ارمغان

پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب وتدوین

قاری اویس ادریس العاصم
فاضل جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

سید کلیم حسین شاہ بخاری
فاضل جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

تقدیم ونظر ثانی

فضیلۃ الشیخ
القاری المقری محمد ادریس العاصم رحمۃ اللہ علیہ
فاضل جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

ارمغان

پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تدوین

قاری اویس ادریس العاصم
فاضل جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

سید کلیم حسین شاہ بخاری
فاضل جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

نظر ثانی

استاذ القراء والمجودین، الشیخ القاری المقری
محمد ادریس العاصم رحمۃ اللہ علیہ
فاضل مدینہ یونیورسٹی

العاصم اسلامک بکس
لاہور پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب ـــــــــــ ارمغانِ پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب وتدوین ـــــــــــ قاری اویس ادریس العاصم

سید کلیم حسین شاہ بخاری

نظر ثانی ـــــــــــ فضیلۃ الشیخ القاری المقری محمد ادریس العاصم

ملنے کا پتا

مدرسہ تعلیم القرآن والسنہ للبنات

مکان نمبر 22، گلی نمبر 3، محلہ حبیب گنج مصری شاہ، لاہور

قاری اویس ادریس: 0322-7776945

کلیم حسین شاہ: 0334-5138522

فہرست مضامین

عنوان	مصنف	صفحہ
شجرہ نسب خاندان غزنویہ		12
حرفِ آغاز	مرتبین	15
تقدیم	مولانا محمد ادریس العاصم	18
تقریظ	ابوعمار زاہد الراشدی	23
باب اوّل: غزنوی خاندان اور اُس کی خدمات		25
خاندانِ غزنویہ	مولانا عبدالعظیم انصاری	27
غزنوی خاندان	مولانا محمد اسحاق بھٹی	31
فکرِ ابن تیمیہ اور اس کی اشاعت میں خاندانِ غزنویہ کا کردار	ڈاکٹر محمود احمد	53
تحریکِ ختم نبوت میں غزنوی علماء کا کردار	پروفیسر محمد سلیمان اظہر	67
دارالعلوم تقویۃ الاسلام، امرتسر	پروفیسر محمد یامین محمدی	75
باب دوم: مولانا سید عبداللہ غزنوی		81
حضرت عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ	مولانا محمد صدیق جھنگوی	83
عارفِ غزنی	پروفیسر محمد سلیمان اظہر	89
باب سوم: مولانا سید عبدالجبار غزنوی		99
حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی امرتسری	محمد تنزیل الصدیقی الحسینی	101
باب چہارم: مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی		119
مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	خالد اشرف	121
باب پنجم: مولانا سید ابوبکر غزنوی: شخصیت و کردار		139
ابوبکر غزنوی	خودنوشت	141
سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ ..... ایک تعارف	بیگم سیّد ابوبکر غزنوی	144

عنوان	مصنف	صفحہ
سید جنید غزنوی حفظہ اللہ سے ایک ملاقات	ادارہ پیامِ آگہی	146
ابو جی	سید حماد غزنوی	156
سید ابوبکر غزنوی	مولانا محمد اسحاق بھٹی	158
اخلاص وایقان کی شمعیں	مولانا محمد صدیق اعظمی	182
سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	مولانا عبدالرشید حنیف	185
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لیکر	مولانا حکیم عبدالرحمٰن آزاد	190
یادِ رفتگاں' بیادِ سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم	مولانا حکیم محمد عبدالرحمٰن	198
سیّدی واخی سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	پروفیسر چوہدری عبدالحفیظ	206
سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ایک بلند پایہ مفکر اسلام	ابوسلمان راغب شیخوپوری	221
سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ چند ملاقاتیں، چند یادیں	پروفیسر محمد حسین آزاد	229
مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی نجی زندگی کی چند جھلکیاں	سیّد ابراہیم غزنوی	235
سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں	ڈاکٹر خالد غزنوی	240
مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	مولانا محمد صادق سیالکوٹی	244
مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ایم، اے	مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی	249
چراغِ علم وعرفان .... سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	محمد اشرف چٹھہ	255
مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ چند یادیں	عبدالستار نیازی، اوکاڑہ	259
سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	مولانا محمد عائش	262
تم کیا گئے دن روٹھ گئے بہار کے کچھ یادیں' کچھ باتیں	مولانا ارشاد الحق اثری	268
حضرت مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سپہرِ علم کا ایک آفتاب	مولانا محمد خالد سیف	274
حضرت سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ آسمانِ علم وفضل کے آفتاب	مولانا محمد خالد سیف	279
میرے مربی، پروفیسر سید ابوبکر غزنوی	حافظ عبدالاعلیٰ درانی	289
آئینۂ شخصیت ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	محی الدین احمد فیروز پوری	304
پروفیسر ابوبکر غزنوی	پروفیسر مرزا محمد منور	311
سیّد ابوبکر غزنوی	ڈاکٹر خورشید رضوی	316

❁ شہیدِ راہِ حق .... پروفیسر سیّد ابوبکر غزنوی	پروفیسر عبدالحفیظ صاحب	322
❁ سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ میرے استاذ' میرے مرشد	ڈاکٹر خالد علوی، برمنگھم	327
❁ سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ چند یادیں' چند باتیں	پروفیسر خالد بزمی	332
❁ سیّد ابوبکر غزنوی ایک بااخلاق شخصیت	ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر	335
❁ سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ چند یادیں	مولانا عبدالرشید راشد ہزاروی	339
❁ سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ میری نگاہ میں	پروفیسر غلام احمد حریری	343
❁ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	مولانا محمد اسحاق بھٹی	349
❁ مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعزیت	مولانا عبدالغفار حسن	352
❁ خاندانِ غزنویہ کا درخشندہ ستارہ	آغا طاہر سلیم قصوری	355
❁ سیدابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ شخصیت اور یادیں	سلیم تابانی	359
❁ آہ! مولانا سیّد ابوبکر غزنوی	حافظ صلاح الدین یوسف	363
❁ سیّد ابوبکر الغزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال	مولانا محمد ابراہیم کمیرپوری	367
❁ سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم کی موت پر چند تاثرات	عنایت اللہ نسیم سوہدروی	371
❁ مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	ملک عبدالرشید عراقی	375
❁ سیدابوبکر غزنوی	عبدالرشید عراقی	378
❁ آہ! سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	ملک ولی الرحمٰن ناصرؔ	382
❁ سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں	مولانا حافظ عبدالغفور جہلمی	384
❁ واہ سیّدی! ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	پروفیسر محمد مزمل احسن شیخ	387
❁ سیدابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کا پیغام	پروفیسر محمد مزمل احسن شیخ	390
❁ پروفیسر سیدابوبکر غزنوی مرحوم	جاوید بن عبداللہ	393
❁ یادِ رفتگاں، ابوبکر غزنوی	آزاد شیرازی	395
❁ سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم....ایک باغ و بہار شخصیت	حمید المکی	396
❁ سیدابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں	محمد یوسف ہارون	398
❁ ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ.....چند تاثرات	قاری محمد ادریس عاصم	400

آہ! سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ ایک خاندان!! یک تاریخ!!!	مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی	402
سید ابوبکر غزنوی	سید محمد فاروق القادری	404
آہ! پروفیسر ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ	مولانا محمد تقی عثمانی	407
مولانا ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ سے دو ملاقاتیں	عطاء الحق قاسمی	409
عبداللہ غزنوی سے پروفیسر ابوبکر غزنوی تک	محی الدین بن احمد دین	411
آہ! سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم	جناب مظفر حسین	414
سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم و مغفور ایک فاضل شخصیت	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی	415
مولانا ابوبکر غزنوی	جناب عبدالقادر حسن	416
حضرت سید ابوبکر غزنوی مرحوم کی یاد میں	ابو عمر شیخ محمد نعیم بادشاہ	417
پروفیسر سید ابوبکر غزنوی	انجینئر محمد افضل	419
سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم	ملک نصر اللہ خان عزیز	421
باب ششم: آخری لمحات، وفات و جنازہ		423
پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ آخری سفر اور سفرِ آخرت	ڈاکٹر شیر محمد زمان	425
آہ! مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ	مولانا صہیب حسن	432
پروفیسر مولانا ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ لندن میں آخری لمحات	حکیم محمد سعید دہلوی	435
سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کا سفرِ آخرت	مولانا برق التوحیدی	439
خاندانِ غزنویہ کے نامور فرزند مولانا سید ابوبکر غزنوی کی نمازِ جنازہ		441
باب ہفتم: تعزیتی بیانات		443
سید ابوبکر غزنوی کی وفات پر زعمائے ملت کے تاثرات	ڈاکٹر خالد محمود زاہد	445
اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر کا سانحہ ارتحال		449
مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو خراجِ عقیدت	مولانا محمد یوسف انور	451
مولانا سید ابوبکر غزنوی کے انتقالِ پُرملال پر اظہارِ تعزیت		455
آہ سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ		461
مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر علماء کے تاثرات	قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری	462

آہ! مولانا ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ	اکرام القادری	464
لائل پور میں سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں جلسہ	مرزا محمد اسحاق زیدی	465
آہ! اہلحدیث جماعت کے مایۂ ناز سپوت		466
مکتوب مولانا کوثر نیازی وفاقی وزیر مذہبی امور پاکستان		467
سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر تعزیتی مکتوب	مولانا محمود احمد میرپوری	468
قوم ایک جید عالم اور ماہر تعلیم سے محروم ہوگئی	قاضی عبدالحکیم	469
سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کا انتقال	امین اللہ ویٹر	470
برطانیہ سے سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر تعزیتی بیان	فضل کریم عاصم	471
مولانا سیّد ابوبکر غزنوی کی وفات	محمد اسحاق بھٹی	472
سید ابوبکر غزنوی کی تعزیت	فیض عالم صدیقی	473
آہ! خاندان غزنویہ کا آخری روشن ستارہ بھی رُوپوش ہوگیا		474
قرار داد تعزیت بر انتقال پُرملال سید ابوبکر غزنوی		474
مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر تعزیتی قرار دادیں		475
باب ہشتم: منظوم گلہائے عقیدت		481
سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کلام اقبال کے آئینہ میں	مولانا ابراہیم کمیرپوری	481
بیاد ابوبکر غزنوی	جناب اسلام اللہ شاکر	482
سیّد ابوبکر غزنوی	جناب ولی وارثی	483
آہ! سید غزنوی	جناب محمد سعید عابد	484
بیاد غزنوی	جناب زبیر احمد ظہیر	485
آہ! ابوبکر غزنوی	جناب آغا صادق	486
ابن غزنہ	پروفیسر عثمان خالد یورش	487
سید ابوبکر غزنوی	جناب ثناء اللہ زاھدی	488
آہ! مولانا ابوبکر غزنوی	جناب راز کاشمیری	489
آہ! مولانا سید ابوبکر غزنوی	ڈاکٹر عبدالواحد نقیب	491

آہ! ابوبکر غزنوی	جناب علیم ناصری	493
آہ! سید ابوبکر غزنوی	حافظ اللہ رکھا کلیم سیالکوٹی	496
آہ! پروفیسر سید ابوبکر غزنوی	پروفیسر خالد بزمی	497
حق پر تھے حق بیاں تھے ابوبکر غزنوی	مولانا عبدالرحمٰن عاجز مالیر کوٹلوی	498
آہ! سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	مولانا عبدالرحمٰن عاجز مالیر کوٹلوی	500
سید ابوبکر غزنوی کے انتقال کی خبر سن کر ارتجالاً	جناب احسان دانش	502
جناب ابوبکر غزنوی کی یاد میں	نصیر احمد ناصر سہنسرہ گورایہ	504
موت بھی بس نیک لوگوں کا لگاتی ہے سراغ	مولانا محمد ابراہیم صاحب	506
بیادِ مولانا ابوبکر غزنوی مرحوم	پروفیسر اسرار احمد سہاروی	507
باب نہم: تحریری و تقریری افادات		510
میں الحاد سے اسلام تک کیسے پہنچا؟	سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	512
اربابِ صفا کس حال میں تھے؟		515
مرکزی جمعیت اہلحدیث مغربی پاکستان کے ناظم اعلیٰ منتخب ہونے پر مولانا سید ابوبکر غزنوی کی تقریر		524
مکتبۂ غزنویہ کا قیام		527
مطبوعات مکتبہ غزنویہ		528
خلافتِ راشدہ میں نظم ونسق		531
مسلم معاشرہ کو نئی تہذیب کا چیلنج	عبدالوھاب عزام	534
باب دہم: مکاتیب سید ابوبکر غزنوی		545
① بنام حکیم عبدالرحیم اشرف		547
② بنام شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ صاحب		548
③ بنام جناب بشیر انصاری صاحب		549
④ بنام حافظ عبدالرشید اظہر صاحب		550

ضمیمہ:		551
سرگزشت مولانا داؤد غزنوی.... تصنیف سید ابوبکر غزنوی پر تبصرہ	ڈاکٹر سید عبداللہ	553
پیش لفظ.... تعلیم وتزکیہ	عبدالحفیظ	557
پیش لفظ.... قربت کی راہیں	عبدالحفیظ	560
مولانا محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے بعد	مولانا محی الدین احمد	563
خاندان غزنویہ کے امیر کا تقرر	مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف	567
سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے ورثاء کو معاوضہ	مولانا محمد ابراہیم کمیرپوری	571
مولانا سید ابوبکر غزنوی کی مجالس ذکر	مولانا عزیز زبیدی	576
اسلامی معیشت میں گردشِ دولت کے قرآنی اسلوب	محی الدین بن احمد دین	581
ناران کی وادی تک	سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	596

نیک اعمال کی خوشبو اور برے اعمال کی بدبو...

یہ بات تو اپنی جگہ اہل اللہ کے ہاں متحقق ہے کہ نیک اعمال کی خوشبو ہوتی ہے اور برے اعمال کی بو ہوتی ہے۔ اور وہ بسا اوقات اس کا احساس بھی پاتے ہیں۔ میرے شیخ، بلکہ شیخ العرب والعجم حضرت محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب اسی حوالے سے ایک بار بخاری شریف کے درس میں گفتگو کی تو راقم نے عرض کیا کہ کیا یہ بات نظریاتی ہے یا حسی وعملی بھی؟ تو انہوں نے ارشاد فرمایا: حسی طور پر بھی اس کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا: اس کی کوئی مثال؟ تو ارشاد فرمایا: زانی کے جسم سے اس طرح کی بو آتی ہے جیسے حقہ پینے والے کے منہ سے آتی ہے۔ اخی ومحبی مولانا برق التوحیدی حفظہ اللہ نے ذکر کیا کہ اسی نوعیت کی بات دورانِ درس میں حضرت حافظ صاحب نے فرمائی تو میں نے عرض کیا کہ کوئی شخص ہے جس کو یہ احساس ہوتا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ہاں سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا احساس ہوتا تھا۔ جب اہل اللہ یہ چیز محسوس کرتے ہیں تو فرشتے کا وجود تو انتہائی لطیف ہے وہ اس کا احساس بالاَولیٰ پاتے ہیں۔ اور اسی بنا پر وہ نیکی کے ارادے کو لکھتے ہیں اور برائی کے ارادے کو اللہ کے لطف وکرم کی وجہ سے نہیں لکھتے۔

(تفسیر سورہ ق، فضیلۃ الشیخ ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ، (ص: 100)

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾

جتنے پیدا ہوئے اک روز مرنا ہے سب کو
معبرِ رودِ اجل سے گزرنا سب کو
جو کیا اس کا صلہ سب کو ملے گا اِک دن
چاہیے کام ہر اک سوچ کے کرنا سب کو

محمد بشیر انصاری

شجرہ نسب خاندان غزنویہ

حضرت مولانا سید محمد بن محمد بن سید محمد شریف عمرزئی رحمہ اللہ

↓

- سیّد محمد اعظم المعروف عبداللہ غزنوی
- سیّد عبدالعظیم
- سیّد عبدالخالق

سیّد محمد اعظم المعروف عبداللہ غزنوی ↓

- مولانا سیّد محمد
- مولانا سیّد عبداللہ
- مولانا سیّد احمد
- مولانا سیّد عبدالجبار
- مولانا سیّد عبدالقیوم
- مولانا سیّد عبدالستار (لا ولد)
- مولانا سیّد عبدالرحمٰن (لا ولد)
- مولانا سیّد عبدالواحد
- مولانا سیّد عبدالعزیز
- مولانا سیّد عبدالحیّ ① (لا ولد)
- مولانا سیّد عبدالقدوس (لا ولد)
- مولانا سیّد عبدالرحیم

صاحبزادیاں ↓

- فاطمہ بی بی
- مریم بی بی
- امۃ اللہ
- امۃ الرحیم
- امۃ الغفار
- امۃ الوہاب
- امۃ الفتاح
- امۃ الحمید

اولاد: 12 صاحبزادے 15 صاحبزادیاں تھیں۔

یاربّ صلّ وسلّم دائمًا ابدًا علی حبیبك خیرالخلق کلّهم

بشکریہ: حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، شیش محل روڈ، لاہور

---

① مصنف ''ارباب علم وفضل'' نے ان کا نام عبدالسبحان لکھا ہے۔ (مرتب)

① مولانا سیّد محمد بن مولانا سیّد عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ

- مولانا سیّد عبدالغفور
  مترجم اُردو مشکوٰۃ المصابیح و قرآن مجید (حمائل)
  - حافظ سیّد محمد ایوب
- مولانا سیّد عبدالاوّل

② مولانا سیّد عبداللہ بن مولانا سیّد عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ (امام اوّل)[1]

- مولانا سیّد عبدالرحمٰن
- مولانا سیّد عبدالستار
- مولانا سیّد عبدالقدوس
- مولانا سیّد عبدالحیّ

③ مولانا سیّد احمد بن مولانا سیّد عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ

- حکیم عبدالشافی
- مولانا عبدالوارث

④ مولانا سیّد عبدالجبار بن مولانا سیّد عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ (امام ثانی)

- مولانا سیّد احمد علی
- مولانا داؤد غزنوی
  - مولانا سیّد عمر فاروق
    - سیّد حسن
    - سیّد یوسف
  - مولانا سیّد ابوبکر غزنوی
    - سیّد جنید
    - سیّد حماد
  - سیّد محمد یحییٰ
  - سیّد احمد غزالی
- حافظ محمد سلیمان
  - سیّد عثمان
- مولانا سیّد عبدالغفار
- حافظ سیّد عبدالستار

---

[1] مولانا میر سیالکوٹی رقم طراز ہیں: ''آپ کی اولاد میں سے حافظ عبداللہ اسلامیہ کالج پشاور میں پروفیسر ہیں اور اُن کے لڑکے احمد غزنوی ہیں جو آج کل حیدر آباد سندھ میں سیشن جج ہیں۔'' (تاریخ اہل حدیث، ص: 447)

⑤ مولانا سیّد عبدالواحد بن مولانا سیّد عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ (امام ثالث)

↓

مولانا محمد اسمٰعیل — مولانا سیّد عبدالحمید — مولانا ابراہیم — مولانا عبدالولی

مولانا محمد اسمٰعیل ↓

ڈاکٹر سیّد محمد خالد — سیّد محمد طارق — سیّد محمد قاسم — سیّد عبدالواحد — سیّد محمد ابراہیم

سیّد حسن — سیّد محمود — سیّد محمد — سیّد احمد
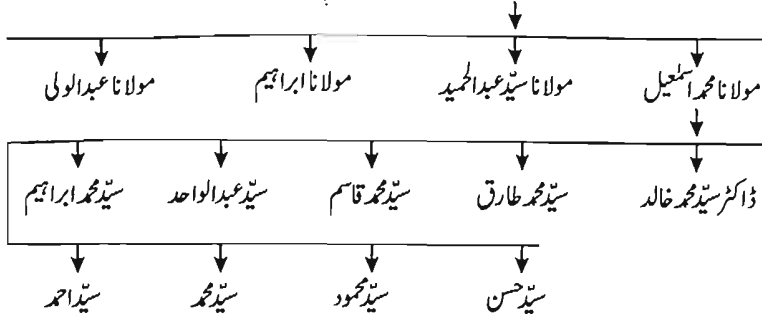
⑥ حضرت مولانا سیّد عبدالعزیز بن مولانا سیّد عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ

↓

مولانا سیّد عبدالاعلیٰ

⑦ حضرت مولانا سیّد عبدالرحیم بن مولانا سیّد عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ

↓

مولانا سیّد یحییٰ — مولانا سیّد ہارون [1] — مولانا سیّد عیسیٰ — حافظ سیّد محمد زکریا — مولوی سیّد موسیٰ

مولوی سیّد نوح — مولانا سیّد احمد

سیّد عبدالرحیم — سیّد عبدالعزیز — سیّد عبدالرشید — سیّد بابر غزنوی — سیّد محمد صدیق

امۃ العزیز — امۃ الرحیم — امۃ الرشید

---
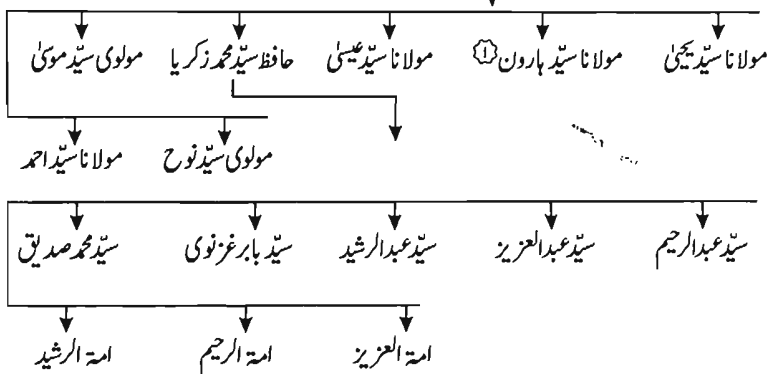
[1] ان کا نام مولانا محمد اسحاق بھٹی نے ذکر کیا ہے۔ (فقہائے ہند، 381/3)

نوٹ: غزنوی خاندان کا مذکورہ شجرۂ نسب ''ارباب علم وفضل'' از حاجی محمد ادریس بھوجیانی (ص: 171 تا 173) سے ماخوذ ہے۔ ''تاریخ اہل حدیث'' (از: مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی) سے بھی کچھ اضافے کیے گئے ہیں۔ مولانا میر سیالکوٹی لکھتے ہیں کہ: ''مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے چار صاحبزادے لاولد تھے، مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبدالستار، مولانا عبدالحیٔ، مولانا عبدالقدوس۔'' (مرتب)

مولانا عبدالقیوم کی اولاد کی تفصیل سے آگاہی نہیں ہوئی۔

حرفِ آغاز

علمائے کرام کے سوانحی حالات اور خدمات سے آگہی حاصل کرنا ہر شخص کے لئے بہت ضروری ہے۔ تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ انہوں نے کن حالات میں دین کے علم کو سیکھا اور پھر اسے آئندہ نسلوں تک پہنچایا۔ برصغیر پاک وہند میں غزنوی علماء نے درس وتدریس، وعظ وتبلیغ اور تصنیف وتالیف کے ذریعے دین اسلام کی اشاعت، کتاب وسنت کی ترویج اور شرک وبدعت کی تردید میں بے مثال خدمات انجام دیں۔

غزنوی خاندان کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے جس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ تحریک آزادی میں بھی اس خاندان کے افراد نے عظیم الشان کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

غزنوی علماء کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے تلمیذ رشید امام ابن القیم کی تصانیف سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا اور ان کی اکثر تصانیف اسی خاندان کے قابلِ قدر علماء کی کوششوں سے طبع ہوئیں۔ مجموعی طور پر اس خاندان کے معزز علماء نے حدیث کی نشر واشاعت کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

غزنوی خاندان کے سربراہ مولانا سید عبداللہ غزنوی کا شمار شیخ الکل میاں سید نذیر محدث دہلوی کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ سید عبداللہ غزنوی ایک ولی اللّٰہی شخصیت، اسلام کے خادم اور اپنے زمانے کے صاحبِ عزیمت بزرگ تھے۔ آپ کے پانچ صاحبزادوں اور تین پوتوں نے بھی حضرت میاں صاحب سے استفادہ کیا اور اپنا علمی فیض لوگوں تک انتہائی احسن انداز میں پہنچایا۔

اس خاندان کے سربراہ مولانا سید عبداللہ غزنوی کے سوانحی حالات پر کئی کتب لکھی گئی ہیں۔ جن کی تفصیل ''غزنوی خاندان'' از ملک عبدالرشید عراقی میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی انہی مولانا عبداللہ غزنوی کے پوتے اور حضرت الامام عبدالجبار غزنوی کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ علم وفضل کے اعتبار سے جید عالم دین تھے اور اسلامی علوم کا ایک سمندر تھے۔ ساری زندگی انگریزی سامراج کے خلاف سینہ تان کر کھڑے رہے۔ قید وبند کی صعوبتیں بھی سہیں لیکن آپ کے پایۂ استقلال میں لغزش نہ آئی۔ تحریک پاکستان میں آپ کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ علمائے اہلحدیث میں سے تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں جن علمائے کرام نے بستی بستی جاکر عوام کا شعور بیدار کیا ان میں مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی سرفہرست تھے۔

مولانا داؤد غزنوی کے فرزند مولانا سید ابوبکر غزنوی اپنے زہد وورع اور علم وفضل کی بنا پر علمی حلقوں میں مشہور ومعروف تھے۔ پروفیسر ابوبکر غزنوی بڑے ذہین اور صاحبِ فکر عالم دین تھے۔ سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد

جناب بشیر انصاری صاحب مرحوم نے سید صاحب کی سوانحی خدمات کے متعلق ''ہفت روزہ الاسلام'' کی ایک خصوصی اشاعت شائع کی۔ غزنوی مرحوم کی ہمہ گیر شخصیت کے بارے میں یہ مقالات پڑھنے کے بعد ارادہ ہوا کہ یہ اشاعت کتابی صورت میں مرتب ہونی چاہیے۔ پھر اس سلسلے میں مزید تگ ودو شروع کی تو اللہ تعالیٰ کی توفیق ونصرت اور احباب کے تعاون سے اتنا زیادہ مواد جمع ہوگیا کہ جس سے یہ ضخیم کتاب وجود میں آ گئی۔

کتاب کے لیے مواد جمع کرنے کے سلسلے میں دارالدعوۃ السّلفیہ (لاہور)، جامعہ اہلحدیث چوک دالگراں (لاہور)، دارالعلوم تعلیم الاسلام ماموں کانجن، اشرف لیبارٹریز (فیصل آباد)، ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری (شاہ فیصل مسجد اسلام آباد) کا سفر کیا گیا جہاں سے قابلِ ذکر مواد حاصل ہوا۔ دیگر معاونین میں پروفیسر ڈاکٹر خالد ظفر اللہ صاحب (سمندری)، جناب شبیر احمد خان میواتی اور محمد فرقان صاحب (لاہور) شامل ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر سہیل حسن صاحب کی رہنمائی سے ڈاکٹر شیر محمد زمان صاحب سے ملاقات کی، انہوں نے چیدہ چیدہ مقامات سے مسودہ ملاحظہ فرما کر مفید مشورے دیے۔ انہی کی تجویز پر اورینٹل کالج لاہور کا رخ کیا جہاں جناب طارق صاحب نے بھرپور تعاون کیا لیکن وہاں ہمیں مطلوبہ مواد تک رسائی نہ ہو سکی۔

فضیلۃ الشیخ المقری محمد ادریس العاصم رحمہ اللہ نے بھی اپنے خاندانی تعلق کی بنا پر وفات سے اڑھائی ماہ قبل طویل مقدمہ لکھ کر عنایت کیا۔

مذکورہ کتاب چند ابواب پر مشتمل ہے جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

باب اوّل میں غزنوی خاندان کی علمی ودینی خدمات سے متعلق مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ باب دوم میں غزنوی خاندان کے بانی وجد امجد مولانا سید عبداللہ غزنوی کا مختصر تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ باب سوم میں مولانا الامام سید عبدالجبار غزنوی کے متعلق تنزیل صدیقی صاحب کا مضمون ان کی کتاب ''اصحابِ علم وفضل'' سے اُن کی اجازت سے شامل کیا گیا ہے۔ باب چہارم میں مولانا سید داؤد غزنوی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

باب پنجم میں مولانا سید ابوبکر غزنوی کی سوانح اور علمی ودینی خدمات پر مختلف شخصیات کے مضامین شامل اشاعت کیے گئے ہیں۔ چند مضامین میں تکرار بھی موجود ہے۔ کیونکہ یہ کتاب مولانا کی مبسوط سوانح عمری نہیں ہے اس لیے تکرار ناگزیر ہے۔

باب ششم میں سید صاحب کے حادثہ اور وفات وجنازہ پر مشتمل مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ حصہ ہفتم میں حکومتی شخصیات، علمائے کرام اور اداروں کے تعزیتی بیانات ومکاتیب درج کیے گئے ہیں۔ حصہ ہشتم میں مولانا ابوبکر غزنوی پر شعراء کا منظوم کلامِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

باب نہم میں سید ابوبکر غزنوی مرحوم کی چند منتخب تقاریر ومضامین بطور نمونہ شامل کیے گئے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ خطبات ومضامین ان کے مطبوع ''خطبات ومقالات'' میں موجود نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں سید صاحب نے غزنوی علماء کی

علمی تراث کو زندہ کرنے کے لیے مکتبہ غزنویہ قائم کیا تھا۔ جس کے تعارف کے لیے انہوں ایک مختصر تحریر لکھی تھی جو اس حصے میں شامل کر دی گئی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی کتاب ''سیدی وابی'' میں اپنے رسائل کے مضامین کا تعارف کرایا تھا اور یہ تمام رسائل مکتبہ غزنویہ کے ہی اہتمام میں خود شائع کیے تھے۔ وہ تعارف بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

باب دہم میں غزنوی صاحب کے چند مکاتیب شامل ہیں۔

آخر میں بطور ضمیمہ سید ابوبکر غزنوی صاحب کی شخصیت کے متعلق چند اہم مضامین بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے اور ہمیں اسلاف کی سیرت سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ ولی التوفیق

مرتبین

قاری اویس ادریس العاصم

سید کلیم حسین شاہ بخاری

تقدیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ
اَمَّا بَعْدُ!

''تذکرہ'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''یاد'' کے ہیں۔ تذکرہ ایک ادبی صنف بھی ہے۔ مسلمانوں میں تذکرہ نگاری کی ایک خاص روایت رہی ہے، مسلمان جہاں بھی گئے اپنے ساتھ اپنی روایات بھی لے گئے، مسلمانوں نے اپنی علمی روایات کے پیش نظر اپنے اکابرین کے حالات محفوظ کر کے اتنا بڑا ذخیرہ تیار کر دیا ہے کہ جس کا مقابلہ دیگر مذاہب نہیں کر سکتے۔

اللہ والوں کا تذکرہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود حکم دیا ہے۔ قرآن کریم میں اس سلسلہ میں متعدد آیات موجود ہیں۔

☆ ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ....﴾ ☆ ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ....﴾
☆ ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى﴾ ☆ ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمٰعِيلَ﴾
☆ ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ﴾

(سورہ مریم، آیات: 16، 41، 51، 54، 56) وغیرہ

اسی طرح حدیث مبارکہ میں ہے:

البَرَكَةُ مع أكابِرِكُمْ.(1)

زیر نظر کتاب پروفیسر سید ابوبکر غزنوی مرحوم کے تذکرے کے طور پر مرتب کی گئی ہے۔ اس تحریر کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارا تعلق غزنوی خاندان سے کب سے ہے۔

خاندان غزنوی سے ہمارا تعلق:

میرے دادا جان حاجی غلام اللہ مرحوم اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے ان کے اور کوئی بھائی بہن نہ تھے، اور میرے دادا جان کے والد جن کا نام جامی ہے پکے سنی تھے۔ میرے دادا جان حضرت امام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کی اقتدا میں جمعہ وغیرہ نمازیں ادا کرتے تھے، اور اس وجہ سے وہ اہل حدیث ہو گئے۔ جب میرے پردادا کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے میرے دادا کو اپنی جائیداد سے عاق کر دیا، حالانکہ ان کی تقریباً پانچ مربع زمین تھی۔ میرے دادا جان ہجرت کر کے لاہور آ گئے، لاہور آ کر وہ چینیاں والی مسجد تلاش کر کے حضرت امام عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ کی خدمت میں پہنچے

---

(1) المعجم الأوسط للطبراني (8991)، السلسلة الصحيحة (1778)

اور ان کی بیعت کی، مزدوری وغیرہ کو اپنا ذریعہ معاش بنایا، رات مسجد میں آ کر گزارتے۔ وقت گزرتا گیا امام عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ نے ان کو اپنا مرید و مشیر بنالیا۔ میرے دادا اتنے ذہین اور زیرک تھے کہ حضرت امام صاحب اکثر اوقات اپنے ذاتی اور جماعتی معاملات میں بھی ان سے مشورہ لیتے، حتی کے دو مرتبہ اپنے خرچ پر میرے دادا جان کو اپنے ساتھ حج پر بھی لے کر گئے اور وہاں سلطان عبدالعزیز رحمہ اللہ سے بھی ملاقات کروائی۔ انہوں نے سلطان سے کہا کہ غلام اللہ انتہائی مخلص، نیک اور پرہیزگار انسان ہے۔ سعودیہ اس وقت ایک غریب ملک تھا، ہندوستان واحد ملک تھا جو چندہ اور اشیائے خوردنی وہاں بھیجتا تھا۔ سلطان عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ان کو وہاں شہریت دینے کی پیش کش کی، تو انہوں نے اس کو قبول نہ کیا اور کہا کہ میں اس ملک کی ویسے ہی خدمت کروں گا کیونکہ یہاں پر حرمین شریفین جیسے مقدس مقامات موجود ہیں، اور آخری دم تک وہ یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ آخری وقت تک ان کا تعلق حضرت امام عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ سے رہا اور اسی تعلق کی بنا پر بڑے بڑے علماء و امراء میرے دادا جان کی بڑی عزت و تکریم کیا کرتے تھے۔

حضرت امام عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ کے ایک شاگرد مولانا عبدالکریم کشمیری بھی تھے۔ حضرت امام غزنوی رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد اسی محلہ میں مسجد کے قریب ہی انہوں نے ایک مکان کرایہ پر لیا جہاں بڑے بڑے علماء ان سے ملاقات کرنے آتے اور وہ عوام الناس کا روحانی علاج بھی کرتے، جس کی وجہ سے صبح سے شام تک عوام کا ان کے پاس رش لگا رہتا اور میرے تایا جان مولانا عبداللہ ان کے معاون تھے۔ حضرت امام عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد چینیاں والی مسجد کی خطابت ان کے بھتیجے شیخ الاسلام مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے سپرد کر دی گئی۔ مولانا عبدالکریم اکثر ہر پندرہ بیس دن بعد مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کو کھانے کی دعوت دیتے، میرے والد محمد یعقوب، تایا محمد عبداللہ اور قاری احمد دین صاحب وہاں خدمت کے فرائض سرانجام دیتے اور یہ دعوت کا سلسلہ نمازِ عصر تک جاری رہتا، اسی وجہ سے مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ میرے والد اور تایا پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔

چینیاں والی مسجد میں (جیسا کہ آپ نے پڑھا مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ خطیب تھے) رمضان المبارک کی ستائیسویں کو قیام ہوتا تھا، تو میرے والد محترم کی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ ٹیکسی کروا کر استاذ القراء قاری اظہار احمد تھانوی رحمہ اللہ، قاری محمد صدیق لکھنوی رحمہ اللہ، قاری فضل الکریم رحمہ اللہ اور قاری عبدالوہاب مکی رحمہ اللہ کو مسجد میں لاتے تھے اور یہ حضرات چار چار رکعات پڑھاتے تھے، پھر بعد از سحری ان کو اپنے مکانات پر چھوڑ کر آتے تھے اور یہ مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی میرے والد صاحب پر کمال شفقت تھی۔

شفقت کا ایک اور واقعہ:

ہمارے خاندان میں کچھ حضرات سنی العقیدہ تھے، ایک بار طلاق کا واقعہ پیش آیا، احناف کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں، تو انہوں نے میرے والد صاحب سے کسی اہل حدیث عالم صاحب سے فتویٰ لینے کو کہا۔

والد صاحب نے سوال تیار کیا اور شیش محل روڈ پر مدرسہ تقویۃ الاسلام میں حضرت مولانا سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو واقعہ کی صورتحال بتائی۔ انہوں نے کہا کہ یہ استفتاء مولانا عبدالرشید صاحب کو دے دو وہ فتویٰ لکھ دیں گے اور میں اس کی تصدیق کروں گا۔ چنانچہ جب فتویٰ لکھ دیا گیا تو والد صاحب لینے گئے، تو انہوں نے کہا کہ مدرسہ کو پندرہ روپے دو، والد صاحب نے کہا کہ میں تو لے کر نہیں آیا، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ مولانا عبدالرشید صاحب فتویٰ لے کر مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے پاس آ گئے اور کہا کہ میں نے ان سے پندرہ روپے کا مطالبہ کیا ہے اور یہ کہہ رہے ہیں کہ میرے پاس نہیں ہیں۔ مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ نے ان سے فتویٰ پکڑ کر فرمایا کہ عبدالرشید! حاجی غلام اللہ کے بیٹے سے پندرہ روپے مانگتے ہو، یہ جملہ انہوں نے دو تین مرتبہ دہرایا اور پھر فتویٰ پر دستخط اور مہر لگانے کے بعد فرمایا: لو یعقوب لے جاؤ۔ جب حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ جمعہ کے خطبہ کے لئے تشریف لاتے اور وہاں میرے والد صاحب، چچا جان، تایا جان ان سے مصافحہ کرتے تو وہ بڑی شفقت فرماتے اور خوب حال احوال دریافت فرماتے۔

راقم نے جب قرآن حفظ کر لیا، تو میرے والد صاحب کو کسی نے بتایا کہ شیش محل روڈ پر مدرسہ تقویۃ الاسلام میں جو حافظ صاحب قرآن سناتے ہیں، وہ بیمار ہیں، انہوں نے معذرت کر لی ہے آپ وہاں جا کر بات کر لیں۔ جب والد صاحب مجھے وہاں لے کر گئے تو وہاں اس وقت ان کا پروگرام تھا، جو آخری مراحل پر تھا۔ میرے والد صاحب سب سے پہلے مولانا عمر فاروق جو مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے بڑے بیٹے تھے، ان سے ملے اور وہ بہت اچھے انداز سے میرے والد سے ملے۔ ان کے محبت بھرے الفاظ کچھ یوں تھے، آؤ بھائی یعقوب! کیا حال ہے؟ ساتھ ساتھ معانقہ بھی کیا اور یہ الفاظ کہتے رہے، خیریت ہے؟ سب اہل وعیال خیریت سے ہیں؟ بہت دیر بعد ملاقات ہوئی، بہت مصروف ہو؟ آج آپ سے ملاقات کر کے بہت خوشی ہوئی۔ اس کے بعد میرے والد صاحب نے فرمایا کہ یہ آپ کے بھتیجے ہیں اور انہوں نے قرآن حفظ کر لیا ہے، سنا ہے کہ اس بار آپ کے حافظ صاحب قرآن پاک نہیں سنا رہے، ان کو موقع دیں۔ انہوں نے کہا: بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ کے بچے نے قرآن حفظ کیا ہوا ہے، بہت مبارک ہو، مزید انہوں نے کہا کہ حضرت والد صاحب (مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ) کے انتقال کے بعد چھوٹے بھائی پروفیسر سید مولانا ابوبکر غزنوی کو مہتمم بنا دیا گیا ہے، آپ ان سے بات کریں۔ حضرت پروفیسر صاحب اس وقت بہاولپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ والد صاحب نے کہا کہ وہ تو بڑے آدمی ہیں، وہ میری بات کیسے سنے گے، تو انہوں نے کہا کہ نہیں نہیں آپ بات کریں، میں بھی اس سلسلہ میں ان سے بات کروں گا۔ ہم نے دیکھا کہ حضرت علامہ پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے پروفیسروں کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ والد صاحب نے سلام کیا، وہ بھی اسی طرح محبت بھرے انداز سے جس طرح ان کے بھائی ملے تھے، آؤ بھائی یعقوب کیا حال ہے؟ وغیرہ الفاظ سے ملے۔ والد صاحب نے کہا کہ یہ آپ کے بھتیجے ہیں، قرآن کریم کے حافظ ہیں، سنا ہے کہ آپ کے حافظ صاحب قرآن نہیں سنا رہے ہیں،

آپ اس کو موقع دیں اور ان سے قرآن سنیں۔ حضرت ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ان بنگالی حضرات نے کہا: قرآن سنانا ہے؟ سنائیں، سنائیں، سنائیں اور وہیں بیٹھ گئے، میں نے قرآن کریم سنایا، وہ بنگالی حضرات بہت خوش ہوئے اور خوب داد دی۔ پروفیسر صاحب نے سوال کیا کہ قرآن کریم مکمل یاد ہے؟ تو والد صاحب نے جواب دیا کہ مکمل یاد ہے، اس وقت میں نے تجوید کا ایک سال پڑھا ہوا تھا، دوسرا سال باقی تھا۔ پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ کل تشریف لائیے گا اور بیٹھ کر بات کریں گے۔ دوسرے دن حاضر ہوئے تو پھر قرآن کریم سنا اور سوال کیا کہ مکمل قرآن یاد ہے؟ جواب میں ہاں کہا تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ ہی تراویح پڑھائیں گے۔

میرے لئے انتہائی خوشی اور اعزاز کا مقام ہے کہ حضرت علامہ پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ نے میرا مکمل قرآن کریم سماعت فرمایا اور جس دن تکمیل قرآن ہوا تو انہوں نے راقم کو خصوصی انعام واکرام سے نوازا اور ساتھ ہی میرے والد صاحب کو فرمایا کہ بھائی یعقوب مبارک ہو آپ کو، اور مزید وقت ان کو قاری اظہار صاحب کی خدمت میں بھیجتے رہیں، درسِ نظامی کی کتب بھی پڑھائیں، میں ان کو مدینہ یونیورسٹی میں خود بھیجوں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا، راقم جب آخری جماعت میں بخاری شریف پڑھ رہا تھا، ایک حادثہ پیش آیا، پروفیسر صاحب لندن میں ایک روڈ حادثہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے، لیکن وہ مستجاب الدعوات تھے، ان کی دعاؤں سے جب میں جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ سے فارغ ہو کر آیا تو مدرسہ تجوید القرآن پڑھانے کی ڈیوٹی لگ گئی۔ مدرسہ عالیہ تجوید القرآن میں تین سال تدریس ہو چکی تھی، میں نے مدینہ یونیورسٹی داخلہ بھیجا تو داخلہ ہو گیا، یوں ان کی خواہش پوری ہو گئی۔ یہ ان کی دعاؤں کا نتیجہ تھا اور یقیناً یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ان کے خاندان کا ہر فرد مستجاب الدعوات تھا، ان کا اللہ تعالیٰ سے بہت قرب تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

حضرت مولانا عبدالکریم صاحب کاشمیری رحمہ اللہ کا تذکرہ پہلے چند سطور میں ہوا ہے، ان کا انتقال سریاں والا کے نزدیک رنگ محل کی مسجد میں ہوا، وہاں انہوں نے تحفیظ القرآن کا ایک شعبہ بھی قائم کیا ہوا تھا، قاری عبدالغفور مرحوم پڑھاتے تھے اور عصر کے بعد قاری احمد دین صاحب بھی وہاں آجاتے تھے، جب حضرت کا انتقال ہوا تو قاری احمد دین صاحب نے علامہ پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کو اطلاع دی تو فوراً تشریف لائے۔ میں نے دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہے تھے .انا للہ وانا الیہ راجعون اللھم اغفر لہ وارحمہ.زبان پر جاری تھا، پھر فرمانے لگے: یہ ہمارے چچا جان ہیں ان کے کفن دفن کا انتظام ہم کریں گے اور میانی صاحب قبرستان میں جہاں ہمارے خاندان کی قبریں ہیں وہیں ان کو دفن کیا جائے گا اور پھر اسی طرح ہوا۔

ایک اور اہم واقعہ:

ہمارے محترم دوست جناب بشیر انصاری رحمہ اللہ جب الاسلام کی خاص اشاعت تیار کر رہے تھے تو ایک دن جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ تشریف لائے، ان کا گھر بھی جامعہ کے نزدیک تھا۔ ہم وہاں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے اسی دوران بشیر انصاری صاحب نے ایک واقعہ سنایا، ایک دعوت پر حضرت علامہ پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ بھی تشریف فرما تھے، جب کھانے کا وقت ہوا ایک صاحب کھانا نکالنے لگے تو سالن کے کچھ چھینٹے پروفیسر ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے کپڑوں پر پڑ گئے، وہ آدمی بہت پریشان ہوا، تو حضرت نے فرمایا: پریشان نہ ہو یہ داغ دھبے تو دھوبی صاف کر دے گا ہمیں اپنے اندر دل کی طرف دیکھنا ہے کہ دل کیسے صاف ہوں گے، اس کی فکر کرنی چاہئے، تعلق باللہ قائم ہوگا تو بات بنے گی۔

ہمارے اس عظیم خاندان کے ساتھ اتنے دیرینہ تعلقات تھے، دل میں بڑی خواہش وتمنا تھی کہ اس خاندان پر لکھا جائے مگر جب عزیزم القاری اویس ادریس العاصم اور ان کے ساتھ محترم سید کلیم حسین شاہ بخاری نے اس کام کو شروع کیا تو انتہائی مسرت ہوئی اور دل سے دعا نکلی کہ اے اللہ! تو ان کی مدد اور ان کے لئے آسانی فرما۔ اللہ تعالیٰ نے خاص مدد کی یہ کام ان کے لئے آسان تر ہوگیا اور جلد ہی اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے، اپنی رحمت نازل فرمائے اور اس کتاب کو شرفِ قبولیت سے نوازے، اور دونوں مرتبین کے لئے ذریعۂ نجات بنائے، آمین۔

واللہ ولي التوفیق وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ أجمعین.

العبد

محمد ادریس العاصم

خادم القرآن وعلومہ

تقریظ

حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کا خاندان برصغیر پاک وہند کی علمی و دینی جدوجہد کی تاریخ میں ایک مستقل باب کا عنوان ہے، جنہوں نے نہ صرف دین کی تعلیم و ترویج بلکہ دفاع و تحفظ میں بھی نمایاں خدمات سرانجام دیں اور تحریک آزادی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ اس خطہ میں مسلک اہلحدیث کے سرکردہ راہ نماؤں میں سے تھے اور ان کی مسلکی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے مگر ملی معاملات میں مشترکہ جدوجہد، وطن کی آزادی اور تحفظ ختم نبوت جیسی ملی تحریکات میں ان کا کردار ہمیشہ قائدانہ رہا اور ان کا اعتدال اور توازن آج بھی اہل دین کے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان کے فرزند حضرت سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ ان کی روایات کے امین اور تعلیمات و افکار کے ترجمان تھے اور خود بھی صاحبِ فکر شخصیت تھے۔ جنہوں نے تعلیم، اصلاح اور تربیت و تزکیہ کے شعبوں میں خاندانِ غزنویہ کی روایات کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ نئی نسل اور علماء کرام کو ان سے متعارف کرانے میں زندگی بھر محنت کی۔ میں تاریخ اور دینی جدوجہد کے ایک طالب علم کے طور پر خاندانِ غزنویہ بالخصوص حضرت مولانا سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ کا ہمیشہ نیازمند رہا ہوں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ محترم ادریس ادریس العاصم اور محترم سید کلیم حسین شاہ بخاری نے اس علمی، دینی اور روحانی خاندان، خاص طور پر مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی حیات و خدمات کے حوالہ سے مختلف اصحابِ قلم کی نگارشات کا یہ حسین مجموعہ مرتب کر کے نئی نسل کی راہ نمائی کے ساتھ ساتھ اپنے ذخیرۂ آخرت میں بھی اضافہ کیا ہے۔

آج کا نوجوان جس طرح دین کی بنیادی معلومات کے ساتھ ساتھ اپنے ماضی اور حال سے بھی بے خبر بلکہ لاتعلق ہوتا جا رہا ہے۔ اس ماحول میں اپنے بزرگوں کی خدمات اور تعلیمات کو سامنے لانا وقت کی اہم ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ اس طبقہ اور مکتب فکر کے دانش وروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے تذکرہ کو زیادہ سے زیادہ عام کریں۔ کیونکہ نئی نسل کو ماضی سے وابستہ رکھنے کی یہ ایک مؤثر صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ مرتبین کو دارین میں جزائے خیر سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

ابوعمار زاہد الراشدی

خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ

24 دسمبر 2021ء

مولانا سید ابوبکر غزنوی کی وصیت

شیخ العربیہ مولانا محمد بشیر سیالکوٹی لکھتے ہیں:

مولانا سید ابوبکر غزنوی 1962ء کے موسم گرما کی تعطیلات کے دوران ایک ماہ جامعہ میں مقیم رہے۔ میں نے ان دنوں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا، میں نے انہیں یہ بتایا تو انہوں نے مجھے مبارک باد دی اور فرمایا: بشیر صاحب، میں آپ کو ایک وصیت کرتا ہوں جو مولانا ابوالکلام آزاد نے مجھے اس وقت کی تھی جب وہ میرے والد مولانا سید داود غزنوی سے ملاقات کے لیے لاہور آئے تھے۔ انہوں نے کہا: ابوبکر! تین زبانیں سیکھو، عربی، اردو، انگریزی۔ ایک زبان میں اتنی مہارت حاصل کرو کہ آپ اسے خوب لکھ بول سکیں، دوسری دو زبانوں کو بقدر ضرورت سیکھ لو۔ رحمھم اللہ جمیعًا۔

(درسِ نظامی کی اِصلاح اور ترقی، ص: 161)

(باب اوّل)

غزنوی خاندان
اور
اُس کی خدمات

خاندانِ غزنویہ

تحریر: مولانا عبدالعظیم انصاری

سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی ذات ستودہ[1] صفات، مجموعہ اوصافِ حسنہ اور پیکرِ فضائل و محاسن تھی۔ آپ کی ذاتی خوبیاں اَن گنت اور بے شمار ہیں، جو حیطۂ تحریر سے باہر ہیں۔ آپ نے علم و عمل، تقویٰ و طہارت اور دیگر اوصاف میں جو بلند مقام حاصل کیا۔ اس میں آپ کے خاندان کے پس منظر کا بہت بڑا دخل ہے۔ جس نے آپ کی سیرت اور عمل و کردار کو جلا بخشی اور اس گئے گزرے زمانہ میں آپ گوہر شب تاب اور آفتاب [و] مہتاب کی طرح چمکے اور مینارۂ نور کی حیثیت حاصل تھی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ جس سلسلۃ الذہب کی آپ مرصع کڑی ہیں۔ اس عالی خاندان کا اختصار کے ساتھ ذکر کروں تا کہ یہ ذکرِ خیر میری نجات کا باعث بھی ہو جائے۔

أحب الصالحين ولست منهم
لعل الله يرزقني صلاحا

خاندانِ غزنویہ نے برصغیر پاک و ہند میں دینی شعور پیدا کرنے، قرآن و سنت کی اشاعت اور اسلام کی صحیح تعلیم و تربیت اجاگر کرنے میں وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں جس کی مثال نہیں ملتی۔ دینی تعلیمات کے فروغ، توحید و سنت کی اشاعت، تبلیغ و اصلاح کی سعی کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس، تعلق باللہ اور ذکرِ الٰہی کا درس بھی دیا اور اس میدان میں اپنا مثالی کردار اور عملی نمونہ پیش فرمایا۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ تھے، جو بدرجہ غایت پاک باز، مجسمہ اخلاص، انتہائی نیک نفس، توحیدِ خالص کے داعی اور مبلغ، کتاب و سنت کے شیدائی اور پیکرِ علم و عمل تھے۔ آپ اس وقت کے مشہور عالم دین، صوفی اور بزرگ ملا حبیب اللہ قندھاری رحمہ اللہ کے فیض یافتہ تھے۔

آپ افغانستان کے مشہور شہر غزنی میں پیدا ہوئے۔ غزنی پر اس وقت امیر دوست محمد کی حکمرانی تھی۔ حضرت عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ نے جب خالص توحید و سنت کی تبلیغ اور رسوماتِ بد اور شرک و بدعت کی مذمت شروع کی تو یہ حکمران آپ کے پورے خاندان کا دشمن ہو گیا اور انتہائی مخالفت شروع کر دی۔ اس کی خفگی کے پیشِ نظر اور بادشاہ کی خوشی حاصل کرنے کے لئے دوسرے سرکردہ افراد اور جاہ پرست لوگ بھی ظلم و تشدد اور بغض و عناد پر اتر آئے۔ اور حضرت عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کا وہاں ٹھہرنا مشکل اور جینا دوبھر کر دیا۔ چاروں طرف سے ایذا رسانی، طعن و ملامت اور سب و شتم کا سلسلہ

---

[1] قابلِ تعریف۔

شروع ہو گیا۔ دوست دشمن ہو گئے اور اپنے پرائے ہو گئے اور یہ وسیع وعریض سنگلاخ زمین آپ کے لئے تنگ ہو گئی اور ﴿وَضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ﴾ کا نمونہ سامنے آ گیا۔

وہ لوگ بدقسمت اور تیرہ بخت تھے جنہوں نے اس درِّ نایاب اور قیمتی متاع کو اپنے ہاتھوں سے ضائع کیا اور ملک بدر کر دیا۔ آپ پہاڑوں، جنگلوں اور غاروں میں چھپتے چھپاتے سفر کی اذیتیں اور کلفتیں سہتے، بھوک و پیاس کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے اپنے خاندان کو لے کر وہاں سے روانہ ہوئے اور اس حال میں بھی پولیس آپ کے تعاقب میں تھی۔ اپنے وطن سے جدائی، عزیز و اقارب سے مفارقت، جائداد اور مال ومنال سے محرومی، بھوک و پیاس کی شدت، بچوں کا رونا اور تڑپنا، اہل خاندان کی پریشانی کوئی چیز بھی آپ کو اس وادی خارزار میں قدم رکھنے سے روک نہ سکی اور آپ نے انبیاء کرام اور مبلغ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ ہجرت کو تازہ کر دیا اور خدا کا ذکر کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن رہے۔ ان کا جرم کیا تھا محض یہ کہ ﴿وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ﴾

کیا حضرت عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ حکومت میں شریک وسہیم ہونا چاہتے تھے یا مال وزر کا مطالبہ کرتے تھے؟ نہیں وہ تو اسلام کو اس صحیح صورت میں پیش کرنا چاہتے تھے جو تیرہ سو سال پہلے ہادیِ اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا لیکن پیٹ پرست ملاؤں، علماء سو اور مفاسد پسند درباریوں نے یہ برداشت نہ کیا، تاکہ ان کی دکانداری اور مفاد پر زد نہ پڑے۔ انہوں نے طرح طرح کے الزامات اور بہتان لگانے شروع کر دیئے اور دوست محمد کو ان سے بدگمان کر کے انہیں وطن سے نکالنے کا پروانہ حاصل کر لیا۔ اور آپ تکلیفیں، صعوبتیں اور مصائب و آلام برداشت کرتے ہوئے ہندوستان تشریف لے آئے اور امرتسر میں قیام فرمایا۔ اپنے مشن کی تکمیل اور توحید وسنت کی ترویج واشاعت کے لئے اپنی زندگی وقف فرما دی۔ عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے بارہ بیٹے تھے جو سب کے سب عالم و فاضل اور عابد وزاہد تھے۔ ان کی بدولت ہندوستان میں عموماً اور صوبہ پنجاب میں خصوصاً اسلام کو شوکت نصیب ہوئی اور توحید وسنت کا غلغلہ بلند ہوا۔ گھر گھر میں قال اللہ وقال الرسول کی آواز پہنچی اور لاکھوں لوگ اس چشمہ صافی سے فیض یاب ہوئے۔

ان کے تلامذہ میں ایسی ایسی یگانہ روزگار ہستیاں معرض وجود میں آئیں جو اپنے وقت کے امام، محدث، مفسر، بلند پایہ عالم وفاضل، عابد وزاہد، درویش صفت اور فرشتہ سیرت لوگ ثابت ہوئے۔

خاندانِ غزنویہ کی دینی، ملی، علمی، تبلیغی اور سیاسی خدمات بھلائی نہیں جا سکتی ہیں اور آنے والا مؤرخ اس خاندان کا ذکر سنہری حروف میں پیش کرے گا۔ میرا بچپن کا زمانہ تھا، گھر میں دین داری کا ماحول تھا۔ میرے چچا میاں الٰہی بخش مرحوم بڑے متدین اور نیک سیرت بزرگ تھے۔ علماء کرام کے ساتھ انہیں خاص لگاؤ تھا۔ خصوصاً غزنوی اور بھوجیانی خاندان کے علماء سے تو والہانہ عقیدت ومحبت تھی۔ موضع بھوجیاں ہمارے گاؤں سے قریباً سات آٹھ میل کی مسافت پر تھا جہاں مولانا فیض اللہ صاحب رہتے تھے۔ جو بہت بڑے عالم و فاضل تھے اور حضرت امام عبدالجبار بن حضرت

عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے فیض یافتہ تھے۔ مولانا فیض اللہ رحمہ اللہ کے خلف الرشید مولانا عبدالرحمان، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالرحیم تھے جو بڑے بزرگ اور عالم وفاضل تھے۔ مولانا فیض اللہ مرحوم کی صاحبزادی مولانا عبدالرحیم بن حضرت عبداللہ غزنوی کے صاحبزادے حافظ محمد زکریا غزنوی رحمہ اللہ امام شاہی مسجد صادق گنج (بہاول پور) کے نکاح میں ہے۔ اس طرح بھوجیانی خاندان اور غزنوی خاندان کے قریبی تعلقات ہیں۔

والد ماجد اکثر لاہور جا کر جمعہ کی نماز چینیانوالی مسجد میں مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ کی اقتداء میں ادا کرتے۔ اکثر فرمایا کرتے کہ جو لطف نماز پڑھنے کا مولانا عبدالواحد رحمہ اللہ کے پیچھے آتا تھا وہ اور کسی کے پیچھے نہیں آیا۔ جب نماز پڑھتے بڑے خشوع وخضوع، آہ وزاری کے ساتھ پڑھتے۔ خود بھی روتے اور سب نمازی بھی روتے۔ والد صاحب نے ان سے بیعت کی۔

اسی اثناء میں والد ماجد نے مجھے جنڈیالہ گرو کے قریب ایک گاؤں بھینی سدھواں کے دینی مدرسہ میں داخل کرادیا۔ اسی دوران معلوم ہوا کہ فلاں روز مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی رحمہ اللہ ترن تارن آنے والے ہیں اور وہاں سے بھوجیاں جائیں گے۔ میں بصد شوق ان کی زیارت کے لئے ترن تارن حاضر ہوا۔ حضرت میرے پہلے ہی ترن تارن کی مسجد اہل حدیث میں تشریف لے آئے تھے۔ مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا ایک سرخ وسفید نورانی شکل وصورت، گھنی اور سفید داڑھی والے بزرگ تشریف فرما تھے۔ جن کی پیشانی پر نور چمک رہا ہے اور چہرہ مبارک اتنا پُر ہیبت کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ اردگرد بہت سے لوگ خاموش بیٹھے ان کی گفتگو سننے میں محو ہیں۔ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور بڑے مؤدبانہ انداز میں سلام عرض کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے نہایت مشفقانہ طور پر میری طرف دیکھا، مصافحہ کیا اور ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ انہیں دیکھ کر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ یہ پہلا موقع تھا غزنوی خاندان کے کسی بزرگ کی زیارت کا موقعہ ملا۔

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

کچھ عرصہ بعد بھوجیاں کے مدرسہ میں آگیا اور پھر امرتسر مدرسہ غزنویہ میں داخل ہوگیا۔ اس وقت بیہقیِ وقت مولانا نیک محمد رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث تھے اور مدرسہ کا انتظام وانصرام مولانا احمد علی رحمہ اللہ برادر بزرگ مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے سپرد تھا، جن کی شخصیت بارعب اور پُرہیبت تھی۔ بڑے بڑوں کو ان کے آگے دَم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ مسجد غزنویہ کے متولی ڈپٹی محمد شریف کو ایک بار ایسی ڈانٹ پلائی کہ وہ کوئی جواب نہ دے سکا اور کئی روز تک آپ کا سامنا کرنے سے کتراتا رہا۔ حضرت عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے بارہ بیٹوں سے اس وقت صرف مولانا عبدالرحمٰن رحمہ اللہ زندہ تھے۔ وہ سیدھے سادے درویش صفت بزرگ تھے ان کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہوا۔ حضرت عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے جلیل القدر

فرزندوں میں یہ آخری نشانی تھے۔ باقی سب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

مولانا سید داؤد غزنوی اس وقت سیاست میں بھرپور حصہ لے رہے تھے۔ ان کے بھائی مولانا عبدالغفار بھی جلسوں وغیرہ میں شرکت کے لئے پابرکاب رہتے تھے۔ مولانا سید داؤد غزنوی کبھی کبھی امرتسر تشریف لاتے اور مدرسہ کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیتے۔ اس وقت ان کی جوانی کا عالم تھا، حسین وجمیل شکل وصورت اور وجیہ چہرہ جو دیکھتا' دیکھتا رہ جاتا۔ خاندانِ غزنویہ کے بزرگوں میں مولانا عبدالغفور رحمہ اللہ بھی اس وقت زندہ تھے۔ عالم وزاہد، متقی، پرہیزگار انہیں دیکھتے خدا یاد آجاتا۔ صبح کی نماز سے کچھ وقت پہلے مسجد میں تشریف لاتے، طلبا کو اٹھاتے، جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی تلقین فرماتے۔ خوب صورت چہرہ، موٹی آنکھیں، گھنی ڈاڑھی، سادہ لباس، پاؤں میں جرابیں ہوتیں، پائجامہ آدھی پنڈلی تک اونچا ہوتا، ہاتھ میں عصا رکھتے، بہت بھاری اور اونچی پگڑی پہنتے، بہت بارعب شخصیت تھے۔

سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ اور مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی مساعی سے اس وقت مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ 1954ء کا ذکر ہے کہ مولانا محمد اسحاق رحمانی رحمہ اللہ نے مجھے فرمایا کہ تمہاری خدمات کی مرکزی دفتر میں ضرورت ہے۔ چنانچہ ان کے ارشاد اور مشورہ سے میں نے مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کے دفتر واقع شیش محل روڈ لاہور میں کام شروع کر دیا اور ان کی وفات تک ساتھ رہا۔ مولانا مرحوم کی ذات گرامی، بلند شخصیت، علم وفضل، زہد وتقویٰ، علمی تفوق، ملکی ملی ودینی خدمات، تقریر وتحریر، تدبر، بلند اخلاق، حسنِ عمل، خاندانی وقار، تنظیمی کارنامے، سیاسی سوجھ بوجھ، تحریک آزادی کے سلسلہ میں قربانیاں، شفقت وبردباری۔ کتنی ہی خوبیاں ہیں جن پر علیحدہ علیحدہ ایک ایک کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ افسوس کہ جماعت کے کسی بزرگ نے ابھی تک اس طرف توجہ نہیں فرمائی۔ مولانا اسحاق بھٹی صاحب اس کے اہل ہیں، کاش کہ وہ اس طرف توجہ فرمائیں۔ [1]

مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ جو خود بھی متذکرہ بالا اوصاف سے متصف تھے اس عظیم خاندان کی آخری یادگار تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، رحمہم اللہ اجمعین [2]

---

[1] مولانا محمد اسحاق بھٹی مرحوم نے اپنی مختلف کتب اور کئی جرائد میں اکثر غزنوی علماء پر مضامین تحریر کیے ہیں جس کی تفصیل اُن کے مضمون میں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ مولانا بھٹی کے متعلقین کو وہ تمام مضامین یکجا کر دینے چاہئیں۔ (مرتب)

[2] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

غزنوی خاندان

تحریر: مولانا محمد اسحاق بھٹی

پنجاب کے اہلحدیث خاندانوں میں غزنوی خاندان نے علمی، تدریسی اور تصنیفی واشاعتی میدان میں بڑی شہرت پائی۔ اس کے ساتھ ہی نیکی اور صالحیت میں بھی اس خانوادے کے علمائے کرام کا مرتبہ بہت بلند رہا۔

خاندان کی مرکزی شخصیت:

اس خاندان کا آغاز افغانستان کے علاقہ غزنی سے ہوا۔ اس کی مرکزی شخصیت حضرت سید عبداللہ غزنوی تھے جن کا دست یاب مختصر نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ بن محمد بن محمد بن محمد شریف عمر زئی غزنوی۔ سید عبداللہ غزنوی جنہیں زہد وعبادت میں یگانۂ زماں کی حیثیت حاصل تھی، 1230ھ (1815ء) کو ضلع غزنی کے ایک مقام قلعہ بہادر خیل میں پیدا ہوئے۔

والدین نے ان کا نام محمد اعظم رکھا تھا، لیکن انہوں نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں اور تحصیل علم اور اس پر عمل ان کا شیوۂ حیات بنا تو خود اپنا نام عبداللہ رکھ لیا اور اسی نام سے پہچانے گئے فرماتے ہیں:

''محمد کے اعظم از کائنات، افضل از مخلوقات است، ہماں رسول اللہ ہست تسمیہ ما عبداللہ خوب است''[1]

''محمد کا اسم گرامی رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہی کو زیب دیتا ہے جو تمام کائنات سے معظم اور سب مخلوقات سے افضل ہیں۔ ہمارا نام تو عبداللہ ہی بہتر ہے۔''

عبداللہ نام میں اللہ کی الوہیت اور بندے کی عبودیت کا اظہار پایا جاتا ہے اور ان کے نزدیک اصل چیز یہی تھی۔ حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ صغرسنی میں ہے حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ علوم مروجہ کی تحصیل انہوں نے اپنے عہد اور وطن کے غزنوی علماء سے کی۔ ان کے فہم اور ادراک کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے مشکل مسائل فوراً ان کے ذہن کی گرفت میں آجاتے اور انہیں پوری وضاحت سے فرما دیتے تھے۔ غزنی کا کوئی عالم مروجہ علوم کے کسی پہلو میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت قندھار میں ملا حبیب اللہ قندھاری کا سلسلہ درس جاری تھا جو اپنے زمانے کے ممتاز عالم اور معروف مصنف تھے، حضرت سید صاحب ان کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان سے استفادہ کیا۔ ملا صاحب ممدوح نے اپنے اس شاگرد کی قوتِ فہم کے متعلق فرماتے ہیں:

---

[1] سوانح عمری مولانا عبداللہ غزنوی از مولانا غلام رسول قلعوی: ص، 28

"مسائل دینیہ راچناں کہ ایں شخص می فہمد من خود نمی فہمم"

"دینی مسائل کو جس طرح یہ شخص سمجھتا ہے میں نہیں سمجھتا۔"

حضرت سید صاحب نے علم حدیث کی تحصیل دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کی۔ یہ 1857ء کا زمانہ تھا اور سخت تکلیف دہ حالات۔ چاروں طرف سے انگریزی حکومت کی طرف سے گولیاں چل رہی تھیں اور بموں کے دھماکے ہو رہے تھے۔ لوگ بے حد خوف زدہ تھے لیکن حضرت سید عبداللہ غزنوی اپنے رفقائے درس سمیت سب معاملات سے لاتعلق علم حدیث کی تحصیل میں مشغول تھے۔

سخت سزائیں:

حضرت سید ممدوح کے زمانے میں غزنی سمیت پورے افغانستان میں بدعات کا زور اور غیر دینی رسوم کا چلن تھا۔ لوگوں نے قرآن وحدیث کے احکام کو ترک کر دیا تھا اور اللہ کی توحید سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی جبکہ حضرت ممدوح قرآن وحدیث کے بہت بڑے مبلغ اور توحیدِ الٰہی کے عظیم داعی تھے۔ اس دعوت وتبلیغ کی بنا پر افغانستان کے علمائے سوء ان کی شدید مخالفت کرنے لگے تھے اور انہوں نے حکومت کو بھی ان کی مخالفت پر بہت اکسایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں اپنے تین بیٹوں (مولانا محمد، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالجبار) سمیت کابل کے قید خانے میں بند کر دیا گیا۔ جتنا عرصہ وہ جیل میں رہے سنگ دل حاکموں نے ان کو کھانے پینے کے لئے بھی کچھ نہیں دیا لیکن ان کے عقیدت مندوں کو ان کے حالات کا پتا چلا تو انھوں نے جیل میں ان کے لئے خورد ونوش کا سامان بھیجنا شروع کیا۔

حضرت عبداللہ غزنوی کو یکے بعد دیگرے افغانستان کے چار بادشاہوں نے ہدف اذیت بنایا جن کے علی الترتیب نام یہ ہیں:

① امیر دوست محمد خاں ② امیر شیر علی خاں ③ امیر محمد افضل خاں ④ امیر محمد اعظم خاں۔

بستی خیر دی آمد:

افغانستان کے ان حکمرانوں کے عہد حکمرانی میں حضرت عبداللہ غزنوی اور ان کے خاندان کو پندرہ سال کی طویل مدت تک بے حد تکلیفوں میں مبتلا رکھا گیا، اس ابتلاء میں افغانستان کے علمائے سوء کا پورا عمل دخل تھا۔ پھر سخت گرمی کے موسم میں ان کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو پیدل پشاور پہنچایا گیا۔ کچھ دن یہ لوگ پشاور رہے، پھر لاہور چلے گئے اور لاہور سے نکل کر امرتسر کے قریب بستی خیر دی میں جا پڑاؤ کیا۔ یہ آج سے کم وبیش ڈیڑھ سو سال قبل (1840ء) کی بات ہے۔ اس زمانے میں نہ خبر رسانی کا موجودہ تصور تھا، نہ سفر کے لئے آسان ذرائع کا کہیں وجود تھا۔ نہ سڑکیں تھیں اور نہ بسیں اور ریلیں۔ لوگ یا پیدل سفر کرتے تھے یا اونٹوں، گھوڑوں اور خچروں پر اپنی منزل کو پہنچتے تھے۔ غزنوی خاندان کا یہ ستم رسیدہ قافلہ جوں ہی بستی خیر دی کے پہنچا، ان کی خدمت میں پنجاب کے دور دراز علاقوں سے آنے والے لوگوں کا

تانتا بندھ گیا۔ قدرتی طور پر لوگوں میں مشہور ہوگیا کہ امرتسر کے نزدیک بستی ''خیر دی کے'' میں غزنی سے نہایت متقی اور صالح لوگ آئے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ حضرات یا عربی بولتے تھے یا فارسی اور پشتو۔ علماء کے علاوہ ان کی زبان کوئی نہیں سمجھتا تھا، تاہم کثیر تعداد میں لوگ ان کی خدمت میں آئے۔ میرے پڑدادا میاں امام الدین اور ہمارے خاندان کے ایک بزرگ حاجی نور الدین نے بھی ان کی خدمت میں حاضری دی اور تین دن اور تین راتیں ان کے ہاں قیام رہا۔ پھر ان کو حضرت سید صاحب ممدوح نے حضرت مولانا محی الدین عبد الرحمان لکھوی کی خدمت میں ''لکھوکے'' بھیج دیا تھا اور ان کے حلقہ بیعت سے منسلک ہو گئے۔

ضلع امرتسر کے انگریز حاکموں سے کسی نے کہا کہ بستی خیر دی کے میں حکومت کے باغی لوگ آئے ہیں۔ حکومت نے اس شخص کو طلب کیا جن کے ہاں وہ مقیم تھے۔ انھوں نے جواب دیا مجھے نہیں معلوم یہ کون لوگ ہیں، لیکن جب سے آئے ہیں اللہ کے دین کی تبلیغ ہو رہی ہے اور نیک لوگ ان کے پاس آتے ہیں۔ ہمارے گاؤں اور میرے گھر میں اللہ کی رحمت کا نزول ہو رہا ہے۔ ہم ان نیک سیرت لوگوں کو یہاں سے نہیں نکالیں گے، یہ خود ہی چلے جائیں تو ان کی مرضی۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد یہ قافلہ امرتسر شہر چلا گیا اور پھر وہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔

حکمرانوں کا انجام:

اب دیکھتے ہیں ان کے غزنی سے نکلنے کے بعد وہاں کیا صورتِ حال پیدا ہوئی۔

بہت جلد وہاں انقلاب کا تباہ کن ریلا آیا جس کے نتیجے میں افغانستان کی حکومت ختم ہوگئی اور حکمران خاندان کے بہت سے لوگ پشاور، پنجاب اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں انگریزی حکومت کی قید میں آئے اور کئی قسم کی اذیتوں سے دو چار ہوئے۔ امیر دوست محمد خاں افغانستان کا پہلا حکمران تھا، جس نے کلمہ حق کہنے کی پاداش میں حضرت سید عبداللہ غزنوی اور ان کے دودمانِ عالی قدر کو نشانہ ستم بنایا اور پھر جلد ہی اس شاہی خاندان کا نام ونشان مٹ گیا۔ اب غزنوی خاندان تو موجود ہے اور کسی نہ کسی انداز میں علمی سرگرمیاں بھی جاری ہیں لیکن افغانستان کے اس حکمران خانوادے کے اس دنیا میں کوئی آثار باقی نہیں رہے۔

قبولیت دعا:

حضرت سید عبداللہ مستجاب الدعوات بزرگ تھے، اس سلسلے میں ان کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ ان کا دل خشیت الٰہی سے لرزتا رہتا تھا اور باطن کی دنیا کو روشنی کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ علم وحلم، صبر وقناعت اور زہد واتقا کا چلتا پھرتا پیکر تھے، گفتار وکردار میں اللہ کی برہان۔

یہاں حضرت سید عبداللہ صاحب کی قبولیت دعا کے بہت سے واقعات میں سے صرف ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس کے راوی حضرت مولانا عبد القادر قصوری کے فرزند کبیر مولانا محی الدین احمد قصوری مرحوم ومغفور ہیں۔ مولانا محی

الدین احمد قصوری لکھتے ہیں:

''نماز عصر کے بعد مولانا عبداللہ غزنوی کا خاص وقت دعا تھا، جن لوگوں کو دعا کرانا ہوتی وہ اس وقت ان کی خدمت میں پہنچ جاتے۔ مولانا عبدالقادر قصوری کے پھوپھا مولوی غلام قادر کو مولانا عبداللہ صاحب سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ وہ امرتسر گئے تو نماز کے بعد اپنا تعارف کرایا اور اپنے خاندان کا ذکر کیا۔ فرمایا: اگر تمہارا تعلق اس خاندان سے ہے تو ضرور علم سے کچھ دسترس رکھتے ہو گے۔ انھوں نے ازراہِ انکسار عرض کیا: ''کچھ شدبد رکھتا ہوں۔'' ایک دن مولانا نے اپنی کسی کتاب کا قلمی نسخہ نکالا اور مولوی غلام قادر سے فرمایا کہ کتابت کر سکتے ہو تو یہ چھوٹی سی کتاب نقل کر دو۔ ان کا خط بہت اچھا تھا۔ کئی دن کے بعد جب نقل کر کے پیش خدمت کی تو بہت خوش ہوئے۔ ایک روز نماز عصر کے بعد غلام قادر نے عرض کیا: ''حضرت میرے لئے دعا فرمائیں۔'' پوچھا: ''کیا دعا کروں؟'' عرض کیا: ''مجھے بعض دفعہ دردِ سر کا ایسا شدید دورہ پڑتا ہے کہ بے حال ہو جاتا ہوں اور نمازیں قضا ہو جاتی ہیں۔ دعا فرمائیں کہ ایک تو یہ دردِ سر کی شکایت دور ہو جائے۔ دوسرے نماز باجماعت قضا نہ ہو۔'' (تیسری کسی اور چیز کے لئے دعا کی درخواست کی جو مضمون نگار مولانا محی الدین احمد قصوری کو یاد نہیں رہی) حضرت مولانا نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور فرمایا: ''قبول شد ان شاء اللہ۔'' مولوی غلام قادر اس وقت بالکل جوان تھے۔ انہوں نے ستر (70) سال کی عمر پائی، یعنی دعا کے کم وبیش پچاس سال زندہ رہے۔ اس طویل مدت میں نہ کبھی دردِ سر ہو نہ سفر وحضر میں کبھی نماز باجماعت قضا ہوئی۔ زندگی کی آخری رات عشاء کی نماز باجماعت ادا کی۔ تہجد کی نماز پڑھ چکے تھے کہ پیغامِ اَجل آ گیا۔ ذکر الٰہی شروع کیا اور فجر کی نماز سے قبل جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔'' (ملاحظہ ہو: ''سیدی وابیؒ'' از ابوبکر غزنوی)

حضرت عبداللہ صاحب کی وفات:

حضرت سید عبداللہ غزنوی کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار اوصافِ حسنہ سے نوازا تھا۔ اس عالم ذی مرتبت کی ولادت 1230ھ (1815ء) کو قلعہ بہادر خیل (ضلع غزنی افغانستان) میں ہوئی اور انہوں نے منگل کی شب 15 ربیع الاول 1398ھ (15 فروری 1888ء) کو امرتسر میں وفات پائی۔ بدھ کی روز زوالِ آفتاب کے بعد نماز ظہر سے پہلے دفن کئے گئے۔ ہر طبقہ وخیال کے کثیر تعداد میں لوگوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ امیر، غریب، رئیس، علماء، طلباء سب شریک جنازہ تھے۔ ازدحام کی وجہ سے ہر ایک کے لئے جنازے کو کندھا دینا ممکن نہ رہا تھا۔ حضرت کے فرزند ذی قدر حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اس صورتِ حال کو دیکھ کر لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے اس قول کی سچائی کا پتا اس دن چلا کہ الفرق بيننا وبين أهل البدع يوم الجنائز (ہمارے اور اہل بدعت کے درمیان فرق جنازوں کے دن معلوم ہوتا ہے۔)

کئی دن لوگ ان کی قبر پر جنازہ پڑھتے اور روتے اور آنسو بہاتے رہے۔ ہندوستان کے بہت سے مقامات پر ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔

اللّٰھم أکرم نزله ووسع مدخله وأدخله جنة الفردوس.

غزنوی علماء کی تصنیفی اور اشاعتی خدمات:

حضرت مرحوم کی اولاد نرینہ بارہ بیٹے تھے۔ ان حضرات نے تصنیفی، اشاعتی اور تدریسی اعتبار سے بے حد خدمات سرانجام دیں، جن کے متعدد پہلوؤں میں انھیں اولیت حاصل ہے۔ اس کی کچھ تفصیل آئندہ سطور میں بیان کی جاتی ہے۔

1: تفسیر جامع البیان مع حاشیہ: جامع البیان قرآن مجید کی مشہور تفسیر ہے اور اہل علم میں متداول۔ اس پر حاشیہ مولانا عبداللہ غزنوی کے سب سے بڑے بیٹے مولانا محمد غزنوی نے لکھا۔ یہ تفسیر مع حاشیہ مولانا محمد غزنوی 1892ء میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس تفسیر کے ساتھ مندرجہ ذیل تیرہ کتابیں بھی پہلی دفعہ چھپیں:

- اکلیل فی استنباط التنزیل: امام جلال الدین سیوطی۔
- مفحمات الاقران فی مہمات القرآن: امام جلال الدین سیوطی۔
- تفسیر سورۃ النور: امام ابن تیمیہ۔
- فوائد شتی: تفسیر کے سلسلے کے مختلف علمی فوائد۔
- خاتمة الطبع المشتملة علی الفوائد المهمة۔
- فوائد شریفیہ: امام ابن تیمیہ۔
- فتیا فی مسئلة کلام الله تعالیٰ: امام ابن تیمیہ۔
- کتاب الرد علی الجهمية: امام احمد بن حنبل۔
- رسالة فی القرآن: امام ابن تیمیہ۔
- الفوز الکبیر فی اصول التفسیر: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔
- احادیث التوحید ورد الشرك۔
- اسباب الاحتراز من الشیطان۔

غالباً مولانا محمد غزنوی صوبہ پنجاب کے (یا شاید ہندوستان کے) پہلے عالم ہیں جنھوں نے اس تفسیر کے عربی میں حواشی لکھے۔ یہ تفسیر مع حواشی مطبع فاروقی دہلی کے علاوہ جموں کشمیر کے ایک بزرگ میاں فیروز الدین مرحوم نے بھی (جو مولانا محمد غزنوی کے عقیدت مند تھے) شائع کی تھی اور اسے مفت تقسیم کیا گیا تھا۔ شنید ہے

کہ اب یہ تفسیر ہمارے دوست مولانا عارف جاوید محمدی کی تحریک سے کویت کا ایک ادارہ شائع کر رہا ہے (یا کرنا چاہتا ہے) اس فقیر سے انہوں نے مولانا محمد غزنوی کے حالات لکھوائے ہیں۔[1]

2: حمائل غزنویہ: یہ وہ حمائل غزنویہ ہے جس کے ترجمہ و حواشی نواب وحید الزمان خان کے تحریر فرمودہ ہیں۔ یہ حمائل مولانا محمد غزنوی کے فرزند گرامی مولانا عبدالاول غزنوی نے مطبع القرآن والسنۃ امرتسر سے شائع کی۔

3: حمائل غزنویہ: یہ وہ حمائل غزنویہ ہے جس کا ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلوی کا ہے اور فوائد سلفیہ اور حواشی مولانا عبد الاول غزنوی کے۔ اس حمائل غزنویہ نے اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر بڑی شہرت پائی اور بہت مقبول ہوئی۔ اب نایاب ہے۔

4: مصفیٰ مع مسویٰ: یہ دو کتابیں ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف کردہ ہیں اور مؤطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی شرحیں ہیں۔ مسویٰ فارسی میں ہے مصفیٰ عربی میں۔ یہ دونوں شرحیں ایک ساتھ پہلی مرتبہ مولانا محمد غزنوی نے دہلی سے شائع کیں۔

5: کشف المغطا: یہ مؤطا امام مالک کا اردو ترجمہ ہے جو نواب وحید الزمان نے کیا۔ اسے پہلی دفعہ مولانا محمد غزنوی نے مطبع مرتضوی دہلی سے شائع کیا۔

6: ریاض الصالحین: حضرت مولانا عبداللہ غزنوی کے ایما سے پہلی دفعہ لاہور سے شائع ہوئی اور اس کا اردو ترجمہ مولانا ممدوح کے ایک مرید مولانا احمد الدین کوموی نے کیا۔ "کوم" ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کا ایک گاؤں ہے۔ یہ ریاض الصالحین کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔ مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی نے اپنی تصنیف "ہندوستان کے اہل حدیث کے علمی خدمات" (ص:46) اور ان کے حوالے سے سید ابوبکر غزنوی نے "سیدی وابی" (ص: 234) میں ریاض الصالحین کو مولانا عبدالاول غزنوی کا ترجمہ قرار دیا ہے، جو صحیح نہیں۔ مولانا ابویحییٰ امام خان نوشہروی کی کتاب کے حوالے سے بعض دیگر اصحابِ قلم نے بھی اسے مولانا عبدالاول غزنوی کا ترجمہ لکھا ہے، جبکہ (جیسا کہ عرض کیا گیا) یہ مولانا احمد الدین کوموی کا ترجمہ ہے جو حضرت سید عبداللہ غزنوی کے مرید تھے اور انھی نے ان سے ترجمہ کروایا تھا۔

7: مشارق الانوار: یہ حدیث کی مشہور کتاب ہے اور امام حسن بن محمد صغانی لاہوری (م 650ھ/1252ء) کی تصنیف ہے۔ کسی زمانے میں یہ باقاعدہ نصاب درس میں شامل تھی۔ پہلی مرتبہ مع ترجمہ تحفۃ الاخیار علمائے غزنویہ نے شائع کی۔

8: ایقاظ الھمم لاولي الابصار از فلانی: یہ کتاب ردتقلید سے متعلق ہے۔ حضرت عبداللہ غزنوی کے

---

[1] یہ تفسیر "دارغراس" کویت سے مولانا صلاح الدین مقبول احمد کی تقدیم اور مراجعت کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ (مرتب)

ایما پر میاں عبد العزیز مالواڈا مرحوم (بار ایٹ لا) کے والد مکرم مولوی الٰہی بخش مرحوم کے خرچ سے پہلی دفعہ لاہور میں چھپی۔

9: ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح: مشکوٰۃ کا اردو ترجمہ مولانا عبد الاول غزنوی نے کیا، کئی بار چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ کچھ عرصہ پیشتر یہ کتاب ہمارے دوست مکتبہ محمدیہ اردو بازار کے عبد الرحمان صاحب نے نہایت اہتمام سے بہترین انداز میں شائع کی ہے جو کہ پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔

10: نصرۃ الباری ترجمہ صحیح بخاری: مولانا عبد الاول غزنوی نے نصرۃ الباری کے نام سے صحیح بخاری کا اردو ترجمہ مع حواشی شروع کیا تھا صرف آٹھ پارے مکمل ہو سکے۔

11: انعام المنعم ترجمہ صحیح مسلم: مولانا عبد الاول غزنوی نے صحیح مسلم کا اردو ترجمہ انعام المنعم کے نام سے شروع کیا تھا۔ اس کا صرف ایک پارہ چھپا تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ترجمہ مکمل ہو گیا تھا کہ نہیں۔

12: اجتماع الجیوش الاسلامیۃ علی غزو المعطلۃ والجھمیۃ: یہ امام ابن قیم کی تصنیف ہے پہلی مرتبہ مولانا عبد الغفور اور عبد الاول غزنوی نے مطبع القرآن والسنۃ امرتسر سے شائع کی۔

13: رسالۃ الحقیقۃ والمجاز: یہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ہے جو پہلی دفعہ مولانا عبد الغفور اور مولانا عبد الاول نے شائع کیا۔

14: جلاء الافھام فی الصلاۃ والسلام علی خیر الانام: امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف مولانا عبد الغفور اور عبد الاول غزنوی نے مولانا عبد القدوس بن مولانا عبد اللہ غزنوی کی کوشش سے پہلی مرتبہ مطبع القرآن والسنۃ امرتسر سے شائع کی۔

15: شرح حدیث النزول: امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف جو پہلی دفعہ مولانا عبد الغفور اور عبد الاول غزنوی نے مطبع القرآن والسنۃ امرتسر سے شائع کی۔

16: شرح خمسین: ابن رجب حنبلی کی تصنیف، اسے مولانا عبد الغفور و عبد الاول غزنوی نے شائع کیا۔

17: تحفۃ العراقیۃ فی الاعمال القلبیۃ: امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف جو مولانا عبد الغفور و مولانا عبد الاول غزنوی نے پہلی دفعہ امرتسر سے شائع کی۔

18: فتویٰ الحمویہ: اس کے مصنف بھی امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اسے بھی پہلی مرتبہ امرتسر سے مولانا عبد الغفور و عبد الاول غزنوی نے شائع کیا۔

19: البیان المبدی لشناعۃ القول المجدی: علامہ سلیمان بن سحمان نجدی اس کے مصنف ہیں۔ اسے بھی مولانا عبد الغفور و عبد الاول غزنوی نے پہلی مرتبہ امرتسر سے شائع کیا۔

20: مجموعة التوحيد النجدية ومجموعة الحديث النجدية: اسے بھی پہلی مرتبہ علمائے غزنویہ نے مطبع انصاری دہلی سے شائع کیا۔

21: فتح المجید شرح کتاب التوحید: یہ کتاب مولانا عبدالغفور اور عبدالاول غزنوی کے اہتمام میں پہلی دفعہ مطبع القرآن والسنۃ امرتسر سے اشاعت پذیر ہوئی۔

22: اثبات علو الرب ومباينته عن الخلق: یہ حضرت امام عبدالجبار غزنوی کی تصنیف ہے اور عربی میں ہے۔

23: اثبات الالهام والبيعة: یہ بھی مولانا عبدالجبار غزنوی کی تصنیف ہے اور اردو میں ہے۔

24: اعانة الملة الاسلامية: مولانا عبدالجبار غزنوی کا یہ رسالہ اردو میں ہے اور کفار کی ملازمت کے عدم جواز سے متعلق ہے۔

25: الاربعين بان ثناء الله ليس على مذهب المحدثين: یہ بھی مولانا عبدالجبار کا رسالہ ہے اور عربی میں ہے۔[1] اس میں ان چالیس مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی تعبیر میں ان کے نزدیک مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم نے اسلاف کے متعین کردہ خطوط سے مختلف زاویۂ فکر کا اظہار کیا۔ یہ رسالہ ان مباحث پر محیط ہے جو علمائے غزنویہ اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے درمیان کسی زمانے میں موضوعِ گفتگو رہے۔ یہ ایک دور کی بات تھی، اب ان مباحث سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض مسائل میں تعبیر کا اختلاف زمانۂ قدیم میں بھی اہل علم میں پایا جاتا تھا۔ اسے بہت زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔

26: معارج الوصول بان الاصول والفروع بينه الرسول: یہ حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی مرحوم کا رسالہ ہے۔

27: تحشیہ داری: حضرت مولانا عبداللہ غزنوی کے لائق فرزند مولانا عبدالرحیم غزنوی نے حدیث کی مشہور کتاب سنن دارمی پر عربی میں حاشیہ لکھا تھا۔ افسوس کے یہ حاشیہ گم ہو گیا، اس کا آخری حصہ البتہ قلمی صورت میں کسی زمانے میں موجود تھا۔ اب پتہ نہیں موجود ہے کہ نہیں۔

کسی زمانے میں مولانا عبدالواحد غزنوی اور مولانا عبدالرحیم غزنوی (دونوں بھائی) تجارت کی غرض سے کویت گئے تھے، وہیں ان کی پہلی مرتبہ ملک عبدالرحمان آل سعود اور ان کے صاحب زادے ملک عبدالعزیز (ابن سعود) سے ملاقات ہوئی جو اس وقت کویت میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے اور نجد پر حملہ کر کے شریف حسین سے اپنا ملک واپس لینے کے خواہ تھے۔ ان دونوں باپ بیٹے نے ان غزنوی علماء سے تعلیم حاصل کی۔ پھر غزنوی علماء اور سعودی

---

[1] یہ رسالہ "الاربعين فى ان ثناء الله ليس على مذهب المحدثين" مولانا عبدالحق غزنوی تلمیذ رشید مولانا سید عبداللہ غزنوی کی تصنیف ہے اور اردو میں ہے۔ (مرتب)

حکمرانوں میں تعلقات پیدا ہو گئے۔غزنوی علماء کی کوشش سے کویت سے امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی تصانیف امرتسر آئیں جو اس خاندان کے علماء کرام نے شائع کیں، جس کا تذکرہ گزشتہ سطور میں خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آیا۔

علمائے غزنویہ میں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی، ان کے برادرانِ صغیر مولانا عبدالغفار غزنوی، حافظ سلیمان غزنوی اور ان کے عم زاد بھائی مولانا اسماعیل غزنوی بن حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی نے برصغیر کی آزادی کے لیے سیاسیات میں بھی حصہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

علاوہ ازیں ان علمائے کرام نے برصغیر میں وعظ و تقریر کے ذریعے قرآن وحدیث کی بڑی تبلیغ کی اور بے شمار لوگوں نے ان کی تبلیغی مساعی سے اثر پذیر ہو کر راہِ راست اختیار کی اور توحید کی سیدھی راہ پر گامزن ہونے کا شرف حاصل کیا۔ اللہ کی مہربانی سے ان کی صدائے حق اس قدر پر اثر تھی کہ جہاں جاتے اور کلمۂ حق بیان کرتے، لوگ ہمہ تن گوش ہو کر ان کے ارشادات سنتے اور انھیں لائق عمل ٹھہراتے۔

غلافِ کعبہ:

ایک بہت بڑی خدمت جو غزنوی علمائے کرام نے سرانجام دی، وہ غلاف کعبہ کی تیاری اور اسے کعبۃ اللہ کی زینت بنانے سے متعلق ہے۔اس کی تفصیل حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ہفت روزہ ''توحید'' کے مئی جون 1928ء کے شماروں میں مندرج ہے، یکم مئی 1928ء کو دس بجے شب کی ٹرین سے حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی (جو اس وقت لاہور کی مسجد چینیاں والی کے منصب امامت و خطابت پر متمکن تھے) لاہور سے امرتسر تشریف لائے اور یہاں سے مولانا محمد داؤد غزنوی اور محمد اسماعیل غزنوی دیگر رفقائے کرام کے ساتھ غلاف لے کر امرتسر سے ٹرین پر سوار ہو کر بمبئی کو روانہ ہوئے۔

8 مئی 1928ء کو بمبئی سے یہ قافلہ جو مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا محمد اسماعیل غزنوی، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا حافظ محمد اسلم جیراج پوری، مولانا خواجہ عبدالحیٔ صاحب اور بعض دیگر حضرات پر مشتمل تھا، ایس ایس انگلستان جہاز پر سوار ہوا۔ نماز کمیٹی نے جہاز میں نماز کے لئے بہت اچھا انتظام کیا تھا۔ جہاز کے روانہ ہونے سے قبل اس پر نجدی جھنڈا لہرا دیا گیا، جس پر نہایت خوب صورتی سے کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ بمبئی میں موجود اسلامی ملکوں کے نمائندے، نیز رؤسائے شہر بڑی تعداد میں قافلے کے رخصت ہونے کے وقت بندرگاہ پر موجود تھے۔ غلاف کعبہ نہایت حفاظت کے ساتھ صندوق میں بند تھا۔ لوگوں کی بے حد خواہش کے باوجود یہ صندوق بمبئی میں نہیں کھولا گیا۔

18 مئی کو جمعۃ المبارک کی صبح کو طبی معائنے کے بعد ایس ایس انگلستان جہاز جدہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ اس وقت حکومتِ نجد کا قومی جھنڈا جہاز کے مستان پر لہرا رہا تھا۔ جدہ کے مقامی حاکموں اور زعمائے شہر کا مجمع جس میں جدہ

کے گورنر، وزیر مال، پولیس کمشنر، ڈپٹی کمشنر، صدر بلدیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جلالۃ الملک عبدالعزیز ابن سعود کی طرف سے جہاز کے تختے پر محمل پارٹی کے استقبال کے لیے آئے۔ محمل مقدس کو ان حضرات کے سپرد کیا گیا، جسے نہایت حفاظت کے ساتھ بذریعہ کشتی بندرگاہ کے کنارے تک پہنچایا گیا۔ فوج کے افسروں اور شہریوں نے ساحل سمندر پر غلافِ کعبہ لانے والے وفد کا عظیم الشان استقبال کیا۔

غلافِ کعبہ سے متعلق ایڈریس:

ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں یہ واقعہ نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ اسلام کی تیرہ صدیاں گزر گئیں مگر اب تک اہل ہند کی قسمت میں ایسا مبارک دن نہیں آیا تھا کہ اس ملک کو بیت اللہ العظیم پر غلاف پہنانے کی سعادت نصیب ہوتی۔ یہ سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) کی پُرخلوص اسلامی اخوت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو اس سعادتِ عظمیٰ سے شرف اندوز ہونے کا موقع عطا فرمایا۔

مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد 25 مئی 1928ء (5 ذی الحجہ 1346ء) جمعۃ المبارک کے روز بہ وقت تکمیل غلافِ کعبہ مولانا داؤد غزنوی کے چچازاد بھائی مولانا اسماعیل غزنوی نے عربی زبان میں اڈریس پیش کیا۔ اس کا عنوان تھا: "کسوۃ الکعبۃ المکرمۃ"

یہ نہایت پر وقار تقریب تھی جو روحانیت کی فضاؤں میں منعقد کی گئی تھی۔ یہ ایڈریس نہایت اہتمام اور توجہ سے سنا گیا۔ اس میں غلافِ کعبہ کی تاریخ واہمیت اور اسے بیت اللہ پر چڑھانے کے مختلف ادوار کی تفصیل خوب صورت اور تحقیقی انداز میں بیان کی گئی ہے۔ ایڈریس میں جلالۃ الملک سمیت شہزادگانِ عظام، علمائے کرام، ملک کے قاضی القضاۃ اور ارکانِ دولت، رؤسائے سلطنت اور مندوبین و حجاج کرام موجود تھے۔ یہ ایڈریس 6 جون 1928ء کے ہفت روزہ توحید (امرتسر) میں شائع ہوا تھا۔ اس سے اگلے ہفتے 13 جون 1928ء کے اخبار ''توحید'' میں اس کا اردو ترجمہ معرضِ اشاعت میں لایا گیا۔ ترجمہ اگرچہ خاصا طویل ہے لیکن معلومات کا ایک جہان اس میں آباد ہے۔ آیئے ذیل کی سطور میں اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جلالۃ الملک!

آج کے دن مجھے یہ قابل صد فخر و مباہات عزت حاصل ہے کہ آپ کے عہدِ سعود میں غلاف کعبہ کی تکمیل کے بعد یہ اڈریس پیش کر رہا ہوں۔ اعلیٰ حضرت مجھ کو اجازت دیں کہ میں غلافِ کعبہ شریف کے متعلق چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اگرچہ غلافِ کعبہ کی مستند و مکمل تاریخ کا مواد کسی کتاب میں مسلسل نہیں ملتا لیکن مختلف کتب تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حرم پاک اپنے یوم تاسیس ہی سے مرجع خاص و عام بن گیا تھا اور نہ فقط عرب کے مختلف

حصوں کے باشندے بلکہ یہودی بھی اسے عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقدس عمارت کی تعظیم واجلال کی بنا پر غلافِ کعبہ پہنانے کا سلسلہ بھی قدیم زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔

غلافِ کعبہ کا آغاز:

عربوں میں یہ رسم مصریوں سے آئی اور یہودیوں کی وساطت سے آئی۔ مصری لوگ اپنے بادشاہوں کے مقبروں پر بڑے اعلیٰ قسم کے کپڑے کے غلاف چڑھایا کرتے تھے۔ یہودیوں نے اسی طرح اپنے بزرگوں کی قبروں پر چادریں ڈالنے یا غلاف چڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ عربوں کے نزدیک بیت اللہ شریف سے بڑھ کر اور کوئی مقام جلیل و محترم نہ تھا۔ اس لئے وہ اس بابرکت عمارت کو غلاف پہنانے لگے۔

ابتدائی حالت:

مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں غلاف سے متعلق کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ اکثر و بیشتر ٹاٹ یا چمڑے کے ٹکڑے جوڑ کر کعبے کی دیواریں ڈھانپ دی جاتی تھیں۔ آہستہ آہستہ قربانی کے جانوروں کی پر تکلف جھولوں سے جو بعد قربانی کعبے کی نظر کر دی جاتی تھیں، غلاف تیار ہونے لگا۔ لیکن نہ پارچے کی وضع وساخت کی متعلق کوئی پابندی تھی، نہ رنگ ایک ہوتا تھا اور نہ غالباً وقت کی کوئی خاص قید تھی، لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شاید سال بھر میں ایک مرتبہ نیا غلاف چڑھایا جاتا تھا۔

اسعد حمیری:

بادشاہوں میں سے غالباً سب سے پہلے ایک تاج دار ابوکرب اسعد حمیری نے کعبے کو غلاف پہنایا جبکہ وہ یثرب کی لڑائی سے واپس آیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسعد نہایت عقیدت مندانہ حیثیت سے ایک زرتار غلاف لایا تھا لیکن اہل مکہ نے اس کا خاطر خواہ استقبال نہ کیا اس پر وہ ناراض ہو گیا اور یہ کہہ کر مکہ والوں کو سارا غرور کعبے کی وجہ سے ہے، وہ اس مقدس عمارت کو ڈھا دینے کے درپے ہو گیا۔ اس ارادے کے ساتھ ہی اس پر بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ اسعد کو بتایا گیا کہ جب تک وہ انہدامِ کعبہ کے ارادۂ فاسد سے تائب نہ ہوگا، بیماری سے نجات نہ ملے گی۔ یہ سن کر اس نے توبہ کر لی اور جو غلاف لایا تھا اسے سچی عقیدت کے ساتھ کعبے کو پہنا دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسعد کے جانشین بھی مختلف اوقات میں غلاف چڑھاتے رہے۔

قصیؔ:

قریش میں سے قصیؔ نے غلاف کو زیادہ مستقل حیثیت دی، یعنی غلاف کی تیاری کے مصارف کا اندازہ کر کے ساری رقم مختلف قبائل پر تقسیم کر دی اور ہر سال یہ رقم قبائل سے وصول کر کے باقاعدہ غلاف چڑھایا جانے لگا، یہ رقم قصیؔ

کی اولاد نے بھی قائم رکھی۔ ابو ربیعہ نے تجارت میں بہت سی دولت پیدا کرلی تھی، اس لئے اس زمانے میں یہ دستور ہو گیا کہ ایک سال تنہا وہ غلاف چڑھاتا اور دوسرے سال قبائلِ قریش چڑھاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پرانے غلاف اتارے نہیں جاتے تھے۔

عہدِ اسلام:

8ھ میں مکہ فتح ہوا اور اس مقدس عمارت کی خدمت بلا شرکت غیرے مسلمانوں سے متعلق ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ نے 9ھ میں یمن کی باریک چادر کا غلاف چڑھایا اور اس کی قیمت بیت المال سے ادا فرمائی۔ نبی ﷺ کے بعد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی بیت المال کے خرچ سے غلاف چڑھایا۔ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ہر سال نیا غلاف چڑھاتے تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی یہی حالت قائم رہی۔ لیکن جب آپ کو پتا چلا کہ غلاف کا ایک ٹکڑا ایک حائضہ عورت کے جسم پر دیکھا گیا ہے تو خیال فرمایا کہ تقسیم کی صورت میں غلاف کی توہین ہوتی ہے۔ اس لئے پرانے غلاف کو اتار کر دفن کیا جانے لگا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے پرانے غلافوں میں سے دو غلاف بدستور رکھنے کا سلسلہ رکھنا شروع کر دیا تھا۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں غلاف کے متعلق زیادہ اہتمام شروع ہوگیا۔ یعنی کبھی سال میں دو بار، کبھی تین بار، کبھی ہر دوسرے مہینے کعبے کی پوشش بدلنے لگے۔ اس موقع پر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پرانے غلافوں کے دفن پر اعتراض کیا۔ یہ معاملہ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے پیش ہوا تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ پرانے غلاف کو فروخت کر کے اس کی قیمت فقراء اور مساکین میں بانٹ دی جایا کرے۔ اس وقت سے غلاف کے ٹکڑوں کی فروخت کا سلسلہ شروع ہوا، جس پر آج تک عمل کیا جاتا ہے۔ اگرچہ روپے کو مستحقین میں تقسیم کرنے کا سلسلہ باقی نہیں رہا لیکن امید ہے کہ جلالۃ الملک کی توجہ سے یہ نیک کام بھی جاری ہو جائے گا۔

بنو اُمیہ:

یزید بن معاویہ نے اپنے زمانے میں دیبا کا غلاف چڑھایا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی، عبدالملک بن مروان اور دوسرے اُموی خلیفہ سال میں دو دو تین تین مرتبہ غلاف چڑھاتے رہے۔ عام دستور یہ تھا کہ دیبا کا غلاف 8 ذی الحجہ کو اتار کر سفید کپڑے کا سادہ غلاف پہنا دیا جاتا تھا، اس خیال سے 8 ذی الحجہ کو تمام لوگ عرفات میں چلے جاتے ہیں۔ مبادا ان کی عدم موجودگی میں کوئی شخص غلاف پھاڑ دے۔

عباسیہ:

جب خلافت عباسیوں کے ہاتھ میں آگئی تو غلاف ان سے متعلق ہوگیا۔ مہدی عباسی نے 120ھ میں حج کیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ غلاف چڑھایا۔ اسی کے حکم سے تمام پرانے غلاف اتارے گئے اور کعبے کی دیواریں مشک و عنبر سے معنبر کی گئیں۔ مامون الرشید کے زمانے میں سال میں تین مرتبہ غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ آٹھویں ذی الحجہ کو دیبائے

سرخ کا، یکم رجب کو مصری کپڑے کا، عید الفطر کو دیبائے سفید کا۔ خلیفہ جعفر المتوکل علی اللہ کے زمانے میں ہر دوسرے مہینے دو غلاف بھیجے جانے لگے۔

سلاطین مصر:

جب عباسیوں کی سلطنت ختم ہو گئی تو مصر کے بادشاہ ملک منصور بن ملک ناصر بن قلادون نے غلاف اپنے ذمہ واجب ٹھہرا لیا اور قاہرہ کے قریب کے دو گاؤں اس مقصد کے لئے وقف کر دیئے۔ اسی زمانے سے غلاف خاص وضع کا بننے لگا، جس میں آیاتِ قرآنی اور کلمہ شریف بُنا جاتا تھا لیکن اور مقامات سے بھی غلاف آجاتے تھے۔

آلِ عثمان:

جب خلافت آلِ عثمان کے ہاتھ میں آگئی تو مصر سے غلاف کی آمد کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ سلطان سلیمان اعظم نے حکم دے دیا کہ وقف کردہ گاؤں غلاف کے خرچ کے لئے کافی نہ ہوں تو باقی مصارف خزانہ مصر سے ادا کئے جائیں۔ مصر کے میزانیہ میں غلاف کا خرچ 4 لاکھ گنی تھا۔

سعود بن عبدالعزیز اوّل:

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس وقت اختلال پیدا ہوا، جب سلطان سعود بن عبدالعزیز بن محمد بن سعود بانی خاندان سعودیہ نے حجاز پر قبضہ کیا۔ (1803ء) اس کی وجہ یہ ہوئی کہ مصر غلاف باجوں وغیرہ کے ساتھ مکہ معظمہ میں آیا کرتا تھا اور سلطان سعود حرم پاک میں ان ممنوعات کے ارتکاب کے روادار نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ مصریوں کو باجوں سے روکا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ غلاف کو تعزیہ کی صورت میں نہ لایا جائے لیکن مصری نہ رکے۔ ناچار سلطان سعود نے ان کا تعزیہ جلا دیا۔ سلطان موصوف نے اس موقع پر سلطان ترکی کو جو مکتوب بھیجا، وہ اس حقیقت کی قاطع شہادت ہے۔ مکتوب کا متن یہ ہے:

> ''من جانب سعود بہ خدمت سلیم۔ میں 4 محرم 1218ء کو مکہ میں داخل ہوا، یہاں کے باشندوں کو امان دی۔ میں نے ان تمام چیزوں کو جو بتوں کی طرح پوجی جاتی تھیں، برباد کر دیا۔ سوائے ان محصولوں کے جو شرعاً جائز ہیں، باقی تمام محصول منسوخ کر دیے۔ جس قاضی کو آپ نے حسب شرح محمدی مقرر فرمایا ہے، اسے بحال رہنے دیا۔ میری خواہش ہے کہ آپ دمشق وقاہرہ کے والیوں کو ہدایت کر دیں کہ وہ آئندہ باجوں کے ساتھ محمل روانہ نہ کیا کریں۔ مذہب کو ایسی باتوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ خدا کا فضل آپ کے شامل حال رہے۔''

لیکن جب سعودی حکومت جاتی رہی اور محمد علی پاشا خدیو مصر نے دوبارہ حجاز پر قبضہ کر لیا تو پھر بدستور باجوں کے ساتھ غلاف آنے لگا۔

شریف حسین کا عہد:

اس سلسلے میں دوسرا اختلال شریف حسین کے زمانے میں 1923ء میں پیش آیا۔ اس کی مختصر سی کیفیت یہ ہے کہ مصری محمل کے ساتھ مصر سے خدمت حجاز کے لئے چند ڈاکٹر بھی آیا کرتے تھے۔ شریف حسین نے ڈاکٹروں کو روک دیا۔ گفت وشنید سے شریف حسین ڈاکٹروں کو اجازت دینے پر رضامند نہ ہوا۔ لہٰذا محمل مع غلاف جدہ سے واپس ہو گیا اور شریف حسین نے کسی ولایتی کارخانے کے بنے ہوئے کپڑے کا غلاف تیار کرا کے کعبے پر چڑھا دیا۔

صرف مصارفِ غلاف:

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ جب غلاف مصر سے بن کر آتا تھا تو اس پر کم وبیش 4 لاکھ روپے کی رقم صرف ہوتی تھی۔ 1910ء کے میزانیہ مصر سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعد میں اس رقم میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ 1910ء کے میزانیہ غلاف میں مصارف کی مختصر تفصیل یوں درج ہے:

* سنہری روپہلی (وزن 1225 مثقال): روسفید چاندی (وزن 3405 مثقال)	خرچ 515 گنی
* کام کرنے کے آلات کی قیمت:	خرچ 600 گنی
* کارخانوں میں غلاف کی تیاری کے لئے:	خرچ 60 گنی
* زرکشی کے کارکنوں کی اجرت:	خرچ 1664 گنی
* حریر اور اس کے بننے کی اجرت (اس کام پر 70 آدمی معمور تھے):	خرچ 1111 گنی
* غلاف کے سالانہ جلوس کے مصارف:	خرچ 150 گنی
* ملازمین کی تنخواہیں، دفتر غلاف کے مصارف:	خرچ 850 گنی
میزان:	4950 گنی

مصری محمل:

مصری محمل کا سلسلہ مصر کی مشہور ملکہ شجرۃ الدر کے حج (645ھ) سے شروع ہوا تھا اور اسی زمانے سے غلاف بڑے دھوم دھڑکے کے ساتھ مکہ معظمہ آنے لگا۔ محمل کے ساتھ بہت بڑی رقم بھیجی جاتی تھی۔ مثلاً امیر الحج اور خدمت گزارانِ محمل کے وظائف اور اسی قسم کے دوسرے اخراجات مثلاً حرمین کے لئے بتیاں، شمعیں، قندیلیں، روغن زیتون، چٹائیاں۔ اس خرچ کی مقدار سالانہ 50 ہزار گنی تھی اور یہ ساری رقم مختلف اوقات میں ادا کی جاتی تھی۔

مصارفِ محمل کا نقشہ:

1910ء کے میزانیہ مصر میں مصارفِ محمل کا جو نقشہ درج کیا گیا ہے، اسے بھی یہاں بیان کرتا ہوں۔

✷ امیر الحاج اور خدمت گزرانِ عمل کے مشاہرے:	1281 گنی
✷ شرفائے مکہ و مدینہ:	1493 گنی
✷ تکیہ مدینہ:	1257 گنی
✷ بدو:	2511 گنی
✷ تکیہ مکہ:	1961 گنی
✷ باشندگانِ مکہ و مدینہ:	2579 گنی
✷ حرمین کی شمعیں اور قندیلیں:	1249 گنی
✷ بری و بحری باربرداری کی اُجرت:	4248 گنی
✷ متفرق مصارف:	256 گنی
✷ گندم صدقہ کی قیمت:	22500 گنی
✷ خیمے وغیرہ:	1550 گنی
✷ حرمین کے لئے روغن، زیتون اور چٹائیاں:	6420 گنی
✷ میزان:	50000 گنی

کہا جاتا ہے کہ فاطمیوں کے زمانے میں حج کا سالانہ خرچ دو لاکھ دینار تھا اور آج تک کسی اسلامی حکومت نے حج پر اتنی بڑی رقم صرف نہیں کی۔ مگر رقم کا بڑا حصہ غیر ضروری بلکہ ممنوع امور میں صرف ہوتا تھا۔

جلالۃ الملک ابن سعود کا عہد:

یا مصلح الاعظم! جلالۃ الملک سلطان ابن سعود نے حجاز پر قبضہ کیا تو مصری محمل مکہ معظمہ آیا لیکن محمل کے محافظ دستے کے مصری کمانڈر کی غلطی، نادانی یا شرارت سے منیٰ میں گولی چل گئی اور اگر سلطان ابن سعود بروقت اپنی حیرت انگیز ستان قیادت و حسن تدبیر سے کام لے کر اس فتنے کو فی الفور نہ روک دیتے تو نہیں معلوم قربان گاہ اسماعیلی میں کتنے بے گناہ فرزندانِ توحید قربان ہو جاتے۔ اس پر مصری حکومت کے ساتھ گفت و شنید شروع ہوگئی۔ آئندہ نہ تو محمل کے ساتھ باجا آئے اور نہ محافظ دستہ جدہ سے آگے ہتھیار لے جا سکے گا۔ مصری حکومت نے یہ پابندیاں قبول نہ کیں۔ لہٰذا 1927ء میں محمل پھر رک گیا۔

غلافِ کی تیاری مکہ مکرمہ میں:

سلطان ابن سعود کو نہایت قلیل مدت میں نیا غلاف تیار کرا کے چڑھانا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی فیصلہ کر لیا گیا کہ

آئندہ غلاف کسی غیر ملک سے متعلق نہ رکھا جائے بلکہ خود حکومت حجاز حرمین کی خدمت گزاری کا حق ادا کرتی ہوئی اس کا انتظام کرے۔ چنانچہ سلطان نے کمال شفقت و مہربانی سے یہ عظیم الشان خدمت خاکسار کو تفویض فرمائی۔ اگرچہ میں اس فن اور اس کے لوازمات سے بالکل ناواقف تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس خدمت کے لئے تیار ہو گیا۔ بنارس، پنڈ دادن خاں، گوجراں والہ، بھیرہ مقامات سے کپڑا بنانے کے نمونے تیار کرائے۔ اس میں کلمہ شریف اور اللہ تعالیٰ کا نام آنا چاہیئے تھا اس لئے اس میں زیادہ دقت ہوئی۔ بنارسی مسلمانوں کی قسمت میں یہ سعادت لکھی ہوئی تھی۔ ان کا نمونہ ٹھیک تھا۔ مجھ کو پسند آگیا اور یہ نقشہ استاد حفیظ الدین نے تیار کیا۔ نمونے کی تیاری میں حاجی رحمت اللہ اور ان کے بھائیوں نے قابلِ قدر امداد دی۔ آخر بڑی جدوجہد کے بعد کپڑا بننے کی کھڈیاں اور کاری گروں کو بنارس اور اس کے نواح سے جمع کر کے حجاز بھجوا دیا گیا۔ زری کے کام کے لئے لاہور، دہلی، کشمیر سے نمونے بنوائے۔ آخر دہلی کا نمونہ پسند آیا اور یہ سعادت اہل دہلی کے حصے میں آئی۔ وہاں زری کا کمربند جس کو ''حزام'' کہتے ہیں، جس پر قرآنی آیات لکھی گئیں اور کعبہ شریف کے دروازے کا پردہ دہلی میں تیار ہوا اور مجھ کو ان تمام کاموں میں میرے محترم مولانا عبدالقادر صاحب کے مفید مشوروں سے فائدہ پہنچا اور حاجی بشیر الدین صاحب نے زری کے کام کی تیاری میں قابلِ قدر محنت کی۔ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم اور حضرت جلالۃ الملک کی حسنِ نیت سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ الحمدللہ میں خوش ہوں کہ حجاز مقدس میں جو غلاف تیار ہوا وہ ہر لحاظ سے مصری غلاف سے زیادہ خوب صورت اور اعلیٰ ہے اور قیمت کے لحاظ سے اس پر مصری غلاف سے بہت کم خرچہ ہوا۔ فالحمد لله حمدا كثيرا طيبا مباركا فيه.

پارچہ بافی کا کارخانہ:

یا شرف العرب! جلالۃ الملک نے مکہ معظمہ میں پارچہ بافی کا ایک کارخانہ جاری کر دیا ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ خود حکومت حجاز غلاف تیار کرا کے چڑھا رہی ہے اور اس طرح یہ مقدس کام مستقل طور پر پائیدار حیثیت اختیار کر رہا ہے۔ اسی طرح کپڑا خاص مکہ معظمہ میں بنایا گیا اور خدا کو منظور ہوا تو آئندہ زری کا کام مکہ معظمہ میں بھی ہونا شروع ہو جائے گا۔ اس مبارک و مسعود کام کا تعلق محض حرم پاک کی خدمت ہی سے نہیں بلکہ اس سلسلے میں حجاز کے اندر پارچہ بافی کا ایک عمدہ اور مستقل پائیدار کارخانے کے قیام کی شکل بن کر آئی، جس میں حجاز کے باشندے بہترین کپڑا بننے کا کام سیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح ایک مفید اور نفع بخش صورت اس سرزمین مقدس میں رواج پا سکتی ہے اور دوسرے معاملات کی طرح کپڑے کے معاملے میں بھی اہل حجاز دوسرے ممالک کی احتیاج سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔

آخر میں صدقِ دل سے جلالۃ الملک کی خدمت اقدس میں اس عظیم الشان خدمت کے سرانجام پانے پر مبارک باد عرض کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جلالۃ الملک کا ظلِ عاطفت امت عربیہ اور سائر مسلمین پر مدت دراز تک قائم رکھے اور اصلاحِ امت مسلمہ عزت اور شوکت و سطوت کا باعث ہو۔ عرب کی سرزمین پورے طور پر آزاد ہو۔ مرکزیت

عرب کا جو خواب مدتوں سے ہم دیکھ رہے ہیں پورا ہو، تا کہ عرب پھر سے عالم اسلام کے لئے مشعل ہدایت بنے اور جلالۃ الملک کی سیادت میں تمام امت مسلمہ جزیرۃ العرب کو اپنی ہر قسم کی امیدوں کا واحد ملجا و ماویٰ سمجھے، آمین۔

اللھم انصر الاسلام والمسلمین. اللھم انصر من نصر الدین وجعلنا منھم واخذل من خذل الدین ولا تجعلنا منھم. اللھم اجعل کلمتك ھي العلیا وجعل کلمة الذین کفروا ھي السفلي. اللھم الف بین الاتراك والایران والافغان والعرب وسائر بلاد المسلمین.

(اسماعیل الغزنوی)

خواندگانِ محترم نے مولانا اسماعیل غزنوی کا خطبہ (یا ایڈریس) ملاحظہ فرمایا جو غلاف کعبہ سے متعلق بہت سی معلومات پر محیط ہے۔ اب آگے چلیے!

سلطان ابن سعود اور مولانا عبدالواحد غزنوی:

1922ء میں حجاز فتح ہوا تو اس کے بعد مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور دیگر مقامات میں سرکاری عمارتیں تعمیر کرنا اور سڑکیں بنانا اہم ترین مسئلہ تھا، اس کے لئے سلطان ابن سعود کا حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی سے رابطہ رہتا تھا۔ سلطان مرحوم چاہتے تھے کہ مزدور اور کاریگر مولانا عبدالواحد غزنوی کی وساطت سے ہندوستان سے آئیں اور سعودی حکومت کی ہدایات کے مطابق کام کریں۔ مولانا عبدالواحد صاحب کے ایک عقیدت مند دوست میاں عبداللہ ٹھیکیدار تھے جو گوندلاں والا (ضلع گوجراں والا) کے رہنے والے تھے، اس ضمن مولانا ممدوح نے ان سے خط و کتابت کی۔ اُن حالات کی روشنی میں میاں عبداللہ ٹھیکیدار کے نام حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی کے خطوط خاص تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔ مولانا کے دست مبارک سے تحریر شدہ یہ خطوط میرے عزیز دوست مولانا عارف جاوید محمدی (کویت) کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ انہوں نے ان کی فوٹو کاپیاں مجھے بھجوائیں۔ میری ایک کتاب ''چمنستانِ حدیث'' کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔ اس کتاب میں حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی کے حالات کافی تفصیل سے موجود ہیں اور ان کے یہ خطوط بھی درج ہیں۔ ان خطوط سے موجودہ سعودی حکومت کے ابتدائی دور کے بہت سے واقعات کی نشاندہی ہوتی ہے اور اس کی مالی حالت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مولانا محترم نے اس طرح سعودی حکومت سے تعاون کیا، یہ خطوط اس کے وضاحت کناں ہیں۔ آج کے حالات سے وہ حالات بالکل مختلف تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کی مغفرت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

مرزا غلام احمد سے مباہلہ:

غزنوی علماء کے واقعات میں سے ایک اور واقعہ سنئے جو مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ مباہلے سے تعلق رکھتا ہے۔

مولانا صوفی عبدالحق غزنوی ایک جلیل منزلت اور زاہد و متقی عالم تھے۔ مرزا قادیانی کے دجل و فریب اور غلط سلط دعاوی کے خلاف ان کے اشتہارات و بیانات کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مرزا صاحب کی طرف سے بھی ان کی مخالفت ہوتی رہتی تھی۔ بالآخر مخالفت کا معاملہ مباہلے تک جا پہنچا اور مباہلے کے لئے جو طریقہ کار طے ہوا وہ بالفاظ مولانا صوفی عبدالحق غزنوی یہ تھا:

> ''مقامی عیدگاہ (امرتسر) میں مباہلہ اس تاریخ پر بہ ایں الفاظ ہوگا: میں یعنی عبدالحق تین بار بہ آواز بلند کہوں گا: یا اللہ! میں مرزا کو ضال، مضل، ملحد، کذاب، مفتری، دجال، محرف کلام اللہ واحادیث رسول اللہ ﷺ سمجھتا ہوں۔ اگر میں اس بات میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر وہ لعنت کر جو کسی کافر پر تو نے آج تک نہ کی ہو۔ مرزا تین بار بہ آوازِ بلند کہے گا: یا اللہ! اگر میں ضال و مضل و ملحد ودجال و کذاب و مفتی و محرف کتاب اللہ و احادیث رسول اللہ ﷺ ہوں تو مجھ پر وہ لعنت کر جو آج تک تو نے کسی پر نہ کی۔ بعدہ رو بہ قبلہ ہو کر دیر تک ابتہال اور عاجزی سے دعا کریں گے، یا اللہ! جھوٹے کو شرمندہ اور رسوا کر۔ اور سب حاضرین مجلس آمین کہیں گے۔''[1]

یہ مباہلہ 10 ذی قعدہ 1310ھ (25 مئی 1893ء) کو عیدگاہ امرتسر میں ہوا اور فریقین امن وامان سے واپس چلے گئے۔ اس مباہلے کے نتیجے میں مرزا غلام احمد قادیانی 26 مئی 1908ء (25 ربیع الثانی 1326ھ) کو لاہور کی احمدیہ بلڈنگ میں ہیضے کی بیماری سے مباہل یعنی مباہلہ کرنے والے مدمقابل (صوفی عبدالحق غزنوی) کی زندگی میں بیت الخلاء میں مرگیا اور اس کے مرنے کے بعد یہ ہوا کہ اس کی لاش کو قادیان لے جانے کے لئے جب لاہور ریلوے اسٹیشن کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو اس پر اینٹ، پتھر، گندگی اور غلاظت کی ایسی بارش ہوئی کہ شاید کسی بھی بدترین کافر پر بھی نہ ہوئی ہو۔ اس کے برعکس مولانا صوفی عبدالحق غزنوی رحمہ اللہ مرزا غلام احمد کی موت کے بعد پورے 9 برس زندہ رہے۔ ان کا انتقال 23 رجب 1335ھ (12 مئی 1917ء) کو امرتسر میں ہوا۔ ان کے جنازے میں ہر فقہی مکتب فکر کے بے شمار لوگوں نے شرکت کی اور انہیں نہایت اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ مولانا صوفی عبدالحق غزنوی پوری اُمت میں واحد شخص ہیں جن کے ساتھ مرزا غلام احمد کا مباہلہ ہوا۔ ان کے علاوہ متعدد علماء کرام کے ساتھ مباہلے کے متعلق زبانی گفتگو اور اشتہار بازی تو ہوئی لیکن عملاً مباہلہ کسی کے ساتھ نہیں ہوا۔ بہ الفاظ دیگر مرزا غلام احمد کے ساتھ مباہلے اور پھر اس میں کامیابی کی سعادت پوری اُمت میں صرف مولانا عبدالحق غزنوی کے حصے میں آئی۔

حضرت سید عبداللہ غزنوی کے فرزندانِ گرامی میں سے ایک فرزند کا نام نامی مولانا عبداللہ تھا۔ وہ پشاور میں قیام پذیر ہوئے، اور وہ اور ان کی اولاد و احفاد وہیں خدمات انجام دینے لگے۔ حضرت عبداللہ صاحب کے ایک بیٹے حضرت

---

[1] اشتہار مولانا عبدالحق غزنوی 8 ذی قعدہ 1310ھ بہ حوالہ تاریخ مرزا، ص:47 مطبوعہ مکتبہ سلفیہ، لاہور

مولانا عبدالرحیم غزنوی تھے۔ وہ ریاست بہاولپور کے ایک والی کی دعوت پر منڈی صادق گنج تشریف لے گئے تھے۔ ان کے صاحب زادۂ عالی قدر حافظ محمد زکریا غزنوی تھے۔ منڈی صادق گنج میں انہوں نے مدرسہ غزنویہ جاری کیا، جس میں بے شمار علماء وطلباء نے استفادہ کیا۔

علمائے غزنویہ کی تدریسی خدمات:

غزنوی علمائے عظام کی مختلف خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم بہت سا تحریری سفر طے کر چکے ہیں۔ اس سفر کی اب صرف ایک منزل باقی ہے اور اس منزل کا نام ہے: غزنوی علمائے ذی قدر کی تدریسی خدمات۔

امرتسر میں سکونت اختیار کرنے کے فوراً بعد ان حضرات نے دیگر امور دینیہ کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ اس درس گاہ کے پہلے باکمال مدرس خود حضرت سید عبداللہ غزنوی تھے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد ان کے فرزندانِ عالی مرتبت مولانا سید محمد غزنوی، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالرحیم غزنوی اور مولانا عبدالواحد غزنوی یہ خدمت سرانجام دینے لگے۔ تھوڑی مدت کے بعد حضرت عبداللہ صاحب کے پوتوں اور مولانا محمد غزنوی کے لائق بیٹوں مولانا عبدالاوّل اور مولانا عبدالغفور غزنوی نے بھی مدرسین کے ان اخوانِ باصفا میں شمولیت اختیار کر لی۔ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے مروجہ تعلیم سے فراغت پائی تو کچھ عرصہ وہ بھی مسند درس پر متمکن رہے۔ اس مدرسے کا نام دارالعلوم تقویۃ الاسلام تھا جسے آسان زبان میں مدرسہ غزنویہ کہا جاتا تھا۔

استفادہ کرنے والے چند حضرات:

امرتسر میں حضرت سید عبداللہ غزنوی سے استفادہ کرنے والوں کی وسیع فہرست میں حضرت مولانا غلام رسول قلعوی، مولانا عبدالوہاب پنجابی دہلوی اور دیگر متعدد اصحابِ علم کے نام شامل ہیں۔ ان کے بعد اس مدرسے کے طلبائے علم میں مولانا عبدالقادر لکھوی، مولانا نیک محمد، حضرت حافظ محمد گوندلوی، حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا محمد حسین ہزاروی، مفتی محمد حسن امرتسری، مولانا عطاء اللہ لکھوی اور مولانا محمد یوسف کلکتوی ایسی رفیع المنزلت شخصیات کے نام آتے ہیں جنہوں نے آگے چل کر بے حد تدریسی خدمات سرانجام دیں اور بڑی شہرت پائی۔

اس کے بعد مدرسہ غزنویہ امرتسر کے فیض یافتگان کا ایک اور گروہ سامنے آتا ہے، اس گروہ میں مولانا عبداللہ ویرووالوی، مولانا عبداللہ بھوجیانی شہید، مولانا عطاء اللہ رندھاوا، مولانا عبدالرحیم بھوجیانی شہید، مولانا عبدالواحد لائل پوری، مولانا عبدالعظیم انصاری، مولانا محمد اسحاق چیمہ، حافظ محمد بھٹوی، حافظ محمد اسحاق حسینوی، مولانا محمد یوسف راجووالوی، مولانا عبدالعزیز سعیدی اور دیگر حضرات ہیں، جن کو شمار وقطار میں لانا ممکن نہیں۔ پھر امرتسر کے آخری دور میں حافظ محمد یحییٰ عزیز میر محمدی، مولانا ابوبکر صدیق سلفی اور ان کے رفقائے درس کی جماعت ہے۔ میرا خیال ہے مدرسہ غزنویہ امرتسر کے آخری دور میں جن طلبہ نے تھوڑی یا زیادہ تعلیم حاصل کی ان میں سے مولانا ابوبکر صدیق سلفی

(سرپرست دار الدعوۃ السلفیہ، لاہور) ہی اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس وقت اس دنیائے فانی میں موجود ہیں اور ان کا شمار اس فقیر کے مخلص ترین قدیم دوستوں میں ہوتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں صحت دعافیت والی طویل زندگی عطا فرمائے۔

مدرسہ غزنویہ امرتسر سے لاہور منتقل ہوا:

اگست 1947ء میں ملک تقسیم ہوا تو دار العلوم تقویۃ الاسلام (مدرسہ غزنویہ) امرتسر سے لاہور منتقل ہوگیا۔ اس کے مہتمم مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے۔ انھوں نے 16 دسمبر 1963ء کو وفات پائی۔ ان کی وفات تک یہ دار العلوم اساتذہ اور طلباء کی تعداد کے اعتبار سے بڑی شان وشوکت کے ساتھ جاری رہا۔ مولانا کی وفات کے بعد اس کی زمامِ اہتمام ان کے فرزند گرامی سید ابوبکر غزنوی کے ہاتھ میں آئی۔ انھوں نے بھی اپنے والد مکرم کی روایت برقرار رکھی اور دار العلوم پرانے خطوط پر جاری رہا۔ ان کا انتقال ایک بڑے حادثے کے نتیجے میں 26 اپریل 1976ء کو لندن میں ہوا اور پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ دار العلوم کے معاملات بدلنے لگے۔ بہت سالوں سے اس کے منصب اہتمام پر سید ابوبکر غزنوی مرحوم کے صاحب زادۂ ذی قدر سید جنید غزنوی متمکن ہیں۔

فیصل آباد کے ماہنامہ ''پیامِ آگہی'' کے مئی 2014ء کے شمارے میں ان کا انٹرویو شائع ہوا ہے جو بہت سی معلومات پر مشتمل ہے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ ''دار العلوم تقویۃ الاسلام کن حالات سے گزر رہا ہے؟'' جواب دیا:

> ''یہ ایک دکھتا ہوا سوال ہے۔ دار العلوم اچھے حالات سے نہیں گزر رہا ہے اس کی بڑی وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ میں اسے وقت نہیں دے پایا۔ میرا اپنا تعلیمی سلسلہ جو رہا ہے، وہ تمام کالج اور یونیورسٹی سے رہا۔ پھر بھی میری تمنا ہے کہ یہ جگہ ہری بھری رہے، پھلے پھولے۔''

اس سے آگے فرماتے ہیں:

> ''ضمناً یہ بھی عرض کروں گا کہ مدارس کے نظام سے میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔ جو بھی طلبا یہاں سے فارغ التحصیل ہوکر نکلتے ہیں اور جن مناصب پر وہ جاتے ہیں، ملک کے نظام میں مرکزی دھارے سے دور رہتے ہیں، جس کی وجہ سے کوئی جوہری تبدیلی نظام میں نہیں آئی۔ جب تک فیصلہ ساز لوگوں سے آپ قریب نہیں ہوتے یا خود ان مناصب پر نہیں آتے، تبدیلی آنا مشکل ہے۔''

مہتمم صاحب کے ان الفاظ کے بعد اگرچہ دار العلوم کے بارے میں کچھ عرض کرنا مناسب نہیں، تاہم اس گھرانے کے اس فقیر جیسے بے شمار قدیم نیاز مندوں کی بہرحال یہ تمنا ہے کہ اس بہترین خاندانی روایت کو زندہ رکھا جائے اور دار العلوم کو کسی نہ کسی طرح پہلی سطح پر لانے کی سعی کی جائے۔ اگر پہلی سطح پر لانا ممکن نہ ہو تو جہاں تک ہو سکے اپنے اسلاف کے آثار کو قائم رکھا جائے۔ اس دار العلوم سے بے شمار عظیم شخصیتوں نے تعلیم حاصل کی اور پھر آگے چل کر انھوں

نے بے پناہ دینی خدمات سرانجام دیں، جس کا تذکرہ کسی حد تک گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں اس فقیر کی متعدد تصانیف مثلاً نقوش عظمت رفتہ، قافلۂ حدیث، برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن، دبستانِ حدیث، گلستانِ حدیث، تذکرہ صوفی محمد عبداللہ، برصغیر کے اہل حدیث کی تنظیمی اور تدریسی سرگزشت، خطبات استقبالیہ وصدارت اور زیر طبع کتاب چمنستانِ حدیث وغیرہ میں علمائے غزنویہ اور ان سے مستفید ہونے والوں کے تذکار مرقوم ہیں۔

چند باتیں مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں:

اب آخر میں حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی کے بارے میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔ اس فقیر کو پندرہ سال سے زیادہ عرصہ مولانا مرحوم ومغفور کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہے، مرکزی جمعیت اہل حدیث کے آفس سکرٹری کی حیثیت سے بھی اور اخبار ''الاعتصام'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی۔ علم، عمل، حلم، وظائف، درگزر اور میل ملاقات کے اعتبار سے ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اس سلسلے میں ان کے بہت سے واقعات، میں اپنی کتابوں اور اخباری مضامین میں بیان کر چکا ہوں۔ یہاں صرف تین واقعے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

① ایک دن فرمایا کہ ان کی آخری قید کا تعلق کانگرس کی ایک تحریک سے تھا جس میں 18 اگست 1942ء کو بمبئی میں ایک ریزولیوشن کے ذریعے انگریزی حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ''ہندوستان خالی کرو'' (Quit India) تین سالہ قید کی یہ مدت سنٹرل جیل لاہور میں گزری۔ اس اثنا میں ان کی آنکھوں میں ایسی تکلیف شروع ہوئی جس کا کئی انگریز اور ہندوستانی ڈاکٹروں سے علاج کرایا گیا لیکن تکلیف رفع نہ ہوئی۔ ایک دن نماز عشاء کے بعد حسب معمول وظیفہ کر کے سوئے تو خواب میں ایک موٹے گتے پر سورۃ الکہف کی پہلی آیت نمایاں حروف میں لکھی ہوئی سامنے آئی:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ (الکہف)

''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی نہ رکھی۔''

آیت اچھی طرح پڑھ لی تو آنکھ کھل گئی۔ اس کی تعبیر انہوں نے یہ سوچی کہ آنکھوں کی تکلیف کا علاج یہی ہے، یا تو اسے پڑھ کر ہاتھوں پر پھونک مار کر آنکھوں پر مل لیا جائے یا پھر برتن میں پانی ڈال کر اسے پڑھنے کے بعد پانی میں پھونک ماری جائے اور پانی آنکھوں پر ڈالا جائے۔ اس پر چند روز عمل کیا تو اللہ نے شفا بخشی اور آنکھوں کی تکلیف رفع ہو گئی۔ زندگی کے آخری دور تک انہیں عینک لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن کبھی کبھار زیادہ باریک الفاظ پڑھنا ہوتے تو عینک لگا لیتے تھے۔

② مولانا امامت نہیں کراتے تھے۔ دارالعلوم میں امامت کے لئے کسی استاد یا طالب علم کو مقرر کر لیا جاتا، وہی پانچ وقت کی نمازوں کی امامت کراتے تھے۔ ایک دن مولانا نے کسی شخص کو جماعت کرانے کا کہا۔ اس وقت

مقررہ امام وضو کر رہے تھے، اُنھوں نے مولانا کی آواز سنی تو بولے: میں امام راتب ہوں اور وضو کر رہا ہوں۔ میری اجازت کے بغیر کوئی شخص جماعت نہیں کرا سکتا ہے۔ مولانا خاموش ہو گئے۔ امام صاحب وضو کر کے آئے تو نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد مولانا وظیفے اور دعا سے فارغ ہوئے تو امام صاحب سے فرمایا: مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے دوسرے شخص کو جماعت کرانے کا کہا، اس پر میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ میں بیمار ہوں، بڑی مشکل سے نماز کے لئے آتا ہوں، آپ کو بھی بیماروں کا خیال رکھنا چاہیے اور جماعت مقررہ وقت پر کرانی چاہیے۔

③ تیسری بات سنیے جو نہایت اہم ہے۔ مولانا کا ذاتی ملازم محمد عمر تبتی تھا۔ بے حد امانت دار اور مولانا کے نزدیک انتہائی قابلِ اعتماد۔ مولانا سے ملنے والا ہر شخص پہلے محمد عمر سے رابطہ کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ بڑی بے پروائی سے بڑے سے بڑے آدمی سے اپنی خاص قسم کی اردو زبان میں کہہ دیتا تھا: ''یہاں بیٹھو، مولانا صاحب ابھی نہیں آیا، جب آئے گا آپ کو بتا دیا جائے گا۔'' لوگ اس کے لہجے سے اس قسم کی باتیں سن کر مسکرانے لگتے۔ مولانا اسے منع کرتے تو وہ جواب دیتا: ''یہ لوگ ہم کو تنگ کرتا ہے۔ ہم آپ سے بولے گا تو آپ ہم پر خفا ہو گا۔''

ایک دن مولانا نے محمد عمر کو کسی کام کے لئے فرمایا۔ مولانا اپنے دفتر (لائبریری) میں تھے۔ شاید وہ مولانا کی بات سمجھ نہیں پایا، مولانا کو غصہ آ گیا اور تھپڑ دے مارا۔ وہ رونے لگا اور اپنی تبتی اردو میں کہا: اب ہم یہاں نہیں رہے گا۔ ہمارا تنخواہ دے دو۔ ہم ابھی یہاں سے چلا جائے گا۔ اسے دیکھ کر مولانا بھی رونے لگے۔ دارالعلوم کے مدرس حافظ عبدالرشید گوہڑوی، مولوی عبدالعظیم انصاری اور مجھے بھی بلا لیا گیا۔ محمد عمر سے مولانا نے روتے ہوئے کہا: محمد عمر یا تو مجھے معاف کر دو یا اسی طرح تھپڑ مارو، جیسے میں نے مارا ہے۔ محمد عمر بھی رو رہا ہے اور مولانا بھی رو رہے ہیں، اس سے معافی بھی مانگ رہے ہیں اور بدلے میں تھپڑ مارنے کا بھی کہہ رہے ہیں۔ عجیب صورت حال تھی، بڑی مشکل سے مسئلہ حل ہوا۔ کیا اب کوئی اس اخلاق کا عالم کہیں نظر آتا ہے؟

حاضری کی پندرہ سال سے زائد مدت میں مجھ سے بھی مولانا کے حضور کئی گستاخیوں کا ارتکاب ہوا۔ مولانا کی وفات کو پچاس سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے۔ ان گستاخیوں کا کوئی گواہ بھی نہیں ہے، لیکن جب بھی مجھے وہ گستاخیاں یاد آتی ہیں تو شدید احساسِ ندامت ہوتا ہے۔ درآں حال کہ مولانا نے کبھی اس طرف اشارہ تک نہیں کیا تھا، وہ بہت اونچے مرتبے کے شخص تھے۔ چھوٹوں پر ان کی شفقت ہمیشہ سایہ فگن رہتی تھی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین![1]

---

① ہفت روزہ الاعتصام (12،5 ستمبر 2014ء)

فکرِ ابن تیمیہ اور اس کی اشاعت میں خاندانِ غزنویہ کا کردار

تحریر: ڈاکٹر محمود احمد

امام شیخ الاسلام ابو العباس تقی الدین احمد بن عبد الحلیم (661ھ - 728ھ / 1263ء - 1327ء) جو کہ ابن تیمیہ کے نام سے معروف ہیں۔ اُنہوں نے اپنے عظیم کارناموں اور کارِ اصلاح و تجدید کی بناء پر عظیم مصلح و مجدد کا لقب پایا۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو ان کے فضل و کمالِ علم کی بناء پر مجتہد مطلق قرار دیا گیا۔ ان کی مجددیتِ دین کا اندازہ ان کی شہرۂ آفاق تصانیف کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ایسی وقیع اور شاندار کتب تصنیف کیں کہ جس کسی کو استفادے کا موقع ملا وہ انہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ان کے تقریباً تمام ہم عصر اور مابعد علماء نے ان کے مجدد ہونے کی صراحت کی، ہر صاحب و دشمن نے آپ کی وسعتِ علمی کو تسلیم کیا اور اس بحرِ زخار کو بہت سی عبقری و مجدد شخصیات نے بھی مجدد و مصلح عظیم کے القاب سے نوازا۔

ان کی مساعی جمیلہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے مختلف جہات و میادین میں اصلاح و تجدید کا فریضہ سرانجام دیا اور اپنے معاشرے کی خرابیوں اور فسادات کا خوب قلع قمع کیا۔ امام ابن تیمیہ کی فکر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی اصلاحی و تجدیدی مساعی کا اجمالی خاکہ پیش کیا جائے، اس لیے یہاں ان کے اصلاحی و تجدیدی کارناموں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

امام ابن تیمیہ کی تجدیدی و اصلاحی مساعی کو مندرجہ ذیل نکات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:

① اصلاحِ عقائد
② غیر اسلامی رسوم و رواج اور بدعات کا رد
③ فلسفہ و منطق اور علمِ کلام کا رد
④ باطل ادیان و فرق کا رد
⑤ معاشرتی برائیوں کا خاتمہ
⑥ علومِ اسلامیہ کی تجدید اور اصلاح

① اصلاحِ عقائد:

عہدِ ابن تیمیہ میں عقائد میں بہت بگاڑ پیدا ہو چکا تھا، ایمان و عقائد کے بارے میں عجیب و غریب بحثیں برپا تھیں، خصوصاً صفاتِ باری تعالیٰ کے مسئلے پر بہت طبع آزمائی کی جا رہی تھی۔ لوگ اس مسئلے میں افراط و تفریط کا شکار تھے،

کچھ تجسیم کے قائل تھے اور کچھ صفات کی تقسیم کرتے کرتے تعطیل کی حد تک پہنچ چکے تھے۔

امام ابن تیمیہ نے دونوں نقطہ ہائے نظر کا رد کیا اور صفاتِ الٰہی کی اصلی حیثیت کو واضح کیا کہ قرآن و حدیث میں مذکورہ صفات کو بلا تاویل حقیقی تسلیم کیا جائے۔ البتہ ان کی کیفیت اور ماہیت پر بحث نہیں کی جائے گی کیونکہ اس کا علم اللہ ہی کے پاس ہے اور ان کی کیفیت اور ماہیت ویسی ہی ہے جیسی اس کی ذات کے لائق ہے۔ حقیقی بات یہ ہے صفات کے باب میں تاویل کا رد امام ابن تیمیہ کا بہت بڑا کارنامہ ہے، آپ نے ایمان کی حقیقت پر بھی بحث کی اور ایمان کا صحیح تصور واضح کیا، آپ نے عقائد کے بگاڑ کو بھی موضوعِ بحث بنایا اور عقیدۂ توحید کے منافی عقائد کا پرزور رد کر کے توحید کا اجلا اور واضح تصور لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ آپ نے توسل، استغاثہ، نداء لغیر اللہ کے غیر شرعی ہونے پر دلائل دیے۔

اسی طرح آپ نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں غیر اسلامی اور ملحدانہ وکفریہ عقائد کا ابطال کیا، جس میں حلول، اتحاد اور وحدت الوجود جیسے عقائد ونظریات شامل ہیں۔ آپ نے عقائد اور علم الکلام کے مسائل پر تقریباً ایک سو بیس کتب تصنیف کیں، جن میں معروف کتب یہ ہیں:

العقيدة الحموية، رسالة فى القرآن هلك انحرفا وصوتا، رسالة فى علم الظاهر والباطن، عقيدة الواسطية، كتاب فى خلق الافعال، مسئلة فى العقل والروح۔ [1]

② غیر اسلامی رسوم و رواج اور بدعات کا رد:

آپ کے دور میں عقائد کے ساتھ ساتھ بعض مسلمانوں کے اعمال میں بھی بہت بگاڑ پیدا ہو چکا تھا۔ بہت سے غیر اسلامی رواج اور بدعتیں مسلمانوں میں پیدا ہو گئیں تھیں۔ اصل میں عقائد کے بگاڑ کا لازمی نتیجہ اعمال کے بگاڑ کی شکل میں نکلتا ہے، اس لیے آپ نے عقائد کے ساتھ ساتھ اعمال کی اصلاح پر بھی بھرپور توجہ دی۔ لوگ حصولِ ثواب اور تحصیلِ حاجات کے لیے قبروں اور مزارات پر جاتے تھے اور وہاں بہت سے غیر شرعی اُمور کے مرتکب ہوتے تھے۔ آپ نے اس کی اصلاح کے لیے زوردار آواز بلند کی اور اس کا خلافِ شریعت ہونا واضح کیا۔ اس سلسلے میں الجواب الباهر فى زوار المقابر لکھی جو کہ دار عالم الفوائد مکة المکرمة سے 1492ھ میں شائع ہوئی۔ اسی طرح بعض لوگ مختلف قسم کی شعبدہ بازیاں کر کے ان کو کرامت باور کراتے تھے جیسا کہ سلسلہ رفاعیہ سے تعلق رکھنے والے آگ میں کود جاتے تھے۔ آپ نے ان سے مناظرہ کیا اور ان کا دجل وفریب لوگوں کے سامنے ظاہر کیا۔ آپ نے ان کو چیلنج کیا کہ وہ غسل کر کے آگ میں کودیں کیونکہ وہ اپنے جسموں پر ایسا تیل لگاتے تھے جس سے آگ ان پر اثر نہیں

---

[1] امام ابن تیمیہ: غلام جیلانی برق، ادارہ مطبوعاتِ سلیمانی لاہور، ص: 156، 157۔

کرتی تھی اور وہ اس کو کرامت ظاہر کرتے تھے۔①

دوسری قوموں کے ساتھ اختلاط کی وجہ سے دوسری تہذیبوں کے جو اثرات مسلمانوں میں سرایت کر گئے تھے آپ نے ان کو دور کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کو دوسری قوموں کی مشابہت سے منع کیا۔ بعض مسلمانوں نے غیر مسلموں کے تہواروں کو منانا شروع کر دیا تھا، آپ نے ان کے رد میں اقتضاء الصراط المستقیم میں مفصل لکھا۔

③ فلسفہ و منطق اور علمِ کلام کا رد:

مسلمانوں میں یونانی فلسفہ اور منطق کے مطالعہ کا آغاز خلیفہ منصور کے دور میں شروع ہوا، پھر تیزی سے مسلمانوں میں اس کا شیوع ہوا۔ مسلمانوں میں بڑے بڑے ذہین لوگ فلسفہ و منطق کے سحر میں گرفتار ہو گئے، حتی کہ فلسفہ و منطق کو علم کی معراج اور عقل کی انتہاء سمجھا جانے لگا۔ فلسفہ و منطق کے بہت سے مسائل کی زد براہِ راست اسلامی عقائد پر پڑتی تھی لہٰذا کچھ مسلمانوں نے فلسفیانہ انداز میں اسلامی عقائد کے اثبات کا بیڑا اٹھایا جس سے علمِ کلام وجود میں آیا۔ عہدِ ابن تیمیہ میں فلسفیانہ بحثیں اور متکلمانہ جدلیات اپنے عروج پر تھیں۔ فلسفہ کی تو بنیاد ہی وحی کی مخالفت پر ہے، کیونکہ یہ وحی کے مقابلے میں عقل کے ذریعے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش ہے۔ اس لیے اس کے بہت سے مسائل اسلامی عقائد سے متصادم ہیں جن میں قِدَمِ عالَم اور خدا کے علمِ جزئی جیسے نظریات شامل ہیں۔

اسی طرح علمِ کلام اگرچہ اسلام کے دفاع کے لیے بنایا گیا تھا لیکن چونکہ اس کا طریقہ کار بھی فلسفے جیسا تھا اس لیے اس کے بہت سے نقصانات مسلمانوں کے لیے تھے۔ جس میں شک و تذبذب، ایمان و صفات کے بارے میں غیر ضروری بحثیں جو بہت سے نزاعات کا باعث تھیں، قرآن و حدیث کے دلائل پر عدمِ اعتماد اور اس کو ناکافی سمجھنا اور عمل کی طرف عدمِ توجہی ایسی قباحتیں سرِ فہرست ہیں۔ لیکن ان حقائق کے باوجود مسلمان ان علوم کو حرزِ جاں بنائے ہوئے تھے اور ان کو زندگی کا لازمی جزو سمجھتے تھے، امام ابن تیمیہ نے ان علوم کے طلسم کو توڑا اور انہیں اصولوں کے مطابق ان علوم کا غیر تسلی بخش ہونا ثابت کیا۔ آپ نے ان علوم کے اصول و مبادی کا بدلائل رد کر کے مسلمانوں کو ان علوم کی مرعوبیت سے آزاد کروایا اور ان علوم کے غیر شرعی ہونے پر دلائل دیے۔ عقائد کے سلسلے میں منہجِ سلف کی برتری کو ثابت کیا، یہ آپ ہی کا ایک عظیم الشان مجتہدانہ کارنامہ ہے جس کے لیے امتِ محمدیہ آپ کی مرہونِ منت ہے۔ آپ نے ان علوم کی تردید کے لیے بیس سے زائد کتب لکھیں جن میں معروف کتب یہ ہیں:

كتاب فى الرد على المنطق، نقض المنطق، الرد على الفلاسفة، درء تعارض العقل والنقل، موافقة صحيح المنقول لصريح المعقول.

---

① حوالہ سابق، ص: 61

④ باطل ادیان وفرق کی تردید:

آپ نے جس وقت اصلاح وتجدید کا کام شروع کیا اس وقت مسلمانوں میں بہت سے گمراہ فرقے پیدا ہو چکے تھے اور ان فرقوں کے ظہور کی ایک بڑی وجہ فلسفہ وعلم کلام بھی ہے، آپ نے اپنے دور کے ہر گمراہ فرقے کے خلاف قلمی جہاد کیا، آپ نے مختلف مذاہب کی تردید کی اور اس دور میں موجود مختلف فرقوں کے باطل نظریات کا رد کیا، آپ نے مندرجہ ذیل فرقوں کا خصوصی طور پر رد کیا: زیدیہ، کیسانیہ، اسماعیلیہ، باطنیہ، نصیریہ۔ آپ نے ان کے رد میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور کتاب منهاج السنة النبوية ہے۔

مسئلہ تقدیر پر بھی بہت سے لوگ گمراہ ہو گئے تھے، جہمیہ انسان کو مجبورِ محض سمجھتے تھے اور قدریہ تقدیر کا انکار کر کے انسان کو اپنے افعال کا خالق سمجھتے تھے، آپ نے ان دونوں کی تردید کی، اسی طرح آپ نے معتزلہ، اشاعرہ، ماتریدیہ فرقوں میں پائے جانے والی خلافِ شرع باتوں کا بھی ابطال کیا۔ آپ نے ادیانِ باطلہ کا بھی رد کیا۔ خاص طور پر عیسائیت اور یہودیت کا رد کیا۔ عیسائیت کے رد میں آپ کی کتاب الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح ایک مایہ ناز تصنیف ہے۔

⑤ معاشرتی برائیوں کا خاتمہ:

معاشرتی برائیوں کے خلاف بھی ابن تیمیہ نے طویل جدوجہد کی۔ آپ نے ریاکاری، تکبر، بدخوئی، بدگمانی اور خود پسندی کی مذمت کی، لوگوں کو اخلاقِ فاضلانہ کی تلقین کی۔ آپ نے اخلاقیات کے موضوع پر بیسیوں کتب تصنیف کیں۔ ان کے زمانے میں کوہستانی قبائل نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا، وہ مسلمانوں کے مال اور عزتوں کو لوٹتے تھے اور اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے تھے، جنہوں نے بہت سی حرام کردہ چیزوں کو اپنے لیے حلال کر لیا تھا۔ آپ نے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی اور ان سے جنگ کی، اس طرح آپ نے ان کو راہِ راست پر لا کر معاشرے سے فساد کو ختم کیا۔ [1]

اسی طرح آپ نے شراب خانوں کو ختم کیا، شراب کے مٹکے توڑ دیے، شرابی لوگوں پر تعزیر لگائی [2]، آپ کے دور میں عوام پر بھاری ٹیکس لگائے جاتے، لوگ رشوت دے کر سرکاری عہدے حاصل کر لیتے اور کچھ لوگ اپنے مقتولین کا خود قصاص لیتے اور معاملہ عدالت میں لے جانے کی بجائے خود نمٹا لیتے۔ آپ نے سلطان سے کہہ کر ان تینوں امور کے خلاف قانون سازی کروائی۔ [3]

---

① تاریخ دعوت وعزیمت: سید ابو الحسن علی ندوی، مجلس نشریاتِ اسلام کراچی (2/54، 55، 64، 65)۔

② حوالہ سابق، (2/54)۔

③ حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ: ابو زہرہ مصری، مترجم: رئیس احمد جعفری ندوی المكتبة السلفية لاہور، ص: 135۔

⑥ علومِ اسلامیہ کی تجدید اور اصلاح:

ابن تیمیہ نے دیگر علومِ اسلامیہ کی طرف توجہ بھی کی۔ آپ نے حدیث، اصولِ حدیث، تفسیر، اصولِ تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ کے موضوع پر موجود مواد کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا۔ پھر ان موضوعات پر اپنی تحقیقات پیش کیں۔ آپ نے ان علوم کے ماہرین کی آراء کا تنقیدی جائزہ لیا اور اپنا ایک جداگانہ طریق اختیار کیا۔ آپ نے متقدمین کے کام کو آگے بڑھایا اور تقلید کی بجائے مجتہدانہ طریق اختیار کیا۔ آپ نے روایت ودرایتِ حدیث کے اصولوں، مختلف اسالیبِ تفسیر اور استنباطِ مسائل کے طرق کا تنقیدی جائزہ لیا اور اس سلسلے میں پائی جانے والی خامیوں کا تذکرہ کیا۔ اسی طرح آپ نے مختلف فقہی مکاتبِ فکر کی خوبیوں اور خامیوں کا تذکرہ کیا۔ آپ نے قیاس کے استعمال میں پائے جانیوالی افراط وتفریط، تقلید اور اتباعِ سنت کے بارے میں مبالغہ آمیز رویوں اور مختلف مکاتبِ فکر کے دوران پائے جانے والے تعصب کو ختم کر کے ایک معتدل اور جداگانہ طرزِ فکر وعمل لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے تفسیر میں اسرائیلی روایات، طویل نصوص کی حدود، خبرِ واحد کی حجیت، ظواہرِ قرآن اور حدیث کا تعارض، قیاس، استحسان اور مصالح مرسلہ کی حجیت جیسے اختلافی مسائل پر مدلل گفتگو کی اور بادلائل راجح مسلک کی وضاحت کی۔

الغرض آپ نے علومِ اسلامیہ کی تنقیح، تجدید، اصلاح اور نشر واشاعت کے لیے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ آپ نے تفسیر کے موضوع پر اسّی اور حدیث پر چالیس اور فقہ پر ایک سوبیس اور اصولِ فقہ پر بیس کتب ورسائل تصنیف کیے۔ (1)

خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کی اور فکرِ اسلامی کا احیاء کیا، آپ نے عقائد کی اصلاح کی نیز غیر اسلامی رسومات ورواج کا رد کیا۔ فلسفہ ومنطق اور علمِ کلام پر تنقید کی، باطل ادیان وفرق کا رد کیا۔ معاشرتی برائیوں کا خاتمہ کیا اور اسلام کو خالص شکل میں پیش کر کے علومِ اسلامیہ کی تجدید واصلاح کی۔ یقیناً یہ بہت عظیم کارنامے ہیں اور ان میں ہر ایک کارنامہ اپنے اندر کئی عظیم کارناموں کو سموئے ہوئے ہے۔ ان کے انہیں کارناموں سے ان کے منہجِ اصلاح وتجدید کے اصولیات تلاش کیے جاسکتے ہیں جو ان نکات واصولیات پر مضبوط عمارت استعمار کیے ہوئے ہیں:

① ہدایت وعلمِ یقینی کا واحد حتمی ذریعہ وحیِ الٰہی ہے۔
② قرآن وسنت کی اتباع ہی اصلِ دین ہے۔
③ دین کی اصل پر قائم رہنا ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔
④ خارجی وداخلی حملوں سے اسلام کا دفاع کرنا ضروری ہے۔
⑤ دینِ اسلام کی جامع حیثیت کا پرچار کرنا چاہیے۔

---

(1) امام ابن تیمیہ: محمد یوسف کوکن عمری، مکتبہ رحمانیہ لاہور، ص: 8۔

⑥ دین کے معاملے میں عدم مداہنت سے کام لینا چاہیے۔

⑦ فائدہ مند طبعی علوم سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

چونکہ امام ابن تیمیہ کی فکر ہمہ جہت فکر تھی، اسی وجہ سے یہ آپ کی زندگی ہی میں دنیا کے اطراف واکناف میں پھیل گئی اور برصغیر میں بھی یہ فکر نفوذ پذیر ہوئی اور یہاں کے عبقری علماء اور مصلحین نے اس فکر سے بہت استفادہ کیا اور یہاں کے فساد و بگاڑ کی خوب اصلاح کی۔ برصغیر کے عظیم مجدد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی اس فکر سے استفادہ کیا اور ان کے بعد برصغیر کی بہت سی اہم شخصیات نے فکر ابن تیمیہ سے استفادہ کیا اور بہت سے اہلِ علم وفضل آئے جنہوں نے یا تو امام ابنِ تیمیہ کی فکر کو شائع کروایا ان کی سیرت وافکار پر کچھ لکھا، مسائل میں ان سے موافقت کی، ان کی تحسین میں لکھا، افکار ونظریات میں ان سے متاثر ہوئے، ان کے دفاع میں لکھا اور ان کی فکر وعمل کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ شاہ ولی اللہ نے گوکہ فکرِ ابن تیمیہ سے استفادہ کیا اور امام ابن تیمیہ سے بعض مسائل میں موافقت کی، ان کے نظریات کی تائید کی اور ان کا دفاع کیا لیکن اس سے عموماً علمی حلقے پوری طرح سے متعارف نہیں ہوئے تھے کہ برصغیر کی ایک اہم شخصیت نواب محمد صدیق حسن خان کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو معارفِ ابن تیمیہ سے شناسائی ملی۔ انہوں نے ابن تیمیہ کی بہت سی کتب شائع کیں، انہیں ایام میں جب نواب صدیق حسن خان کتبِ ابن تیمیہ کی نشر واشاعت میں مصروف تھے خاندانِ غزنویہ بھی ابن تیمیہ کی فکر کو پھیلانے میں سرگرم عمل تھا۔ سید عبد اللہ غزنوی اور ان کے بیٹوں نے معارفِ ابن تیمیہ کو امرتسر اور اس کے گرد ونواح میں عام کرنے کا بیڑا اٹھا اور ابن تیمیہ کی کتب حجاز سے دستیاب کر کے شائع کروائیں اور ان کا اردو فارسی میں ترجمہ کروایا۔ یہاں اس خاندان کا مختصر تعارف اور ان کی کاوشوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سید عبد اللہ غزنوی (المتوفی 1298ھ بمطابق 1879ء):

آپ کا نام عبد اللہ بن محمد بن محمد بن محمد شریف تھا۔ آپ سیدنا سید اہل الجنۃ حسین بن علی بن ابی طالب کی اولاد سے ہیں[1]، افغانستان کے ضلع غزنی قلعہ بہادر خیل خواجہ ہلال پہاڑ کے پاس ایک گاؤں ''گیرد'' آپ کا آبائی وطن تھا۔[2] آپ کی ولادت 1230ھ کے آخری عشرے میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے اساتذہ سے حاصل کی۔ جب آپ کی ابتدائی رسمی تعلیم مکمل ہوگئی تو آپ نے تعلیم کی طرف ذاتی طور پر توجہ دی اور پوری تندہی اور انہماک کے ساتھ کتاب و سنت کا علم حاصل کرنے لگے۔ مسائل سیکھنے کے لیے علامہ حبیب اللہ قندھاری کے پاس قندھار گئے کیونکہ آپ تحقیق و جستجو کی طرف میلان رکھتے تھے۔ مولانا داؤد غزنوی لکھتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ صاحب غزنوی جب دوبارہ قندھار

---

[1] اہل حدیث امرتسر: شمارہ 6 دسمبر 1918ء۔

[2] الشیخ عبد اللہ غزنوی: بدر الزماں محمد شفیع نیپالی، ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ پاکستان، ص: 15۔

تشریف لے گئے تو آپ کے حالات سے متعجب ہو کر شیخ حبیب اللہ قندھاری نے علماءِ قندھار کی بھری مجلس میں کہا:
''مسائلِ دینیہ را چناں کہ ایں شخص ی فہمد من خود نمی فہم'' (دینی مسائل جس قدر یہ شخص سمجھتا ہے میں خود نہیں سمجھتا)۔ (۱)

اس دور کے معاشرتی و مذہبی حالات:

آپ کے معاشرے کا ماحول دینی نقطۂ نظر سے بہت ہی گھناؤنا تھا۔ ماحول کافی حد تک جہالت، بے دینی اور بدعات وخرافات سے لبریز تھا، اس دور میں دین کا صحیح علم رکھنے والوں اور اس پر صحیح طریقے سے عمل کرنے اور کرانے والوں کا بحران ہی نہیں فقدان تھا، ایسے موقع پر کسی کو ہمت نہیں پڑتی تھی کہ مولویوں اور ملاؤں کے جمِ غفیر کو للکارے اور سب کی مخالفت مول لے کر اپنی راحت و آرام کی زندگی اذیتوں اور تکلیفوں کی داستان بنا دے۔

بات صرف اتنی ہی نہیں تھی کہ ملاؤں کی مخالفت ہوگی بلکہ ان کی مخالفت سے ان امراء اور حکام کی مخالفت کا بھی اندیشہ تھا جو ان ملاؤں کے چنگل میں تھے۔ اور ان کے دباؤ پر اپنی حکومت وسلطنت کو بچانے کے لیے وہ سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو سکتے تھے جس کے کرنے پر زور ڈالا جاتا۔ شیخ کے دور میں اور آپ سے پہلے قرآن وسنت کے مخالف کو موافق قرار دے دینے پر افغانستان کے ملاؤں اور مولویوں کا تقریباً اتفاق ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس کی توثیق اس مناظرہ سے ہو سکتی ہے جو اس موضوع پر شیخ عبداللہ غزنوی سے ہوا۔ ''حدیث کی موجودگی میں امام کا قول ترک کیا جا سکتا ہے؟'' (۲)

شرک وبدعت کی مخالفت:

آپ طبعاً شرک وبدعت سے قطعاً بیزار تھے اس سلسلے میں قرآن وحدیث کا مطالعہ کیا اور دین کا صحیح علم حاصل کیا، شرک وبدعت کو پہچان گئے تھے۔ اگر کچھ شبہات ہوتے تو علامہ قندھاری کی طرف رجوع کرتے۔ چنانچہ آپ نے کھل کر شرک وبدعت کی مخالفت شروع کر دی۔ اس وقت وطن کا ماحول کس قدر شرک وبدعت سے گدلا ہو چکا تھا اس کا اندازہ آپ کے فرزند سید عبدالجبار غزنوی کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''آپ کے ملک میں کیا خاص کیا عام، سبھی شرک وبدعت اور رسوم ورواج میں مبتلا تھے۔ علماء اور مشائخ اسی کو دین سمجھتے تھے، پھر بیچارے عامیوں کا کیا ذکر ہے۔ آپ کو غیب سے کبھی الہام کے ذریعہ اور کبھی خواب میں ان کاموں سے سخت روکا جاتا اور کتاب وسنت کی ترغیب دی جاتی۔ آپ حیران ہوتے کہ اس ولایت میں کتاب وسنت کے علم کا نام ونشان تک نہیں ہے اور نہ کتاب وسنت کی ترویج کے اسباب موجود ہیں، کس طرح مجھ سے یہ امر انجام پذیر ہوگا؟ جب یہ خیال کرتے تو غیب سے تاکید آیت ﴿فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ﴾ کا

---

(۱) اہل حدیث امرتسر: شمارہ 6 دسمبر 1918ء۔

(۲) الشیخ عبداللہ غزنوی، ص: 15۔

مضمون الہام ہوتا۔ ناچار سنت کی تابعداری اور شرک و رسوم اور بدعتوں کا رد کرنا اختیار کیا۔ اور کتاب وسنت کے علم کی طرف توجہ دی۔

آپ نے علی رؤس الاشہاد اعلان کر دیا کہ ہم کتاب وسنت کے خلاف جو کچھ پائیں گے اس کی تردید کریں گے۔ اسے اپنی زندگی میں نافذ ہونے دیں گے نہ کسی ایسے شخص کی زندگی میں جسے ہم کسی قیمت پر دعوت دے سکتے ہیں۔"[1]

کفر کا فتویٰ اور جلا وطنی:

جب آپ نے کھل کر شرک وبدعت کی تردید شروع کی اور قرآن وسنت کی دعوت پیش کرنا چاہی تو علماء وقت آپ کے سخت مخالف ہو گئے اور امیر دوست محمد (المتوفی 1863ء) کو شکایت کر کے آپ کے خلاف اُکسایا۔ ان علماء کی ذہنی اور فکری حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سید عبداللہ غزنوی سے مناظرہ کیا جس کا موضوع تھا: "مذہب کے خلاف حدیث پر عمل کرنا چاہیے۔" جس میں آپ نے حجیت حدیث پر زبردست دلائل دیے، مخالفین کو بڑی رسوائی ہوئی جس سے وہ اس قدر مخالفت پر اتر آئے کہ امیر کو زبردستی اس بات پر قائل کر لیا کہ اگر یہ شخص یہاں رہا تو ملک میں انتشار پھیل جائے گا۔ امیر دوست محمد نے شیخ کو اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا: "مصلحت یہی معلوم ہوتی ہے کہ تم اس ملک سے چلے جاؤ۔"[2] لہٰذا آپ نے گھر بار چھوڑا اور دہلی روانہ ہو گئے۔

میاں نذیر حسین کی صحبت میں:

میاں نذیر حسین محدثِ دہلوی کی صحبت میں دہلی پہنچ کر سید عبداللہ غزنوی نے میاں نذیر حسین سے اکتسابِ علم کیا۔ سید صاحب خود فرماتے ہیں: "اسی زمانے میں غدرِ دہلی واقع ہوا، عین بلوہ کے زور وشور میں جبکہ موت سر پر منڈلا رہی تھی اور ہر ایک کو جان کی فکر ہو رہی تھی۔ میں پورے اطمینان سے حضرت میاں صاحب سے بخاری پڑھنے میں مشغول تھا، یہاں تک کہ انگریز دوبارہ قابض اور بحال ہو گئے اور انھوں نے لوگوں کو دہلی سے باہر نکال دیا۔ ان دنوں میری صحیح بخاری ختم ہونے والی تھی مگر بوجہ دہلی والوں کے منتشر ہونے کے میرے اور سید صاحب کے درمیان جدائی ہو گئی اور چند اوراق باقی رہ گئے۔"[3]

ابن تیمیہ سے خصوصی عقیدت:

سید عبداللہ غزنوی ابن تیمیہ اور ابن قیم سے گہری عقیدت اور وابستگی رکھتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں: "میں نے

---

[1] الشیخ عبداللہ غزنوی، ص:30۔

[2] الشیخ عبداللہ غزنوی، ص:32، 34۔

[3] حوالہ سابق، ص:20۔

خواب میں دیکھا کہ جس دن نور تقسیم ہوا ابن تیمیہ کو نور کا ایک بہت بڑا حصہ ملا۔“①

ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتب سے بہت شغف رکھتے اور ان کے حصول کی ہر ممکن کوشش کرتے اور ان کو تمام کتب پر فضیلت دیتے، ان کے بیٹے سید عبدالجبار غزنوی (1268ء-1331ء) کہتے ہیں:

”میرے والد محدثین محققین کی کتابوں میں خاص کر ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تصانیف کی طلب میں سبحان اللہ کس شوق سے عاجزی وزاری کرتے کہ کبھی سیر نہ ہوتے۔ ان دونوں عالموں کے ساتھ زیادہ محبت رکھتے اور اکثر اہلِ علم پر ان کو فضیلت دیتے۔ اور فرماتے تھے کہ شاہ ولی اللہ جیسوں کی نسبت ان دونوں شیخوں کے ساتھ ایسی ہے جیسے علماءِ خراسان کی نسبت شاہ ولی اللہ کے ساتھ۔“②

اس سے واضح ہوتا ہے کہ سید عبداللہ غزنوی' ابن تیمیہ کے علم ومرتبہ سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس لیے تو کتب ابن تیمیہ اور ابن قیم سے خصوصی عقیدت رکھتے اور ان کے بے حد شائق تھے۔ ہر صورت میں ان تصانیف کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور ان کا خوب مطالعہ کرتے، اس کا اثر ان کے بیٹوں میں بھی منتقل ہوا۔ (آئندہ اس کا ذکر آئے گا۔) مزید یہ کہ سید عبداللہ غزنوی نے جو اصلاحی کاوشیں کیں وہ بھی فکر ابن تیمیہ سے متاثر نظر آتی ہیں۔

دعوتی اور اصلاحی فکر میں فکرِ ابن تیمیہ سے مطابقت:

سید عبداللہ غزنوی کی اصلاحی کاوشیں افکارِ ابنِ تیمیہ سے کافی حد تک مطابقت رکھتی ہیں انہوں نے بہت سے اصلاحی کام کیے جن کا خلاصہ یہ ہے:

غلط عقائد ورسوم کو ختم کیا گیا اور بہت سے لوگوں کو سیدھے راستے پر لگایا گیا۔ چنانچہ آپ نے مرد وزن کی باہمی مشابہت، مشرک وبدعتی کو لڑکی دینے، مہر کو لڑکی کے حوالے نہ کرنے اور خود کھا جانے اور کسی بھی طرح رسم ورواج کی پابندی کرنے پر زبردست نکیر کی ہے۔ اور خدا کو ایک جاننے، ماننے، نمازوں کو خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرنے، صرف اللہ پر بھروسہ کرنے اور اسی کی مرضی تلاش کرنے، دنیا سے قطعاً بے پرواہ رہنے، قرآن وحدیث کا ترجمہ کرانے اور اس کا پرچار کرنے، توبہ وانابت کرنے، خدا کو آرام وتکلیف ہر حال میں یاد کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ آپ نے درس وتدریس اور کتب کی نشر واشاعت کے ذریعے تبلیغ دین کا فریضہ سرانجام دیا، یہاں مختصراً ان کا احاطہ کیا جاتا ہے:

---

① مجموعہ نافعہ المسمی بہ سوانح عمری مولوی عبداللہ غزنوی: مولوی عبدالجبار غزنوی، مولوی غلام رسول قلعوی، مرتب: صوفی احمد دین حنیف، ص: 42 (ناشر: محمدی اکیڈمی، محلہ توحید گنج، منڈی بہاؤالدین)۔

② حوالہ سابق، ص: 47۔

درس وتدریس اور دعوتِ دین:

سید عبداللہ غزنوی نے درس وتدریس کے ذریعے خالص دین کی دعوت کو پیش کیا اور قرآن وحدیث کی تدریس میں اس قدر مگن ہوئے کہ اس کو اولین ترجیح سمجھا اور کسی چیز کو اس میں رکاوٹ نہ بننے دیتے تھے۔ علامہ اقبال اپنے ایک مکتوب (بنام منشی محمد دین فوق بتاریخ 19 دسمبر 1922ء) میں ان کے درس وتدریس میں شوق وذوق اور انہماک کو بایں الفاظ بیان کرتے ہیں:

''مولوی عبداللہ غزنوی حدیث کا درس دے رہے تھے کہ اُن کو اپنے بیٹے کی قتل کی خبر موصول ہوئی ایک منٹ تأمل کیا پھر طلباء کو مخاطب کر کے کہا: "ما بر رضائے او راضی هستیم بیایید که کارِ خود بکنیم" یہ کہہ کر درس میں مصروف ہو گئے۔''[1]

اس سے ظاہر ہے کہ آپ کو دین کی ترویج میں اس قدر دلچسپی تھی کہ بیٹے کے قتل پر صرف ادنیٰ تأمل فرمایا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ گویا آپ کے نزدیک درس کو اور دعوتِ دین کو ایسے موقع پر بھی چھوڑ دینا دینِ حق کی حق تلفی اور خیانت ہے۔

مصائب میں دینِ اسلام کی ترویج:

انہوں نے ابن تیمیہ کی طرح تبلیغِ دین کے لیے کسی تنگی اور تکلیف کو رکاوٹ نہ بننے دیا بلکہ ہمہ وقت دینِ اسلام کی تبلیغ کے لیے کمر بستہ رہے۔ چنانچہ جب آپ کو شریعتِ حقہ کی تبلیغ کے جرم میں گرفتار کیا گیا تو گرفتار کرنے والے صوبہ دار محمد عمر خان نے سنجیدہ مزاجی کے ساتھ کہا: ''آپ اپنے راستے کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے جو کچھ وقت کے مولوی کرتے ہیں آپ بھی ان کے ساتھ شریک ہو جائیں۔'' اس موقع پر آپ کا جواب یہ تھا: ''مجھ کو اللہ کا حکم یہ ہے کہ میں کتاب وسنت کو جاری کروں۔ میں محکم قصد اور مصمم ارادہ رکھتا ہوں کہ جب تک جان بدن میں ہے اور سرتن پر، کتاب وسنت کی خدمت میں سرگرمی سے کوشش کروں گا۔''[2]

اسی بات کو آپ نے ایک خط میں اس طرح لکھا:

''فقیر ہمیشہ خود را بترویج کلام اللہ ماموری بیند، ودر تبلیغ آں ماجور۔ پس مادامیکہ جان در بدن دارم وسر بر تن، آشنا وبیگانہ را ترغیب می دہم واز تکرار آں ہر چند کہ باشد ننگ وعارنمی آرم۔''[3]

(فقیر اپنے کو ہمیشہ کلام اللہ کی ترویج کے لیے مامور سمجھتا ہے اور اس تبلیغ میں اپنے آپ کو ماجور تصور کرتا ہے

---

[1] انوارِ اقبال: بشیر احمد ڈار، ترتیب وتدوین: زیب النساء (اقبال اکیڈمی لاہور، پاکستان) (247/1)۔

[2] سوانح عمری، ص: 17۔

[3] سوانح عمری مولوی عبداللہ غزنوی، مکتوب، ص: 102۔

اس لیے جب تک بدن پر سر اور جسم میں جان رکھتا ہوں واقف اور غیر واقف ہر ایک کو ترغیب کرتا ہوں اور جس قدر بھی ہو اس کو بار بار کہنے میں ننگ و عار نہیں محسوس کرتا۔)

یہی وجہ ہے کہ خود دین کی تبلیغ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اس خدمت پر آمادہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں اپنے شاگرد محمد حسین کو لکھتے ہیں:

''غرض کہ از خوابہائے حقیر معلوم می شود کہ مرضی ارحم الراحمین در حق شما اشاعت دین است۔ پس در اشاعت دین سعی تمام و کلفت مالا کلام باید کرد۔''①

(حقیر کو خوابوں سے جو بات معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی تمہارے لیے اسی میں ہے کہ تم دین کی اشاعت کرو، اس لیے کہ دین کی اشاعت میں پوری کوشش کرنی چاہیے اور تحمل کے ساتھ اذیتیں برداشت کرنی چاہیے۔)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''در افشاء و اجراء و تبلیغ احکام رب العالمین خصوصاً توحید و تفرید حق، کما ینبغی بجا آرید۔''②

(یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام خصوصاً توحید و وحدانیت باری تعالیٰ کی تبلیغ اور نشر و اشاعت خوب مناسب طریقے پر کیجیے۔)

اشاعتِ کتب:

سید عبد اللہ غزنوی نے بہت سے تبلیغی رسالے شائع کرائے اور انہیں مفت تقسیم کرایا۔ کئی کتابوں کے ترجمے اپنے احباب سے کرائے اور انہیں طبع کرا کے عوام میں دین کا پرچار کیا۔ لیکن اس سلسلے میں آپ نے جتنی کوششیں کیں ہیں ان سب کے جاننے والے اب نہیں رہے، اس لیے آپ نے اشاعت و تراجم کتب سے متعلق جس قدر خدمات سرانجام دی ہیں ان سب کا پیش کرنا مشکل ہے۔ جو کوئی ان کو جاننے والے تھے ان میں سے کچھ ہی احباب نے سرسری طور پر بعض خدمات کا اجمالی ذکر کیا ہے۔

سید عبد الجبار غزنوی لکھتے ہیں:

''توحید اور اتباع سنت اور عقائد کی بہت سی کتابیں اور رسالے عام لوگوں کے نفع کے واسطے فارسی اور اُردو زبان میں ترجمہ کروا کر چھپوا دیے اور للہ تقسیم کر دیے۔ الحمد للہ! جس قدر خوش عقیدہ لوگ آج کل اس شہر امرتسر میں موجود ہیں گمان نہیں کہ ہندوستان اور خراسان کے شہروں میں سے اس قدر خوش عقیدہ لوگ موجود ہوں

---

① حوالہ سابق، ص: 107۔

② سوانح عمری، ص: 95۔

باوجودیکہ یہ شہر ہندوؤں اور کافروں کی قرار گاہ ہے۔''(۱)

شیخ نے بعض مترجمین اور معاونین کو جو خطوط لکھے ہیں ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کتب کی نشر و اشاعت اس قدر ضروری سمجھتے تھے اور کتب کے شائق تھے۔ چنانچہ آپ اپنے خاص رفیق مولوی حیات گل کو لکھتے ہیں: ''رسالہ ایقاظ الھمم جسے ترجمے کے لیے بھیجا گیا تھا چونکہ یہاں اس کی سخت ضرورت آپڑی ہے اس لیے لکھا ہے کہ اسے خط پہنچتے ہی فوراً بذریعہ ڈاک بھیج دو، ترجمہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔''(۲)

دوسری جگہ اپنے مخصوص ہمدرد و معاون محمد حسین کو لکھتے ہیں: ''تمہارے لیے ضروری ہے کہ مردوں اور عورتوں کو قرآنِ مجید ترجمے کے ساتھ اور ترجمہ نماز پڑھاؤ الغرض کلام اللہ کی اشاعت کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کرو تا کہ خادمانِ کلام اللہ میں شمار ہووے، آمین۔''(۳)

''قاضی شوکانی کی کتاب کے چند اوراق کا فارسی ترجمہ بہت جلد کرو تا کہ چھپ جائے، رسالہ نزول(۴) کو عبدالاحد بہت مانگتا ہے، کسی معتبر آدمی کے ہاتھ ضرور بھیج دو۔(۵)

خاندانِ غزنویہ اور کتب ابن تیمیہ کی دستیابی:

جس طرح سید عبداللہ غزنوی نے اصلاحی کاوشوں سے اور کتب کی نشر و اشاعت کر کے فکرِ ابن تیمیہ کو پھیلایا اس طرح یہ فکر ان کے بیٹوں کے ذریعے عام ہوئی۔ یہاں ان کی کاوشوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سید عبداللہ غزنوی کے بارہ بیٹے تھے:

(۱) مولانا محمد (۲) مولانا عبداللہ (۳) مولانا احمد
(۴) مولانا عبدالجبار (۵) مولانا عبدالواحد (۶) مولانا عبدالرحمن
(۷) مولانا عبدالستار (۸) مولانا عبدالقیوم (۹) مولانا عبدالعزیز
(۱۰) مولانا عبدالحئی (۱۱) مولانا عبدالقدوس (۱۲) مولانا عبدالرحیم

یہ تمام اپنے وقت کے جلیل القدر عالم اور فاضل تھے، بعض اہم کتابوں کے مصنف، مترجم اور شارح تھے۔ انہوں نے بہت سی عمدہ کتابیں شائع کیں۔(۶)

---

(۱) حوالہ سابق، ص:22۔
(۲) حوالہ سابق، ص:103۔
(۳) حوالہ سابق، ص:108۔
(۴) شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا رسالہ مراد ہے۔
(۵) سوانح عمری، ص:108۔
(۶) کتب کی فہرست ملاحظہ ہو: فقہائے پاک و ہند (تیرھویں صدی ہجری): محمد اسحاق بھٹی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور (2/210،214)

مولانا عبدالرحیم اور مولانا عبدالواحد دونوں کی تجارت کے سلسلے میں عرب کے بعض علاقوں میں آمد ورفت تھی۔ اس ضمن میں وہ کویت گئے تو وہاں نجد وحجاز کے والی سلطان عبدالرحمٰن اور ان کے بیٹے سلطان عبدالعزیز سے ملاقات ہوئی، وہ ان دنوں کویت میں مقیم تھے اور نجد پر حملے کی تیاری کر رہے تھے، غزنوی برادران سے ان کے باپ بیٹوں نے کچھ تعلیم بھی حاصل کی۔ نجد کی فتح کے بعد اپنے ہاں ان کو درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ یہ بزرگ تقریباً پانچ سال وہاں رہے اور خاندانِ سعود کے بعض افراد اور اہلِ نجد ان سے مستفید ہوئے۔ اسی اثناء میں ابن تیمیہ اور ابن قیم کی بعض قلمی کتابیں بھی ان کی وساطت سے برصغیر پہنچیں، جو کہ یہاں کے ناشروں اور خاندانِ غزنویہ کے علماء نے شائع کیں۔[1]

کتبِ ابن تیمیہ کی اشاعت:

ابن تیمیہ کی کتب کی فہرست جو علماء غزنویہ کے اہتمام سے شائع ہوئیں ان کی فہرست مولانا اسحاق بھٹی کی کتاب ''فقہاء ہند تیرھویں صدی ہجری'' جلد دوم سے نقل کی جارہی ہیں۔ مولانا اسحاق بھٹی نے یہ معلومات مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے حاصل کی تھیں۔

تفسیر جامع البیان پر مولانا محمد بن عبداللہ غزنوی نے حاشیہ لکھا اور اس تفسیر کے ساتھ مندرجہ ذیل کتب ابن تیمیہ 1892ء میں مطبع فاروقی دہلی سے پہلی دفعہ شائع ہوئیں:

① تفسیر سورۃ النور
② فوائد تفسیریۃ مختلفۃ (تفسیر کے سلسلہ کے مختلف علمی فوائد)
③ فوائد شریفیۃ
④ فتیا فی مسئلۃ کلام اللہ تعالی (مسئلہ کلام پر دو فتوے)
⑤ رسالۃ فی علوم القرآن
⑥ قاعدۃ فی العلوم
⑦ رسالۃ الحقیقۃ والمجاز
⑧ شرح حدیث نزول (مولانا عبدالغفور اور مولانا عبدالاول نے امرتسر سے شائع کی)
⑨ التحفۃ العراقیۃ فی الاعمال القلبیۃ

---

[1] حوالہ سابق، (2/209،210)۔

⑩ الحموية[1]

نیز ان کے علاوہ ابن قیم کی مندرجہ ذیل کتب شائع کیں:

① اجتماع الجیوش الاسلامیة علی غزو المعطلة والجهمیة (مطبع القرآن والسنة)

② جلاء الافهام فی الصلوة والسلام علی خیر الانام (مولانا عبد الغفور اور مولانا عبد الاول غزنوی نے مولانا عبد القدوس غزنوی کی کوشش سے پہلی مرتبہ مطبع القرآن والسنۃ امرتسر سے شائع کی)

مزید یہ کہ مولانا عبد الجبار غزنوی (المتوفی 1331ھ۔1913ء) نے بھی ابن تیمیہ اور ابن قیم کے معارف کو عام کیا۔ اس سلسلے میں ''مجموعۃ التوحید'' اور ''مجموعۃ الحدیث نجدیۃ'' شائع کیں۔ جن میں ابن تیمیہ اور ابن قیم کی مؤلفات میں سے بعض تحریریں جمع کی گئیں جو مدارس کے نصاب میں شامل کیں۔[2]

مولانا عبد الجبار غزنوی کے صاحبزادے سید داؤد غزنوی (المتوفی 1963ء) نے سیرت ابن تیمیہ پر مضمون لکھا۔
الغرض خاندان کی مساعی سے فکرِ ابن تیمیہ عام ہوئی اور اس خاندان نے باہتمام کتب ابن تیمیہ شائع کیں تو کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے اسی خاندان کی وجہ سے اور ان کی خصوصی توجہ کی وجہ سے کتب ابن تیمیہ شائع ہوئیں اور اہل ہند معارفِ ابن تیمیہ سے واقف ہوئے۔[3]

---

[1] فقہائے پاک وہند (2/210، 213)، "دعوة شيخ الاسلام وأثرها على الحركات الاسلامية المعاصرة وموقف الخصوم منها": صلاح الدین مقبول احمد، 1416ھ/1996ء، دار ابن الاثیر کویت، ص: 39۔ بعض کتب کے نام فقہائے ہند میں صحیح درج نہیں، دعوة شيخ الاسلام وأثرها على الحركات الاسلامية المعاصرة، ص 39 سے لکھا گیا ہے۔ مثلاً نمبر پانچ پر رسالہ فی القرآن کی بجائے رسالہ فی علوم القرآن ہے اور قاعدۃ فی القرآن کی بجائے قاعدۃ فی العلوم ہے، واللہ اعلم۔

[2] سیدی وابی داؤد غزنوی: ابوبکر غزنوی، المکتبۃ السلفیۃ، لاہور، ص: 108، 109۔

[3] ہزارہ اسلامیکس (جنوری تا جون 2016ء)

تحریکِ ختم نبوت میں غزنوی علماء کا کردار

تحریر: پروفیسر محمد سلیمان اظہر

آمادہ بہ قتل من آں شوخ ستم گارے

مرزا غلام احمد آنجہانی پروپیگنڈے کے فن سے پوری طرح آشنا تھے۔ اس فن کے اسرار ورموز ان پر پوری طرح واشگاف تھے۔ حصولِ مقصد کی خاطر وہ ایسے تمام طریقے روبہ عمل لانے کی صلاحیت رکھتے تھے کہ جن سے ادنیٰ فائدے کی بھی توقع ہو۔ وہ جانتے تھے برصغیر کی امتِ مسلمہ پر صوفیاء کا کس قدر اثر ہے۔ اور صوفیاء کی زبان سے نکلی ہوئی بات پر عوام کس طرح بلا چون و چرا عمل کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اپنی دکان چمکانے کے لیے انہوں نے دیگر ذرائع کے ساتھ ساتھ ماضی قریب کے ان بزرگ افراد کو بھی استعمال کیا جنہیں عوام کا کوئی نہ کوئی طبقہ معتبر خیال کرتا ہو۔ انہوں نے امیر المومنین سید احمد شہید کو اپنا مشیر قرار دیا۔ انہوں نے نعمت اللہ شاہ ولی کی پیش گوئی (خدا معلوم اس پیش گوئی کی حقیقت کیا ہے۔ تاہم اگر یہ حقیقت تھی تو اس میں احمد کا ذکر ہے غلام احمد کا نہیں ہے) کو اپنے حق میں قرار دیا۔ انہوں نے صوبہ سرحد کے ایک نامور بزرگ سید امیر آف کوٹھہ ضلع مردان۔ جو تحریک مجاہدین کے ایک نامور فرد سید احمد کے مرید اور سید عبداللہ غزنوی و مولانا غلام رسول قلعہ والے کے پیر تھے۔ کے متعلق مشہور کیا کہ انہوں نے میری آمد کی خبر دی ہے۔ اسی طرح انہوں نے حضرت عارف باللہ سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کو بھی اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کرنا چاہا۔ مرزا صاحب نے یہ روایت گھڑی کہ عبداللہ صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ قادیان سے نور ظاہر ہوا لیکن میری اولاد اس سے محروم رہ گئی۔ [1]

---

[1] محترم قارئین اس من گھڑت روایت کی حقیقت جاننے کے لیے جریدہ الاعتصام میں شائع شدہ ایک شذرہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

حضرت مولانا سیّد عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ پر افتراء

ہفت روزہ ''پیغام صلح'' (23 جولائی 1958ء) نے حضرت مولانا سیّد عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کی طرف یہ دو کشف منسوب کر کے افتراء کی ایک انوکھی مثال قائم کی ہے۔

- ایک یہ کہ ایک دفعہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ قادیاں میں ایک نور نازل ہوا ہے لیکن میری اولاد اس سے محروم ہو گئی .... (العیاذ باللہ!)
- دوسرا یہ کہ ایک اور کشف میں مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کا کرتہ پھٹا ہوا دیکھا اور اس سے ان کی علمی پردہ دری مراد لی .... (ثم العیاذ باللہ!!)

اس افتراء اور سفید جھوٹ کا پردہ چاک کرنے کے لیے اتنا بتا دینا کافی ہے کہ یہ دونوں کشف مسلمانوں کی کسی مصدقہ کتاب میں نہیں ہیں۔ بلکہ صرف مرزا صاحب نے ہی ان کو اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ بات کس نے ان سے ذکر کی ہے۔ ⇐

مرزا صاحب کی چال یہ تھی کہ اس طرح غزنوی خاندان اور اس سے عقیدت رکھنے والے اہلحدیث یا دیگر افراد میری مخالفت سے باز آ جائیں اور میری اطاعت کر لیں۔ وہ جانتے تھے کہ مولانا محمد حسین بٹالوی جو مرزا صاحب کے شدید ترین مخالف تھے اور جن کا ماہنامہ ''اشاعۃ السنۃ'' ان کی تردید کے لیے وقف تھا، سید عبداللہ کا کس درجہ احترام کرتے ہیں۔ غزنوی صاحب کی زبانی بشارت پیش کر کے نہ صرف بٹالوی صاحب کو بقولِ مرزا صاحب راہِ راست پر لایا جا سکتا تھا بلکہ غزنوی علماء بھی حلقہ بگوشِ قادیانیت ہو جائیں گے۔ لیکن سید صاحب نے ایسی کوئی بات نہ فرمائی تھی۔ علماء کو علم تھا کہ مرزا صاحب کے دوسرے جھوٹے دعاوی کی طرح یہ بھی پروپیگنڈے کا ایک حربہ ہے۔ اس لیے وہ مرزا صاحب کے دام میں نہ پھنسے۔

مرزا صاحب پر اولین فتویٰ تکفیر جس کے مجیب حضرت شیخ الکل اور مرتب مولانا محمد حسین بٹالوی تھے اور جو ''اشاعۃ السنۃ'' میں طبع ہوا تھا اس کی تائید کنندگان میں دیگر بہت سے علماء کی طرح غزنوی علماء بھی شامل تھے۔ مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا عبدالحق غزنوی ان بزرگوں میں نمایاں ہیں۔ مولانا عبدالجبار غزنوی تو اس فتویٰ تکفیر سے پہلے ہی میدان میں آئے تھے جیسا کہ اس خط و کتابت سے ظاہر ہوتا ہے جو مولانا بٹالوی اور مرزا صاحب کے درمیان ابتداءً ہوئی تھی جس میں مولانا نے مرزا صاحب کو مباحثے کو دعوت دی تھی۔ اور مرزا صاحب نے کہا تھا کہ بحث میں مولانا عبدالجبار کا ہونا بھی ضروری ہے یہ خط و کتاب ہم کسی جگہ درج کر چکے ہیں۔ ان تین بزرگوں کے اسماء گرامی اس فہرست میں بھی موجود ہیں جو مرزا صاحب کے اشتہار مباہلہ کے مخاطبین تھے اور جن میں سرِ فہرست حضرت سید نذیر

⇦⇦ یا کس کتاب میں انھوں نے دیکھی ہے۔ اس کے علاوہ "صاحب البیت ادری ما فیہ" کے اصول کے مطابق.... ''پیغامِ صلح'' کا یہ نوٹ پڑھ کر میں نے مولانا سید محمد داؤد غزنوی صدر جمعیۃ اہلحدیث سے اس کی تصدیق چاہی تو انھوں نے اس کو مرزا غلام احمد صاحب کا افتراء، بہتان اور کذب بیانی قرار دیا۔ اتفاق سے اس وقت جمعیۃ اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ بھی موجود تھے۔ انھوں نے بھی اس کو مرزا صاحب کی کذب بیانی قرار دیتے ہوئے اس کی اس قبیح حرکت کی مذمت فرمائی۔ اس کی مزید تحقیق اور کرید کرنے پر معلوم ہوا کہ ان دونوں کشوف کو نہ تو آپ کے خاندان اور دیگر اکابرین میں سے کوئی جانتا ہے، اور نہ آپ کی کسی تصنیف اور سوانح عمری میں اس کا کوئی نشان ملتا ہے۔ قارئین الاعتصام یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت مولانا داؤد غزنوی آپ کے پوتے ہیں اور علمی لحاظ سے اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اور حضرت شیخ الحدیث رجال اہلحدیث کی سب سے وسیع معرفت اور علم رکھنے والی ہستی ہیں۔

الغرض جناب مرزا غلام احمد صاحب وہ انسان تھے جنھوں نے حق تعالیٰ پر افتراء اور بہتان باندھنے سے بھی کبھی دریغ نہیں کیا تھا۔ اب اگر انھوں نے حضرت امام سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ پر یہ تہمت لگائی ہے، تو اس سے مسلمانوں کو حیرت نہیں ہونی چاہیے

ع خیالِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

کاش! یہ اتنا ہی سوچ لیتے کہ جس ہستی کو والیٔ افغانستان جیسی اندھی لٹھ حق سے باز نہ رکھ سکی' کیا آج اتنا کچھ پہچان لینے کے باوجود وہی ہستی قادیانیوں کا ساتھ دینے کی مرتکب ہوتی تھی؟ (عزیز زبیدی) (ہفت روزہ الاعتصام: یکم اگست 1958ء)

حسین دہلوی تھے۔ یہ اشتہار اس وقت منظرِ عام پر آیا تھا جب ایک غزنوی عالم مولانا عبدالحق صاحب کی طرف سے مرزا صاحب کو مباہلے کا معاملہ چل رہا تھا۔ اسی لیے مولانا بٹالوی نے فرمایا تھا: ''صوفی عبدالحق غزنوی و مولوی غلام دستگیر قصوری مباہلہ کو تیار ہیں۔ ان سے اب مباہلہ کیوں نہیں کرتے، اس کی وجہ معقول بیان کریں تو بدرجہ اتم میں مباہلہ کو حاضر ہوں۔''[1]

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں کو مباہلوں کے بہت بڑے بڑے چیلنج دیئے تھے۔ یہ دراصل ان کا مباحثہ و مناظرہ سے فرار کا ایک طریق تھا۔ وہ مباہلے کو اس طرح مشروط سے مقید کر دیتے کہ بعض دفعہ اس کا عملی پہلو بعید از عقل ہو جاتا پھر بھی اگر کوئی میدان میں آوارد ہوتا تو آپ مختلف حیلوں بہانوں سے بات ٹال دیتے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری کو بھی مباہلے کا چیلنج تھا جو انہوں نے منظور کر لیا تھا، پھر مرزا صاحب کی درخواست پر یہ کچھ دنوں کے لیے مؤخر ہوا۔ پھر جب وہ گویا ہوئے تو اس میں سے مباہلے کا لفظ ہی غائب تھا اور صرف خدا کی بارگاہ میں یک طرفہ دعا تک ہی محدود ہو گیا تھا۔ یہ یک طرفہ دعا مرزا صاحب کے آخری فیصلے والے اشتہار میں درج ہے جس کے تحت وہ سچے کی زندگی میں جھوٹے کی حیثیت سے فوت ہو گئے۔ گویا آغاز مباہلے سے کیا اور انجام آمنے سامنے آنے کی بجائے قادیان کے کسی گوشہ میں بیٹھ کر دعا کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اسی طرح مولانا بٹالوی سے مناظرہ اور مباحثہ کے میدانوں میں تنگ آ کر مباہلے کا ڈول ڈالا۔ امرتسر مقام متعین ہوا، لیکن پھر فرار ہو گئے۔

مرزا صاحب نے 1891ء سے 1908ء کے عرصہ میں حقیقتاً ایک ہی مباہلہ کیا جس میں ان کے مدمقابل ایک غزنوی درویش مولانا عبدالحق تھے گویا غزنوی صاحب کو مرزا صاحب کے جھوٹے ہونے پر مہر لگانے کی لازوال دولت حاصل ہے۔ یہ واحد مباہلہ امرتسر میں وقوع پذیر ہوا۔ مرزا صاحب اور مولانا عبدالحق آمنے سامنے ہوئے اور مباہلے کے طریق و قواعد کے مطابق بارگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہوئے۔

اطلاعِ عام برائے اہلِ اسلام

ازمولوی صوفی عبدالحق مباہل مرزا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں مرزا کے مباہلہ کا مدت سے پیاسا ہوں اور تین برس سے اس سے یہی درخواست ہے کہ اپنے کفریات پر جو تو نے اپنی کتابوں میں شائع کیے ہیں مجھ سے مباہلہ کر، مگر چونکہ خاص کر ان دنوں میں وہ پادریوں کے مقابلہ میں اسلام کی جنگ لڑتا ہے (ان دنوں مرزا صاحب ''آتھم'' سے مناظرہ کر رہے تھے) تو اس موقع پر میں نے

---

[1] اشاعۃ السنۃ جلد 18 نمبر 3 صفحہ 86

اور ہمارے بھائی مسلمانوں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ مرزا سے اس موقع پر مباہلہ یا مباحثہ یا کسی اور قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے تا کہ وہ پادریوں کے مقابلے میں کمزور نہ پڑ جاوے۔ لہٰذا میں نے یہ خط مسطور الذیل تاریخ 7 ذیقعد 1310ھ ارسال کیا کہ ہم کو آپ سے مباہلہ بدل وجان منظور ہے مگر تاریخ تبدیل کردو۔ وہ خط یہ ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

از طرف عاجز عبد اللہ الصمد غلام احمد عافاہ اللہ وایدہ۔

میاں عبدالحق غزنوی کو واضح ہو کہ اب جب درخواست آپ کے جس میں آپ نے مجھ کو قطعی طور پر کافر اور دجال لکھا ہے۔ مباہلہ کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے اور میرے امرتسر میں آنے کے لیے دو ہی غرضیں تھیں۔ ایک عیسائیوں سے مباحثہ اور دوسرا آپ سے مباہلہ میں بعد استخارہ مسنونہ انہی دو غرضوں کے لیے مع قبائل کے آیا ہوں اور جماعت کثیر دوستوں کی جو میرے ساتھ کافر ٹھہرائی گئی ہے ساتھ لایا ہوں اور اشتہارات شائع کر چکا ہوں اور مختلف پر لعنت بھیج چکا ہوں۔ اب جس کا جی چاہے لعنت سے حصہ لے۔ میں تو حسبِ وعدہ میدان مباہلہ یعنی عیدگاہ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ خدا تعالیٰ کاذب اور کافر کو ہلاک کرے۔

﴿وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا﴾ [الاسراء: 36]

یہ بھی واضح رہے کہ میں 15 جون کے مباحثہ میں نہیں جاؤں گا۔ میری طرف سے اخویم حضرت حکیم مولوی نور دین صاحب یا حضرت مولوی سید محمد احسن صاحب بحث کے لیے جاویں گے۔ ہاں یہ مجھے منظور کہ مقام مباہلہ میں کوئی وعظ نہ کروں صرف یہ دعا ہو۔ کہ میں مسلمان اور اللہ رسول کا متبع ہوں اگر میں قول میں جھوٹا ہوں تو اللہ تعالیٰ میرے پر لعنت کرے اور آپ کی طرف سے یہ دعا ہوگی کہ یہ شخص درحقیقت کافر و دجال اور مفتری ہے۔ اور اگر میں اس بات پر جھوٹا ہوں تو خدا تعالیٰ میرے پر لعنت کرے اور اگر یہ الفاظ میری دعا کے آپ کی نظر میں ناکافی ہوں جو آپ تقویٰ کی راہ سے لکھیں کہ دعا کے وقت یہ کہا جائے وہی لکھ دوں گا۔ مگر اب ہرگز ہرگز تاریخِ مباہلہ تبدیل نہیں ہوگی۔

لعنت الله على من تخلف منا وما حفر في ذالك التاريخ واليوم والوقت والسلام على عباده الذين اصطفى.

خاکسار غلام احمد از امرتسر ہفتم ذیقعد 1310ھ

غرض یہ کہ اب میں بری الذمہ ہو گیا ہوں اور مجھ پر کسی قسم کی ملامت نہیں۔ کیونکہ میں نے تاریخ کا بدلنا تو اس سبب سے چاہا تھا کہ اگرچہ میں اور دیگر مسلمان مرزا کو کیسا ہی گمراہ سمجھیں مگر جب وہ اسلام کی طرف سے لڑتا ہے تو ہم

سب کو بجائے بددعا کے دعا اور مدد دینی چاہیے۔ مگر مرزا نے وہ تاریخ یعنی دہم ذیقعد نہیں بدلی۔ اب میں بھی اس وقت میز پر کہ دہم ذی قعد 1310ھ بوقت دو بجے دن کے اپنا حاضر ہونا مباہلہ کے واسطے مقامِ مباہلہ میں فرض سمجھتا ہوں۔ اور وہاں جا کر لیکچر یا وعظ یا اظہار صفائی طرفین سے مطلق نہ ہوگا۔ جیسا کہ اس نے اپنے خط میں وعدہ کر لیا ہے کہ مقامِ مباہلہ میں کوئی وعظ نہ کروں گا۔

مقام عیدگاہ میں مباہلہ اس طریق پر بدیں الفاظ ہوگا:

''میں یعنی عبد الحق تین بار باآوازِ بلند کہوں گا۔ یا اللہ میں مرزا کو ضال، مضل، ملحد، دجال، کذاب، مفتری، منحرف کلام اللہ واحادیث رسول اللہ ﷺ سمجھتا ہوں۔ اگر میں اس بات میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر وہ لعنت کر جو کسی کافر پر تو نے آج تک نہ کی ہو۔''

مرزا تین بار بآوازِ بلند کہے:

''یا اللہ اگر میں ضال، مضل وملحد دجال ومفتری منحرف کتاب اللہ واحادیثِ رسول اللہ (ﷺ) ہوں تو مجھ پر وہ لعنت کر جو کسی کافر پر تو نے آج تک نہ کی ہو۔''

بعدہ روبقبلہ ہوکر دیر تک ابتہال دعا عاجزی کریں گے کہ یا اللہ جھوٹے کو رسوا کر اور سب حاضرین آمین کہیں گے۔

المشتہر: عبدالحق غزنوی از امرتسر پنجاب

مورخہ 8 ذیقعد 1310ھ مطابق جون 1891ء

اس اشتہار کے مطابق عیدگاہ امرتسر میں دونوں صاحبوں کا مباہلہ ہوا اور دونوں فریق امن وامان کے ساتھ واپس آگئے اور پھر مرزا 1908ء کو مولانا عبدالحق کی زندگی میں ذلیل ورسوا ہوکر چل بسے جبکہ مولانا عبدالحق کی وفات 16 مئی 1917ء ہے۔

مباہلے کے بعد مرزا صاحب نے پروپیگنڈہ مہم تیز کر دی مثلاً ایک واقعہ یوں ہے کہ اس مباہلے سے قبل مولانا عبد الصمد غزنوی فوت ہوگئے تھے۔ مولانا عبدالحق نے بعد مباہلہ بیوہ سے شادی کر لی اس سنت کو مرزا صاحب نے یوں ہدفِ تنقید بنایا: ''تم اپنا نکاح انعامِ الٰہی سمجھتے ہو اور تمہارا بھائی فوت ہوگیا ہے اور اس کی فرسودہ زائد تمہارے نکاح میں آئی۔ تمام عمر باکرہ نصیب نہ ہوئی یہ کیا نعمت ہوئی؟ اولاد کے لیے دن رات ہمت کرتے رہو، مردہ لڑکی بھی پیدا ہوئی تو کہنا۔''[1]

مرزا صاحب کو جھوٹ بولنے میں کوئی دریغ نہ تھا، مولانا غزنوی کی اس سے قبل دو شادیاں ہوچکی تھیں اور وہ دونوں عورتیں کنواری تھیں لیکن مرزا صاحب کو تو بات بنانا تھی، بنادی۔

---

[1] منقول از اشاعۃ السنۃ جلد 16 نمبر 5 ص 156

ضمیمہ انجام آتھم ص 27 میں فرماتے ہیں: ''عبدالحق نے اشتہار دیا تھا کہ اس کے گھر لڑکا پیدا ہوگا وہ لڑکا کہاں گیا کیا اندر ہی اندر پیٹ میں تحلیل ہوگیا یا پھر رجعتِ قہقری کر کے نطفہ بن گیا۔'' لیکن 80 سال کی تلاش و جستجو کے باوجود مرزا صاحب یا مرزائی کوئی ایسا اشتہار یا تحریر پیش نہیں کر سکے جس میں عبدالحق غزنوی صاحب نے اس مباہلے کے بعد اپنے ہاں کسی لڑکے کی ولادت کی پیش گوئی کی ہے۔ یہ مرزا صاحب کا سفید جھوٹ تھا۔ اس قسم کی پیش گوئیاں تو ان کا اپنا من پسند موضوع تھا۔

اس مباہلے کے نتیجے کے بارے میں مرزا صاحب اپنی کامیابی یوں فرماتے ہیں: ''تم سے جو ہم نے مباہلہ کیا تو چار باتیں ہمارے حق میں ظاہر ہوئیں جن سے ہماری عزت ثابت ہوئی اور تمہاری ذلت۔ ہمارے لیے رمضان کے مہینے میں کسوف وخسوف جمع ہوئے، ہمارا لڑکا بیمار تھا وہ اچھا ہوا، عبداللہ آتھم کے متعلق ہماری پیش گوئی سچی نکلی، ہماری عربی کتابوں کا کسی نے جواب نہ لکھا۔''

پھر مزید لاف زنی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اگر کوئی مصنف قسم کھا کر کہہ دے کہ ان باتوں سے ہماری عزت اور تمہاری ذلت نہیں ہوئی تو ہم تم کو 500 روپیہ انعام دیں گے۔ ہم شیخ (مولانا) محمد حسین کو منصف کر کے روپیہ جمع کروا دیتے ہیں۔'' اور جانتے ہیں کہ پھر کیا ہوا مولانا بٹالوی نے فرمایا کہ لاؤ پانچسو روپیہ میں قسم کھاتا ہوں کہ ان باتوں سے تمہارا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔'' (اشاعۃ السنۃ جلد 16 نمبر 5 ص 159) اور پھر مرزا خاموش ہوگیا۔

یہاں جن باتوں کو مرزا نے اپنی عزت کا نشان قرار دیا ہے وہ غلط ہیں: آتھم کے متعلق آپ کی پیشگوئی تھی کہ وہ فلاں تاریخ تک مرجائے گا۔ اس دوران اس پر کئی حملے بھی ہوئے لیکن وہ بچ گیا اور تاریخ مقررہ کے بعد اس کے حامیوں نے اس کے جلوس نکالے جلسے کے اشتہارات دیئے کہ جس کی موت کی پیش گوئی تم کرتے تھے وہ تو زندہ پھر رہا ہے۔ مرزا صاحب نے بات بنائی کہ وہ دل میں ڈر گیا تھا اس لیے عذاب ٹل گیا۔ لیکن بہر حال اس کی زندگی مرزا صاحب کو تسلیم تھی پھر وہ اپنی طبع موت سے تاریخ مقررہ کے بعد فوت ہوا تو مرزا صاحب نے اس کی موت کو اس تحریر میں دوبارہ اپنی صداقت کا نشان قرار دے دیا۔ کسوف وخسوف پر انہیں دو علماءِ اسلام نے بحث کر کے مرزا صاحب کے دعووں کے تار پود بکھیر کر رکھ دیئے تھے۔ در اصل مرزا صاحب کا یہ طریق تھا کہ کہیں کوئی زلزلہ آئے، کوئی بھونچال آجائے، کوئی وباء پھیل جائے، گرہن لگ جائے، وہ جھٹ سے اسے نبوت کا اشتہار بنا لیتے تھے۔ رہا عربی کتابوں کے جوابات کی بات، تو ان کتابوں میں تھا ہی کیا؟ جو کوئی جواب دیتا، نہ ان کی عبارات درست تھیں، نہ صرف ونحو کا کوئی لحاظ تھا۔ نہ انشاء پردازی کے اصولوں کا تتبع تھا۔ اس کے بارے باوجود مرزا صاحب کو دعویٰ تھا کہ یہ لاجواب ہیں۔ علماء نے کہا کہ یہ کتابیں اس لحاظ سے واقعی لاجواب ہیں کہ ان میں ایسی ایسی غلطیاں پائی جاتی ہیں جو مبتدی طلباء کی عبارات میں بھی نہ پائی جاتی ہوں۔ علماء نے ایسی اغلاط کی نشاندہی کر کے شائع کی تو آپ نے فرمایا: یہ دراصل کتابت

کی اغلاط ہیں۔ مولانا بٹالوی نے کہا: پھر میدانِ مباحثہ میں آؤ ہم ثابت کریں گے کہ یہ کتابت کی اغلاط نہیں بلکہ مصنف کی غلطیاں ہیں۔ لیکن مرزا صاحب کچی گولیاں تو کھیلے ہوئے نہ تھے کہ میدان میں آجاتے۔

مرزا صاحب خود عربی لکھنا نہ جانتے تھے بلکہ حکیم نوردین یا پھر مولوی محمد سعید طرابلسی سے لکھواتے تھے۔ اس بات کی نشاندہی علماء نے کردی تھی۔ مثلاً مولانا غنیمت حسین نے ابطالِ اعجازِ مرزا کے ص 6 میں لکھا ہے: ''مرزا صاحب نے اس (عربی) قصیدہ کو مبلغ پانچ سو روپیہ اجرت دے کر ایک طرابلسی عرب سے لکھوایا ہے۔ وہ عرب عرصہ تک حیدر آباد دکن میں تھا۔'' اس کی تائید ترجمہ کی اغلاط سے بھی ہوتی ہے کیونکہ عربی اشعار کے ساتھ جو ترجمہ اردو دیا گیا ہے اکثر جگہ دونوں عبارات میں فرق ہے اگر اردو اور عربی لکھنے والا ایک ہی شخص ہوتو ایسا ہونا مشکل تھا۔

مصر کے مشہور شاعر صادق رافعی صاحب دیوان، صاحبِ تاریخ آداب العرب نے شعبان 1321ھ میں مرزا صاحب کے اس قصیدہ اعجازیہ (عربی) کے بارے میں ایک نظم لکھی ہے جو اس کے دیوان میں موجود ہے اس کے ایک شعر کا ترجمہ یوں ہے: وائے اے سرزمین ہند اور اس کا مسیح، ہمیشہ اس گھر میں بہت ہی رہتے ہیں۔

مولانا بٹالوی کے ایک رسالہ میں بھی ایم ای آر رعنا نامی کسی شخص کا ایک اشتہار شائع ہوا جس میں انہوں نے مرزا صاحب کو ان عربی کتابوں کے مصنف ہونے سے انکار کیا۔ اور ساتھ ہی چیلنج دیا کہ وہ کسی مجلس میں آئیں وہاں ہم کچھ مواد اردو زبان کا انہیں دیں گے اور وہ وہاں بیٹھ کر اس کا عربی ترجمہ کردیں تو ہم ان کا دعویٰ تسلیم کرلیں گے۔ لیکن مرزا صاحب اپنی عربی دانی کا ثبوت دینے کی خاطر میدان میں تشریف نہ لائے۔

ان حالات میں مرزا صاحب کا یہ فرمان کہ میری کتابوں (عربی) کا جواب نہ دیا جانا میرے لیے باعثِ عزت ہے۔ قطعاً غلط ہے کیونکہ ایک تو جواب دیا گیا جیسا کہ قصیدہ اعجازیہ کا جواب اورینٹل کالج لاہور کے ایک پروفیسر نے قصیدہ رائیہ کے نام سے دیا۔ پھر لوگوں نے مرزا صاحب کی عربی انشاء پردازی کی اغلاط نکالیں اور ان کی عربی دانی کا بھرم کھول کر رکھ دیا۔ مولانا امرتسری نے بھی ان کی عربی اغلاط کی نشاندہی کی اور مولانا بٹالوی نے بھی۔

بہرحال اس مباہلے کے متعلق یہ تو مرزا صاحب کا دعویٰ تھا، اب آیئے دوسری جانب، مولانا عبدالحق نے ایک اشتہار شائع کیا جس کے آغاز میں فبهت الذی کفر لکھنے کے بعد یہ عربی شعر درج تھا:

كذبت والله فى دعوى نبوتك

تبت يداك سقلي فى غد سعرا

یعنی بخدا تو نے اے قادیانی دعویٰ نبوت میں جھوٹ بولا ہے، تیرے ہاتھ ٹوٹ پڑیں تو شتابِ دوزخ میں داخل ہوگا۔

اس کے بعد لکھا ہے: ''کیوں مرزا جی، مباہلہ کی لعنت اچھی طرح پڑگئی یا کچھ کسر ہے۔ منہ اچھا کالا ہوا یا کچھ فرق

ہے۔ پھر بھی الہام و مسیحائی کا لاف و گزاف مارو گے یا خاتمہ ہے بے شرمی کا۔ آپ تو مسیح موعود، مجددِ وقت، مہدی منتظر تھے، آپ کا دعویٰ والہام پیش گوئیاں ایسی جھوٹی و بکواس نکلیں تو تیری امت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ آپ کا الہام کیوں فیل ہوگیا۔ آپ جو فرماتے تھے کہ مباہلہ کے بعد جو باطل پر ہوگا وہ ذلیل و روسیاہ ہوگا۔ وہ سچ نکلا یا جھوٹ۔ آپ نے جو مولانا عبدالجبار کی طرف خط بھیجا تھا کہ میں اپنے الہام پر ایسا ایمان رکھتا ہوں جیسے کتاب اللہ پر۔ اب بھی وہی ایمان ہے یا کچھ فرق آ گیا۔ کیوں مرزا جی! پنڈتوں، جوتشیوں اور برہمنوں کی بھی تو کبھی پیش گوئیاں سچی نکلتی ہیں، آپ کے الہامات کیوں سب کے سب جھوٹ اور غلط نکلتے ہیں۔"[1]

مولانا غزنوی کا اشارہ اس ذلت کی طرف تھا جو مرزا صاحب کو بوجہ پیش گوئیاں بابت عبداللہ آتھم کے غلط ہونے کے پورے ملک میں تمسخر واستہزاء کا ہدف بن کر اٹھانا پڑی تھی اور اپنی عربی کتابوں کے باعث حلقہ علماء وحلقہ ثقات [میں] اپنی علمیت کا بھانڈا پھوٹنے کے باعث ذلیل وخوار ہونا پڑا تھا۔

اب ہم مباہلے کے موضوع پر ایک آخری بات بیان کرتے ہیں۔ ایڈیٹر الحکم قادیاں نے مرزا صاحب کا ایک قول نقل کیا: "سچے کے ساتھ جو جھوٹے مباہلہ کرتے ہیں وہ سچے کی زندگی میں ہی ہلاک ہوجاتے ہیں۔"[2]

اس پر مولانا ثناء اللہ 12 مئی 1916ء کے اخبار اہلحدیث میں لکھتے ہیں: "بتلاؤ! مرزا صاحب نے صوفی عبدالحق غزنوی سے جو مباہلہ کیا تھا اور فوت (عبدالحق کی زندگی میں) ہوئے تو کیا ہوئے؟ لطف یہ کہ سوائے صوفی صاحب کے کسی اور سے مرزا صاحب کا مباہلہ ہوا ہی نہیں، اصلی مباہلہ میدان عیدگاہ میں صرف انہی سے ہوا۔ جس کا نتیجہ وہی ہو جو مرزا صاحب کے درج بالا قول میں مذکور ہے۔"

قارئین کرام! غزنوی خاندان کے دیگر بزرگوں میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی خدمات در بارۂ ختم نبوت نہایت رفیع الشان ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا عرصہ خدمات 1908ء کے بعد کا ہے اور ہم فی الحال اپنے اس طویل مضمون کو مرزا صاحب کی زندگی یعنی 1908ء تک محدود رکھنا چاہتے ہیں تاکہ عوام کو پتہ چلے کہ مرزا صاحب کی زندگی میں کون کون ان کے مدمقابل تھے؟ اس لیے مولانا داؤد کی خدمات کا تذکرہ ہم چھوڑ دیتے ہیں۔[3]

---

[1] منقول از اشاعۃ السنۃ جلد 16 نمبر ایک ص 13

[2] اخبار الحکم قادیاں 10 اکتوبر 1907ء

[3] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

دار العلوم تقویۃ الاسلام، امرتسر

تحریر: پروفیسر محمد یامین محمدی (گورنمنٹ اردو کالج کراچی)

1857ء کا دور مسلمانوں کے لیے بڑا صبر آزما تھا۔لیکن علمائے حق کا ایک مقدس گروہ ایسا بھی تھا جس نے اس نازک دور میں حالات کی یکسر نامساعدت کے باوجود ایک طرف تو اپنی زبان وقلم سے عیسائی مشنریوں کے فتنہ کا مقابلہ کیا اور دوسری طرف علومِ کتاب وسنت کے لیے ایسی درس گاہیں قائم کیں جن میں تمام ہندوستان کے اطراف واکناف سے تشنگانِ علم کشاں کشاں آنے لگے ا.ران دینی مدارس کے چشمہ ہائے ہدایت وبصیرت سے سیراب ہوکر ابرِ رحمت بن کر مطلع ہند پاکستان پر اس طرح چھائے اور ایسے برسے کہ ایمان واخلاق کی مردہ کھیتیوں کو سرسبز وشاداب کر دیا۔انھوں نے اپنی ایمانی فراست سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر خطرہ کے انسداد کا سامان نہ کیا گیا اور اسلامی علوم وفنون کے قلعے نہ بنا لیے گئے تو حملہ آور غنیم ہمارے تاج وتخت کے بعد ہمارے علوم وفنون، ہماری تہذیب وتمدن، ہمارے مذہب' غرض ہر وہ چیز جس سے ہماری دینی زندگی کا تشخص ہوتا ہے' غارت کر دے گا۔اس خطرے کے پیش نظر ہی ان علمائے حق نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر بھروسا کرتے ہوئے متعدد عربی، دینی مدارس کی بنیاد ڈالی۔

امرتسر کی مشہور درس گاہ مدرسہ غزنویہ یا دار العلوم تقویۃ الاسلام مسلمانوں کے علوم وفنون کے تحفظ وبقا، اسلام کے دفاع اور مسلمانوں کی ملی زندگی کے تشخص کے اسی تصور کے پیشِ نظر قائم کیا گیا تھا۔اس درس گاہ کے قیام میں اور اس کے ذریعہ علوم کتاب وسنت کی ترویج واشاعت میں خاندانِ غزنویہ کی خدمات آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

ذیل میں اس خاندان جدِ امجد حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کی زندگی کے مختصر حالات درج کیے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ (متوفی 1298ھ) غزنی سے پنجاب تشریف لائے۔آپ کا شمار غزنی کے مشہور سادات خاندان سے تھا۔غزنی میں تمام قابلِ ذکر علماء سے علومِ متداولہ کی تحصیل کرنے کے بعد شیخ حبیب اللہ قندھاری سے قندھار پہنچ کر علم کی پیاس بجھائی اور سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی اور خلیفہ ہوئے۔علومِ حدیث کی تعلیم آپ نے شیخ الکل میاں نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ سے حاصل کی۔آپ نے غزنی میں کتاب وسنت کی تبلیغ واشاعت اور شرک وبدعات کو دور کرنے کے سلسلے میں جو کام کیے وہ اس زمانے کے لوگوں کو پسند نہ آئے۔اس وجہ سے آپ ترکِ ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لائے اور پشاور میں کچھ عرصہ قیام فرمایا۔پھر بعض احباب کی درخواست پر پنجاب کے شہر امرتسر میں تشریف لے آئے اور کتاب وسنت کی تبلیغ واشاعت میں ڈوب گئے۔توحید، اتباعِ سنت اور عقائد صحیحہ پر بہت سی کتابوں

اور رسالوں کا فارسی اور اردو زبان میں ترجمہ کرواتے رہے اور عام لوگوں کے فائدے کے لیے چھپوا کر للّٰہ تقسیم کرتے رہے۔ ان کاموں نے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی کہ امرتسر عوام وخواص کا مرجع بن گیا۔ آپ کے حلقۂ پند ونصائح میں شریک ہونے، آپ کی اقتدا میں نماز پڑھنے اور کیفیت خشوع وخضوع حاصل کرنے اور آپ کے فیضانِ صحبت سے مستفیض ہونے کے لیے صلحا وعلماء دور دور سے حاضر ہو کر اس چشمۂ ہدایت ومعرفت سے اپنی روح کی تسکین اور قلب کی تطہیر حاصل کرتے۔ آپ کے صاحب زادگان میں سے مولانا عبداللہ، مولانا احمد اور حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ قرآن وحدیث کا درس دیتے۔ اس طرح مسجد غزنویہ ایسی تربیت گاہ بن گئی تھی جہاں علم کے ساتھ عمل، قال کے ساتھ حال کی کیفیت اور علم وبصیرت کے ساتھ معرفت کا نور حاصل ہوتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد بڑے صاحبزادے' حضرت مولانا عبداللہ بن عبداللہ (متوفی 1300 ھ) ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ آپ اگرچہ تھوڑے عرصہ ہی زندہ رہے مگر اس کے باوجود آپ نے کتاب وسنت کی ترویج واشاعت اور درس وتدریس میں جو کارنامے انجام دیئے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

ان کے وصال کے بعد حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی (متوفی 1331 ھ) منصبِ امامت پر فائز ہوئے۔ آپ کے عہدِ مبارک میں روحانی فیوض وبرکات حاصل کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا اور آپ کے علم وفضل کے چرچے پنجاب سے گزر کر پورے ہندوستان' بلکہ بیرونی ممالک میں بھی پھیل گئے۔ آپ نے اپنے عہدِ مبارک میں مسجد غزنویہ کی درس گاہ کو باقاعدہ دارالعلوم کی شکل میں تبدیل کر دیا اور اس کے لیے ایک نظام قائم کر دیا۔

قیام کی تاریخ:

حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ نے اپنی فراست ایمانی اور بصیرت قلبی کی برکت سے وقت کی اہم ترین ضرورت کو محسوس کیا اور علوم کتاب وسنت اور دیگر علومِ دینیہ کی تعلیم کے لیے دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے نام سے 1319ھ مطابق 1901ء میں مسجد غزنویہ امرتسر میں ایک ایسی درس گاہ قائم کی جو پنجاب میں علمی اور روحانی فیوض کے لحاظ سے عدیم النظیر اور بے مثال تھی۔ دارالعلوم کی بنیاد کچھ ایسے مبارک وقت اور ایسے اخلاص اور حسن نیت سے رکھی گئی کہ بہت جلد اس کو قبولیت عوام وخواص کا درجہ حاصل ہو گیا۔ بہت کم عرصہ میں حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کے شاگرد دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے طلباء ملک کی مساجد میں دعوت دارشاد کا فرض بجالاتے ہوئے محراب ومنبر کی زینت کا باعث ہوئے اور پنجاب کے اکثر دینی مدارس میں مدرسی کے فرائض بجالانے لگے۔ ان کی برکت سے شہروں سے گزر کر دور دراز قصبات ودیہات تک میں قال اللہ وقال الرسول کے غلغلے بلند ہوئے، جہل کی تاریکیوں کی جگہ علم وبصیرت کے چراغ روشن ہو گئے۔ غرض علم ومعرفت کا یہ شجر طیبہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام ایسا سرسبز اور بارآور ہوا کہ اس کے گل داثمار ہزاروں لاکھوں مومنین کے قلوب وارواح کے لیے حیات بخش ثابت ہوئے۔

مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد آپ کے بھائی حضرت مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی رحمہ اللہ جنھیں اللہ تعالیٰ نے فصلِ خطاب وحسنِ بیان اور فہم قرآن میں حظ وافر عطا کیا تھا، مسند خلافت ودرس وتدریس پر متمکن ہوئے اور زمامِ اہتمام مدرسہ ان کے دستِ مبارک میں آئی۔ انھوں نے اسی طرح علومِ نبویہ کی خدمت اور توحید وسنت کی اشاعت کی، جس طرح ان کے اسلاف کرتے آئے۔

حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ کی رحلت کے بعد حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ سے دارالعلوم کا کام سنبھالنے کی درخواست کی گئی۔ مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کا دور دارالعلوم تقویۃ الاسلام کا زرّیں دور ہے۔ ان کے دور میں دارالعلوم نے بے انتہا ترقی کی۔ کیونکہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے' ایک بہت زبردست عالم، بے مثال خطیب، تحریک آزادی کے بہترین رہنما، علم وعمل کے منبع، طریقت وشریعت کے ماہر، ہر طبقہ میں مقبول، تحریک پاکستان کے سپاہی اور معتدل مسلک کے حامل تھے۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ اگست 1895ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم مولانا سید عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ اور مولانا عبدالاول غزنوی رحمہ اللہ سے حاصل کی۔ مولانا گل محمد سے اردو اور حساب کی تعلیم حاصل کی۔ پھر دہلی میں حضرت مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی قائم کردہ درس گاہ میں مولانا عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ علوم عقلی میں مولانا سیف الرحمن کابلی سے استفادہ کیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد امرتسر واپس آگئے اور بڑی مستعدی اور ذوق وشوق کے ساتھ اپنی آبائی درس گاہ یعنی مدرسہ غزنویہ میں تفسیر اور حدیث کی تدریس کا کام سرانجام دیتے رہے۔ اسی زمانے میں تدریس کے ساتھ ساتھ تبلیغ واشاعت اسلام، تحریک آزادی وطن میں اپنی دلچسپی اور کمالِ خطابت کی وجہ سے امرتسر میں ایک مقام پیدا کرلیا تھا۔

1919ء میں تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔ 1921ء میں جمعیت علمائے ہند کی تشکیل وتاسیس میں مؤثر کردار ادا کیا۔ ابتدا میں مجلس عاملہ کے رکن اور پھر مدتوں نائب صدر رہے۔ اسی سال برطانوی سامراج کے خلاف اس قدر گرج دار آوازہ بلند کیا کہ تین سالوں کے لیے میانوالی جیل میں بھیج دیئے گئے۔ رہا ہونے کے بعد اسی شان کے ساتھ آوازہ حق بلند کیا اور 1925ء میں دوسری بار گرفتار ہوئے۔ اس دفعہ انھوں نے جیل میں قیدیوں کے ساتھ حکام کے غیر انسانی سلوک کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ سیاسی نظر بندوں کو مناسب مراعاۃ دے۔

1927ء میں انھوں نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور تیسری بار قید وبند کی آزمائش سے دوچار ہوئے۔ یکم اپریل 1927ء کو امرتسر سے ہفتہ وار اخبار توحید کا پہلا شمارہ نکالا جو ایک سال جاری رہنے کے بعد بند ہوگیا۔ 1929ء میں چند خلافتی ساتھیوں کو ساتھ لے کر انھوں نے مجلس احرار کی بنیاد ڈالی۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کے اشتراک اور تعاون سے انھوں نے مجلس احرار کے پہلے سیکرٹری کی حیثیت سے دو اڑھائی برس کے مختصر

عرصے میں ایک منظم اور جان دار تحریک بنا دیا۔ 1932ء میں جب احرار نے تحریک کشمیر شروع کی تو وہ گرفتار کر لیے گئے۔ 1942ء میں جب کانگریس نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی مہم شروع کی تو وہ کانگریس میں شامل ہو گئے اور اس کام میں بھرپور حصہ لیا اور گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں پنجاب کانگریس کا صدر منتخب کر لیا اور وہ اس جماعت کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعد میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ مسلم لیگ کو اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ مسلم لیگ کی سول نافرمانی کے پہلے روز ہی نواب ممدوٹ اور مولانا داؤد کے علاوہ ورکنگ کمیٹی کے تمام اراکین گرفتار کر لیے گئے۔ نواب ممدوٹ بھی گرفتار ہوئے اور ان کے بعد تحریک چلانے کی ذمہ داری مولانا کے کندھوں پر آ پڑی۔

1947ء میں تقسیم ملک کے بعد جماعت اہلحدیث کی ازسرِنو تنظیم کی، جماعت میں رکن سازی کا شعور پیدا کیا، مجلس شوریٰ قائم، دستور مرتب کیا اور سالانہ کانفرنسیں قائم کیں۔ تادمِ حیات اس کے صدر رہے۔

تحریک ختم نبوت میں زبردست حصہ لیا۔ 1958ء میں جب پاکستان میں مارشل لا نافذ ہوا تو اس کے خلاف آوازہ حق بلند کیا۔ فروری 1960ء میں سابق صدر ایوب خان نے ملک میں آئندہ دستور کے لیے ایک آئین کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن کی طرف سے چالیس سوالات پر مشتمل ایک سوال نامہ مرتب کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں 19 علما کو اکٹھا کر کے جواب کا مسودہ تیار کر کے انھوں نے مکمل جمہوریت، اسلامی اقدار اور پارلیمانی نظامِ حکومت کے قیام کی تائید کی تھی۔

مئی 1962ء میں شاہ سعود بن عبدالعزیز نے انھیں مدینہ یونیورسٹی (سعودی عرب) کی کونسل کا رکن نامزد کیا اور اس کے افتتاحی اجلاس میں بھی شریک ہوئے۔

مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد جماعت کے مخلصین اور تمام خاندان کے افراد کے بے حد اصرار پر مولانا نے دارالعلوم کی تمام ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر اُٹھا لی۔

مولانا اعلائے کلمۃ الحق کی پاداش میں کئی بار نظر بند ہوئے۔ مگر ان کے عزم وہمت کا یہ عالم تھا کہ وہ قید وبند کی سختیاں بھی جھیلتے رہے اور دارالعلوم بھی چلاتے رہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''اس دور میں دارالعلوم کے لیے وقت بڑا نازک تھا۔ جب کہ انگریزی حکومت نے مجھے گذشتہ عالمگیر جنگ کے زمانے میں نظر بند کر دیا اور تین سال کی نظر بندی کے عرصہ میں مجھے دارالعلوم کی نگرانی سے مجبوراً محروم ہونا پڑا۔''

اس نظر بندی کے عرصہ میں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ دارالعلوم کی نئی عمارت بنائی جائے جو تمام ضروریات کے لیے کفیل ہو سکے، چنانچہ تیس ہزار روپے کے صرف سے تین منزلہ خوبصورت عمارت مسجد غزنویہ کے ساتھ ہی تعمیر کی گئی۔ خوبصورتی کے علاوہ اس کی پختگی اور مضبوطی کا خیال اس درجہ رکھا گیا کہ اس کی چھتیں لوہے، سیمنٹ اور کنکریٹ سے تیار کی گئیں اور تمام عمارت سیمنٹ سے تیار کی گئی۔ لیکن افسوس کہ تین چار ماہ سے زیادہ عرصہ دارالعلوم کی اس نئی بلڈنگ میں

رہنے نہ پائے کہ 1947ء کا انقلاب اپنے تمام فتنوں اور بربادیوں سمیت آ گیا۔

1947ء کے خونین انقلاب میں دارالعلوم پر کیا گزری، مولانا یوں رقم طراز ہیں:

''اگرچہ ہندوستان کی تقسیم مسلم لیگ اور کانگرس کے باہمی سمجھوتے سے ہوئی اور دوسرے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعتوں کی رضامندی سے ہوئی۔ لیکن اس تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا جبری اخراج، مسلمانوں کا قتل عام، مسلم خواتین کی بے حرمتی، مسلمانوں کے مال ومتاع کی تباہی و بربادی، مسلمانوں کی مساجد اور مدارس کا تاخت و تاراج کرنا' راشٹریہ سیوک سنگھ، سکھوں اور کانگریسیوں کی باہمی سازش کے نتیجہ کے طور پر اس وحشت اور بربریت کے ساتھ عمل میں آیا کہ قرون مظلمہ کی تاریخ میں بڑے سے بڑے جلاد وسفاک اور درندہ خصلت حکمرانوں یا فاتحوں کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ مشرقی پنجاب میں امرتسر اس ہولناک بربریت اور سفاکی سے بڑا متاثر ہوا۔

ہماری تاریخی مسجد ''مسجد غزنویہ'' بھی جلا دی گئی۔ مسجد غزنویہ کے ساتھ مدرسین کی رہائش کے مکانات بھی جلا دیئے گئے۔ دارالعلوم کی تاریخی لائبریری جو بڑی نادر اور بیش قیمت کتابوں پر مشتمل تھی، برباد کر دی گئی۔ بزرگوں کے وقت سے اس لائبریری میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس عاجز نے مصر اور ہندوستان کے بڑے بڑے کتب خانوں سے جدید مطبوعات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اس میں شامل کیا تھا۔ قرآن مجید کی تمام تفاسیر، کتب احادیث اور ان کی شروح، کتب فقہ ائمہ اربعہ اور ان کے بڑے بڑے مجموعے، فتاویٰ، ادب اور تاریخ' غرض تمام علوم کی بہترین کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا اور تمام درسی کتابوں کے ایک ایک کے بیسیوں بلکہ پچاسیوں نسخوں کی کئی الماریاں بھری پڑی تھیں، جو آج ہزاروں روپے خرچ کرنے پر بھی نہیں مل سکتیں۔ افسوس کہ سکھوں اور ہندوؤں کی اسلام دشمنی بلکہ مسلم دشمنی کی وجہ سے وہ ذخیرہ برباد ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہمیں اپنے مکانات کی تباہی وبربادی کا اتنا صدمہ نہیں' جتنا اپنے کتب خانہ کے ضائع ہونے کا صدمہ ہے، کیونکہ اب وہ کسی قیمت پر بھی نہیں مل سکتا۔''

پاکستان کے قیام کے بعد اس دارالعلوم کے دوبارہ اجراء کا مسئلہ پریشان کن تھا۔ لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور مولانا کی مساعی جمیلہ سے دارالعلوم کو شیش محل روڈ کی موجودہ عمارت میسر آ گئی۔ لیکن اس وقت درس و تدریس کے آغاز کے لیے ایک کتاب بھی موجود نہ تھی۔ توفیق الٰہی شامل حال ہوئی اور شروع میں صرف درسی کتابیں خریدی گئیں۔ لیکن بتدریج تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، تصوف اور دوسرے علوم وفنون پر تمام اہم اور مستند درسی کتابیں خریدی گئیں، اور یوں تھوڑے عرصے میں اس دارالعلوم کا کتب خانہ پھر علمی ذخائر سے مالا مال ہو گیا۔

کتب خانہ غزنویہ متعدد اعتبار سے گنجینۂ گوہر تھا، ہر علم وفن سے متعلق بہترین کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ تفسیر،

حدیث، فقہ، احادیث کی شروح، کتب تصوف، کتب ائمہ اربعہ اور ان کے بڑے بڑے مجموعے، فتاویٰ، ادب اور تاریخ سے متعلق بے شمار نادر و نایاب کتب موجود تھیں۔ ان میں اس خاندان کے افراد مولانا عبدالاول غزنوی وغیرہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کتب احادیث وغیرہ کے متعدد قلمی نسخے اور بے شمار درسی وغیر درسی کتابیں موجود تھیں۔ مولانا داؤد غزنوی اس میں بے بہا اضافہ فرماتے رہتے تھے، مصر و بیروت اور دیگر ممالک میں شائع شدہ تازہ ترین مطبوعات زرِ کثیر خرچ کر کے منگاتے تھے، ان کا مطالعہ فرماتے اور جگہ جگہ خوشی سے اس میں اضافہ فرماتے رہتے تھے۔ اگرچہ 1947ء میں خونین انقلاب کی وجہ سے یہ کتب خانہ ضائع ہو گیا مگر قیام پاکستان کے بعد لاہور میں جب دارالعلوم قائم کیا گیا تو اس کے کتب خانہ میں بے بہا اضافہ کیا گیا۔ اگرچہ اس کتب خانہ کی اب وہ بات تو نہ رہی جو تقسیم ملک سے قبل تھی مگر مولانا محمد داؤد مرحوم کی کوششوں اور کاوشوں سے اب اس کتب خانہ میں نادر و نایاب اور بے شمار مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے جس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہو رہا ہے۔

ہمارے دینی مدارس میں عام طور پر جماعت بندی کا خیال نہیں کیا جاتا تھا اور نصابِ تعلیم پر جمود طاری تھا۔ مولانا داؤد نے جماعت بندی، اصلاحِ نصاب، عرصہ تعلیم کا تعین ایسے اہم امور پر توجہ فرمائی۔ قرآن وحدیث اور فقہ کے علاوہ صرف ونحو، منطق وفلسفہ اور بلاغت وادب کے نصاب میں ضروری تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے زمانے میں دارالعلوم ازسرنو وجود میں آیا۔

مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی وفات (16 دسمبر 1963ء) کے بعد دارالعلوم کو چلانے کی ذمہ داری ان کے صاحبزادے پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کو سونپی گئی جو تاہنوز اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔

سید ابوبکر غزنوی کے زمانے میں معاشرے کے افراد کی ذہنی اور روحانی پرورش کے لیے مکتبہ غزنویہ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جو اسلامی نظریۂ حیات کے مختلف پہلوؤں پر مثبت انداز میں مقالے چھاپنے کا اہتمام کرتا ہے۔ یہ مقالے خاص طور پر ڈاکٹروں، وکیلوں، سرکاری افسروں، انجینئروں، پروفیسروں اور طالب علموں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔[1]

---

[1] علم وآگہی (جلد دوم، ص: 36) (گورنمنٹ نیشنل کالج۔ کراچی)، خصوصی شمارہ [برصغیر پاک وہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے] 1974۔75ء

(باب دوم)

مولانا سید عبداللہ غزنوی

حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

تحریر: مولانا محمد صدیق جھنگوی

اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ عملی زندگی کا جذبہ سرد پڑتا جا رہا ہے۔ بالخصوص تقویٰ و اخلاص جو ہماری دینی زندگی کا جزوِ لاینفک بلکہ اس کی اساس تھا' دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ البتہ جہاں تک قال و گفتار کا تعلق ہے وہ بے شک پوری تیزی سے اوجِ کمال پر پہنچ چکا ہے۔ اس کی زوردار پرواز ہر آن رفعت و بلندیوں سے ہمکنار ہو رہی ہے۔ بحر و بر کی فضا ہو یا دیار و صحرا کی، علمبردارانِ وعظ و تبلیغ کی مجالس سے پوری طرح متمتع ہو رہی ہیں۔ اب جہالت و ناواقفی کے سب عذر لنگ ختم ہو چکے ہیں۔ شرعی مسائل سے سب لوگ واقف ہو چکے ہیں۔ مگر اس غلبہ قال و طنطنہ تبلیغ دین کے باوجود عمل و حال کی حالت ہر لحظہ رو بہ انحطاط و تنزل ہے۔ مسجدیں آج مضطرب سجدوں سے خالی ہو رہی ہیں۔ منبر و بازار یکساں صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ کردار و سیرت کا میدان ویران نظر آ رہا ہے۔ ذکر و فکر کی محفلیں لطفِ عبادت کی مٹھاس سے یکسر خالی ہوتی جا رہی ہیں۔ صحیفہ اعمال کے اوراق سے صفحہ اخلاص حرفِ غلط کی طرح مٹتا نظر آ رہا ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ ہمارے مواعظ حسنہ و تقاریر کے اجتماعات میں، درس گاہوں و مدارس کی صفوں میں، رشد و ہدایت کے مراکز میں اور خاص کر پیرانِ معرفت و طریقت کی جلوتوں میں طہارتِ روح، تصفیہ قلب و تزکیۂ نفس اور رضائے الٰہی کا نام تو پوری شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے اور ایسی مجالس منصۂ شہود پر ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ مگر یہ کتنے افسوس و حیرت کا مقام ہے کہ وہ روح و داعیۂ اخلاص جس سے دلوں کی عمیق گہرائیوں کو منور و آراستہ ہونا چاہئے تھا، جس سے عابد و معبود و ساجد و مسجود کے مابین رشتۂ محبت استوار ہونا چاہئے تھا وہ کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ حقیقت ہر صاحبِ فکر و فہم پر کماحقہ آشکار ہو جاتی ہے کہ اسلام کا مقصود اصلی یہی خلق باللہ، تقویٰ اور جذبۂ اخلاص و مؤدّت ہی مطلوب تھا مگر آہ اسی سے آج ہم نے کمال درجہ کی بے اعتنائی و لاپرواہی اختیار کر لی ہے۔ یہ کتنے صدمہ کی بات ہے کہ ہم نے جھوٹی ناموری و سستی شہرت کے لئے تو زندگی کی تمام کوششوں کو صرف کر ڈالا ہے۔ مگر جو ہر اخلاص اور روح طہارت نفس ہی کو ہم نے درخورِ اعتناء نہ سمجھا۔ آج فی الحقیقت ہماری حالت یہی ہے ؎

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

آیئے چند لمحات مقبولانِ بارگاہ قدس کی معیت میں گزاریں۔ ممکن ہے ان کے فیضِ صحبت سے ہماری مشکل حالت

میں کوئی تبدیلی ظاہر ہو۔ اقلیم ولایت کے عظیم تاجدار محبتِ الٰہی میں ہمہ وقت سرشار حضرت عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ نے بحوالہ شرح بخاری ایک مخلص بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن ایک اہل دل فقیر کے پاس آیا اور دعا کی استدعا کی تو اُس فقیر نے صرف انکساری و تواضع کی بنا پر کہہ دیا:

بَلْ أَنْتَ الَّذِيْ يَنْبَغِيْ أَنْ تَدْعُوْنِيْ لِأَنَّكَ مِنْ عُلَمَاءِ الْمُسْلِمِيْنَ وَفُقَهَائِهِمْ.

(بلکہ آپ کو چاہئے کہ میرے حق میں دعا کریں کیونکہ آپ مسلمانوں کے بڑے عالم ہیں)

اتنی سی بات پر اس خدا رسیدہ عارف باللہ بزرگ کی حالت بدل گئی:

فَلَمْ يتمانك رحمه الله أن غلبته الدموع حتى كادت نفسه تذهق من كثرة بكائه وهو يردد ويقول مثلي يخشب من العلماء والله ما يكون العالم عالما حتى لا يخرج نفسه إلا لله وبالله لا ياكل ولا يشرب ولا يقوم ولا يجلس ولا يتكلم ولا يسكت إلا لله وبالله عزوجل.

یہ بزرگ اپنے اوپر قابو نہ پا سکا۔ شدید گریہ وزاری کے باعث ان کی حالت غیر ہوگئی اور ممکن تھا کہ شدت سے رونے کی وجہ سے جان بحق ہو جائیں۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے: کیا مجھ جیسا علماء میں شمار ہو سکتا ہے؟ قسم بخدا عالم تو اُس وقت تک عالم کہلانے کا مستحق نہیں جب تک کہ اُس کے تمام کام اللہ عزّ وجل کی رضا کے لئے نہ ہو جائیں۔ (یعنی اُس کا کھانا پینا، اُٹھنا اور بیٹھنا، بولنا اور خاموش ہونا یہاں تک کہ اُس کے سازِ وجود سے نکلنے والا سانس بھی اللہ عزّ وجل کی رضا جوئی سے مخمور ہو۔)

یہ تھے ہمارے بزرگانِ سلف جن کے مقدس کردار کی امانت کو ہماری تاریخ نے پوری دیانت سے محفوظ رکھا ہے۔ مگر آج ایسے باکمال و باخدا لوگ کہاں ہیں، جن کے قلوب واذہان صحیح معنوں میں خوفِ خدا سے لبریز تھے، جن کی نگاہیں ہمیشہ لذتِ ایمان سے مسرور رہتی تھیں، جو رضائے الٰہی کے جذبہ سے معمور رہتے تھے، جن کی مجلسی اثر انگیزیاں رحمت خدا سے موجزن رہتی تھیں، جن کے دیکھنے سے یادِ خدا آجاتی تھی۔ جو بولتے تھوڑا اور سوچتے زیادہ تھے، جو سوتے کم اور جاگتے زیادہ تھے، جو بے معنی ہنستے نہیں تھے بلکہ خشیت الٰہی سے ہر وقت متفکر و آبدیدہ ہوتے تھے۔ جن کے منور چہرے رات کی عبادت کے باعث پھولوں کی طرح نکھرے ہوئے تھے، جن کی جبینیں خدائے برتر کے حضور جھک جھک کر ماسویٰ اللہ سے بے نیاز ہو چکی تھیں، جن کے ہاتھوں کی عمیق لکیروں میں جذبۂ ایمان کی سرشاری کا عنوان عیاں و واضح نظر آتا تھا، جن کے فکری و نظری احساسات واثرات سر کی آنکھوں سے دیکھے جا سکتے تھے۔ کیا ایسے پاکباز خدا ترس دیدہ ور لوگ ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئے۔ کس قدر پاکیزہ ماحول تھا ان کا اور کتنا ازکیٰ واطہر موضوع گفتگو تھا ان معبودانِ بارگاہِ الٰہی کا۔

آسمان سجدہ کند بر سرِ خاکے کہ برد
یک دو تن یک دو نفس بہرِ خدا بنشیند [1]

قطب الاقطاب [2] حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ جن کی پوری حیات مستعار اسی وادیٔ ذکر وفکر میں گزر گئی اور درود عشق کے لئے حرب وضرب، حلق واسیری کے مراحل پیش آئے۔ ہجرت وجلا وطنی کی منزلوں سے کئی بار گزرنا پڑا۔ مگر گوشۂ زبان پر کبھی بھی حرفِ شکایت تک نہ لائے۔ بلکہ ان مصائب وشدائد کو خدائے محسن کا احسانِ خصوصی یقین فرمایا۔ پھر بھی حالت انکساری وتواضع کا یہ مقام تھا کہ جب کبھی اعمال وعبادات کا تذکرہ فرماتے تو یہی کہتے:

ہمہ عمر گذشتہ وہیچ آز مانشد ومرضیات رب عزیز۔

''تمام عمر یونہی گزر گئی ہم سے تو اپنے ربِ عزیز کی رضامندی کا کوئی کام نہ ہو سکا۔''

یہ اس فقیر ولی کامل فنا فی اللہ کا قول ہے جس نے کبھی بھی اپنا قدم حیطۂ رضائے الٰہی سے باہر نہیں اُٹھایا۔ ایک مقام پر اپنے لواحقین ومعتقدین کو رضاء الٰہی کی تلقین فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

اخوان وعزیزاں رالازم کہ دنیاونی را روز چند دانستہ درطلب مرضیات اوتعالیٰ بجان ودل کوشند وزندگانی آیامی رااندک دانستہ درابتغائے وجہہ اللہ کمرِ ہمت راچست بندند۔

''عزیزان برادران کو چاہئے کہ دنیائے دون کو چند روزہ سمجھیں اور حصولِ رضائے تعالیٰ واعلیٰ میں جان ودل سے کوشش کریں۔ زندگی کے دن تھوڑے ہیں۔ خدا کی رضا میں پوری ہمت سے کمربستہ ہو جایئے۔''

رضائے الٰہی کا اثر:

یہ آج کل ہماری کوتاہ اندیشی وکج فکری کا نتیجہ ہے کہ ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ دیکھنے والوں کی نگاہ ودل میں ہماری عزت ووقار اور شوکت وعظمت کا سکہ تب جاکر بیٹھتا ہے کہ ہماری ظاہری وضع ولباس میں فیشن کی طراری ہو جو ہر طرح سے جاذبِ نظر وموجبِ کشش ہو اور ہمارے وعظ ونصائح میں نری خوش الحانی اور تڑپا دینے والی شعر گوئی ہو۔ ہوسکتا ہے اس طرح سے وقتی طور پر ہر جانب سے تحسین وآفرین کی صدائیں بلند ہو جائیں یا اس سے زیادہ جذباتی نعروں سے فضا

---

[1] آسمان باوجود اپنی وسعت اور رفعت کے، زمین کے اس حصے کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے سجدہ تعظیم بجالاتا ہے جہاں ایک دو آدمی چند لمحات اللہ کی رضاء کے لئے یکجا ہو کر بیٹھے ہوں۔

[2] ہم اس لفظ کو حذف کر سکتے تھے مگر ہم نے اسے باقی رکھا تا کہ یہ کہہ سکیں کہ یہ عجمی طریق خطاب بالخصوص اہل توحید کے علمبرداروں کے ہاں یکسر غلط ہے۔ اولاً تو قطب، غوث اور اس قسم کے الفاظ ہی در دزوال اور اسلام میں عجمی تصوف کی آمیزش کی علامات ہیں۔ ثانیاً: اب اچھے بھلے دین داروں نے القاب کی طویل طویل فہرستیں جس سہل نگاری، بے احتیاطی بلکہ بے رحمی سے استعمال کرنا شروع کی ہیں ناگزیر ہے کہ اس سے لوگوں کو روکا جائے اور پھر سے اسلاف کے سادہ اسلوب بیان کو اختیار کیا جائے۔ (المنبر)

گونج جائے اور مدح و توصیف کے لئے چند زبانیں واشگاف ہو جائیں۔ لیکن یاد رکھئے صحیح معنوں میں حقیقی اثر اور دیر پا کشش و انقلاب اُسی زبان میں ہوگا جو خود عمل و کردار میں رنگین ہو گی۔ دلوں میں تاثیر ہمیشہ اُس علم و قلم سے برپا ہو گی جس کا تعلق ایسے دل سے ہوگا جو چاشنیٔ ایمان سے لذت آشنا ہوگا اور محبّت خدا میں سرشار و معمور۔ کیونکہ ظاہر تو باطنی شعاعوں کا پرتو و عکس ہے۔ جس طرح کی واردات قلب پر ہوں گی ویسے ہی اثرات سننے اور دیکھنے والوں پر اثر انگیز ہوں گے۔ راقم الحروف سے خود اس قسم کے اثر و تاثیر کا دل گیر واقعہ پیش آیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ طبع افتاد کے باعث بچپن سے ایسے شعر و ابیات یاد کرنے اور لکھنے لکھوانے کی عادت پڑ گئی جو محبت آمیز دالفت و پیار کا مظہر ہوں۔ جو احباب کو لکھے اور ہم نشینوں میں پڑھے جاتے۔ اگر چہ ایسے اشعار کی مذمت کا علم تھا اور علماء سے کئی بار اُن کی بد انجامی اور سیاہ کاری کے متعلق سُنا بھی۔ مگر دل میں کبھی بھی اُن سے دستبرداری کا یارانہ ہو سکا۔ اور یہ توفیق نہ ہو سکی کہ ان سے بچ سکوں۔ پھر ایک رات جو کہ میری قسمت و نصیب کی سربلندی کی رات تھی کہ امام الزمان جناب حضرت عبداللہ الغزنوی علیہ الرحمۃ کے مکتوباتِ گرامی پڑھ رہا تھا۔ ان کے اثرات سے دل میں اتنی رقت پیدا ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی اتنا اثر نہ ہوا تھا۔ چنانچہ آپ کے ایک مکتوب مبارک میں اس قسم کے اشعار کی مذمت سامنے آئی جس میں آپ جناب نے صاحبزادگان کو در بابِ تقویٰ ہدایت فرماتے ہوئے لکھا ہے: از خواندان ابیات و شنیدن آن پرہیز کلی باید کرد کہ محققین نوشتہ اند کہ زناء زبان است (ترجمہ: ابیات واشعار کے پڑھنے و سننے سے کلی اجتناب کر لیں کیونکہ محققین نے لکھا ہے کہ یہ زبان کا زناء ہے۔) بس صرف اس ایک ہی جملے کے اثر سے تمام گیتوں، نعتوں اور شعروں سے طبیعت میں اتنی نفرت پیدا ہوئی کہ اب خود پڑھتے تو کجا اگر کوئی بھی پڑھ رہا ہو تو ان کی خباثت باطنی و فحش کاری سے طبیعت متنفر ہو جاتی ہے تو میں سمجھتا ہوں یہ اثر جو ان الفاظ میں ودیعت فرمایا گیا ہے یہ اُس بزرگ کی نیک سیرت اور پاکبازی کا نتیجہ ہے۔

علماء و طلباء سے:

دین متین کے ہر مبلّغ اور ملت حقہ کے ہر فرد کو چاہئے کہ ہر نیک کام و عمل صالح کرتے وقت ہمیشہ رضائے الٰہی کو مطمح نظر بر بنائے اور اس کو اپنی زندگی کا حقیقی مقصد سمجھے۔ اس سے دو فائدے حاصل ہوں گے، ایک تو عنداللہ ثواب حاصل ہوگا، دوسرا اس کام میں برکت وافر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کی کارگزاریوں میں درد و حظ کا حصہ وافر ہوتا تھا۔ اُن کے وعظ و باتیں بے حد پیاری ہوتی تھیں۔ دل کے طاقچوں سے گزر کر باطنی دنیا میں ولولۂ ایمانی و حرارتِ عمل پیدا کر دیتی تھیں۔

عارف باللہ حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ جب غزنی افغانستان سے ہجرت کر کے امرتسر بستی خیر دین میں سکونت پذیر ہوئے تو ان دنوں آپ کے خلف الصدق سیّد احمد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کچھ تنگی و عسرت کی حالت میں تھے۔ آپ دن رات اللہ عزّ و جل سے کشادگیٔ مال کی دعا کرتے رہتے۔ تو انہی ایام میں ایک رئیس خانان محمد حسن خان کی طرف سے طلبی نامہ

آ گیا کہ آپ میرے پاس آ جائیں ہر طرح سے خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ فرماتے ہیں: اس طلبی نامہ سے دل میں خوشی پیدا ہوئی مگر جناب والد محترم و مکرم سے مشورہ و اجازت کا مرحلہ باقی تھا۔ حاضر خدمت اقدس ہو کر سب معاملہ پیش کر کے طالبِ اجازت ہوا۔ تو آپ نے فرمایا: لختِ جگر کچھ توقف کیجئے۔ سوچ کر جواب دیا جائے گا۔ چنانچہ آپ نے کچھ دن مراقبہ فرمایا۔ اُس کے بعد بُلا کر پاس بٹھایا اور نہایت پُر تاثیر انداز سے درجِ ذیل وصیت فرمائی جس کا ایک ایک حرف لوہے کی میخ کی طرح میرے صفحۂ قلب پر پیوست ہو گیا۔ فرمایا:

''اے فرزند دلبند میں نے اپنی اولاد کے لئے کوئی سامانِ دنیا وراثت کے لئے نہیں چھوڑا حتیٰ کہ عزت و جاہ بھی نہیں چھوڑی۔ میرے ورثاء کے لئے میری میراث صرف اللہ عزّوجل کی محبت و توحید ہے۔ میں نے اپنے فرزندوں کو ربِّ عزیز کی امانت سمجھتا ہوں اور مجھے یقین محکم ہے کہ میرا خدا عزّوجل میری امانت کو ضائع نہیں فرمائے گا۔ میرے بیٹو! جب بھی تم پر وقت عسرت و تنگی آ پڑے تو بارگاہِ ایزد متعال میں عاجزی سے یہ عرض کر دینا۔ یا رب العالمین! ہمارے والد محترم نے جو تیرا بندہ تھا ہمارے لئے دنیاوی جائداد سے کوئی میراث نہیں چھوڑی وہ تیرے ہی سپرد کر گیا ہے۔ ان شاء اللہ خدائے رزاق اس طرف سے کشادگی و گزران کا سبب بنا دے گا جہاں سے تمہیں وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔ باقی رہا مراد خانان کی ہم نشینی کا معاملہ تو گوشِ قلب سے سُن لو: ہوش کنید کہ اکون و میلان ظلم و اہلِ دول از امرا و خانان پر خدر باید بود کہ ہمنشینی و اختلاط بادشاں سم و زہر قاتل بس کلام الٰہی را ربیع قلب و نور صدر و جلاء حزن و ذہاب ہم باید ساخت و ہر روز ازاں چیزے باید خواند (ترجمہ: مگر ظالموں اور دولت مند خانان کی صحبت و مجلس سے سخت پرہیز کیجئے کیونکہ ایسے رؤسا و مجرمین سے ہم نشینی اور راہ و رسم زہر قتل ہے۔ بس کلام اللہ کو ہی اپنے دلوں کے لئے بہار اور سینوں کا نور، غموں کے لئے جلاء اور تمام فکرات کے لئے اکسیر جانیں اور ہمیشہ اسی کتابِ حق کی تلاوت کو لازم رکھیں)۔''

دیکھئے اس وصیت مبارکہ کے الفاظ میں روحانی زندگی کی بیداری کے لئے کتنا سامانِ درد ہے۔ اصلاحِ نفس کے ہر خواہش مند کو چاہئے کہ ہمیشہ اپنے پیارے رب تعالیٰ کے پیارے کلام کو اسی انداز سے پڑھے۔ واقعی اس کلامِ مبین کے ایک ایک لفظ میں کروڑہا رحمتیں اور برکتیں ہیں۔ حبِ الٰہی کے متلاشیان و رضائے الٰہی کے طالبان کے لئے آبِ حیات ہے۔ اگر قرآنِ پاک کی تلاوت کے وقت اس کے ارشاداتِ عالیہ میں خاص کر اُس کے اوامر و منہیات اور مُنذرات و مبشرات احکام و حقائق پر فکر و تدبّر کیا جائے تو ضروری طور پر دل کے دریچوں میں اثر و پختگیٔ ایمان کا جذبہ ہو جاتا ہے۔ حرام نظر و فکر سے نفرت ہونے لگ جاتی ہے اور اپنے مربیٔ حق تعالیٰ سے محبت کا دریا بہنے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح سے ان شاء اللہ جن اثرات کا قرآن حامل ہے وہ ظاہر ہو سکتے ہیں۔

ایک مقام پر فخر الفقراء حضرت عبداللہ الغزنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کئی بار ایسا ہوا کہ طبیعت میں اندوہ و غم اور

پریشانی پیدا ہوئی تو بارگاہِ ایزدی سے یہ الہام ہو گیا:

هذا كتابي وهذا عبادي فاقرأ كتابي على عبادي.

"یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے بندے ہیں، تو پڑھ میری کتاب میرے بندوں پر۔"

فرماتے ہیں: اس سے مجھے روحانی زندگی مل جاتی اور تمام قسم کے ہم وغم دور ہو جاتے ہیں اور طبیعت میں نہایت لطیف فرحت وخوشی آ جاتی۔ یہ بھی اپنا اپنا مقدر ونصیب ہے۔

علی الصبح چو مردم بہ کاروبار روند
بلا کشانِ محبت بہ کوئے یار روند[1]

---

[1] صبح صبح جیسے لوگ اپنے اپنے کاروبار کی طرف جاتے ہیں، محبت کا دکھ اٹھانے والے (عشاق) دوست کے کوچے کی طرف جاتے ہیں۔
ہفت روزہ المنبر (20،6 مئی 1966ء)

عارفِ غزنی

تحریر: پروفیسر محمد سلیمان اظہر

محترم بشیر انصاری صاحب کا ارشاد ہے کہ قارئین الاسلام کے لئے کچھ خامہ فرسائی کروں لیکن موضوع نگارش جو تجویز کیا ہے وہ اپنی رسائی سے باہر ہے۔ غزنوی اکابر پر چند سطور بھی لکھنا اپنے بس کی بات نہیں۔ بایں ناتوانی تعمیل حکم کے لئے مجبور ہوں، تاہم اسے کرشمۂ گردشِ ایام کے سوا کیا نام دیا جائے کہ اس قدوۃ السالکین خانوادے پر ایک ایسا فرد قلم اٹھائے جو سلوک وعرفان کی ابتدائی منازل سے ہی ناآشنا ہو اور اس جامع العلوم خاندان پر لکھنے کی جسارت وہ شخص کرے جو علماء حق کی کفش برداری کے لائق بھی نہیں ہے۔ اِس خاندان کے نسبتاً سید ہونے پر امام عبداللہ غزنوی کی طرح مجھے بھی شک ہوسکتا ہے لیکن اس کے عملاً سیّد ہونے میں شک کرنے والا فاتر العقل ہی کہلائے گا۔ ان لوگوں نے عملاً اپنا سیّد ہونا ہر جگہ تسلیم کرایا۔ امام عبداللہ غزنوی ایک ایسے سید الطلباء کا نام ہے جسے عین ہنگامِ جنگ (1857ء) مرکز جنگ (دہلی) میں علمِ حدیث کے (بقول مولانا ابوالکلام آزاد) آخری مرکز (سید محمد نذیر حسین محدث) سے کسب فیض کی سعادت نصیب ہوئی اور جس کے متعلق بعد از فراغت استاذ گرامی (سید نذیر حسین) یوں گویا ہوئے: عبداللہ حدیث مجھ سے پڑھ گیا اور نماز پڑھنے کا طریق مجھے سکھا گیا۔ پھر عبداللہ غزنوی ایسے سیّد العلماء کا نام ہے کہ تمام معاصر علمائے افغانستان سامنے آکر منہ کی کھانے کے بعد ساری عمر مدمقابل آنے سے گریز کرتے رہے۔ امام عبداللہ غزنوی انیسویں صدی کے اس سیّد المہاجرین کا نام ہے جو عمل بالسنۃ کے جرم میں تین بار لاکھوں کی جائداد چھوڑ کر وطن سے نکلا۔ امام عبداللہ غزنوی اس سید الطائفہ کا نام ہے جس میں عارف باللہ مولانا غلام رسول اللہ قلعہ والے، پیر میر حیدر شاہ، امام عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی، صوفی عبدالحق سرہندی (مؤلف ایقاظ غفلاء الزمان بترجمۃ محی الدین عبدالرحمٰن)، صوفی ولی محمد فتوحی والے، حافظ عبدالمنان وزیر آبادی، مولوی قطب الدین پران والے، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی اور صوفی محمد عبداللہ اوڈانوالے شامل ہیں۔ یہ تمام بزرگ بالواسطہ یا بلاواسطہ امام عبداللہ غزنوی ہی کے وابستگانِ دامن ہیں۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی فرمایا کرتے تھے: میں چقماق ہوں، دیئے جلاسکتا ہوں روشنی نہیں دے سکتا۔ لیکن غزنوی عارف نے دیئے بھی جلائے اور برصغیر ہندوافغانستان کو نورِ توحید وسنت سے بھی منور کیا۔

محو حیرت ہوں کہ میں کیا لکھوں اور کس طرح لکھوں کیوں کہ پیش نظر وہ تابدار شخصیت ہے جس کا دل انوارِ الٰہی

کی زد میں آ گیا تھا۔ جس کے متعلق افغانستان کے سب سے بڑے شیخ حبیب اللہ قندھاری نے فرمایا تھا: تمہیں دور دراز کا سفر کر کے مسائل سمجھنے کی خاطر میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مشکل مسئلہ پیش آنے پر اللہ تعالیٰ تمہارے لئے در و دیوار کو گویائی عطا فرما دیں گے۔ اور حاضرین مجلس سے شیخ حبیب اللہ قندھاری نے یوں خطاب کیا: مسائل دینیہ راچنداں شخص مے فہمید من خود نمی فہم (مسائل دینیہ کی سمجھ جتنی اس شخص کو ہے مجھے نہیں)۔

پھر جب شیخ سے رخصت ہو کر اس بلبلِ بستانِ رسالت نے نغماتِ توحید و سنت الاپنا شروع کئے تو باوجودیکہ سعید روحیں اللہ کے رنگ میں رنگنے لگیں لیکن تقلیدِ آباء اور جمودِ عقل و خرد پر پڑنے والی یہ ضرب بہت کاری اور ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی۔ ان نغمات سے سرورِ قلب و نظر حاصل کرنے کے بجائے رسوم و قیود کے خمار سے مدہوش انسان اور جمود و تقلید کے سرپرست بلبلا اٹھے۔ فوراً حضورِ شاہ میں جا کر رپٹ لکھوا دی کہ اکبر اس زمانے میں خدا کی بندگی کا دعویدار ہے۔ پھر دربارِ خسروی میں متاعِ نقر و غنا کو حاضر کیا گیا۔ رعونت نے پوچھا: تمہارے کاسہ میں کیا ہے۔ وقارِ درویشی نے جواب دیا: ''اللہ کی کتاب اور سرورِ کونین کی سنت کے سوا کاسہ ہر شے سے بری ہے۔ نمرودِ وقت نے فرمان جاری کیا: ''اپنے عقائد و اعمال ترک کر دو''۔ قلندر بولا: ''جس چوکھٹ کا غلام ہوں حکم اسی کا مانوں گا۔ تم خدا و رسول کی بات سناؤ پھر دیکھو جبینِ نیاز کس طرح سے سجدہ ریز ہوتی ہے۔ بصورتِ دیگر اسی کج کلاہ کی گدائی کی تمہیں بھی دعوت دیتا ہوں، جس سے ارفع کوئی دیگر سرکار نہیں''۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے۔ عشق یوں دیوانگی پر اتر آئے۔ قلندر یوں مچل جائے تو بلی کھسیانی ہو کر کھمبا نوچا ہی کرتی ہے اور جو سلوک عزیمت کے بادشاہ امام اہل سنت امام احمد بن حنبل کے ساتھ کیا گیا، جس بھٹی سے الف ثانی کے مجدد کو گذارا گیا تھا۔ ظلم و تشدد اور قید و بند کی وہی داستان غزنی میں ایک بار پھر دہرائی گئی۔ جس طرح امام احمد اور شیخ احمد کو خردمندوں نے سمجھایا تھا کہ مقامِ عزیمت سے ہٹ کر مقامِ رخصت پر چلے آؤ۔ اسی طرح غزنی کے اس عارف کو بھی ''دم در گلو گرہ کن'' کے مشورے دیئے گئے لیکن دیوانہ کب کسی کے روکنے سے رکا کرتا ہے۔ فراعنہ وقت نے بصد حیل و فن نشۂ توحید اتارنے کی کوشش کی۔ ڈاڑھی منڈوائی تو بال ہاتھوں میں پکڑ کر انہیں مبارکباد دینے لگے کہ تم مجھ سے پہلے مقامِ شہادت پر فائز ہو گئے۔ درّے لگوائے گئے تو فرماتے ہیں: تمام حاضرین کو یقین ہوتا تھا کہ اب میں بچ نہیں سکوں گا لیکن واللہ مجھے محسوس بھی نہ ہو رہے تھے کیونکہ ابھی تک کوئی ایسی ترشی وجود میں نہیں آئی جو قلندرانہ سرمستیوں کا تدارک کر سکے بلکہ شرابوں میں شرابیں ملنے سے نشہ بڑھتا چلا گیا۔ آخر بظاہر رسوائی کے تمام سامان مہیا کر کے وطن سے نکال دیا گیا۔ امام عبداللہ غزنوی بزبانِ حال ؎

ستم گر تم سے امیدِ کرم ہو گی جنہیں ہو گی
ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تو ظالم کہاں تک ہے

کہتے ہوئے وطن سے نکل کر دشتِ نوردی میں مصروف ہو گئے جس طرف گئے عشق الٰہی مشک و عنبر کی مانند خوشبو

دینے لگا۔ پروانوں کے ہجوم سے دشت وجبل سازِ الست کا مضراب بن گئے۔ اسی دوران افغان مملکت کے چند فرزانے چل بسے تو آپ واپس وطن چلے گئے۔ آزمائش ابھی ختم نہ ہوئی تھی اس لیے پھر بھٹی کے حوالے کر دیئے گئے جب سونا کندن بن گیا تو پھر بھٹی سے نکل جانے کا حکم نافذ ہو گیا۔ اب عازمِ ہند ہوئے۔

افغانستان نے اس گوہرِ نایاب، جنیدِ وقت اور بایزیدِ زماں کو ہند کی جھولی میں ڈال دیا۔ انیسویں صدی کے افغانستان کا نصیب سو گیا اور غزنی کا آفتاب نصف النہار اپنی تمام تر ضوفشانیوں کے ساتھ افقِ ہند پر طلوع ہو گیا۔

سفرِ ہجرت امام عبداللہ غزنوی کا ایک یادگار سفر ہے جس خالق کونین کی اطاعت میں اپنے گھر سے رابطہ توڑا تھا، اس نے تسخیر کے عجیب عجیب مظاہر دکھائے۔ بھوک لگی تو دہشت ناک تنہائیوں میں "من حیث لا یحتسب" کے خزانہ سے لذتِ کام و دہن کا سامان مہیا کیا۔

ہری پور میں اس عاجز نے بعض ثقات سے سنا کہ جب آپ ہری پور کے نواح میں مقیم تھے تو ایک روز ہمرائیوں نے شکار کا گوشت کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ عارف غزنی نے نظریں اٹھائیں، پرندوں کی ڈار آئی اور پھڑ پھڑ پرندے نیچے گرنے لگے۔ جب مطلوبہ تعداد میں سامان مہیا ہو گیا تو نگاہیں نیچی کر کے فرمایا: اٹھو اور ذبح کر لو۔

اسی جگہ میں نے سنا کہ: ایک شخص لوٹا بائیں ہاتھ میں پکڑ کر آپ کو وضو کروانے لگا۔ آپ نے فرمایا: دائیں ہاتھ سے پکڑو۔ وہ کہنے لگا: جناب میرا دایاں ہاتھ بیکار ہے۔ آپ نے کچھ پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم کیا اور ہاتھ اس کے دائیں بازو پر پھیر کر فرمایا: اب پکڑ لو۔ بیمار کو مسیحا مل گیا۔ اس کا ہاتھ کار آمد ہو گیا۔

اس جگہ کئی لوگوں نے آپ سے کسبِ فیض کیا جن میں راجگان گکھڑ (خان پور ضلع ہزارہ) نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ قاضیانِ خان پور کا آپ کے خاندان سے رابطہ بھی شاید اسی جگہ شروع ہوا۔ یاد رہے کہ قاضی عبدالاحد خان پوری اور قاضی محمد خان پوری ان معدودے چند سعادت مندوں میں شامل ہیں جنہیں امام عارف غزنی نے اپنی عادت کے برعکس زانوئے تلمذ طے کروایا ہے۔

قاضیانِ خان پور اور غزنویوں میں باہم رشتہ داریاں بھی ہوئیں اور کسب و استفادہ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس وقت (یہ 1975ء کی بات ہے) قاضی محمد عبداللہ صاحب ایم اے، ایل ایل بی (مقیم مانسہرہ) بعمر 80 سال بقید حیات ہیں جنہیں امام عبدالجبار غزنوی سے کسبِ فیض کا شرف حاصل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ: حضرت الامام جب مسجد میں ذکر اذکار کرتے تو در و دیوار وجد میں آجاتے تھے۔ وہ ہر وقت خشیتِ الٰہی کے باعث زار وقطار روتے رہتے۔ قرآن وسنت کے اس قدر شیدائی تھے کہ ان کے مدرسے میں صرف قرآن وسنت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ منطق وفلسفہ وغیرہ کی کتب تک

مسجد لے جانا منع تھا۔[1]

[1] ذیل میں قاضی محمد عبداللہ صاحب کا ایک مضمون بعنوان ''حضرت سیّد عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 15 ربیع الاول 1298ھ) اور علمائے خانپور (تحصیل ہری پور) ضلع ہزارہ'' ملاحظہ فرمائیں:

علمائے خانپور کے سرتاج قاضی القضاۃ قاضی عبدالصمد رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1268ھ) اور قاضی القضاۃ قاضی محمد حسن (متوفی 1301ھ) گزرے ہیں جو ہر دو سید شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے مشرف اور فیض یاب ہوئے۔ ان ہر دو نے اس علاقہ میں اتباع کتاب و سنت کا آوازہ بلند کیا۔

قاضی القضاۃ قاضی عبدالصمد رحمۃ اللہ علیہ نے جن کی عمر ایک سو سال سے زائد ہوئی اپنی عمر کے آخری حصہ میں (1264ھ) میں قاضی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ داماد خود کو اس عہدہ کا پورے طور پر اہل سمجھ کر اپنا جانشین بذریعہ ایک دستاویز کے بنا دیا تھا۔ جوان کی زندگی میں چار سال تک اس عہدہ پر فائز رہ کر مدت العمر فائز رہے۔ خاندانِ مغلیہ کے عہدِ حکومت کے وقت سے یہ خاندان علم و اتقاء میں مشہور چلا آتا تھا، حتیٰ کہ سکھ بھی اپنے عہدِ حکومت میں انہیں واجب العزت سمجھتے رہے۔

جب آپ کے بڑے پسران قاضی عبدالاحد اور قاضی محمد گھر کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو آپ نے ہر دو کو حضرت سیّد عبداللہ صاحب موصوف کی خدمت میں امرتسر بھیج دیا تاکہ ان سے فیض یاب ہوں۔ ان کے امرتسر پہنچنے پر عبداللہ صاحب بہت مسرور ہوئے اور منتظمین مدرسہ سے کہا کہ ان ہر دو کا خیال رکھنا۔ یہ اس شخص کے فرزند ہیں جو زہد و تقویٰ کے بلند مقام پر فائز ہیں۔ عبداللہ صاحب نے ہر دو کو خود توجہ خصوصی سے تعلیم دی بلکہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی بعض تصنیفات انہیں سبقاً بھی پڑھائیں۔ قاضی صاحب کے تیسرے فرزند قاضی ابو اسمٰعیل یوسف حسین بھی حضرت عبداللہ صاحب غزنوی سے فیض یاب ہوئے اور حافظ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ (خسر قاضی محمد صاحب مذکور) خانپور سے پیدل چل کر عبداللہ صاحب کی ملاقات کی خاطر غزنی پہنچے اور ان سے فیض یاب ہوئے۔ یہ حضرت محبتِ اسلام اور عداوتِ کفار کی وجہ سے عرصۂ دراز اسیر فرنگ بھی رہے۔

ایک مرتبہ عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی عبدالاحد سے کہا: عبدالاحد! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری داڑھی بالکل میری جیسی ہے۔ قاضی صاحب نے عرض کی کہ پھر آپ نے اس کی کیا تعبیر فرمائی۔ حضرت نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تم سے توحید و سنت کی بڑی خدمت کر لے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قاضی صاحب موصوف مدت العمر خدمتِ دین میں بذریعہ تعلیم و تدریس و تصنیف و تالیف مصروف رہے اور بلا خوف و خطر ہمت و جرأت سے یہ فرض ادا کیا۔ اور اسی غرض کے پیش نظر مرزا غلام احمد قادیانی کا بھرپور رد کیا حتیٰ کہ مرزا مذکور نے ان کا نام اپنے اشد مخالفین کی فہرست میں درج کیا۔ ضلع فیروز پور میں مرزائیوں کے چیلنج کے جواب میں مردانہ وار ان سے مقابلہ کیا جس کے نتیجہ میں ان کے سامنے علی محمد مرزائی سرگروہِ مباہلین مرزائیہ مع دیگر مرزائی شرکاء مباہلہ کے مرضِ طاعون میں مبتلا ہو کر جہنم رسید ہوئے۔ اس کے علاوہ شرک و بدعت کے متوالے پنجاب کے کئی سجادہ نشین پیروں کے ساتھ معرکہ آراء ہو کر انہیں نیچا دکھایا، جس پر ان کی تالیفاتِ متعددہ و اشتہارات مطبوعہ شاہد عدل ہیں (تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں صرف اشارہ کافی ہے)۔

قاضی محمد مرحوم موصوف نے دل لگا کر خالصتاً لوجہ اللہ درسِ حدیث بے شمار طلباء کو دیا جن کا تعلق ضلع ہزارہ، سرحد ہزارہ (قافلہ مجاہدین) کشمیر، ضلع پشاور و راولپنڈی سے تھا۔ لیکن کوئی فہرست تلامذہ مرتب نہیں کی اور تا وفات اس میں مشغول رہے۔ اور بحیثیت کامیاب مناظر کے مشہور ہوئے۔

آپ کے تیسرے فرزند قاضی ابو اسمٰعیل یوسف حسین [نے] بسلسلہ تدریس دلی، گنور و بدایوں (یو۔پی) میں بھرپور خدمتِ دین انجام دی۔ بڑے فاضل ادیب اور مصنف تھے۔ بغداد میں تخمیناً سات سال تک عہدۂ شیخ الحدیث پر فائز رہ کر عربوں کو حدیث پڑھائی۔ ⇐⇐

بات عارف غزنی کی ہو رہی تھی جو افغانستان سے چل کر ضلع امرتسر کی بستی خیر دی میں آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ ان کے دم قدم سے یہ بستی اسم با مسمّٰی بن گئی کچھ عرصہ گم نامی میں گزرا لیکن ؏

کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

مشک خود بول اٹھتا ہے، عطار کے تعارف کی ضرورت نہیں ہوتی اور عارف غزنوی تو ؏

ایں قدر مستم کہ از چشم شراب آید بروں

کی تصویر مجسم بن چکے تھے۔ اس لیے مئے وحدت کے متلاشیوں کا ان کے گرد ہجوم ہو جانا کوئی بعید از قیاس بات نہ تھی۔

ان دنوں آپ کے فرزند اکبر جناب احمد غزنوی تنگ دستی سے پریشان ہو کر فراخیٔ رزق کی دعائیں کیا کرتے تھے۔ چند روز بعد ایک رئیس محمد حسن خان کی طرف سے پیغام آیا: ہمارے پاس تشریف لا کر خدمت کا موقع عنایت فرمایئے۔

احمد غزنوی حصول اجازت کے لئے باپ کے پاس آئے۔ باپ نے چند روز مراقبہ کے بعد فرمایا: اے فرزند دلبند! میں نے اپنی اولاد کے لیے کوئی سامانِ دنیا وراثت کے لئے نہیں چھوڑا۔ حتی کہ عزت وجاہ بھی نہیں چھوڑی۔ میرے ورثاء کے لئے میری میراث صرف اللہ عز وجل کی محبت اور توحید ہے۔ میں اپنے فرزندوں کو ربّ عزیز کی امانت سمجھتا ہوں اور مجھے یقین محکم ہے کہ میرا خدا اس امانت کو ضائع نہیں کرے گا۔ میرے بیٹو! جب بھی تم پر کبھی عسرت آ پڑے تو بارگاہِ خداوندی میں عاجزی سے عرض کر دینا: یا رب العالمین! میرے والد نے جو تیرا بندہ تھا، ہمارے لئے دنیاوی میراث میں سے کوئی چیز نہیں چھوڑی، وہ تیرے ہی سپرد کر گیا ہے۔ ان شاء اللہ خدائے رزاق اس طرف سے کشادگی وگزران کا سبب بنا دے گا جہاں سے تمہیں وہم وگمان بھی نہ ہوگا۔ باقی رہا امراء وخوانین کی ہم نشینی کا مسئلہ' تو گوشِ قلب سے سن لو کہ ستم گر خوانین اور امراء کی مصاحبت ومجلس سے سخت پرہیز کرو ایسے لوگوں کی ہم نشینی زہر قاتل ہے۔ پس کلام اللہ ہی کو اپنے دلوں کے لیے سرور، سینوں کے لیے نور، غم اور فکر کے لیے اکسیر جانو اور ہمیشہ کتاب حق کی تلاوت لازم سمجھو۔

آپ نے امراء وخوانین کے متعلق علماء اہلحدیث خصوصاً غزنویوں کا نقطۂ نظر ملاحظہ فرمایا کہ وہ مسلمان امراء کی مصاحبت کو بھی زہر قاتل سمجھتے تھے چہ جائیکہ انگریزوں سے کسی قسم کے روابط پیدا کریں۔ حیرت ہے بعض مصنفین ایسے

⇦⇦ آپ تینوں زبانوں (عربی، فارسی، اردو) کے شاعرِ نامور بھی تھے۔ یہ تینوں برادران حضرت غزنوی مرحوم کے فیض کی برکت سے اس طرح نامور ہوئے۔

یہ یاد رہے کہ عبداللہ صاحب کی آخری علالت اور رحلت کے وقت قاضی عبدالاحد وقاضی محمد ہر دو برادران مرحومین امرتسر میں موجود وحاضر تھے۔ قاضی عبدالاحد مرحوم نے ایک دفعہ عبداللہ صاحب رحمہ اللہ سے کہا کہ میرے لئے دعا فرمائیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تو اِس جلاد کے لئے بھی دعا کرتا ہوں جس نے کابل میں مجھے دُرّے مارے تھے تو تمہارے لئے دعا کیوں نہ کروں گا۔ (تاریخ حریت اسلام) (ہفت روزہ الاسلام: 1396ھ)

لوگوں کو انگریز کا وفادار سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام عبداللہ غزنوی نے انگریز سرکار سے مفاہمت کا تعلق پیدا کر لیا تھا۔ دراصل ایسے اہلِ علم نہیں جانتے کہ عارف غزنی بیعت تھے شیخ حبیب اللہ قندھاری کے، جو مرید تھے امیر المومنین سید احمد بریلوی شہید بالاکوٹ کے۔ اور عارف غزنی تیمناً بیعت تھے حضرت سید امیر آف کوٹہ ضلع مردان کے جو مرید تھے حضرت سید احمد بریلوی شہید بالاکوٹ کے۔ عارف غزنی رفیق و ہمدم تھے عارف باللہ غلام رسول قلعوی کے جنہیں 1857ء کے جہادِ آزادی میں مجاہدانہ سرگرمیوں پر انگریزی عدالت سے قید اور زبان بندی کی سزا ہوئی تھی جب کہ حاکم عدالت انہیں پھانسی دینے پر تلا ہوا تھا۔ بقول مولانا عبید اللہ سندھی' حضرت عبداللہ غزنوی، مولانا ولایت علی صادق پوری کی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ (دیکھیے: شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص 195) اور سارا زمانہ واقف ہے کہ صاحب الولایت مولانا ولایت علی کی پارٹی کون سی تھی......

ایسے لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ انگریزوں کے ہاتھ بک گئے تھے جب کہ غیر تو غیر، یہ تو اپنوں سے بھی ہشیار تھے۔ عارف غزنی کے سامنے ان کے استاد گرامی میاں صاحب نذیر حسین محدث دہلوی کا طرزِ عمل روشنی کا مینار تھا جنہیں والیہ بھوپال نے اپنے مدار المہام کے ذریعے اس بات کی ترغیب دی تھی کہ مدرسہ نذیریہ کے اخراجات کے لئے ریاست سے درخواست کی جائے تو ایک معقول رقم مقرر کر دی جائے گی، میاں نذیر حسین نے مدار المہام کو جواباً جو کچھ لکھا وہ ایسے لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

> ''مجھے ایسی لغو تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ رہا اخراجات کا سوال تو سن رکھو کہ خدا کے دروازے پر بیٹھ کر پڑھاتا ہوں جو یہاں لایا ہے وہی اخراجات پورے کرتا ہے۔''

اور یہ کوئی دو چار طالب علموں کی نفری والا مدرسہ نہیں تھا، بلکہ ہندوستان کے اس شیخ الکل کی درس گاہ کے اخراجات کا سوال ہے جس کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ اور استغناء اس ہستی کی طرف سے ظاہر کیا جا رہا ہے جو اپنے وطن (بہار) سے سینکڑوں میل دور غریب الوطنی میں دہلی کو وطن بنائے بیٹھا ہے۔ کرائے کے مکان میں رہتا ہے جو اس قدر مختصر ہے کہ چار پانچ افراد کے کنبے کے لیے اس کی چھت کافی نہیں، گرمیوں میں سائبان لگانا پڑتا ہے۔ کوئی تنخواہ کسی جگہ سے وصول نہیں کرتا۔ صدقات و خیرات، سید ہونے کے ناطے، اپنے پر حرام کئے بیٹھا ہے، گذر اوقات کے لیے فارغ اوقات میں بھیس بدل کر مزدوری کرتا ہے جیسا کہ عارف غزنی کے واقعہ سے ظاہر ہے جو انہیں حضرت شیخ الکل کے ساتھ پیش آیا۔ اس واقعہ کی بعض تفصیلات مولانا غلام رسول قلعوی کی سوانح حیات میں موجود ہیں۔

واقعہ کچھ یوں ہے: مولانا غلام رسول کسی اہلِ دل کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ چلتے چلاتے ضلع مردان میں کوٹہ نامی جگہ پہنچ گئے جہاں سید امیر سے بیعت ہوئے۔ اسی جگہ عارف غزنی بھی اپنی روحانی پیاس کو تسکین دینے آ گئے اور بطور حصولِ برکت بیعت ہوئے۔ مولانا غلام رسول اور عارف غزنی میں تعلقاتِ اخوت و مودت پیدا ہو گئے۔ ایک ماہ

یہاں قیام رہا، پھر مشورہ کیا کہ کہیں چل کر حدیث پڑھیں۔ باہم مشورہ کر کے پنجاب کی طرف چل دیئے۔ گجرات پہنچے تو عارف غزنی کہنے لگے: مجھے یہاں کسی مجذوب کی خوشبو آ رہی ہے، پھر پھراتے اس کو تلاش کر لیا۔ یہ جگنو شاہ نامی مجذوب تھا جس نے ان کا مرتبہ پہچان کر کما حقہما استقبال کیا۔ باتیں ہوئیں جب چلنے لگے تو کہنے لگا: تم حدیث پڑھنا چاہتے ہو تو جنت کا دروازہ اس طرف ہے (اور انگلی سے جانب دہلی اشارہ کیا)۔ جب یہ بزرگ چل دیئے تو دوبارہ آواز دے کر کہا: اس کی سادگی اور کپڑوں پر نہ جانا اس کا نام نذیر حسین ہے، حدیث اسی سے پڑھنا۔ پھر یہ بزرگ چلتے، قیام کرتے دہلی پہنچ گئے۔ جس جگہ ان کی سواری (تانگہ) رکی، وہاں ایک قلی پھر رہا تھا جب کہ ان کے پاس بستر اور کتابوں کا وزن بھی تھا اور نوادر بھی تھے۔ قلی نے ان سے پوچھا: کہاں جانا ہے؟ بتایا: ہم میاں نذیر حسین کے مدرسہ میں جانا چاہتے ہیں۔ قلی ان کا سامان اٹھا کر مدرسہ میں لے گیا اور بغیر اجرت لیے غائب ہو گیا۔ یہ بزرگ مسجد میں ٹھہر گئے اور کچھ دیر بعد طلباء سے پوچھا: میاں صاحب سے کس وقت ملاقات ہو سکتی ہے؟ انہیں بتایا گیا: بھائیو! جو شخص تمہارا سامان اٹھا کے لایا ہے وہی میاں صاحب تھے۔ جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو میاں صاحب نے فرمایا: بس اپنی گذر اوقات اسی طرح کرتا ہوں، تم سے کچھ اس لئے وصول نہ کیا کہ تم میرے پاس حدیث پڑھنے آئے ہو، اور یاد رکھو حدیث کا پہلا سبق یہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے استاد اور شاگردوں کو خریدنے کے لیے اس مادی دنیا کے خزانے کافی نہیں ہو سکتے اور جہاں تک خدا اور رسول کا معاملہ ہے تو ع

بے دام بک گئے جو خریدار آ گئے

اور بکنے کے بعد اپنی ہستی کا تصور ہی فراموش کر بیٹھے تھے۔

روایت ہے کہ ایک بار عصر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ اس زور کی بارش ہونے لگی کہ تمام مقتدی سوائے دو چار کے نماز چھوڑ کر چلے گئے، نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو وہ کیچڑ میں لت پت تھا۔ حیران ہو کر فرمانے لگے:

باران شد؟ واللہ عبد اللہ را خبر نشد۔

[یعنی بارش ہوئی؟ اللہ کی قسم عبد اللہ کو خبر بھی نہ ہوئی۔]

تعلق باللہ کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت ذکرِ محبوب میں مگن رہتے۔ کوئی ملاقاتی آتا ہے تو عموماً طریق یہ ہے کہ پوچھتے ہیں: آپ کا کیا حال ہے، بال بچوں کا کیا حال ہے۔ کاروبار کیسے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ آپ اپنا حال تو بتا دیتے باقی معاملات کے متعلق فرماتے: ''از عبد الجبار پرس۔'' کہ باقی باتیں عبد الجبار سے پوچھ لو۔ میرے اور خدا کے درمیان زیادہ دیر مت حائل رہو۔

آج یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ اہلِ حدیثوں میں اولیاء اللہ نہیں ہوتے۔ سنیئے امام عبد اللہ غزنوی کا طرزِ عمل ''از

خواندن ابیات وشنیدن آن پرہیز کلی باید کرد کہ محققین نوشتہ اند کہ زناء زبان است۔'' یعنی آپ اشعار کے سننے پڑھنے سے بھی منع کیا کرتے تھے ان کا موقف یہ تھا کہ یہ زبان کا زنا ہے۔

خدارا بتایئے دیگر تمام افکار و اعمال سے قطعِ نظر اس موقف کا انسان اولیاء اللہ میں شمار کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی شک ہے تو پھر طبقاتِ حنابلہ لابن رجب میں حضرت عبد القادر جیلانی کے اس جواب کا کیا مطلب ہے جو انہوں نے ایک سائل کو دیا تھا۔ سوال یہ تھا: ''کیا امام احمد بن حنبل کے مسلک کے علاوہ کسی دیگر مسلک کے حاملین میں کوئی ولی اللہ ہوسکتا ہے؟'' محبوبِ سبحانی نے فرمایا: "ما کان ولا یکون" نہ تو اب تک ہوا ہے نہ آئندہ کبھی ہوگا۔

فرمائیں ہمارے کرم فرما کہ برصغیر ہند کے وہ تمام اولیاء جنہیں اولیاء شمار کیا جاتا ہے کون سے مسلک کے حامل تھے؟ میرا خیال ہے کہ حنبلی تو ہرگز نہ تھے اور جب آپ کے غوث الاعظم اور قطب الاقطاب نے غیر حنابلہ کے لیے ولایت کا دروازہ ہی بند فرما دیا ہے تو خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ نظام الدین، خواجہ باقی باللہ، خواجہ غریب نواز، علاؤ الدین کلیر والے، سید علی ہجویری، خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی، حضرت رکن عالم کی ولایت کے متعلق کیا خیال ہے؟

حضرت الامام عبد اللہ غزنوی کے احوال و مقامات جس کی نظر میں ہوں وہ بخوبی جانتا ہے کہ آپ جنیدِ زماں اور بایزید وقت تھے اور اگر ان کی قبر قبورین کے ہتھے چڑھ جاتی یا ان کے اہلِ خاندان دکانداری چلانا چاہتے تو آج امرتسر بھی اسی طرح مرجع خلائق ہوتا جس طرح لاہور، پاکپتن اور اجمیر کی حیثیت ہے۔

بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ علمی اور روحانی طور پر بیٹا باپ کا صحیح وارث ہو، پوتوں تک پہنچتے پہنچتے معاملہ عموماً چوپٹ ہو جایا کرتا ہے لیکن غزنویوں میں امام عبد اللہ غزنوی کے بعد ان کے تمام صاحبزادے بالخصوص حضرت الامام عبد الجبار غزنوی اور حضرت مولانا عبد الواحد غزنوی یکے بعد دیگرے اپنے گرامی قدر والد کے صحیح جانشین تھے۔ عبد الجبار تو مرتبہ امامت پر فائز ہوئے، ان کی کرامات کا سلسلہ بہت دراز ہے۔ ابھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں ان کی مجلس میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ استاذ العلماء حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں جب کسبِ فیض کے لیے امام صاحب کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوا اور تھوڑے ہی وقت میں مجھ پر روحانی اثرات مرتب ہوئے تو میں حیران ہوا کہ وہ لوگ جو دیر سے یہاں موجود ہیں۔ شدت تاثر سے مر کیوں نہیں گئے۔ وہ مستجاب الدعوات ولی اللہ تھے۔ انہیں شیخ الکل سے کسبِ فیض کا شرف حاصل تھا۔ جوانی میں اپنے والد کی تمام ابتلاؤں میں ان کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ والد کے اکثر مناظروں میں آپ ہی متکلم ہوتے تھے۔ سفر ہجرت میں آپ نے صدیقِ اکبر کی طرح سید عبد اللہ غزنوی کو اپنے کندھوں پر سفر کرایا۔ سید عبد اللہ غزنوی بڑے قوی ہیکل اور جسیم تھے۔ پیدل چلنے سے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ان کی رانوں سے خون بہنے لگا تو ہمرائیوں نے انہیں اٹھا کر سفر کرنا شروع کر دیا اور یہ سعادت عموماً آپ کے حصہ میں آتی۔

اپنے باپ کی طرح فقر و استغناء کی تصویرِ مجسم تھے۔

عارف غزنی کی تیسری پشت میں حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی جیسے باکمال افراد نظر آتے ہیں جن کی عمر کا بیشتر حصہ انگریز سامراج سے ٹکراتے گزرا۔ کسی کو ان کے سیاسی مسلک سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ غیر ملکی حکومت کے لیے وہ شمشیر برہنہ تھے۔ فقر و استغناء کا جوہر اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ یہاں بھی موجود تھا۔ ساری عمر وسائل مہیا ہونے کے باوجود کوئی جائداد نہیں بنائی۔ واقفانِ حال جانتے ہیں کہ ان کے بعد ان کی بیوہ اور چھوٹے بچوں کو کن ناگفتہ بہ حالات سے گذرنا پڑا تھا۔ خدا پر انہیں پورا اعتماد تھا۔

مجھے ان کا ایک مکتوب گرامی دیکھنے کا موقع ملا ہے جو آپ نے مولانا محمد یونس دہلوی کو اس وقت تحریر کیا تھا جب جامعہ سلفیہ لائل پور کی مسجد کے لیے کراچی کے ایک مخیّر دولت مند نے بعض وجوہ کے باعث دستِ تعاون کھینچ لیا تھا اور اس کی اطلاع مولانا یونس نے آپ کو دی تھی۔ آپ نے جو کچھ لکھا وہ کچھ یوں ہے: ''.....سے کہہ دو کہ وہ اہلحدیث کے خدا نہیں ہیں بلکہ اہلِ حدیث کا خدا وہ ہے جو حی و قیوم ہے۔''

فقر و استغناء کا یہی جوہر ان کے صاحبزادے سید ابوبکر مرحوم میں موجود تھا۔ بروایت بعض ایک مرتبہ ان سے کہا گیا کہ سید صاحب آپ اپنے بچوں کے لیے کچھ وسائل رزق از قسم جائداد کیوں نہیں حاصل کرتے؟ آپ نے فرمایا: دیکھو! ہمارے بابا نے کچھ نہیں بنایا اور ہم بادشاہوں کی طرح رہتے ہیں۔ ہم بھی کچھ نہیں بنائیں گے اور ہماری اولاد شہزادوں کی طرح رہے گی۔

یہ سید عبداللہ غزنوی کے پڑپوتے تھے اور ملک کے قابلِ فخر علماء میں شمار ہوتے تھے جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں علم و روحانیت کا معاملہ عموماً تیسری پشت پر ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان جو ہندوستان کا مرجع العلماء والخلائق تھا۔ شاہ اسماعیل اور شاہ اسحاق کے بعد گوشۂ گمنامی میں چلا گیا۔ سید نذیر حسین محدث کا خاندان، ان کے پوتوں کے بعد علمی طور پر ختم ہو گیا۔ اسی طرح برصغیر کے دوسرے خاندان ہیں لیکن غزنویوں میں علمی روایات چار نسلوں تک چلی ہیں اور اب یہ سلسلہ بظاہر ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ شاید دنیا بھر میں شیخ محمد بن عبدالوہاب ہی وہ شخصیت ہیں جن کی نسل میں ساتویں پشت کے بعد بھی آج تک جلیل القدر علماء پیدا ہوتے چلے آرہے ہیں۔

قارئین محترم! خیالاتِ پریشان اور بے ربط جملے محض بشیر انصاری صاحب کے فرمان کی تعمیل ہیں ورنہ اس عاجز کا غزنوی اکابر پر کچھ لکھنا ع

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

آخر میں آپ سید عبداللہ غزنوی کے ہمدم و رفیق عارف باللہ غلام رسول قلعوی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر کا مطالعہ کر لیجئے جو انہوں نے سید عبداللہ غزنوی کے متعلق لکھی تھی۔ عبارت فارسی میں ہے لیکن میں ترجمہ کر کے اس عبارت کا

حسن ختم کرنے کی گستاخی نہیں کرسکتا۔ اہلِ ذوق پڑھیں اور حظ اٹھائیں:

کسے کہ جذبۂ او مقدم بر سلوک باشد مجذوب سالک پیر تمام است واگر نباشد سالک مجذوب ہم کافی است وجناب عبداللہ غزنوی از قسم اول است کہ صحبت او اکسیر است و مکمل پیر است۔

بیت:

من چہ گویم وصف آں عالی جناب
شمہ زاں می نگنجد در کتاب

جنید وقت وبایزید زمانہ است اما قصور طالبین است کہ بدون صحبت فیض حقیقت می جویند۔ دل فریب شیطان مبتلا شدہ چوں مہوساں مال خود را سوختہ پس اکسیری پویند وایں را طلب الشیٔ من غیر ہابہ میگویند دادیم ترا از گنج مقصود نشان، خود نرسیدم تو شاید برسی واز اوصاف عبداللہ۔

بیت:

اند کی گفتم کہ تا زاں رہ بری
پیش زاں کہ فوۃ آں حسرۃ خوری

دین قسم در زمان ہائے سابقہ نیز کم بودہ اند
اما المعاصرت سبب منافرت مشہور است

عمرہا باید کہ تا اندر جہاں پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن
صلي الله على خير خلقه محمد وآله واصحابه۔ (1)

---

(1) ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

(باب سوم)

مولانا سید عبد الجبار غزنوی

حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی امرتسری

تحریر: محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

خانوادۂ غزنویہ (امرتسر) کے مورث اعلیٰ سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ جن کی زہدانہ روش اور عابدانہ طریق نے ہزارہا گم کردہ راہِ حیات کو منزل حقیقی سے آشنا کیا، جن کی فضیلت علمی کی ضیاء پاش کرنوں نے چار دانگ عالم کو روشنی سے منور کر دیا۔ جن کی ولایت وللّٰہیت کے آثار بدوِ شعور کے آغاز ہی سے ہویدا تھے، جنھوں نے تکلیفیں سہیں، ایذائیں برداشت کیں مگر موحدانہ روش سے ذرہ برابر ہٹنا گوارا نہ کیا، جس پر غزنی سے جلا وطن ہونا پڑا اور اس طرح امرتسر کا نصیبہ جاگ اٹھا کہ وقت کے عظیم ولی نے اسے اپنی جائے سکونت قرار دیا۔ محدث شہیر امام ابو الطیب شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف غایۃ المقصود فی حل سنن أبی داود کے مقدمے میں امام کبیر عارف باللہ السید عبداللہ غزنوی کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''آپ ہیں شیخ، علامہ، سید، سند، مقدس کمالات والے، آخری زمانہ میں جو عزیز الوجود ہیں۔ مولانا اور فضل کے اعتبار سے ہم سے بہتر، محمد اعظم بن محمد بن محمد بن شریف معروف بہ عبداللہ غزنوی امرتسری۔ آپ تھے اللہ کو پہچاننے والے، اس کی رضا کے لیے سب کچھ کرنے والے، کثرتِ ذکر کرنے والے، عابد، اللہ کی طرف رجوع کرنے والے متذلل، خاشع، خاضع، پرہیزگار، متواضع، حنیف، کامل، بارع، ملہم، مخلص، صدیق، کریم کہہ کر مخاطب کیے گئے۔ سخاوت کرنے والے، رجوع کرنے والے، حلیم، متوکل، منیب، صابر، قانت، انہیں اللہ کی راہ میں کسی کی ملامت کی پروا کبھی نہ ہوئی۔ اللہ کی خوشنودی کو اپنے اہل وطن، اپنے مال و دولت، اپنے اہل وعیال اور خود اپنے نفس پر ترجیح دینے والے، مشہور احوال ومقامات والے، بڑے بڑے معرکوں والے، آپ اللہ کے دین کی مدد کے لیے صابر محتسب بن کر اٹھے۔ توحید و سنت کا باغ لگانے والے، میدانِ اخلاص کے شہسوار، زاہدوں کے پیشوا، بندوں میں یکتا، زمانے کے امام، رحمان کے ولی، قرآن کے خادم، اللہ کا تقرب حاصل کرنے والے، آپ تمام احوال میں اللہ عزّوجل کے ذکر میں مستغرق رہتے، حتیٰ کہ آپ کا گوشت، آپ کی ہڈیاں، آپ کے اعصاب، آپ کے بال اور آپ کا پورا بدن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور اس کے ذکر میں فنا ہونے والا تھا۔''[1]

---

[1] غایۃ المقصود فی حل سنن أبی داود: 1/12، 13

منقول ہے کہ حضرت عبداللہ غزنوی اپنے نام کے ساتھ کسی لاحقے کو پسند نہیں فرماتے تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ محض عبداللہ کے تسمیہ سے مخاطب ہوں یا ذکر کریں، مگر میرے لیے ناممکن ہے کہ میں حضرت عارف باللہ سید عبداللہ غزنوی کا نام یوں ہی سادہ طریقہ پر ادا کروں۔

ممدوح گرامی کے نسب کے بارے میں خاصا اشتباہ پایا جاتا ہے، عام طور پر موصوف کی نسبی نسبت کا انتساب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جانب سے کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب موصوف کے عمر زئی افغان ہونے کے بھی مناسب وجوہات موجود ہیں۔ جناب بدر الزمان محمد شفیع نیپالی نے حضرت کی سوانح میں اس ابہام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ [۱] بایں ہمہ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ممدوح کی ذات گرامی ہمارے لیے 'سیدنا فی الدارین' کا درجہ رکھتی ہے۔

مولانا سید عبداللہ غزنوی صاحبِ اولاد تھے، ایک صالحہ خاتون سے عقد کیا جس سے 12 صاحبزادے اور 15 صاحبزادیاں ہوئیں۔ تمام صاحبزادے علم کی دولت سے مالا مال ہوئے، کئی ایک کو ہماری علمی دنیا میں خاصا مقام حاصل ہے۔ مولانا سید عبداللہ غزنوی کے صاحبزادگان عالی قدر کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

① مولانا عبداللہ ② مولانا احمد

③ مولانا عبدالجبار ④ مولانا محمد

⑤ مولانا عبدالاحد ⑥ مولانا عبدالرحمان

⑦ مولانا عبدالستار ⑧ مولانا عبدالقیوم

⑨ مولانا عبدالرحیم ⑩ مولانا عبدالحیٔ

⑪ مولانا عبدالعزیز ⑫ مولانا عبدالقدوس

یہ سید عبداللہ غزنوی کے ان 12 صاحبزادگان کے اسمائے گرامی تھے کہ جن کا ذکر عام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت کے ایک صاحبزادے مولانا عطاء اللہ کا ذکر سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے مکتوب گرامی بنام محدث کبیر شمس الحق عظیم آبادی میں ملتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب [۲]

یہاں ان کے جس فرزند ارجمند اور خلفِ صادق کا تذکرہ کرنا مقصود ہے، ان کا نام نامی 'عبدالجبار' ہے، جو اپنے زمانے کے صالح اور متدین عالم دین تھے اور اپنے والد گرامی کی زاہدانہ روش پر گامزن اور راہِ عزیمت میں آنے والے مصائب میں ان کے شریک تھے، جن کے خلوص فی الدین، انابت الی اللہ اور صوری و معنوی محاسن کا اندازہ اس امر سے

---

[۱] ملاحظہ ہو: الشیخ عبداللہ غزنوی: 12-14

[۲] ملاحظہ ہو: حیاۃ المحدث شمس الحق واعمالہ: 44

لگایئے کہ شمس المحدثین امام شمس الحق ڈیانوی شارح سنن أبی داود جیسے رفیع المرتبت اور عالی قدر عالم دین فرماتے ہیں:

"ما استصغرتُ نفسي إلّا عند عبدالجبار"

''میں نے خود کو سوائے عبدالجبار کے کسی کے سامنے کم تر نہیں پایا۔''

مولانا عبدالجبار غزنوی 1268ھ میں غزنی کے مقام 'صاحبزادہ' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتابیں اپنے برادران حقیقی مولانا محمد غزنوی (المتوفی 1296ھ) اور مولانا احمد غزنوی سے پڑھیں۔ اپنے عالی قدر والد گرامی سے علوم دینیہ کی تحصیل کی اور روحانی استفادہ کیا۔ بیس برس سے بھی کم عمر میں علوم دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔

سید عبداللہ غزنوی نے جب غزنی میں اپنی موحدانہ روش کا آغاز کیا اور عوام الناس کو کتاب وسنت کی دعوت دی تو علماء سوء آتش حسد اور مبتدعانہ خیالات کی وجہ سے چراغ پا ہو گئے۔ علمائے سوء دربارِ شاہی میں خاصا اثر ورسوخ رکھتے تھے جب کہ سید عبداللہ غزنوی اور ان کے رفیع المرتبت صاحبزادگان کے پاس اللہ رب العزت پر توکل اور یقین کا سرمایہ تھا، اُنہیں یہ زعم کہ وہ مسند اقتدار کے زلہ ربا ہیں اور انہیں اس پر ناز کہ ع

بلائیں حسن جاناں کی اگر لیں گے تو ہم لیں گے

متعدد مرتبہ جائے سکونت تبدیل کرنی پڑی، درے اور کوڑوں کی مار کی سزا کا کوئی شمار نہیں مگر یہ سب کچھ رضائے الٰہی کی خاطر برداشت کیا۔ جب سردار محمد افضل خان اور محمد اعظم خان کا زمانہ اقتدار آیا تو اس نے بھی علمائے سوء کی کثرت سے مرعوب ہو کر ان کے بہکاوے میں سید عبداللہ غزنوی اور ان کے عالی مراتب صاحبزادگان کو مبتلائے مصائب کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ حاکم مقر سردار محمد عمر کے نام پروانہ لکھا کہ سید عبداللہ غزنوی کو بہر صورت گرفتار کرو اور ہاتھ سے جانے نہ دو۔ سردار عمر نے اسی وقت مسلح رسالہ راتوں رات بھیجا، جنھوں نے آدھی رات کے وقت مکان کا محاصرہ کر لیا اور سید عبداللہ غزنوی کو مع ان کے تمام اسباب اور کتابوں کے گرفتار کر لیا۔ فرزندوں میں سے مولانا محمد، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالجبار بھی شریک حزن والم ہوئے۔ صوبہ دار کے سامنے پیش کئے گئے، صوبہ دار حضرت عبداللہ غزنوی کی گفتگو سے خاصا متاثر ہوا اور اس نے تمام اسباب مع کتابیں واپس کر دیں اور رہا کر دیا۔

پھر مقر میں مجلس مناظرہ آراستہ کی گئی، مخالفین کی جانب سے ابن موت مقری سرگروہ ٹھہرا، دوسری جانب سید عبداللہ غزنوی اور ان کے صاحبزادے تھے۔ حضرت نے اپنے چھوٹے فرزند مولانا عبدالجبار کو مباحثے کے لئے پیش کیا جن کی عمر اس وقت صرف بیس برس تھی، شرکاء مجلس حیران تھے کہ یہ کم عمر لڑکا علمائے اعلام کا مقابلہ کیونکر کر سکے گا، لیکن پھر سبھوں نے دیکھا کہ اس نوعمر لڑکے نے اس مجمع اعلام وفضائل کو ساکت کر دیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر صوبہ دار نے امیر افضل خان کے نام خط لکھا کہ

''حسب الحکم آپ کے میں نے اس شخص کو گرفتار کیا اور اس نواح کے علماء اس کے ساتھ مناظرہ کرنے کے لئے

حاضر ہوئے لیکن ان سے کچھ نہ بنی، یہ شخص صالح اور فقیر ہے اور دنیا کے اسباب سے بالکل عاری ہے جو کچھ حکم ہو، ارقام فرمادیں۔"①

اس پر کابل طلبی ہوئی، کابل میں ملا مشکی اور ملا نصر اللہ وغیرہ علماء سوء امیر افضل خان کے پاس گئے اور کہا کہ امیر دوست محمد خاں کے عہد میں ہم اس کا کفر ثابت کر چکے ہیں۔ اب دوبارہ تحقیق کی حاجت نہیں، سب متفق تھے کہ پروانہ عدم جاری ہو مگر ملا مشکی جو قدرے 'انصاف پسند' تھے، نے مخالفت کی، بالآخر سو درے مارے جانے، سر اور داڑھی کے بال مونڈ دینے اور گدھے پر سوار کر کے تشہیر کرنے پر معاملہ ٹھہرا۔

سید عبداللہ غزنوی اور ان کے عالی مراتب صاحبزادگان مولانا محمد، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالجبار پر رودادِ جرم مرتب کر دی گئی .... کس لیے؟

اعلائے کلمۃ الحق بلند کرنے کے جرم میں، کتاب وسنت کے چشمہ صافی سے براہِ راست استفادہ کرنے کے جرم میں قبر پرستی سے انکار کرنے کے جرم میں، پیغامِ توحید کو عام تبلیغی شعار بنانے کے جرم میں، مزعومہ فقہی روایات کے برخلاف سننِ مصطفوی ﷺ کو اختیار کرنے کے جرم میں ....

پشت مبارک پر سو سے زائد درے مارے گئے، برداشت کر لیا۔ اس قدر درے مارے گئے کہ زندگی کا سلامت رہنا محال تھا مگر پیٹھ مبارک پر سرخی کی معمولی سی لہر تک نہ ابھری، مگر منکرین حق اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔ سر اور داڑھی کے بال مونڈھ دیئے گئے، برداشت کر لیا۔ گدھے پر سوار کر کے چہرے پر کالک مل کر تشہیر کی گئی، مگر سب کچھ رب جل و علا کی محبت میں برداشت کر لیا۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

پھر قید خانہ میں ڈال دیئے گئے، دو سال قید میں رہے، ان سنگدلوں نے ایک حبہ بھی خرچ کے لیے مقرر نہیں کیا، بس قید میں ڈالا اور بھول گئے۔ تا آنکہ افراد شہر کے دلوں میں القائے ربانی نے کروٹ لی اور وہ ان درویشوں کی خدمت میں ہمہ وقت قسم قسم کے پھل، میوے اور کھانے پیش کرنے لگے، اس قدر فراخی ملی کہ کبھی اتنی فراخی اپنے گھر میں بھی نہ دیکھی تھی۔ امیر افضل خان کے بعارضۂ وبا مرنے کے بعد امیر اعظم خان مسند اقتدار کا مالک ہوا۔ اس شقی نے ملا عبد الرحمان خان کے بہکاوے میں عین تپتی ہوئی گرمی کے موسم میں پیادہ پا اور بلا زادِ راہ پشاور کی طرف جلا وطن کر دیا اور سخت دل سپاہیوں کو ان حضرات کے ساتھ مقرر کر دیا کہ بہت جلد پشاور پہنچا دیں۔ ان افرادِ عالی قدر نے یہ سفر اس عالم میں کیا کہ ایک طرف سورج کی کرنیں چہرۂ مبارک کو بوسہ دے رہی تھیں اور دوسری جانب زمین کی حرارت پائے مبارک

① الشیخ عبداللہ غزنوی: 44

کو تپش بہم پہنچا رہی تھی۔ مگر ان کی مردانگی نے راہِ حق میں پہنچنے والی ہر ایذا کو بخندہ پیشانی برداشت کر لیا۔

حضرت سید عبداللہ غزنوی اور ان کے خانوادے کے عالی مرتبت اراکین نے کچھ مدت پشاور میں قیام پذیر رہنے کے بعد امرتسر کو اپنا مستقل جائے سکونت قرار دیا۔ حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی نے امرتسر تشریف لانے کے بعد دہلی کی طرف شدِ رحال کیا تا کہ مسند ولی اللہی کے امین حضرت سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے کتب حدیث کی قرأت وسماعت کر سکیں اور تمام مرویات ومسموعات کی اجازت حاصل کر سکیں۔ دہلی میں مولانا غزنوی نے حضرت میاں صاحب سے استفادہ کیا یہ بہت بڑا شرف تھا جو انہیں حاصل ہوا۔

مولانا غزنوی نے جن علماء محدثین سے کتب حدیث وتفسیر پڑھی، ان کے اسمائے گرامی اپنے تلمیذ رشید مولانا عبد اللہ بابر خانوی ◆ کے نام عطا کردہ اپنی سند مرقومہ 7 شوال 1309ھ / 29 اپریل 1892ء میں لکھے ہیں، چنانچہ آپ نے لکھا ہے:

"أجازني مشائخي الكرام وسادتي العظام:

اوّلهم: امام الوقت فى التقوىٰ والدين والدى الشيخ عبدالله الغزنوى السلفى

وثانيهم: شيخى وشيخ والدى وشيخ الكل السيد نذير حسين الدهلوى

وثالثهم: الشيخ احمد الشرقى الحنبلي نزيل مكة

ورابعهم: الشيخ نعمان الآلوسى رئيس المدرسين فى المدرسة المرجانية ببلدة بغداد

وخامسهم: الشيخ حسين البوفالي ثم الحديدوى اليمانى الشافعى الملقب بشيخ البخارى وغيرهم"[1]

اس تحریر سے عیاں ہوتا ہے کہ مولانا غزنوی نے اپنے والد گرامی اور حضرت میاں صاحب کے علاوہ شیخ احمد بن ابراہیم بن عیسیٰ شرقی نجدی حنبلی سے بھی استفادہ کیا جو بڑے صاحبِ عزیمت اور اکابر محدثین میں سے تھے۔ قارۂ ہند کے جن علمائے عالی مرتبت نے شیخ احمد شرقی سے استفادۂ علمی کیا ان میں محدث شہیر ابوالطیب شمس الحق عظیم آبادی، علامہ محمد بشیر سہوانی صاحب صیانۃ الانسان، مترجم حدیث وقرآن علامہ وحید الزماں لکھنوی وغیرہم شامل ہیں۔ شیخ احمد شرقی نے 4 جمادی الثانی 1329ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا عبدالجبار نے مشہور مفسر قرآن علامہ شہاب الدین محمود آلوسی صاحب روح المعانی کے فرزند ارجمند شیخ ابوالبرکات خیر الدین نعمان آلوسی سے بھی فیض علمی حاصل کیا۔ جن کا شمار بلدہ عراق کے بلند پایہ فقہاء ومحدثین میں ہوتا

---

[1] الفيوض المحمدية بتذكار سلالة لكوية: 248-249

تھا۔ فروع میں حنفی اور عقائد میں سلفی المشرب تھے۔ دیارِ ہند کے دو جلیل القدر محدثین حضرت نواب صدیق حسن خان والی بھوپال اور علامہ شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی صاحب عون المعبود بھی ان کے دبستانِ علمی کے فیض یافتہ تھے۔ علامہ نعمان آلوسی نے 17 محرم 1317ھ کو بغداد میں وفات پائی۔

حضرت الامام غزنوی نے یمن کے مشہور و معروف محدث علامہ شیخ حسین بن محسن یمانی سے بھی اخذ علم کیا۔ جنھوں نے نواب صدیق حسن خان کے عہد میں بھوپال کو اپنی علمی و تدریسی تگ و تاز کا مرکز بنایا، اور جن سے اس وقت کے مشاہیر اربابِ مسند وارشاد نے استفادہ کیا، جن میں نواب صدیق حسن خاں، علامہ شمس الحق ڈیانوی، علامہ ابوالحسنات عبدالحیٰ فرنگی محلی، مولانا حافظ ابومحمد ابراہیم آروی، علامہ عبدالعزیز رحیم آبادی، علامہ حافظ عبداللہ غازی پوری، علامہ محمد بشیر سہسوانی (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسے اکابرِ عصر شامل تھے۔ شیخ حسین یمانی نے 10 جمادی الاول 1327ھ کو بھوپال میں قضائے الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔

ان حضرات علماء و مشائخ کے علاوہ بھی مولانا غزنوی نے اساتذہ علم و فن سے استفادہ کیا تھا جیسا کہ لفظ 'وغیرھم' سے ظاہر ہے، لیکن افسوس کے ان اساتذہ علم کے اسمائے گرامی ہمارے حیطۂ علم میں نہ آ سکے۔

امرتسر آنے کے بعد سید عبداللہ غزنوی نے توحید و سنت کی نشر و اشاعت کے لیے اپنی جہودِ مخلصہ کا آغاز فرمایا۔ مولانا سید داؤد غزنوی رقمطراز ہیں:

> ''امام اہلِ توحید، منبع آثارِ سلف الصالحین، عارف باللہ حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ جب غزنی سے پنجاب تشریف لائے اور امرتسر میں سکونت پذیر ہوئے۔ توحید و سنت کی اشاعت اور بدعات اور مشرکانہ رسوم سے پاک اسلام کی تبلیغ کا بے پناہ جذبہ جو آپ کے دل میں موجزن تھا، اس نے چند دنوں میں ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ امرتسر مرجع عوام و خواص بن گیا۔ آپ کے حلقہ پند و نصائح میں شریک ہو کے آپ کی اقتداء میں نماز پڑھنے اور کیفیت خشوع حاصل کرنے اور آپ کے فیضانِ صحبت سے مستفیض ہونے کے لیے صلحاء اور علماء دور دور سے حاضر ہو کر اس چشمہ ہدایت و معرفت سے اپنی روح کی تسکین اور قلب کی تطہیر حاصل کرتے۔ آپ کے صاحبزادگان میں مولانا عبداللہ، مولانا محمد اور والد بزرگوار حضرت مولانا سید عبدالجبار غزنوی قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ اس طرح مسجد غزنویہ ایسی تربیت گاہ بن گئی جہاں علم کے ساتھ عمل، قال کے ساتھ حال کی کیفیت اور علم و بصیرت کے ساتھ معرفت کا زر حاصل ہوتا تھا۔ عارف باللہ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے واصل بحق ہونے کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا عبداللہ بن عبداللہ ان کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ آپ تھوڑا عرصہ زندہ رہے، ان کی وفات کے بعد والد بزرگوار حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ منصبِ خلافت و امامت پر فائز ہوئے۔ آپ کے عہد مبارک میں روحانی فیوض و برکات حاصل

کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا اور آپ کے علم و فضل کے چرچے پنجاب سے گزر کر پورے ہندوستان بلکہ بلادِ عرب تک جا پہنچے اور اس طرح آپ کے شاگرد تمام ملک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی پھیل گئے۔ آپ نے اپنے عہدِ مبارک میں مسجد غزنویہ کی درس گاہ کو باقاعدہ دارالعلوم کی شکل میں تبدیل کر دیا اور اس کے لیے ایک نظام قائم کر دیا۔ حضرت امام صاحب نے اپنی فراستِ ایمانی اور بصیرتِ قلبی کی برکت سے وقت کی اہم ترین ضرورت کو محسوس کیا علوم کتاب وسنت اور دیگر علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے نام سے ایک ایسی درس گاہ قائم کی جو پنجاب میں علمی اور روحانی فیوض کے لحاظ سے عدیم النظیر اور بے مثال تھی۔''[1]

مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالجبار صاحب حدیث وتفسیر میں بے بدل تھے، اپنے ظاہری وباطنی صلاح وتقویٰ کی وجہ سے (خود نہیں) دوسروں نے آپ کو امام صاحب سے خطاب کیا اور بجا طور پر۔''[2]

امام عبدالجبار کا حلقۂ درس وافادہ خاص وسیع تھا، حضرت میاں صاحب کے آخری دور میں جبکہ بینائی بے حد کمزور ہو چکی تھی، استاذِ پنجاب حافظ عبدالمنان محدث وزیر آبادی حاضر خدمت ہوئے، اور پوچھا کہ کیا مجھے پہچان لیا، جس پر شیخ الکل میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''میں نے تمہیں پہچان لیا ہے، تم عبدالمنان ہو۔ پنجاب میں تین شخص میرے دل کی راحت کا باعث بنے ہیں۔ ایک عبدالمنان تم ہو، دوسرے عبدالجبار غزنوی اور تیسرے مولوی محمد لکھوی سب شاگردوں سے بڑھ کر ان ہی تلامذہ نے میرے فیض کو چاروں طرف پھیلایا ہے۔'' اس کے بعد حافظ صاحب کی درخواست پر میاں صاحب نے اپنی پگڑی اتار کر حافظ صاحب کے سر پر رکھ دی اور فرمایا: ''عبدالجبار کرتا لے گیا تم یہ پگڑی لے جاؤ۔''[3]

مولانا عبدالجبار غزنوی کے فیضِ صحبت سے مستفید ہونے والوں کی تعداد کثیر ہے اور پھر ان میں بھی بلند پایہ علمائے عالی مرتبت شامل ہیں۔ مولانا غزنوی کے ایک تلمیذ رشید مولانا فقیر اللہ پنجابی مدراسی ہیں، جو خانوادۂ غزنویہ کے خاص ارادت مند تھے، مجاہدانہ صفات کے حامل تھے، امیر المجاہدین مولانا عبدالکریم صادق پوری کے دست مبارک پر بیعت بھی کی تھی، مدراس میں تحریک مجاہدین کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

---

[1] سیدی وابی داؤد غزنوی: 450

[2] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات: 174

[3] پاک وہند میں علمائے اہل حدیث کی خدمات حدیث: 43-44

مولانا ابو عبد اللہ عبد القادر لکھوی خانوادۂ غزنویہ کے رکن رکین اور مشہور مدرس تھے، انہیں بھی مولانا غزنوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

مولانا عطاء اللہ لکھوی جن کے فیض علمی سے مولانا عبد الجبار کھنڈیلوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی جیسے اکابر مستفید ہوئے، حضرت الامام غزنوی ہی کے تربیت یافتہ تھے۔

خانوادۂ لکھویہ کے ایک اور فردِ فرید مولانا محمد علی لکھوی بھی دبستان غزنویہ کے مستفیض یافتہ تھے۔

مولانا حافظ عبد اللہ محدث روپڑی جیسے محدث عصر وفقیہ زمانہ نے بھی مولانا غزنوی کے باب علم پر حاضری کا شرف حاصل کیا۔

بانی جماعت غرباء اہل حدیث مولانا عبد الوہاب صدری دہلوی نے بھی مولانا غزنوی سے استفادۂ علمی کیا۔

مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفۂ خاص مفتی محمد حسن امرتسری نے بھی کتب حدیث مولانا غزنوی ہی سے سماعت فرمائیں تھیں۔

مولانا حافظ محمد محدث گوندلوی جن کا حلقہ درس خاصا وسیع تھا اور جدید پنجاب کو انہوں نے اپنے تلامذہ سے بھر دیا، وہ بھی مولانا غزنوی کے خرمن فیض کے خوشہ چیں تھے۔

تحریک مجاہدین کے ایک سرگرم کارکن قاضی عبد الرحیم (کوٹ قاضی، گوجرانوالہ) نے بھی مولانا عبد الجبار غزنوی کے سامنے زانوائے تلمذتہ کیا اور صحیح بخاری کا اعادہ کیا۔

حضرت الامام عبد الجبار غزنوی کے دیگر مشہور تلامذۂ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

شیخ الحدیث مولانا فضل اللہ مدراسی ﷫، قاضی محمد خان پوری، مولانا ابو تراب محمد حسین ہزاروی ﷫، مولانا نیک محمد، مولانا حافظ شاہ محمد گکھڑوی گجراتی ﷫، مولانا عبد الرحمان گونڈوی، مولانا عبد التواب غزنوی علی گڑھی، مولانا عبد الحکیم انگوی، مولانا معصوم علی ہزاروی، مولانا ابو داؤد عبد اللہ بابر خانوی، مولانا حکیم عبید الرحمان عمر پوری، شیخ احمد مہاجر مدنی، مولانا فضل حق قصوری، مولانا عبد اللہ عبد الصبور عمر پوری، مولانا عبد الکریم گرنتھی امین خانوادۂ غزنویہ و دیگر ابناء غزنویہ۔

سید عبد الجبار غزنوی غیر معمولی علم وفضل کے حامل، زہد وتقویٰ سے آراستہ، رموزِ معرفت الٰہی سے آشنا، رضائے الٰہی کے حصول میں سرگرم رہنے والے متوکل، روز وشب بزمِ الٰہی سجانے والے عابد دینیہ کی اشاعت کرنے والے مبلغ اور سلوک وتصوف کی راہ سے آنے والی بدعات ومحدثات کی تردید میں بہت زیادہ ساعی تھے۔ کبار علمائے معاصرین نے موصوف کی فضیلت علمی کا اعتراف کیا ہے۔

علامہ ابو الطیب شمس الحق عظیم آبادی اپنے ایک مکتوب گرامی بنام مولانا سید عبد الجبار غزنوی میں لکھتے ہیں:

"بسم الله الرحمٰن الرحيم، ونحمده ونصلي على رسوله محمد وآله واصحابه اجمعين' از عاجز فقیر حقیر محمد شمس الحق عفی عنہ۔ بگرامی خدمت زید درجات جامع الفضائل والکمالات، ذو المناقب الجلیلہ اخی مکرمی مخدومی مولانا عبدالجبار صاحب متع الله تعالٰي المسلمين بطول بقائكم ويمن علينا بشرف لقائكم. السلام وعليكم ورحمة الله وبركاته ورضوانه. لله الحمد والمنة کہ ہم مع الخیر ہیں اور صحت آپ کی حق تعالیٰ سے چاہتے ہیں۔ دو ہفتہ سے زیادہ ہوا کہ گرامی نامہ آپ کا پا کر ممنون و مشکور ہوئے۔ جزاكم الله تعالٰي خيراً۔ آپ کے مکاتیب جس وقت آتے ہیں ان کے مطالعہ سے اس قدر حظ وافر حاصل ہوتا ہے کہ ہم اس کو بیان نہیں کر سکتے مکرر، سہ کرر اس کو دیکھتے ہیں تاہم تسکین نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں آپ کی محبت ومودت وعظمت اس قدر بھر دی ہے کہ جس کی حالت خود وہی رب العزت جانتا ہے اور جو جملہ امام بخاری علیہ الرحمۃ بحق علی بن المدینی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے کہا تھا کہ ماستصغرتُ نفسي الا عند ابن المديني ویسا ہی ہم آپ کی شام میں کہتے ہیں کہ ماستصغرتُ نفسي الا عند عبد الجبار۔ فہم معنی کتاب اللہ تعالیٰ وسنت رسول ﷺ جو آپ کو حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا وہ فہم حضرت شیخ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے کسی تلامذہ کو عطا نہیں ہوا ہے۔ ذٰلك فضل الله يوتيه من يشاء اور اس امر کو ہم نے اپنے متعدد تحریر میں بیان کیا ہے۔"(1)

اس مکتوب گرامی کو نقل کرنے کے بعد مولانا فقیر اللہ پنجابی مدراسی لکھتے ہیں:

"یہ مولانا شمس الحق صاحب وہی حضرت معروف و مشہور بہ نزدیک و دور لا عند علماء الهند فقط بل عند علماء النجد واليمن ومصر ومكة معظمة وغيرها ہیں........ ومسلم عند الکل ہیں اور جو ان سے تعارف رکھتا ہے وہ ان کو صادق وصالح وموصوف بصفات عدیدہ جانتا ہے۔ پس ایسے موصوف شارح وخادم کتاب وسنت کی شہادت صادق بہ نسبت مولانا موصوف غزنوی کے کس درجہ کی وقعت رکھتی ہے اور آپ کو یہ اعتقاد اس درجہ کا مولانا موصوف غزنوی کی نسبت اس وجہ سے ہوا ہے کہ شارح حدیث ومحقق ہیں۔ آپ کے مزاج میں تعلّی وتفوق وتکبر کا رائحہ تک نہیں ہے۔ بہت سیدھے سچے مسلمان ہیں......اس کے سوا دونوں حضرات کے اخلاق واوصاف محمد یہ بہت کچھ ملتے جلتے ہیں تو بقول ولی را ولی می شناسد۔ آپ اس واسطے اس قدر ان کے مداح ہوئے ہیں۔ پس یہ مدح سچی صرف ایک دو شخص کی نہ رہی بلکہ کل علماء عرب وعجم کی ہوئی جو مولانا عظیم آبادی کو صادق جانتے ہیں۔"(2)

اس میں شک نہیں کہ علامہ عظیم آبادی اور مولانا غزنوی کے باہم روابط خلوص وللّٰہیت کی بنیاد پر نہایت مضبوط اور

---

(1) تفسير السلف امام من صنف ملقب به اتباع السلف على من خلقه: 10-11

(2) حوالہ مذکور: 11

استوار تھے۔ بالفاظ حضرت ممدوح غزنوی:

''اخی فی اللہ وحبی لوجہ اللہ ورفیقی فی سبیل اللہ عالی مراتب مکرمی مولوی شمس الحق صاحب۔''①

حضرت محدث عظیم آبادی مولانا غزنوی سے متعلق فرماتے ہیں:

"عالم، کامل، محدث، مفسر، عامل، منکسر النفس، لم تر مثله العيون، وله تلاميذ كثيرة وهو صاحب مناقب جمة."②

حضرت الامام غزنوی کے ایک استاذ گرامی محدث یمن، امام العصر شیخ حسین بن محسن یمانی انصاری اپنے ایک مکتوب گرامی میں مولانا عبدالجبار کو ان شاندار الفاظ میں مخاطب فرماتے ہیں:

"مولانا الامام المحدث الاثری السلفی المولوی عبدالجبار الغزنوی."③

علامہ حکیم سید عبدالحیٔ حسنی ندوی (المتوفی 1341ھ) نزہۃ الخواطر میں مولانا موصوف کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"الشيخ العالم المحدث عبد الجبار .... الغزنوی ثم الامرتسری، المتفق على ولايته وجلالته..... وأيد بكثرة المطالعة وسعة الحفظ، وقوة الادراك والفهم، فاشتغل بالحديث والقرآن ببلدة امرتسر مع انقطاعه الي الزهد والعبادة، والاشتغال بالله تعالى، والتجرد عن أسباب الدنيا، ودعاء الخلق الي الحق سبحانه، وله أوراد وأذكار يداوم عليها بكيفية وجمعية، رأيته غير مرة فی امرتسر، فألفيته على قدم السلف الصالحين، من العلماء الربانيين، وكان لا يلتزم المذهب المعين اذا افتى، بل بما يقوم عنده دليله، ولكنه كان لا يسيئ الظن بالائمة المجتهدين، ولا يذكرهم الا بخير."④

ترجمہ: ''شیخ، عالم، محدث عبدالجبار ..... غزنوی ثم امرتسری، آپ کی ولایت اور جلالت شان پر سب متفق ہیں ..... کثیر المطالعہ، سریع الحفظ، ادارک وفہم کی قوت کے حامل تھے، امرتسر میں قرآن وحدیث کی دعوت دیتے، زہد وعبادت میں مصروف رہتے، اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے، اسبابِ دنیاوی سے کنارہ کش تھے اور مخلوق کو حق تعالیٰ سبحانہ کی طرف بلانے میں مشغول رہتے، ان کے مخصوص اوراد و وظائف تھے، جن کی مداومت سے ان پر خاص کیفیت طاری ہوتی، میں نے کئی مرتبہ امرتسر میں ان کی زیارت کی ہے، میں نے

---

① یادگارِ گوہری: 143

② تذکرہ علماء حال: 36

③ تفسیر السلف امام من صنف ملقب به اتباع السلف علی من خلقه: 11

④ نزهة الخواطر: 8/218-219

انہیں سلف صالحین کی راہ پر پایا، وہ علمائے ربانی میں سے تھے، فتویٰ دیتے وقت کسی ایک مذہب معین کا التزام نہیں کرتے بلکہ دلیل کی بنیاد پر فتویٰ دیتے، ائمہ مجتہدین سے سوءِ ظن نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کا ذکر ہمیشہ خیر کے ساتھ کیا کرتے تھے۔"

مولانا محمد ادریس حنفی نگرامی تذکرہ علمائے حال (ص:36) میں مولانا کے بارے میں یوں خامہ پرداز ہوتے ہیں:

"آپ کو حدیث شریف کے جملہ مالہ و ماعلیہ پر بہت عبور و ملکہ ہے۔ آپ کو علمائے محدثین و مجتہدین و فقہائے مذاہب اربعہ و ائمہ اربعہ امام اعظم و امام مالک و امام شافعی و امام احمد بن حنبل سے نہایت محبت ہے اور سب کو تعظیم و تکریم کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور مسائل فروعیہ میں بزمرۂ اہل حدیث داخل ہیں۔"

علامہ عبدالتواب محدث ملتانی حضرت کا ذکر درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

"مجدد أساس التوحيد والاتباع، قالع بنيان الشرك والابتداع، ذوالفضل والعلم والفخار، الجامع بين الكمالين الصورى والمعنوى، السيد السند العلامة الناقد المولوى عبدالجبار الغزنوى."(۱)

مولانا عبدالصمد مدراسی لکھتے ہیں:

"مولانا الشيخ المحدث الكامل العالم النبيل الفاضل المولوى عبد الجبار الغزنوى."(۲)

حضرت الامام مولانا عبدالجبار اخلاص وللّٰہیت اور زہد وتقویٰ میں بے مثل تھے، کلام ایسا پر تاثیر ہوتا کہ قلوب بے اختیار مائل ہوتے۔ علامہ شبلی نعمانی ایک مرتبہ امرتسر تشریف لے گئے، وہاں مولانا عبدالجبار کے درس میں شریک ہوئے، جب واپس آئے تو اپنا تاثر بیان فرماتے ہیں:

"یہ شخص جب اللہ کہتا تھا تو دل چاہتا تھا کہ سر اس کے قدموں میں رکھ دوں۔"(۳)

نواب حبیب الرحمان خاں شروانی صدر یار جنگ ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ رجب 1320ھ/اکتوبر 1902ء کو امرتسر میں ندوۃ العلماء سالانہ جلسہ ہوا، رات میں کھانے میں علماء و معززین کی بڑی تعداد شریک تھی، جس کمرے میں کھانا کھلایا گیا اس میں درمیان میں ہال کے علاوہ بغل میں دائیں بائیں کمرے بھی تھے۔ دستر خوان ایک تھا لیکن کمرے الگ ہونے کی وجہ سے ایک طرف کا آدمی دوسری طرف کے آدمی کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میری نشست جہاں تھی

---

(۱) جزء لطیف فی شرح حدیث ماذئبان جائعان:14

(۲) اعلام الانام بذلة بعض الاعلام:49

(۳) اہل حدیث اور سیاست:18

وہاں حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی بھی رونق افروز تھے۔ مولانا سید علی کان پوری مونگیری ناظم ندوۃ العلماء دوسری طرف کے کمرے میں تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد مجھ سے کہا: ''مولوی حبیب الرحمان تمہارے پاس اور کون کون بیٹھا ہوا تھا؟'' میں نے چند مشاہیر علماء کے نام بتائے، مگر مولانا برابر پوچھتے رہے کہ اور کون تھا؟ آخر میں میں نے مولانا عبد الجبار صاحب غزنوی کا نام لیا۔ کہنے لگے:

''اب میں سمجھا، میرا دل بے اختیار اس طرف کھنچ رہا تھا، اس کی یہی وجہ تھی۔''

توکل ویقین اور مرتبہ زہد اس قدر بلند تھا کہ اس کی تشریح سے میرا خامہ عاجز ہے۔ مولانا غزنوی کے ایک تلمیذ رشید مولانا محمد حسین ہزاروی اپنے دور کے بڑے جید عالم تھے، حضرت میاں صاحب کے فیض یافتہ تھے۔ صاحب غایۃ المقصود علامہ ابوالطیب شمس الحق نے مولانا ہزاروی کا شمار میاں صاحب کے طبقہ اول کے تلامذہ میں کیا ہے۔ مولانا ہزاروی سیرت وکردار کے لحاظ سے بھی نمونہ سلف تھے۔ ایک دن عصر کی نماز کے وقت مولانا عبدالجبار نے ان سے فرمایا:

''مولوی محمد حسین! میں اپنی صاحبزادی تمہارے حبالہ عقد میں دینا چاہتا ہوں اگر تمہیں یہ رشتہ منظور ہو تو نماز کے بعد ٹھہر جانا۔''

ایسی للّٰہیت، بے غرضی اور اخلاص آج کہاں ملے گا؟ یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہیں کہ مولانا ہزاروی معاشی لحاظ سے اس وقت غیر مستحکم تھے۔ مولانا حکیم عبدالمجید خادم سوہدروی حضرت ممدوح غزنوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''الملقب بہ 'امام صاحب' بڑے عالم، فاضل، جامع معقول ومنقول، خاندان غزنویہ کے روشن چراغ، مدرسہ غزنویہ تقویۃ الاسلام کے بانی اول، صاحبِ نسبت، صاحبِ دل اولیاء اللہ میں شمار ہوتے تھے، اپنے والد عبد اللہ صاحب غزنوی کے صحیح جانشین تھے، غزنی سے ان کے ساتھ ہجرت کر کے آئے اور ہر قسم کی تکالیف ومصائب برداشت کرنے میں ان کے شریک رہے، صرف امرتسر ہی نہیں پنجاب بھر میں توحید وسنت کا بول بالا انہی کی ذات گرامی سے ہوا، اور مدرسہ کا علمی فیض تو دور دور ملکوں تک پہنچا۔''[1]

منقول ❺ ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت کچھ مہمان مولانا موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے، سب سے پہلے آپ کی توجہ مہمانان گرامی کی ضیافت کی طرف گئی، گھر میں دریافت فرمانے پر معلوم ہوا کہ کچھ بھی موجود نہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: ''فاقہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے اور آج ہمارے گھر میں فاقہ ہے۔''

مستجاب الدعوات اور صاحب کرامات تھے، مگر میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی کرامت دین کے لیے ان کی بے مثال استقامت ہے۔ الاستقامة فوق الكرامة.

---

[1] سیرت ثنائی: 368

مولانا نے امرتسر میں عامۃ الناس کے اصلاح نفس و باطن کی غرض سے انہیں اپنے حلقۂ ارادت میں بھی لیا۔ ان سے کتاب وسنت سے تمسک اور بدعات ومحدثات سے اجتناب پر بیعت لیتے۔ بعض علمائے اہل حدیث امرتسر پر یہ امر گراں گزرا۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ اس طرح پیری مریدی کے مروّجہ رسوم باطلہ کو پروان چڑھنے کا موقع مل سکتا ہے۔ چنانچہ ان حضرات کا اختلاف بھی دین ہی کی خاطر تھا، اس کے پس پردہ کوئی ذاتی غرض نہ تھی، واللہ اعلم بالصواب۔ اس ضمن میں مولانا غزنوی کے معتقدین میں سے بعض افراد نے چند کبار علمائے عصر سے اس مسئلے میں رجوع کیا۔ چنانچہ محدث کبیر شمس الحق عظیم آبادی نے جو جواب مرحمت فرمایا، مختصراً درج ذیل ہے:

''بیعت توبہ منجملہ مستحبات کے ہے اور اس کے استحباب پر بہت سے ادلہ شرعیہ قائم ہیں کتاب اللہ وسنت رسول ﷺ سے ...... آخذ بیعت کے لیے جتنے شرائط چاہیے یعنی کونه عالماً بالكتاب والسنة، آمراً بالمعروف، ناهياً عن المنكر وكونه صاحب العدالة والتقوىٰ والصدق والضبط وكونه زاهداً في الدنيا راغباً الي الاخرة، مواظباً على الطاعات المؤكدة والاذكار الماثورة وان يكون صحبا لعلماء بالكتاب والسنة وتادب بهم دهراً طويلاً واخذ عنه العلم والفضل وغير ذالك من الشروط الصحيحة۔ یہ کل شرطیں جناب مولوی عبد الجبار صاحب غزنوی میں فيما اظن والله حسيبه موجود ہیں اور وہ اس امر کے لائق وقابل ہیں کہ ان پر لوگ بیعت توبہ کریں۔''[1]

دوسری طرف مولانا غزنوی نے بھی تمام عمر اپنے معتقدین کو عقیدت وارادت کے نام پر کسی غیر شرعی فعل میں مبتلا ہونے کی اجازت نہ دی اور نہ ہی بیعت توبہ کے سلسلے کے ذریعے نظام 'خانقاہیت' کو پروان چڑھایا۔

امرتسر کے ایک معروف اہل حدیث عالم دین مولانا ابوعبد اللہ غلام العلی قصوری ثم امرتسری تھے، ایک روایت کے مطابق حضرت مولانا عبد اللہ غزنوی ان ہی کی دعوت پر اپنے عالی مرتبت فرزندوں کے ہمراہ امرتسر تشریف لائے۔ مولانا قصوری اور خانوادۂ غزنویہ میں باہم بڑی یگانگت اور محبت تھی، لیکن چند ایک مسائل میں دائرہ علمی میں رہتے ہوئے ان بزرگوں کے مابین اختلافات بھی تھے۔ اربابِ غزنویہ بیعت الہام کے قائل تھے، جبکہ مولانا قصوری کو اس سے اختلاف تھا۔ مولانا غلام العلی قصوری نے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار اپنی کتاب تحقيق الكلام فی مسئلة البيعت والالهام میں تحریر فرمایا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا عبد الجبار غزنوی نے اثبات الالهام والبيعة بادلة الكتاب والسنة تالیف فرمائی۔ بقول حکیم محمد موسیٰ امرتسری:

''جس کا لب ولہجہ ذرا سخت تھا۔ یہ کتاب مؤلف فاضل کے والد (مولانا عبد اللہ غزنوی رحمہ اللہ) کی نظر سے

---

[1] الاعلام الانام بزلۃ بعض الاعلام: 50

گزری تو انہوں نے اس سخت طرزِ تحریر کو ناپسند کیا۔''[1]

عرض یہ کرنا ہے کہ اربابِ غزنویہ اور مولانا غلام العلی کے درمیان جو اختلاف تھے وہ محض علمی اور دائرۂ اخلاق کے اندر تھے، اس کی تہہ میں کوئی ذاتی خلش ہرگز نہ تھی۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری لکھتے ہیں:

''مولانا قصوری اور مولانا [عبداللہ] غزنوی میں جو اختلافات تھے وہ احقاقِ حق ہی کے لیے تھے، کوئی ذاتی جھگڑا نہ تھا۔ مولانا غزنوی جب تک زندہ رہے مولانا قصوری کی اقتدا میں عیدین کی نمازیں ادا کرتے رہے اور تبلیغی کاموں میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار رہے۔''[2]

اس سے ان بزرگوں کے اخلاص فی العمل اور خلوص فی الدین کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جبکہ آج عالم یہ ہے کہ جب تک مخالف کی قرار واقعی تحقیر نہ کر لی جائے دل کو تسلی نہیں ہو سکتی۔ اللہ رب العزت ہمیں صحیح دینی فہم کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

جب علامہ ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری کی تفسیر القرآن بکلام الرحمان پہلے پہل طبع ہو کر 1903ء/ 1321ھ میں منظر عام پر آئی تو اس میں بعض مسائل بالخصوص صفاتِ الٰہی کے باب میں علمائے اہل حدیث کی ایک بہت بڑی تعداد نے علامہ امرتسری کی شدید مخالفت کی، مخالفین کی راہ نمائی علمائے غزنویہ کر رہے تھے اور اس وقت خانوادۂ غزنویہ کے سرخیل امام عبدالجبار غزنوی تھے، چنانچہ حسب الحکم صاحب مولانا حکیم ابو تراب عبدالحق امرتسری نے الاربعین فی ان ثناء اللہ لیس علی مذہب المحدثین لکھی، جس پر تقریباً ایک صد سے زائد علمائے اہل حدیث کے تائیدی دستخط ثبت تھے۔ اس کے جواب میں مولانا ثناء اللہ امرتسری نے الکلام المبین فی جواب الاربعین لکھی۔ مگر یہ نزاع یوں ختم نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مئی 1905ء کو جلسہ مذاکرہ علمیہ آرہ کے موقع پر تین رفیع القدر علماء کو حکم قرار دے کر اس کے تصفیے کا معاملہ ان کے سپرد کیا گیا۔ ان علمائے اعلام کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

① علامہ ابوالطیب محمد شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی صاحب عون المعبود

② استاذ الاساتذہ حافظ عبداللہ صاحب محدث غازی پوری

③ عالم کبیر مولانا شاہ عین الحق جعفری پھلواروی

دو امر میں محاکمہ کی تجویز ہوئی۔

1. تفسیر پر جو اعتراضات ہیں وہ صحیح ہیں یا نہیں؟

2. ان الزامات کی بنیاد پر مولوی ثناء اللہ جماعت اہل حدیث سے خارج ہیں یا نہیں؟

---

[1] سہ ماہی 'بصائر': جنوری 1963ء

[2] سہ ماہی 'بصائر': جنوری 1963ء

مخالف فریق کی جانب سے مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے استاذِ گرامی مولانا احمد اللہ امرتسری نے دستخط کیے۔ علمائے ثلاثہ نے بہت غور وفکر کے بعد جو فیصلہ دیا، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

''اربعین کے چودہ اعتراضات بجا ہیں، لیکن ان چودہ اغلاط کی وجہ سے مولوی ثناء اللہ اہل حدیث سے خارج نہیں ہو سکتے۔''

ان علماء کے اس جامع محاکمہ کو فیصلہ آرہ سے موسوم کیا جاتا ہے، اور یہ محاکمہ پہلی مرتبہ مجلہ ضیاء السنۃ کلکتہ بابت رجب وشعبان 1322ھ میں اشاعت پذیر ہوا۔

اس فیصلے کے بعد یہ نزاعی صورت ختم ہوگئی۔ اکابر علماء نے فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ اس لیے کہ مولانا غزنوی کی یہ مخالفت دین کے لیے تھی، ذات کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ لیکن جب ان اکابر علماء نے دنیائے دوں سے کنارہ کر کے عدم کی راہ لی تو نوآمیز راہِ جنوں میں میدان علم کے ایسے کئی شہسوار ہوئے جنھوں نے ازسرنو اس شاخسانہ کو ہوا دی، روداد جرم مرتب کی گئی (الامان الحفیظ) کہ نوعیت دین سے نکل کر ذات تک جا پہنچی تھی، جس نے جماعت اہل حدیث کی تنظیم سازی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

مولانا عبدالجبار غزنوی کے عہد میں ایک فتنہ مرزا غلام احمد قادیانی کے نام سے خطہ پنجاب سے اٹھا، جس نے جلد ہی اپنی شورش سے اپنی یورشوں میں اضافہ کیا۔ پہلے پہل مرزا نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا پھر مرتبہ مسیح موعود پر فائز ہوا اور اس کے بعد مقام نبوت پر متمکن ہوا۔ علمائے حق نے اس کے ان رذیلانہ دعوؤں کا بروقت جواب دیا۔ سب سے پہلے شیخ الکل سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی اور ان کے تلامذہ آگے بڑھے اور مرزا کی تکفیر کی، جس کی تائید دیگر تمام مکاتیب فکر کے اعاظم رجال نے کی۔ مرزا نے بھی اپنی متعدد تحریروں میں سید نذیر حسین محدث دہلوی اور ان کے تلامذہ کو نشانہ تنقید بنایا۔ مرزا نے ایک کتاب آسمانی فیصلہ بھی لکھی، جس میں اس نے بطور خاص سید میاں نذیر حسین اور ان کے تلمیذ رشید مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی کو مخاطب کیا ہے۔ اس میں ایک مقام پر تحدی دیتے ہوئے مولانا عبدالجبار غزنوی کو بھی دعوت مقابلہ ومناظرہ دیا ہے۔ (آسمانی فیصلہ: 30) مولانا عبدالجبار غزنوی نے بھی تاعمر مرزا کی سخت مخالفت کی اور مولانا غزنوی کے تلامذہ بھی اس روش پر گامزن رہے۔ چنانچہ مولانا غزنوی ہی کے ایک تلمیذ رشید مولانا صوفی عبدالحق امرتسری سے مرزا کا مباہلہ ہوا۔ الغرض تردید مرزائیت میں بھی مولانا موصوف غزنوی کی خدمات لائق قدر وستائش ہیں۔

امام عبدالجبار کو اللہ رب العزت نے علم وفضیلت سے بھی بھرپور طور پر نوازا، بلاشک وشبہ ہزارہا افراد نے اپنے مسائل کے حل کے لیے ان سے رجوع کیا اور جواب باصواب پایا، الا ماشاء اللہ۔ موصوف مسلک وعقیدے کے اعتبار سے سلفی نقطۂ نظر کے خاص علمبردار تھے، صفاتِ الٰہی کے باب میں تاول وتوجیہ کے سخت مخالف تھے، مسائل توحید سے

خاص دلچسپی تھی اور اس ضمن میں مسلک سلف نہایت مدلل انداز میں پیش کرتے تھے، فروعی مسائل میں بھی تاحیات عمل بر حدیث کے پابند رہے اور لوگوں کو اس کی دعوت دی۔ زہد و تصوف میں بھی ان کا دامن متاخر صوفیاء کے مبتدعانہ افعال واعمال اور افکار و خیالات سے پاک رہا اور فتویٰ نویسی کے وقت یہی رجحانات ان پر غالب رہے۔

مولانا عبد الجبار نے اپنی باقیات میں مختصر تحریری سرمایہ بھی چھوڑا ہے، اور یہ ان سے روحانی وابستگی رکھنے والے عقیدت کیشوں کے لیے انتہائی حسرت کا مقام ہے کہ آج یہ تحریری سرمایہ بھی کمیاب ہے۔ بایں ہمہ ان کی کتابوں کے عناوین یہ ہیں:

① اثبات الالهام والبيعة بادلة الكتاب والسنة:

اس کتاب میں مولانا موصوف نے الہام و بیعت کے اثبات پر کتاب وسنت سے دلائل جمع کیے ہیں اور مخالفانہ نقطہ نظر کی تصحیح کی ہے، مولانا نے یہ کتاب اردو میں تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ مطبع، ریاض ہند، امرتسر سے 1300 ھ میں طباعت پذیر ہوئی۔ تعداد صفحات 174۔

② وجوب الزكوة فی اموال التجارة:

مولانا کی اول الذکر تصنیف اثبات الالهام والبيعة کے آخر میں ایک رسالہ وجوب الزکٰوۃ ملحق ہے۔ اس پر مصنف کا نام مرقوم نہیں لیکن گمان غالب یہی ہے کہ اس کے مصنف بھی مولانا ممدوح ہوں گے۔ صفحہ 175 سے لے کر 181 تک محیط ہے۔

③ سبيل النجات فی مباينة الرب عن المخلوقات:

یہ کتاب اردو میں ہے۔

④ عقيدة اهل السنة والجماعة فی مسئلة الاستواء والمباينة:

یہ کتاب عربی میں تالیف کی ہے۔

⑤ سوانح عمری مولانا سید عبد اللہ غزنوی:

اس کی تالیف میں مولانا غلام رسول قلعوی بھی شریک ہیں۔

⑥ بستان المحققين بشارة السائلين معروف به مجموعة الفتاویٰ ملقب به العروة الوثقیٰ:

اس میں مولانا اور بعض دیگر علماء غزنویہ کے فتاویٰ ہیں۔ یہ مجموعہ فتاویٰ دو جلدوں پر محیط ہے۔

حضرت الامام عبد الجبار غزنوی صاحبِ اولاد تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پانچ صاحبزادے عطا کیے، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا احمد علی، علامہ سید داؤد غزنوی، حافظ سلیمان، مولانا عبد الغفار اور مولانا عبد الستار۔ پانچوں ہی

علم کی دولت سے حصہ وافر رکھتے تھے۔ بالخصوص علامہ سید داؤد غزنوی اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم، زعیم ملت اور صحافی تھے، بڑے حق گو اور جری تھے، جدوجہد آزادی میں نمایاں طور پر شریک رہے، ان کی دینی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا داؤد غزنوی کے صاحبزادے اور مولانا عبدالجبار کے حفید سعید پروفیسر سید ابوبکر غزنوی اپنے زہد و ورع اور علم و فضل کی بنا پر علمی حلقوں میں مشہور و معروف تھے۔ اخلاص وللّٰہیت میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے، چمنستانِ حیات کی صرف 49 بہاریں دیکھیں تھیں کہ 25 اپریل 1976ء کو لندن میں ایک کار حادثے میں وفات پائی۔

دیارِ پاک و ہند کے اس جلیل القدر عالم دین، رفیع المنزلت محدث، مفسر، فقیہ اور صاحبِ دل بزرگ نے اپنی 63 سالہ زندگی مسلمانوں کی روحانی و باطنی اصلاح میں اپنی عنانِ ہمت کو صرف کرنے کے بعد 25 رمضان المبارک (یوم جمعۃ الوداع) 1331ھ / 9 اگست 1913ء کو امرتسر میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری اپنے ہفت روزہ اہل حدیث بابت 12 ستمبر 1913ء میں مولانا موصوف غزنوی کی خبر وفات بایں الفاظ درج اخبار فرماتے ہیں:

''امرتسر کا آفتاب غروب ہوگیا''

''25 رمضان المبارک (1331ھ) 29 ستمبر (اگست)، جمعہ کو اخبار اہل حدیث کا پچھلا پرچہ ڈاک میں جا چکا تھا۔ 12 بجے جبکہ نماز جمعہ کے لیے جا رہا تھا، بازار میں ناگاہ خبر ملی کہ مولانا عبدالجبار صاحب امام قافلہ غزنویہ مقیم امرتسر فوت ہو گئے۔ مرحوم اپنی زندگی میں خاص وضع کے پابند رہے۔ شہر امرتسر اور بیرون جات میں آپ عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کی اور آپ کے خاندان کی قوم کے دلوں میں ایک خاص وقعت تھی ......دعا ہے خدا اس خاندان کو جید علماء کے وجود سے ہمیشہ قائم رکھے۔

ایں دعا ازمن واز جملہ جہاں آمین باد۔'' [6]

حواشی

[1] مولانا ابوداؤد عبداللہ بن احمد بن خیر الدین بابر خانوی موضع ببر کھائی کے ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے۔ حافظ محمد لکھوی، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالرحیم غزنوی، سید نذیر حسین محدث دہلوی اور شیخ حسین بن محسن یمانی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ حکیم عبدالمجید دہلوی سے طب کی تحصیل کی۔ تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ تصانیف میں حاشیہ بخاری، حواشیز رادی، حاشیہ نخبۃ الفکر، حکایت عجیبہ مع لطائف غریبہ، عجالہ ضادیہ، فلاحِ آخرت وغیرہا کا ذکر ملتا ہے۔ 1921ء/ 1340ھ میں وفات پائی۔ (حالات کے لیے ملاحظہ ہو: الفیوض المحمدیہ: 247-261)

❷ مولانا فضل اللہ بن صادق مدراسی واتمباڑی (جنوبی ہند) سے تعلق تھا۔ اخذ حدیث کے لیے شمالی ہند کی طرف مراجعت کی۔ مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا فقیر اللہ پنجابی، مولانا عبدالجبار غزنوی، حافظ عبدالمنان وزیر آبادی، علامہ شمس الحق ڈیانوی، مولانا محمد اشرف ڈیانوی سے کسبِ علم حاصل کیا۔ جامعہ دارالسلام عمر آباد (مدراس) میں ایک طویل عرصہ تک مدرس رہے۔ تصانیف میں مسئلہ رؤیۃ الھلال، اسلام اور علم جدید، اللولو المکنون، ترکِ موالات اور رد اہل قرآن کا ذکر ملتا ہے۔ 1361ھ/1942ء میں وفات پائی۔ (حالات کے لیے ملاحظہ ہو: حیاۃ المحدث شمس الحق واعمالہ: 274۔275)

❸ مولانا ابوتراب محمد حسین ہزاروی ہزارہ کے ایک غیر معروف گاؤں نونن میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے امرتسر تشریف لے گئے اور خانوادۂ غزنویہ سے فیضیاب ہوئے۔ سید نذیر حسین دہلوی سے اخذ حدیث کیا۔ امرتسر ہی کو اپنی جہود علمی کا مرکز بنایا۔ تصانیف میں تحفۃ الباقی علی الفیۃ العراقی، شرح نخبۃ الفکر، تحفۂ اہل حدیث، ھدایۃ البلید فی رد التقلید اور تقلید النسیان فی ابطال الاعیان کا ذکر ملتا ہے۔ 1343ھ میں وفات پائی۔ (حالات کے لیے ملاحظہ ہو: غزنوی خاندان: 84۔85، دیارِ ہند کے گمنام اکابر)

❹ مولانا حافظ شاہ محمد گکھڑوی گجراتی، گکھڑ (گجرات، پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ حفظ قرآن کریم کے بعد مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور مولانا عبدالجبار غزنوی سے اکتسابِ علم کیا۔ زاہد و عابد تھے۔ تردید بدعت میں بہت زیادہ ساعی تھے۔ 15 مئی 1915ء کو بعارضہ طاعون وفات پائی۔ (حالات کے لیے ملاحظہ ہو: دیارِ ہند کے گمنام اکابر)

❺ ہم نے یہ روایت مولانا قمر التوحید بہاری رحمۃ اللہ علیہ سے سنی۔ مولانا قمر التوحید بہاری رحمۃ اللہ علیہ پر راقم کا مضمون ملاحظہ ہو: ہفت روزہ الاعتصام لاہور، بابت: 29 دسمبر 2000ء۔

❻ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے مؤقر جریدے ہفت روزہ اہل حدیث امرتسر کے متعدد شمارے ہماری نگاہ سے گزرے ہیں لیکن اس موقع کی عبارت ہم نے محترم جناب ضیاء اللہ کھوکھر صاحب (گوجرانوالہ) کے اس مضمون سے لی ہے جو ہفت روزہ اہل حدیث امرتسر کے عنوان سے ہفت روزہ الاعتصام لاہور بابت 19 دسمبر 2003ء میں طباعت پذیر ہوا تھا۔

(منقول از: اصحابِ علم و فضل، ص: 143)

(باب چہارم)

مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی

مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

تحریر: خالد اشرف

پہلی جنگ عظیم میں انگریز کی فتح پر ہندوستان کو رولٹ ایکٹ ملا جس سے مسلمانانِ ہند میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ امرتسر میں جلیانوالہ باغ میں حادثہ پیش آگیا جس سے پورے ملک میں آگ سی لگ گئی۔ انگریز کے ظلم وتشدد کی وجہ سے تمام پنجاب میں عموماً اور امرتسر میں خصوصاً خوف وہراس طاری تھا۔ اس موقعہ پر ایک پچیس سالہ نوجوان اٹھتا ہے اور برطانیہ کی اسلام دشمنی کو بے نقاب کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیتا ہے اس مقصد کے حصول کے لیے مسئلہ خلافت کو اس انداز سے شہر کے مختلف مقامات پر تقاریر کے ذریعے پیش کرتا ہے کہ مسلم عوام تو درکنار غیر مسلم ہندو سکھ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ وقت کی ظالم وجابر حکومت کے مصائب وظلم وتشدد سے بے نیاز ہوکر قید وبند کی تکالیف کو سامنے پانے کے باوجود ان سے نڈر ہوکر اللہ کے بھروسہ پر اپنی اس مہم کو بہرصورت جاری کیے ہوئے ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب بات کہنا بھی جرم تھا چہ جائیکہ حکومتِ وقت جس کے متعلق یہ بات مقولہ بن گئی تھی کہ ''برطانیہ کی حکومت کا سورج غروب نہیں ہوتا'' اور بڑے بڑے سر چھپائے بیٹھے تھے۔ اس لہیب دور میں آزادی وطن کا وہ مجاہد جس نے ملک کے کونہ کونہ میں ایک آگ سی لگا دی تھی مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ تھے!

مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بیک وقت ایک کامیاب سیاسی بصیرت کے حامل عظیم قائد، مذہبی مسائل پر گہری نظر رکھنے والے تھے اور بے مثال راہنما، عظیم منتظم اور مقرر تھے۔ امت مسلمہ کی ہر تکلیف پر ان کی آواز صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی۔

جب انگریز نے اس برصغیر پر ظلم وتشدد ڈھائے تو سینہ تان کر مقابلہ میں آنے والے، عالم اسلام پر برطانوی اقتدار کے مظالم کے بجلیاں گرنے پر بے تاب ہو جانے والے، ہندو نے پر پرزے نکالے تو اس پر خدائی رعد بن کر جھپٹنے والے، مسلمانوں کے درد سے معمور سینہ رکھنے والے یہ مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

انگریز کو اس برصغیر سے نکالنے کی ہر تحریک میں وہ مستعد سپاہی اور مقتدر جرنیل کی حیثیت میں آگے بڑھے، قید فرنگ میں بار بار مصیبتیں جھیلنے کے باوجود یہ ''ذوق'' ختم نہ ہوا بلکہ مزید بڑھتا ہی گیا۔ یہ مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے کہ جن کے دم قدم سے قومی زندگی میں حرارت اور ملی شاہراہ پر اجالا تھا۔ مولانا غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسی شخصیت تھے کہ جن سے مذہب وسیاست دونوں کے ایوان روشن تھے۔ وہ پنجاب کے علماء میں واحد ایسے عالمِ دین تھے کہ جنہوں نے تحریکِ خلافت کے زمانہ میں انگریزی حکومت کے خلاف اپنا پرچم کھولا۔ مولانا ہی پہلے شخص تھے کہ جنہوں نے

امرتسر میں انگریزی کے خلاف وعظ وارشاد کا سلسلہ شروع کیا اور یہ عظیم ترین شرف تاریخ نے انہی کے سپرد کیا کہ پاک وہند کے عظیم جری سپوت پاسبانِ ختمِ نبوت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کو جھنجھوڑا اور منبر ومحراب کے جمود سے کھینچ کر جادۂ حریت اور آزادیٔ وطن کے میدان میں لاکھڑا کیا۔

امرتسر میں دینی زندگی میں سیاسی ہلچل ڈالنے کی ابتداء انہی کی بدولت ہوئی۔ پنجاب میں علماء کی جنگِ آزادی سے پہلے سپہ سالار مولانا سیّد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے۔ تحریک عدم تعاون میں زندگی پیدا کرنے والے بھی حضرت سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے جن کی بدولت یہ تحریک عروج کو پہنچی۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم ایسی عظیم المرتبت ہستی اور ان کی ملّی قربانیوں کی تفصیل پیش کرنے سے قبل خاندانِ غزنویہ کی مختصر تاریخ دہرانی ضروری ہے تاکہ یہ واضح ہوسکے کہ وہ کس خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم کے جد امجد حضرت سیّد عبد اللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے ولی اللہ ہوئے ہیں۔ آپ کا نام نامی والدین نے محمد اعظم رکھا تھا لیکن آپ نے اپنا نام محمد اعظم سے بدل کر عبد اللہ رکھ لیا اور فرمایا:

محمد کہ اعظم و افضل مخلوق است
ہماں رسول اللہ است تسمیہ ما بعد اللہ خوب است

آپ اکثر فارسی میں گفتگو فرمایا کرتے تھے اور آپ کے خطوط وملفوظات فارسی ہی میں ہیں۔ طبیعت میں سادگی وانکساری بے حد تھی۔ مولانا ومولوی جیسے الفاظ اپنے نام کے ساتھ پسند نہیں فرماتے تھے۔

حضرت سیّد عبد اللہ غزنوی سیّدنا وسید اھل الجنۃ حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کی اولاد میں سے تھے۔ خراسان میں آپ کا خاندان سیادت وولایت میں مشہور تھا۔ آپ کے خاندان کو وہ لوگ اصحابِ کرامات سمجھتے تھے۔ آپ کے جد امجد حضرت سید محمد شریف اکمل الاولیاء میں سے ہوئے ہیں۔ سیّد محمد شریف اپنے وقت کے امام اور ولی تھے، لاکھوں افراد ان سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ آپ کی شخصیت مرجع خلائق تھی۔ حضرت سیّد محمد شریف کے صاحبزادے یعنی حضرت سیّد عبد اللہ غزنوی کے والد ماجد صلحائے امت میں سے ہوئے ہیں۔

حضرت سید عبد اللہ غزنوی کی پیدائش غزنی کے قریب قلعہ بہادر خیل میں ذوالحجہ کے آخری عشرہ 1220ھ میں ہوئی۔ آپ کو بچپن ہی سے علم کا شوق تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں تحصیلِ علم سے فارغ ہو گئے۔ چونکہ بچپن ہی سے آپ کو گوشہ نشینی اور توجہ الی اللہ کا شوق وذوق تھا اور چہرے پر تقویٰ اور للّٰہیت کے آثار نمایاں تھے اس لیے بعض صوفیاء اللہ نے آپ کو علماءِ سوء سے دور رہنے اور توجہ الی اللہ کی تلقین فرمائی اور تنبیہ کی کہ علماءِ سوء کی مجالس تمہارے اس نور کو ضائع کر دیں گی۔ جس نور کو ہم تمہارے اندر محسوس کر رہے ہیں، وہ ایک وقت میں ظاہر ہو کر رہے گا۔ مشیتِ ایزدی سے

یہ نور ایک دن اوجِ خراسان پر چمکا اور نورانی شفاؤں سے ہندوستان کو بھی منور کیا۔

ایامِ طفولیت کے گزرنے کے بعد شباب کا آغاز ہوا تو آپ کی صلاحیت، تقویٰ اور ذکاوتِ طبع اور جودتِ فہم کے جوہر روز بروز ملک پر روشن ہونے لگے۔ ایامِ طفولیت میں بھی اگرچہ آپ کو گوشہ نشینی اور توجہ الی اللہ کا شوق تھا مگر سن شباب شروع ہونے سے ہر ایک کمالِ شباب کو پہنچا۔

خود فرماتے ہیں کہ:

''ایک روز مغرب کی نماز کے بعد محض عنایتِ ایزدی سے ایسا جذبہ غیبی دل پر طاری ہوا کہ تمام ماسوی اللہ سے دل خالی ہو کر ربّ عزوجل کی طرف متوجہ ہوگیا اور یکا یک حضور دائمی یعنی مرتبہ احسان مجھ کو حاصل ہوا جس سے تمام ماسوی اللہ سے نفرت ہوگئی اور تمام مقاصد توکل، رضا، قناعت، صبر، قصرِ امل بغیر وسیلہ ریاضت واشتغالِ صوفیہ کے مجھ کو سب ایک دفعہ ہی ایک وقت میں ہی حاصل ہوگئے۔''

اس کے بعد آپ نے لوگوں سے عام ملاقات و میل جول بند کر دیا اور تمام اقارب واحباب کو چھوڑ کر پہاڑ خوجہ بلال پر، جہاں کوئی متنفس آباد نہ تھا اقامت فرما ہوئے۔ مگر یہ خلوت تادیر قائم نہ رہ سکی دنیا پروانہ وار وہاں پہنچی اور قدرت جملہ خلوت کو جلوت میں لے آئی۔ آپ کی صحبتِ پاک سے لاتعداد افراد مستفیض ہوئے۔ صوبہ غزنی کے علاوہ قندھار سے ہرات تک کے تمام علماء و مشائخ آپ کی خدمت میں استفادہ کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ اس وقت غزنی کی مذہبی حالت یہ تھی کہ خواص و عام شرک و بدعت اور رسومِ قبیحہ میں مبتلا تھے۔ اکثر مشائخ وعلماء نے ان رسومات کو دین سمجھ رکھا تھا۔ ان حالات میں جبکہ آپ بے حد پریشان اور متفکر تھے یہ القاء ہوا کہ ان بدعات اور رسوم کو سختی سے روکو اور خود اتباعِ کتاب وسنت پر قائم رہو۔ پھر آپ کو ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى﴾ کی ترغیب ہوئی تو آپ کتاب وسنت کے علوم ومعارف کی طرف متوجہ ہوئے۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کو اس کے لیے عرب وعجم سے نایاب کتب فراہم فرمائیں، آپ نے خداداد فہم و جودتِ طبع اور تعلیم غیبی سے طریقہ علیہ محدثین کو اختیار فرمایا۔

حضرت سید عبداللہ غزنوی صاحب نے حدیث کی تفہیم اس وقت کے محدث کبیر شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی سے حاصل کی۔ قرآن وسنت کی تفہیم میں آپ ہر مشکل مقام پر وحید العصر فرید الدھر جامع انواع العلوم شیخ حبیب اللہ قندھاری نور اللہ مرقدہ سے استفادہ فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ خود بھی قندھار تشریف لے گئے اور کچھ عرصہ کے لیے مولانا حبیب اللہ قندھاری کے پاس قیام فرمایا کیونکہ خراسان میں اس وقت کوئی بھی شیخ کے سوا طریقہ محدثین سے واقف نہ تھا، مگر آپ حکامِ وقت کے ظلم و جبر سے خاموش تھے۔ حضرت عبداللہ غزنوی جب دوبارہ تشریف لے گئے تو آپ کے حالات سے متعجب ہو کر شیخ حبیب اللہ نے قندھاری علماء کی بھری مجلس میں فرمایا:

''مسائل دینیہ را چناں کہ ایں شخص مے فہمد من خود نمے فہم۔''

یہ ملاقات آپ کی شیخ سے آخری ملاقات تھی اور اس آخری ملاقات میں شیخ نے حضرت سید عبداللہ غزنوی سے فرمایا کہ:

''قندھار آپ کے ملک سے بہت دور ہے، آپ اتنی مسافت طے کر کے تشریف نہ لایا کریں۔ کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ عز وجل تمہارا مربی ہے۔ تمہیں میری کوئی ضرورت نہیں۔ وہ خود تمہاری حفاظت کرے گا۔ اگر آپ کو کوئی مشکل مقام آیا تو مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی راہنمائی فرمائیں گے۔''

آپ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ نے جو کچھ فرمایا ویسا ہی میرے معاملات میں ہوا۔ اس زمانہ میں قندھار، ہرات، غزنی اور قرب و جوار کے علماء و مشائخ آپ کو نہایت احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خواص و عوام آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوتے، حلقۂ مریدین بہت وسیع ہوگیا، بڑے بڑے امراء و حکام آپ سے نیاز حاصل کرتے۔

حضرت سید عبداللہ غزنوی کی زندگی کے اس قابل رشک و بے مثال پہلو کا ایک دوسرا رُخ بھی تھا۔ حاسدین و بدعت پسند علماء سوء اور گدی نشینوں کو یہ ادا پسند نہ آئی، عوام میں توحید راسخ ہوتے دیکھ کر وہ سیخ پا ہو گئے۔ چنانچہ وہ حضرت سید عبداللہ غزنوی کی علانیہ مخالفت پر اتر آئے اور ان کے راستہ میں مشکلات کی سنگین دیواریں کھڑی کرنے کی ٹھان لی۔ اس سلسلہ میں والیٔ افغانستان دوست نور خاں سے مراسم پیدا کئے اور اسے کہا کہ یہ شخص ہمارے دین کا دشمن اور ہمارے عقائد و مسلک کا مخالف ہے اور اس کا طریقۂ عبادت خدا اور رسول اللہ (ﷺ) کے مقرر کردہ طریقوں سے ہٹا ہوا ہے۔ اسے راہِ راست پر لانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے شدید ترین سزائیں دی جائیں۔ چنانچہ دوست محمد خاں نے حضرت سید عبداللہ غزنوی کو دربار میں بلایا اور ان سے نہایت تحقیر آمیز انداز سے گفتگو کی۔ دورانِ گفتگو افغانستان کی فوج کے کمانڈر انچیف سردار محمد خاں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ عبداللہ کو میرے حوالے کر دیا جائے میں اس کو توپ کے دھانے پر رکھ کر اڑا دوں۔

حکومت افغانستان کی طرف سے حضرت سید عبداللہ غزنوی کو اس قدر وحشت ناک سزائیں دی گئیں کہ آپ ملک سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ آپ نے افغانستان کو اس وقت خیر باد کہا جبکہ پولیس اور فوج آپ کے پیچھے پیچھے پھرنے لگی اور حکام نے حد درجہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حضرت سیّد غزنوی کے افراد کنبہ پہاڑوں کی غاروں میں جا چھپے اور وہاں جا کر اللہ کی عبادت کرتے رہے لیکن سرکاری آدمی وہاں بھی جا پہنچے اور انہیں آرام نہ لینے دیا۔ ان حالات میں حضرت سید عبداللہ غزنوی نے قصد ہجرت فرمایا اور پنجاب کے لئے رختِ سفر باندھا۔ آپ کے بارہ فرزند اور ایک صاحبزادی تھی جن میں حضرت الامام مولانا سیّد عبدالجبار غزنوی بھی تھے۔ وہ اس وقت انیس (19) برس کے نوجوان تھے۔

یہ مسافرانِ راہِ حق سب سے پہلے صوبہ سرحد کی ایک درگاہ گوٹھ شریف پہنچے وہاں کے سجادہ نشین ان کے حالات

سے باخبر تھے اور اُن کے اصرار پر یہ سال بھر اُن کے مہمان رہے۔ صوبہ سرحد کے پہلے وزیر اعظم نواب سر عبد القیوم خاں اور اُن کے والد حضرت سیّد عبداللہ غزنوی سے بیعت ہوئے۔ بعد ازاں مسافرانِ حق کا یہ قافلہ دہلی اور مختلف مقامات سے ہوتا ہوا لاہور وارد ہوا اور یہاں چند روز ٹھہرنے کے بعد امرتسر کے قریبی گاؤں ''خیر دی کے'' میں ڈیرے ڈال دیئے۔ یہاں مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے اور اپنے مشن کو از سر نو جاری کیا۔

دہلی میں اقامت کے دوران علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ بھی ان سے متعارف ہوئے۔ وہ اُن کی نیک نفسی، روحانی بلندی اور جرأت و استغناء سے بہت متاثر ہوئے۔ علامہ اقبال نے دو روایتیں حضرت سید عبداللہ غزنوی کے متعلق بیان کی ہیں۔

① دہلی میں 1857ء کے انقلاب کا زمانہ تھا۔ گورا فوج نے چاروں طرف گولیوں سے ہلاکت کا طوفان اٹھا رکھا تھا۔ جامع مسجد اور اُس کے گرد و نواح کا علاقہ بالخصوص اس قتل عام کا مرکز تھا۔ ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو آپ جامع مسجد کے حوض پر آ گئے۔ گولیاں چلتی رہیں، رائی برابر کھٹکا محسوس نہ کیا۔ اس معجزہ نما جرأتِ ایمانی کو دیکھ کر مقتدیوں نے حوصلہ کیا اور گولیوں کی بوچھاڑ میں وضو کر کے نماز میں لگ گئے۔

دوسرا واقعہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے:

② ''حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کہ کسی نے آکر اطلاع دی کہ آپ کا بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ آپ نے یہ اندوہناک خبر سُنی، ایک منٹ خاموش رہے پھر درس میں مصروف ہو گئے۔''

حضرت سیّد عبداللہ غزنوی جب غزنی سے دہلی حضرت شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کے مدرسہ میں تحصیل علم کے لئے گئے تو اسی زمانہ قیام میں 1857ء کا انقلاب آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس جنگ کے ابتدائی ایام میں جب سلطنت مغلیہ کا بے نظام لشکر اندھا دھند قتل عام کر رہا تھا۔ آپ کو سڑک کے کنارے ایک بے ہوش انگریز عورت نظر آئی جسے مغلیہ لشکر اپنی طرف سے مردہ کر گیا تھا۔ حضرت سیّد عبداللہ غزنوی اس مجروح عورت کو اٹھا کر اپنے مدرسہ میں لائے اور اس کی تیمارداری کرتے رہے۔ بعد میں جب انگریزی اقتدار نافذ ہو گیا تو اُسے جنرل نکلسن کے ہیڈ کوارٹر میں خود پہنچا کر آئے۔ وہ میم جنرل نکلسن کی قریبی رشتہ دار تھی۔ جب اس نے جنرل نکلسن کو اپنی بپتا سنائی اور مولانا غزنوی کے حسنِ سلوک کا حال سنایا تو مولانا کو قلعہ میں بلایا گیا اور جنرل نکلسن نے اس خدمت کے عوض آپ کو انعام و اکرام دینا چاہا۔ لیکن آپ نے فرمایا:

''نہتی عورت پر حملہ کرنا میرے مذہب کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ آپ کی عزیزہ کی خدمت کر کے میں نے اپنے پروردگار کو راضی کیا ہے۔ میں کسی بشر سے اپنی دینی خدمت کا عوض لینا ناجائز سمجھتا ہوں۔''

حضرت سیّد عبداللہ غزنوی کے اس تقویٰ، خدا خوفی، تعلق باللہ اور ولایت و شرف و امتیاز ہی کا نتیجہ تھا کہ امرتسر میں ایک محلہ غزنویوں کے نام سے منسوب ہو گیا۔

حضرت عبداللہ غزنوی کے بارہ فرزند اور ایک بیٹی تھی۔ جن میں حضرت عبداللہ غزنوی اور حضرت الامام سیّد عبدالجبار غزنوی اور قطب وقت سیّد عبدالواحد غزنوی، مولانا سید عبدالاوّل غزنوی، حضرت مولانا سیّد محمد غزنوی معروف ہوئے۔ یوں بارہ فرزند اپنی اپنی جگہ قرآن وسنت کے اجل عالم اور اپنے وقت کے ائمہ تھے۔ ہر ایک کے حلقہ درس میں سینکڑوں افراد شریک ہوتے۔

حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی حضرت الامام امام الموحدین سید عبدالجبار غزنوی کے فرزند ارجمند قطب الاقطاب حضرت سیّد عبدالواحد غزنوی کے بھتیجے تھے۔

پیدائش اور تعلیم و تربیت:

خود مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ پیدائش اواخر جولائی یا اوائل اگست 1895ء لکھی ہے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے خاندانی روایات کے مطابق اپنے جلیل القدر والد حضرت الامام مولانا سیّد عبدالجبار غزنوی سے حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے عمان کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ امرتسر سے تعلیم کی تکمیل کے لئے اپنے بھائی مولانا سیّد اسماعیل غزنوی المعروف خادم حجاج کے ہمراہ دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے اسی مدرسہ سے فیض حاصل کیا جس میں آپ کے جد امجد فیض یاب ہوئے تھے یعنی مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کے مدرسہ اور فتح پوری مسجد میں قیام فرما ہوئے۔ یہاں تکمیل علم کے بعد دونوں بھائی لکھنؤ گئے جہاں فقہ و منطق کے علوم شیعہ علماء سے حاصل کئے۔ مولانا اسماعیل غزنوی تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں طب اسلامی کی تعلیم کے لئے ٹھہر گئے لیکن مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ دستارِ فضلیت حاصل کر کے امرتسر واپس تشریف لے گئے۔ اور اپنے آبائی مدرسہ میں درس تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آپ کے اساتذہ کرام میں حضرت مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری اور منطق کے شہرہ آفاق عالم مولانا سیف الرحمٰن کابلی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے انتہائی ہنگامہ خیز تھا۔ مولانا کا جوانی کا عالم تھا غزنی کا گرم خون مسند تدریس کی عافیت گوشی میں کب چین لینے دیتا تھا۔ مسند تدریس کو چھوڑ کر میدانِ سیاست میں اتر پڑے اور آتے ہی انگریزی حکومت کے اقتدار کو چیلنج کر دیا۔ یہ زمانہ ہندوستان کی سیاسی زندگی کی بیداری کا تھا۔ ترکی انگریز کے خلاف صف آرا تھا۔ مسلمانانِ ہند کی تمام تر ہمدردیاں ترکی کی خلافت کے ساتھ تھیں۔ خلافت کمیٹی کے معرض وجود میں آنے کا سبب بھی دراصل جنگ اور اس کی حمایت تھی۔ مولانا غزنوی مرحوم اور مولانا سید اسماعیل غزنوی برادر مولانا داؤد غزنوی تحریکِ خلافت کے بانیوں میں سرِفہرست تھے۔ 1919ء میں آپ نے سیاسیات میں قدم رکھا، یہ مولانا کی جوانی کا زمانہ تھا۔ ادھر مارشل لاء کا مہیب

دور اور انگریز کے جبر و استبداد کا عروج سامنے تھا۔ آپ نے مارشل لاء کے حالات کی دہشت کو ختم کرنے کے لئے پوری قوت بیان سے کام لیا۔ اُس دور میں جن لوگوں کو ان کی تقریریں سننے کا موقع ملا اُن کا کہنا ہے کہ مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی صاحب تقریر کرتے اور انگریز حکومت کی مخالفت پر آتے تو یوں معلوم ہوتا کہ تقریر نہیں کر رہے بلکہ آگ برسا رہے ہیں۔ اُن کے بے خوف تقریروں سے لوگوں کے دلوں سے مارشل لاء کی دہشت دور ہونے اور علماء کو میدانِ حریت کی طرف آنے میں بے حد مدد ملی۔ امرتسر کی مشہور تحریک سول نافرمانی میں ایک ایسا دور بھی آیا جب انگریزی حکومت کچھ عرصہ کے لیے امرتسر شہر کی علمداری سے دست بردار ہو گئی اور کانگریس کمیٹی نے شہر میں متوازی حکومت قائم کر لی۔ اس حکومت میں شہر کے مغربی حصہ کے ڈکٹیٹر مولانا سیّد داؤد غزنوی بنائے گئے۔ مولانا کی عمر اس وقت 26 برس تھی، اس وقت غیر مسلم شہریوں میں بھی ان کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ مولانا نے بدیشی مال فروخت کرنے کے جرم میں شہر کے بڑے بڑے تاجروں پر ہزاروں روپے جرمانہ کیا اور انہوں نے بخوشی یہ جرمانے ادا کئے۔ 1919ء میں جلیانوالہ باغ کے مشہور واقعہ کے دوران مولانا غزنوی اور آپ کے بھائی مولانا سیّد اسماعیل غزنوی کو اُن کے احباب اور بزرگوں نے شہر میں گڑبڑ کے باعث زبردستی مسجد غزنویہ کے ایک حجرہ میں مقید کر دیا تھا تاکہ یہ کسی ہنگامہ میں حصہ نہ لے سکیں۔ جب جمعہ کی نماز کے لئے ان دونوں کو باہر نکالا گیا تو یہ نماز سے فارغ ہوتے ہی چپکے سے دیوار پھاند کر جلیانوالہ باغ کی جانب چل پڑے۔ اس روز یہ دونوں حضرات حادثہ سے بال بال بچے۔ ہوا یوں کہ انہوں نے جلیانوالہ باغ میں منعقدہ اس عظیم الشان جلسہ میں تقریریں کرنا تھیں۔ مسجد غزنویہ سے نکل کر ملکہ وکٹوریہ کے بت کے قریب پہنچے تو وہاں ایک پنواڑی کی دکان پر پان کھانے رُک گئے وہیں کچھ دوسرے رفقاء بھی مل گئے۔ پان لگوانے کے بعد یہ سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ''پہلے آپ'' کی تکرار میں مصروف ہو گئے۔ ابھی یہ پان کھانے بھی نہ پائے تھے کہ جنرل ڈائر اپنی گورا فوج کے ہمراہ مارچ کرتا ہوا اُن کے پاس سے گزرا، جب تک یہ پان کھا کر کرشنا مارکیٹ تک پہنچتے کہ جنرل ڈائر گولی چلوا کر اور سترہ سو افراد کو ہلاک کر کے واپس آ رہا تھا۔ اس طرح یہ دونوں بھائی اور ان کے رفقاء اس حادثہ سے بال بال بچ گئے۔ خلافت کمیٹی کے تمام اراکین چونکہ کانگریس میں شامل ہو گئے تھے۔ اس لئے مولانا کانگریس اور خلافت دونوں کے رُکن تھے۔ لکھنؤ کانگریس کے موقع پر خلافت کانفرنس بھی ہوئی۔ اس وقت حجاز پر سلطان ابن سعود نے قبضہ کر لیا تھا۔ علی برادران اور بعض دوسرے خلافتی کارکن جو ابن سعود کے وہابی ہونے قبہ جات گرانے کے باعث اختلافات رکھتے تھے۔ انہوں نے کانفرنس میں سلطان ابن سعود کے خلاف ایک قرار داد پیش کی۔ دوسرے گروہ میں مولانا ظفر علی خاں، مولانا داؤد غزنوی اور مولانا اسماعیل غزنوی چونکہ خود وہابی تھے اور سلطان سے ذاتی مراسم رکھتے تھے، انہوں نے 1926ء میں مؤتمر عالم اسلامی میں اس فریق مخالف کے خلاف تقریریں کیں۔ پنجاب خلافت کمیٹی نے جس میں شیعہ، سُنی، اہلحدیث سبھی شامل تھے مل کر حالات کا مقابلہ کیا۔ بالخصوص شاہ جی مرحوم نے جوانمردی کا ثبوت دیا

اور سلطان کے مخالفین اور حکومت وقت کا مقابلہ کیا۔

تحریکِ خلافت کا زمانہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ایک سخت ترین دور تھا جبکہ کلمۃ اللہ اور آوازۂ حق بلند کرنے آزادی کا نام لینے پر زبانیں کاٹ دی جاتی تھیں۔ انقلاب زندہ باد کہنے کی پاداش میں کوڑے لگتے تھے۔ مولانا داؤد غزنوی نے پہلی دفعہ صوبہ میں جمعیۃ علماء اسلام کی بنیاد رکھی۔ خلافت کمیٹی کے دوران تین سال قید بامشقت ہوئی۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اس وقت مدرسہ نعمانیہ مسجد خیر الدین امرتسر میں مشکوٰۃ وغیرہ پڑھاتے تھے اور اپنے خوش بیان ہونے کی وجہ سے ایک واعظ کی حیثیت سے خاصے مشہور تھے۔ مولانا غزنوی نے چوک کٹڑہ میں ایک تقریر کی، جو ان کی تقاریر میں معرکہ کی تقریر ہے، خیال تھا کہ آپ گرفتار ہو جائیں گے۔ دوسرے روز اسی جگہ شاہ جی مرحوم نے تقریر فرمائی۔

شاہ جی کی اس تقریر سے عوام میں غلط فہمیوں کا شدید اندیشہ محسوس کرتے ہوئے مولانا غزنوی شاہ جی کے پاس گئے۔ گفتگو کی، حالات واخبارات سامنے رکھے۔ شاہ جی نے فرمایا: بھائی میں تو کبھی اخبار پڑھتا نہیں اور نہ ہی میں نے کبھی سیاست میں حصہ لیا ہے، مجھے حالات کا کوئی علم نہیں۔ مولانا نے بتلایا کہ عالم اسلام کے ساتھ برطانیہ کیا کچھ کر رہا ہے اور ترکی کے حالات کس خطرناک موڑ پر ہیں۔ آپ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔ اس وقت مسلمانوں اور عالم اسلام کے ساتھ اس سے بہتر کوئی خیر خواہی نہیں ہوسکتی۔ شاہ صاحب نے مولانا کے ساتھ تقریریں شروع کر دیں اور وہ ان کے دستِ راست بن گئے۔ پھر فنِ خطابت کے امام تسلیم کر لئے گئے اور اپنی ایمان پرور تقاریر سے لوگوں کے اندر حریتِ اسلام کی روح پھونکتے رہے۔

سول نافرمانی کی تحریک میں مولانا غزنوی اور شاہ جی دوسرے رفقاء سمیت گرفتار ہوئے۔ پنجاب کے تمام کارکن میانوالی جیل میں تھے اور ان پر سخت پابندیاں تھیں، ایک دوسرے سے ملاقاتیں تو بالکل بند تھیں۔ جب امرتسر کے رفقاء بھی ان کے ساتھ آ ملے تو ان کی ایک طاقت بن گئی اور انہوں نے مطالبات منوانے شروع کر دیے اور آہستہ آہستہ پابندیاں ختم کر دی گئیں۔ اسی زمانۂ قید وبند میں جب حالات تھم گئے تو مولانا غزنوی کو شاہ جی نے فرمایا کہ مجھے شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ پڑھایا کریں۔ مولانا نے ٹالا لیکن شاہ جی نے منوا لیا۔ چنانچہ مولانا نے شاہ جی کو حجۃ اللہ البالغۃ پڑھانی شروع کر دی۔ مگر دو ماہ بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ اس جمعیت کو منتشر کر دیا گیا اور مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ مولانا غزنوی کو رہتک بھیجا گیا، مولانا اور شاہ جی 1946ء تک دونوں ایک دوسرے کے ہم سفر رہے۔

احرار میں شمولیت:

خلافت سے علیحدگی کے بعد مولانا غزنوی احرار میں شامل ہو گئے۔ مسجد شہید گنج کی تحریک کے موقع پر ان کے اور دوسرے پرانے سیاسی ساتھیوں کے مابین اختلافات بھی ہوئے۔ مولانا ظفر علی خان حریف بن گئے لیکن آپ اپنے مسلک پر قائم رہے۔

1936ء کو احرار کی طرف سے سلطان ابن مسعود کے پاس ایک وفد آیا جس کے امیر خود مولانا ہی تھے۔ مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں ماسٹر تارا سنگھ اور مولانا غزنوی صاحب کے مابین اصل مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ ماسٹر تارا سنگھ اس کی اہمیت کو سمجھ گئے اور سردار منگل سنگھ کو لاہور بھیجا کہ مسجد گرانے والوں کو اس بد ارادہ سے روکیں۔ لیکن سردار منگل سنگھ کو لنڈے بازار میں حکام نے روک لیا اور مسجد شہید ہو جانے کے بعد چھوڑا۔ اس طرح مولانا کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

مختلف تحریکوں سے وابستگی:

مولانا داؤد غزنوی کی سیاسی زندگی بڑے معرکے کی تھی جیسا کہ مختصراً اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ طوالت سے بچتے ہوئے ایک مختصر سی تاریخ کا بیان کرنا ضروری ہے کہ مولانا مرحوم کن کن جماعتوں اور تحریکوں سے وابستہ تھے۔ تاکہ ان کی سیاسی زندگی کے مزید خدوخال نمایاں ہوں۔

صوبہ میں پہلی مرتبہ جمعیۃ علماء اسلام کی بنیاد آپ ہی نے رکھی۔ خلافت کمیٹی بنائی کہ جس کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں 1921ء میں تین سال تک قید بامشقت ہوئی۔ دوسری مرتبہ 1925ء میں گرفتار ہوئے اور پھر تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر

مختلف اوقات میں امرتسر، سیالکوٹ، شاہ پور، رہتک، ملتان، لاہور، منٹگمری، حصار، اٹک، میانوالی، سرگودھا اور گجرات کی جیلوں میں رکھے گئے۔ گویا جیل ان کے لیے امن وسکون کا گہوارہ بن گئی اور کیفیت یہ ہو گئی کہ۔

گوشے میں قفس کے مجھے آرام ہے

خلافت، جمعیۃ العلماء ہند، مجلسِ احرار اور کانگرس کی تحریکوں میں وہ بارہا گرفتار ہوتے رہے۔ سول نافرمانی کی تحریک کے وقت مولانا غزنوی مسلم لیگ میں شرکت فرما چکے تھے جس سے پورے ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ مولانا نے تقریباً سبھی بڑے بڑے شہروں میں تقریریں کر کے صوبہ بھر میں آگ لگا دی تھی اس سے اس تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ اس تحریک میں مولانا کے بھائی مولانا سید اسماعیل غزنوی بھی ان کے ساتھ آ ملے اور اس تحریک میں آپ کے ساتھ بہت تعاون فرمایا۔ پنجاب صوبائی مسلم لیگ کی سول نافرمانی کے پہلے ہی روز نواب ممدوٹ اور ورکنگ کمیٹی کے اراکین مولانا داؤد غزنوی کے سوا تمام گرفتار ہو گئے۔ مولانا غزنوی نے ان کے بعد صوبہ بھر کی تمام تحریکوں کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کی حسنِ تدبیر سے یہ تحریک اپنے عروج کو پہنچی۔

آزادئ وطن کے سلسلہ میں جتنی بھی تحریکیں معرض وجود میں آئیں مولانا نے ان سب میں بھرپور حصہ لیا اور کئی ایک تنظیمیں خود قائم کیں۔ ان سب تحریکوں میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور ان میں سے اکثر قیدیں بامشقت تھیں۔ ملتان جیل روڈ میں شدید قسم کی جسمانی مشقت لی گئی جس مین آپ کی آنکھیں مستقل طور پر خراب ہو گئیں، کئی بار آپریشن ہوئے لیکن خدا تعالیٰ کے کرم واحسان سے ان کی بصارت قائم رہی۔

1942ء کی کانگرس تحریک میں گرفتار ہوئے تو جیل کی غذا کے باعث مولانا کے قلب کی فعالیت بری طرح متاثر ہوئی۔ اس وقت سے لیکر تادمِ وفات یہ نامراد مرض ہم سفر رہی۔

1921ء میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس لاہور میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء کی کوٹھی پر ہوا۔ مولانا آزاد نے صبح کی نماز پڑھائی، اس کے بعد لوگوں نے استخلاصِ وطن اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے مولانا آزاد کی بیعت کی۔ بیعت کرنے والوں میں مولانا غزنوی صاحب سب سے پہلے تھے اور حضرت سید غزنوی نے اس اجلاسِ بیعت کے انعقاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

جمعیۃ علماء ہند کی ابتداء کا سہرا مولانا غزنوی صاحب ہی کے سر ہے۔ اس کی پہلی نشست مولانا آزاد کی زیرِ صدارت ہوئی۔ اس میں شریک علماء ومشائخ جن میں مولانا سلامت اللہ لکھنوی اور اُن کے رفقاء، مولانا عبدالجبار لکھنوی فرنگی محلی اور ان کے احباب، مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی اور ان کے معتقدین، مولوی کفایت اللہ دہلوی اور ان کے ساتھی، مولانا معین الدین اجمیری اور ان کے شرکاء، مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے مقربین، مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے معتقدین، پیر جماعت علی شاہ، پیر مہر علی شاہ، مولانا گورکھ پوری شامل تھے جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا غزنوی کی مساعی جمیلہ میں ایسا عظیم وعدیم المثال اجتماع ہوا کہ پاک وہند کی تاریخ میں کبھی نہ ہوا اور نہ شاید کبھی ہوگا۔

مجلسِ احرار کے بانیوں میں مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چوہدری افضل حق، مولانا مظہر علی، خواجہ عبدالرحمٰن غازی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا داؤد غزنوی بھی پیش پیش تھے۔ تحریکِ کشمیر میں مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی صفِ اول کے راہنماؤں میں سے تھے۔ جتنی مساعی مولانا غزنوی کی اس سلسلہ میں ہیں اس وقت چند ہی لوگ آپ کے برابر تھے۔

مغل پورہ انجینئرنگ کالج کے مشہور حادثہ میں حضرت غزنوی بھی شریک تھے۔ چنانچہ آپ مولانا احمد علی، مولانا غلام مرشد کے ساتھ گرفتار ہوئے اور شاہ جی نے ان حضرات کی گرفتاری کے بعد ایک جلسہ عام میں خطاب فرمایا:

> ''مولانا غزنوی نے جہاں کئی اور بے مثال معرکے سرانجام دیئے ہیں وہاں ان کا یہ کارنامہ سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔''

اجنبی اقتدار کے تحت پولیس اور فوج کی ملازمت کو حرام قرار دینے کے لیے پانچ صد علماء کا فتویٰ شائع ہوا۔ یہ فتویٰ اگرچہ حکومتِ ہند نے خلافِ قانون قرار دے کر ضبط کرلیا لیکن مولانا نے اس کی اشاعت وتبلیغ میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا۔ برطانوی فوج میں اس کی تقسیم سے ایک لرزہ طاری ہوگیا۔

قائم ہے ان سے ملّتِ بیضاء کی آبرو:

الٰہ آباد اتحاد کانفرنس جس میں سکھ، ہندو اور مسلم لیڈر موجود تھے وہاں مولانا غزنوی بھی شامل تھے۔ سکھوں نے

اعلان کیا کہ اگر پنجاب میں ہمیں مناسب مراعات نہ دی گئیں تو ہم خون کی ندیاں بہا دیں گے، مختلف تقاریر کے بعد مولانا داؤد غزنوی صاحب اٹھے تو انہوں نے فرمایا:

''میں خیالی خون کی ندیوں میں تیرتا ہوا صلح کے مسائل کی امید میں الہٰ آباد پہنچا ہوں اگر کوئی منصفانہ صلح کی تجویز سامنے آئے تو ان شاء اللہ قبول کر لیں گے۔ اگر نہ ہو سکے تو پھر خون ہماری تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں اور نہ ہم اس سے ناواقف ہیں۔''

یہ کہنے کے بعد مولانا داؤد غزنوی صاحب ہاؤس پر چھا گئے۔ مولانا نے تقریر ختم فرمائی تو مولانا ظفر علی خان مرحوم نے فی البدیہہ یہ شعر کہے:

قائم ہے ان سے ملت بیضاء کی آبرو
اسلام کا وقار ہیں داؤد غزنوی
رجعت پسند کہنے لگے ان کو دیکھ کر
آیا ہے سومنات میں محمود غزنوی
کلکتہ میں ایک اور بھی ہیں ان کے ہم لقب[1]
یہ ہست غزنوی ہیں وہ ہے بود غزنوی

یہ خوش بختی بھی مولانا کے حصہ میں آئی کہ احرار سے الگ ہو کر باقاعدہ طور پر کانگرس میں شامل ہو گئے اور میاں افتخار الدین کے بعد پنجاب کانگرس کے صدر منتخب ہوئے۔ وہ زمانہ پنجاب کی سیاست کا بڑی دھوم دھام کا تھا۔ مسلم لیگ اپنے عروج پر تھی اور مولانا اس کے مقابلے میں کانگرس کا الیکشن لڑ رہے تھے۔ پورے پنجاب میں کانگرس کی صرف ایک مسلم نشست پر قبضہ کر سکی اور یہ خوش بخت مسلمان مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے۔ کیونکہ اس الیکشن میں مقامی سیاست کے علاوہ مولانا کی شخصیت اور خاندانی وجاہت کو بڑا دخل تھا۔ لوگوں نے جماعتی کشمکش سے علیحدہ ہو کر مولانا غزنوی کو ووٹ دیئے۔ اس کے بعد 1946ء میں آزادئ وطن کی تحریک مسلم لیگ میں شامل ہو گئے جس سے مسلم لیگ کو ایک فعال، جاندار، اعلیٰ منتظم، مخلص رفیق مل گیا اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے اپنی تمام تر خدمات اور صلاحیتیں اسی کے لیے وقف کر دیں۔

مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی جس تحریک میں بھی شامل ہوئے انہیں یہ اعزاز ہمیشہ ملا کہ وہ اس تحریک میں نمایاں مقام پر تھے۔ جمعیۃ علماء ہند میں گئے تو صدر رہے۔ احرار میں آئے تو ناظمِ اعلیٰ ہوئے۔ خلافت کمیٹی میں تھے تو اس کے سفید و سیاہ کے مالک مولانا ہی تھے۔ کانگرس میں آئے تو صدر منتخب ہوئے۔ غرض کے سیاسیات میں مولانا کی تگ و تاز کا میدان

[1] سر عبدالحلیم غزنوی

نہایت وسیع وعریض تھا۔ تقریباً سبھی جماعتوں میں شرکت کی اور کئی ایک خود بنائیں۔ اور اس سب کچھ کا مقصد وحید تھا، انگریز کے ناپاک وجود سے ملک کو پاک کرنا اور اعلاء کلمۃ اللہ۔ یہ مقصد انہیں جہاں بھی نظر آیا اور جیسے بھی پورا ہوتا نظر آیا اسے حاصل کرنے کے لیے ہمہ تن تیار ومصروف ہو گئے۔ اس دور کی دھندلی سی تصویر دیکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ مولانا ان تمام کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ وہ جماعتوں کے قائدین میں شامل رہے۔ جماعتوں کی پالیسی بنانے اور چلانے میں ان کو خاص دخل رہتا تھا۔

سیاسیات کے نہایت اہم زاویے بنتے ہوئے دیکھے اور انگریزی سامراج کے خلاف وہ کردار ادا کیا جو تاریخ حریت کے اوراق پر ہمیشہ نمایاں طور پر نقش رہے گا۔ اس سلسلہ میں عمرِ عزیز کے کم وبیش 15 سال جیل میں گذارے اور یہ ان کی جوانی کا دور تھا جو انہوں نے جیل میں بسر کیا۔ اگر یہ جوانی باہر گذرتی تو نہ معلوم وہ اور کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیتے۔ سیاسیات میں مولانا کے ہم سفروں میں مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خاں، چوہدری افضل حق، مولانا مظہر علی، اختر علی خاں، مولانا احمد سعید دہلوی، عبد العزیز انصاری، مولانا بقاء اللہ اور مولانا عبد المجید سالک نمایاں ہیں۔

دینی خدمات:

بعض لوگ سیاسیات میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور ان کے نزدیک دین شجرِ ممنوعہ کی سی حیثیت اختیار کر جاتا ہے لیکن مولانا سیّد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ دینی فہم بھی وافر عطا فرمایا تھا۔ ملکی وملّی خدمات کے علاوہ دینی خدمات جو مولانا نے سرانجام دیں وہ بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان خدمات کے تذکرہ سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر خاندانِ غزنویہ کے اکابر کی طرف سے لوٹیں جہاں سے اس چراغ کو روشنی ملی کیونکہ اس کے بغیر بات پوری نہیں ہوتی۔

اگر طوالت کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو میں پوری وضاحت سے الگ الگ کر کے تفصیل میں جاتا لیکن اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اہم باتیں کرنا بھی ضروری ہے۔ خاندانِ غزنویہ جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں مولانا داؤد غزنوی کے جد امجد اپنے وقت کے بہت بڑے ولی اللہ ہو گزرے ہیں۔ آپ نے تبلیغِ توحید اور اشاعتِ کتاب وسنت کے لیے ہی اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔

مدرسہ غزنویہ:

اکابر غزنویہ جن متعدد طریقوں پر تبلیغ ودعوت کے کارہائے نمایاں انجام دے رہے تھے، ان میں سے ایک طریق درس وتدریس کا تھا اور مدرسہ غزنویہ بھی اسی کی ایک کڑی تھی۔ یہ ایک عظیم علمی ودینی درس گاہ تھی جہاں تشنگانِ علومِ دینیہ بہترین پیمانہ پر اپنی پیاس بجھاتے۔ اس درس گاہ سے جو بھی فارغ التحصیل ہوا..... اور ان کی تعداد لاکھوں تک

پہنچتی ہے ..... سبھی نے ایک ایک مرکز تبلیغ و تعلیم قائم کیا اور وہ ایسے علوم و معارف لے کر نکلے کہ کامل ولی اور صاحبِ معرفت بزرگ بن گئے۔ آج برصغیر پاک و ہند کے اسلامی تعلیم کے مختلف مراکز میں جو علماء دین کتاب و سنت کی تعلیم پر فائز ہیں۔ وہ بلا واسطہ و بالواسطہ اسی درس گاہ کے فیض یافتہ ہیں۔

مسجد غزنویہ ہی میں مدرسہ غزنویہ بھی تھا جس میں حضرت مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا محمد غزنوی صاحب اور مولانا عبدالجبار غزنوی صاحب ابناء حضرت سید عبداللہ غزنوی قرآن و حدیث کا درس دیتے تھے۔ (حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک فرزند کا نام نامی اپنے نام پر رکھا تھا) مولانا سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان کے سب سے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا سیّد عبداللہ ہی خلیفہ مقرر ہوئے اور درس و تدریس کے فرائض آپ نے سنبھالے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے بھائی حضرت مولانا سید عبدالجبار غزنوی مسند خلافت و امامت پر متمکن ہوئے۔ ان کے دور میں حلقۂ درس و حلقۂ فیض بہت وسیع ہوا، آپ نے مسجد غزنویہ کی درس گاہ و مدرسہ غزنویہ کو باقاعدہ دار العلوم کی شکل دی اور اسے دار العلوم تقویۃ الاسلام کے نام سے بدل دیا گیا۔

مولانا سید عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کے بھائی حضرت مولانا سید عبدالواحد غزنوی نور اللہ مرقدہ مسند خلافت و امامت پر فائز ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فصل خطاب و حسن بیان اور فہمِ قرآن میں وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ آپ کے دورِ سعادت میں بھی اس دار العلوم کو مزید ترقیاں ہوئیں۔ دار العلوم تقویۃ الاسلام سید عبدالواحد نور اللہ مرقدہ کے دورِ بابرکت کے بعد آپ کے بھتیجے مولانا محمد داؤد غزنوی علیہ الرحمۃ کے سپرد ہوا۔ آپ نے سب سے پہلے انتظامی معاملات میں تبدیلیاں کیں پھر نصابِ تعلیم میں گراں قدر اصلاحات فرمائیں۔ یہ دور سیاست کے لحاظ سے بڑے نشیب و فراز کا دور تھا۔ مولانا اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ دار العلوم کی طرف بھی متوجہ رہتے، لیکن گزشتہ عالم گیر جنگ کے زمانہ میں مولانا کی تین سالہ قید کے عرصہ میں یہ دار العلوم آپ کی نگرانی سے محروم رہا۔ قید سے رہائی کے بعد مولانا نے دار العلوم کی ضرورت کے تحت ایک عمارت مسجد غزنویہ کے ساتھ ہی تیس ہزار روپے کی صرف سے بنوائی، یہ عمارت اس لحاظ سے منفرد تھی کہ کسی درس گاہ کے پاس ایسی عمارت اور جگہ نہ تھی۔ لیکن یہ عمارت زیادہ عرصہ ان کے پاس نہ رہی۔ 1947ء کے انقلاب میں دار العلوم پھر عالمِ یتیمی میں آ گیا۔ مسجد غزنویہ نذرِ آتش کر دی گئی۔ مسجد سے ملحقہ مدرسین کے مکانات بھی جلا ڈالے گئے۔ دار العلوم کا عظیم دینی کتب خانہ برباد ہوگیا۔ یہ کتب خانہ ہندوستان کے چند بے مثال کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا۔ مولانا داؤد غزنوی کے الفاظ ہی میں اس جانکاہ حادثہ کے تاثرات سنیے، فرماتے ہیں:

''ہمیں اپنے مکانات کی تباہی و بربادی کا اتنا صدمہ نہیں جتنا کہ اپنے کتب خانہ کے ضائع ہونے کا صدمہ ہے کیونکہ وہ اب کسی قیمت پر نہیں مل سکتا۔''

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد آپ نے سب سے پہلے دار العلوم کی طرف توجہ کی اور اسے ازسرِ نو وجود میں لایا گیا اور

یہ یادگار شیش محل لاہور میں آج بھی قائم و دائم ہے۔اب اس کے مہتمم و نگران مولانا سید ابوبکر غزنوی خلف الرشید مولانا داؤد غزنوی ہیں۔

تصنیف و تالیف:

درس و تدریس کے علاوہ تبلیغ و اشاعت کے لیے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ترجمہ مشکوٰۃ، حمائل غزنوی، فتاویٰ غزنویہ، تراجم غزنویہ اور دوسری کتب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔اس کے علاوہ مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی مرحوم نے 1921ء میں امرتسر سے رسالہ ''توحید'' جاری فرمایا جو کتاب و سنت کی اشاعت میں اہم فریضہ سرانجام دیتا رہا۔اس دور میں یہ واحد رسالہ کئی اداروں کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔عالمِ اسلام اور آزادی کی تحریکوں سے متعلق مضامین، توحید، ختم نبوت، فِرق باطلہ و مذاہب باطلہ، اتحاد امتِ مسلمہ یہ عنوانات تھے۔اور ''توحید'' انہی کے تحت اپنی پیشانی پر ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ لے کر جلوہ گر ہوتا رہا۔

وعظ و تقریر:

تیسرا طریق تبلیغ وعظ و خطبات اور تقاریر کا تھا۔اکابر غزنویہ اس میدان کے شہسوار تھے۔ان کی پُرخلوص آواز دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی، قلب و ذہن پر نقش ہو جاتی۔ان کی ذہنی قوتِ عمل اور روحانی قوت چونکہ بہت مضبوط تھی اس لیے سامعین پر بھی اس کے اَن مٹ اثرات مرتب ہوتے تھے۔

بیعت و تصوّف:

خاندانِ غزنویہ کے اکابرین تصوف میں تو پورے ہندوستان میں لاثانی تھے، بیک وقت پورے ہندوستان میں ہزاروں افراد کی کایا پلٹ جاتی تھی۔ان میں زندگی کی ایک نئی روح انگڑائیاں لینے لگتی۔ان اکابر کے اثر صحبت سے روح و قلب میں ایک پاکیزگی اور طہارت اُبھر آتی۔وظائف کا شوق دامن گیر ہو جاتا۔تلاوتِ قرآن اور مطالعہ احادیث ان کا خاص شغف ہو جاتا۔حقیقت یہ ہے کہ اس خاندان کے تصوف و سلوک کا نقشہ الفاظ و حروف میں کھینچنا ناممکن ہے۔ان کے رہائشی مکانوں اور مساجد کے در و دیوار سے بھی لوگ فیض حاصل کرتے تھے۔ایک ایک نماز جو ان کے پیچھے ادا کی جاتی، مہینوں تک اس کے اثرات اپنا کام کرتے۔

مسجد چینیاں والی جو تقسیم ملک کے بعد غزنویہ خاندان کا مرکز بنی، آج بھی اس کی دیواریں پکار پکار کر تزکیہ نفس و طہارت کا اعلان کر رہی ہیں۔آج بھی جبکہ عرصہ گذر گیا کہ اکابرین غزنی اس مرکز کو چھوڑ چکے ہیں لیکن وہاں جانے والے دیکھتے ہیں اور جانتے کہ وہ حجرہ جس میں حضرت الامام مولانا سید عبدالجبار اور مولانا عبدالواحد غزنوی نور اللہ مرقدھما رہا کرتے تھے۔اس میں جانے سے ایک قلبی سکون میسر آتا ہے اور اس کا اثر قلب و روح پر دیر تک رہتا ہے۔

پاسبانِ ختم نبوت:

پاک و ہند میں مرزا غلام احمد قادیانی مدعی نبوت نے جو حالات پیدا کئے تھے ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے جن حضرات نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ثناء اللہ، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی پیش پیش ہیں۔ مولانا داؤد غزنوی تقسیم ملک کے بعد جماعت اہلحدیث کی تنظیم جدید میں مصروف ہو گئے۔ 1948ء میں مولانا حافظ عبد اللہ روپڑی مرحوم، مولانا ثناء اللہ اور مولانا محمد اسماعیل صاحب اور دوسرے اکابرین اکٹھے ہوئے تو مولانا غزنوی کو امیر جماعت اور پروفیسر عبد القیوم ایم اے کو ناظم منتخب کیا گیا۔ مولانا غزنوی صاحب آخر دم تک امیر جماعت کے عہدے پر فائز رہے۔

1953ء میں جب تحریک ختم نبوت اور اُس کے نتائج کی تحقیقات ہو رہی تھی تو مجلسِ عمل کی طرف سے مولانا کو ترجمانی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ جسٹس منیر اور کیانی مرحوم کو حکومت کی طرف سے معاملے کے تمام گوشوں کی تحقیقات کے لیے متعین کیا گیا۔ سب جماعتوں کی طرف سے الگ الگ وکیل تھے۔ مجلسِ عمل نے مولانا غزنوی کو اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ ابتداء میں مجلسِ عمل نے سہروردی مرحوم کو اپنا وکیل مقرر کیا تھا اور مولانا انہیں تیاری کراتے تھے لیکن مسئلے کی نوعیت کے پیشِ نظر سہروردی مرحوم نے معذرت پیش کر دی اور تمام بھار مولانا پر ہی ڈال دیا۔ مولانا کے دلائل سننے کے بعد جسٹس منیر نے ایک روز کہا:

> ''مولانا اگر میرے بس میں ہوتا تو میں آپ کو وکالت کا لائسنس دے دیتا۔ میں آپ کے دلائل سے بہت مستفید اور متاثر ہوتا ہوں۔''

اس عدالت کی کارروائی میں جاؤں گا تو تفصیل بہت طویل ہوگی۔ بہر حال مولانا کی غیرت وحمیت، حفاظت ختم نبوت میں اتنا کام کیا کہ جسٹس منیر اور کیانی مرحوم اور دوسرے جج صاحبان مختلف نشستوں کے غیر متعلقہ سوالات کی بوچھاڑ اس لیے کرتے کہ مولانا کہیں رکیں گے کہیں تو پھنسیں گے۔ لیکن مولانا اپنی خدا داد صلاحیتوں کی بنا پر ایسا جچا تلا جواب دیتے کہ جج صاحبان دم بخود رہ جاتے۔

1958ء کے مارشل لاء کے زمانے میں لوگوں پر انتہائی خوف و ہراس طاری تھا۔ سب کی زبانیں گنگ تھیں، تحریر و تقریر کا انداز بالکل بدل گیا تھا۔ اس دوران میں پہلی آواز منٹو پارک کے میدان میں خطبۂ عید کے موقع پر سنائی دی جس میں اس حکومت کی کوتاہیوں کا کمال وجرأت اور بے باکی سے جائزہ لیا اور اس کی لغزشوں پر شدید تنقید کی۔ یہ آوازِ حق وجرأت مولانا سید داؤد غزنوی کی تھی۔ فروری 1960ء میں صدر ایوب خاں کے ملک کا قانون تجویز کرنے کے لیے ایک آئین کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن کی طرف سے سوالنامہ مرتب کیا گیا۔ اس ضمن میں مولانا غزنوی نے مولانا مودودی اور دیگر علماء کرام سے رابطہ قائم کیا۔

6،5 مئی 1960ء کو ملک کے تمام مکاتیب فکر کے علماء کو جمع کر کے جامعہ اشرفیہ لاہور میں اس مسئلے پر غور کیا گیا۔ اس میں 19 علماء شریک تھے۔ جواب کا مسودہ مولانا سید داؤد غزنوی اور مولانا مودودی نے مرتب کیا۔ اس کے تعدد مراحل میں مولانا غزنوی کی کوششوں اور تگ ودو سے کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ مارشل لاء کے دور میں مولانا کی یہ بہت بڑی جرأت اور صدائے حق تھی۔ تحریک ختم نبوت میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنے والوں میں مولانا غزنوی پیش پیش تھے۔ شاہ جی، اختر علی خان، مولانا احمد سعید دہلوی، عبدالعزیز انصاری، مولانا لقاء اللہ، صوفی اقبال، راجہ غلام قادر خاں، مولانا عبداللہ چوڑی والے، نذیر احمد سیماب، مولانا عبدالمجید سالک' حضرت غزنوی کے جیل کے ساتھی ہیں۔ میانوالی جیل میں ان تمام ساتھیوں نے اپنی اپنی پسند کے مشاغل اپنا لئے۔ اختر علی خاں اور راجہ غلام قادر خاں، شاہ جی سے اپنی قرآن خوانی درست کرانے لگے۔ مولانا لقاء اللہ نے امامت کے فرائض سرانجام دیئے۔ حضرت غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے انگریزی پڑھنی شروع کی اور خود ان کو عربی پڑھانے لگ گئے۔

مولانا غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کافی عرصہ تک تحریک ختم نبوت کی مجلسِ عمل کے کنویئر بھی رہے۔ مارچ 1962ء میں صدر ایوب لاہور میں آئے تو انہوں نے مولانا سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا اپنے رفقاء کے ہمراہ صدر سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ صدر نے دستور کے متعلق مولانا کی رائے طلب کی۔ مولانا نے بالتفصیل اس کے اچھے برے پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اس کے مضرات سے صدر کو آگاہ فرمایا۔

مئی 1956ء پنجاب یونیورسٹی کے مولوی شفیع مرحوم نے یونیورسٹی کی طرف سے اہلِ علم پر مشتمل ایک کمیٹی مرتب کی جس کے ذمہ اہم اور مشکل مسائل کو موضوعِ فکر بنانا اور ان کو حل کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے رکن مولانا داؤد غزنوی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم اور دوسرے لوگ تھے۔

مولانا غزنوی علماء اہلحدیث میں بہت بڑا مقام رکھتے تھے۔ ان کے فتاویٰ کا ایک ذخیرہ موجود ہے۔ روایتی علماء کی طرح وہ اپنے اندر غرور وتکبر اور بڑے ہونے کا بھرم نہیں رکھتے تھے۔ عاجزوں میں عاجز، بڑوں میں بڑے' وہ ایک سچے موحد تھے۔ شرک سے لے کر سرکار تک کا ڈر بھی اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا۔ قدرت نے ایک بہادر انسان کی بہت سی خوبیاں ان میں جمع کر دی تھیں۔ سر دینے سے کبھی گریز کیا لیکن ضمیر کا سودہ کرنے پر کبھی سوچ بھی نہ سکتے تھے، ان کے خون اور گوشت پوست کے اندر ایسے کوئی جراثیم موجود نہ تھے۔ اس لحاظ سے وہ صحیح معنوں میں شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کے جانشینوں میں سے معلوم ہوتے تھے اور انہیں کی فوج کے ایک سپہ سالار تھے۔

قرآن کے معانی ومطالب سے کما حقہ آگاہ تھے، کلام اللہ کی جتنی تفاسیر مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں میں لکھی گئیں شاید ہی کوئی ان کی نظروں سے اوجھل رہی ہو، ان سب پر نظر رکھتے تھے۔ اسی طرح حدیث وفقہ میں انہیں کمال حاصل تھا اور اس ضمن میں انہیں قرآن وسنت کی تشریحات وتعبیرات میں بھی درجہ اسناد حاصل رہا۔ آخری دم تک دین کو اپنا

ظاہر و باطن بنائے رکھا یہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا رہا۔ گویا وہ اسی لیے پیدا ہوئے، جوان ہوئے اور بوڑھے ہوئے حتی کہ اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ آخری دو برس مسلسل بیمار رہے، دل کے عارضے میں مبتلا رہے۔ دل کی شریانوں میں خون کے گاڑھا ہو جانے کے باعث دورانِ خون میں رکاوٹ ہو جاتی۔ اس رکاوٹ سے دل میں شدید درد رہتا۔ کتنی ہی راتیں جاگ کر گزارتے، لیکن اف تک نہ کرتے۔

1963ء میں شاہ سعود کی دعوت پر حجاز تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں تکلیف پھر عود کر آئی۔ حجاز سے واپسی کے بعد ان پر گریہ زیادہ طاری رہتا۔ ایک روز فرمایا: ''لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بیماری کی وجہ سے روتا ہوں..... حضور ﷺ کی محبت کا آج کل مجھ پر شدید غلبہ ہے۔ ان کی ذاتِ گرامی میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔''

یہ فقرے بڑی مشکل سے آپ نے ادا فرمائے اور ساتھ ہی دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ درد کثرت سے آخری مرض میں بیماری ان کو چاٹ رہی تھی۔ ہر نیا آنے والا دن ان کی جسمانی قوت میں ضعف پیدا کر رہا تھا لیکن ایمانی قوت بڑھ رہی تھی۔ تعلق باللہ مضبوط سے مضبوط تر ہو رہا تھا۔ وظائف کثرت سے کیا کرتے تھے۔ آخری رمضان المبارک میں 29ویں رات کو اچھے اچھے قراء کو بلوایا اور مکان پر نوافل کا اہتمام کیا۔ باوجود ضعف اور بیماری کی شدت کے نوافل ادا کیے۔ آخری ایام میں باتیں کم کرتے، درود و وظائف میں اکثر مشغول رہتے۔ ایک روز بیماری کی شدت کی وجہ سے ایک نماز فوت ہوگئی۔ فرمانے لگے: ''آہ یہ زندگی بھی کیا زندگی ہے۔''

علمی شغف، ذوقِ عبادت:

کثرت سے ذکرِ الٰہی کے عادی تھے۔ رات کو دو تین بجے اٹھ کھڑے ہوتے اور مسلسل چار پانچ گھنٹے عبادت میں مشغول رہتے۔ تہجد بڑی باقاعدگی سے ادا فرماتے اور اس میں بہت گریہ و زاری کرتے حتیٰ کہ ان کے گھر والے جاگ اٹھتے، روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔ رات کو خواہ اپنی مصروفیات کے سبب کتنی دیر سے بھی سوئیں مگر صبح کے اذکار و عبادت کے مشاغل میں کوئی کمی نہ آنے دیتے۔ شام کی نماز کے بعد بھی بہت دیر تک مصروف رہتے۔ فرمایا کرتے کہ جب میں لا الہ الا اللہ کا ذکر کرتا ہوں تو میرے منہ سے نور نکلتا ہے اور عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ ذکر کرتے وقت تو میں بادشاہ ہوتا ہوں اور مجھے کوئی غم نہیں ہوتا۔

خود فرماتے ہیں کہ تعلیم کے دوران مجھ پر ایسا بھی وقت آیا ہے کہ کھانے کے لیے روٹی نہ ملتی تھی تو میں چنے چبا کر وقت گزارتا تھا۔ حضرت والد صاحب کا اتنا رعب تھا کہ ان سے اجازت لینے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ بیعت کے بعد دہلی آ کر ان سے بذریعہ خط اجازت حاصل کی۔

فقہ اور تصوف کے بارے میں ان کا موقف منجھا ہوا تھا۔ فقہائے کرام کی خدمات کا اعتراف کرتے اور ہمیشہ ان کا نام ادب سے لیتے تھے اور ان کی شان میں گستاخی موجب حرمان سمجھتے تھے۔ اور فرماتے کہ اہل اللہ کی شان میں گستاخی

فیض کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ فرماتے تھے: تصوف میں میرے شیخ احمد سرہندی ہیں۔

شعر کا بھی ذوق تھا اور شعراء کے اچھے اشعار کو پسند فرماتے۔ آپ کی بیاض میں حافظ، عرفی، فیضی، نظیری، جامی، گرامی، علمی حزیں، طاہرہ قرۃ العین، غالب، اقبال اور دوسرے فارسی شعراء واساتذہ کے چیدہ چیدہ اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح میر، داغ، انشاء، سودا، مومن، حسرت موہانی، فراق گورکھپوری، ظفر علی خاں، سالک، تاثیر بھی۔ نفاست و شائستگی طبیعت میں بہت تھی۔ کپڑا نفیس ترین، کتاب کی جلد اعلیٰ، قلم عمدہ، کتابوں پر کبھی کوئی داغ دھبہ نہ پڑنے دیا۔

حقوق العباد میں التزام فرماتے۔ حتیٰ کہ آخری بیماری میں بھی یہ بات ہاتھ سے نہ جانے دی۔ بیماری کی شدت کے دوران بھی مولانا حافظ اسماعیل روپڑی، شیخ عظیم اللہ کے صاحبزادے شوکت عظیم، علامہ حسین میر کاشمیری مرحوم، مولانا احمد علی مرحوم، حمید نظامی مرحوم اور دوسرے حضرات کے انتقال پر جنازہ میں شرکت یا نمازِ جنازہ پڑھانے کے لئے تشریف لے جاتے رہے۔

مولانا اپنے اور بیگانے سبھی کے بزرگ، سبھی کے دوست، سبھی کے راہنما اور بھائی تھے۔ شفیق بھی تھے اور معلم بھی، ہم نوا بھی تھے ہم خیال بھی، وضع دار، باغیرت، گفتگو میں تمکنت، جلال و رعب، چال میں شہزادگی اور شہزادگی بھی پرانے شہزادوں جیسی، ہمیشہ بااخلاق خطیب و مقرر پائے گئے۔

سیاسی اختلافات کو کبھی تعلقات میں حائل نہ ہونے دیا۔ مذہبی اختلاف جس سے بھی ہوا اپنی جگہ رہا مگر اس سے عام انسانی حیثیت میں سراپا معیت و اخلاص اور سراپا شخصیت بن کر ملے۔ مولانا احمد علی، مولانا مفتی محمد حسن، شاہ جی (رحمۃ اللہ علیہم) تو گویا ان کے رفیقِ خاص تھے۔ ان سے ملاقات اور میل جول تو فرضِ عین سمجھ رکھا تھا۔ کبھی بھی اختلافات کو اپنے درمیان حائل نہ ہونے دیا۔ یہ بھی مولانا غزنوی ہی کے حسنِ اخلاق اور وضع داری کا کرشمہ تھا کہ نمازِ عیدین مولانا احمد علی ہمیشہ مولانا غزنوی کے پیچھے ادا کرتے رہے اور ہمیشہ مولانا غزنوی کے پیچھے کھڑے ہونے والوں میں مولانا احمد علی ہوا کرتے تھے۔

آہ! آج یہ قافلہ سارے کا سارا ہم سے پوشیدہ ہو کر اپنے رب کے پاس اپنی محنتوں کا صلہ پانے کے لیے جا چکا ہے۔ وہ قافلہ جس نے آزادی کی منزل پر ہمیں لا کر سرفراز کرنے میں نہ جانے کتنی جدوجہد کی، مصیبتیں جھیلیں، کتنے ہی غم سہے اور صدمے برداشت کیے اور رات دن کا امتیاز کئے بغیر اسی کام میں عمریں صرف کر دیں۔ رحمہم اللہ علیہم اجمعین [1]

---

[1] ہفت روزہ چٹان، لاہور (22، 29 جنوری، 5 فروری 1968ء)، ہفت روزہ المنبر (2، 16، 23 فروری 1968ء)

(باب پنجم)

مولانا سید ابو بکر غزنوی

شخصیت و کردار

ابوبکر غزنوی

(خودنوشت)

خاندان:

برصغیر پاک وہند میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے خاندان کے بعد غزنوی خاندان ممتاز ترین خاندان ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ مولانا محمد اعظم معروف بہ عارف باللہ مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ تھے۔ ان کے بعد اس علمی خاندان کے دیگر مشاہیر علماء میں حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل غزنوی اور مولانا عبدالغفار غزنوی (رحمہم اللہ) شامل ہیں۔

تاریخ پیدائش:

22 مئی 1927ء مقام امرتسر (پنجاب) بھارت۔ بچپن کا بیشتر حصہ امرتسر ہی میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد گرامی مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے پائی۔

اعلیٰ تعلیم کن مدارس میں پائی:

① ایم اے عربی 1950ء میں پنجاب یونیورسٹی میں اول رہا اور یونیورسٹی کی طرف سے تین میڈل حاصل کیے۔
② ایل ایل بی 1955ء پنجاب یونیورسٹی لاء کالج لاہور۔
③ علوم اسلامیہ کے ممتاز تعلیمی ادارے دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور کا فارغ التحصیل ہوں۔
④ فارسی اور اُردو زبانوں اور ان کے متعلقہ ادب کا طالب علم ہوں۔
⑤ ایک باخدا صوفی حضرت حاجی گل احمد صاحب مدظلہ العالی سے تصوف کی سند حاصل کی۔

تدریسی خدمات:

① اسلامیہ کالج لاہور میں صدر شعبہ عربی وعلوم اسلامیہ کی حیثیت سے ڈگری کلاسز کو عربی اور علوم اسلامیہ پڑھانے کا تیرہ سالہ تجربہ۔
② پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے (عربی) کی کلاسز کو پڑھانے کا دس سالہ تجربہ۔
③ مغربی پاکستان یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور میں 1964ء سے صدر شعبہ علوم اسلامیہ ہوں۔
④ 1963ء سے دارالعلوم تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ لاہور میں ہر جمعۃ المبارک کو راقم الحروف خطبہ دیتا ہے۔

تصنیفی خدمات:

① واقعہ کربلا کا معروضی مطالعہ (اردو) شائع کردہ: مکتبہ علمیہ 15۔ لیک روڈ لاہور۔

② اسلام میں گردشِ دولت (اردو، انگریزی) شائع کردہ: مکتبہ غزنویہ شیش محل روڈ لاہور۔

③ کتابت حدیث عہد نبوی ﷺ میں (اردو) شائع کردہ: مکتبہ غزنویہ شیش محل روڈ لاہور۔

④ اسلامی ریاست کے چند ناگزیر تقاضے (اردو، انگریزی) شائع کردہ: مکتبہ غزنویہ لاہور۔

⑤ اسلام اور آدابِ معاشرت (اردو، انگریزی) شائع کردہ: مکتبہ غزنویہ لاہور۔

⑥ حقیقتِ ذکر الٰہی (اردو، انگریزی) شائع کردہ: مکتبہ غزنویہ لاہور۔

⑦ تاریخ اسلام، بنو امیہ اور بنو عباس (اردو) شائع کردہ: رفیق مطبوعات اردو بازار لاہور۔

⑧ عہدِ حاضر میں استاد اور شاگرد کا رشتہ (اردو) شائع کردہ: مکتبہ غزنویہ لاہور۔

⑨ اس دنیا میں اللہ کا قانونِ جزا و سزا (اردو) شائع کردہ: مکتبہ غزنویہ لاہور۔

⑩ اقبال عقلیت پسند نہ تھا؟ (اردو) مطبوعہ: اسلامیہ کالج میگزین "فاران" اردو، ماہنامہ "مسلمہ" لاہور۔

⑪ گیتان جلی پر ایک نظر (اردو) رابندر ناتھ ٹیگور کی معروف کتاب پر تنقید و تبصرہ، مطبوعہ: اسلامیہ کالج میگزین "کریسنٹ" اور ماہنامہ "مسلمہ" لاہور۔

⑫ سورہ نور، سورۂ محمد اور سورۂ حجرات کی تفسیر (اردو) شائع کردہ: چوہدری غلام رسول بک سیلر اردو بازار لاہور۔

⑬ قرآن مجید کے صوری اور معنوی محاسن (اردو) شائع کردہ: مکتبہ غزنویہ لاہور۔

⑭ خطباتِ جہاد (اردو) شائع کردہ: مکتبہ غزنویہ لاہور۔

⑮ پاکستان میں سائنسی علوم کا مستقبل (اردو) غیر مطبوعہ

(ابن الہیثم کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر ماہرین تعلیم، سائنس دانوں اور طالب علموں سے خطاب)

⑯ ایک مسلمان صحافی کے فرائض (تعلیماتِ اسلام کی روشنی میں) مطبوعہ: ہفت روزہ "توحید" لاہور۔

⑰ آدابِ بارگاہِ رسالت (اردو) مطبوعہ: ہفت روزہ "چٹان" لاہور۔

قومی و ملی خدمات:

① 1950ء سے (پہلے اسلامیہ کالج لاہور اور اب انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں) تدریسی فرائض انجام دے رہا ہوں۔

② راقم الحروف دار العلوم تقویۃ الاسلام میں ہر جمعۃ المبارک کو خطبہ دیتا ہے۔

③ تحریک احیائے دین کا صدر ہوں۔ جس کے زیر اہتمام مختلف علمی اور دینی موضوعات پر مقالے شائع ہوتے ہیں اور ہر جمعرات کو مجلس ذکر کا انعقاد ہوتا ہے۔

④ معروف دینی درس گاہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام کا مہتمم ہوں۔

⑤ تقریباً گزشتہ دو برس سے دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں تفسیر، حدیث اور عربی زبان کی تدریس کا اہتمام کیا ہے۔

خصوصی مشاغل اور زندگی کے خاص اور اہم واقعات:

تعلیم و تدریس، وعظ و تذکیر، تحریر و تقریر۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے ابتدائے جوانی میں ملاقات۔

اخلاق و شمائل و خاص حالات:

کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں۔

اولاد:

دو فرزند جنید غزنوی اور حماد غزنوی

ابوبکر غزنوی[1]

---

[1] علماء کی کہانی خود اُن کی زبانی: ڈاکٹر حافظ قاری فیوض الرحمن، (ص:9) ادارۂ تالیفات اشرفیہ، چوک فوارہ ملتان پاکستان

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ......ایک تعارف

مرتبہ: بیگم سیّد ابوبکر غزنوی

پیدائش:

آپ 22 مئی 1927ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔

تعلیم:

آپ نے ابتدائی تعلیم امرتسر اور لاہور میں حاصل کی۔ 1950ء میں پنجاب یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا۔ پنجاب بھر میں اوّل آئے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اس کے بعد قانون میں ایل ایل بی کیا۔

اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ، مولانا حافظ محمد گوندلوی صاحب اور مولانا شریف اللہ صاحب سے دینی علوم میں استفادہ کیا۔

ملازمت:

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچرار تعینات ہوئے۔ شعبہ عربی اور اسلامیات کے سربراہ رہے۔ اس کے ساتھ ہی اورینٹل کالج لاہور میں جدید عربی ادب کے جز وقتی لیکچرار تھے۔ جب انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں شعبہ علوم اسلامی کا اجراء ہوا تو آپ اس کے سربراہ مقرر ہوئے، وفات سے کچھ عرصہ پیشتر آپ کو جامعہ اسلامیہ بہاول پور کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ آپ کے تقرر کو تمام دینی و علمی حلقوں نے حسنِ انتخاب کے مصداق قرار دیا۔

معمولات:

اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرتے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد دن نکلنے تک اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ نماز اور وظیفہ کے دوران آنکھیں پرنم رہتیں۔ سارا دن اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے۔

ملک بھر سے جلسوں، علمی مجالس اور ثقافتی تقریبات کے دعوت ناموں کی بے حد بھرمار رہتی۔ مگر آپ اکثر لوگوں سے معذرت کر دیتے اور بہت کم شریک ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور مطالعہ کو بے حد ترجیح دیتے۔ حکام اور خود سرمایہ داروں کی مجلسوں سے دور رہتے۔ بہاول پور یونیورسٹی کے معاملات کے سلسلہ میں آپ کو بعض اعلیٰ حکام سے ملنا بھی طبع نازک پر گراں گزرتا تھا، اور فرمایا کرتے تھے: ''مجھ فقیر کو وزیروں کے پاس جانا پڑتا ہے''۔ اور استغفار پڑھتے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور ان کی دعائیں اور مناجاتیں ہی ان کی زندگی کا نصب العین اور مستقل پروگرام تھیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اکثر یہ دعائیں نہایت خضوع وخشوع سے مانگا کرتے تھے:

① یا اللہ تو زندگی بھر کے گناہوں کو معاف فرما۔ ② یا اللہ تو شریعت پر استقامت عطا فرما۔ ③ یا اللہ تو اپنی اور اپنے حبیب کی محبت عطا فرما۔ ④ یا اللہ تو قرآن وسنت کی معرفت عطا فرما۔ ⑤ یا اللہ تو رزقِ حلال عطا فرما۔ ⑥ یا اللہ تو صحت عطا فرما، ہمت عطا فرما، قوت عطا فرما۔ ⑦ یا اللہ تو اپنا کام بے لوث اور بے پناہ کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ⑧ یا اللہ تو اپنی راہ میں ہماری حقیری کوششوں کو قبول فرما۔ ⑨ یا اللہ تو شہادت عطا فرما۔

عادات وخصائل:

آپ نہایت خوش طبع، خوش اخلاق، خوش پوشاک، بے حد حساس اور نازک مزاج تھے۔ آپ کسی کام میں بے ترتیبی کسی صورت گوارہ نہ کرتے، سوائے کتابوں کے جو آپ کے آس پاس بکھری رہتی تھیں۔ اس پر بہت خوش رہتے اور دلجمعی کے ساتھ مصروف رہتے۔ یہ کوشش فرماتے کہ ان کی ذات سے کسی کو ایذا نہ پہنچے۔ بغیر اطلاع کے کسی کے ہاں جانے سے اجتناب کرتے۔ ملاقات کے لیے اوقات کا بہت خیال رکھتے تاکہ معمولات میں فرق نہ آنے پائے۔ اسی طرح دوسروں کی راحت وتکلیف کا بھی بے حد احساس رکھتے۔

آپ بے حد مہمان نواز، خوددار اور فیاض تھے۔ اپنی اور احباب کی راحت کے لیے کسی خرچ کی پروا نہ کرتے۔ آپ کی گفتگو میں چاشنی تھی۔ بات ٹھوس اور معقول کرتے تھے، کبھی ناشائستہ لفظ منہ سے نہ نکلا تھا۔ دیانت اور خلوص طبیعت کا خاصہ تھا۔ صاف گوئی ان کا شیوہ تھا۔ عزم وہمت کا سراپا تھے۔ حق بات کہنے سے دبتے نہ تھے، برملا کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف جی میں نہیں رکھتے تھے۔ ان کا دل غنا کی دولت سے مالا مال تھا۔ جاہ کی طلب نہ تھی اور دنیا سے بے نیاز تھے۔

جس طرح آپ کو توحید سے والہانہ لگاؤ تھا، اسی طرح حضور اکرم ﷺ کی ذات سے بے پناہ محبت تھی۔ آخری دنوں میں آپ مسجد نبوی میں دورۂ حدیث کی خواہش کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ افسوس کہ ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ (آمین)[1]

---

① ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

سید جنید غزنوی حفظہ اللہ سے ایک ملاقات

(ادارہ پیامِ آگہی)

سید جنید غزنوی برصغیر پاک وہند کے معروف علمی وروحانی گھرانے کے چشم وچراغ ہیں۔ نجیب الطرفین گھرانے میں آنکھ کھولی، گھر کا پاکیزہ ماحول اولین درس گاہ ٹھہرا۔ رسمی تعلیم کا سلسلہ سنٹرل ماڈل ہائی سکول سے شروع ہوا۔ یہاں سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے پولیٹیکل سائنس اور ایم اے ہسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ سکول وکالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دارالعلوم تقویۃ الاسلام سے (1977ء۔ 1987ء) میں درسِ نظامی کیا۔ اساتذہ میں نمایاں نام حافظ عبدالرشید کا ہے۔ شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی، سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا مودودی رحمہ اللہ کی کتب کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ عرصہ 20 سال تفہیم دین کے نام سے پی ٹی وی پرائم پر دینی تعلیمات کا پروگرام پیش کرتے رہے۔ یہ پروگرام خاص طور پر امریکہ اور یو کے میں مقیم مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے پیش کیا گیا۔ مختلف کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں دینی موضوعات پر لیکچر دیتے ہیں۔ دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے ہیں۔ عرصہ سات آٹھ سال پہلے تک اخبارات میں دینی موضوعات پر مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ذاتی موضوعات پر مضامین لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ذاتی دلچسپی میں مطالعہ کتب، ایکسرسائز کرنا، ہوٹلنگ، سیر وتفریح کرنا شامل ہیں۔ کم وبیش تمام یورپی ممالک کی سیر کر چکے ہیں۔ آپ کے خطبات ولیکچرز کے لیے وزٹ کریں۔

www.sayedjunaidghznavi.com

سید جنید غزنوی حفظہ اللہ خانوادہ غزنویہ کے علم، تقویٰ اور روحانیت کے وارث ہیں۔ دینی ودنیاوی علوم سے مزین ان کی شخصیت دیکھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ وقار، سنجیدگی، متانت، نفاست اور ملائمت کے ساتھ ساتھ عاجزی وانکساری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بولتے ہیں تو الفاظ وبیان اس حسنِ ترتیب کی لڑی بن جاتے ہیں کہ چننے والا اور سننے والا عش عش کر اٹھتا ہے۔ حسنِ سیرت اور حسنِ صورت میں ہم آہنگ، پیکر جلال وجمال سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے منبر ومحراب کے امین اور ولی کامل سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر وتدبر کے محافظ کو دیکھنے والے ان دو عظیم شخصیات کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ گلشن سادات کے گل سرسبد اور خانوادۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چشم وچراغ کا لفظ لفظ محبت صلی اللہ علیہ وسلم رسول کی چاشنی لیے ہوئے ہوتا ہے۔ ان کی گفتگو میں احترامِ صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم کے زمزمے موجزن ہوتے ہیں۔ اسلاف کا تذکرہ کرتے ہیں تو یوں والہانہ انداز میں کرتے ہیں ہر شریک مجلس جھوم جھوم جاتا ہے۔ قول وفعل میں ہم

آہنگی، فرقہ واریت کی بیخ کنی، قرآن وسنت کی سچی تعلیمات کے فروغ، اخلاقِ حسنہ کے پرچار اور اُدب کی دنیا آباد رکھنے کی سوچ اور فکر رکھنے والا یہ مردِ قلندر ہٹو بچو سے بچتے ہوئے، دلفریب نعروں کی گونج سے کہیں دور، ظاہری پروٹوکول کی پروا کیے بغیر اسلاف کی علمی وروحانی باقیات صالحات کو سنبھالے دھیرے دھیرے چلا جا رہا ہے۔ 54 برس بیت گئے مگر عزم ہے کہ غیر متزلزل اور ارادہ ہے کہ مستحکم۔ دل کی خواہش اور آرزو تھی کہ ایسی نابغہ روزگار شخصیت کی زیارت اور سعادتِ ملاقات کے حصول کی کوئی سبیل بنے۔ ملاقات طے ہوئی اور طے شدہ وقت پر سجاد انور منصور، حافظ محمد فہیم علوی، محمد دین عابد اور محمد ابوبکر فاروقی حاضر خدمت ہوئے۔ اس ملاقات کی تفصیل قارئین کے پیش خدمت ہے:

سوال آپ اپنے خاندانی پس منظر پر کچھ روشنی ڈالیں؟

جواب ہمارے جدِ امجد سید عبداللہ غزنوی انیسویں صدی کے آغاز میں کابل سے امرتسر آئے، ان کی یہ پہلی ہجرت تھی۔ وہاں کے بادشاہ سے ان کے کچھ اختلافات ہو گئے تھے۔ کابل کی فضا ان کے لیے سازگار نہ رہی تھی، جب بادشاہ کا تخت الٹ دیا گیا تو وہ واپس گئے۔ اپنے آبائی علاقہ میں رہنا ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے، لیکن جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ حالات پہلے سے مختلف نہیں ہیں۔ دوبارہ امرتسر ہجرت کی، یہ غالباً 1840ء کی بات ہے۔ کچھ عرصہ پشاور رہے، کچھ عرصہ قلعہ میہان سنگھ والا گوجرانوالہ میں قیام کیا۔ اسی دوران جنگ آزادی شروع ہو گئی۔ امرتسر پہنچ کر مدرسہ غزنویہ کی بنیاد رکھی۔ ہمارے دادا جان پاکستان بننے سے پہلے MLA رہے۔ پاکستان بننے کے بعد مدرسہ شیش محل روڈ لاہور منتقل ہو گیا اور آزادی وطن کے بعد پاکستان مجلس قانون ساز کے بھی رکن رہے۔ والد مرحوم انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں صدر شعبہ اسلامیات تھے۔ بعد میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر بنے۔ جب ان کا انتقال ہوا، ہم بہاول پور میں ہی مقیم تھے۔ والد مرحوم کی وفات کے بعد دوبارہ لاہور آئے اور دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں رہائش پذیر رہے۔ اب عرصہ اٹھارہ سال سے یہاں ڈیفنس میں رہائش ہے۔

سوال اپنے بچپن کی کچھ باتیں اور یادیں قارئین کے ساتھ شیئر کریں گے؟

جواب ہمارے گھر کا ماحول بے جا سختیوں اور پابندیوں میں جکڑا ہوا نہیں تھا۔ یوں کہہ لیں کہ تناؤ کھچاؤ کی بجائے فضا ہی ایسی بنا دی گئی تھی کہ جس میں مثبت کے کرنے اور منفی کے نہ کرنے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ والد صاحب نے ہماری تربیت بہت زیادہ باریکیوں میں جا کر نہیں کی۔ بہت سے میدانوں میں ہمیں آزادی تھی، البتہ بعض باتوں میں سمجھوتے کی گنجائش نہیں تھی۔ مثلاً نماز پڑھنی ہے اور باجماعت پڑھنی ہے۔ مجھے بچپن میں ٹیبل ٹینس کا بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ لاہور کی سطح پر ہونے والے ٹورنامنٹ میں مَیں فائنل تک پہنچ گیا۔ اتفاق سے میچ اور نماز کا وقت ایک تھا۔ فائنل کھیلنے کی خواہش تو بہت تھی، مگر سوچا کہ باجماعت نماز میں سستی والد صاحب کی ناراضی کا سبب ہو گی۔ لہٰذا نماز پڑھ کر جب پہنچا تو کھیل ختم ہو چکا تھا۔ بہرحال ایک شیلڈ اور سرٹیفکیٹ ملا، لا کر والد صاحب کو دکھایا اور تمام قصہ بھی

کہہ سنایا۔ فرمایا: فائنل تمہیں ضرور کھیلنا چاہیے تھا، مجھے پہلے بتاتے [تو] ہم اس کا کوئی حل نکالتے۔ میٹرک کا جب رزلٹ آیا تو ہم سب کلاس فیلو انجینئرنگ یونیورسٹی میں جمع تھے۔ میرے والد صاحب باری باری مستقبل کا پروگرام پوچھ رہے تھے۔ اسی مجمع میں مجھ سے بھی پوچھا: ہاں بھئی تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میں نے عرض کیا: انجینئرنگ کرنے کا ارادہ ہے۔ مسکرا کر کہنے لگے: اچھا دیکھتے ہیں تم کیسے انجینئرنگ کرتے ہو؟ ان کی بصیرت افروز نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ میں ایسا نہ کرسکوں گا اور پھر ہوا بھی ایسا ہی۔ ایف ایس سی کے بعد انجینئرنگ میں داخلہ لیا، لیکن ایک سال پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ میرا مستقبل نہیں ہے۔ سو دوبارہ گورنمنٹ کالج لاہور واپس آگیا اور بی اے کیا۔

سوال آپ کتنے بہن بھائی ہیں اور ان کی مصروفیات کیا ہیں؟

جواب ہم دو بھائی ہیں۔ حماد غزنوی مجھ سے چھوٹے ہیں، وہ انگریزی صحافت سے منسلک رہے، مختلف اخبارات سے ہوتے ہوتے دی نیوز تک پہنچے، پھر صحافت کو خیر باد کہا اور میڈیا سٹڈیز میں ماسٹرز کے لیے لندن چلے گئے۔ واپسی پر مختلف چینلز سے وابستہ رہے۔ پی ٹی وی سے بحیثیت ڈی ایم ڈی کچھ عرصہ قبل ان کا معاہدہ ختم ہوا ہے۔ آئندہ دیکھیں کیا مصروفیت ہوتی ہے؟

سوال آپ کی تربیت میں والدین میں سے کس کا کردار کلیدی رہا؟

جواب جب والد محترم کا انتقال ہوا، میری عمر پندرہ سال تھی۔ اگرچہ ان کے ساتھ بہت زیادہ وقت نہیں گزارا، لیکن ان کی شخصیت کا سایہ میں اب بھی ساتھ محسوس کرتا ہوں، ایسا نہیں ہوا کہ کبھی انہوں نے خاص طور پر بٹھا کر سمجھایا ہو کہ ایسا کرو ایسا نہ کرو، یہاں تم نے خطبہ دینا ہے، یا اس قسم کی کوئی بھی بات۔ ہاں یہ ہے کہ وہ گھر میں فضا ایسی بنا کر رکھتے تھے جس سے ہم خود بخود باتیں اخذ کرتے رہے۔ زیادہ پند ونصائح ان کا طریقہ نہیں تھا۔ قال سے زیادہ حال ان کا طریقہ تھا، اس فضا سے یہ باتیں ذہن نشین ہوتی رہتی تھیں کہ اونچی چیزیں کون سی ہیں؟ پست چیزیں کون سی ہیں؟ مثلاً علم اور عالم بہت بلند چیزیں ہیں، جہالت ناپسندیدہ چیز ہے۔ ہمارے ہاں ہر جمعرات مجلس ذکر ہوتی تھی، میں بھی اس میں بیٹھا کرتا تھا۔ کبھی پوچھتے تھے: ہاں کوئی بات سمجھ آئی یا مزہ آیا۔ کبھی کوئی ہلکا پھلکا سوال بھی کرتے تھے، یہی ان کی تربیت کا انداز تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں مری میں گزارنا ہمارا معمول تھا۔ اس دوران اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ میرے پاس بیٹھو، مجھ سے بات کرو، کوئی سوال پوچھا کرو وغیرہ۔ ان کی شخصیت ایسی جاذبیت اور کشش رکھتی تھی کہ ساتھ رہنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ والدہ محترمہ کا انتقال 3 نومبر 2013ء کو ہوا۔ ماں کی محبت ایک ایسا ہاتھ ہوتا ہے جو بہت جگہوں پر آپ کی مدد کرتا ہے۔ آدمی اس کی مدد سے کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی اب تک ان کی محبت کے سہارے بادشاہوں کی طرح زندگی گزاری ہے۔ بہرحال آج جو کچھ بھی ہوں، والدین کی دعاؤں کی وجہ سے ہوں۔

سوال آپ کون کون سی شخصیات سے متاثر ہیں؟

(جواب) دین کو تو میں نے اپنے گھر سے سمجھا۔ میں اپنے گھر کی تاریخ سے متاثر ہوا، اپنے آباء واجداد سے متاثر ہوا۔ جب میں اپنے والد صاحب کو دیکھتا تھا تو صرف انہیں نہیں دیکھتا تھا بلکہ ڈیڑھ دو سو سال کی تاریخ دیکھتا تھا۔ ہمارے گھر میں جو باتیں ہوتی تھیں وہ صدیوں کا نچوڑ تھیں۔ اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ کی شخصیت ان کی کتب پڑھ کر دل میں نقش ہوگئی۔ حضرت مجدد الف ثانی کی بالواسطہ تحریروں سے متاثر ہوں۔ ماضی قریب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہم ایسی شخصیات ہیں، جنہوں نے شدید متاثر کیا۔

(سوال) آپ کے بچوں کی مصروفیات کیا ہیں؟

(جواب) مجھے اللہ نے ایک بیٹے اور دو بیٹیوں سے نوازا ہے۔ بیٹیاں دونوں چھوٹی ہیں، سکول جاتی ہیں، بیٹا اولیول میں ہے، اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک جانے کا خواہش مند ہے۔ سائنس کے شعبہ پارٹیکل فزکس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی دینی تعلیم وتربیت کا آغاز گھر پر کر دیا ہے۔ ایک استاد مقرر ہیں، جن سے عربی گرائمر، حدیث شریف اور قرآن کی تفسیر کا سبق لیتا ہے۔

(سوال) سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ان کی تعلیمات کے حوالے سے زندہ ہے؟

(جواب) والد مرحوم کا تبلیغ کرنے کا اپنا ایک انداز تھا۔ مجلس ذکر منعقد کرتے تھے، تقریریں کرتے تھے، وعظ ونصیحت کرتے تھے۔ آج بھی بے شمار لوگ اپنے وعظ وغیرہ ان کی باتوں کو دہراتے ہیں۔ ان کے مقالات کا ایک مجموعہ خطبات ومقالات کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اپنے تبلیغی دوروں میں میری ملاقات اب بھی ان لوگوں سے ہوتی ہے، جو والد صاحب کے جملے من وعن دہرا دیتے ہیں، ان کے لیے ہوئے اشارے انہیں اب تک یاد ہیں، اب بھی وہ والد کی تعلیمات سے رہنمائی لیتے ہیں۔ یہ بات تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میرا سارا زادِ راہ ان کے علمی دسترخوان کی باقیات ہیں۔

(سوال) سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت بطور والد کن خوبیوں سے مزین تھی؟

(جواب) سب سے نمایاں خوبی آزادیٔ فکر ہے۔ ایک آدمی جو ایک خاص جماعت سے تعلق، ایک خاص ذہن اور ایک خاص پس منظر رکھتا ہو۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے بچوں کو سب چیزیں گھول کر پلا دے، تاکہ اس کے فکر وفلسفہ کا تسلسل برقرار رہے، یا گھر میں کم از کم تمام افراد کے خیالات ایک جیسے ہوں، لیکن انہوں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ اس بات کا احتمال تو ہوتا ہے کہ اگر میں نے انہیں ایسا نہ بنایا تو دوسری باتیں سن کر کہیں اور راہ نہ اختیار کر لیں، اس حوالے سے انہوں نے ہمیں بٹھا کر کبھی ایسا نہیں کہا کہ ایسا کرو ویسا کرو، مگر ماحول ایسا رکھا کہ ہر بات ذہن نشین ہوتی رہی۔ شاید انہیں اپنے طریق کار پر پورا اعتماد تھا، اللہ پر پورا بھروسہ تھا۔ اللہ کی توفیق اور دعا پر پورا یقین تھا، یہی وہ فن تھا جو ان کے پاس تھا۔ بہت سے معاملات میں آزادی تھی، پھر جب میں خود باپ بنا تو اندازہ ہوا، اس طرح بچوں کو فکری

آزادی دینے کے کیا فائدے ہیں؟ نرمی کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟ بچوں پر اگر زیادہ سختی کی جائے تو وہ اس کے عادی ہو کر بات کا اثر لینا چھوڑ دیتے ہیں۔

سوال کیا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کو اپنا جانشین دیکھنا چاہتے تھے؟

جواب اپنی زبان سے تو انہوں نے کبھی اظہار نہیں کیا مگر دل میں یقیناً چاہتے ہوں گے، کبھی انہوں نے یہ نہیں کہا کہ تم یہ بنو، یہ پڑھو وغیرہ۔ انجینئرنگ اپنی مرضی سے رکھی، مگر جب دیکھا کہ اس میں مستقبل نہیں ہے تو لائن تبدیل کی۔ ایک مرتبہ مجھے یاد ہے، میں نے کچھ ایسا کہا کہ میں ایسا بنوں گا کہ لوگ میرے پاس آیا کریں گے۔ فرمانے لگے: اچھا تم ایسا بننا چاہتے ہو؟ یہ جو تمام دن لوگ میرے پاس آتے ہیں انہیں تم دیکھتے ہو۔ اشارہ تھا کہ دنیا کے اعتبار سے کچھ بننا چاہتے ہو مگر حقیقی عزت اللہ تعالیٰ نے دین میں رکھی ہے۔

سوال سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے شب و روز کے معمولات پر کچھ روشنی ڈالیں؟

جواب اللہ سے لو لگانے والا ہر شخص سحر خیز ہوتا ہے۔ نماز تہجد ان کا معمول تھا، اس کے بعد لمبی دعا اور آہ و زاری کا سلسلہ ہوتا۔ فجر کے بعد دیر تک ذکر اذکار میں مشغول رہتے پھر تیار ہو کر ناشتہ کرتے اور یونیورسٹی چلے جاتے۔ یونیورسٹی کے بعد باقی تمام دن آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ چہل قدمی بہت پابندی سے کرتے تھے، خاص طور پر چھٹیوں میں جب ہم مری جاتے تو مال روڈ سے کافی فاصلے پر رہائش لیتے۔ مقصد 5 سے 6 کلومیٹر روزانہ پیدل چلنا ہوتا تھا۔

سوال آج کس سے مل کر سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے؟

جواب ایک تو چوہدری عبدالحفیظ صاحب تھے، تقریباً دس سال پہلے ان کا انتقال ہوا۔ والد صاحب کے ساتھ اسلامیات کے پروفیسر تھے، بعد میں صدر شعبہ بھی بنے۔ والد کے بعد مجلس ذکر بھی منعقد کرتے رہے، دوسرے لفظوں میں والد صاحب کے خلیفہ بھی تھے۔ ان سے مل کر والد گرامی کی یاد بہت زیادہ آتی تھی۔ موجود لوگوں میں مولانا عیش محمد ہیں۔ دراصل والد گرامی کی شخصیت کے مختلف پہلو تھے۔ ان کے پاس بیٹھنے والے لوگ مختلف پہلو تھے۔ ہر شخص نے اپنے مزاج کی مناسبت سے کوئی ایک پہلو اخذ کر لیا تھا۔ کسی نے وعظ اپنا لیا، کسی نے ذکر اخذ کر لیا، کسی نے تقویٰ، کسی نے علم اور کسی نے احسان اور خشوع اپنا لیا۔ تزکیہ، احسان اور عبادت میں خشوع کے حوالے سے مولانا عیش محمد سے مل کر ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

سوال سید صاحب کے دوستوں سے مل کر کیسا لگتا ہے؟

جواب بے انتہا خوشی ہوتی ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر آدمی کی زندگی میں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسی خوشی ہے جس کا تجربہ میرے سوا شاید ہی کسی کو ہوا ہو۔ جب میں ان کی والہانہ محبت دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ یہ مجھ سے

اتنی محبت کرتے ہیں تو ان سے کتنی محبت کرتے ہوں گے؟ جن کی وجہ سے کرتے ہیں، جس طرح ان کی بتائی ہوئی باتوں کو دہراتے ہیں، ان کے کیے ہوئے اشارے تک بھی یاد ہیں۔ بہت عجیب لوگ ہیں، اتنی عزت دیتے ہیں کہ شاید ہی کسی کے حصہ میں آئی ہو۔

سوال سید ابوبکر غزنوی صاحب رحمہ اللہ کی مجلس کے بارے میں بتائیں؟

جواب ہر جمعرات کو والد صاحب مجلس وعظ و ذکر منعقد کیا کرتے تھے۔ ان کی مجلس میں شہر کے چوٹی کے پڑھے لکھے لوگ آیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر، وکیل، پروفیسر اور اس طرح ہر طبقہ کے اعلیٰ درجہ کے لوگ آتے تھے۔ وعظ سنتے تھے، ذکر میں شامل ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی ہر طرح کے لوگ آتے تھے، بے نماز لوگ، ہر مسلک کے لوگ، خدا کے وجود کے منکر لوگ بھی آتے تھے۔ والد مرحوم کا اپنا ایک طریقۂ تبلیغ تھا، اپنا انداز تھا۔ اس مجلس کو بعد میں چوہدری عبدالحفیظ صاحب نے ڈاکٹر ایوب صاحب کے کلینک پر کچھ عرصہ چلایا، مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔

سوال سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے معمولات میں شامل اوراد و وظائف کی کچھ تفصیل سے آگاہ فرمائیں؟

جواب سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر، سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم اور لا الٰہ الا اللہ کے وظائف ہمارے گھر میں چلتے تھے۔ درود شریف بھی کثرت سے پڑھا جاتا تھا۔ والد مرحوم فرمایا کرتے تھے: ہمیں جو کچھ بھی ملا ہے درود کی برکت سے ملا ہے۔ ہر ذکر کے اپنے اثرات ہوتے ہیں۔ جب ہم ان کے ساتھ جمعہ پڑھنے نکلتے تو وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ہوتے اور ہم اگلی سیٹ پر براجمان ہوتے تھے۔ گھر سے دارالعلوم تک وہ ہمیں بے کار باتوں سے منع کرتے تھے اور درود پڑھنے کی تاکید کرتے تھے۔ اپنے عقیدت مندوں کو کہا کرتے تھے کہ اگر میں تمھیں کوئی غیر مسنون لمبی عبارت بتا دیتا تو تم کہتے شیخ نے بہت اچھا وظیفہ بتایا ہے، مگر میں تمھیں سبحان اللہ پڑھنے کے لیے کہتا ہوں کیوں کہ یہ مسنون وظیفہ ہے۔ یاد رکھو وہ لمبے چوڑے وظیفے خادموں کے بنائے ہوئے ہیں جب کہ یہ آقا کا بنایا ہوا ہے۔ مسنون وظائف کے مقابلہ میں یہ لمبی چوڑی عبارتیں کچھ بھی نہیں ہیں، اس لیے دل میں یہ خیال مت لانا کہ میں تمھیں ٹرخا رہا ہوں۔ فرمایا کرتے: لمبے وظیفوں کا یہ دور نہیں ہے، پہلے دور کے جو لوگ تھے ان کی قوتیں، ان کی مصروفیات، ان کے کام اور طرح کے تھے۔ یہ لوگ لمبے وظیفوں سے باغی ہو جائیں گے۔ نفلی عبادت تو مَن کا سودا ہے، جب عادی ہو جائیں گے تو خود شوق سے لمبے وظائف کریں گے، تو اس طرح وہ لوگوں کو اوراد و وظائف اور ذکر کی طرف مائل کرتے تھے۔

سوال کیا سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ سیاست میں بھی دلچسپی رکھتے تھے؟

جواب وہ سیاست وغیرہ سے دور رہتے تھے۔ حکومت کی کسی پیشکش یا عہدے کو کبھی بھی قبول نہیں کیا۔ فرمایا کرتے تھے: سیاست کے ذریعے دولت و منفعت یا شہرت کچھ بھی ہو چار دن کی چاندنی ہے، جب کہ ہمارا کام سدا بہار ہے۔ البتہ دادا جان سیاست میں باقاعدہ حصہ لیتے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی وہ ایم ایل اے تھے، پاکستان بننے

کے بعد بھی مجلس قانون ساز کے رکن رہے۔ مگر والد صاحب کا اپنا ایک نقطۂ نظر تھا۔ کالج کے زمانہ میں مَیں بھی طلبہ سیاست کا حصہ رہا ہوں۔ جمعیت کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑا، طویل غور وخوض کے بعد میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس سے دور رہا جائے تو بہتر ہے اور اپنی توانائیاں کسی تعمیری کام میں صرف کرنی چاہئیں۔

(سوال) سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے وفات کے واقعہ کی کچھ تفصیل بتائیں؟

(جواب) یہ اپریل 1976ء کی بات ہے، انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور سے اسلامیہ یونی ورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر بن آچکے تھے۔ ایک وفد کے ساتھ سرکاری دورہ پر انگلینڈ میں تھے کہ سڑک پر حادثہ پیش آگیا، شدید زخمی ہو گئے۔ کالر بون اور ان کی دونوں ہڈیاں ٹوٹ گئیں، ویسٹ منسٹر ہسپتال میں داخل ہوئے۔ ہم اس وقت بہاولپور ہی میں تھے، سفارت خانہ سے فون آیا اور حادثہ کی اطلاع ملی، بہت پریشانی ہوئی۔ معلوم ہونے والی صورت حال پر ڈاکٹروں سے تبادلۂ خیال ہوا تو انہوں نے یہی بتایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، علاج ذرا طویل ہوگا۔ ان کا سر، چہرہ، دماغ وغیرہ بالکل سلامت تھے۔ اگلے روز ہمیں تار ملا کہ آپ لوگ جلد میرے پاس پہنچیں۔ لندن میں اس وقت ہمارے ماموں موجود تھے، وہ ہسپتال پہنچے۔ ان کے علاوہ کئی شاگرد، دوست اور جاننے والے بھی اطلاع پا کر آموجود ہوئے۔ ہر ملنے والے سے کہتے رہے: اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کریں کہ میرا چہرہ، دماغ، ہاتھ سلامت ہیں۔ میں بول سکتا ہوں، میں سوچ سکتا ہوں، بس دعا کریں اللہ تعالیٰ کرم فرمائے گا۔ میں بھی اللہ کا کروڑ کروڑ شکر ادا کر رہا ہوں اور سوائے شکر کے اس وقت میرے دل میں کوئی بات آ ہی نہیں رہی۔ ہماری والدہ کے ہمراہ جانے کی تیاری مکمل ہوگئی تھی، مگر جس دن روانگی تھی اسی روز ان کی وفات کی خبر ملی۔ حادثہ کے بیسویں دن وفات پائی۔ خبر ہمارے لیے بہت زیادہ حیرت کا باعث تھی۔ ابتدائی طور پر بتایا گیا تھا، خطرے کی کوئی بات نہیں اور ماموں جان بھی دیکھ کر آئے تھے۔ بلکہ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے ملاقات بھی کر آئے تھے، بعد میں انہوں نے اس ڈاکٹر سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ خون کا ایک لوتھڑا بن جانے کی وجہ سے دل کو خون کی فراہمی متاثر ہوئی، یہی بات وفات کا سبب بن گئی۔ میت پاکستان لائی گئی اور یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں مولانا معین الدین لکھوی مرحوم کی اقتداء میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور قبرستان میانی صاحب میں دادا مرحوم کے پہلو میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

(سوال) ایک بڑے دینی اور روحانی خانوادے کے فرد ہونے کے ناطے آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

(جواب) اللہ کا بڑا کرم ہے، بہت بڑا اعزاز ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا﴾ ''اس کے والدین نیک لوگ تھے۔'' یعنی آباء واجداد کا اونچی سطح کا انسان ہونا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے۔ سورہ طور کی آیت ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی (راہ) ایمان میں بھی ان کے پیچھے چلی۔ ہم ان کی اولاد کو بھی ان (کے درجے) تک پہنچا دیں گے اور ان کے اعمال

میں سے کچھ کم نہ کریں گے۔"

تو یہ کرم دراصل آباء واجداد پر ہوتا ہے۔ اس کی نعمت ہے کہ آپ کو ایک پلیٹ فارم مل جاتا ہے، بات کرنے کی جگہ مل جاتی ہے۔ تبلیغ کے لیے بھی مناسب مقام، ماحول اور فضا چاہیے۔ مکہ میں ماحول مناسب نہیں تھا تو حضور علیہ السلام کو کتنی تکلیف اُٹھانی پڑی، طائف تشریف لے گئے، وہاں آپ پر پتھر برسائے گئے، آخر کار مدینہ منورہ ہجرت کی۔ یہ اللہ کا بڑا کرم ہے، کوئی جگہ مل جائے اور پھر اس تعارف کو اسی کام کے لیے استعمال کیا جائے۔ بزرگوں نے اس بات سے بڑی نفرت کی ہے کہ اپنی حیثیت کو دنیاوی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔

سوال سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اور سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر مزید آگاہی کے لیے کوئی کتاب یا کسی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے تو براہِ کرم آگاہ فرمائیں؟

جواب سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر تو والد صاحب کی کتاب "سیدی وابی" کے نام سے موجود ہے، جسے فاران اکیڈمی لاہور نے پانچ سال قبل بھی شائع کیا تھا۔ مولانا اسحٰق بھٹی کی کتاب "قافلہ حدیث" میں بھی والد گرامی کا تذکرہ موجود ہے۔ کراچی کے ایک ادارہ نے "غزنوی خاندان" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے، مگر مارکیٹ میں مفقود ہے۔ چوہدری عبدالحفیظ صاحب کی بیٹی کا والد صاحب کی حیات وخدمات پر پی ایچ ڈی کا مقالہ موجود ہے اور کچھ لوگوں نے پی ایچ ڈی کا موضوع والد کی شخصیت کو بنایا ہے، مگر سردست ان کے نام ذہن میں نہیں ہیں۔

سوال آج کل جب کہ اہل تصوف ذرائع ابلاغ میں نمایاں ہیں، کیا یہ سب کچھ تصوف کی روح سے میل کھاتا ہے؟

جواب بنیادی اصول یہ ہے کہ جو کام بھی اللہ کے لیے کیا جائے وہ درست ہے۔ اگر کوئی شخص نیک کام کسی اور مقصد کے لیے کرتا ہے۔ مثلاً اپنی شہرت، پہچان، حبِ جاہ، حبِ مال وغیرہ تو وہ عمل مردود ہے۔ دین کا جو بھی کام کیا جائے اور مقصود خدا کی ذات نہ ہو تو وہ مردود ہے۔ ہم کسی کے دل میں تو نہیں جھانک سکتے، ہمیں اس شخص کا احترام کرنا چاہیے جو اللہ کی طرف بلاتا ہے۔ خواہ اس کا ذریعہ ٹی وی ہو، اخبار ہو، سیمینار ہو، کانفرنس ہو، کتاب لکھ کر ہو یا کوئی مجلس وغیرہ ہو۔ ہمارے گھر میں ذکر اذکار کے علاوہ قرآن کی کچھ آیات بہت زیادہ پڑھی جاتی تھیں اور بعض احادیث بہت زیادہ دہرائی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک وہ روایت ہے جس میں ایک عالم، شہید اور سخی کا ذکر ہے۔ والد صاحب یہ حدیث بہت زیادہ دہرایا کرتے تھے، وہ فرماتے تھے: جب کوئی شخص وعظ کر رہا ہو تو اس کا اولین مخاطب اس کا اپنا نفس ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت دو کام کر رہا ہوتا ہے، اپنے سننے والوں کی اصلاح وتربیت اور اپنا تزکیۂ نفس۔ باقی جہاں تک گوشہ نشینی، خلوت اور تنہائی کا تعلق ہے تو یہ تصوف کا ایک پہلو ہے، ایک گوشہ ہے۔ مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے، بذاتِ خود ایک مقصد نہیں ہے۔ جیسے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر چالیس راتیں گزارنا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حرا میں بیٹھنا۔

یہ دراصل ایک بہت بڑی ذمہ داری کو ادا کرنے کی تیاری کا ایک مرحلہ ہے۔ ہمیشہ حرا میں نہیں رہنا، نہ ہمیشہ کوہِ طور پر رہنا ہے۔ بلکہ جب آپ یہاں سے نکلیں تو آپ رحمت بن کر لوگوں پر برسنا ہے۔ دین کی دعوت دے کر لوگوں کو اللہ کے احکام ماننے پر تیار کرنا ہے۔ آپ کا لوگوں کے لیے بھرپور فیضان ہونا چاہیے۔

سوال سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے والد ہونے کے ساتھ ساتھ استاد اور شیخ بھی تھے، اس تعلق کی تفصیل بتائیں گے؟

جواب ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے: اللہ کا ولی وہ ہے جس کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔ یعنی جو کچھ وہ کرتا ہو، جو کچھ اس کے احوال ہوں ان میں اتنی جاذبیت ہو کہ دیکھنے والا خود بخود وہ کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ چونکہ ان کا انداز قال سے زیادہ حال تھا، اس لیے ان کے زیر سایہ رہنے سے وہ جو کچھ بھی کرتے تھے اس کا کچھ نہ کچھ حصہ اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ میں تو کہوں گا یہ انہی کے دسترخوان کے چند ریزے ہیں جنہیں میں اپنا زادِ راہ سمجھتا ہوں اور انہی کی باتوں کو دہرا دینا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں۔

سوال آپ کے دادا جان مرکزی جمعیت کے بانی اور تاحیات صدر تھے، مگر آپ جماعتی سرگرمیوں سے دور ہیں، اسباب پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

جواب جماعتی معاملہ جو ہے، سچی بات یہ ہے کہ میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ دادا جان نے مرکزی جمعیت کی بنیاد رکھی، ملکی سیاست میں بھی پوری طرح دخیل رہے۔ جب کہ والد صاحب سیاست وغیرہ سے دور رہے۔ اس طرح ایک وقفہ سا آ گیا، اس لیے میں بھی جماعتی سرگرمیوں سے دور ہو گیا۔ اب بھی جماعتی احباب کوئی کام کہتے ہیں تو استطاعت کی حد تک ضرور کرتا ہوں۔ آج کل پیغام ٹی وی کے پروگرام ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ جب مجھے بلاتے ہیں میں ضرور جاتا ہوں۔ تمام احباب رابطہ میں ضرور ہوتے ہیں، دلی میلان برقرار ہے۔

سوال دار العلوم تقویۃ الاسلام کن حالات سے گزر رہا ہے؟

جواب یہ ایک دُکھتا ہوا سوال ہے۔ دار العلوم اچھے حالات سے نہیں گزر رہا۔ اس کی بڑی وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ میں اسے وقت نہیں دے پایا۔ میرا اپنا جو تعلیمی سلسلہ رہا وہ تمام کالج و یونیورسٹی سے رہا، پھر بھی میری تمنا ہے کہ یہ جگہ ہری بھری رہے، پھلے پھولے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے اس کا متبادل کچھ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک ماڈرن سکول ''برکت سکول'' کے نام سے بنایا ہے، پری سکول سے لے کر اے لیول تک۔ ابھی یہ او لیول تک پہنچا ہے، اس کے نصاب میں کیمرج کے تجویز کردہ اسلامیات کے نصاب کو ہم نے مزید کچھ پھیلا دیا ہے۔ پلے گروپ سے اسلامی تعلیمات شروع ہو جاتی ہیں۔ نماز کی پابندی سکول کی تعلیم کا حصہ ہے، قرآن مجید کا ناظرہ لازمی ہے۔ منصوبہ یہ ہے کہ کلاس 8th تک ناظرہ قرآن مکمل کروا کر اگلے پانچ سال میں مکمل قرآن کا ترجمہ پڑھایا جائے۔ اس سے اگلی بات

یہ ہے ہم یہاں ایک سازگار ماحول فراہم کر رہے ہیں، مخصوص سرگرمیاں ہیں۔ کون سا دن یہاں منایا جائے گا اور کون سا نہیں منایا جائے گا۔ اس طرح ہم ایک جہت متعین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ مدارس کے نظام سے میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔ جو بھی طلبہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں اور جن مناصب پر وہ جاتے ہیں، ملک کے نظام میں مرکزی دھارے سے دور رہتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی جوہری تبدیلی نظام میں نہیں آئی۔ جب تک فیصلہ ساز لوگوں کے آپ قریب نہیں ہوتے، یا خود ان مناصب پر نہیں آتے تبدیلی آنا مشکل ہے۔ اس نقطۂ نظر سے سکول کا آغاز کیا، اگرچہ ان مقاصد کے لیے ایک طویل وقت درکار ہے۔ دینی مدارس کی تعلیم انبیاء کا ورثہ ہے، انہی کی وجہ سے یہ علم محفوظ چلا آرہا ہے۔ اگرچہ نصاب میں کچھ تبدیلیاں وقت کا تقاضا ہیں۔

سوال کیا دعوتی کام اسلاف کے منہج کے مطابق ہو رہا ہے؟

جواب میرا یہ خیال ہے کہ اس دور میں دین کا جو جوہر ہے اس کی تبلیغ کی جائے۔ کیوں کہ یہ دور مادیت، الحاد اور زندیقیت کا دور ہے۔ اس میں فروعی باتوں کی ترویج نہیں کرنی چاہیے۔ بنیادی چیزوں پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے، مثال کے طور پر اگر درخت کو جڑ سے اکھاڑا جا رہا ہو اور مالی اس کی شاخوں اور پتوں کو پانی دے رہا ہو تو ایسے مالی کو آپ عقلمند کہیں گے؟ فروعی باتوں کو کرنے کا بھی ایک موقع محل ہوتا ہے کہ آپ کا موقف اسلاف سے چلا آرہا ہے، آپ اس پر عمل کرتے ہیں۔ آج دشمن یہ چاہتا ہے کہ صوبوں کو صوبوں سے لڑا دیا جائے، قوموں کو قوموں سے لڑا دیا جائے، مسلکوں کو مسلکوں سے لڑا دیا جائے۔ اس لیے فروعی اختلافات کو بہت احتیاط اور اعتدال سے بیان کرنا چاہیے۔ اسی میں امت کی، اس ملک کی ہم سب کی بقا ہے۔

سوال قارئین کے نام کیا پیغام دینا پسند کریں گے؟

جواب تمام قارئین کو میں یہی پیغام دینا چاہوں گا کہ جوہرِ دین کی اعتدال کے ساتھ تبلیغ کریں، جس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد شامل ہیں۔ غیروں کی سازشوں کو پہچاننا چاہیے اور ان کے جال میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ اس وقت ہماری نوجوان نسل اس طرف مائل ہے کہ وہ ہر چیز کا ثبوت دیکھنا چاہتے ہیں، ہر چیز کا ماخذ تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے میں ان کی رہنمائی کرتے ہوئے دین کے بنیادی اصولوں کو ذہن نشین کروایا جائے۔ [1]

---

[1] ماہنامہ پیامِ آگہی، فیصل آباد (مئی 2014ء)

ابو جی

تحریر: سید حماد غزنوی

مکتوباتِ سرہندی اور حجۃ اللہ البالغہ کے مصنفین کون اصحاب ہیں، فتاویٰ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتنی جلدیں ہیں، غبارِ خاطر اور تذکرہ کی نثر کے کیا وظائف ہیں، امام ابن کثیر کی البدایۃ والنہایۃ کے کیا کوائف ہیں؟ ان سب سوالوں کے جواب آٹھ دس سال کی عمر میں مجھے معلوم تھے۔ کیوں معلوم تھے، میں عرض کرتا ہوں۔ یہ ماحول جبر کا تھا، یہ وہ دنیا تھی جس میں میں نے ہوش سنبھالا، یہ میرا گھر تھا جس میں علم سے محبت کرنا اختیاری معاملہ نہیں لازم تھا۔ میری یہ انوکھی دنیا ایک ستون پر کھڑی تھی اور یہ ستون تھے ابو جی (سید ابوبکر غزنوی)۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے مطالعہ، ذکرِ الٰہی اور تقریر و تبلیغ کے سوا والد کو کسی اور کام میں منہمک پایا ہو۔ اپنے بزرگوں کے ورثے کی نسبت سے والد کو مسلسل ذمہ داری کا احساس رہتا تھا۔

کم گھر ایسے ہوتے ہوں گے جن میں اپنی کئی پیڑھیوں کا تذکرہ اس تواتر سے صبح شام ہوتا ہو۔ میں نے بچپن میں والد سے مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں سن رکھا تھا کہ ''ابا جی انگریزوں کے خلاف متحرک تھے، جوانی کے 10 سال انگریز کی جیل میں کاٹے۔'' دادا جان کی لائبریری کی سینکڑوں کتابوں پر ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے حاشیے کے باریک و لطیف نکات کا تذکرہ اکثر والد کرتے۔ میں نے اپنے پردادا امام عبدالجبار غزنوی کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی کا یہ فقرہ بھی بچپن میں سن رکھا تھا کہ ''جب امام صاحب اپنی زبان سے لفظ ''اللہ'' کہتے ہیں تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ سر ان کے قدموں میں رکھ دیا جائے۔'' اور والد صاحب کے جدِ امجد عبداللہ غزنوی کو کس طرح کلمہ حق کہنے کی پاداش میں خاندان سمیت افغانستان سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

ابو جی صحیح معنی میں اپنے اجداد کے علم و فکر کے وارث تھے۔ حج سے واپسی پر ان کے ٹرنک فقط کتابوں سے بھرے ہوتے تھے۔ لکھے ہوئے حرف کی انتہائی تعظیم کرتے، میں نے انہیں جھک کر زمین سے کبھی کچھ اٹھاتے نہیں دیکھا سوائے اس کاغذ کے جس پر کچھ لکھا ہوتا۔ کتابیں رکھنے میں بھی وہ مراتب کا خیال رکھتے تھے، یعنی اگر دیوانِ غالب کے اوپر زنداں نامہ رکھی ہے تو ترتیب الٹ دیتے۔ کتابوں کی سمت پاؤں کرنا ابو جی انتہائی بے ادبی شمار کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کا تانا بانا علم اور تصوف سے بُنا گیا تھا، وقت کے ساتھ تصوف کا رنگ ان پر گہرا ہوتا چلا گیا، دل کے برتن کو صبح شام مانجھتے رہنا، یعنی ذکرِ الٰہی ان کا طرزِ حیات تھا۔ نماز پڑھتے ہوئے ابو جی ایک حالت میں ہوتے تھے، لگتا تھا

انہیں کامل یقین ہے کہ ان کا خالق انہیں دیکھ رہا ہے۔ دلی کے معروف شیخ الحدیث میاں نذیر حسین نے اپنے شاگرد عبداللہ غزنوی بارے کہا تھا: ''عبداللہ حدیث ہم سے پڑھ گیا اور نماز پڑھنا ہمیں سکھا گیا۔'' نماز کا یہ خشوع بھی ابو جی کا خاندانی ورثہ تھا۔ اللہ کے رنگ نے انہیں ڈھانپ رکھا تھا، ان کی دوستی، ہر تعلق، ہر تحریر، ہر تقریر کی غایت رضائے الٰہی کا حصول تھا۔ ان کے خالق نے ملال وخوف کو ان کے دل سے اُچک لیا تھا۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ غزنوی حدیث کا درس دے رہے تھے، کسی نے مطلع کیا کہ آپ کا بیٹا فوت ہو گیا ہے، آپ نے یہ اندوہ ناک خبر سنی ایک منٹ خاموش رہے اور پھر درس دینے لگے۔

دنیا سے ان کا دل پاک تھا، توازن، اعتدال، ہر مکتبۂ فکر کا احترام ابو جی کی شخصیت کے بنیادی اوصاف تھے۔ ''ادب پہلا قرینہ ہے'' ان کی زندگی کا منشور تھا، غیر مہذب صحبت میں ان کا دم گھٹتا تھا۔ ابو جی کے دل سے حُب اہلِ بیت رضی اللہ عنہم چھلکتی تھی۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ذکر اکثر بھرائی ہوئی آواز میں کرتے۔

ابو جی اورینٹل کالج میں پڑھاتے تھے۔ اپریل 1976ء میں سرکاری وفد کے ہمراہ انگلستان میں تھے جہاں وہ ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ابو جی نے اپنے اجداد امام عبدالجبار غزنوی اور عبداللہ غزنوی کے جنازوں پہ اژدھام کی تفصیل لکھ رکھی تھی۔ ابو جی کا جنازہ بھی اپنے اجداد جیسا تھا۔[1]

---

[1] روزنامہ دنیا (3 مئی 2021ء)

سید ابوبکر غزنوی

تحریر: مولانا محمد اسحاق بھٹی

24 جولائی 1948ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کا قیام عمل میں آیا اور اس کا دفتر شیش محل روڈ پر دار العلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھا۔ اسی سال اس کے ناظم دفتر کی حیثیت سے لاہور میں آیا تو رہائش کے لئے مجھے جو کمرہ دیا گیا، وہ سید ابوبکر غزنوی کے کمرے سے ملحق تھا۔ جمعیت کے دفاتر اور یہ کمرے بلڈنگ کی دوسری منزل میں تھے۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی سکونت تیسری منزل میں تھی۔

سید ابوبکر غزنوی اس وقت پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے (عربی) کے طالب علم تھے اور بہت پڑھتے تھے، رات کا اکثر حصہ پڑھنے میں گزر جاتا تھا۔ بالعموم وہ اونچی آواز سے پڑھا کرتے تھے۔ دو تین روز میں ہی ہمارا باہم تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے بھی پڑھنے کی عادت تھی۔ اس لئے شب کا کافی حصہ اسی شغل کی نذر ہو جاتا تھا۔ بارہا ایسا ہوتا کہ رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ کے قریب وہ اپنے کمرے سے نکلتے اور میرے کمرے کے دروازے پر دستک دیتے اور ساتھ ہی آواز آتی:

اسحاق صاحب زندہ ہیں؟

میں جواب دیتا: ابھی زندہ ہوں۔

ان کی طرف سے آواز آتی: باہر آ کر زندگی کا ثبوت دیجئے۔

ہم بھاٹی دروازے کے چوک پر جاتے، وہاں تکے یا کباب کھاتے، ایک ایک کپ چائے کا پیتے اور واپس آ کر پھر پڑھنے کا جو سلسلہ شروع ہو جاتا تو ڈیڑھ دو بجے تک جاری رہتا۔

ایک دن عجیب لطیفہ ہوا۔ مجھے کہا چلو، آج عیاشی کریں۔ فلیٹی ہوٹل اس وقت لاہور کا بہت بڑا ہوٹل تھا۔ ہم وہاں پہنچے، کافی دیر وہاں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور کھاتے پیتے رہے۔ بیرے سے بل طلب کیا تو وہ چالیس روپے کے قریب تھا۔ انھوں نے اپنی جیب سے پیسے نکالے تو چوبیس یا پچیس روپے تھے۔ میں نے اپنی جیب ٹٹولی تو کل پونجی چھ یا سات روپے تھی۔ مجھے کہا: اپنے پیسے جیب میں ڈال لیے اور نہایت اطمینان سے اٹھے اور کاؤنٹر پر آئے۔ عام طور پر وہ ننگے سر رہتے تھے، لیکن اتفاق سے اس دن خاکستری رنگ کی شاندار قراقلی ٹوپی ان کے سر پر تھی۔ کاؤنٹر پر پانچ روپے بہ طور ٹپ بیرے کی پلیٹ میں ڈالے جو اس زمانے میں بہت بڑا ٹپ تھا اور وہاں بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا: یہ

لیجیے بیس روپے اور یہ ٹوپی لیجیے...... جس دن ہم ادھر آئیں گے، پیسے دے کر ٹوپی لے جائیں گے۔

وہ یہ الفاظ سن کر نہایت حیران ہوا۔ کھڑا ہو کر کہا: جناب! مجھے شرمندہ نہ کیجیے، یہ پیسے بھی لیجیے اور ٹوپی بھی لیجیے۔

اس نے ٹوپی تو مجبور کر کے دے دی، لیکن بیس روپے ہم نے اس سے نہیں لیے، وہ اس کی میز پر رکھے اور جلدی سے باہر آ گئے۔ دو تین دن کے بعد میں ادھر گیا تو اسے باقی پیسے دیے، لیکن نہایت مشکل سے۔!

اپنے سے بڑوں میں سے جس میں وہ نیکی کا جوہر دیکھتے، اس کے سامنے سر نیچا کر لیتے تھے۔ حضرت مولانا عطا اللہ حنیف کے سسر کا اسم گرامی میاں نور الدین تھا۔ تقسیم ملک کے اپنے گاؤں بھوجیاں (ضلع امرتسر) سے ترک مکانی کر کے بہ طور پناہ گزین وہ گوندلانوالا (ضلع گوجرانوالہ) میں آ بسے تھے۔ ان کے اخلاف اب بھی وہی ہیں۔ مولانا عطاء اللہ صاحب اور اپنے دوسرے عزیزوں سے میل ملاقات کے لئے لاہور ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ نماز وہ دار العلوم تقویۃ الاسلام میں پڑھتے تھے۔ مولانا داؤد غزنوی نے دار العلوم کے امام صاحب سے کہہ رکھا تھا کہ میاں صاحب جتنے دن یہاں رہیں، جماعت کے لئے انہی سے عرض کیا جائے۔ وہ نہایت پرہیزگار بزرگ تھے اور مولانا داؤد غزنوی کے والد مکرم حضرت امام مولانا عبد الجبار غزنوی کے ارادت مند تھے، اس لئے مولانا ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک دن ابوبکر صاحب دار العلوم کے صدر دروازے سے متصل محمد ادریس کی دکان پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ ادھر سے میاں صاحب بھی تشریف لے آئے۔ انھوں نے حسب عادت وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کو السلام علیکم کہا اور فرمایا:

''مجھے یہاں اپنے مرشد کی خوشبو آ رہی ہے۔''

ابوبکر صاحب نے یہ الفاظ سنے تو فوراً ادھر متوجہ ہوئے اور گردن جھکا کر نہایت ادب سے میاں صاحب کو سلام کیا اور انتہائی نرم آواز میں ان سے دعا کی درخواست کی۔

عربی زبان سے انہیں بے حد پیار تھا، بالخصوص جدید عربی سے وہ نہایت دلچسپی رکھتے تھے اور دراصل یہی ان کا موضوع تھا۔ خود وہ عرب بھی ان کی عربی دانی کا اعتراف کرتے تھے، جن سے انھیں بات چیت کا موقع ملتا تھا۔ ایک مرتبہ سعودی سفارت خانے کے چند اعلیٰ حکام مولانا داؤد غزنوی سے ملاقات کے لئے لاہور آئے، ایمبیسیڈر ہوٹل میں ان کا قیام تھا۔ انھوں نے مولانا کو ٹیلی فون کیا۔ مولانا اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ ابوبکر صاحب نے ٹیلیفون سنا اور عربی میں گفتگو کی۔ وہ ان کے لہجے اور زبان سے بہت متاثر ہوئے اور ان کا ذکر مولانا سے کیا۔

ابوبکر صاحب بعض دفعہ بڑی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے تھے، مئی 1965ء میں پندرہ سال کی ارادت کے بعد ہفت روزہ ''الاعتصام'' سے الگ ہوا تو ہم نے جولائی 1965ء میں ہفت روزہ ''توحید'' جاری کیا۔ اس کے پبلشر سید عمر فاروق غزنوی اور نگران سید ابوبکر غزنوی تھے، ایڈیٹر میں تھا۔ ایک دن شام کے بعد میں اور ابوبکر صاحب، مولانا محی الدین احمد قصوری کی خدمت میں گئے کہ وہ ''توحید'' کے لئے مضمون عنایت فرمایا کریں۔ وہ مزنگ روڈ کی کوٹھی نمبر ۵۳

میں سکونت پذیر تھے۔ ان سے مل کر ہم چوک صفاں والا سے ٹمپل روڈ کی طرف گھومے تو ایک ریڑھی والا کھڑا تھا، جس نے برف کی ایک سل پر میٹھے لگا رکھے تھے۔ ابوبکر صاحب نے اسے دیکھا تو وہیں رک گئے اور مجھے کہا: آگے کہاں جا رہے ہو؟ اللہ کا نام لے کر ٹوٹ پڑو ان پر......!

وہاں کھڑے کھڑے ہم نے بیس بائیس میٹھے رگڑ ڈالے......!

یہاں یہ بھی سنتے جایئے کہ اخبار ''توحید'' جاری نہ رہ سکا، اکتوبر 1965ء میں یہ فقیر ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہو گیا تھا۔

ایک دن دس بجے کے قریب کسی کام سے میں مولانا غزنوی کے کمرے میں گیا تو ابوبکر صاحب وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی داڑھی کچھ بڑھی ہوئی تھی۔ اس سے قبل وہ روزانہ شیو کرتے تھے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ اب ان کی دنیا بدل گئی ہے، لیکن کئی روز سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور انہیں اس حالت میں نہیں دیکھا تھا، جس حالت میں اب دیکھ رہا تھا۔

مولانا نے جاتے ہی مجھ سے پوچھا: آپ یہ حجامت کہاں سے بنواتے ہیں؟ جس حجام سے آپ حجامت بنواتے ہیں ابوبکر کو بھی ان کے پاس لے جایئے۔ اس وقت انارکلی دھنی رام روڈ کی ایک گلی میں ایک حجام کی دکان تھی، جس کا نام محمود تھا اور وہ صوبہ یوپی کے شہر ''سیوہارہ'' کا رہنے والا تھا جو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری مرحوم کا شہر تھا۔ وہ پڑھا لکھا حجام تھا اور کئی ادیب، صحافی اور شاعر اس سے حجامت بنواتے تھے۔ میں کچھ عرصہ بیشتر اس سے ملنے کی غرض سے گیا تو دیکھا کہ اس نواح کا پرانا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ حجام کا کچھ پتہ نہیں کدھر گیا۔ اس کی دکان فیشن ایبل ملبوسات کی دکان سے بدل گئی ہے۔

میں ابوبکر صاحب کو اس حجام کی دکان پر لے گیا۔ ان کا تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے بڑے شوق اور پیار سے ان کا خط بنایا۔ چھوٹی چھوٹی موچھیں بڑی خوبصورتی سے بنائیں۔ لیکن ابوبکر صاحب کو موچھیں پسند نہیں آئیں۔ انھوں نے گھر آ کر موچھیں ختم کر دیں، باقی سب کچھ اسی حالت میں رہنے دیا۔

اگر میں یہ کہوں کہ ان کی داڑھی رکھنے کے ''افتتاح'' میں ایک طرح سے میرا بھی حصہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔

دار العلوم تقویۃ الاسلام میں ان کی خطابت جمعہ کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے۔ جولائی 1965ء کی بات ہے کہ میں نے ان سے کہا: آپ دار العلوم میں خطبہ جمعہ شروع کر دیں۔ انھوں نے جواب دیا: میں اسی مسجد (چینیاں والی) میں جمعہ پڑھا کروں گا، جہاں میرے بابا پڑھا کرتے تھے۔ ان کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ اس مسجد میں جمعہ پڑھانے کے متمنی ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہیں نماز جمعہ کے لئے جایا کریں گے، جہاں ان کے والد مکرم جایا کرتے تھے۔ میں نے کہا: وہ دور تو ختم ہو گیا۔ آئندہ آپ یا آپ کے خاندان کے کسی فرد کی اس مسجد کے منبر و محراب تک رسائی نہیں ہو

سکے گی۔ بہرحال ان کے انکار کے باوجود میں نے اخبار ''توحید'' میں اعلان کر دیا کہ آئندہ دار العلوم تقویۃ الاسلام میں سید ابوبکر غزنوی نماز جمعہ پڑھایا کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کثیر تعداد میں دور دراز سے لوگ جمعے کے لئے آنے لگے۔ ان کی وفات کے بعد کئی سال ہمارے دوست پروفیسر حافظ محمد ایوب (انجینئرنگ یونیورسٹی) لاہور وہاں جمعہ پڑھاتے رہے۔ اب ابوبکر صاحب کے صاحب زادے سید جنید غزنوی خطبہ جمعہ دیتے ہیں۔ بہت حاضری ہوتی ہے اور وہ ماشاء اللہ اچھی تقریر کرتے ہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ 1963ء میں جب مولانا داؤد غزنوی کی صحت زیادہ بگڑ گئی تھی اور جمعے کے لئے کسی مسجد میں جانا ان کے لئے ممکن نہیں رہا تھا تو انھوں نے چند جمعے دار العلوم میں پڑھے تھے۔ لیکن وہ عارضی معاملہ اور مجبوری کا قصہ تھا۔ اب ابوبکر صاحب نے مستقل طور پر یہ سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ میں کہنا دراصل یہ چاہتا ہوں کہ دار العلوم میں ان کے خطبہ جمعہ کے افتتاح میں بھی اس فقیر کا حصہ ہے۔

خطابت و تقریر میں ان کا مقام بڑا اونچا مقام تھا۔ جس موضوع پر کچھ کہنا ہوتا، اس کی پوری تیاری کر کے آتے تھے۔ ایک دفعہ انھیں حکیم محمد سعید مرحوم کی طرف سے ''شام ہمدرد'' میں تقریر کے لئے دعوت دی گئی، شام ہمدرد کے جلسوں میں بہت سے پڑھے لکھے حضرات شرکت کرتے تھے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اس وقت کے ڈائریکٹر ایس ایم اکرام بھی اس میں شامل ہوتے تھے۔ مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا جاتا تھا۔ اکرام صاحب انڈین سول سروس کے پرانے آدمی تھے اور متعدد انگریزی اور اردو کتابوں کے مصنف......! بے شمار مشہور و ممتاز اہل علم کو انھوں نے دیکھا اور سنا تھا۔ اب شام ہمدرد میں سید ابوبکر غزنوی کی تقریر سننے کا بھی انھیں موقع ملا۔ دوسرے دن وہ دفتر آئے تو ابوبکر صاحب کی تقریر کی بہت تعریف کی...... بے شک جس موضوع پر انھوں نے اظہارِ خیال کیا، اس کے تمام پہلوؤں کی خوب صورتی کے ساتھ بادلائل وضاحت کی۔ ان کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ تقریر میں اردو، عربی اور فارسی کے (بلکہ بعض اوقات پنجابی کے اشعار بھی) برمحل پڑھتے تھے اور تقریر کو آیاتِ قرآن، حدیث رسول اور اقوالِ صلحا سے مزین کرتے تھے۔ تقریر کو وہ وعظ کہا کرتے تھے۔ مثلاً اگر اپنی کسی پچھلی تقریر کا حوالہ دینا ہوتا تو فرماتے: میں نے اپنے پہلے وعظ میں یہ کہا تھا۔

زندگی کے آخری دور میں ان کی حالت بالکل بدل گئی تھی۔ زیادہ وقت وظائف اور یادِ خدا میں گزرتا تھا۔ ہمارے دوست پروفیسر محمد یحییٰ (صدر شعبہ اسلامیات انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور) کا شمار ان شاگردوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ ان کی ہدایات کے مطابق اپنے ایک نہایت ضروری کام کے لئے کسی صاحب سے ملنے کے لئے روانہ ہونے لگے تو کہا: اول و آخر درود شریف 313 دفعہ حسبی اللہ ونعم الوکیل پڑھنا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کا بتایا ہوا وظیفہ پڑھنے لگا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ واپس آیا تو پوچھا: کتنی دفعہ پڑھا تھا۔

عرض کیا: بے شمار دفعہ۔

فرمایا: جتنی دفعہ بتایا جائے اتنی ہی دفعہ پڑھنا چاہیے۔ اس کا معاملہ معالج کی بتائی ہوئی دوا کی طرح ہے، جتنی مقدار میں وہ بتائے، اس کی ہدایت کے مطابق اتنی ہی مقدار میں دوا استعمال کرنی چاہیے۔

ابوبکر صاحب نے خوب تدریسی کام کیا اور بے شمار لوگ ان کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے۔ ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک، ڈاکٹر خورشید حسن رضوی، ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر سعید اقبال، ڈاکٹر محمد یحییٰ، ڈاکٹر جمیلہ شوکت، ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن، خالد بزمی، حافظ ثناء اللہ خان، چودھری عبدالحفیظ، عابد حسن، ساجدہ قریشی اور حافظ عبداللہ (بھکر) شامل ہیں۔ ان حضرات میں سے بعض وفات پا چکے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ زندہ دوستوں کی عمر دراز فرمائے اور ان کے لئے زیادہ سے زیادہ علم و فن کی خدمت کے مواقع فراہم کرے اور وفات پا جانے والوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

اب ملاحظہ فرمایئے، ان کا وہ شجرۂ نسب جو ہمیں معلوم ہے اور ان کے آبا و اجداد کے بارے میں چند باتیں اور خود ان کے واقعات و حالات کی جھلک......! اور واقعہ یہ ہے کہ ان کا وجود ایک جھلک ہی تھا۔ دنیا میں آئے، ایک جھلک دکھائی اور غائب ہو گئے۔ ان کی ولادت سے لے کر ان کے سفر آخرت کی یہ کہانی نہایت مختصر ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ان کی زندگی مختصر تھی۔ لیکن اس اختصار میں پھیلاؤ بھی بہت ہے۔ ان سے استفادہ کرنے والوں کی خدمات جس قدر پھیلتی جائیں گی اختصار کا دائرہ پھیلتا جائے گا۔

کسی کو ان سے اختلاف ہوگا، کسی کو اتفاق۔ کوئی ان کا معتقد ہوگا، کوئی مخالف......اور دنیا میں ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے، نہ سب کسی سے متفق ہوتے ہیں، نہ سب کسی کی مخالفت کرتے ہیں۔ موافقت اور مخالفت کا سلسلہ برابر چلتا ہے۔ جس نے کسی سے اتفاق کیا، اس نے بھی اس کی حیثیت کو مان لیا اور جس نے اختلاف کیا اس نے بھی مان لیا۔ بلکہ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ اختلاف کرنے والے نے اتفاق کرنے والے کی بہ نسبت اسے زیادہ مانا اور زیادہ اہمیت دی۔ اس میں کوئی کمال تھا تو اس سے اختلاف کیا گیا اور اس کے افکار و تصورات کے بارے میں اہل علم کی رائے میں تغیر رونما ہوا۔

ابوبکر صاحب کا سلسلہ نسب یہ ہے:

ابوبکر بن مولانا محمد داؤد بن مولانا عبدالجبار بن مولانا عبداللہ بن محمد بن محمد بن محمد شریف......! یہ تمام حضرات اپنے اپنے وقت میں علم و معرفت کی دولت سے مالا مال اور مرجع خلائق تھے۔

مولانا سید عبداللہ غزنوی جو سید ابوبکر غزنوی کے پردادا تھے، 1226ھ (1811ء) کو قلعہ بہادر خیل میں پیدا ہوئے جو افغانستان کے شہر غزنی کے مضافات میں واقع ہے اور خواجہ بلال پہاڑ کے قریب ہے۔ اسے ''قریہ صاحب

زادگان'' بھی کہا جاتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ''صاحب زادگان'' سے مراد یہی لوگ تھے اور اس نواح میں ان کی دین داری کا بڑا شہرہ تھا، اور یہی وجہ کہ انہیں صاحب زادگان کہا جاتا ہے۔

مولانا عبداللہ غزنوی بہت بڑے عالم اور عارف باللہ تھے۔ چوں کہ وہ خاص کتاب وسنت کی تبلیغ کرتے اور اسی کو مدارِ عمل ٹھہراتے تھے، اس لئے 1857ء سے کچھ عرصہ بعد افغانستان کی حکومت نے ان کو ملک بدر کر دیا تھا۔ حکومت کے ایوانوں اور وہاں کے علما و زعما میں اس تقویٰ شعاری کا چلن نہ تھا، جس سے اللہ نے حضرت عبداللہ غزنوی کو بہرہ مند فرمایا تھا...... اس لیے نہایت اذیتوں میں مبتلا کر کے انھیں وہاں سے نکال دیا گیا۔ اپنے اہل وعیال سمیت وہ غزنی سے پشاور آئے اور کچھ عرصہ وہاں رہے، پھر لاہور آ گئے۔ بعد ازاں پنجاب کے شہر امرتسر کے بعض سرکردہ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں امرتسر لے گئے۔

امرتسر میں انھوں نے کتاب وسنت کی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا، عربی اور فارسی کی متعدد کتابوں کے اردو زبان میں ترجمے کرائے اور انھیں شائع کر کے افادہ عوام کے لئے تقسیم کیا۔ امرتسر میں ایک دار العلوم قائم کیا جو ''مدرسہ سلفیہ غزنویہ'' کے نام سے موسوم ہوا۔ اس دار العلوم سے بے شمار علما وطلبا نے استفادہ کیا۔ انھوں نے ربیع الاول 1298ھ (1881ء) میں وفات پائی۔ میں ان کے مفصل حالات جو کم وبیش 80 صفحات پر مشتمل ہیں، اپنی کتاب فقہائے ہند کی نویں جلد میں لکھ چکا ہوں جو تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے پاک وہند پر مشتمل ہے۔

مولانا عبداللہ غزنوی کے بارہ بیٹے تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور علم وفضل کی دولت عطا فرمائی تھی۔ ان میں سے ایک بیٹے مولانا عبدالجبار غزنوی تھے، جو جلیل القدر عالم اور نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ وہ 1628ھ (1852ء) کو غزنی میں پیدا ہوئے اور والد مکرم کے ساتھ ہی امرتسر آ گئے تھے۔ 25 رمضان المبارک 1231ھ (27 اگست 1913ء) کو امرتسر میں فوت ہوئے۔

مولانا عبدالجبار غزنوی کے بیٹے مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے، جن کی ولادت 1895ء کو امرتسر میں ہوئی۔ وہ تحریر وتقریر، فضیلت علمی، دین داری اور تقوے میں اپنے اسلاف کے صحیح ترین جانشین تھے۔ انگریزی حکومت کے خلاف انھوں نے سیاسیات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مختلف سیاسی تحریکوں میں مجموعی طور پر دس سال قید کاٹی۔ ان کی تاریخ وفات 16 دسمبر 1963ء ہے۔

مولانا غزنوی کے چار بیٹے تھے، سید عمر فاروق، سید ابوبکر غزنوی، سید محمد یحییٰ اور غزالی۔! عمر فاروق اور سید ابوبکر وفات پا چکے ہیں اور محمد یحییٰ اور غزالی اللہ کے فضل سے زندہ ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم سید ابوبکر غزنوی کے حالات بیان کرنا چاہتے ہیں۔

سید ابوبکر غزنوی 22 مئی 1927ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ اس وقت مولانا داؤد غزنوی کا قیام امرتسر میں تھا اور

لاہور کی چینیاں والی (جامع مسجد اہل حدیث) کے خطیب ان کے حقیقی چچا حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی تھے۔ 1930ء میں مولانا عبدالواحد غزنوی فوت ہو گئے تو ان کی جگہ اس مسجد کی مسند خطابت پر مولانا داؤد غزنوی کو فائز کر دیا گیا تھا۔ وہ امرتسر سے لاہور آ گئے تھے، لیکن ان کے اہل وعیال کچھ مدت امرتسر میں ہی رہے۔ چنانچہ ابوبکر غزنوی نے حصول علم کا آغاز امرتسر سے ہی کیا۔

لاہور خزانہ گیٹ ہائی سکول، ان دنوں امرتسر میں تھا۔ یہ سکول تقسیم ملک کے بعد لاہور منتقل ہوا تھا۔ ابوبکر صاحب نے امرتسر میں اسی سکول میں میٹرک پاس کیا۔ اس وقت ماسٹر عبدالغفور صاحب اس کے ہیڈ ماسٹر تھے، جو علمائے غزنویہ کے عقیدت مند تھے۔ ایک معلم شیخ محمد جمیل تھے۔ یہ بھی مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ارادت کیشوں میں سے تھے۔ یہ دونوں بزرگ سید ابوبکر صاحب کے معلمین میں سے تھے۔

بی اے انھوں نے ایم اے او کالج امرتسر سے کیا۔ یہ کالج آزادی کے بعد 1947ء میں امرتسر سے لاہور منتقل ہو گیا تھا۔

1950ء میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (عربی) کیا۔ پورے پنجاب میں اول آئے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔

ایم۔اے پاس کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کیا۔ وہ اس قدر ذہین اور تیز فہم تھے کہ ایل ایل بی کرنے کے بعد اگر وہ وکالت کا پیشہ اختیار کرتے تو بہت بڑے وکیلوں میں ان کا شمار ہوتا۔ مگر انھوں نے تعلیم وتعلّم کی راہ اختیار کی اور یہی ان کے لئے صحیح راہ تھی جو ان کے آبا واجداد کی راہ تھی۔

پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں جن اساتذہ سے انھوں نے استفادہ کیا، وہ حسب ذیل ہیں:

① شیخ عنایت اللہ: 1909ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ وہیں بی اے پاس کیا۔ پھر اورینٹل کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں عربی کے علاوہ جرمن اور فرانسیسی زبانیں سیکھیں۔ 1923ء میں ایم اے عربی کر کے اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ بعد ازاں برطانیہ سے پی ایچ ڈی کیا۔ لاہور واپس آئے تو گورنمنٹ کالج میں شعبہ عربی کے صدر مقرر کیے گئے۔ اورینٹل کالج میں عربی کے جز وقتی استاذ بھی تھے۔

② پروفیسر محمد مراکشی: اپنے عہد کے مشہور عالم اور اورینٹل کالج میں عربی کے استاذ تھے۔ عالم اسلام کے محقق ڈاکٹر تقی الدین مراکشی ہلالی کے چھوٹے بھائی تھے۔

③ ڈاکٹر برکت علی قریشی: 1896ء میں غازی آباد (یوپی، ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ پہلی تقرری بہ طور لیکچرار دہلی کے ایک کالج میں ہوئی۔ 1924ء میں برلن (جرمنی) سے

پی ایچ ڈی کیا۔ 1928ء کو واپس آئے تو اسلامیہ کالج لاہور میں بہ حیثیت صدر شعبہ عربی تقرر ہوا۔ پھر اورینٹل کالج آ گئے۔ مختلف اوقات میں اردن، لبنان اور شام میں پاکستان کی طرف سے سفیر بھی مقرر کیے گئے۔

④ پروفیسر عبدالقیوم: عربی کے مشہور عالم ومصنف تھے۔ لدھیانہ، گجرات اور لاہور کے گورنمنٹ کالج میں عربی کے پروفیسر رہے۔ اورینٹل کالج میں بھی پڑھاتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے انسائیکلو پیڈیا کے سینئر ایڈیٹر مقرر کیے گئے تھے۔ 8 ستمبر 1989ء کو وفات پائی۔

یہ حضرات گزشتہ دور کے اساتذہ میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ ابوبکر صاحب نے ان سے استفادہ کیا اور نہایت محنت اور انہماک سے تعلیم حاصل کی۔

عربی اور فارسی سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ بالعموم کہا کرتے تھے کہ میں اگر انگریزی میں فیل ہو جاؤں تو مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہوگا، لیکن عربی اور فارسی جو میرے آباء واجداد کی زبانیں ہیں، مجھے اچھے نمبروں میں کامیاب ہونا چاہیے۔

1950ء میں وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور (سول لائن) میں عربی کے لیکچرار مقرر کیے گئے۔ اس کالج میں عربی اور اسلامیات کے شعبوں کے سربراہ بھی رہے۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج (لاہور) کے پرنسپل ڈاکٹر سید عبداللہ تھے۔ انھوں نے بھی ان کو اپنے کالج میں جدید عربی کے لیے جز وقتی لیکچرار مقرر کرلیا، جدید عربی ان کا خاص موضوع تھا۔

دینیات کی تعلیم انھوں نے باقاعدگی سے حاصل نہیں کی تھی، اگرچہ اپنے والد محترم مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا عبدالرحیم (حسین خاں والا)، مولانا عطاء اللہ حنیف اور مولانا محمد عبدہ سے مختلف اوقات میں پڑھتے رہے تھے، لیکن وہ کسی حد تک باقاعدہ پڑھنا چاہتے تھے۔ اس کا انھیں بہت احساس تھا اور ان کی شدید خواہش تھی کہ یہ کمی پوری کی جائے، چنانچہ 1960ء میں گرمیوں کی تعطیلات ہوئیں تو وہ فیصل آباد (اس زمانے میں لائل پور) پہنچے اور پیپلز کالونی میں مکان کرائے پر لیا۔ اس وقت جامعہ سلفیہ میں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا شریف اللہ خان خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔ انھوں نے حضرت حافظ صاحب سے تفسیر بیضاوی اور بعض کتب حدیث پڑھیں اور مولانا شریف اللہ خاں سے نحو کی بعض کتابیں پڑھیں۔ انھی دنوں میں ان کا تعلق پروفیسر غلام احمد حریری سے ہوا جو اس وقت اسلامیہ کالج لائل پور میں پڑھاتے تھے۔ ان سے علم نحو کی کتاب الفیہ کی شرح ابن عقیل کا کچھ حصہ پڑھا۔ اس طرح انھوں نے مختلف لائق اساتذہ سے دینیات کی تعلیم مکمل کر لی۔ 1964ء میں وہ انجینئرنگ یونیورسٹی سے منسلک ہوئے اور انھیں علوم اسلامیہ کی سربراہی کا منصب عطا کیا گیا۔ اس یونیورسٹی میں انھوں نے بڑی محنت کی جس کے نتیجے میں اسلام سے قلبی تعلق رکھنے

والے طلباء کا خاصا حلقہ وہاں قائم ہو گیا۔

ستمبر 1975ء میں انھیں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا پہلا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ اس سے قبل اسے ایک ، دینی درس گاہ کی حیثیت حاصل تھی، جسے جامعہ عباسیہ کہا جاتا تھا۔ صدر ایوب کے دور میں اس کے نصابِ تعلیم میں اسلامی علوم کے ساتھ کچھ جدید علوم شامل کر دیے گئے تھے، لیکن اسے مکمل یونیورسٹی کا درجہ ذوالفقار علی بھٹو کے عہدِ حکومت (1975ء) میں دیا گیا تھا، ابوبکر غزنوی اس کے اولین وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ انھوں نے اس کی تعمیر و ترقی کے لئے بڑی تگ و دو کی۔

اب ان کی قلمی جدوجہد کی طرف آیے۔ وہ نہایت نہایت ذہین اور قدیم و جدید علوم سے باخبر تھے اور تحریر و کتابت سے بھی لگاؤ تھا، لیکن انھوں نے اس میدان میں بہت زیادہ جدوجہد نہیں کی، بس چند رسائل ان کی یادگار ہیں، اگرچہ وہ اپنے اندر اختصار کا پہلو لیے ہوئے ہیں تاہم بڑے مفید اور لائق اعتنا ہیں۔ وہ رسائل مندرجہ ذیل ہیں:

① اسلام میں گردش دولت (اردو، انگریزی)
② حقیقت ذکر الٰہی۔
③ ادب محبت کا پہلا قرینہ ہے۔
④ قربت کی راہیں۔
⑤ اسلام اور آدابِ معاشرت (اردو، انگریزی)
⑥ اس دنیا میں اللہ کا قانونِ جزا و سزا۔
⑦ خطباتِ جہاد۔
⑧ واقعہ کربلا۔
⑨ قرآن مجید کے صوری اور معنوی محاسن۔
⑩ تاریخ اسلام (عہد بنو امیہ و عباس)
⑪ سورۂ محمد، سورۂ فتح اور سورۂ حجرات کی تفسیر و ترجمہ۔
⑫ تعلیم و تزکیہ۔
⑬ اسلامی ریاست کے چند ناگزیر تقاضے (اردو، انگریزی)
⑭ کتابت حدیث عہد نبوی ﷺ میں۔
⑮ عہد حاضر میں استاد اور شاگرد کا رشتہ۔

ان رسائل کے مصنف شہیر کا نقطہ نظر یہ تھا کہ لوگوں کے پاس بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کے لئے وقت نہیں ہے،

اس لئے کسی موضوع پر چھوٹا سا رسالہ لکھنا چاہیے تاکہ کم سے کم وقت میں پڑھا سکے۔ یہ ان کا خیال تھا......لیکن واقعہ یہ ہے کہ چھوٹا سا رسالہ محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔ پڑھ کر رکھا اور کاغذات میں گم ہو گیا۔ بڑی کتاب جلد کی تحویل میں آجاتی ہے اور محفوظ رہتی ہے۔

اگر وہ تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ عنانِ توجہ مبذول کرتے تو اس میدان میں بہت کامیاب رہتے، اس لیے کہ اللہ نے ان کو دلکش زبان اور خوب صورت اندازِ نگارش سے بھی نوازا تھا، علم و مطالعہ کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، ذہانت و فطانت سے بھی بارگاہِ خداوندی سے انھیں بہرۂ وافر حاصل ہوا تھا اور قوتِ اظہار کا ملکہ بھی ودیعت فرمایا گیا تھا۔

ان کی ایک کتاب کا نام ''حضرت مولانا داؤد غزنوی'' ہے۔ یہ کتاب جو 464 صفحات پر مشتمل ہے، درحقیقت بہت سے اہل قلم کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف عنوانات سے مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے متعلق تحریر فرمائے۔ ان مضامین میں ایک طویل مضمون سید ابوبکر غزنوی کا ہے، جس میں انھوں نے اپنے آباء واجداد کے حالات بیان کیے ہیں، یہ حالات مختصر ہونے کے باوجود اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف عنوانات سے متعلق مضامین و مقالات سپرد قلم کیے جو بعض مجلات و جرائد میں شائع ہوئے۔

تقریر و خطابت میں ایک خاص اسلوب جو تھا جو لوگوں کو متاثر کرتا تھا۔ اپنی تقریر کو وہ عام طور پر وعظ کہا کرتے تھے۔ تقریر اور مجلسی گفتگو میں قرآن کی آیات اور نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار انھیں یاد تھے جو برمحل پڑھتے تھے اور نہایت صفائی اور وضاحت سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے تھے۔

اپنی بات وہ بڑے زور اور خاص جذبے کے ساتھ سامعین تک پہنچاتے تھے، جس سے وہ اثر پذیر بھی ہوتے تھے اور مرعوب بھی۔ تقریر میں اگر اسلاف میں سے کسی بزرگ کا کوئی واقعہ بیان کرنا مقصود ہوتا تو بالعموم عربی یا فارسی کے انہی الفاظ میں بیان کرتے جو اس واقعہ سے متعلق کسی کتاب میں ان کے مطالعہ میں آئے ہوتے۔ اصل الفاظ بیان کرنے کے بعد ان کا ترجمہ کرتے تاکہ سامعین پوری صورت حال سے آگاہ ہو سکیں۔

نہایت باحمیت اور خوددار اہل علم تھے اور بعض اوقات خودداری اپنے اصل دائرے اور حد سے آگے نکل جاتی تھی۔

میانہ قد، گول چہرہ، سرخ گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑا سینہ، ناک نقشہ جاذب نظر، آنکھوں میں چمک، آواز میں کھنک، صاف ستھرا لباس اور بے حد نفاست پسند۔

ابتدا سے لے کر ایم اے تک انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ یہ ایک طویل مدت ہے جو کہ سکول کے پہلے درجے سے لے کر یونیورسٹی کے آخری درجے تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس اثنا میں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کے بہت سے اساتذہ سے انھوں نے حصولِ علم کیا۔ دینیات کے مختلف شعبوں کی کتابیں پڑھیں، لیکن انھوں نے کبھی نہیں بتایا کہ کس استاذ

گرامی قدر سے کون سی کتاب پڑھی اور سکول یا کالج یا یونیورسٹی کے کس معلم یا پروفیسر سے زیادہ متاثر ہوئے یا دینی علوم کے کون بزرگ ان کے نزدیک کس علم میں کس مرتبے کے حامل تھے؟ یہی وجہ ہے کہ نہ ان کے اساتذہ کی تفصیل کا کسی کو علم ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ انھوں نے کس صاحب سے کیا پڑھا۔ گزشتہ سطور میں جن چند علمائے کرام اور اساتذہ عالی قدر کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے ان سے استفادہ کیا، اس کا پتا اس لئے چلا کہ یہ موجودہ دور سے تعلق رکھنے والے اہل علم کے سامنے کا معاملہ تھا، پھر ان حضرات کے اسمائے گرامی ان بعض مضامین میں بھی مندرج ہیں جو ان کی وفات کے بعد مختلف اصحابِ قلم نے ان کے بارے میں لکھے اور اخبارات میں شائع ہوئے۔ ان اساتذہ گرامی میں سے بھی بعض نے ان کی زندگی میں یا ان کی وفات کے بعد اس کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ ان کے شاگرد تھے۔

وہ عربی اور اردو کے شاعر بھی تھے۔ اگرچہ انھوں نے خاص طور سے اس طرف توجہ نہیں کی اور بہت کم شعر کہے، تاہم ان کا جو کلام بعض اخبارات میں چھپا، وہ بڑا جاندار ہے، مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ابتدا میں وہ کس شاعر سے اصلاح لیتے رہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عام طور پر شاگرد اپنے اساتذہ کے بارے میں لوگوں کو بتاتے ہیں اور جن سے استفادہ کیا ہو، ان کا تذکرہ کرتے ہیں، لیکن سید ابوبکر غزنوی اسے ضروری نہیں سمجھتے تھے اور واقعی یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ کسی کو اپنے اساتذہ کے بارے میں بہ ہر حال بتایا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ سید ابوبکر غزنوی کو اللہ نے بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا، جہاں وہ علم وادراک، تقریر وخطابت اور تدریس وتعلیم میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے، وہاں حسن وخوب صورتی کی دولت بھی بارگاہِ الٰہی سے انھیں عطا کی گئی تھی اور یہ وہ چیزیں تھیں جو انھیں اپنے آباء واجداد سے ورثے میں ملی تھیں۔

وہ بذلہ سنج، لطائف وظرافت کے ماہر، خوش کلام، خوش مزاج، دوستوں کے دوست اور حاضر جواب تھے۔ عام گفتگو میں آسانی سے کسی کے قابو میں نہیں آتے تھے۔ علمی بات کا جواب علم سے، شعر کا جواب شعر سے، لطیفے کا جواب لطیفے سے، طنز کا جواب طنز سے اور تصوف سے متعلق بات کا جواب تصوف سے دیتے تھے۔

علم فلسفہ سے بھی انھیں دلچسپی تھی، چنانچہ مولانا محمد حنیف ندوی سے اس موضوع پر ان کی خوب گفتگو ہوتی تھی، اس لیے کہ مولانا فلسفے کے تمام پہلوؤں سے آگاہ تھے۔

کسی سے مرعوب ہونا اور کسی کے سامنے جھکنا ان کی خاندانی روایت اور ذاتی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ وقار سے رہتے تھے اور اپنے مقام ومرتبے کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اصحابِ اقتدار کے پاس جانے سے احتراز کرتے تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ جس طرح اردو اور پنجابی میں روانی سے بات کرتے تھے، اسی طرح عربی، فارسی اور انگریزی میں بے تکلفی اور روانی سے گفتگو کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے وہ نہایت متاثر تھے اور ان کے انتہائی مداح......! مولانا کے الہلال، البلاغ اور تذکرہ کے صفحات کے صفحات انھیں زبانی یاد تھے، غبارِ خاطر کا بہت سا حصہ ان کے نوک زبان

تھا۔ مولانا نے اپنی تصانیف میں عربی، فارسی اور اردو کے جو اشعار درج کیے ہیں، ان میں بہت سے اشعار انھوں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لئے تھے......اور یہ ان ذہانت اور قوت حافظہ کا کمال تھا۔

بعض معاملات میں وہ نہایت سخت تھے یا یوں کہیے کہ بے حد باقاعدہ تھے۔ کسی کے ہاں جانا ہوتا تو اس سے وقت لے کر جاتے تھے، اطلاع دیے اور وقت مقرر کیے بغیر نہیں جاتے تھے۔ اسی طرح اگر کوئی ان کے ہاں آنا چاہے تو وقت مقرر کر کے آئے۔

سید ابوبکر غزنوی کی زندگی کو ہم دو عہدوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا عہدہ حصولِ علم، حصولِ ملازمت اور بعض دیگر مشغولیتوں کا تھا جو تقریباً 1940ء تک چلا۔ اس کے بعد دوسرا عہد شروع ہوا جس کے بہت سے گوشے پہلے عہد سے بالکل مختلف تھے۔ یہ ذکر الٰہی، وظائف واوراد، مجالس ذکر کے انعقاد، عبادت وتصوف، وعظ وتقریر، خطباتِ جمعہ کے التزام کا عہد تھا۔ اس عہد میں انھوں نے بڑی شہرت پائی اور ان کے ان اشغال سے بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا۔

16 دسمبر 1963ء کو مولانا محمد داؤد غزنوی نے وفات پائی تو 17 دسمبر کو خاندانِ غزنویہ کا سربراہ بھی انھیں مقرر کیا گیا۔ دار العلوم تقویۃ الاسلام کا اہتمام بھی ان کے سپرد ہوا اور یہ بڑی ذمہ داری تھی جسے وہ سرانجام دیتے رہے۔ یہ ان کے آباء واجداد کا قائم کردہ دار العلوم تھا، جس کے انتظامی امور کو انھوں نے بہ طریق احسن انجام دیا۔

اب ان کی زندگی کے بالکل آخری دور میں آجایئے۔

وہ 1976ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر تھے۔ اسی سال کے ماہ مارچ کے آخر میں کسی سرکاری کام سے لاہور آئے۔ اپریل میں لندن میں اسلامک فیسٹیول منعقد ہو رہا تھا۔ اس میں مقالہ پڑھنے کے لئے حکومت پاکستان کے وفد کے ساتھ (جس کی سربراہی اس زمانے کے مرکزی وزیر حج واوقاف مولانا کوثر نیازی تھے) لندن روانہ ہوئے۔ 4، 5 اپریل کی درمیانی شب کو لندن میں ایک سڑک عبور کرتے ہوئے، تیز رفتار کار کی زد میں آ گئے۔ یہ حادثہ اتنا شدید تھا کہ ہنسلی ٹوٹ گئی، دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ اسی وقت انھیں لندن کے ویسٹ منسٹر ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا اور اس ہسپتال کے کنگ جارج وارڈ میں ان کا علاج شروع ہوا۔

اس سے تھوڑی دیر بعد (غالباً) ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا کو لندن سے بذریعہ ٹیلی فون اس حادثہ کی اطلاع آئی۔ دوسرے دن اخبارات میں جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی، جس سے ان کے متعلقین اور احباب انتہائی تشویش سے دوچار ہوئے اور ان کی صحت کے لئے بے شمار لوگوں نے اللہ سے دعائیں کیں۔

لندن میں جانے والے سرکاری وفد کے ساتھ مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف بھی شامل تھے اور جس دن یہ حادثہ ہوا اس دن وہ وہیں تھے اور ابوبکر صاحب کا پتہ لینے ہسپتال گئے تھے۔ انھوں نے واپس آکر بتایا کہ ضربیں نہایت شدید اور خطرناک ہیں، لیکن وہ ہوش میں ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نماز کے لئے نہ وہ تیمم کر سکتے ہیں، نہ وضو کا

کوئی انتظام ہے، نہ طہارت ہوسکتی ہے۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ ان کی اہلیہ یہاں آ جائیں تو کسی حد تک یہ پریشانی رفع ہوسکتی ہے، لیکن جلدی سے ان کی اہلیہ محترمہ کے وہاں جانے کا انتظام نہ ہوسکا۔ شیخ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ وہ کہتے تھے: میں حج بیت اللہ کے لئے گیا اور بالکل تندرست رہا۔ یورپ کے کسی ملک میں پہلی دفعہ آیا تو یہ حالت ہوگئی ہے۔

ڈاکٹروں نے انتہائی محنت اور توجہ سے ان کا علاج کیا، جس کی اطلاع لاہور کے اخبارات میں روزانہ آتی رہی۔ لیکن 24 اپریل 1976ء کو اسی ہسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس سانحہ کی خبر نمایاں سرخیوں کے ساتھ اخبارات میں شائع ہوئی۔

29 اپریل کو پی آئی اے کے جہاز سے ان کی میت لاہور پہنچنا تھی۔ اسی روز اخبار ''امروز'' میں جو اس زمانے ایک بڑا اخبار تھا، ان کے متعلق میرا مضمون شائع ہوا جو اس سے ایک دن پیشتر اس کے ایڈیٹر حمید جہلمی کے کہنے سے میں لکھا تھا۔ اسی دن ریڈیو پاکستان لاہور میں ان کے حالات میں میری تقریر نشر ہوئی۔ اس طرح اس فقیر کو یہ سعادت حاصل ہے کہ اس نے ان کی وفات کے بعد سب سے پہلے ان پر اخبار میں مضمون لکھا اور ریڈیو میں تقریر کی۔

دن کو گیارہ بجے کے قریب ان کی عارضی اقامت گاہ دار العلوم تقویۃ الاسلام میں تابوت میں بند ان کی میت پہنچی تو میں وہیں تھا۔ دار العلوم کا ہال عورتوں اور مردوں سے بھرا ہوا تھا اور ایک کہرام بپا تھا۔ جو حضرات دار العلوم کے صدر دروازے سے پی آئی اے کی ایمبولینس سے ان کی میت اٹھا کر ہال میں لائے، ان میں سب سے آگے ایک طرف میرے اور ان کے مرحوم دوست حمید المکی تھے اور دوسری طرف مشتاق صاحب تھے۔

تابوت رکھنے کو کہیں جگہ نہ تھی اور لوگ ان کا چہرہ دیکھنے کو بے تاب تھے۔ حزن و ملال کے عالم میں میں وہیں کھڑا تھا کہ حمید المکی مرحوم نے مجھے آواز دی۔

''بھٹی صاحب خدا کے لئے ہماری مدد کیجئے، ان لوگوں کو پیچھے ہٹایے تاکہ ہم تابوت نیچے رکھ سکیں۔''

لوگوں کو بڑی مشکل سے پیچھے ہٹا کر تابوت کے لئے جگہ بنائی گئی۔ لائنیں بنا کر لوگوں نے شیشے کے اندر سے چہرہ دیکھا، بالکل پہلے کی طرح تھا۔ چہرہ اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

نماز مغرب کے بعد جنازہ اٹھایا گیا۔ تابوت کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھے گئے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ کندھا دے سکیں یا کم از کم بانسوں ہی کو ہاتھ لگا سکیں۔ لاہور کے لوگوں کے علاوہ مختلف مقامات سے بے شمار لوگ جنازے میں شرکت کے لئے کاروں اور بسوں پر آئے تھے۔ بسوں کی چھتوں پر بھی لوگ بیٹھے تھے اور آیاتِ قرآنی پڑھ رہے تھے۔ جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ میں سید ابوبکر غزنوی کے بڑے بھائی مولوی عمر فاروق غزنوی کے کہنے سے مولانا معین الدین لکھوی نے پڑھایا تھا۔ گراؤنڈ لوگوں سے بھر گئی تھی۔ اس سے باہر بھی بے شمار لوگ بائیں اور دائیں جانب کی

سڑکوں پر کھڑے تھے۔ ہر حلقۂ فکر کے لوگ جنازے میں شامل تھے۔

میرے دائیں جانب ایس اے رحمان تھے جو اس وقت سپریم کورٹ کے جج تھے اور بائیں جانب پاکستان کے مشہور صحافی م ش (میاں محمد شفیق) تھے۔ م ش مرحوم نے مجھے کہا: بہت بڑی تعداد میں لوگ جنازے میں شریک ہوئے ہیں۔ جسٹس ایس اے رحمان نے (جو خود بھی اہل حدیث تھے) مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''میاں صاحب! آپ بھی وہابی ہو جایئے، اسی کثرت کے ساتھ لوگ آپ کے جنازے میں شریک ہوں گے۔''

لاؤڈ سپیکر کا انتظام تھا اور علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم لوگوں کو صفوں میں کھڑے ہونے کی تلقین کر رہے تھے۔ سنت کے مطابق جنازہ اونچی آواز میں پڑھایا گیا تھا۔ امام جنازہ مولانا معین الدین لکھوی نے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ کئی دعائیں پڑھیں جو مختلف احادیث سے مروی ہیں۔

غزنوی خاندان کے اس عظیم فرزند کو قبرستان میانی صاحب میں ان کے والد مکرم مولانا محمد داؤد غزنوی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ انھوں نے 49 برس عمر پائی۔ جب سے میرا ان سے تعلق ہوا، میں انھیں ''ابوبکر صاحب'' کہا کرتا تھا۔ اس مضمون میں بھی ان کے لئے زیادہ تر یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے ان کی شادی 1958ء میں ہوئی تھی۔ ان کے دو بیٹے ہیں، بڑے سید جنید غزنوی اور چھوٹے حماد غزنوی۔!

جنید کاروبار کرتے ہیں اور دار العلوم میں جمعہ بھی پڑھاتے ہیں، حماد نے صحافتی لائن اختیار کر لی ہے اور وہ آج کل انگریزی اخبار ''دی نیشن'' سے منسلک ہیں۔ سید جنید غزنوی نے کئی دفعہ مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ میں دو کتابیں تصنیف کر دوں۔ ایک سید ابوبکر غزنوی کے حالات میں اور دوسری حضرت مولانا سید عبد اللہ غزنوی سے لے کر تمام خاندانِ غزنویہ کے علما و اکابر کے حالات میں۔! میں نے یہ خدمت انجام دینے کا ان سے وعدہ بھی کیا اور کام بھی شروع کر دیا، لیکن افسوس ہے تکمیل کو نہیں پہنچا۔

یہاں عرض کر دوں کہ غزنوی اور لکھوی دو خاندانوں سے اس فقیر کو بے حد عقیدت ہے۔ میرے اکابر ان خاندانوں کے اکابر سے فیض یافتہ تھے۔ غزنوی خاندان کے اس وقت سب سے زیادہ عمر کے رکن سید عثمان غزنوی ہیں جو حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے بھتیجے اور حافظ محمد سلیمان غزنوی مرحوم کے صاحب زادے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاندان کے بہت سے اکابر کو دیکھا ہے اور نہایت شوق اور خاص جذبے کے ساتھ ان کے حالات بیان کرتے تھے۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے: میں تمھیں خاندانِ غزنویہ کا فرد سمجھتا ہوں، اس لیے کہ تمھاری اس خاندان سے قلبی محبت ہے اور تم ان کے حالات سے باخبر ہو اور حالات بیان بھی کرتے ہو۔ یہ ان کی اس فقیر پر شفقت کا اظہار ہے اور میں اس پر ان کا نہایت شکر گزار ہوں۔[1]

---

[1] افسوس ہے ان سطور کی تحریر سے چند روز بعد سید عثمان غزنوی 24 جولائی 2001ء کو وفات پا گئے۔

تیسرا خاندان جس کے اکابر نے ان دونوں سے استفادہ کیا، روپڑی خاندان ہے۔ اور مجھے یہ سعادت حاصل ہے کہ میں نے ان تینوں خاندانوں کے بزرگانِ عالی قدر پر لکھا ہے اور نہایت عقیدت سے لکھا ہے اور کسی کی کہے بغیر اپنے شوق اور پیار کے جذبات سے لکھا ہے جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

میرے سلسلۂ ''فقہائے ہند'' کی اس جلد میں جو تیرھویں صدی ہجری کے برصغیر کے علماء وفقہا کے حالات پر مشتمل ہے، حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی سے متعلق کم وبیش 80 صفحات کا مضمون ہے، جس میں اس فقیر نے پورے خاندانِ غزنویہ کے علماء کی تاریخ بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ اس میں بہت سے حضرات کا تذکرہ بھی آ گیا ہے جنھوں نے ان سے استفادہ کیا۔ یہ کتاب ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئی تھی اور سید عثمان غزنوی صاحب نے اس کتاب کا مطالعہ کر کے ازراہِ کرم نہایت مسرت کا اظہار کیا تھا اور اس کے پچاس یا ساٹھ نسخے خریدے تھے، وہ اسے دار العلوم تقویۃ الاسلام کے نصاب میں شامل کرنا چاہتے تھے۔

اسی کتاب میں حضرت مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ) پر بھی میں نے ایک طویل مضمون لکھا تھا، اس کی ضخامت بھی 80 صفحات کے لگ بھگ تھی۔ وہ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے دوست اور مرید تھے۔ مناسب مواقع اور مختلف مقامات میں اس مضمون میں بھی حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پھر اپنی کتاب ''نقوش عظمت رفتہ'' میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی پر اپنی دانست میں بھرپور مضمون لکھا ہے جو کتاب کے 112 صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اسی طرح ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی بعض اشاعتوں میں مولانا سید داؤد غزنوی کے چچا زاد بھائی مولانا اسماعیل غزنوی اور ان کے برادر صغیر حافظ سلیمان غزنوی پر میرے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

زیر مطالعہ مضمون کا تعلق سید ابوبکر غزنوی سے ہے۔ ان سے متعلق پنجاب یونیورسٹی کے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے لئے بھی اس کے اربابِ انتظام کی طلب پر مقالہ بھیج چکا ہوں۔

اب لکھوی خاندان کی طرف آیئے۔

سب سے پہلے حضرت حافظ محمد لکھوی سے متعلق مجھ سے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مرحوم چیئرمین ڈاکٹر سید عبداللہ نے مقالہ لکھوایا جو شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں بہت عرصہ ہوا حافظ محمد صاحب پر روزنامہ ''امروز'' میں میرا ایک مضمون دو یا تین قسطوں میں چھپا تھا۔ حضرت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی پر میں نے اپنی کتاب فقہائے پاک وہند کی آٹھویں جلد میں طویل مضمون لکھا۔

پھر اپنی کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں مولانا محمد علی لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی کے حالات میں مضامین تحریر کیے۔ اس کتاب میں جو قارئین کے پیش نگاہ ہے، مولانا محی الدین لکھوی اور ان کے فرزند کبیر مرحوم حافظ محمد لکھوی سے متعلق دو الگ الگ مضامین شائع ہوئے۔

غزنوی اور لکھوی خاندانوں سے فیض یافتہ روپڑی خاندان ہے، جس کے علمائے کرام کی تدریسی اور تبلیغی خدمات سے لاتعداد علما وطلبا مستفید ہوئے۔ اس خاندان کے عالم کبیر مولانا حافظ عبداللہ روپڑی سے متعلق میری کتاب ''بزم ارجمنداں'' میں کئی صفحات پر مشتمل مضمون معرضِ اشاعت میں آیا۔ پھر زیر نظر کتاب میں مولانا حافظ محمد حسین روپڑی، حافظ عبدالرحمٰن روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی پر مضامین مندرج ہیں۔ حافظ اسماعیل روپڑی مرحوم کے حالات میں کئی سال پہلے میں نے ''الاعتصام'' میں مضمون لکھا تھا۔

پنجاب کے اہل حدیث کا ایک خاندان قصوری خاندان ہے۔ جس کے سربراہِ اعلیٰ مولانا عبدالقادر قصوری تھے۔ اس خاندان سے متعلق ''قصوری خاندان'' کے نام سے میری ایک کتاب جو اس موضوع کی اولین کتاب ہے، چھپ چکی ہے۔ یہ کتاب 1994ء میں دار العلوم تعلیم الاسلام ماموں کانجن کی طرف سے میرے مرحوم دوست قاضی محمد اسلم سیف نے شائع کی تھی۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ فقیر غزنوی خاندان، لکھوی خاندان، روپڑی خاندان، قصوری خاندان کے متعدد اکابر کے حالات ضبط کتابت میں لا چکا ہے۔

زندگی رہی تو ان شاء اللہ اپنے محدود علم ومطالعے کی روشنی میں ان تمام خاندانوں سے تعلق رکھنے والے مزید علمائے کرام کے واقعات وکوائف سے اپنے کرم فرماؤں کو روشناس کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

اللھم وفقنا لما تحب وترضاہ

سید ابوبکر غزنوی کے بارے میں میری گزارشات ختم ہوئیں۔ اس سے آگے اپنے عزیز دوست پروفیسر محمد یحییٰ [گوہڑوی] (صدر شعبہ اسلامیات انجینئرنگ یونیورسٹی، لاہور) کے وہ واقعات ردوبدل کے ساتھ تقریباً انھی کے الفاظ میں درج کیے جا رہے ہیں جو انھوں نے میری طلب پر تحریری صورت میں مجھے بھجوائے۔ ان واقعات سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ ابوبکر صاحب ان سے کس درجہ مشفقانہ تعلق رکھتے تھے اور مختلف حالات میں ان پر کتنا اعتماد کرتے تھے، وہاں ان کی زندگی کے بعض نئے پہلو بھی نظر وبصر کے زاویوں میں آتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

① 1963ء کے غالباً مئی کا مہینہ تھا۔ اسلامیہ کالج سول لائنز کی عربی فارسی سوسائٹی نے یو اے آر (یونائیٹڈ عرب ریپبلکن) مصری ادارے کے تعاون سے اس کے ڈائریکٹر کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا، جس کا وقت بعد دوپہر مقرر کیا گیا تھا۔

سوئے اتفاق سے ان دنوں سید ابوبکر غزنوی کے والد محترم حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی گلاب دیوی ہسپتال (لاہور) میں زیر علاج تھے اور پروگرام کے دن ان کی طبیعت کچھ زیادہ ناساز تھی۔ سید ابوبکر صاحب نے سارا پروگرام میرے سپرد کیا، میں اس وقت اسلامیہ کالج میں بی اے سال دوم کا طالب علم تھا اور عربی فارسی سوسائٹی کا جنرل سیکرٹری

تھا۔ سید ابوبکر غزنوی صاحب کو اپنے والد مکرم کی تیمارداری کے لئے ہسپتال جانا تھا، اس لئے طے پایا تھا کہ عربی بات چیت کا سلسلہ حافظ احمد یار (مرحوم) چلائیں گے۔

اس وقت اسلامیہ کالج کے پرنسپل پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم تھے۔ خاں صاحب سید ابوبکر غزنوی صاحب کا نہایت احترام کرتے تھے اور غزنوی صاحب بھی ان کی بے حد تک تکریم بجالاتے تھے۔ حمید احمد خاں اس پروگرام میں مہمان خصوصی تھے، چنانچہ پروگرام کے دن پروفیسر حمید احمد خاں صاحب' وقت مقررہ پر تشریف لائے۔ یو اے آر (یونائیٹڈ عرب ریپبلکن) کے ارکان بھی پہنچ گئے۔ خاں صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ غزنوی صاحب کہاں ہیں؟ میں نے بتایا کہ ان کے والد صاحب گلاب دیو ہسپتال میں زیر علاج ہیں اور ان کی طبیعت زیادہ ناساز ہے، اس لئے انھیں ہسپتال جانا تھا۔ خاں صاحب نے مجھے حکم دیا کہ آپ میری گاڑی پر غزنوی صاحب کی خدمت میں جائیں اور ان سے عرض کریں کہ تھوڑی دیر کے لئے اسی گاڑی پر تشریف لے آئیں اور پھر اسی گاڑی پر تشریف لے جائیں۔

میں ڈرتے اور سہمتے ہوئے سید ابوبکر غزنوی صاحب کی خدمت میں دار العلوم تقویۃ الاسلام آیا اور دروازے پر دستک دی، وہ باہر آئے اور میں نے آمد کا مقصد بیان کیا۔ فرمایا: بھائی میں نے آپ کو کہا بھی تھا کہ میری مجبوری ہے، سارا پروگرام خود ہی سنبھال لینا۔ پھر میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی۔

اس کے بعد پروفیسر حمید احمد خاں کی گاڑی میں ہمارے ساتھ تقریب میں تشریف لے آئے اور آتے ہی خاں صاحب سے سامنا ہوا تو بڑے جلال سے قرآن کی یہ آیت پڑھی: شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِي (یہاں "أهلها" کو لفظ أَهْلِي میں بدلتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا) یہ (یعنی یحییٰ) میرا اپنا آدمی ہے اس نے جو کچھ آپ کو میرے والد کے متعلق بتایا وہ غلط نہیں ہے۔

مجھے وہ منظر یاد ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں نے مولانا داؤد غزنوی کی بیماری کا سن کر ہمدردی کا اظہار کیا اور کوئی دوسرا لفظ زبان سے نہیں نکالا۔

بہرحال تقریب شروع ہوئی۔ تلاوت قرآن کے بعد سید ابوبکر غزنوی نے عربی زبان میں استقبالیہ اور ترحیبی تقریر کی۔ تقریر فی البدیہہ تھی، مگر نہایت جامع اور مربوط۔ یو اے آر ڈائریکٹر فرید الدین جو کہ نسلاً عرب تھے اور عرب کے بڑے عالم تھے، اپنے جوابی کلمات میں بالوضاحت اعتراف کیا کہ مجھے اپنے پاکستان اور ہندوستان قیام کے دوران جن عربی دان حضرات سے ملاقات کے مواقع ملے ہیں، ان سب میں ابوبکر غزنوی پہلے شخص ہیں جو اہل زبان کی طرح عربی بولتے ہیں، جن کے لہجے اور تعبیر میں صحیح عربی زبان کے طالب علم کی جھلک موجود ہے۔

تقریر کے بعد سید ابوبکر غزنوی واپس دار العلوم تشریف لے آئے، کیونکہ انھیں اپنے والد کی خدمت میں گلاب دیوی ہسپتال جانا تھا۔ باقی پروگرام حافظ احمد یار صاحب نے تکمیل کو پہنچایا۔

② 1974ء کے موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو ایک روز مجلس ذکر کے بعد چودھری عبدالحفیظ کے دولت کدہ پر راقم الحروف، ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا، چودھری عبدالحفیظ، ملک غلام مرتضیٰ، ڈاکٹر خواجہ صادق حسین، ڈاکٹر منور حیات، میاں سلمان اور سید ابوبکر غزنوی اکٹھے ہوئے۔ مختلف قسم کی باتیں ہوئیں اور طے پایا کہ میاں سلمان صاحب نے خانسپور ایوبیہ میں جو بیرک خریدی ہے گرمی کی ان چھٹیوں میں وقت وہاں گزارا جائے اور یکسوئی کے ساتھ کچھ دن اللہ کا ذکر کیا جائے۔ خانسپور ایوبیہ ایک پرفضا مقام ہے۔ مری کی نسبت سطح سمندر سے زیادہ بلند۔ ہر قسم کا انتظام سلمان صاحب کے ذمے تھا۔ بندہ عاجز اور چودھری عبدالحفیظ کو "ہراول دستے" کے طور پر کچھ خورد ونوش اور گرم کپڑوں نے ساتھ ایک روز پہلے روانہ ہونے کو کہا گیا۔

راقم الحروف اور چودھری عبدالحفیظ تمام ساتھیوں کا سامان وغیرہ لے کر عازم خانسپور ہوئے۔ رات راولپنڈی میں میرے عزیزوں کے ہاں بسر کی اور اگلے روز علی الصبح خانسپور ایوبیہ کے لئے بس پر سامان لادا اور روانہ ہو گئے۔ راستے میں مری عبور کر کے بلند وبالا پہاڑوں کے راستے سے سخت بارش اور طوفان باد وباراں میں آہستہ آہستہ ہم ایوبیہ پہنچے۔ سلمان صاحب کی بیرک میں سامان رکھا اور کچھ کھانے پینے کا انتظام کیا۔

ادھر ابوبکر صاحب اوران کے باقی ساتھی ڈاکٹر منور حیات صاحب کی ذاتی کار میں اسی روز شام کو خانسپور ایوبیہ پہنچ گئے۔ مغرب کی نماز کے بعد رات کا کھانا کھایا، کچھ آئندہ کے پروگرام کے متعلق باتیں ہوئیں اور عشا کی نماز کے بعد تھکاوٹ کی وجہ سے فوراً سو گئے۔ وہاں ہمارا یہ معمول ہوتا تھا کہ فجر کی نماز کے بعد سید ابوبکر صاحب معرفت الٰہی کے متعلق وعظ فرماتے اور حقیقت ذکر الٰہی کا درس دیتے۔ اس کے بعد چائے کا دور چلتا اور پھر اپنے اپنے اوراد و وظائف کے لئے وقت نکالتے، دوپہر کا کھانا ظہر کی نماز کے متصل ہوتا تھا اور پھر کچھ دیر قیلولہ کرتے۔ عصر کی نماز کے بعد سیر کے لئے نکل جاتے۔ ہر شخص کو اجازت تھی جدھر چاہے سیر کے لئے جائے۔

ایک دن میں، ڈاکٹر ملک مرتضیٰ، چودھری عبدالحفیظ، ڈاکٹر منور حیات اور میاں سلمان "پنج تن پاک" کا یہ قافلہ ایک چشمہ دیکھنے گیا، جو پہاڑوں کے اندر نشیبی جگہ پر تھا۔ ہم بیرک سے کوئی دوسو قدم باہر نکلے ہوں گے کہ کالی گھٹا اٹھی جو دیکھتے ہی دیکھتے پورے آسمان پر چھا گئی۔ ڈاکٹر منور حیات نے موسم کے تیور بھانپ لئے اور واپس بیرک میں چلے گئے۔ ہمیں بھی کہا کہ ایسے پہاڑوں میں ایسی گھٹاؤں میں باہر نہیں نکلنا چاہئے، یہ گھٹائیں جب برستی ہیں تو خوب برستی ہیں۔ ہماری جوانی کے جذبے نے ڈاکٹر صاحب کے مشوروں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب واپس چلے گئے اور ہم چاروں اس چشمے کی طرف چل پڑے۔ ہم نے چشمے پر جا کر ٹھنڈا پانی پیا اور کچھ دیر وہاں بیٹھے۔ اتنے میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور اس زور سے برسی کی چاروں طرف سے برساتی نالے بھر کر زور شور سے بہنے لگے۔ ہم چاروں کے پاس ایک ہی چھتری تھی۔ چنانچہ ہم چاروں آمنے سامنے کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے معانقے کے بعد

''مباطنہ'' کرنے لگے اور ''یک جان چہار قالب'' کی صورت بن گئے۔ ہمارے لیے ایسے طوفانی موسم میں واپس آنا ممکن نہ تھا، اس لئے کہ راستے میں کئی طوفانی نالے بہہ رہے تھے اور کئی جگہ تو نوے درجے کے زاویے میں پانی اس زور سے گر رہا تھا کہ بڑے بڑے درخت جڑوں سے اکھڑ رہے تھے۔ میاں سلمان صاحب نے مشورہ دیا کہ بارش تھمنے کے کم از کم ایک گھنٹا بعد تک ہمیں یہیں رہنا چاہئے۔ پانی کا بہاؤ ختم ہو جائے تو یہاں سے روانہ ہونا چاہئے۔ خطرہ یہ ہے کہ کسی نالے کے پانی کے ریلے کی زد میں نہ آ جائیں۔

ادھر ڈاکٹر منور حیات نے سید ابوبکر غزنوی کو ہمارے متعلق بتایا کہ ہم لوگ چشمے پر گئے ہیں، یہ سن کر وہ بہت پریشان ہوئے۔ طوفان باد و باراں اور پھر شام بھی ہو رہی تھی۔ وہ بڑے بے چین تھے اور تشویش کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ البتہ ہمارے لئے دعا کرتے رہے اور نہایت اخلاص سے رو رو کر اللہ تعالیٰ سے ہماری عافیت کے طالب ہوئے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور ہم خیر و عافیت سے واپس بیرک میں پہنچے تو غزنوی صاحب نہایت خوش ہوئے اور فرمایا: دیکھو جب ڈاکٹر صاحب نے آپ لوگوں سے واپس آنے کو کہا تھا تو آپ کو ان کی بات مان لینی چاہیے تھی۔ بہر حال مضیٰ ما مضیٰ گرم چائے اور گرم پکوڑوں سے ہماری تواضع کی اور گرم کپڑے پہننے کی ہدایت کی۔

اس طرح پروگرام کے مطابق ہم نے وہاں ایک ہفتہ قیام کرنا تھا اور اس کے بعد غزنوی صاحب کے اہل خانہ نے وہاں پہنچنا تھا اور تعطیلات وہیں گزارنا تھیں۔ اتفاق سے اس سال بارش معمول سے زیادہ ہوئی اور ہمارے خانسپور کے قیام کے دوران پہاڑوں میں تودے گرنے سے راستے بند ہو گئے اور غزنوی صاحب کے اہل خانہ پروگرام کے مطابق راستے بند ہونے کی وجہ سے نہ پہنچ سکے۔ ڈاکٹر حضرات اتنا وقت نہیں نکال سکتے تھے، وہ اپنے پروگرام کے مطابق نتھیا گلی اور ایبٹ آباد کے راستے سے ڈاکٹر منور حیات کی کار پر واپس آ گئے اور مجھے غزنوی صاحب نے یہ کہہ کر روک لیا کہ ان کے ساتھ بات چیت کے لئے کسی شخص کو تو رہنا چاہیے۔

چنانچہ میں اور غزنوی صاحب ایک ہفتہ ان کے اہل خانہ کے انتظار میں خانسپور رکے۔ اس دوران ہم نے لوئر ٹوپہ کا سفر بھی کیا جہاں ان کے ہم زلف کرنل صلاح الدین بہ سلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ ان سے ملاقات اور وائرلیس کے ذریعے پتہ چلا کہ غزنوی صاحب کے اہل خانہ پہنچ رہے ہیں۔ اب ہمارا معمول یہ ہوتا تھا کہ عصر کی نماز کے بعد سیر کو نکل جاتے اور مغرب کی نماز تک سیر کرتے۔ غزنوی صاحب کو پہاڑوں سے طبعی مناسبت تھی، وہ ہر سال پہاڑوں پر ضرور جاتے اور چند روز وہاں قیام کرتے۔ جب سیر کو جاتے تو غزنوی صاحب بہت سی باتیں کرتے۔ پند و نصائح کے ساتھ ہنسی مذاق بھی رہتا، وہ مجھ پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔

ایک روز ہم سیر کو نکلے تو باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھا: بھئی کیا کچھ پڑھا ہے؟ (وہ میری تعلیم کے بارے میں جانتے تھے صرف ڈویژن پوچھنا چاہتے تھے) میں نے عرض کیا: حضرت ایم اے عربی اور ایم اے اسلامیات.....!

کہنے لگے: ایم اے اسلامیات میں ڈویژن کون سی ہے؟ عرض کیا: فرسٹ ڈویژن۔ فرسٹ ڈویژن کا لفظ سن کر ان کا چہرہ کھل اٹھا اور قہقہے کے ساتھ بے ساختہ فرمایا: تو پھر کام بن گیا!

''تو پھر کام بن گیا!'' کا میں بالکل مطلب نہ سمجھ پایا۔ نہایت ادب سے عرض کیا: حضرت میں کچھ سمجھا نہیں۔ کہنے لگے: ہمارے ہاں یعنی شعبہ علوم اسلامیہ انجینئرنگ یونیورسٹی (لاہور) میں، اسلامیات کے اساتذہ کی بھرتی کے لئے دو پوسٹیں پیدا ہو رہی ہیں اور یونیورسٹی ٹیچر کے لئے متعلقہ مضمون میں فرسٹ ڈویژن ہونا ضروری ہوتا ہے اور یہ شرائط آپ پوری کرتے ہیں، اس لئے آپ کو ہم اپنے شعبے میں رفیق کار کے طور پر رکھیں گے۔ یہ بات سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی، اس محسن کے ساتھ جن کی صحبت میں 1961ء سے اب تک چودہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا، اب مجھے ان کے رفیق کار ہونے کا بھی موقع مل جائے گا۔

یونیورسٹی میں غزنوی صاحب کے پاس میرا آنا جانا تھا۔ ہر جمعرات کو مجلس کے ذکر میں حاضر ہوتا اور پھر ٹریننگ کے لیے مجھے دو سال یعنی 1973ء، 1974ء ستمبر تک جز وقتی استاد بھی رکھا۔ یہ سب ان کی شفقت اور اعتماد تھا جو وہ بندہ عاجز پر کرتے تھے۔

ان کے اہل خانہ خانپور پہنچے تو مجھے پند و نصائح کے ساتھ روانہ کیا اور کہا: اب آپ لاہور جائیں، لاہور میں ملاقات ہوگی اور باقی پروگرام وہیں بنائیں گے۔ البتہ ایک ضروری وظیفہ کرنے کو بتایا کہ ہر روز "حسبی اللہ ونعم الوکیل" 313 دفعہ اول وآخر درود شریف کے ساتھ پڑھا کریں اور اس پر استمرار کریں۔

اب میں واپس لاہور آیا تو بتائی ہوئی تعداد سے زیادہ بار بار پڑھنے لگا کہ سب کام جلدی اور آسانی سے ہو جائیں۔ جب غزنوی صاحب واپس تشریف لائے تو ملاقات پر سب سے پہلے وظیفے سے متعلق پوچھا کہ کیسا چل رہا ہے؟ عرض کیا: حضرت میں تو لاتعداد دفعہ پڑھتا ہوں۔ سن کر بڑے منطقی طریقے سے سمجھایا کہ بھئی یہ وظائف روحانی غذا ہوتے ہیں اور اگر ان کو Over Doze کر لیا جائے تو بجائے فائدے کے نقصان ہو سکتا ہے۔ جتنا آپ کو بتایا تھا اتنا ہی پڑھا کرو اور آئندہ یہ بات پلے باندھ لو کہ جس طرح ڈاکٹر کہے اسی طرح دوا استعمال کیا کرو۔

③ 1975ء کے آخر میں ایک دن اپنے شعبہ علوم اسلامیہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں دوپہر کو میں، غزنوی صاحب، چودھری عبدالحفیظ، حافظ محمد ایوب چائے پی رہے تھے۔

یہاں یہ بھی بتا دوں کہ یونیورسٹی میں مجھے وہ اپنے رفیق کار (Coeque) سے زیادہ اپنا عزیز اور بھائی سمجھتے تھے۔ دوپہر کی چائے اور خورد ونوش کا انتظام میرے ذمے تھا اور ٹھیک گیارہ بجے وہ اپنے خاص لہجے میں آواز دیتے:

''یحییٰ''...

میں ان کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ گیارہ بجے کھانے پینے کی تمام چیزیں سجا کر پیش کرتا تو نہایت خوش

ہوتے۔ چائے میں ہمارے شعبے کے تمام اساتذہ شامل ہوتے تھے۔

ایک دن فرمانے لگے کہ ملک غلام نبی نے جو اس وقت وزیر تعلیم تھے، مجھے کہا ہے کہ ہم آپ کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا وائس چانسلر مقرر کرنے لگے ہیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ بھائی میں عزت پسند آدمی ہوں۔ ان ہنگاموں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میرا کام کرنے کا ایک انداز ہے اور وہ میں اپنے انداز سے کر رہا ہوں۔ مگر اصرار ان کی طرف سے زیادہ ہے، کیا کرنا چاہیے؟ گویا کہ یہ ہم لوگوں سے ایک مشورہ لیا جا رہا تھا جو ان کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم سب نے بیک زبان عرض کیا! حضرت اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتے ہیں، آپ یہ پیش کش قبول فرمالیں۔ چونکہ وہ ہمیں اپنے دست و بازو سمجھتے تھے، اس لیے کہنے لگے: کام مشکل ہے، لیکن اگر آپ لوگوں کی ہمدردیاں اور دعائیں شامل حال رہیں تو سب آسان ہو جائے گا۔

چنانچہ بعض شرائط کے ساتھ انہوں نے یہ عہدہ قبول کر لیا اور باقاعدہ یونیورسٹی کا انتظام و انصرام سنبھالنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ ملک کے نامور اساتذہ کو چن چن کر اور منہ مانگی تنخواہیں دے کر یونیورسٹی میں جمع کیا۔ ان اساتذہ میں پروفیسر غلام احمد حریری، عبدالحیٔ صدیقی اور بشیر احمد صدیقی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ یونیورسٹی کے لئے باقاعدہ نیو بغداد کیمپس کے لئے وسیع و عریض قطعہ ارض حاصل کیا اور نئے کیمپس کی بنیاد رکھی، جو اب اللہ کے فضل و کرم سے عظیم بلڈنگ کی شکل میں تمام تدریسی شعبوں اور رہائشی عمارات پر مشتمل ہے۔

اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے قیام کے دوران 1976ء کے مارچ کے آخر میں وہ لاہور تشریف لائے۔ خطبہ جمعۃ المبارک دار العلوم تقویۃ الاسلام میں ارشاد فرمایا۔ نماز جمعہ کے بعد پروفیسر خواجہ غلام صادق صاحب کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی طلبا یونین کے عہدے دار دار العلوم کی لائبریری میں ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ اس ملاقات میں بندہ عاجز، حافظ محمد ایوب اور ڈاکٹر محمد راشد رندھاوا بھی موجود تھے۔

پروفیسر خواجہ صادق صاحب پنجاب یونیورسٹی (لاہور) میں شعبہ فلاسفی کے سربراہ تھے۔ اردو بازار لاہور میں ان کی رہائش تھی اور جمعہ باقاعدگی سے دار العلوم تقویۃ الاسلام میں ادا کرتے تھے اور اسلامیہ کالج سول لائن میں ابوبکر صاحب کے رفیق کار تھے اور Dean کے عہدے پر فائز تھے۔ ابوبکر صاحب اور خواجہ صادق صاحب آپس میں گہرے دوست تھے اور ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے تھے۔ آج جب یونین کے عہدے داروں نے غزنوی صاحب کو یونین کے افتتاحی اجلاس اور اپنے اپنے عہدوں کا حلف لینے کے لیے دعوت دی تو ان دنوں وہ بہت مصروف بھی تھے اور کچھ علیل بھی تھے۔ لیکن ان کے وہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں جو اس وقت انھوں نے فرمائے: ''خواجہ صادق صاحب جیسے پیارے دوست کی دعوت کو کس طرح رد کر سکتا ہوں۔''

خواجہ صادق صاحب اس وقت پنجاب یونیورسٹی طلبا یونین سرپرست اعلیٰ تھے جو طلبا کے ساتھ دعوت دینے کے

لئے آئے اور ابوبکر صاحب کو مہمان خصوصی اور حلف لینے کے لئے عرض کیا۔ حلف برداری کی تقریب آئندہ پیر منگل کو ہونی تھی۔ غزنوی صاحب نے ڈاکٹر راشد صاحب اور ہم لوگوں سے مشورہ لیا اب واپس بہاول پور جاؤں یا لاہور ہی میں رک جاؤں؟ ڈاکٹر راشد صاحب نے مشورہ دیا کہ صرف ایک دن بروز ہفتہ Working day ہے۔ لمبا سفر ہے۔ آپ لاہور میں پیر تک رک جائیں۔

ڈاکٹر راشد صاحب کے مشورے کے مطابق بہاول پور جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

جمعۃ المبارک ہی کو مولانا کوثر نیازی کی طرف سے جو اس وقت وزیر مذہبی امور تھے، اسلامک فیسٹیول (لندن) میں شمولیت کے لئے دعوت نامہ موصول ہوا تھا، جس میں غزنوی صاحب کو شمولیت اور وہاں تقریر کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس میلے میں شمولیت کی دعوت اور مقالہ پڑھنے کے علاوہ کسی اور پروگرام وغیرہ کا پتہ نہ تھا۔ اب پنجاب یونیورسٹی طلبا یونین کی حلف برداری کی تقریب کی دعوت قبول کرنے کے بعد ڈاکٹر راشد صاحب کے کلینک میں بندہ عاجز، حافظ ایوب اور ڈاکٹر راشد، ڈاکٹر صاحب کی گاڑی میں پہنچے تاکہ ٹیلی فون کے ذریعے اسلام آباد سے لندن میں منعقد ہونے والے اسلامی فیسٹیول کے پروگرام کا پتا کیا جائے۔ ان دنوں دار العلوم میں غزنوی صاحب کا ٹیلی فون عارضی طور پر منقطع تھا۔ وزارت مذہبی امور سے رابطہ کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ منگل کے روز شام ساڑھے سات بجے کی فلائٹ سے انگلینڈ روانہ ہوں گے۔ اپنا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ فوری طور پر بھیج دیجئے تاکہ ویزے وغیرہ کا بندوبست کیا جا سکے۔

اب پھر مسئلہ پیدا ہوا کہ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ تو بہاول پور میں سیف کے اندر پڑے ہیں، وہاں سے کس طرح اسلام آباد پہنچائے جائیں اور اپنے کس بااعتماد آدمی کو بہاول پور بھیجا جائے جو وہاں سے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ لائے۔ اس آدمی کو غزنوی کے صاحب زادے جنید اور حماد بھی جانتے ہوں اور گھر میں کام کرنے والی ملازمہ بھی اس سے واقف ہو (وہ ملازمہ ضلع سرگودھا سے تعلق رکھتی تھی) چونکہ میرا غزنوی صاحب کے گھر آنا جانا تھا اور میں غزنوی صاحب کا پرسنل سیکرٹری ہوتا تھا، دار العلوم کے دفتر کی نظامت بھی میرے سپرد تھی، اس لئے مجھے حکم دیا گیا کہ آپ آج ہی کسی وقت بہاول پور روانہ ہو جائیں۔ چنانچہ میں اسی روز 4 بجے کی ٹرین سے بہاول پور روانہ ہو گیا۔ رات کے تقریباً ایک بجے بہاول پور پہنچا اور سید ھاوی سی ہاؤس گیا۔ ملازمہ نے مجھ سے کھانا وغیرہ پوچھا۔ لیکن میں ٹرین میں کھانا کھا چکا تھا، اس لئے آرام کرنے کے لئے کہا تو فوراً بستر وغیرہ لگا کر علیحدہ کمرے میں مجھے آرام کرنے کو کہا اور ساتھ ہی کہا کہ صبح میں ناشتہ تیار کر دوں گی اور پاسپورٹ اور شناختی کارڈ بھی نکال دوں گی۔ چنانچہ علی الصبح میں اٹھا، غسل کر کے ناشتہ کیا، ڈرائیور نے جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا، یونیورسٹی کی گاڑی میں مجھے ریلوے اسٹیشن پہنچایا۔ چونکہ کوئی سیٹ وغیرہ ریزرو نہ تھی اس لیے ڈرائیور نے مجھے پولیس کے ایک ڈبے میں بٹھا دیا اور میں اسلام آباد کے لئے روانہ ہو گیا۔ حافظ محمد زاہد نے مجھ سے کچھ کاغذات لاہور ریلوے سٹیشن سے لینا تھے جو کہ اسی روز غزنوی صاحب کو پہنچانا تھے۔ میں لاہور تقریباً ڈیڑھ

بجے پہنچا۔ حافظ زاہد ریلوے پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ میں نے ان کو وہ کاغذات دیے اور پاسپورٹ اور شناختی کارڈ لے کر راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ سوئے اتفاق سے گوجرانوالہ اور راہوالی کے درمیان ریل کا انجن فیل ہو گیا اور گاڑی راہوالی اسٹیشن پر رک گئی۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد لاہور سے دوسرا انجن پہنچا اور گاڑی راولپنڈی کے لئے روانہ ہوئی۔ میں بروز ہفتہ تقریباً بارہ بجے راولپنڈی پہنچا۔ اب اسلام آباد جانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ رات ہو چکی تھی اور دفاتر بند تھے۔ چنانچہ میں اپنے عزیزوں کے ہاں رات بسر کرنے کے لئے چلا گیا۔ اگلے روز علی الصبح وزارت مذہبی امور میں ٹیلی فون کیا۔ اس دن اتوار تھا۔ جواب ملا کہ آج اتوار کو بھی دفتر کھلا ہے۔ آپ غزنوی صاحب کا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ لے کر فوراً دفتر وزارت امور اسلام آباد پہنچ جائیں۔ میں جب دفتر پہنچا اور استقبالیہ سے پوچھا تو انھوں نے متعلقہ آدمی سے رابطہ قائم کیا۔ رابطہ کار آفیسر نے جواب دیا کہ ہمارا آدمی باقی مندوبین کے پاسپورٹ وغیرہ لے کر ویزے کے لیے روانہ ہو گیا ہے۔ وہ جب استقبالیہ پر پہنچے تو اسے روک لینا، لیکن مسٹر یحییٰ کو فوراً اندر بھیج دو۔ ویزے لگوانے والے کو روک لیا گیا اور جب میں اندر پہنچا تو متعلقہ افسر نے مجھ سے کہا: اگر پانچ منٹ لیٹ ہو جاتے تو غزنوی صاحب کا ویزا نہ لگ سکتا۔

میں نے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ متعلقہ آدمی کے سپرد کیا۔ پروگرام کی ایک کاپی لی اور فارغ ہو کر واپس عازم لاہور آ گیا۔ تقریباً دو اڑھائی بجے لاہور دار العلوم پہنچا۔ سارا پروگرام غزنوی صاحب کو بتایا اور اسی شام کی فلائٹ پر جانے کو کہا تو مجھے کہنے لگے: تم فوراً گھر جاؤ اور آرام کرو۔ بڑا لمبا سفر کیا ہے۔ ساڑھے پانچ یا چھے بجے آنا، پھر باتیں کریں گے۔

میں ساڑھے پانچ بجے حاضر ہوا۔ میرے سفر پر بڑے خوش ہوئے کہ سارے کام بہ طریق احسن انجام پائے، البتہ ایک چیز دیکھ کر خفا ہوئے۔ وہ یہ تھی کہ میں نے لاہور سے بہاول پور اور بہاول پور سے اسلام آباد کا سفر تھرڈ کلاس میں کیا تھا۔ فرمانے لگے: ''آپ کو کس کافر نے کہا تھا کہ تھرڈ کلاس میں سفر کریں۔ آپ کی تو Intitle ment فرسٹ کلاس کی ہے۔ فرسٹ کلاس آفیسر ہیں، کیا دار العلوم آپ کو فرسٹ کلاس کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا۔ اب آپ نے آئندہ کبھی تھرڈ کلاس میں سفر نہیں کرنا، ہمیشہ فرسٹ کلاس میں سفر کرنا ہے۔''

ان کے الفاظ میں ہمدردی اور شفقت بھی تھی اور خوشی بھی۔ اب دار العلوم میں کچھ کام کرنے والے اور گھر میں دروازے وغیرہ اور تالوں کی تاکید کی اور کچھ لباس اور سامان پیک کرنے کو کہا۔ ہر قسم کی تیاری ہو گئی تو ڈرائیور جس کا تعلق بلتستان سے تھا (نام مجھے یاد نہیں) گاڑی تیار کر کے دار العلوم کے دروازے پر کھڑا تھا۔ غزنوی صاحب نے مجھے ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ پچھلی سیٹ پر محمد یعقوب کو جو ان کا خادم تھا اور اب بھی دار العلوم میں رہتا ہے، اپنے ساتھ بٹھا کر ڈرائیور سے کہا کہ ائیر پورٹ چلو۔ اب ہم چار افراد کا قافلہ لاہور ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔

مجھے غزنوی صاحب کے معمولات کا پتہ تھا۔ وہ پان کھایا کرتے تھے اور میں لا کر دیتا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو اشارہ کیا کہ الفلاح بلڈنگ کے پاس رکے تاکہ دو چار پان پیک کروا کر انھیں دے دوں۔ راستے میں کھا لیں گے۔ جب گاڑی رکنے لگی تو انھوں نے رکنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے عرض کیا: حضرت! پان لینے کے لیے روکی ہے۔ اپنے خاص انداز میں فرمایا: ''آپ کی معلومات کے لیے بتا دوں کہ میں نے پان کھانا چھوڑ دیا، چلتے رہو۔'' چنانچہ ہم ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ پر اس روز دبئی سے فلائٹ آئی تھی۔ اس زمانے میں جب دبئی سے فلائٹ آتی تھی تو لاؤنج میں کسی دوسرے کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ میں سامان اٹھائے جب ساتھ جانے کے لیے اندر داخل ہوا تو سیکورٹی والوں نے مجھے Sorry کہہ کر روک لیا۔ غزنوی صاحب نے کہا: یہ میرے سیکرٹری ہیں، مگر انھوں نے معذرت کی۔ چنانچہ سامان لے کر خود اندر داخل ہوئے۔ میں اور یعقوب دوسری طرف سے جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو کر دیکھنے لگے کہ وہ جہاز پر جائیں تو سلام کریں۔ جب ہم جنگلے کے قریب پہنچے تو چودھری عبدالحفیظ اور حافظ ایوب صاحبان بھی پہنچ گئے۔ ان کی آخری ملاقات جنگلے کے پار سے ہوئی۔ ہم سب نے ان کو الوداعی سلام کیا اور وہ جہاز میں سوار ہو کر انگلینڈ کی وادیٔ موت کو روانہ ہو گئے اور ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے۔ پھر ان کی میت (Dead boady) لاہور پہنچی تو بے پناہ مخلوقِ خدا تھی جو چہرہ دیکھنے اور جنازہ پڑھنے کے لئے امڈی چلی آ رہی تھی۔ [1]

[1] قافلۂ حدیث (ص:136)

اخلاص وایقان کی شمعیں

تحریر: مولانا محمد صدیق اعظمی، بدھوآنہ ضلع جھنگ

محترم استاذی المکرم مولانا عبدالحمید صاحب جھنگوی علیہ الرحمۃ ان صالحین میں سے تھے جن کی مجلس ہمیشہ روحانی طمانیت سے لبریز رہتی۔ آپ بے حد اثر وسوز والے بزرگ تھے۔ آپ کے باعث ضلع جھنگ کے ویرانوں میں صدائے حق بلند ہوئی۔ آپ جب کبھی اپنے تعلیمی دور کا ذکر کرتے تو سننے والے کے دل ودماغ قوتِ ایمانی سے معمور ہو جاتے اور سلسلہ مبارک میں ایک بات پورے وثوق سے فرمایا کرتے تھے کہ جو کیفیت روح کی بیداری کی حضرت امام عبدالجبار غزنوی علیہ الرحمۃ سے بیعت ہوتے وقت طاری ہوئی وہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس وقت سے مشکوک روٹی سے نفرت آنے لگی اور بری مجلس سے بھی دل بیزار ہوگیا۔ یہی بیان کئی اور بزرگوں نے بھی فرمایا جو خاندانِ غزنویہ کے اکابر سے مستفیض ہوئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاصہ انہیں شروع سے حاصل ہے۔

حضرت مولانا سید عبداللہ الغزنوی علیہ الرحمۃ ایک دفعہ قرآن پاک کا درس دے رہے تھے کہ اچانک اپنے رومال سے ناک وچہرہ ڈھانپ لیتے ہیں۔ طالبانِ درس اس سے حیران ہوجاتے ہیں۔ خدا جانے یہ کیا معاملہ ہے۔ اتنے میں حاکمِ وقت کا قاصد بہت سارے تحفے لے کر حاضر خدمت ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے جناب یہ شاہی تحائف ہیں قبول فرما لیں۔ آپ نے فرمایا: ان کو اسی جگہ رکھ کر چلے جایئے۔ اس کے بعد طلبا کو حکم دیا کہ گڑھا کھود کر ان کو دفن کرو۔ پھر فرمایا: یہ شاہی مال ومتاع جو ظلم وجور سے حاصل کیا گیا ہے ان کی بدبو مجھے پہلے محسوس ہوگئی تھی جس کے باعث میں نے اپنا چہرہ رومال سے چھپالیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ جن کے قلوب رضائے الٰہی سے معطر رہتے ہیں ان کو اللہ رب العزت ضرور ایسی الائشوں سے بچالیتا ہے۔ اللہ اکبر کبیرا۔

سنتِ طاہرہ کی فدائیت وعمل پیرائی میں آپ کا یہ حال تھا کہ اس سلسلہ میں نہایت ہولناک شدائد کو بھی خوشی خوشی برداشت کرلیتے تھے۔ ایک بار آپ کو تمام فرزندانِ ارجمندان سمیت گرفتار کرکے کابل کے ایک صوبے دار عمر خاں کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ شخص نہایت شقی القلب تھا، اس نے آپ سے پوچھا: حضرت صاحب آپ دوسرے مولویوں کی طرح عبادت کیوں ادا نہیں کرتے۔ اس طرح آپ ہمیشہ مشکلات ومصائب سے دوچار رہتے ہیں۔ یہ طریقہ آپ چھوڑ دیں ورنہ توپ چلا کر اڑا دوں گا۔ آپ نے اس وقت پوری قوتِ ایمانی سے جواب دیا: میں کتاب وسنت کو کیسے چھوڑ دوں جبکہ مجھے اللہ رب العزت کی طرف سے اس بات کا کئی بار القا ہوا ہے: یا عبدی ھذا کتابی وھؤلاء عبادی اقرأ کتابی علی عبادی۔ اس لیے میں نے محکم ارادہ کرلیا ہے کہ جب تک جان میں جان ہے اس راہِ حق سے کبھی نہ

پھروں گا۔ یہ شدائد و آزمائشی مراحل کیا ہیں۔ خدا کی قسم اگر میری سوجانیں ہوں تو مالک الملک کی رضا پر قربان کردوں گا اور اگر میں بالکل پارہ پارہ کر دیا جاؤں اور میری آنتیں درختوں کی شاخوں پر ڈال دی جائیں۔ مرغ ہائے صحرا چونچیں مار مار کر کھا جائیں تو میں اس پر بھی لذت یاب ہوں گا۔ واقعی حب الٰہی کی صداقت اپنے متلاشیوں کو اسی طرح تڑپا دیتی ہے۔

تنم بسوخت دلم بسوخت استخوانم بسوخت
تمام سوختم و ذوقِ سوختن باقیست ①

شیخ العرب والعجم استاذی المحترم جناب حافظ محمد صاحب گوندلوی مدظلہٗ العالی نے ایک دن اپنے سلسلہ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب میں امرتسر مدرسہ غزنویہ میں داخل ہوا تو صرف تین دن میں حضرت الامام کی مجلس کا میرے دل پر اتنا اثر ہوا کہ میں سوچنے لگا جو لوگ مدت سے آپ کی خدمت میں رہتے ہیں وہ تڑپ تڑپ کر مرکیوں نہیں جاتے۔

یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ سرزمین پنجاب کا گوشہ گوشہ جو نغمہ قال و تصفیہ حال سے شاد باد ہے، یہ خاندانِ غزنویہ کی سرمستانہ و رضا جویانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ دارالعلوم ماموں کانجن کانفرنس جو مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ہوئی تو اس میں خاص کر غزنویہ کے گل سرسبد سید ابوبکر غزنوی علیہ الرحمۃ کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس دفعہ حاضرین کی خاصی تعداد صرف آپ کے ارشادات سے استفادہ کے لیے آئی ہوئی تھی۔ پوری جماعت کی نظریں آج آپ پر مذکور تھیں کہ کس انداز سے آپ تقریر کریں گے۔ کیونکہ ایسے عظیم اجتماع سے آپ پہلی بار خطاب فرمانے والے تھے۔ آپ کھڑے ہوئے تو مجمع پر کامل سکوت طاری ہوگیا۔ خطبہ مسنونہ سے آپ دلوں پر چھا گئے پھر جب اپنے آباء واجداد کی خدمات دینیہ کا سوز بھرا تذکرہ چھیڑا تو سامعین کی آنکھیں اشک بار تھیں آپ کی آواز بھرا گئی۔ بالخصوص جب آپ نے بزرگوار حضرت والد ماجد سید داؤد صاحب غزنوی رحمہ اللہ کی وفات حسرتِ آیات کا قصہ درد شروع کیا تو پورا مجمع سے سسکیوں اور آہوں کی صدائیں اٹھ رہی تھیں۔

آپ فرما رہے تھے جب مجھ سے میرے مشفق باپ کا سایہ رحمت اٹھ گیا میں گھر کی چار دیواری میں بے ساختہ روتا رہا۔ میں نے محسوس کیا آج میرا باغ وراثت اجڑ گیا ہے۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا کہ ذمہ داریوں کا ایک کوہِ گراں مجھ پر آ پڑا ہے۔ پھر آپ نے مومنانہ گرج و گونج میں فرمایا: آج میں عہد کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ جہاں میرے خاندان کے اکابرین نے دین کے جھنڈے گاڑے ہیں وہاں میں اپنی جوانی، اپنا خون اور گوشت و ہڈیاں تک قربان کردوں گا۔ خدا جانے یہ آپ کے الہامی جملے کس قدر حقیقت آشنا تھے کہ واقعی یہ شہبازِ اسلام، ذکر و فکر

① جسم و دل اور میری ہڈیاں جل گئی ہے، سب کا سب جل گیا ہوں لیکن جلنے کا ذوق باقی ہے۔

کا تاجدار، اخلاص و رضا کا پیکر اپنے بدر و شباب کو اور جملہ توانائیوں کو اپنے قولِ حق کے مطابق نثار کر کے ہم بے نصیبوں سے اتنی جلدی جدا ہو جائے گا۔ آہ آج جماعت کا ہر فرد حیران و ششدر ہے کہ وہ اقلیمِ غزنویت کا شہزادہ کہاں ہے جس کے دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں ترستی تھیں، جس کے علم و عمل پر ہم نازاں تھے۔ وہ ہمارا عظیم راہنما تھا جس کے اٹھ جانے سے جماعت یتیم ہو کر رہ گئی۔

آپ نے جب ''توحید'' اخبار کا اجراء فرمایا، اس سے لاکھوں فرزندانِ توحید کی طرح مجھے بھی بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے اس وقت جذبۂ حقیقت سے مخمور ہو کر اپنی کم علمی و بے عملی کا عجیب طرح سے مظاہرہ کیا کہ اتنے بلند مقام و معیاری پرچہ کے لیے بالکل سادہ قسم کے مضمون لکھنے شروع کر دیئے جو آپ کمال شفقت سے شائع فرما دیتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مضمون میں نے اسلاف کرام پر لکھا جس کا عنوان تذکرہ اسلاف تھا۔ مگر آپ نے اس کا عنوان تبدیل کر کے ''اخلاص وایقان کی شمعیں'' تجویز فرما دیا اور پھر آپ نے ذوقِ محبت سے اس پر نہایت بھرپور تبصرہ بھی فرما دیا جو میرے لیے اب وہ مایہ افتخار ہے۔ آپ بھی ان کے محبت بھرے الفاظ سن لیں کس طرح آپ نے ہماری سطحی کیفیت کو بے نقاب فرمایا ہے۔ آپ نے لکھا:

> ''دین اور اسلام کے نام لیوا بفضلہٖ بڑی کثرت سے ہیں، کوئی گوشہ نہیں جہاں سے حق وصداقت کی آواز بلند ہو رہی ہو۔ وعظ وارشاد کی مجلسیں اسلام کے احیاء کا نعرہ پیشانی پر سجائے صحائف ورسائل کا ایک لشکر اونچی اونچی پرشکوہ مساجد کی فضاؤں میں گونجنے والے بلند آہنگ اسلامی خطبات اور قرونِ اولیٰ کی سادگی اور قناعت کے پیکر معلمین اور متعلمین، کیا ہے جس کی اپنے ہاں کمی ہو۔ لیکن ساز وسامان کی اس فراوانی اور لاؤ لشکر کی اس کثرت کے باوجود ہماری زندگیوں میں اسلام کو غلبہ کہیں حاصل نہیں، ہر طرف کفر والحاد کی حکمرانی ہے؟ آخر کیوں؟ جواب زیادہ مشکل نہیں۔ ہماری سرگرمیاں وسعت اور مقدار میں بہت ہیں لیکن ایقان واخلاص کی روح سے خالی ہیں اس لیے بے جان اور بے اثر ہیں۔ جن کے ہاں اور کچھ بھی نہیں تھا صرف اخلاص اور ایمان ہی ان کی پونجی تھی۔ انہوں نے بالکل بے سروسامانی اور انتہائی ناسازگار حالات میں بھی رشد وہدایت کی ایسی شمعیں فروزاں کیں کہ دلوں کی سلطنتوں پر نور کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ مولانا محمد صدیق اعظمی نے اس مضمون میں قریب ترین عہد کی تاریخ کے چند درخشاں ابواب کی طرف اشارے فرمائے ہیں۔''[1]

اللہ رب العزت آپ کو جوارِ رحمت میں شاداں وفرحاں فرمائے اور اس خاندان کے ورثاء میں ایسے چشم وچراغ پیدا کرے جو ہمیشہ اپنے اکابر کے نقوشِ روحانی کو اجاگر کر سکیں۔ آمین ثم آمین۔[2]

---

[1] توحید: 13 مئی 1966ء

[2] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

خاندانِ غزنویہ کا درخشندہ ستارہ

تحریر: مولانا عبدالرشید حنیف

1857ء کا دور مسلمانوں کے لیے بڑا کٹھن تھا لیکن علماءِ حق کا ایک گروہ اس دور میں بھی شمعِ اسلام کو فروزاں کرنے میں پیش پیش رہا۔ اسی گروہ میں علماءِ غزنوی کا حظ وافر تھا۔

غزنوی خاندان کی تاریخ سازی کا آغاز سید عبداللہ غزنوی سے ہوتا ہے۔ موصوف نے کتبِ متداولہ کی تعلیم غزنی کے علماءِ حق سے حاصل کی اور علوم حدیث کی تعلیم شیخ الکل میاں نذیر حسین دہلوی سے حاصل کی۔ غزنی میں کتاب وسنت کی تبلیغ کی پاداش میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ہندوستان میں امرتسر کو عقائدِ صحیحہ کی اشاعت اور تبلیغ کا ایک ایسا مرکز بنایا جو عوام الناس کی روحانی غذا و فیوض کا باعث بن گیا۔

سید صاحب کی علمی اور عملی زندگی نے امرتسر کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے، آپ کے عقیدت مندروں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ عوام الناس کو جس چیز نے متاثر کیا وہ سید صاحب میں تعلق باللہ کی لگن اور خشوع وخضوع سے نماز کی ادائیگی تھی۔ سید صاحب 1298ھ میں رحلت فرما گئے۔

جانشین:

سید صاحب کے دینی منصب پر آپ کا بیٹا عبداللہ ثانی جانشین بنا۔ موصوف اپنی مثال آپ تھا۔ عبداللہ ثانی کا انتقال 1300ھ میں ہوا۔

دورِ ثالث:

سید عبدالجبار غزنوی خاندانِ غزنویہ میں علمی اور عملی سورج تھے جس کی روشنی صرف پنجاب ہی نہیں بلکہ ہندوستان سے دیارِ غیر میں پوری وسعت سے پھیل چکی تھی۔ مولانا موصوف زہد وتقویٰ اور ریاضت میں امتیازی مقام پر فائز تھے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے بھی ایک مقام پر عجیب انداز سے تذکرہ کیا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی زبان سے ایک واقعہ سنا ہے کہ مولانا عبدالجبار غزنوی علی الحیاۃ، روزانہ قرآن کا درس دیتے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی ان کی زندگی میں ایک مرتبہ امرتسر تشریف لے گئے۔

مولانا شبلی اگرچہ علوم و فنون میں درک رکھتے تھے مگر ان چیزوں سے انہیں زیادہ شغف نہیں تھا، جب مولانا غزنوی کے درس سے واپس آئے تو کہنے لگے! کہ یہ شخص جب اللہ کہتا تھا تو دل چاہتا تھا کہ سر اسی کے قدموں پر رکھ دوں، یہ تھا ان لوگوں کا تعلق باللہ کا حال۔ (1)

کرامت:

مولانا عبدالجبار غزنوی کی یوں تو بے شمار کرامات ہیں۔ ملک احمد نمبر دار فیروز وٹوآں نے اپنی مرض کا ذکر کیا کہ اٹھارہ برس کی عمر میں گنٹھیا کا مریض تھا، میرے والد صاحب نے بے شمار علاج کرائے لیکن مرض بڑھتا گیا۔ بالآخر میرے والد صاحب مجھے امرتسر میں مولانا عبدالجبار غزنوی صاحب کے پاس لے گئے۔ میرے والد صاحب نے مجھے مرض کی حالت میں صحن میں رکھا اور خود جماعت میں شریک ہو گئے۔ والد صاحب نے آگے بڑھ کر درخواست دعا کی۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے جیسے وہ دعا مانگ رہے تھے یوں احساس ہوتا تھا جیسے مرے جوڑوں کی بندش کھل رہی ہے۔ تین دن ہم وہاں رہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں تندرست ہو کر واپس آیا۔ اب جسمانی حالت کے ساتھ ہماری روحانی دنیا بھی بدل چکی تھی!

مدرسہ غزنویہ:

1319ھ میں مسجد غزنویہ میں ''تقویۃ الاسلام'' دارالعلوم کا اجراء کیا گیا۔ مدرسہ مذکور میں خالص قرآن کی تعلیم وتدریس کا اہتمام کیا گیا۔ جس سے فارغ التحصیل علماءِ دینِ حق کی تبلیغ میں سرشار ہوتے تھے۔

1331ھ میں مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغِ دین کی ذمہ داری کو خوب نبھایا۔ پھر مولانا سید داؤد غزنوی صاحب نے دارالعلوم ''تقویۃ الاسلام'' کو بڑی مستعدی اور ذوق و شوق سے چلایا۔ اس دور میں تدریسِ قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ تبلیغ کا بھی سلسلہ جاری رکھا۔

تحریکِ آزادیٔ وطن میں بھی دلچسپی لی اور کمالِ خطابت سے امرتسر میں امتیازی مقام پیدا کیا۔ 1919ء میں تحریکِ خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔ 1921ء میں جمعیت علماء ہند کی تشکیل میں مؤثر کردار ادا کیا، تین سال میانوالی جیل میں رہے۔ 1925ء میں دوبارہ گرفتار کر لیے گئے۔ یکم اپریل 1927ء میں امرتسر سے ہفتہ وار رسالہ ''التوحید'' کا اجراء کیا۔ 1929ء میں چند احبابِ خلافت کو لے کر مجلسِ احرار کی بنیاد ڈالی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے اشتراک وتعاون سے مجلسِ احرار کی نظامت کو اڑھائی برس تک خوش اسلوبی سے چلایا۔ 1931ء میں تحریکِ کشمیر کی وجہ سے گرفتار ہوئے۔ 1943ء میں کانگرس میں شریک ہوئے۔

---

(1) اہل حدیث اور سیاست، مرتبہ: مولانا نذیر احمد رحمانی صاحب، مطبوعہ جامعہ سلفیہ بنارس، ص: 18

1947ء میں تقسیمِ ملک کے بعد جماعتِ اہلحدیث کی تنظیم، جماعت کی رکن سازی، مجلسِ شوریٰ کا قیام، دستورِ جماعت اہلحدیث کی ترتیب، مسجد اہلحدیث کی تعمیر، مدارسِ اہلحدیث کا اجراء، دعوتِ اہلِ حدیث کی نشر واشاعت کے لیے سالانہ کانفرنس اور مجالس کا انعقاد، ''الاعتصام'' کا اجراء، تادمِ حیات اہلِ حدیث کے منصبِ امامت پر فائز رہے۔ مولانا غزنوی نے تحریکِ ختم نبوت میں بھی خوب حصہ لیا۔ 1958ء میں مارشل لاء کے خلاف آوازۂ حق بلند کیا۔ 1960ء میں سابق صدر ایوب خان نے ملک میں آئندہ دستور کے لیے آئین کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن کی طرف سے چالیس سوالات پر مشتمل ایک سوالنامہ مرتب کیا گیا تھا، اس ضمن میں 19 علماء کو اکٹھا کر کے جواب کا مسودہ تیار کیا اور مکمل جمہوریت اور اسلامی اقدار کے فروغ کا ثبوت دیا۔ 1962ء میں شاہ سعود بن عبد العزیز نے مدینہ یونیورسٹی کی مشاورتی کونسل کا رکن نامزد کیا۔

سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے آباء واجداد کے طریق دعوتِ دین کی اشاعت وتبلیغ میں خوب منہمک رہے۔ زہد و تقویٰ، ذکر واذکار، شب بیداری، نماز میں خشوع وخضوع ہی وراثت بنا رہا اس میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے پائی۔

وفات:

16 دسمبر 1963ء کو رحلت فرمائی۔ غزنوی خاندان کی روایات کے تحت پروفیسر ابوبکر غزنوی کو خاندان کا سربراہ بنایا گیا اور دار العلوم ''تقویۃ الاسلام'' کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی۔ چنانچہ ابوبکر غزنوی ایک مقام پر خود تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت والد علیہ الرحمہ کے بعد دار العلوم کو چلانے کی ذمہ داری اسی بندہ عاجز کو سونپی گئی۔ راقم الحروف اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کی وجہ سے حضرت عبد اللہ غزنوی اور حضرت الامام عبد الجبار غزنوی کی مسند پر بیٹھنے کا اپنے آپ کو کسی طرح بھی اہل نہیں سمجھتا لیکن اس بات کے پیشِ نظر کہ بزرگوں نے کتاب وسنت کا جو فیضان جاری کیا ہے اور مدتوں سے جاری ہے کہیں بند نہ ہو جائے اس ذمہ داری کو قبول کیا۔

فتشبهوا إن لم تكونوا مثلهم
إن التشبه بالكرام كرام

یہ خطا کار آس لگائے بیٹھا ہے کہ رحمتِ خداوندی نقل کو اصل میں تبدیل کر دے۔''[1]

ابوبکر غزنوی اپنے اکابر کا تذکرہ اکثر اپنی تقریروں میں کرتے تھے۔ مجھے ایک دفعہ آپ کے ہمراہ سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ مغرب کی نماز ایک ہی صف میں مل کر ادا کی تو جب سلام پھیرا تو موصوف کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ لنڈن کے ہسپتال میں حکیم سعید دہلوی سے فرمانے لگے: ٹانگیں زخمی ہوئیں ہیں، دل زخمی نہیں ہوا۔ یہ کیفیت تھی تعلق باللہ

---

[1] سیدی وابی صفحہ 456، مطبوعہ لاہور۔

کی۔[1]

اذکارِ مسنونہ:

نماز کے بعد کسی سے بالکل بھی گفتگو نہ کرتے تھے۔ عقیدت و محبت، ادب و احترام کو دینی اتباع اور اطاعت کے نقوش میں ڈھالتے تھے۔

کتب حدیث سے محبت:

ایک دفعہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تشریف لائے، مسجد سے باہر نکلے تو اچانک مسجد کی صفوں پر نگاہ پڑی تو بلا کر کہنے لگے: صف پر بڑی کتاب کون سی ہے اور اوپر کون سی کتب ہیں؟ جواب ملا: مشکوٰۃ المصابیح ہے، تو اس کو بلا کر ہدایت کی کہ قرآنِ مجید کے بعد حدیثِ مصطفیٰ ﷺ کا درجہ ہے، لہٰذا آئندہ ایسی غلطی نہ کریں۔ فوراً مشکوٰۃ کو اونچی جگہ پر رکھو۔

مجلسِ ذکر:

اگرچہ کچھ اہلحدیث کتاب و سنت کی روشنی میں تصوف کے بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں مگر سید صاحب اسے اصلاحِ نفس، تزکیہ نفس اور ریاضت نفس قرار دیتے تھے۔ چنانچہ کالج میں بھی اس سلسلہ کو تاحیات جاری رکھا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک رسالہ ''حقیقتِ ذکر'' کے نام سے خوبصورت طباعت میں عوام الناس کے سامنے پیش کیا جسے حلقۂ احباب نے خوب پسند ہی نہ کیا بلکہ اپنا روحانی علاج سمجھ کر اسے پڑھا۔

تصانیف:

① حقیقتِ ذکرِ الٰہی۔

② اسلام اور آدابِ معاشرت۔

③ اسلام میں گردشِ دولت۔

④ عصرِ حاضر میں استاذ اور شاگرد۔

⑤ اسلامی ریاست کے چند ناگزیر تقاضے۔

⑥ کتابتِ حدیث عہدِ نبوی ﷺ میں۔

⑦ خطباتِ جہاد 1965ء۔

⑧ واقعہ کربلا۔

⑨ اس دنیا میں اللہ کا قانونِ جزا و سزا۔

---

[1] مشرق 8 مئی 1976ء

⑩ قرآنِ مجید کے صوری و معنوی محاسن۔

⑪ محمدی انقلاب کے چند خط و خال۔

⑫ حرزِ اعظم۔

⑬ وظائف کی شاندار کتاب۔

خطابت:

غزنوی صاحب شہسوارِ خطابت تھے۔کلام میں متانت اور سنجیدگی اور وقار کو ٹھیس نہ لگنے دیتے تھے۔حب نبی ﷺ اور حب اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تذکرہ بڑی ایمانی جرأت سے کیا کرتے تھے۔تقریر کا آغاز کرتے وقت فرمایا کرتے تھے کہ میں کچھ سیکھنے آیا ہوں اور دعا کرانے آیا ہوں۔

موصوف نے مسلک اہلحدیث میں راہِ اعتدال کے طریق پر پوری زندگی بسر کر دی۔ چنانچہ ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں:

''مجھے اپنے آباء واجداد کا مسلک عزیز ہے اور اس کے پرچار کو بہت بڑی سعادت سمجھتا ہوں۔ اس مسلک میں اعتدال کا ایک حُسن ہے یہاں بے داغ اور بے لچک توحید بھی ہے، ائمہ کرام اور اولیاء عظام کی غایت درجہ تعظیم وتکریم بھی ہے۔ یہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بے پناہ محبت بھی ہے اور اہلِ بیت سے والہانہ عقیدت بھی، یہاں حدیث صحیح کو ائمہ کرام کے اقوال پر ترجیح دینے کا ذوق بھی ہے اور فقہائے کرام کی مساعی جمیلہ کا حسنِ اعتراف بھی، یہاں شریعت کے ظاہری احکام کا التزام بھی ہے اور تزکیۂ نفس اور روحانیت کا شغف بھی۔''①

خاندانِ غزنویہ کی دینی خدمات میں حمائل غزنوی، مشکوٰۃ غزنوی، فتاویٰ غزنوی، بلوغ المرام غزنوی، ریاض الصالحین غزنوی باقیات الصالحات ہیں۔

سیّد ابوبکر غزنوی جہاں بہترین استاد تھے وہاں بہترین روحانی پیشوا بھی تھے۔ پوری زندگی اسلام کی خدمت کرتے بسر کر دی۔ اسلامی جشن میں شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے۔ افسوس کہ ابھی مقالہ پڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ حادثہ کا شکار ہو گئے۔یہی حادثہ جان لیوا ثابت ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون②

---

① سیدی وابی، ص:214

② ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

اب اُنہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لیکر

تحریر: مولانا حکیم عبدالرحمٰن آزاد

(نگرانِ اعلیٰ ہفت روزہ ادارہ ''الاسلام'' گوجرانوالہ)

تازگی ہے عملِ خیر میں بعد موت
لوگ اب تک تیرے جینے کا گماں کرتے ہیں

لندن کا نہیں سفرِ آخرت تھا:

''حضرت مولانا ابوبکر غزنوی وائس چانسلر بہاولپور یونیورسٹی پاکستان''

جو لندن میں منعقد جشنِ اسلامی کی تقریب میں شرکت کرنے والے وفد کے ممتاز رکن تھے۔ آپ 4 اپریل 1976ء کو لندن پہنچے۔ اسی روز 4، 5 اپریل کی درمیانی شب کار حادثہ میں آپ کی پسلی، دونوں ٹانگیں اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ آپ کو ''ویسٹ منسٹر ہسپتال لندن'' میں داخل کیا گیا۔ جہاں وہ 25 اپریل کو لکھوکھا عقیدت مندوں کو داغ مفارقت دے گئے۔

ان کی لاش بذریعہ طیارہ 29 اپریل لاہور لائی گئی جہاں اڑھائی بجے دوپہر سے رات آٹھ بجے تک آخری دیدار کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ریلوں، بسوں، ہوائی جہازوں کے ذریعہ ملک کے گوشے گوشے سے لوگ لاہور پہنچے۔ یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہزارہا لوگوں نے اشکبار آنکھوں سے نمازِ جنازہ پڑھی اور میانی صاحب کے قبرستان میں مولانا داؤد غزنوی (والدِ حقیقی) کے پہلو میں آپ کو دفن کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

سلسلۂ نسب:

آپ بلند پایہ علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کے جد امجد سلکِ اولیاء میں مروارید حقیقی کی طرح پیوست دکھائی دیتے تھے۔ برصغیر ہند کے مسلمانوں کی محبت بھری چشمِ عقیدت جب بھی کسی عظیم خاندان کے لیے اٹھتی ہے تو ولی اللّٰہی مقدس خاندان کے بعد غزنوی خاندان کی پاکیزہ ضیاء پاشیوں سے لذت محسوس کرتی ہے۔

کیا مبارک ہے ان کا سلسلہ نسب: پروفیسر ابوبکر غزنوی بن مجاہدِ تحریکِ آزادیٔ ہند مولانا محمد داؤد غزنوی بن امام الموحدین مولانا عبدالجبار غزنوی بن امام طریقت مولانا عبداللہ المہاجر غزنوی۔

قومی غیرت تقدیر بن کر نمودار ہوگئی:

سید ابوبکر غزنوی ظاہری و باطنی تطہیر سے آراستہ آئینۂ قلب سے وفاقی وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی کی معیت میں مؤرخہ 4 اپریل کو لندن پہنچے۔ لیکن اس پاکباز، سعید روح کو دیارِ غیر کی آوارہ مزاج فضا راس نہ آئی۔ تاریخ کتمِ عدم پکار اٹھی کہ اے گلدانِ غزنوی کے شگفتہ پھول اور مجاہدِ اعظم کے نامور لختِ جگر جن لوگوں نے غرورِ حکمرانی کے نشہ میں سرشار ہو کر برصغیر پاک و ہند کے حریت پسندوں پر ظلم و ستم کی آتش فشانی کی۔ جن کے دست ِ ظلم نے گیارہ صد سالہ حکمرانِ قوم کو ہندوستان میں ذلت آمیز زنجیروں میں جکڑ کر شرفِ انسانی سے محروم کرنا چاہا۔ جس کی وحشت ناک بربریت نے حق گویان کو فولادی زنجیروں میں کس دیا کہ انجمادِ خون سے اعضاء معطل ہو کر رہ گئے۔ سید اسماعیل شہید کی تحریکِ مجاہدین سے وابستہ جانبازوں کو چونا بنانے والی بھٹیوں میں اس لئے زندہ جلا دیا گیا کہ ان مواحدین کے عزم و استقلال، جانبازی و سرفروشی نے انگریزی فوج کو ہر جگہ ناکام بنا کر رکھ دیا تھا۔ جن کی خون آلود سنگینیوں نے علماءِ حق کے مقدس خون سے دہلی کے گلی کوچوں اور شاہراؤں کو لالہ زار بنا دیا تھا۔

آج انہی ظالموں کے دیس میں آپ کا ورودِ مسعود ہے ......؟

جہاں سے ظلم کی بجلیاں اٹھتی اور آپ کے دیس کو جھلستی رہیں۔ آرڈیننسوں، پابندیوں، جلاوطنیوں، پھانسی اور موت کے فیصلے یہاں سے ہوتے اور ہند کے بچوں کو یتیم، عورتوں کو بیوہ بنایا جاتا۔ آپ کے آباء و اجداد کو جن اذیت ناک شکنجوں میں کسا جاتا رہا، ان کے کل پرزے یہاں ڈھلتے اور تیار ہوتے رہے۔ مسلمانانِ عالم شکست و ریخت کے طوفانی منصوبے یہاں بنتے اور جھکڑ بن کر عالمِ اسلام پر چلتے رہے لیکن تم ہو کہ اس دیس میں شریکِ جشن......؟

تخیلات میں جوں جوں تاریخ کی ورق گردانی ہوتی گئی، سفید جلد کے سیاہ دل سیاست دانوں کے مظالم سے پردہ اٹھتا گیا اور ماضی کے یاس انگیز و عبرت خیز ابواب کھلتے گئے۔ افرنگ کی مسلم کش تاریخ نے کچھ سعید فطرت انسان کی قومی غیرت و حمیت کو اس طرح جھنجھوڑا کہ آئینہ دل کی کیفیت بارگاہِ ایزدی میں تقدیر بن کر نمودار ہوئی اور آپ دیارِ فرنگ میں کسی جشن میں شریک ہوئے بغیر اس دنیا سے اٹھا لیے گئے۔

دورِ ابتدائی:

مجھے چینیاں والی مسجد کا وہ دل گزیں منظر یاد آرہا ہے جب میرے ماموں مولانا حافظ احمد مرحوم بطورِ صدر مدرس وہاں اقامت پذیر تھے۔ کچھ عرصہ کے لیے بندہ کی رہائش بھی لاہور میں لازمی قرار پائی گئی تھی۔ بسا اوقات فارغ وقت میں مسجد ہذا ہی میں گذارتا جس کی دو وجہ تھی، ایک تو مولانا داؤد صاحب مسلکی فکر میں میرے پیشوا، دوسرے میرے افکار و نظریات میں آزادی کی شمع روشن کرنے کے موجد بھی مولانا ہی تھے۔

مجھے یاد ہے 1946ء کے الیکشن میں موضع پٹی (ماجھا) کے شہری حلقہ میں مجلسِ احرار اسلام کے نمائندہ کا الیکشن

ہمارے ذمہ تھا اور دیہاتی حلقہ کا کام بھی مولانا موصوف نے مولانا عبدالغفار غزنوی کے الیکشن کا ہمارے سپرد کر دیا تھا۔ ان دنوں سید صاحب سنِ بلوغت سے شباب کی منزلوں کی طرف گامزن تھے۔ مدرسہ کے ماحول اور کالج کے ابتدائی زمانہ میں عصری اثرات سے پوری طرح سے متاثر دکھائی دیتے جن کی پوری پشت زہد وتقویٰ سے محمود اور رضاء الٰہی کے جذبہ سے مخمور ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ﴾ کی مجسمہ تصویر ہو وہاں یہ تضاد یاس انگیز دکھائی دیتا ہے۔ کئی دفعہ جسارت سے صاحبزادہ صاحب کے تصورات وعادات کی طرف مولانا کی توجہ مبذول کروائی جاتی تو آپ فرماتے: ''اس کے لیے دعا کو خاص وقت میں لازم قرار دے رکھا ہے۔ دعا کے بعد میرے قلب میں سکون کی غیر معمولی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو مجھے اس کے تابناک مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔''

یہ بات 1938ء یا 1939ء کے زمانہ کی ہے ان دنوں مولانا محمد داؤد ظہر کی نماز کے بعد اکثر غم غلط کرنے اور راحتِ قلبی کے حصول کی خاطر حافظ محمد صاحب جو حقیقتاً اللہ کے ولی تھے، سے قرآن پاک سنتے۔ اس مجلس میں بندہ بھی اکثر شریک ہوتا۔ حافظ صاحب مذکورہ امام المتقین حضرت مولانا عبدالواحد صاحب کی مجلس سے فیض یاب تھے۔ قرآن پاک بغیر کسی تکلف کے پورے سوز سے پڑھتے یوں معلوم ہوتا کہ ابھی احکامِ الٰہی کا نزول ہو رہا ہے، سننے والوں پر رقت آمیز وجد طاری ہو جاتا۔

حضرت مولانا کی قلبی کیفیت کا اظہار آنکھوں سے ٹپکنے ہوئے آنسوؤں سے ہوتا جو سرخ وسفید رخساروں سے گذرتے ہوئے ریش مبارک پر موتیوں کی طرح حلقہ باندھے دکھائی دیتے۔

جوانی میں اخذِ خیر:

جوانی ابن آدم پر زہد شکن بن کر نمودار ہوتی ہے جس کے رنگین خواب، دلپذیر نغمے اور خواہشات کا امڈتا ہوا طوفان دامنِ شفاف کو عصیاں کی آلودگی سے داغ دار کر دیتا ہے۔ اسی عہدِ شباب کی عبادت کو اوصافِ انبیاء علیہم السلام میں شمار کیا گیا ہے۔ یہاں دامن کو نفس کی طغیانی سے بچا لینا تائیدِ ایزدی کے بغیر ناممکن ہے۔ سید صاحب کو بیک وقت دو متضاد ماحول سے گذرنا پڑا۔ گھر کا ماحول جو نہایت پیارا اور پاکیزہ تھا، جہاں وہ کل اوصاف پائے جاتے تھے جو شرفِ انسانی کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن کالج سوسائٹی کا پُرخطر ماحول جہاں حسن بے نقاب ہو اور کھلے بندوں متاعِ ایمان پر ڈاکے پڑتے ہوں، وہاں سے دامن بچا کر نکل جانا انہی لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جہاں اخذِ خیر کے تابندہ جوہر رفعتِ انسانی کے بدرجہا کثیر معاون ثابت ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ والدِ محترم کی دعائیں آخر رنگ لائیں اور مولانا محمد داؤد غزنوی کی پیش گوئی کا یوں اظہار ہوا کہ سید صاحب بڑی سرعت سے مرجع خلائق بن گئے کہ ان کی وفات نے صرف ہم مسلکِ اہلحدیث جماعت کو ہی بحرِ حزن میں ہی غوطہ زن نہیں کیا بلکہ پاکستان کا ہر اہلِ دل اور بیرون پاکستان کا ہر وہ شخص جس کو ان سے یا اس خاندان سے ذرہ بھر بھی شناسائی ہو وہ بھی چیخ اٹھا اور ان کی وفات سے ہر شخص کے دل پر المناک چوٹ لگی۔

غزنوی اسلام کی مسلح افواج تھے:

اللہ تعالیٰ نے سید صاحب کو ایسا نسب عطا فرمایا جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے، یہ وہ خاندان ہے جس کی ایک ایک کرن آفتاب دجہاں تاب بن کر چمکی جہاں تینتیس کروڑ دیوتاؤں کی پوجا پاٹھ کی جاتی ہو۔[1]

عدمِ تولید پر ایک ہندو عورت ہر قسم کی زیب و زینت سے آراستہ سات برہمنوں سے حصولِ اولاد کے لیے عصمت آزاد بند تار تار کرانے کا جائز حق رکھتی ہو۔[2]

فاتحِ ہند محمد بن قاسم کی مساعی جمیلہ نے لوگوں کو اسلام کی نعمت سے نوازا لیکن قلت وقت نے تربیت کا موقع نہ دیا جس وجہ سے نام کے مسلمان ہندوانی رسومات سے نجات نہ پا سکے جن کی اصلاح کے لیے ولی اللٰہی خاندان کو مشیتِ الٰہی نے منتخب کیا یا پھر غزنی سے امام طریقت حضرت سید عبد اللہ غزنوی کو ایثار و محبت کا امین بنا کر ہند کے مسلمانوں کی اصلاح اور کفر کو حلقۂ بگوشِ اسلام لانے کے لیے بھیجا جن کے سینے میں عشقِ رسول ﷺ کا دریا موجزن تھا۔ وہ ہر عمل کو کتاب وسنتِ رسول ﷺ کے ترازو میں تولتے تھے اور مسلمانوں کو ہندوانی رسومات اور منکرات سے نجات دلانے کے لیے عشقِ رسول ﷺ کا درس دینے میں لگے رہے۔

ان کے بعد ان کی اولاد شجاعت مند مسلح افواج کی طرح کتاب وسنت کے اسلحہ سے آراستہ توحید وسنت پر کمر بستہ رہی۔ یہ خاندان علم وعمل کا گہوارہ رہا جس میں امامِ طریقت مولانا عبد اللہ المہاجر غزنوی، فاتحِ مرزائیت مولانا عبد الحق غزنوی، ناشر کتبِ اسلامیہ مولانا عبد الغفور غزنوی، مجاہدِ آزادیٔ ہند مولانا داؤد غزنوی، مشیر سلطان ابن سعود (والیٔ حکومتِ سعودیہ) مولانا محمد اسماعیل غزنوی، پروفیسر ابوبکر غزنوی وغیرھم۔

ان کواکبِ افلاک کی ضیاء پاشیوں سے کفر و بدعت کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں کو جلا ملی۔ ان ہستیوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں گم کردہ ہدایت کو درسِ حیات دیا۔ حق و باطل کا وہ کون سا معرکہ ہے جسے سر نہ کیا ہو۔ دینِ حق کی تبلیغ واشاعت کا وہ کونسا مرحلہ ہے جہاں اس خاندان نے علمی گوہر افشانی نہ کی ہو، جہاد کا میدان ہو یا اتحاد کا، علمی ہو یا تبلیغی، سیاسی ہو یا معاشی، کالج کا ماحول ہو یا اسمبلی ایوان، ہر جگہ غزنوی علماء صف اول میں دکھائی دیتے ہیں۔

ہجرت کی سنت پر امامِ طریقت مولانا عبد اللہ غزنوی نے عمل کیا۔ ذکرِ الٰہی میں عاشق و دل گداز کی طرح محو رہنا خصوصاً نماز میں یکسوئی اور محویت کا یہ عالم کہ حضرت میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی سے جب سندِ فراغت حاصل کی تو مولانا نے فرمایا: ''عبد الجبار نے حدیث ہم سے پڑھی ہے اور نماز پڑھنی ہم نے ان سے سیکھی ہے۔''

---

[1] اسلام سے قبل ہندوستان میں 33 کروڑ بت پوجے جاتے تھے۔

[2] اگر کسی ہندو عورت کو اولاد نہ ہوتی ہو تو چونکہ نہ دوسری شادی ہندو دھرم میں جائز ہے نہ طلاق، لہٰذا وہ عورت سات برہمنوں کے پاس یکے بعد دیگرے اولاد حاصل کرنے کے لیے جا سکتی ہے۔ (ہندو دھرم)

یقیناً امام عبدالجبار غزنوی صاحب کے پیچھے جس شخص نے ایک بار نماز پڑھ لی پھر پوری زندگی وہ لذت کسی اور نماز میں نصیب نہیں ہوئی۔ مولانا عبدالواحد صاحب کی نماز بھی کچھ ایسی ہی ہوتی تھی کہ نماز شروع ہے تو آنسو ٹپک رہے ہیں۔

مولانا عبدالحق صاحب نے مرزا غلام احمد کا ناطقہ بند کر رکھا تھا یہی وجہ تھی کہ مرزا مولانا کے خلاف بہت کچھ لکھتا رہا۔ بالآخر مرزا غلام احمد اور مولانا عبدالحق غزنوی کا مقابلہ ہوا تو مرزا کو شکست فاش ہوئی اور مولانا کو فتح ونصرت نصیب ہوئی۔ مولانا عبدالغفور غزنوی نے اشاعتِ کتب کا حق ادا کیا۔ چنانچہ غزنوی حمائل، مشکوۃ المصابیح مترجم، فتاویٰ غزنویہ و دیگر کتب جو آج کل نایاب ہیں شائع کیں۔

مولانا محمد داؤد صاحب نے انگریز جیسی ظالم وجابر طاقت جس کی حکومت میں کہتے ہیں سورج غروب نہیں ہوتا۔ اس جرأت سے اس کا مقابلہ کیا کہ انگریز کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا اس سلسلہ میں آپ کو بڑی بڑی اذیتیں دی گئیں، آٹھ برس تک اپنی زندگی کا بہترین حصہ نذرِ زندان کر دیا۔ ①

آخری دو برس قید کی مسلسل سزا جب بھگت کر آئے تو رفیقِ حیات کو بیمار پایا، ادھر بڑے صاحبزادے عمر فاروق مجاہدین کی جماعت میں ملک وملت کی عظمت کی خاطر جان کی بازی تک لگائے ہوئے تھے۔ والدہ کی تیمار داری کے لیے گھر لوٹے تو وارنٹ گرفتاری پہلے ہی پہنچ چکے تھے، چند دن چھپ چھپا کر نکلے تو مولانا نے مریضہ کو سری نگر ہوا بدلی کے لیے لیجانے کا فیصلہ کر لیا اور عمر فاروق کو موضع میر محمد حضرت مولانا دوست محمد صاحب کے پاس چلے جانے کو کہا۔ چنانچہ عمر فاروق رات کی تاریکی میں کسی طرح لاہور سے نکل گئے، سید صاحبؒ کی والدہ جلد ہی سری نگر جاتے کے بعد فوت ہوگئیں جبکہ سید صاحب ابھی زیرِ تعلیم ہی تھے۔ مولانا داؤد غزنوی کو اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ پنجاب اسمبلی کی رکنیت کا اعزاز بھی بخشا تھا۔

1946ء کے الیکشن میں قبل از تقسیم دوبارہ پاکستان بننے کے بعد مگر اسمبلی کے در و دیوار اس بات کے شاہد ہیں کہ آپ نے کلمۃ الحق کی آواز سے اسمبلی میں ایسی گونج پیدا کر دی تھی کہ جس سے بے عمل مسلمانوں کے ایوان میں لرزہ پیدا ہو گیا۔

ان ہی کے فرزندِ ارجمند مولانا ابوبکر غزنوی کو مولانا نے جدید تعلیم یافتہ اور جدید معاشرہ کے دلدادہ لوگوں کی اصلاح کے لیے چن لیا اور مغربی تعلیم، تہذیب اور تمدن سے آراستہ غیر اسلامی فضا میں پرورش پانے والے جن کا ذہن دین سے بغاوت وسرکشی کی بھٹی میں ڈھل چکا تھا۔ سید صاحب کی مجلس ومحبت نے قلوبِ زنگ آلود میں معرفتِ الٰہی کی کرنیں پیدا کر دیں اور وہ مواعظِ حسنہ سے یہاں تک مستفید ہوئے کہ دل خوفِ خدا سے لرزتے ہوئے چشمِ اشکبار سے ذکرِ الٰہی میں محو دکھائی دیتے۔

① آپ کی مدتِ قید مختلف اوقات کی آٹھ برس بنتی ہے، مولانا نے ایک مرتبہ مجھے ساری قید حساب کر کے بتائی تھی۔

خاندانِ غزنوی کے امیر:

مجاہدِ ملت مولانا داؤد غزنوی 16 ستمبر 1963ء کو جہانِ فانی کو چھوڑ گئے تو خاندان کے اکابر واصاغر موجود تھے۔ سوال پیدا ہوا کہ حضرت مولانا مرحوم جو خاندان کے امیر تھے اب ان کے بعد امیر کے لیے کس کو منتخب کیا جائے؟ چنانچہ سید ابوبکر غزنوی کو ہی 25 ستمبر کو خاندانِ غزنویہ کا امیر مقرر کیا گیا۔ رسمِ دستار بندی مولانا ہی کے چچا مولانا زکریا صاحب غزنوی نے ادا کی۔ اس تقریب میں شرکت کرنے والے حضرات حسبِ ذیل ہیں:

حاضرینِ مجلس سید احمد محمود سیشن جج کوئٹہ، میجر عبدالرحیم صاحب امیر جماعت اہلحدیث کراچی، الحاج عبد الرحمٰن صاحب، حافظ عبد الستار صاحب، مولانا محمد ہارون صاحب، مولانا محمد عمر صاحب، سید محمد عثمان صاحب، محمد اسماعیل صاحب منڈی صادق گنج والے، سید ابراہیم صاحب، نصر اللہ جان صاحب، شوکت مجاہد صاحب کوئٹہ، حافظ عبد الولی صاحب، محبوب صاحب، مسٹر یحییٰ صاحب، مولوی عبد اللہ صاحب، مولوی احمد صاحب۔ ابراہیم صاحب کو خاندان کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔

دار العلوم تقویۃ الاسلام جس کی بنیاد امام الموحدین مولانا عبدالجبار غزنوی صاحب نے رکھی تھی۔ ان کے بعد مجاہدِ ملت اس کے مہتمم رہے۔ اس درس گاہ کا اہتمام بھی سید صاحب کے سپرد کر دیا گیا۔ آپ نے خطبہ جمعہ بھی دار العلوم کے وسیع ہال میں شروع کر دیا۔ آپ کے خطبہ جمعہ میں بے شمار لوگ شریک ہوتے۔ اہلحدیث اصحاب کے علاوہ دیگر مسالک کے متعلقین ڈاکٹر، انجینئر، وکلاء، سٹوڈنٹ آپ کے علمی جواہر پاروں کو جمع کرتے اور آپ کے مواعظِ حسنہ سے مستفید ہوتے رہے۔ نمازِ عید بارہ برس تک آپ نے انجینئر یونیورسٹی گراؤنڈ میں پڑھائی۔ ستمبر 1975ء میں آپ کو بہاولپور یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا گیا تو آپ نے آخری نمازِ عید گورنمنٹ گرلز ہائی سکول (دار العلوم) کی گراؤنڈ میں پڑھائی جہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے۔

اخلاقی بلندی:

اخلاق و کریکٹر انسانی ضمیر کے عکاس ہیں، ان کی عظمت کا اقرار اسی قدر ہو گا جس قدر کسی کو ان سے زیادہ واسطہ پڑا ہو۔ چونکہ استاد شاگرد کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ لہٰذا سید صاحب کے تلامذہ سے ملنے سے یہی معلوم ہوا کہ استاد اپنے شاگردوں میں حسنِ اخلاق کی وہ قدریں چھوڑ کر گئے ہیں جن کا تلامذہ کے دلوں پر گہرا اثر ہے۔

وہ استاد کی شفقت سے مادر و پدر کی شفقت بھول چکے تھے۔ پروفیسر یحییٰ صاحب جو انجینئر یونیورسٹی کے پروفیسر سید صاحب کے سٹاف میں کام کرتے رہے فرماتے ہیں: ''مجھے کالج میں سید صاحب کی شاگردی کا شرف بھی حاصل رہا ہے لیکن جب میں انجینئر یونیورسٹی کا پروفیسر بن گیا تو آپ نے مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ میرے استاد اور میں اُن کا شاگرد تھا بلکہ ساتھی اور رفیق ہی سمجھا۔''

تجربہ شاہد ہے کہ دولتِ حُسن کی فراوانی، ترقی منازل کی عظمت یا پھر ناز ونعمت میں پلے ہوئے شخص کو مصائب وپریشانی، حاملین اعلیٰ اخلاق کے اخلاقی اقدار کو بھی مجروح کرنے کا سبب ہوتی ہیں لیکن سید صاحب کی طبیعت میں بہاولپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن جانے سے انا کا تغیر نہیں آیا بلکہ شفقت والفت کی پہلی سی ادا قائم رہی۔ اسی طرح غصہ اور ناراضگی میں بھی آپ کی زبان نازیبا الفاظ سے کبھی آشنا نہ ہوتی۔

افسوس ناک مرحلہ:

امیر اوّل کی وفات کے بعد جمعیت اہلحدیث کے انتخاب میں حضرت مولانا اسماعیل صاحب سلفی کو امیر اور سید صاحب کو مرکزی ناظمِ اعلیٰ بنالیا گیا مگر اسے جماعت کی بدنصیبی ہی کہیے کہ علم کے اس روشن مینار سے جماعت کو جلد ہی محروم کر دیا گیا۔ نظامت سے معطل اور رکنیت منسوخ کردی گئی۔ رات کی تاریکی میں سامان کو نکال کر خفیہ طور پر جمعیت کے دفتر کو دار العلوم سے اٹھا کر ایبک روڈ میں منتقل کر دیا گیا۔

پس منظر میں گئے بغیر غور کیجئے اتنے عظیم شخص سے یہ تحیر آمیز سلوک کتنا اذیت ناک ہے لیکن سید صاحب نے اسے عزتِ نفس کا نہ مسئلہ بنایا نہ جماعتی احباب کو کسی آزمائش میں ڈالا۔ حالانکہ چشمِ زدن میں پانسہ پلٹ سکتے تھے لیکن انہوں نے عقیدت مندوں کے اصرار پر فرمایا کہ ''اس سے بڑھ کر جماعت پر ظلم کیا ہوسکتا ہے کہ میں اپنی ذات کے لیے انتشار کا موجب بنوں، میں یہ وقت کسی تعمیری کام میں کیوں نہ صرف کروں۔''

ایسے لوگ ہی جماعت کی ترقی وآبرو کا ضامن ہوا کرتے ہیں جو خودستائشی سے مبرا اپنے مفاد کو جماعتی مفاد پر قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

علمی استعداد:

جب آپ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں عربی ادب کے پروفیسر تھے ان دنوں حکومت کو انٹر کالج میں جدید ادب پڑھانے کے لیے کسی قابل پروفیسر کی تلاش تھی، جب حسبِ منشا نہ مل سکا تو بالآخر نظرِ انتخاب سید صاحب پر ہی ٹھہری اور آپ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ اس کالج میں ایم اے عربی کی کلاسیں تھیں جس میں جدید ادب کی تعلیم آپ دیتے تھے، یہ کالج وہی ہے جہاں شبلی مرحوم بھی پڑھاتے تھے۔ سید صاحب کی ملازمت تو اسلامیہ کالج میں تھی لیکن اعزازی طور پر ایک گھنٹہ انٹر کالج میں جدید ادب پڑھاتے۔

پروفیسر یحییٰ خان صاحب نے فرمایا کہ ''لاء کرنے کی تیاری پر گفتگو ہو رہی تھی تو سید صاحب نے فرمایا: جب میں نے لاء کیا تو ان دنوں بخاری شریف کا کچھ حصہ لاء کر سٹوڈنٹ کو پڑھایا جانا لازمی تھا لیکن جب استاد مجھے بخاری پڑھاتے تو مجھے خود اپنے استاد صاحب کی عبارت کی اصلاح کرنا پڑتی۔ بالآخر پروفیسر صاحب نے مجھے حکم کیا کہ بخاری شریف آپ پڑھایا کریں لہٰذا یہ پیریڈ مجھے پڑھانا ہوتا تھا، لیکچر انگریزی میں دیتے ہوئے بخاری شریف کا ترجمہ بھی انگریزی

میں کرنا ہوتا تھا اس لیے بعض اوقات انگریزی زبان میں عربی کا ترجمہ کرنے کے لئے الفاظ کا موزوں تلاش کرنا بہت مشکل ہوجاتا تو مجھے ڈکشنریوں سے الفاظ تلاش کرنا پڑتے۔"

موت سے چند دن پہلے لندن میں آپ کا آخری مقالہ:

لندن میں جو مقالہ آپ نے پڑھنا تھا، حادثہ کی وجہ سے وہ مقالہ آپ خود نہ پڑھ سکے تو آپ کا یہ ٹائپ شدہ انگریزی مقالہ ڈاکٹر شیر زمان نے جشنِ اسلامی کی مجلس میں پڑھا۔ مقالہ کی ایک حدیث کے بارہ میں مصری علماء نے کچھ اعتراض کئے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مقالہ نگار چونکہ صاحب فراش ہیں ان سے دریافت کے بعد ہی کچھ عرض کرسکتا ہوں۔ بعد ازاں ڈاکٹر صاحب ہسپتال سید صاحب کے ہاں تشریف لائے تو معترضین کے سوالات دہرائے۔ آپ نے سات منٹ تک اس حدیث کی وضاحت کی، جب دوسرے روز ڈاکٹر صاحب نے معترضین سے سید صاحب کی وضاحت بیان کی تو مصری علماء عش عش کر اٹھے اور مولانا ابوبکر کے علم کے گرویدہ ہوگئے۔

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لیکر
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لیکر

آپ نے خود بھی کئی ایک تصانیف کیں جن کی تعداد تقریباً چودہ ہے لیکن آپ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنا ایک حلقہ چھوڑ گئے ہیں جو ان کے خطبات، تقاریر کو کتابی شکل دے رہے ہیں۔

آپ کے دو صاحبزادے ہیں، بڑا صاحبزادہ جس کی عمر تقریباً سولہ سترہ برس ہے اس کا نام سید جنید ہے۔ دوسرا صاحبزادہ جس کی عمر تیرہ برس اور نام سید حماد غزنوی ہے۔

حکومت نے سید صاحب کی وفات کو ملک میں علمی خلاء کا موجب قرار دیا۔ آپ کی خدمات کو سراہتے ہوئے مبلغ پچاس ہزار روپیہ ان کی بیوہ اور ان کے بچوں کو بطورِ خدمت پیش کیا۔

آخری دو خطاب:

خاندانِ غزنویہ کے زہد و تقویٰ اور علمی ورثہ کی آخری کرن جس کے پُربصیرت خطبات جو تاریک دلوں میں ہدایت کی شمع روشن کرتے ہیں، ان کا اپنے ملک اور اپنی جماعت کے عظیم اجتماع میں آخری خطاب جو ماموں کانجن کی کانفرنس میں فرمایا جس کے الفاظ اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ مقرر سامعین سے جلد جدا ہونے والا ہے۔

ان کا دوسرا خطاب جو بیرون ملک دنیا بھر کے نمائندگان کی موجودگی میں لندن کے جشنِ اسلامی میں پڑھا گیا جس پر غیر ملکی نمائندگان دادِ شجاعت دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ بالکل آخری ایام کا خطاب تھا جس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ ہم سے جدا ہوگئے۔ یہ خطاب انگریزی میں ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کا ترجمہ کرا کر دونوں خطاب آپ کے دیدہ نظر کردوں تا کہ آپ اپنے محبوب راہنما کی آخری تقاریر سے مستفید ہوسکیں۔[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

یادِ رفتگان' بیادِ سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم

تحریر: مولانا حکیم محمد عبدالرحمٰن

سخن ز روضۂ رضواں بکوئے یار کشید
چو جادۂ کہ ز صحرا بہ لالہ زار کشید

سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے علم و عرفان کی دنیا میں جو خلاء پیدا ہو چکا ہے وہ بدستور باقی ہے اور شاید ''زمانہ'' تک اس نقصان کی تلافی نہ ہو سکے۔ مرحوم خاندانِ غزنویہ کے مشہور رہنما مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے بیٹے اور حضرت سید عبدالجبار غزنوی رحمہم اللہ کے پوتے تھے۔

خاندانِ غزنویہ علم و فضل کا بڑا مرکز تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں یہ گھرانہ علم، عمل اور عقیدہ کے لحاظ سے امتِ مسلمہ کے بہترین خطاب یافتگان ''حزب اللہ'' میں شمار ہوتا ہے، خاندانِ غزنویہ کے اس ملک کے اہلِ علم پر بے شمار احسانات ہیں۔ انیسویں صدی کے شمار میں متحدہ برصغیر کے بالواسطہ و بلا واسطہ تقریباً 90 فیصد علمائے کرام اور فقراء و صوفیاء اسی خاندان کے تلمذ سے شرفِ استناد رکھتے ہیں۔

مجھ فقیر بے نوا کو بھی اس خاندان کی مساعی جمیلہ سے مستنیر دار العلوم ''تقویۃ الاسلام'' امرتسر میں تربیت حاصل کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ یہ 1937ء کی بات ہے کہ اس وقت مدرسہ غزنویہ سلفیہ ''تقویۃ الاسلام'' امرتسر کٹڑہ مہان سنگھ کے مہتمم مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ غالباً مولانا موصوف نے اسی سال (یا تقریباً کم و بیش) مدرسہ کی نظامت کا عہدہ سنبھالا تھا اور یوں مجھے 1937ء لغایت 1940ء حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب رہنے کا اور آپ کے انتظام و انصرام کے ماتحت ادارہ میں تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہ دور مدرسہ غزنویہ سلفیہ ''تقویۃ الاسلام'' امرتسر کا بہترین دور تھا اس دور میں ہمارے اساتذہ کرام میں حضرت مولانا شیخ الحدیث نیک محمد صاحب، حضرت مولانا محمد حسین ہزاروی، حضرت (شہید) مولانا محمد عبداللہ صاحب بھوجیانی رحمہم اللہ تعالیٰ حضرات شامل تھے۔

یہ دور سیاسی بیداری کے لحاظ سے بھی اپنے شباب پر تھا۔ مسلم لیگ، تحریکِ خاکسار، جماعتِ احرار اور کانگرس وغیرہ اپنے اپنے نظریات پر کاربند تھیں۔ آزادیٔ رائے تھی جلسے جلوسوں پر کوئی پابندی نہیں تھی، رات گئے تک مواعظ حسنہ اور مختلف سیاسی تقاریر سے عوام الناس مستفید ہوتے تھے۔

تاریخ کا یہ ورق چونکہ صرف خاندانِ غزنویہ کی سیرت اور تذکرہ پر مشتمل ہے اس لیے اس میں اس وقت کی سیاسی

اور مذہبی رعنائیوں کا ذکر نہ ہو سکے گا۔ بالاختصار اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ سنین ہائے متذکرہ سے زیادہ خوشحالی، امن، اشیاء کی قیمتوں کا اعتدال، ان کا بے غل وغش، خالص دستیاب ہونا شاید پھر وہ دور اور ایام سرزمینِ امرتسر (برصغیر ہند) کو دیکھنا نصیب نہ ہو۔

الا یــا حبــذا نفحــات نجــد
وریــا روضــة بــعــد القــطــار
شــهــور ینقــضــین ومــا شــعــرنا
بانــصــاف لــهــن ولاســرار

حضرت سید مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ شخصیت و کردار اور وجاہت کے لحاظ سے نہایت حسین اور وجیہ النظر تھے۔ خطاب، بیان اور تدریس کے سلطان تھے۔ نہایت جامع اور مربوط گفتگو کرتے تھے۔ اس وقت میری عمر کوئی 13 - 14 برس ہوگی، اس تربیت کا جمال اب تک میرے رگ و پے میں متاعِ عزیز کی حیثیت سے محفوظ ہے۔

أتاني هواها قبل أن أعرف الهوى
فـصادف قـلبا فـارغا فـتمكـنـا

افسوس کے آئندہ آنے والے ماحول کی تکوینات نے اس میں کوئی اضافہ نہ ہونے دیا اور بتدریج ہم ''فتن'' کے گرداب میں گرفتار ہوتے چلے گئے۔ اور پھر ہم اس صادق المصدق صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کی حرف بحرف تصدیق کر چکے۔

"یتقارب الزمان وینتقص العمل ویلقی الشح وتظهر الفتن یکثر الهرج." (بخاری شریف، ج 2 ابواب الفتن) زمانہ قریب ہوتا چلا جائے گا (سال، مہینہ، ہفتہ، دن اور دن ایک ساعت کی طرح گزرتا محسوس ہوگا) عمل کم ہوتا جائے گا اہلِ علم اٹھتے جائیں گے اور یوں علم کم ہوتا جائے گا۔ بخل اور حرص عام ہوگا، امانات اور صناعات میں خیانت ہوگی، فتنے ظاہر ہوں گے اور (تب) قتل بہت اور عام ہوگا۔

آپ شعبہ ہائے نظم و انصرام میں بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ تنسیخ و تقرر، اسی طرح ترک و اختیار میں ایک خاص بصیرت رکھتے تھے اور کوئی کام جذباتی اور سطحی نہ ہوتا۔ غالباً 1940ء کی بات ہے، موضع بھینی سدھواں، ضلع امرتسر جماعت اہلحدیث کا ایک مشہور گاؤں تھا۔ وہاں درسِ نظامی کے معیار کا ایک مدرسہ بھی تھا۔ اس گاؤں میں ہر سال تبلیغی قسم کا بہت بڑا جلسہ ہوتا تھا جو تین دن تک رہتا۔ قیام و طعام کا انتظام مقامی جماعت ہی برداشت کرتی۔

بھینی سدھواں کی جماعت اہلحدیث میں بعض نہایت نامور اور اہم شخصیات تھیں: مثلاً حضرت احمد صاحب مرحوم بڑے نیک سیرت بزرگ تھے۔ لوگ ان کے نام کے ساتھ امام کا لفظ زیادہ کرتے اور امام احمد کہتے۔ ان کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ جماعت اور برادری کے امور پوری ذمہ داری سے سرانجام دیتے تھے۔

اسی طرح میاں غلام محمد صاحب نہایت پاکیزہ سیرت اور ملنسار بزرگ تھے۔ بڑے خوش خلق اور خوش رو تھے۔

15 اگست 1947ء کو سکھ غدر اور ظلم کا شکار ہوئے۔ آپ بمقام سنگھے ترنتارن سے دو اڑھائی میل کے فاصلے پر نہر کے کنارے شہید کر دیئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی اہلیہ مرحومہ نے بتایا کہ نہتے پناہ گزین مسلمانوں کا قافلہ نہر کے پل کے قریب پہنچا تو سکھوں کے جتھہ نے حملہ کر دیا۔ سکھ آزادنہ بندوقوں، رائفلوں، نیزوں، تلواروں اور خنجروں سے مسلح تھے۔ بس پھر کیا تھا، قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار جو اس قوم کی ابتداء ہی سے سرشت رہی ہے شروع کر دیا۔ یوں ہی کہا جاتا ہے کہ پاکستان بغیر خون بہائے اور عصمت وعفت نچھاور کیے بن گیا۔ یہ سوال ان سے کیجئے جو معصومین اس الم ناک فتنہ سے دو چار ہوئے۔ میدانِ جنگ میں جان دینا تو باعثِ شرف و افتخار ہوتا ہے اور یوں نہتوں کو ان کی بہو بیٹیوں کے سامنے ذلت کے ساتھ ہلاک کرنا۔ پاکستان کے وجود کی کس قدر بری قسمت تھی جو ان پاکباز شہداء کرام نے ادا کی۔

ولا تسألن عما جرى يوم حصرهم
وذلك مما ليس يدخل في الحصرى

عزیز داری کی بنا پر مجھے بھی وہاں جانا ہوتا۔ ان دنوں وہاں کے صدرِ مدرس مولانا عبد الحق صاحب مرحوم تھے۔ جید اور حساس اہلِ علم میں سے تھے۔ رکوع میں شامل ہونے سے مقتدی کی نماز ہوتی ہے یا نہیں اس پر بحث چل نکلی۔ مولوی عبد الحق مرحوم کہتے تھے: رکعت نہیں ہوتی۔ میں نے کہا: رکعت ہو جاتی ہے۔ میں نے امرتسر آ کر اپنے مدرسہ میں اس پر تفصیل سے دلائل لکھے، اس میں امام عبد الجبار غزنوی رحمہ اللہ کا مسلک بھی لکھا کہ رکوع میں ملنے سے رکعت ہو جاتی ہے۔ دستخط اور تصدیق کے لیے حضرت شیخ الحدیث مولانا نیک محمد صاحب کو پیش کیا، موصوف نے درست تسلیم کیا اور دستخط کر دیئے، پھر حضرت مولانا محمد حسین صاحب ہزاروی اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ صاحب بھوجیانی رحمہ اللہ نے بھی دستخط کر دیئے۔ مولانا محمد داؤد غزنوی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں بھی پیش کیا، بغور مطالعہ فرمایا اور مجھے سینے سے لگا لیا اور شاباش دی اور فرمایا: ”جب اس قدر دلائل سے ثبوت دیا جائے تو فیصلہ نرم الفاظ میں نہیں لکھنا چاہیے بلکہ لکھیں، ان دلائل کی رو سے میں فیصلہ کرتا ہوں وغیرہ۔“ میں نے عرض کیا: آپ تصدیق کے لیے دستخط فرما دیجئے۔ فرمانے لگے: ”اس ورق پر دستخط میرے شایاں نہیں۔ نیا سوال اور جواب لکھ کر لاؤ اور جس طرح میں نے آپ کو ترتیب دی ہے، لکھو اور پھر سب سے پہلے مجھ سے دستخط کراؤ، ان لوگوں کے نیچے میں دستخط نہیں کروں گا جو اس قدر دلائل کے بعد بھی اتنے مضمحل سے الفاظ میں اس کی تعبیر کرتے ہیں۔“

صورتِ واقعہ میں فریقین کے دلائل کو سمجھنا اور ان کی تہ تک پہنچنا، ”تاویل الاحادیث“ اور فیصلہ کی قوت کو ثابت اور واضح کرنے کی کس قدر بے عدیل نظیر ہے اور اس قسم کی چھوٹی بڑی بے شمار یادیں ہیں جن کا دامن حضرت سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی مثالی تربیت کا مرہونِ احسان ہے۔

بات کرتے تو ان کے لہجہ میں ایک پروقار کرامت ہوتی۔ اندازِ بیاں اور طرزِ تخاطب میں ایک رعب ہوتا۔ کلمات، جملے اور الفاظ اپنے ارتباط وانبساط میں اس قدر متوازن ہوتے کہ خود بخود عزیمت کا وجدان پیدا ہوجاتا اور سامع سراپا تاثیر بن کر رہ جاتا۔ ان کی تقریر میں چند ساعتیں ایسی ہوتیں کہ سامعین پر عالمِ تحیر طاری ہوجاتا اور وہ وفورِ رقت کو ضبط نہ کرسکتے اور بے اختیار آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔

قرآنِ حکیم کی قراءت عجیب لحن وصوت اور ذوق ومحبت سے کرتے۔ ترتیل وتلاوت میں روانی اور تسلسل کا عالم یہ ہوتا کہ اقتداء کنندگان سراپا سوز ورقت بنے کھڑے ہوتے، معانی کے جاننے والے رونا ضبط نہ کرسکتے اور خواہ کتنی طویل قراءت ہوتی اکتاہٹ یا کسل کا نشان تک نہ ہوتا۔ دیکھنے والے کہتے ہیں: غزنویہ خاندان کی یہ خصوصیت سید امام عبد الجبار غزنوی رحمہ اللہ اور حضرت سید عبد اللہ غزنوی رحمہ اللہ میں انتہائی اہتمام کے ساتھ تھی۔ تلفظ کی ادائیگی میں بناوٹ اور تکلف نہ ہوتا۔ سہل اور آسان تر اور پھر جملہ جملہ ''کلمہ کلمہ'' پورے نظم و وقار اور سکینت کے ساتھ ''میل میل'' کے ادا فرماتے اور یوں تلاوت کی ترتیل بحسنِ سررشتہ معانی اپنے خوبصوت اور حسین لہجہ کے ساتھ حسن ومحبت کی ساری رعنائیاں لیے ہوئے ارواح وقلوب کی تاثیر بنتی چلی جاتی۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ثم نعم ما قیل:

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہ رہا

بات شروع ہوگئی ہے تو کچھ اور سنیے گا۔ غالباً 1939ء میں جناب ممدوح کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوا۔ مرحومہ دورانِ علالت نحیف ونزار ہوگئیں۔ قرآنِ کریم تلاوت کیا گیا اور اسی طرح مکمل بخاری شریف بھی پڑھی گئی۔ قرآنِ حکیم ہم چھوٹے بچوں نے پڑھا اور بخاری شریف اساتذہ کرام نے ختم کی۔ قرآنِ کریم کے تیس پارے ہیں، اسی طرح بخاری شریف بھی تیس پاروں پر مشتمل ہے مگر مرحومہ انتقال فرماگئیں۔ مرحومہ کے انتقال کے بعد کیا ہوا گویا طبیعت کا سکون ہل گیا۔ آپ نے شدت کے ساتھ اسے محسوس کیا۔

پاکستان پہنچ کر موصوف نے جماعت اہلحدیث کی شیرازہ بندی فرمائی ایک باقاعدہ نظام قائم کیا۔ جماعت سازی اور سیاست میں کافی دسترس رکھتے تھے۔ عرصہ تک جماعت احرار میں رہے، کئی مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اوائل میں کانگرس میں بھی رہے۔ غالباً مارچ 1947ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوگئے اور پاکستان کی تعمیر میں ان کی مساعی کسی بھی بڑے سے بڑے فعال مسلم لیگی سے کم نہ ہوں گی۔

جماعت اہلِ حدیث کی شیرازہ بندی میں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی ان کے دستِ راست تھے، اس لیے جناب ممدوح کے بعد صحیح معنوں میں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب ان کے خلیفہ بنے۔

ہم نے اوپر ذکر کیا، اہلیہ محترمہ کے انتقال کے بعد موصوف نے اس صدمہ کو سخت محسوس فرمایا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس کا بدل عطا کر دیا مگر طبیعت سنبھل نہ سکی۔ دل کا روگ لگا بیٹھے۔ ع

دل بھی اگر گیا تو وہ بھی دل کا درد تھا

ہم دل کے درد کی صورت میں بھی خفقان کے باب کی طرف رجوع کرنے کی ہدایات دیتے ہیں۔ خفقان قلب کی اس مضطربانہ حرکت کو کہتے ہیں جو اختلاج کے مشابہ ہو سکتی ہے جس سے قلب کو اذیت و تکلیف پہنچے۔

میں نے ''بوجوہ'' عملاً اہلحدیث کی اس تنظیم میں حصہ بنا لیا جب کبھی ملتے گلے لگا لیتے۔ اور فرماتے: ''عبدالرحمٰن آپ بھی تنظیم جماعت میں میرا ہاتھ بٹائیے۔'' میں کہتا: ''میرے اکثر ہم سبق آپ کے ساتھ ہیں۔ پھر وکالۃً تو ہاتھ بٹا رہا ہوں۔'' فرماتے: ''نہیں آپ کی ذات کے ساتھ اعتماد کی جو حلاوت اور وابستگی پاتا ہوں وہ ہر جگہ سے نہیں مل سکتی۔'' ایک مرتبہ انارکلی میں ملے، گلے سے لپٹ گئے، آبدیدہ ہو کر بے اختیار کہا:

اے کہ بدیدہ نم زتست
وے کہ بسینہ غم زتست
نازشِ غم کہ ہم زتست
خاطرِ شاد می دہد

میرے محترم دوست! خلیل اور بھائی، خاندان موجدین خان صاحب آپ کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ساتھ بغایت درجہ محبت عطا فرمائی ہے۔ دین اور عقیدہ کے سخت طرف دار اور خیر خواہ ہیں۔ اللہ عزّ وجل کے ساتھ حسنِ اعتماد کا مقام بالکل وہی ہے جو بندے کو اللہ رحمٰن سے ہونا چاہیے۔ پاکستان کی خیر خواہی تو آپ کا غازۂ امتیاز ہے۔ آپ کافی عرصہ گوجرانوالہ میں افسر آبادکاری رہے۔ کلیم افسر اور سٹینٹ کمشنر بھی رہے۔ آج کل 135 اپر مال لاہور میں قیام پذیر ہیں۔

خلوت در انجمن اور انجمن در خلوت

دستِ امید بلند است و پایۂ یقین ارجمند
اے آبروئے خلوت اے فخرِ انجمن
وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو وصد ہزار بار بیا

ایک دفعہ میں نے خان صاحب موصوف کو خمیرہ مروارید بہ نسخہ کلاں دیا۔ آپ نے وہ اپنی والدہ محترمہ کو بطورِ تحفہ دیا۔ خان صاحب کی والدہ محترمہ جنہیں ہم اماں جی کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ حضرت سید عبدالواحد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردہ تھیں اور حضرت سید امام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کی بیعت تھیں۔ اماں جی رحمہا اللہ نہایت شفیق اور اولوالعزم دل رکھتی تھیں۔ باقاعدہ تہجد ادا فرماتیں، موج نے کہا: اماں جی سجدہ اتنا طویل فرماتیں، میں سمجھتا شاید آپ کب اٹھیں

گی؟ آپ کی زبان فارسی تھی، فارسی میں گفتگو فرماتیں، کافی عرصہ کے بعد اردو میں دسترس حاصل ہوئی۔ میں جب پہلی بار ملا تو آپ ان دونوں ہیرن روڈ والے مکان میں تشریف فرما تھیں۔ نہایت رأفت وعاطفت سے باتیں کیں اور پھر موج کو بلا کر کہا: تم چار بھائی ہو۔ اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ بھی میرے بیٹے ہیں اب تم پانچ بھائی ہو۔ اماں جی سخاوت میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔

سخاوت بود کار صاحبدلاں

سخاوت بود پیشہ مقبلاں

سخاوت مسلمان خواتین کی مقبول ترین صفت ہے۔ قربِ زمانی کے لحاظ سے بھی رسول ﷺ نے امہات المومنین رضی اللہ عنہن سے فرمایا تھا: ''تم میں سے جس کے ہاتھ لمبے ہوں گے وہ مجھے پہلے ملے گی۔'' چنانچہ محترمات امہات المومنین آپس میں ہاتھوں کی پیمائش کیا کرتیں کہ کس کے ہاتھ لمبے ہیں۔'' مگر لمبے ہاتھوں سے رسول اکرم ﷺ کی مراد سخاوت تھی۔ اماں جی حب ذات کا بہترین نمونہ، ایک عظیم معلمہ، ایک عظیم مربیہ، تقویٰ اور خشیت الٰہی میں انتہائی اعلیٰ مقام پر تھیں۔ میرے علم میں یہ بات نہ تھی کہ اماں جی آباءِ غزنویہ سے بھی متعارف ہیں۔ چنانچہ آپ نے وہ خمیرہ مروارید حضرت سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو مرحمت فرما دیا۔ چند دن کے بعد دوا خانہ میں میرے پاس عبدالحیٰ خان صاحب (موج کے بڑے بھائی) آئے اور کہا کہ ذرا لاہور چلنے کی تکلیف فرمائیے، ہمارے پیر صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ یہ پیر صاحب کے لفظ سے میں چونکا تو انہوں نے ذرا وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ آپ کا خمیرہ مروارید ہم نے اپنے پیر صاحب کو دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ میں ان حکیم صاحب کو دیکھنا چاہتا ہوں جنہوں نے یہ خمیرہ تیار کیا ہے۔ پیر صاحب کا نام انہوں نے نہیں بتایا اور میں نے تو اس بات کو معمولی سمجھتے ہوئے دریافت ہی نہ کیا۔

ویسے میرا خیال تھا پیر مکی یا اس کے گرد ونواح علی ہجویری صاحب یا کسی اور چھوٹے موٹے پیر صاحب کے ہاں چلنا ہوگا۔ لاہور پہنچ کر عبدالحیٰ صاحب شیش محل روڈ کی طرف چل دیئے۔ میں نے پھر بھی یہی اندازہ کیا کہ ہجویری صاحب کے دربار میں کوئی پیر صاحب ہوں گے، حتیٰ کہ ہم شیش محل روڈ مدرسہ تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں داخل ہو گئے۔ عبدالحیٰ صاحب آداب ہائے اِذن سے بے نیاز مجھے ساتھ لیے رواں دواں اوپر چلے گئے۔ آخری منزل پر پہنچے، کیا دیکھتا ہوں حضرت مولانا داؤد غزنوی صاحب سادہ سی نوار کی بنی ہوئی چارپائی پر بیٹھے ہیں، حسن وجمال کے انوارات ان کے سراپا کی زینت ہیں۔

مجھے دیکھتے ہی چارپائی پر اٹھ کھڑے ہوئے، گلے سے لپٹ گئے، فرمایا: ''میں نہ کہتا تھا یہ ہماری تربیت کے اثرات ہیں، ہمارے صحبت یافتگان کے فیوض وبرکات ہیں، ایسا مخلص اور محنتی طبیب فنِ طب کے نظر وعمل کی کلیات جو مجھ تک پہنچی ہیں۔ آپ نے خمیرہ کی ترکیب میں جواہرات کے صلایہ میں اس قدر محنت کی ہے کہ وہ خمیرہ کی ذات بن گئے ہیں اور پھر یہ کہہ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آگئے اور کہنا شروع کر دیا:

أجد الملامة في هواك لذيذة
حبا لذكرك فليلمني اللوّم

''میں تیری محبت کے بارہ میں ملامت کو لذیذ پاتا ہوں (حبا لذکرک کتنا خوبصورت لفظ ہے) تیرے نام کی محبت کے سبب پھر ملامت کرنے والوں کو ملامت کرنی چاہیے تا کہ میری لذت میں اضافہ ہوتا رہے۔''

طوبنا بتعريض العذول بذكركم
فنحن بواد والعذول بواد

''ملامت گر کے اشارات و کنایات سن کو ہم نے آپ کا نام لیا اور خوش ہو گئے پھر ہم بھی ایک وادی میں ہیں اور ملامت گر بھی ایک وادی میں ہیں۔''

بس اس طرح سوز ورقت کی بہت سی باتیں کیں، کہنے لگے: خفقان کے باب میں خمیرہ مروارید کا وقتی اثر تو نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا: طبِ یونانی میں وقتی اثر کو کبھی بنیاد نہیں بنایا گیا۔ ہماری توجہ سبب کے رفع کرنے پر ہوتی ہے۔ کہنے لگے: ''اسباب سے قطع نظر آپ کو فوری اور وقتی منفعت کی دواؤں پر بھی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ اب دیکھیے نا، یہ گولی ہے، میں جب سیڑھیاں چڑھتا ہوں تو منہ میں رکھ لیتا ہوں اور جب اترتا ہوں تو منہ میں رکھ کر اترتا ہوں۔'' پھر فرمایا: آدھ سیر خمیرہ مروارید بہ نسخہ خاص مجھے تیار کر دیجئے۔ میں نے عرض کیا: آدھ سیر ہم دوا خانہ کی طرف سے پیش کریں گے۔ کہا: پھر ایک سیر بنا دیجئے گا، میں آدھ سیر کے پیسے ضرور دینا چاہتا ہوں۔

آپ کے انتقال کے بعد آپ کے لختِ جگر سید ابوبکر غزنوی مرحوم آپ کی مسند پر بیٹھے۔ اکابرینِ غزنویہ نے انہیں بالاتفاق اپنا امیر مقرر کیا۔ آپ ایم اے، ایل ایل بی بھی تھے۔ راسخ العقیدہ اور روشن خیال عالم دین تھے۔ ذکر اللہ کے بہت بڑے داعی تھے۔ 1965ء میں اخبار توحید جاری کیا۔ گاہے میں بھی اس میں لکھتا۔ پھر جب کبھی لاہور کے سفر کا ارادہ ہوتا موصوف کے خطبہ جمعہ کی خاطر عمداً ایک آدھ دن کی کمی بیشی سے جمعۃ المبارک کے دن کا پروگرام بناتا۔ خان موج دین خاں صاحب کے ہمراہ نمازِ جمعہ التزاماً شیش محل روڈ میں ادا ہوتی۔

آپ کا خطاب بالکل سلف کے نہج پر ہوتا۔ پہلے عربی میں خطبہ کہتے اور پھر اردو میں اس کا ترجمہ کرتے۔ درود و سلام کے بعد نہایت جچی تلی اور علم وفضل سے لبریز تقریر کرتے۔ خطبہ کے الفاظ اور دعاؤں کا انتخاب بھی سلف کے تتبع کے مطابق تھا۔ ان دنوں آپ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں صدر شعبۂ اسلامیات تھے۔ پھر آپ جامعہ اسلامیہ بہاولپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو گئے۔ اس انتخاب پر ملک کے گوشے گوشے سے تحسین واعتراف کیا گیا۔ نوائے وقت نے انتخاب کے اس حسنِ انتخاب پر مفصل اداریہ لکھا اور اسے حق بحق دار سید قرار دیا۔ اصحابِ اقتدار میں جس بھی کسی شخصیت نے ان کا نام پیش کیا ہوگا صدق واعتراف کا حق ادا کیا۔ یقیناً اس حسنِ انتخاب کا سہرا محترم جناب ملک غلام نبی

صاحب وزیرِ تعلیم پنجاب کے سر ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہی وہ بے مثال اور تعمیری حسنات ہیں جو جناب ممدوح ایسے اصحاب کے نامہ ہائے اعمال کی زینت بنائے جاتے ہیں۔ بہاولپور جامعہ اسلامیہ یونیورسٹی میں آپ کو بہت کم خدمات سرانجام دینے کی مہلت ملی۔ مگر آپ نے اس تھوڑے عرصہ میں دورِ جدید اور قدیم کے علمی تقاضوں کے اساسی نظریات کو ہم آہنگ کرنے پر جلیل القدر خدمات سرانجام دیں۔

مرحوم کے سفرِ لندن کے تقریباً دو ہفتہ قبل موج سے ملا تو ''سیدی وابی'' کتاب سے متعلق میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: ابوبکر نے مجھے کتاب نہیں بھجوائی کسی بات پر خفگی ہوگئی ہے، اب پھر جب صلح ہوگی تو کہیں گے ٹھہریئے میں آنسو پونچھنے کے لیے رومال لے آؤں اور پھر جب ان کے انتقال کی خبر پہنچی اور میں موج کے ہاں تعزیت کے لیے گیا تو موج کے انکسار ورقت کا عالم ہی دوسرا تھا۔ وہ آنسوؤں کے لیے دوسرا رومال لانے کا وقت ہی نہ ملا۔

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

موج صاحب ان کی وفات کا ذکر سنا رہے تھے۔ دفعتۃً ہی پروگرام بن گیا کہ جشنِ عالمِ اسلامی کے سلسلہ میں سرکاری وفد کے ہمراہ جائیں گے اور وہاں کوئی مقالہ بھی پڑھیں گے۔ 4 اپریل کو بسلسلہ تقریب لندن کے کسی ہوٹل میں تشریف لے گئے۔ میزبان بھی ان کے ہمراہ تھے۔ واپسی پر سڑک عبور کرتے ہوئے تیز رفتار کار کی زد میں آگئے۔ شدید مجروح ہوگئے۔ ظاہر ہے سرکارِ انگریزی کا دار الخلافہ لندن، عالمی اسلامی کانفرنس کے رکن اور سرکاری مہمان ویسٹ منسٹر ہسپتال میں علاج ہوتا رہا۔ اور ایک دن تو یہ بھی کہا: ''میرا لندن آنا اللہ تعالیٰ کو شاید منظور نہ تھا۔'' اور یوں بروز اتوار 25 اپریل موصوف نے جان جانِ آفرین کے سپرد کردی۔ آپ کا جسدِ خاکی 29 اپریل کو پاکستان لایا گیا۔ جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ میں ادا کیا گیا۔ ہزاروں لوگوں نے شرکت کی اور میانی صاحب کے قبرستان میں اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں آسودۂ لحد ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وللہ در القائل:

علیهم سلام الله في كل ليلة
بمقتل زوراء الي مطلع الفجرى
تحية مشتاق والف ترحم
على العلماء الراسخين ذوى البحرى

''ہر رات مطلع الفجر تک ان پر سلام نازل ہوتا رہے (مقتل زوراء) اور ہم مشتاقانِ دید کی طرف سے اس ذی البحری علماء راسخین پر ہزاروں ترحم بھرے سلام ہوں اور تحائفِ مغفرت نازل ہوں۔ آمین۔''[1]

[1] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

سیّدی واخی سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

تحریر: پروفیسر چوہدری عبدالحفیظ (مرحوم)

جذبات میں تلاطم ہے اور خیالات تند و تیز لہروں کی مانند ساحلِ دماغ پر پٹک رہے ہیں۔ ان کی شخصیت کے نقوش چند سطور میں بیان نہیں ہو سکتے۔ ع

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

سیدی و مخدومی برادر مکرم و محترم حضرت مولانا سید ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ جنہیں آج مرحوم لکھتے ہوئے دل کانپ کانپ جاتا ہے، ہاتھ لرزتا اور قلم کا سینہ شق ہوا جاتا ہے، ان سے تعلقات کا سلسلہ چودہ سال پرانا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں قریب سے قریب ہوتا چلا گیا۔ اس لئے کہ انہیں مجھ سے پیار تھا، ہاں وہ مجھ سے محبت کرتے تھے نہ جانے کیوں؟ یوں تو وہ سب سے پیار کرتے تھے۔ اللہ کی خاطر جو بھی ان کے پاس جاتا اسے پیار کرتے تھے مگر میں کہوں گا وہ مجھے چاہتے تھے، مجھے ان کی خلوتوں میں بیٹھنے کا شرف حاصل رہا اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ وہ میرے بغیر بے چین ہو جاتے تھے۔ اگر دن میں تین چار دفعہ ملاقات نہ ہوتی تو میرے لئے تڑپتے تھے۔

یوں تو ہم انجینئرنگ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں دن اکٹھے ہی گزارتے تھے مگر اس کے باوجود اگر شام کو مغرب کی نماز کے وقت ملاقات نہ ہوتی تو ایک تشنگی محسوس کرتے۔ عشاء کے بعد پھر کسی تقریر کا مسودہ، کسی تحریر کے نکات، کسی کتاب کی پلاننگ، شعبہ علومِ اسلامیہ کے مسائل، ملکی حالات پر تبصرہ۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پہنچانے کے منصوبے ان سب موضوعات پر گفتگو ہوتی رہتی۔ میں اس وقت ایک طالب علم تھا، یہ 1962ء کی بات ہے۔ دوسرے طالب علموں میں مَیں بھی موجود تھا۔ مگر ان کی پُرکشش شخصیت، ان کے علم و فضل، ان کی فصاحت وبلاغت، ان کی چال، ان کی گفتار، ان کا دلنشین اسلوبِ بیان، لیکچر کا وہ انداز جس میں شعر وادب پڑھاتے پڑھاتے قرآن و حدیث، فقہ اور مسائلِ تصوف اس حسین اور موثر ترین طریقے سے دل و دماغ میں اتار دیتے تھے کہ آج بھی ان کی چاشنی سے دل و دماغ باغ و بہار ہیں۔ وہ چال، وہ گفتار، وہ کردار کون سی خوبی تھی جو اس ''قدِ دلجو'' میں نہیں تھی۔ میں ان کے لیکچر کا ہر ہر لفظ نوٹ کرتا (الحمد للہ کہ اب بھی ان کی زبان گہربار کے وہ گرانمایہ خزانے میرے پاس موجود ہیں، فرصت ملی تو وہ بھی ایک ایک لفظ ہدیۂ قارئین کروں گا۔ ان شاء اللہ)

مجھے ایم اے عربی (فائنل) میں ریسرچ کے لئے مقالہ لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اورینٹل کالج کے ایک استاد محترم

نے میری تاریخ سے دلچسپی دیکھ کر موضوع تجویز کیا: بعلبک زمانہ اسلام میں، میں دو تین ماہ اس پر کام کرتا رہا۔ ایک دن حضرت (رحمۃ اللہ علیہ) سے دار العلوم تقویۃ الاسلام میں ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو انہوں نے پوچھا کہ ''بھائی کوئی ریسرچ کر رہے ہو۔ موضوع کیا ہے؟'' میں نے عرض کی: مجھے ''بعلبک زمانہ اسلام میں'' الاٹ ہوا ہے۔ فوراً فرمایا: ''حضرت نوح علیہ السلام کی ہڈیاں گننے والی رہ گئی تھیں سو وہ تمہیں دے دی گئی ہیں۔'' یہ الفاظ سن کر پاؤں تلے سے زمین کھسکتی معلوم ہوئی۔ میں بڑے شد و مد سے ریسرچ کے مراحل طے کرنا چاہتا تھا مگر حضرت جی (رحمۃ اللہ علیہ) کے الفاظ نے دل توڑ کر رکھ دیا۔ گزارش کی پھر آپ کوئی موضوع تجویز فرما دیجئے۔ فرمایا: میں ہر سال (جدید ادب ......) پر ایک طالب علم کو ریسرچ کروایا کرتا ہوں، آپ صبح کلاس میں بات کریں۔ ٹوٹے ہوئے دل کی امید بندھی۔ اگلے دن کلاس میں بات ہوئی، چار پانچ دوست تیار ہوگئے، اب آپ کسی ایک کو انکار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آخر کار دو موضوع تجویز ہوئے، منفلوطی اور اس کی تصانیف، ایلیا ابو ماغی۔ ایک مصر کا مشہور افسانہ نگار تھا، دوسرا لبنان کا مشہور شاعر۔

آپ چاہتے یہی تھے کہ منفلوطی پر راقم الحرف کام کرے، مگر قیصر صاحب بہت زیادہ مصر نظر آئے۔ مجھے فرمایا: ''آپ فی الحال دوسرا موضوع لے لیں یہ صاحب دو چار روز میں بھاگ جائیں گے۔'' ایسا ہی ہوا دوسرے تیسرے روز اس دوست کا درجۂ حرارت زوال پذیر ہوا۔ میں حضرت جی کے پاس حاضر ہوا مجھ سے انہوں نے درخواست لکھوائی اور اس پر اپنی سفارش کر کے فرمایا کہ پرنسپل جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے پاس چلے جائیں اور انہیں میری طرف سے بتا دیں کہ اس سال (MODREN LITERATURE) پر کام نہیں ہو رہا۔ میں استاذ گرامی قدر جناب سید عبداللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے درخواست کا پہلا جملہ پڑھ کر لکھ دیا: ''اب مقالے کا وقت نہیں رہا۔'' میں نامراد حضرت جی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا ان سے گزارش کی کہ ایک دفعہ پھر آپ سفارش کر دیں فرمانے لگے: ''یہ بات میرے اصول کے خلاف ہے کہ جس شخص کو ایک دفعہ میں (RECOMMOND) کر کے بھیج چکا ہوں اسے دوبارہ (RECOMMOND) نہیں کروں لیکن آپ کی خاطر یہ بھی کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ آپ کی مخلصانہ سعی سے مسئلہ حل ہوگیا۔

یہ حضرت صاحب سے پہلی ملاقات اور اس کی روداد تھی۔ پھر متواتر چھ سات ماہ ان کے درِ دولت پر اور کبھی ان کے کالج مقالے کی درستی اور اصلاح کے لیے حاضر رہتا اس طرح ان کے اور زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا۔ ایک روز فرمانے لگے: ''دونوں مل کر کوئی کام کریں۔'' عرض کی: ''جو حکمِ حاکم۔''

بی اے کے لیے ''تاریخِ اسلام'' لکھی۔ پھر ''معلقہ زہیر'' کی شرح کا کام شروع ہوا۔ 60/70 اشعار کی بڑی خوبصورت تشریح ہوئی۔ ایک ایک شعر کی تشریح میں شعر و ادب کے دریا بہاتے رہے۔ کبھی تشریح میں فارسی شعر لکھواتے، کبھی اردو کے اشعار سے ثبوت لاتے، کبھی عربی اشعار سے۔

افسوس کہ وہ شرح ان کے کاغذات میں اس کے بعد کہیں مل نہ سکی جن کا انہیں بہت افسوس تھا کہ شرح مکمل نہ ہو سکی اس لیے کہ ان کے والد حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی علیہ الرحمہ دسمبر 1963ء میں انتقال کر گئے۔ اس صدمے سے طبیعت بحال ہوئی تو پھر کام کی طرف طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔ فرمانے لگے: ''ایم اے کے طلباء کے لیے 'الایام' (از طٰہٰ حسین) کا ترجمہ اگر ہو تو کیا خیال ہے۔'' میں نے عرض کی کہ ''حضرت جی اس کا وہ ترجمہ جو کلاس روم میں آپ فرماتے رہے ہیں میرے پاس لفظ بلفظ موجود ہے۔'' فرمایا: ''اس کو تھوڑا سا پالش کرنے کی ضرورت ہوگی۔''

پھر اس ترجمہ کی پالش شروع ہوئی کافی حد تک کام مکمل ہوا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کی طبیعت میں ایک انقلاب آیا۔ والد رحمۃ اللہ علیہ کے فرائض اور ان کی مسند نشینی کا بوجھ ان کے کندھوں پر آن پڑا۔ انہیں جماعت کا ناظمِ اعلیٰ بنا دیا گیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ''اب دینی کام کریں گے، ادب کا کام کر کے کیا کریں گے؟'' میں نے عرض کی: ''حضرت جی آپ کو خدا نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا ہے، آپ قرآن و حدیث، فقہ، تاریخ، فصاحت و بلاغت، شعر و ادب، تاریخ، ڈرامہ، افسانہ، ناول غرضیکہ قدیم و جدید تمام علوم سے بہرہ ور ہیں۔ آپ زمانے کے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے موجودہ دور کے پڑھے لکھے طبقے کے لیے قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھیے۔'' فرمانے لگے: آپ کی تجویز بہت معقول ہے مگر ابھی کام بہت ہیں۔

دراصل والد علیہ الرحمۃ کی وفات کے بعد جماعتِ اہلحدیث کی صفوں میں جو خلاء پیدا ہوا تھا وہ اسے پُر کرنا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی تمام صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ پھر وہ دن بھی آیا جب ہم نے ''دار العلوم'' کے ہال میں نمازِ جمعہ ادا کرنے کا پروگرام بنایا پھر وہ جمعہ المبارک بھی آیا کہ جب آپ منبر پر کھڑے فرما رہے تھے: ''بس میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس دار العلوم کو خونِ جگر سے سیراب کروں گا۔ اپنی ہڈیوں اور پٹھوں کی کھاد دے کر اس کی نشأۃ ثانیہ کا اہتمام کروں گا، توحید و سنت کی تبلیغ و اشاعت کیلئے اپنی صلاحیتیں اپنی توانائی، اپنا مال اور اپنی جان تک اس کی نذر کروں گا۔''

انہوں نے جو کچھ فرمایا اسے سچ کر دکھایا۔ اپنی زندگی کے آخری دن تک دار العلوم کی خدمت کرتے رہے اور اتفاق دیکھیے کہ پاکستان میں ان کا آخری خطاب مورخہ 2-4-1976ء کو دار العلوم کے ہال میں ہی تھا۔

اسی دوران مجھے خانیوال میں ''لیکچرار شپ'' مل گئی اور میں ملازمت کی نئی مصروفیات میں کھو گیا۔ خیریت کی اطلاع تک نہ دے سکا مگر وہ دن میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے جب کالج میں میرے نام پہلا کارڈ آیا اور حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے خط آج تک میرے پاس موجود ہے۔

آپ بھی خط پڑھیے:

باسمہ

بھائی حفیظ!

وفا کند کہ بے گانہ آشنا کرد

و

ترا چہ شد کہ نمی پرسی آشنائے ترا

اپنی خیریت سے مطلع کیجیے۔ آپ نے جا کر کوئی خط نہ لکھا فکر مند ہوں۔

مخلص ''ابوبکر غزنوی''

ایک روز لاہور آیا تو کار میں بیٹھے فرما رہے تھے: ''چوہدری صاحب میں نے بیت اللہ شریف میں دو دعائیں کی تھیں، ایک یہ کہ اے اللہ اپنا کام کرنے کے لیے سواری عطا فرما اور دوسری "اللّٰھم ھب لي زمیلا نجیبا شریفا" (یہ ان کے الفاظ ہیں) یعنی اے اللہ مجھے شریف اور نیک ساتھی عطا فرما۔ گاڑی بھی مل گئی ہے اور دوسری دعا کے نتیجے میں آپ آئے ہیں۔ فرمایا: ''بے وفا ہوتے ہیں کبھی کسی نے وفا نہیں کی ایک آپ ہیں کہ وفا کر رہے ہیں۔''

میری زبان پہ بے ساختہ یہ شعر آ گیا:

ما قصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

خوشی سے قہقہہ لگایا اور شعر کی خوب داد دی۔

یوں پھر چھ سال بعد ان کی نظروں کا مرکز و محور بننے کا شرف حاصل ہوا۔ عین چھ سال بعد وہ 24 اپریل کی شام ان تعلقات کو ہمیشہ کے لیے توڑ کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

مصر کے مشہور افسانہ نگار نے ایک افسانے کی ابتداء میں لکھا تھا:

ما اکثر ایام الحیاۃ وما اقلھا

یعنی زندگی کے دن کتنے زیادہ ہیں اور حقیقت میں یہ کتنے قلیل ہیں۔

حضرت صاحب کی جدائی نے اس فقرے کا مفہوم سمجھایا۔ واقعۃً اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ لمحے گویا پلک جھپکنے میں گذر گئے۔ اے کاش! انہیں مستقل اور دیرپا بنایا جا سکتا۔ اماں قریش رحمہا اللہ کی جدائی پر انہوں نے کہا تھا: ''اماں قریش رحمہا اللہ رحلت فرما گئیں، دنیا سے آخرت کا سفر دو چار گام ہی تو ہے اور یہ فاصلہ پلک جھپکنے میں طے ہو جاتا ہے۔ ان کے کردار کا بیان میرے قلم کا محتاج نہیں۔''

مرحوم نے اماں قریش رحمہا اللہ کے بارے میں یہ بھی لکھا: ''توحید، للّٰہیت، حبِ الٰہی، عشقِ رسول ﷺ، تعظیمِ اولیاء، شعر و ادب، تصوف، تہذیب و شائستگی، خدمتِ خلق، سوز و گداز اور گریہ زاری کا امیختہ بنایا گیا۔ اور اس سے اماں قریش کا وجود تیار ہوا۔ وہ وجود ہمیشہ تحریک کا مجسمہ تھا۔ وہ وجود جس پر جمود حرام تھا وہ بہتّر برس اس جہانِ آب و گل میں رہیں اور آخری دم تک رواں دواں تھیں۔ وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھیں۔ ایک چلتا پھرتا ادارہ عالمِ برزخ میں منتقل

ہوا۔ میں کیا کہوں؟

اس میں اماں قریش رحمہا اللہ کی جگہ سید ابوبکر غزنوی اور بہتر برس کی جگہ چھیالیس برس کا اضافہ کافی ہے۔

حبِ الٰہی:

سید ابوبکر رحمہ اللہ حبِ الٰہی سے سرشار تھے۔ حبِ الٰہی اُن کے رگ و ریشے میں سرایت کر گئی تھی اس لئے کہ اس کی دعا کرتے تھے، ان کے ہر ہر بن مو سے حبِ الٰہی کی آبشاریں پھوٹتی تھیں۔ وہ جب ذکرِ الٰہی میں مصروف ہوتے تو انوار کی بارشیں ساری محفل پر موسلا دھار برستی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو کر ان کی ڈاڑھی مبارک میں جذب ہو جاتے، وہ یادِ الٰہی میں ڈوب کر اللہ کے خوف سے روتے تھے۔ دوسروں کو بھی رلاتے۔ وہ دوست جنہوں نے ان کے ساتھ خانس پور کی پہاڑیوں پر اور مری کے واپڈا ریسٹ ہاؤس میں ایک ایک ہفتہ گزرا ہے وہ ان کیفیات کی گواہی دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر منور حیات صاحب سے پوچھئے کہ جس روز اسلامی کانفرنس کے مہمانوں کو شالامار باغ میں دعوت دی گئی تھی اس روز مغرب کی نماز انہوں نے غزنوی رحمہ اللہ کے ہمراہ یونیورسٹی میں ادا کی تھی، وہ کیا کیفیات تھیں جن کے بارے میں وہ دوستوں سے پوچھتے پھرتے تھے۔ آخر سید صاحب نے فرمایا: ڈاکٹر صاحب یہ تو راز و نیاز کی باتیں ہیں، انہیں عام نہ کیجئے۔ وہ اسمِ ذات کا بے پناہ ذکر کرتے تھے، ان کی زبان اللہ کی یاد سے ہر وقت تر رہتی تھی۔ ریاض صاحب کے خط میں جو تفصیلات لندن سے آئی ہیں ان میں لکھا ہے کہ وہ اللہ اللہ کرتے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے، آخری کلمات یہ تھے۔ ''اللہ اللہ اللہ یا اللہ رحم فرما''۔ الحب للہ والبغض للہ کی زندگی بھر تلقین کرتے تھے اور اس پر عمل کراتے تھے۔ اگر انہوں نے کسی کے ساتھ محبت کی تو اللہ کی خاطر، کسی کے ساتھ ان کا اختلاف تھا تو اللہ کی خاطر۔ ذاتی دشمنیوں اور کدورتوں کو کبھی انہوں نے دل میں جگہ نہ دی تھی۔ اسلام کے دشمن ان کے دشمن تھے، اسلام کے دوستوں کے وہ سچے شیدائی تھے۔

عشقِ رسول ﷺ:

اُن کا دامن عشقِ رسول ﷺ سے مالا مال تھا۔ رسول اکرم ﷺ سنت کی معرفت انہیں حاصل تھی، ان پر اللہ کا اس لحاظ سے خاصا کرم دیکھا کہ وہ ہر عمل کو سنت کی روشنی میں جانچنے کے عادی تھے، سنت کو چھوڑ کر کسی دوسرے عمل سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ میں نے ہزار ہا مرتبہ دیکھا جب بھی پانی پیتے تھے التزام سے تین مرتبہ سانس لیتے تھے، بعد میں الحمد للہ اس درد سے پڑھتے کہ پاس بیٹھنے والا محسوس کر لیتا تھا کہ الحمد للہ ان کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہا ہے صرف زبان کے اگلے حصے سے نہیں۔ بارگاہِ رسالت کا ادب و احترام اس درجہ ملحوظ خاطر رکھتے تھے کہ بہت سے عاشقانِ رسول ﷺ ان کی کیفیات کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ وہ سنت کے شیدائی تھے، آنحضرت ﷺ کی اتباع ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا ''محمدی انقلاب'' کو پاکستان میں نافذ کرنے کے لئے خصوصاً اور ساری کائنات میں پھیلانے

کے لئے عموماً اپنے دل میں عجیب تڑپ رکھتے۔ آخری سال میں یہ دعا اکثر ان کے لبوں پر جاری رہی: ''اے اللہ اپنے پیغام کو حسین ترین اور مؤثر انداز میں ساری کائنات میں پیش کرنے کی توفیق عطا فرما۔''

پنجاب یونیورسٹی میں آخری تقریر 30 مارچ 76ء میں انہوں نے فرمایا تھا کہ آیئے ہم عہد کریں کہ نبی اکرم ﷺ سے بے وفائی نہیں کریں گے۔ یہ اُن کے عشقِ رسول کا مظہر ہے۔ پاکستان سے رخصت ہونے سے پہلے وہ حضرت رسول اکرم ﷺ سے وفا کا وعدہ لے رہے تھے۔ ان کا نظریہ یہی تھا۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

ادب و تعظیم:

جناب سید صاحب رحمہ اللہ سراپا ادب تھے، اولیاء اللہ کا نام نہایت ادب و احترام سے لیتے تھے، علماء کی حد درجہ تعظیم بجالاتے تھے، دنیاداری کے برعکس اہلِ دل، اہلِ علم اور اہلِ اللہ حضرات ان کے ہاں زیادہ عزت پاتے تھے۔ جب یہ علم ہوتا کہ یہ آدمی محض اللہ کی خاطر آیا ہے تو سب کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ ائمہ کرام اور فقہائے عظام کا نام ہمیشہ عزت سے لیتے تھے، ''رحمۃ اللہ علیہ'' کے بغیر کبھی نام نہ لیتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے: دین سراسر ادب ہے، توحید سراسر ادب ہے۔

میں نے ان سے ادب کی لطافتیں سیکھی ہیں، مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ کوئی خط لکھوانے لگے تو میں نے حدیث کی ایک کتاب جو سامنے پڑی تھی پکڑ کر کاغذ کے نیچے رکھنے کی کوشش کی تو میرے ہاتھ سے فوراً کتاب چھین لی اور ایک کاپی اٹھا کر دے دی۔ ایک دفعہ قرآن مجید پر تفسیر کی کوئی کتاب رکھی تو فوراً اوپر سے اٹھانے کا حکم دیا فرمایا: حفظِ مراتب کا ہمیشہ خیال رکھو، ہاں قرآن مجید کے نیچے رکھ سکتے ہو جس کسی کاغذ پر ''بسم اللہ'' لکھی ہوئی ہوتی اسے پھاڑ کر کبھی ردی کی ٹوکری میں نہ پھینکتے تھے۔ فرمایا کرتے کہ آنحضرت ﷺ کا ادب سیکھنا ہو تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سیکھو۔

علم و فضل:

علم و فضل سے انہیں وافر حصہ ملا ہوا تھا، زمانہ طالب علمی میں وہ تشکیک کی وادیوں میں بھی سرگرداں رہے۔ اس لیے تلاشِ حق میں انہوں نے بے شمار کتابیں پڑھیں۔ ان میں مستشرقین کی وہ کتابیں بھی شامل تھیں جن میں اسلام پر بے شمار اعتراضات اٹھائے گئے تھے اور ان کی بدبختی عیاں تھی۔

خاندانِ غزنویہ کا چشم و چراغ ہونے کی حیثیت سے دینی علوم کے دریا ان کے گھر میں بہتے تھے، اسی دریا سے انہوں نے بھرپور فیض پایا تھا۔ مغربی تعلیم کے افکار ونظریات کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور آخر صراطِ مستقیم کو پالیا۔ انہیں کے الفاظ ہیں: ''راقم مدتوں تشکیک کی وادیوں میں سرگرداں رہا اور تخلیق کی سنگلاخ راہوں سے گزر کر جب منزل کا سراغ ملا

تو یہ دیکھ کہ حیرت ہوئی اور مسرت بھی کہ یہ تو وہی منزل ہے جس کی نشاندہی حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی، میں حضرت یوسف علیہ السلام کی اقتداء میں پکار اٹھا:

﴿وَاتَّبَعۡتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَاِسۡحٰقَ﴾ [یوسف:38]

ان کی ذات قدیم و جدید علوم کا سنگم تھی۔ ان کا خطبہ، ان کی تقریر، ان کی گفتگو ہمیشہ علمی ہوتی تھی۔ اسلوبِ بیان اس قدر آسان ہوتا کہ ہر سطح کا آدمی اسے سمجھ سکتا تھا۔ اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اندازِ بیان اس قدر حسین اور مؤثر تھا کہ ان کی ایک ایک بات دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی۔ جب وہ تقریر کے لیے کھڑے ہوتے تو ایک سناٹا محفل پر طاری ہوجاتا، علماء الگ لطف اندوز ہوتے، طلباء اور نوجوان طبقے اپنی جگہ شادمان نظر آتے۔ پروفیسر حضرات اپنی جگہ خوش نظر آتے۔ وکیل، ڈاکٹر، انجینئر اور جج سمجھ رہے ہوتے کہ ان کے دل کی بات ہو رہی ہے۔ شعراء، ادیب حضرات ان کے ادبی چٹکلوں سے محظوظ ہوتے۔ عام پڑھے لکھے لوگ خطاب کی مقصدیت دیکھ کر خوش ہوتے کہ ان کے دل کی بات بیاں ہو رہی ہے۔ غرضیکہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

دورانِ تقریر قرآنِ مجید کی آیات یوں پیش کرتے کہ بعض دوستوں کو ان پر حافظِ قرآن ہونے کا گمان ہوتا حالانکہ وہ حافظِ قرآن نہ تھے مگر قرآنِ مجید پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ قرآنِ مجید اٹھا کر آیات دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ حدیثِ رسول ﷺ کی لمبی لمبی عبارتیں یوں روانی اور اعتماد کے ساتھ پڑھتے کہ بعض اوقات یوں گمان ہوتا کہ شاید لوحِ دماغ پر بخاری اور مسلم شریف نقش ہیں۔ انگریزی محاورات، ان کا اردو ترجمہ، عربی عبارتیں اور ان کے اردو الفاظ ساتھ بیان کردیتے تاکہ سامعین میں سے کسی بھی سطح کا آدمی ابلاغ سے محروم نہ رہے۔

ان کی سب سے بڑی خواہش دینِ اسلام میں ابلاغ تھا۔ مطالعہ میں کوئی ایسی صنف باقی نہ تھی جس سے انہوں نے استفادہ نہ کیا ہو۔ قرآن و حدیث ان کی وراثت تھی، شعر و ادب سے انہیں طالب علمی کے زمانے سے بہت دلچسپی رہی۔ ناول، ڈرامہ، افسانہ، تاریخ ہر قسم کی کتابیں ان کی لائبریری میں موجود تھیں۔

حافظہ اس قدر تیز تھا کہ جو بات ایک دفعہ لوحِ دماغ پر نقش ہوجاتی وہ برسوں انہیں نہ بھولتی تھی۔ ان کے شاگرد اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ ''طٰہٰ حسین'' کی عبارتیں انہیں زبانی حفظ ہوتی تھیں اور دورانِ گفتگو انہیں اسی روانی سے پڑھتے تھے۔ اور مسکرا کر فرمایا کرتے تھے: ''میرا شیخ یوں کہتا ہے۔''

موقع محل کے مطابق کبھی شعر چسپاں کرنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ اس لحاظ سے انہیں شاعروں کے دواوین حفظ تھے مگر وہ ان سب اشعار کو دین کے معاملے میں اس سلیقہ کے ساتھ چسپاں کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا یہ شعر اسی موقع

کی مناسبت کے لیے کہا گیا ہے۔

ان کا دامن علم و فضل کی لازوال اور بے پناہ دولت سے مالا مال تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے سامنے بڑے بڑے علماء اور ادباء کا چراغ نہ جلتا تھا، جب وہ قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ اور شعر و ادب سے دلائل کی بوچھاڑ کرتے تو ان کی بات تسلیم کرتے ہی بنتی تھی۔

میں یہ کہوں گا کہ وہ علم کا ہمالہ تھے۔ قدیم و جدید علوم ان کی ذات میں مجتمع تھے۔ اور ایسے انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں جو بیک وقت دونسلوں کی بات کرتے ہوں اور دونوں سے داد پاتے ہوں۔ وہ صرف ممتاز عالمِ دین، مصنف، بلند پایہ محقق، عظیم خطیب، دانشور، ماہرِ تعلیم نہ تھے بلکہ شاعر، نقاد، ادیب اور صحافی بھی تھے۔

عالم باعمل:

وہ عالم باعمل تھے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے: ''مجھے اپنے آباء و اجداد میں حضرت عبداللہ غزنوی سے طبعی مناسبت ہے۔''

سید ابوبکر غزنوی توحید کا ایک تصور رکھتے تھے اور وہ قرآن و حدیث کی توحید کا تصور تھا۔ فرمایا کرتے تھے: ''توحید صرف قبر نہ پوجنے کا نام نہیں بلکہ اصل توحید یہ ہے کہ انسان وقت کے فرعونوں کے سامنے کلمہ حق کہے، وقت کے نمرود کے سامنے جھکنے سے انکار کردے کہ یہی ہر پیغمبر کی توحید تھی۔''

ان کا اپنا عمل بھی اس توحید پر تھا وہ کبھی کسی سرمایہ دار کے آستانے پر چل کر نہیں گئے۔ انہوں نے کسی وقت کے فرعون یا نمرود کے سامنے اپنی گردن خم نہیں کی، وہ ہمیشہ کلمہ حق کہتے تھے۔ منبر و محراب، شام ہمدرد کی سٹیج، کالج اور یونیورسٹیوں کے در و دیوار مجلسِ ذکر کے احباب اس بات کی گواہی دیں گے کہ انہوں نے خدا کے علاوہ کسی جابر سے جابر بادشاہ کا خوف بھی اپنے ذہن پر طاری نہ ہونے دیا تھا۔ ہاں وہ فقیروں کی مجلس میں بن بلائے بھی چلے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر غریب اور مسکین انسانوں کے ہاں جانے میں انہیں کبھی عار نہیں تھی۔

سٹاف کالونی میں بہت سے ایسے لوگ تھے جن کی تمنا ہی یہی تھی کہ سید صاحب ان کے گھر آئیں مگر وہ نہ جاتے تھے۔ بندۂ عاجز نے جب بھی درخواست کی چلے آئے اور دو تین مرتبہ اچانک تشریف لائے تھے۔

مگر مہمان فقیروں کے ہوئے ہیں بادشاہ مگر

انہوں نے حضرت عبداللہ غزنوی کی ساری زندگی پڑھی تھی اور بہت حد تک روحانیت میں عبادت میں کلمۂ حق کہنے میں دین کو پھیلانے میں انہوں نے وہی طریقہ اختیار کیا جو حضرت عبداللہ غزنوی کا متعین کردہ تھا۔ للٰہیت، تقویٰ، ذکرِ الٰہی، کثرتِ ذکر، دوامِ ذکر، درود شریف اور بے پناہ درود شریف ..... یہی وہ بنیاد تھی کہ جس کی بناء پر ان کا ہر وعظ اثر انگیز ہوتا۔

وہ کسی بھی جلسے کو خطاب کرنے سے پہلے ذکر کرتے۔ جب گاڑی پر جلسہ کی طرف رواں ہوتے تو ذکر کے انوار ان کے چہرے سے پھوٹ پڑتے تھے۔ اس عالم میں ان کے چہرے پر نظر نہیں رکھی جاتی تھی۔ صبح کے وقت نمازِ فجر کے بعد سے 9 بجے تک ذکر میں مشغول رہتے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک روز کلاس نے مجھے کہا کہ غزنوی صاحب سے درخواست کروں کہ صبح سویرے سات بجے ہمارا (EXTRA PERIOD) لے لیں۔ میں نے نمائندگی کرتے ہوئے درخواست کی۔ فرمایا: ''یہ وقت تو حاصلِ عمر رائیگاں ہے۔''

یہ فقرہ میں نے بارہا ان کی زبان سے سنا تھا۔

وہ دن مجھے ہرگز نہیں بھولتا۔ میں صبح سویرے ان کے درِ دولت پر حاضر ہوا، قبلہ رو منہ کیے ہوئے کرسی پر بیٹھے تھے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ چہرہ ذکر کی کثرت اور اس کے انوار سے ٹمٹما رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی ہاتھ سے پاس پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہوئی یوں محسوس ہوا جیسے میں انوار کی بارش میں غسل کر رہا ہوں، میری زبان پر بھی یکا یک ذکر جاری ہوگیا۔ کوئی پانچ چھ منٹ بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ میں نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ دعا سے فارغ ہو کر دل نواز مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا: ''میں معذرت چاہتا ہوں آپ کو انتظار کرنا پڑا۔''

مرحوم دل کے اور شوگر کے مریض تھے مگر انہوں نے کبھی کوئی روزہ نہیں چھوڑا۔ انہیں ڈاکٹر بھی اللہ نے ایسے دیئے تھے کہ جو انہیں روزہ چھوڑنے کی تلقین کبھی نہ کرتے۔

ہر سال جو زکوٰۃ بنتی تھی اس کا حساب اس سے کچھ زیادہ ہی نکالتے تھے۔ فرماتے تھے: ''اللہ کے ساتھ دو جمع دو چار کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے تاکہ وہ بھی بغیر حساب کے جنت میں داخل کر دے۔''

حج کی سعادت سے بھی دو دفعہ بہرہ ور ہو چکے تھے۔ کسی کا حق نہ رکھتے تھے۔ یتیموں، مسکینوں کا انہیں ہمیشہ خیال رہا۔ وہ چپکے چپکے غربا کو گھر میں بلا کر ان کی مدد کرتے تھے۔ اس میں مجھے ان کے راز دار ہونے کا شرف حاصل ہے، مجھے حکم فرماتے: ''جو لوگ مستحق ہیں انہیں میرے پاس بھی دیجیے ان کی ضروریات مجھے بتائیے کہ اس کو کم از کم کیا کیا دوں۔''

وہ لوگ اب میرے پاس آئے اور رو رو کر کہنے لگے سید ابوبکر صاحب اس دنیا سے چلے گئے وہ ہمارے مربی اور محسن تھے۔ سنت کے شیدائی تھے ہر کام میں رسول اکرم ﷺ کے اسوہ کو پیشِ نظر رکھتے۔ انہیں حضورِ اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کی ذات کی عجیب معرفت حاصل تھی۔ ہر بات میں فرمایا کرتے تھے:

''دیکھیے فلاں وقت پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔''

یا

''فلاں وقت پر یوں عمل کر کے دکھایا۔''

جب بھی حج کو گئے روضۂ اقدس کی حاضری پر بہت خوش تھے۔ اکثر فرماتے تھے کہ حج کے زمانے میں وہاں بھیڑ بہت ہوتی ہے کبھی عمرہ کرنے جائیں گے تو پھر وہاں سکون و اطمینان کی حالت میں حاضری کا شرف حاصل کروں گا اور لندن سے واپسی پر ان کا عمرہ کا بھی پروگرام تھا۔

آنحضرت ﷺ کے نام نامی اسم گرامی زبان پر آتا تو دل کی گہرائیوں سے ''ﷺ'' کی آواز آتی۔ چہرے پر عجیب تاثرات ہوتے جیسے کوئی حضورِ یار تاب مجال نہ پاتا ہو۔ ہاں اگر حضورِ اقدس ﷺ کے انقلاب کو بیان کرنے کی بات آتی گھنٹوں آنحضرت ﷺ کی ذہانت و فراست میں نفسیاتی (APPROACH) پر دلائل کی بارش کرتے چلے جاتے۔ فرماتے تھے: ''ولی کی اصل نشانی یہ ہے کہ وہ سنت کا پابند ہو۔ کشف، کرامت، القاء، الہام کو ولی کی نشانی نہ جانتے تھے۔ بلکہ فرماتے تھے: کشف تو شیطان کو بھی ہوتا ہے، اس لیے جو آدمی جس قدر سنت کا تابع ہوگا اسی قدر ولی اللہ ہوگا۔''

وہ خود بھی ولایت کے درجے پر فائز تھے کہ وہ متبع سنت تھے۔

خطابت:

فنِ خطابت کے وہ شہسوار تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان کی طرح قادر الکلام خطیب تھے۔ بات ہمیشہ مرتب اور مربوط کرتے تھے۔ ان کی گفتگو حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی، الفاظ کی تراش خراش کا انہیں بے پناہ ملکہ تھا وہ فصاحت و بلاغت کے موتی رول لیتے تھے۔ ان کی اردو کوثر و تسنیم سے دھلی ہوتی تھی۔ سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے۔

بڑے جلسے ان کی خطابت کے بغیر پھیکے نظر آتے ۔ جہاں لوگوں کو علم ہو جاتا کہ سید ابو بکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ تقریر کرنے والے ہیں۔ سامعین کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ وہ سٹیج سے اترتے تو لوگ انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتے، کوئی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتا تو کوئی زندگی کے مسائل سے راہنمائی چاہتا۔ وہ ہمیں فرمایا کرتے تھے: ''ایسے جلسوں سے وہ جوہر قابلِ تلاش کیا کرو جو ''تحریک احیاءِ دین'' میں ہمارا دست و بازو بن سکے۔''

سارے پاکستان میں ان کی خطابت اور فصاحت و بلاغت کا سکہ مان لیا گیا تھا۔ وہ بہت بڑے Orator تھے۔ ان کے فقروں میں کبھی جھول نہ ہوتا تھا۔ ہر لفظ اور ہر فقرہ سوچ کی بھٹی سے عین کندن بن کر نکلتا تھا۔ زبان سے الفاظ نہیں لعل و گوہر کی بارش ہوتی تھی۔ ہر لفظ جدا جدا بولتے تھے۔ جس طرح ٹیکسائل سے گھڑے گھڑائے سکے ایک ایک کر کے گرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی زبان سے پر ہر لفظ منجھا ہوا اور Polished ہوتا۔

وہ بیک وقت اردو، عربی، فارسی، پنجابی، انگریزی زبان کے ماہر تھے اور ہر زبان سیکھنے کے لیے انہوں نے اس زبان کے شعر و ادب سے برسوں استفادہ کیا۔ عام طور پر لوگوں کو اس بات کا علم نہیں کہ وہ پنجابی بھی بولتے تھے مگر راقم

الحروف کو علم ہے کہ وہ پنجابی بولتے تھے اور ان کی پنجابی زبان میں بھی ادب کی ساری چاشنیاں موجود تھیں۔

ایک دفعہ دیہات کے ایک جلسے میں تشریف لے گئے، لوگوں نے مطالبہ کیا کہ: ''شاہ جی پنجابی وچ تقریر کرو۔''

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پنجابی میں خطاب کیا، پھر روایتی زورِ بیاں اور نستعلیق پنجابی سے دیہاتیوں کے دلوں کو موہ لیا۔ واپس تشریف لائے تو مجھے فرمایا: ''آج میں پنجابی تقریر میں ہیر وارث شاہ، بابا بلھے شاہ اور بابا فرید گنج شکر رحمہم اللہ کے دواوین سے الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتا تھا اور اس وقت میرے حافظے میں یہ سارے دیوان موجود تھے۔''

اردو زبان میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنا استاذ مانتے تھے۔ عربی زبان میں ''طٰہٰ حسین'' اور پنجابی زبان سیکھنے میں اپنے بڑے بھائی مولانا عمر فاروق صاحب کے خوشہ چین بھی تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آج تک برصغیر پاک و ہند میں کوئی ایسا صاحبِ طرز خطیب نہیں آتا کہ جسے بیک وقت قدیم و جدید علوم پر دسترس کے ساتھ ساتھ ایسی قادر الکلامی بھی عطا ہوئی جو سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل تھی۔

شانِ بے نیازی:

شانِ بے نیازی تو ان میں بہت پرانی تھی مگر اپنے نیاز مندوں سے (بے نیازی) نہ تھی۔ اپنے نیاز مندوں سے ہمیشہ پیار کرتے تھے مگر کوئی سرمایہ دار یا بزعمِ خود کوئی افسر یا خود فریبی میں مبتلا صاحب مال وجاہ ان کے پاس آتا تھا تو اسے یہ احساس ہوتا تھا کہ سیدی و مخدومی کی محفل میں درویشوں اور فقیروں کو باریابی تو حاصل ہے مگر اہلِ دولت کو نہیں۔

دولت ان کی دہلیز پر ناک رگڑتی ہوئی آتی تھی مگر وہ اسے دھتکار دیتے تھے اگر وہ محض دنیادار ہوتے تو خدا کی قسم ان کے بچے آج دولت میں کھیلتے۔ مگر ان کی شانِ بے نیازی کا زندہ ثبوت ہے کہ ان کا مکان نہیں تھا، کوئی دکان نہیں تھی کوئی پلاٹ نہیں تھا۔ ان کے پاس اپنی کوئی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ نہ تھی، سوائے اپنی تنخواہ کے کوئی ذریعہ آمدنی ان کا نہ تھا۔

ساری عمر دار العلوم کے دو کمروں میں بیوی بچوں سمیت گزار دی مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ اس بے نیازی کا مظاہرہ تو انہوں نے آخری دفعہ بھی خوب کیا۔ زندگی کے آخری ایام لندن کے ایک ہسپتال میں گزارے پاکستان کا کفن تک نصیب نہ ہوا۔

اہلِ پاکستان نے کسی قسم کا کوئی احسان ان پر نہیں کیا۔ جو زندگی بھر جاہ و چشم کے ایوانوں سے بے نیاز رہا جو پاکستان کی سالمیت اور اس میں اسلامی نظام نافذ کرنے کی بھرپور سعی آخری دم تک کرتا رہا۔ بارہ سال پہلے ایک دفعہ انہوں نے فرمایا تھا: ''ہم نے طبیعت غزنوی مگر قسمت ایازی پائی ہے۔''

دیکھیے حالات نے الفاظ کی صداقت کو کیونکر سچ کر دکھایا؟

ذوقِ شعر:

شعر و ادب کا انتہائی پاکیزہ اور اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ کسی زمانہ میں خود بھی شعر کہتے تھے۔ عربی میں بھی انہوں نے

اشعار کہے۔ طنز و مزاح سے بھرپور شاعری بھی کی۔ وہ ایک ماہر نقاد بھی تھے۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے انہیں ذہانت و فطانت سے وافر حصہ عطا کیا تھا کہ ہر صنفِ ادب میں انہوں نے کوئی نہ کوئی یادگار چھوڑی ہے۔ جو شعر انہوں نے بچپن یا جوانی میں یاد کیے آج بھی ان کی لوحِ دماغ پر نقش تھے۔ گفتگو کے دوران ''تقریر کے درمیان'' خطبہ جمعہ میں وہ اس خوبصورتی سے عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کے اشعار استعمال کرتے تھے کہ سامعین تصویر حیرت بنے رہ جاتے تھے۔ آپ نے جو جو شعر جس جس موقع پر استعمال کیا یوں معلوم ہوتا کہ شاعر نے یہ اس موقع کی مناسبت سے کہا تھا۔ شعر کی بحروں اور اس کے اوزان و قوافی پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا۔ ان کے سامنے کوئی غلط شعر پڑھتا تو فوراً فرماتے: اس شعر میں جھول ہے۔ اگر کبھی اچھا شعر سناتا تو جی کھول کر اس کی داد دیتے۔

پچھلے موسمِ بہار (1975ء) کی بات ہے، یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ہم ان کے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ایک مکان کی چار دیواری سے باہر سر اٹھائے سویٹ پی (SWEET-PEAS) کے رنگ برنگے پھول مہک رہے تھے جونہی خوشبو سونگھی فرمایا: ''واہ سبحان اللہ کیسی پیاری خوشبو ہے۔ کیسا دلفریب منظر ہے۔''

میری زبان پہ میر درد کا یہ شعر بے ساختہ آ گیا:

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں
گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

شعر سن کر مسکرائے اور خوب داد دی اور فرمایا: ''پھر پڑھیے۔'' میں نے دوبارہ شعر پڑھا۔ فرمانے لگے: ''دوسرے مصرعے میں جھول ہے۔'' عرض کی: ''مجھے تو اس طرح یاد ہے۔'' فرمایا: ''اسے دیکھیں۔'' جب گھر آ کر تلاش کیا تو واقعۃً دوسرے مصرعے میں جھول موجود تھا۔ اس لیے کہ میں نے ''گریباں'' کی جگہ ''داماں'' پڑھا تھا۔

تہذیب و شائستگی:

ان کی چال ڈھال سے تہذیب و شائستگی ٹپکتی تھی۔ گفتگو کا انداز اتنا دلنواز اور دلنشین تھا کہ ہر آدمی ملاقات کے بعد آپ کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا۔

اگر کوئی مذہب کے بارے میں سوال کرتا تو ان کی آنکھوں میں یکا یک ایک چمک سی پیدا ہو جاتی، دماغ کے سیل آن (ON) ہو جاتے۔ پھر قرآن و حدیث سے دلائل کے انبار لگا دیتے۔ آنکھوں سے پھوٹنے والی روشنی اور چمک سے مخاطب خیرہ ہو جاتا اور اسے تسلیم کرنا پڑتا کہ اس معاملے میں آپ کی رائے حرفِ آخر ہے اس سے آگے نہ سوال کی گنجائش ہے نہ بحث و تمحیص کی۔ اگر باوجود دلائل دینے کے کسی کو بات سمجھ نہ آتی تو یہ کہنے کی بجائے کہ آپ کو بات سمجھ نہیں آ رہی فرماتے: ''میں اپنا نقطہ نظر اچھی طرح واضح نہیں کر سکا'' لہٰذا دوبارہ اس بات کو سمجھانا شروع کر دیتے۔ اگر کسی سے اختلافِ رائے بھی ہوتا تو اس پر کبھی برا نہ مانتے۔ ہاں اگر کبھی تعرض کی صورت پیدا ہوتی تو ہر عمل کرتے ہوئے

پہلو بچاتے، چال میں اگر وقار تھا تو گفتار میں ایک جلال بھی۔ ان کی ساری زندگی اعتدال کا ایک نمونہ تھی وہ نیکی اور شرافت کا مجسمہ تھے اور اس شعر کی زندہ تصویر تھے:

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ذوقِ جمالیات:

اچھا کھانے، اچھا پینے اور ہر چیز میں اچھائی ڈھونڈنے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں عظیم ملکہ عطا کیا تھا۔ ان کی زندگی گویا اس حدیث کے مصداق تھی، جہاں بھی کوئی چیز اعتدال اور توازن سے ہٹی ہوئی معلوم ہوتی انہیں اس بات پر سخت کوفت ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن ایک دوست کی ڈاڑھی کے بال سنورے ہوئے نہیں تھے۔ نہ تیل، نہ کنگھی، نہ آرائش کا کل ورخسار لطیف۔ طنز و مزاح کے عالم میں اس دوست کو سمجھایا کہ ''آنحضرت ﷺ نے اس بات سے منع کیا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اسے پسند فرماتے ہیں۔ ان اللہ جمیل ویحب الجمال. یعنی اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ فرمایا: ''مسلمان خوبصورت ہوتا ہے ظاہری شکل وصورت میں بھی اور باطنی طور پر بھی۔''

اپنے لباس اور وضع قطع کا انہیں ہمیشہ خیال رہا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو آدمی اُدل جول بالوں کے ساتھ پبلک کے سامنے آتا ہے وہ اسلام کو رسوا کرتا ہے۔ اسلام تو ہے ہی نفاست پسندی کا نام، میلے کچیلے کالر دیکھ کر انہیں بعض احباب پر غصہ آتا تھا۔ صرف اس لیے کہ لوگ انہیں اسلام کا نمائندہ سمجھتے ہیں اور انہیں یہ تمیز بھی نہیں کہ ہماری وجہ سے لوگ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، اس لحاظ سے انہوں نے اسلام پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔

خوشبو بہت زیادہ استعمال کرتے تھے۔ ملاقات کے کمرے میں باقاعدہ بال سنوار کر، اُجلا اور صاف ستھرا لباس زیبِ تن کر کے آتے تھے۔ ہاں اگر اپنے BED ROOM میں ہوتے تو یہ اہتمام نہ کرتے تھے لیکن یہ رعایت صرف چند احباب کے لیے تھی۔

پھلوں کی دعوت ہوتی یا مجلس ذکر کے لیے افطاری کا اہتمام ہوتا تمام احباب کی موجودگی میں فرماتے: ''یہ کام چوہدری حفیظ صاحب پر چھوڑ دیجئے (وہ مجھے اسی طرح ہی یاد فرماتے تھے) یہ زراعت کے ماہر ہیں۔''

بگفتا من گلے ناچیز ہر دم
ولیکن مدت باگل نشینم
جمال ہم نشیں درمن اثر کرد
وگرنہ من ہمہ خاکم کہ ہستم

کہاں تک بیاں کروں یہ مضمون ان ساری تفصیلات کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

حقیقتاً انہیں اپنے احباب کے ذوق جمالیات کی تعریف کرنے میں کوئی بخل نہ تھا اور اس ضمن میں ڈاکٹر راشد صاحب تو ہر دفعہ دوستوں سے زیادہ داد پاتے تھے۔

سایۂ شفقت و محبت:

میرے لیے ان کا وجود گھنے، ٹھنڈے اور وسیع وعریض سائے سے عبارت تھا۔ ان کی شفقت و رحمت کے بازو اس قدر دراز تھے کہ جہاں کہیں بھی ہوتا وہ مجھ پر سایہ فگن رہتے۔ میں زندگی کے ہر معاملے میں ان سے مشورہ کرتا تھا۔ ان کا مشورہ ہمیشہ صائب ہوتا۔ وہ خرد کی گتھیوں کو پلک جھپکنے میں سلجھا دیتے تھے۔

بہاول پور میں تھے تب بھی میں ان کی نظر کرم کا مرکز تھا۔ وہ مری میں ہوتے اور میں گاؤں میں ہوتا، مجھے یوں محسوس ہوتا کہ اس ٹھنڈے اور راحت فزا سائے میں جہاں چاہوں چلا جاؤں مجھے کوئی غم نہ تھا۔ آہ! آج وہ سایہ رخصت ہوا۔

میں داغِ دل دکھانے کہاں جاؤں اور اپنے غم واندوہ کا حال کسے بتاؤں؟ زندگی کے درپیش مسائل میں کون میری راہنمائی کرے گا......؟

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

میں ہر مشکل میں ان سے راہنمائی لیتا تھا، ان کی محبت نے والدین کی محبت کا لطف عطا کر رکھا تھا۔ وہ میرے استاد تھے، وہ میرے بھائی تھے، وہ میرے شیخ تھے، وہ میرے روحانی پیشوا تھے، وہ میرے محسن تھے، وہ میرے ولی تھے۔ آج مسائل کے انبار کس سے بیان کروں؟

شوقِ شہادت:

مرحوم کو ہمیشہ شہادت کا شوق رہتا تھا۔ مجلسِ ذکر میں دعا مانگتے تھے، انصرام کے ساتھ اور عاجزی وانکساری کے ساتھ گڑگڑاتے:

اللّٰھم انی اسئلك شهادة فی سبيلك.

یعنی اے اللہ میں تیری راہ میں شہادت کی بھیک مانگتا ہوں۔

لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ شہادت کی دعا اس قدر جلد قبول ہو جائے گی۔

مولانا عائش محمد صاحب راوی ہیں کہ روضۂ اقدس پر حاضری کے بعد فرماتے:

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

مرحوم اسلامک فیسٹیول میں شرکت کے لیے 3 اپریل 1976ء کو لندن روانہ ہوئے۔ اور اگلے روز ہی وہاں ایک تیز رفتار کار کی زد میں آ کر شدید زخمی ہو گئے اور 25 اپریل کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

29 اپریل کو آپ کی میت بذریعہ طیارہ لندن سے لاہور پہنچی اور اسی روز شام کو میانی صاحب کے قبرستان میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی کی میں سپردِ رحمتِ الٰہی کر دیئے گئے۔ آپ کی قبر برابر ہوئی۔ رات کے اس تاریک سناٹے میں احباب آہستہ آہستہ رخصت ہو رہے تھے اور میں مدیر ''الاسلام'' کا یہ شعر گنگنا رہا تھا۔

وقت آ پہنچا کہ آنکھیں اپنی اشکوں کے عوض
خونِ دل کے رنگ سے لعل و گہر پیدا کریں[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

ایک عظیم علمی شخصیت..... ایک بلند پایہ مفکرِ اسلام

تحریر: ابوسلمان راغب شیخوپوری

تاریخ قوم وتمدن کی محافظ ومظہر ہے اور قوم وتمدن ان نامور شخصیات اور ان کے کارہائے نمایاں سے مشہود و منعکس ہوتے ہیں جو اپنے معاشرے کو اپنی بلند ذات کی بدولت علم وفن، فکر ونظر، خیر ونیکی، رشد وہدایت، کسب وکمال اور شرف و عزت بخشتے ہیں۔ اپنے علم وفضل سے قوم کی تاریخ بناتے اور اس کے توسط سے قوم کے وجود وامتیاز کو حیاتِ دائمی عطا کرتے ہیں۔ اور پھر ایسی شخصیات جن کا دائرہ فیض وکمال قوم کی جغرافیائی حدود سے آگے نہیں بڑھتا ان پر وہ شخصیات فوقیت وافضلیت رکھتی ہیں جو قوم کو ارضی حدود سے بہت آگے ایسی فکری ونظری وسعتوں سے آشنا کرتی ہیں جو زیرِ افلاک جملہ بنی نوعِ انسانی کی خیر خواہی کو محیط ہوتی ہیں۔

اگر کچھ لوگ کوہ دشت اور ارض وممالک کے فاتح ہوتے ہیں تو کچھ دوسرے علم واتقاء انسانی قلب ودماغ اور فکر و نظر پر حکمرانی کرتے ہیں جو انسانی معاشرہ کو اصلاح وہدایت کے ان وسیع افلاک تک لے جاتے ہیں جہاں پوری انسانی برادری کا تصور ابھرتا ہے، تو میں ملت کے رنگ میں جلوہ نما ہوتی ہیں جہاں صرف ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ کا رنگ اثر پذیر ہوتا ہے۔

جہاں فقط ایک جغرافیائی اکائی ہی نہیں بلکہ پوری جنس انسانی سے خطاب ہوتا ہے۔ جہاں رنگ، نسل، ذات اور اونچ نیچ کے سب امتیازات اٹھ جاتے ہیں۔ اور اس جملہ اشرف المخلوقات جنس انسانی کے تزکیہ نفس کی حرص وفکر دامن گیر ہوتی ہے۔

تاریخ وملت کے یہ سیاق وسباق کئی روز سے بضد تھے کہ میں اس عظیم مفکر اسلام جسے سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے دنیا جانتی ہے۔ جس کی ذات والا صفات علمی اور دینی حلقوں میں معروف ہے۔ جسے اپنے اور بیگانے سب مانتے ہیں۔

جس کے جسدِ اطہر کو حال ہی میں لندن کی فضا راس نہ آئی۔ جس کے ظاہر وباطن کے حسن پر کوئی نظر بد حسد کی آگ جل مری اور وہ حادثہ کا شکار ہو کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اس فاضل نوجوان، خاندانِ غزنوی کے مایہ ناز چشم و چراغ، موحد ومؤدب، چشمۂ خلوص ورضا، داعی نظم واتحاد، پیکر ذکر واتقیٰ، غم گسار قوم وملت وجماعت اور آخر اپنے روحانی

بھائی (اس لیے کہ موصوف کے والد بزرگوار مولانا داؤد غزنوی راقم کے استاد تھے) کے لیے اپنی دانست و عقیدت کی حق ادائی کروں اور بغرض استفادہ عوام و خواص اپنے تاثرات و مشاہدات سپردِ قلم کروں۔

غالباً 1951ء یا 1952ء کا ذکر ہے، راقم الحروف دار العلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں زیرِ تعلیم تھا۔ اس زمانہ میں موصوف پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے (عربی) کے طالب علم تھے اور دار العلوم تقویۃ الاسلام کے خوبصورت وسیع ہال کی گیلری میں ایک جانب ان کا کمرہ تھا۔ جو قدیم و جدید کتب سے اٹا پڑا تھا۔ موصوف کی عادت تھی کہ کمرہ بند کر کے مشغولِ مطالعہ رہتے اور اس قدر عمیق اور یکسوئی سے پڑھتے کہ کمرہ کے قریب پاؤں کی آہٹ تک کو بھی مطالعہ میں خلل انداز سمجھتے اور فوراً برہم ہو جاتے۔ کتب جہاں تک ممکن ہوتا مستند رکھتے اور ان کا حصول خواہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہوتا ہر طور حاصل کرتے۔ حافظہ اتنا تیز کہ جو کتاب ایک دفعہ ان کے مطالعہ سے گزر جاتی اس کے اکثر و بیشتر اقتباسات ان کی زبان پر رواں رہتے۔ فہم و ذکاء اس قدر خداداد کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل اور تراکیب و اشکال حل ہوتے چلے جاتے۔ زبان و بیان اس درجہ فصیح و بلیغ کہ نہ رکاوٹ نہ فقرات والفاظ کا اعادہ و تکرار، گفتگو مختصر مگر جامع اور مؤثر۔ اپنی محنت، ذہانت، اہلیت اور مطالعہ پر اعتماد کا یہ عالم کہ گاہے گاہے گیلری میں کھڑے ہو جاتے اور نیچے ہال میں دار العلوم کے اساتذہ اور طلبہ سے مخاطب ہو کر رواں دواں عربی میں خطاب اور سوال و جواب شروع کر دیتے، اور خواہش کرتے کہ دار العلوم کے معلمین و طلبہ بھی ان سے عربی میں ہم کلام ہوں اور ویسی ہی روانی، تیزی اور جدید عربی میں ان کو جواب دیں، جیسے وہ خود۔

بعض اوقات طنزاً مشکل تراکیب اور جدید کتابوں کے وسیع مطالعہ کا انتخاب ہوتے ہی دار العلوم کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف گیلری میں کھڑے کھڑے سوالات کی بارش کر دیتے اور جواب طلب کرتے۔ ان کے اس معمول سے اس وقت تو بلاشبہ ان کے فخر و ناز، غیر پختہ اور شوخ مزاجی کا گمان ہوتا۔ مگر ان کے مابعد کے علم و فضل اور فیض و عمل نے ان کے اس ذاتی اعتماد کی توثیق کر دی کہ حقیقت میں وہ دوسروں کو بھی اور بالخصوص دار العلوم کے اساتذہ و طلبہ کو بھی اپنی طرح اہل و مستعد دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے محاسن مذکورہ کا نتیجہ ہم نے یوں نکلتے دیکھا کہ جب ایم اے (عربی) کے نتائج کا اعلان ہوا تو موصوف نہ صرف یہ کہ یونیورسٹی میں اول آئے بلکہ ماضی کے سب ریکارڈ بھی توڑ دیئے۔

امیر بہاول پور نے آپ کی اس امتیازی کامیابی پر آپ کو پی ایچ ڈی کے لیے وظیفہ عطا کیا۔ مگر انجمن حمایت اسلام لاہور نے خاندانِ غزنوی کی وراثت علمی کے اس جوہرِ نایاب کو اپنے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے لیے سعادت جانا اور بحیثیت لیکچرر منتخب کر لیا جس کے بعد آپ نے پی ایچ ڈی کا ارادہ ترک کر دیا اور بلا تاخیر اپنے نامور آباء و اجداد کے نقشِ قدم کو اختیار کر لیا۔

اب تعمیرِ سیرت کے ساتھ ساتھ تعمیرِ انسانیت کی فکر و حرص بھی بڑھنے لگی۔ جوں جوں میدانِ عمل میں تجربہ بڑھتا گیا

اور ایام زندگی گذرتے گئے۔فکر ونظر راسخ ہوتے چلے گئے۔شخصیت ابھرتی چلی گئی،علم بڑھتا رہا،مزاج میں پختگی اور اعتدال آتے رہے، دائرہ فیض وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور دل ودماغ رغبت الی اللہ میں مستغرق ہوتے چلے گئے اور محبت واطاعت رسول مقبول دل میں پیوست ہوگئی۔نتیجۃً موصوف کی ذات باصفات کا نام بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا اور آپ نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے اسلامیہ کالج سول لائن، وہاں سے انجینئرنگ یونیورسٹی اور وہاں سے جامعہ اسلامیہ بہاولپور تک کی ارتقائی منزلیں انتہائی اور مثالی تیزی سے طے کیں۔جامعہ اسلامیہ کی وائس چانسلری کا منصب، آپ کے علم وفضل عملی تجربہ اور انتظامی وفکری صلاحیتوں کے عام اعتراف ہی کا ردعمل تھا۔

موصوف کی یہ دلی آرزو تھی کہ جس کا ذکر آپ نے ملک غلام نبی وزیر تعلیم پنجاب سے بھی کسی مجلس میں کیا تھا کہ وہ جامعہ اسلامیہ کو جامعہ ازھر مصر کے ہم پلہ بنا دیں گے لیکن زندگی نے اتنی مدت کے لیے بھی ایفا نہ کی کہ وہ اپنے ارادے کو پورا کر سکتے۔

پروفیسر حمید احمد خان وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی آپ کی علمی استعداد اور معلمانہ ذوق وصلاحیت کے اس قدر مداح ومعترف تھے کہ انہوں نے موصوف کی شخصیت کو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی کے لیے باعثِ عزت ونفع سمجھا۔

یہ 65-1964ء کی بات ہے کہ آپ اس وقت اسلامیہ کالج سول لائن لاہور میں بحیثیت صدر شعبہ علوم اسلامی کام کر رہے تھے۔نہ انجمن حمایت اسلام آپ کو چھوڑنا چاہتی تھی نہ آپ خود اسلامیہ کالج چھوڑنا چاہتے تھے،لہٰذا پروفیسر حمید احمد خان صاحب نے آپ کی جز وقتی خدمات کے حصول کو بھی غنیمت جانا اور اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے (عربی) کی کلاسوں کو جدید عربی (حصہ منظوم) کی تدریس کے لیے آپ کی خدمات حاصل کر لیں۔

آپ کا اسلوبِ تدریس بہت واضح،مؤثر اور وسیع مطالعہ کا نچوڑ ہوتا تھا اور آپ عربی الفاظ وعبارات کا اردو ترجمہ اس قدر احتیاط اور اتنی عمدگی سے کرتے کہ مفہوم ومطالب کی اصل روح ضائع یا کم نہ ہو بلکہ اردو میں بھی عربی کا وہی معنوی تنوع اور زور قائم رہے اور پھر کوشش یہ بھی ہوتی کہ اردو الفاظ وعبارات حتی الامکان عربی متن سے زیادہ طویل بھی نہ ہوں۔فکر وذہن تخلیقی تھے۔اردو الفاظ ایسے ایسے اور انوکھے تلاش کرتے اور گھڑتے کہ سامعین آپ کی جدت پسندی کے معترف ہوجاتے اور محظوظ ہوتے۔اسی طرح آپ اپنے خطاب ووعظ میں بھی جدید ونادر الفاظ کا استعمال کرتے مثلاً اڑنگا پٹخنی، ڈھول دھپا، کالا بھجنگ، دھینگا مشتی، کسمسا دیے، سرپھٹول، آٹھوں پہر، چونسٹھ گھڑی، ہر ہر بُنِ مو، کھلی اڑانا وغیرہ الفاظ آپ کے خطاب وبیان میں ملتے ہیں۔جو آپ کے خاص اسلوب بیان مخصوص لب ولہجہ اور آپ کی جدت پسندی کی شہادت ہیں۔اسی طرح مترادف اور غیر مترادف ترکیبات والفاظ کا استعمال بھی آپ کے مخصوص طرزِ تکلم کا حصہ تھے۔مثلاً اطاعتِ امیر کے ضمن میں فرمایا کہ مرکزیت نہ ہو تو خلفشار ہے، انتشار ہے۔اور دوسری جگہ فرمایا کہ فراق ہو یا وصل،کیف ہو یا بے کیفی، قبض ہو یا بسط وغیرہ۔اسی طرح بیان مختصر مگر جامع پسند کرتے اور طوالتِ کلام سے نفرت

کرتے تھے۔اظہار مافی الضمیر کے لیے تشبیہات کا استعمال اتنا موزوں اور مؤثر انداز میں کرتے کہ کلام کی جاذبیت اور اس کے حسن و نکھار میں اضافہ ہو جاتا اور وہ سامعین کے دلوں میں اتر جاتی۔ استعارات و کنایات بھی آپ کی کلام کی زینت تھے۔ جیسا کہ آپ نے ایک جماعت اہلحدیث کے لیے سرزمین کا لفظ مستعار لیا اور جماعت کے جمود کو راکھ اور بنجر کہا ہے۔ اس میں بچے کھچے فکر و احساس اور حرارتِ ایمانی کے لیے چنگاری کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جماعتی درسگاہوں کی حالت زار کا تذکرہ کیا تو ان کے مایوس کن نتائج کے پیشِ نظر بانجھ کا لفظ زیرِ لب آیا، وغیرہ وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ آپ کا علمی مقام بہت بلند اور فکر و نظر بہت گہری تھی۔ بعد میں آپ نے خدائی احکام اور انسانی قوانین کے تقابلی فہم و ادراک کی خاطر رائج الوقت قانون کا مطالعہ کیا اور ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔

عملی میدان میں بھی آپ کی شخصیت بڑی شان سے ابھری، ذاتی تزکیہ نفس کے ساتھ ساتھ تربیت انسانی کی حرص اور اس کا والہانہ ذوق و شوق آپ کے خمیر میں خاندانی اور موروثی طور پر گندھے ہوئے تھے۔ درس و تدریس، طلب علم و مطالعہ اور عبادت و ذکر الٰہی نے آپ کو تبلیغ حق کی راہ پر اس ثابت قدمی اور استقلال سے ڈالا کہ اطاعتِ خدا و رسول ﷺ آپ کے دل و دماغ میں اتر گئی۔ جب خدا و رسول ﷺ کی محبت میں غوطہ زن ہو کر بلند ہوئے تو تعمیرِ سیرت کے بنیادی جوہروں یعنی توحید خدا، اتباعِ رسول ﷺ، ذکر الٰہی، اسلام کے جماعتی نظام کی فکر اور برگزیدہ و نیک شخصیتوں کے رنگ میں رنگ گئے۔ تکمیل انسانیت اور شرفِ انسانی کے تقاضوں کو بھانپ گئے اور دینی علم و عمل کے رسیا ہو گئے۔

توحید پرستی:

عمیق فکر و نظر نے آپ کو اس قدر پکا اور سچا موحد بنا دیا تھا کہ توحید کے بیان و ضمن میں قرآن پاک میں جہاں "من دون اللہ" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں آپ ان کی معنوی جامعیت کو سمجھ گئے کہ ان میں تمام غیر اللہ شامل ہیں صرف قبروں کی نفی نہیں۔ زندہ جابر حکمرانوں کی نفی بھی ان کے نزدیک توحید کا لازمی تقاضہ تھا۔ حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر ان کی توحید پرستی کی روحِ رواں تھا:

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرہ لا پیش نمرودے بزن

(یعنی اے حجروں میں بیٹھ کر باتیں بنانے والو! کسی نمرود کے سامنے جا کر لا کا نعرہ لگاؤ۔)

آپ کہتے کہ: "مردوں کی نفی تو آسان ہے لیکن زندہ خداؤں کی نفی کرنا بڑی کٹھن منزل ہے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی توحید بڑی انقلاب آفرین ہے۔"

اس صاف ستھرے تصورِ توحید نے آپ کو دنیا و مافیہا کی لذتوں سے اس قدر بے نیاز، مستغنی اور راغب الی اللہ بنا

دیا کہ آپ حرصِ دنیا اور طلب جاہ جیسی حقیر دنیاوی اغراض کے کبھی خواہش مند نہ ہوئے۔ کسی کی کاسہ لیسی، چاپلوسی اور حاشیہ برداری نہ کرتے اور کسی کی بخشش ونوال کی آس لگانا توحید شکنی اور شرک خیال کرتے۔

مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر ۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اور سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر ۔

چو تیغ ''لا'' بدست آری بیا تنہا چہ غم داری
مجواز غیر حق یاری کہ ''لا فتاح الا ھو''

(جب ''لا'' کی تلوار تیرے ہاتھ میں ہے تو حق کے سوا کسی کا سہارا نہ لو کہ اس کے سوا کوئی مشکل کشا نہیں۔)

اور شیخ سعدی شیرازی کے یہ اشعار ۔

موحد کہ در پائے ریزی زرش
دیگر تیغ ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نہ باشد زکس
ہمیں است بنیاد توحید وبس

''موحد وہ ہے جس کے قدموں میں تم سونے کے انبار لگا دو مگر اس کی رال نہ ٹپکے۔ جس کے سر پر آرا لٹکا دو لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف اس کے دل میں نہ ہو۔''

احترام وادب شناسی:

آپ پکے موحد تھے اور بہت بڑے ادب شناس بھی۔ اہل اللہ کا ادب بجا لاتے ہیں اور اپنے مربّی اور محسنوں کے شکر گزار بھی تھے۔ آپ توحید وادب کی لطیف امتیازی حدود کے عرفان میں صحیح شعور وادراک کے حامل تھے اور ادب کی لطافتوں اور باریکیوں سے بہرہ ور تھے۔

آپ کے نزدیک یہ امر معیوب تھا کہ'' آدمی موحد ہو مگر ادب کی شد بد سے محروم ہو۔ موحد ہونے کا مطلب یہ نہیں آدمی بے مہار ہو جائے، رسیاں تڑا بیٹھے، بے ادب و گستاخ ہو جائے اور اہل اللہ کی شان میں گستاخیاں کرے اور محسنوں کا گریبان پھاڑے۔''

ایک موحد کے لیے باادب ہونا ضروری سمجھتے۔ بزرگوں کی مجالس میں حرکات فاضلہ کو بھی خلاف ادب سمجھتے تھے۔ جو شخصیتیں انسان کی تربیت کرتی ہیں۔ جسمانی یا روحانی ان کا خود بھی ادب کرتے اور دوسروں کو بھی ان کا ادب ملحوظ رکھنے

کی شدت سے تلقین کرتے تھے۔ان کی ادب شناسی کا مرجع قرآن پاک کا والدین کے بارے میں یہ حکم ہے:

﴿فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا﴾ [الاسراء:23]

''دیکھو! انہیں کبھی یہ بھی نہ کہو کہ تف ہے تم پر اور نہ انہیں جھڑکو اور ان کے ساتھ ادب واحترام سے بات چیت کرو۔''

اسی حق تربیت کی بنا پر ہے کہ والدین اولاد کی جسمانی تربیت کرتے ہیں اور بدیں صورت وہ خدا کی ربوبیت کے مظہر ہیں اور حضور علیہ السلام کے بارے قرآن کا یہ حکم ہے کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ [الحجرات:2]

''یعنی اے ایمان والو! تم اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے اونچا مت ہونے دو اور نہ ان سے اونچی آواز سے بات کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں (ایسا نہ ہو کہ) تمہارے اعمال اکارت جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو سکے۔''

روحانی تربیت کی حق ادائی کے سبب ہے، پھر آپ نے احادیث سے ادب چنا۔ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ، شاہ اسمٰعیل شہید اور دیگر اہل اللہ کے تذکروں سے ادب پارے آپ کی تادیب کا سبب بنے اور نتیجۃً ادب واحسان مندی آپ کی سیرت کے لازمی جزو بن گئے۔ آپ ادب کو محبت کے قرینوں میں پہلا قرینہ شمار کرتے اور موحد ہوتے ہوئے مؤدب ہونا اور مؤدب ہوتے ہوئے موحد ہونا بہت بڑی سعادت سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے اس سعادت کی ہمیشہ بھیک مانگتے رہتے تھے۔

اللہ کا ذکر:

توحید و ادب میں بڑھتے بڑھتے اور فکر و اسلام میں غرق ہوتے ہوتے آپ پر خدا اور رسول ﷺ کی محبت کا رنگ اتنا غالب ہوتا چلا گیا کہ آپ ہمہ وقت ذکر الٰہی میں محو رہنے لگے۔ اسلاف واولیاء کے ذکر وفکر سے اثر قبول کیا اور اپنی سیرت میں مسنون ذکر الٰہی کی لذت سے اس قدر محظوظ ہوتے کہ قسم کھا کر پکار اٹھتے کہ ''اس کے ذکر کی لذت سے بڑھ کر کوئی لذت نہیں۔ دنیا کی تمام لذتیں ذکر کی لذت کے سامنے ہیچ ہیں۔'' مگر اس کے باوجود آپ لذت پرست نہ تھے۔ فرماتے: ''لذت آئے یا نہ آئے اس کے ذکر میں لگا رہنا چاہیے۔ جو آدمی لذت آئے تو ذکر کرتا ہے اور نہ آئے تو نہیں۔ وہ لذت پرست ہے۔'' وہ ذکرِ الٰہی سے فقط ہمہ وقت اپنی اور خالق کی پہچان کے خواہش مند تھے اور عجز دنیا میں رہنے کے آرزو مند تھے۔ فرماتے: ''اگر ذاکر ہر وقت کیف اور لذت کی حالت میں رہے تو اس میں غرور و کبر پیدا ہو جائے اور وہ ابلیس کی طرح راندہ درگاہ ہو جائے۔ بے کیفی بھی اس کی ربوبیت ہے کہ اس بے کیفی میں انسان کو اپنی

اوقات معلوم ہوتی ہے اور اس میں عجز و نیاز پیدا ہوتا ہے۔'' گویا کہ آپ کے ذکر الٰہی میں استقامت تھی اور ذکرِ الٰہی کی تعریف اور اس کے فلسفہ و محاسن میں ہر وقت رطب اللسان رہتے اور اہل اللہ کے بے شمار اقوال و اشعار آپ کا تکیہ کلام تھے۔

اسلام کا جماعتی نظام:

شخصیت کے انفرادی ارتقاء اور تزکیۂ نفس کے ذاتی فکر نے آپ کو اسلام کے جماعتی نظام میں پختہ یقین کا حامل بھی بنایا۔ آپ نے دین و اسلام اور تعمیر سیرت کے جو عوامل اپنے لیے فرض و حق سمجھے دوسروں کو بھی ان کی طرف راغب کرنے اور جملہ معاشرہ کی رشد و ہدایت اور اصلاح و تربیت کی حرص و تڑپ پیدا ہوئی اور دین محمدی کے نفاذ کی لگن بیدار ہوئی۔ مگر جنس انسانی کا مل جل رہنا طبعی امر ہے اور اس کا قیام نظم و ضبط کا تابع ہے۔ اس نظم و ضبط میں اصلاح انسان کے فریضہ کو بطریقِ احسن ادا کرنے کے لیے اجتماعی نظام اور بالخصوص جماعتی نظام ناگزیر ہے۔ اس لیے آپ اسلام کے جماعتی نظام کے بھی شدت سے قائل تھے اور فرمانِ رسولِ مقبول ﷺ: من يطع الامير فقد اطاعني ومن يعص الامير فقد عصاني کے سامنے امیر کے حسب و نسب اور رنگ و منصب اور حیثیت کی پرکھ کی جرأت و جسارت کے شدت سے خلاف تھے۔ آپ کا یقین و عمل تھا کہ: ''جب تک جماعت کے تمام افراد امیر پر اس طرح جانیں نہ چھڑکیں جس طرح پتنگے شمع دان پر گرتے ہیں۔ اسلام کے جماعتی نظام کی ابجد، ہوز بھی سیدھی نہیں ہوتی۔ مرکزیت نہ ہو تو خلفشار ہے انتشار ہے۔'' غیر منظم زندگی سے بہت پریشان ہوتے تھے اور کڑھتے رہتے تھے۔

دائرہ فیض و کمال:

اوصاف کے اس درجہ کمال، فکر دین و آخرت میں ہمہ وقت انہماک اور علم و عمل میں بلیغ ربط و ہم آہنگی نے آپ کی شخصیت کو سنوارا، منور کیا، فہم و ادراک عطا کیے۔ عزت بخشی اور مرجع عوام و خواص بنایا۔ حکمرانِ وقت آپ کی شخصیت و فضیلت کے معترف ہوئے۔ عام و خواص کو آپ سے عقیدت ہوئی۔ ہر مکتبہ فکر آپ کی ذات والا صفات کا قائل ہوا۔ اور کسی کو آپ کے حلقہ فیض و قرب میں آنے کی سعادت کی تمنا ہوئی اور جب آپ نے دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں خطبہ جمعۃ المبارک کا آغاز کیا اور جا بجا عوام الناس سے خطاب کا موقع ملا۔ سب آپ کے حلقۂ عقیدت کے اسیر ہو گئے اور آپ کے علم و فکر اسلامی اور علوم مرتبت کے چشمہ سے پیاس بجھانے لگے۔

آپ طلبِ جاہ کے ہرگز متمنی نہ تھے۔ مگر حاکم وقت نے آپ کی رہبری ''جامعہ اسلامیہ'' بہاول پور کے لیے نافع خیال کی اور آپ کو اس کی وائس چانسلری کی مسندِ اعلیٰ مرتبت سپرد کر دی۔ جہاں آپ دم آخر ہونے تک بحسن وخوبی فرائض انجام دیتے رہے۔

احیائے جماعت و اعلاءِ حق:

خدا اور رسول ﷺ اور خیرِ حق عرفان نے آپ کو وسعت فکر و نظر اور توفیقِ عملی بخشی۔ اور ''اَسْلِمْ تَسْلَمْ اسلام لاؤ گے تو محفوظ رہو گے۔'' زیرِ غور و فکر آئے تو یقین محکم ہو گیا کہ کمالِ انسانیت کا ضامن اور شرفِ انسانی کا محافظ صرف اسلام ہے۔ بس تربیتِ انسانی کا غم دل میں بس گیا اور بالخصوص جماعتِ اہلِ حدیث جو قرآن پاک کے اس حکم کو کہ: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [آل عمران: 104] کے جواب میں ہمیشہ پیش پیش رہی تھی اور جن کا ماضی تابناک و روشن رہا تھا۔

تاریخ اسلام جس پر فخر کرتی ہے وہ آپ کا مرجع خطاب بنی۔ آپ اس جماعت کو ماضی کی طرح فعال، منظم اور موثر انداز سے تبلیغِ دین اور تربیت اولادِ آدم میں ان کی روایتی حرارتِ ایمانی کے ساتھ مصروف دیکھنا چاہتے تھے۔ اسلاف جماعت کے کارنامے اور جماعت کی تاریخ اجتماعات میں دہراتے اور جماعت کی اصلاحِ حال کے لیے پکارتے رہے۔ انہیں اپنے مدارس کی تعمیر نو کے لیے اور اسلاف کی تصنیفات کی اشاعت اور کارہائے نمایاں کی تاریخ منضبط کرنے کی التجا و وعظ کرتے۔ آپ نے اپنے والد بزرگوار مکرمی و معظمی مولانا داؤد غزنوی کے حالات زندگی ''سیدی و ابی'' کے نام سے منضبط کیے۔ آپ کی شخصیت جماعت کی سرزمین کو ماضی کی طرح سرسبز و شاداب اور بارآور دیکھنے کی آرزومند تھی۔ علماء و اکابرین جماعت کے باہمی اختلافات سے ان کا جی جلتا تھا۔

اللہ نے آپ کو علمِ راسخ دیا تھا، تیز سمع و بصارت کی نعمت سے نوازا تھا۔ صحیح فہم و ادراک عطا کیے تھے۔ قوت و استقامتِ عمل بخشے تھے۔ عوام الناس کی رشد و ہدایت کی عمیق حرص و تڑپ خمیر میں گوندھ دی تھی۔ جماعت نے ان کی آواز پر کان دھرا یا نہ دھرا، اثر قبول کیا نہ کیا وہ بمصداق قرآن حکیم: ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ اپنی ذات کی حد تک بلاشبہ اپنے فرض منصبی پر خلوصِ قلب سے کاربند و مشغولِ عمل رہے۔ اور ابھی آپ عمر کی درمیانی منازل طے کر رہے تھے۔ راقم کے گمان میں اگر زندگی کچھ مدت آپ سے پیار کرتی تو آپ پر نہ صرف پاکستان بلکہ تمام عالم فخر کرتا۔ آپ روشنی کے ایک ایسے مینار بن کر ابھرتے کہ ساری دنیا اس مینار کی روشنی میں فیض حاصل کرتی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین [1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

چند ملاقاتیں، چند یادیں

تحریر: پروفیسر محمد حسین آزاد

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

پہلی ملاقات:

1971ء غالباً جولائی کا آخری عشرہ تھا، میرے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بیگم کے ضیاء ہمارے کالج کی انچارج معمر دیندار خاتون اور حضرت مرحوم کی حد سے زیادہ عقیدت مند نے اپنے بزرگانہ لہجہ میں کہا: آیئے آزاد صاحب یہ ہیں حضرت مولانا سید ابوبکر غزنوی۔ یہ نام میرے لیے اجنبی نہ تھا البتہ اس سے پہلے ملاقات نہیں تھی۔ حضرت صاحب فرش پر بچھے ہوئے ایک نہایت خوبصورت قالین پر گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے۔

ابتدائی علیک سلیک کے بعد انہوں نے میری ابتدائی تعلیم کے بارے میں پوچھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے حضرت محمد داؤد غزنوی صاحب مرحوم سے مؤطا امام مالک کے ایک دو اسباق بھی سنے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میری طرف خاصے متوجہ ہیں، کوئی آدھ گھنٹہ بات چلتی رہی۔

1972ء میں غزنوی صاحب تعطیلات گرما گزارنے کے لیے مری تشریف لائے تو ان سے ملاقات کا اشتیاق کچھ اور بڑھ گیا۔ میں وقت بے وقت جب بھی ان کی قیام گاہ پر جاتا وہ بلا تکلف مجھے اپنے پاس بٹھاتے اور میں مختلف مسائل میں ان سے خوب استفادہ کرتا۔ اور مرحوم کا معمول تھا کہ شام پانچ بجے سے آٹھ بجے تک مری کی مال روڈ پر خوب گھومتے۔ ان کے دائیں بائیں، آگے پیچھے شاگردوں، پروفیسروں اور دیگر شناساؤں کا ایک ہجوم ہوتا۔ شعر و شاعری، علم و حکمت، تاریخ و ثقافت، نقاط و لطائف کا گویا یہ چلتا پھرتا دیوان ہوتا تھا۔

1973ء میں حضرت نے مجھے لکھا کہ سیزن شروع ہونے سے پہلے مری میں میرے لیے کوئی مکان تلاش کر رکھیں۔ ہم نے مری کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن کوئی ایسا مکان نہ ملا جو مرحوم کی بتائی ہوئی خصوصیات پر پورا اترتا ہو۔ میں نے لکھا کہ میرا اپنا غریب خانہ حاضر ہے، اس میں سے دو کمرے آپ کے نام کے مخصوص کر دیتا ہوں۔ اور میں نے بہت اصرار کیا کہ آپ میرے یہاں قیام فرمائیں لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے طرح دے گئے۔ مری میں ان کے عقیدت مندوں کی کمی نہ تھی لیکن وہ مکان ہمیشہ کرایہ پر ہی لیتے تھے۔ کسی کے یہاں مفت رہنے کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ فرمایا

کرتے تھے کہ ہم کماتے کس لیے ہیں اگر خرچ کرنے کا حوصلہ نہ ہو کمانا کس لیے۔ اس سال وہ جھیکا گلی میں مقیم ہوئے، سچ تو یہ ہے کہ ان کے مکان کو دیکھ کر ان کے انتخاب رہائش کی بھی داد دینی پڑی۔ اس سال ہمارے یہاں کالج میں حسن قراءت کا مقابلہ تھا۔ میں نے ایک روز عرض کیا کہ اس مقابلہ میں آپ مہمانِ خصوصی ہوں گے۔ فرمانے لگے: میں جلسے جلوسوں کے ہنگاموں سے بھاگ کر یہاں سکون کی تلاش میں آتا ہوں لیکن تم ہو کہ یہاں بھی مجھے نہیں چھوڑتے۔ وہ برستے رہے اور میں خاموشی سے مسکراتا رہا، مجھے یقین تھا حضرت مجھے کبھی مایوس نہیں کریں گے۔ تھوڑی دیر بعد فرمانے لگے: اچھا مقابلہ شروع ہونے سے آدھا گھنٹہ پہلے گاڑی یہاں آجائے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور واپس چلا آیا، مقابلہ رات نو بجے شروع ہونا تھا، میں ساڑھے آٹھ بجے گاڑی لے کر پہنچا تو وہ بالکل تیار تھے، جب ہم سنی بینک پہنچے تو اس بندے خدا کی زبان سے نکلا ''اللہ'' پتہ نہیں اس ادائیگی میں کیسی بجلی تھی کہ مجھ پر ایک مکمل غنودگی بلکہ غش کی کیفیت طاری ہوگئی، جب گاڑی کالج کے بڑے گیٹ میں داخل ہوئی تو فرمانے لگے: مولانا اٹھئے کالج آگیا۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ بیدار ہوا، ہم سیدھے ہال میں چلے گئے، پرنسپل صاحب انتظار میں تھے، مختصر تعارف کے بعد مقابلہ کا آغاز ہوا۔ قرأت کا سلسلہ کوئی رات 11 بجے تک جاری رہا۔ کالج کے بچے سونے لگے تھے اور اساتذہ بھی تھکے تھکے نظر آرہے تھے۔ آخر میں آپ نے جیسے ہی خطاب شروع کیا بچے سونا بھول گئے اور اساتذہ بھی تازہ دم ہوگئے۔ قرآن کی ظاہری و معنوی خوبیوں کو یوں واضح کیا کہ اساتذہ اور طلبہ حیران رہ گئے۔

جشن کوہسار مری:

1974ء میں آپ مری جھیکا گلی روڈ پر مقیم تھے۔ میں اپنے ایک ایڈوکیٹ دوست کے ہمراہ دن کے دو بجے ان کی قیام گاہ پر پہنچا، یہ ان کے قیلولے کا وقت تھا، جسے وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ کرتے تھے۔ اس وقت بہت تیز بارش تھی راستے میں ہمارے کپڑے بری طرح بھیگ گئے، جیسے ہی ہمارے قدموں کی آہٹ سنی فوراً باہر تشریف لے آئے، ان کی آنکھوں پر اونگھ کی کیفیت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ہم نے بے وقت آنے کی معذرت کی تو فرمانے لگے: میاں اس اشتیاق کا کیا کہنا جس کے راستہ میں طوفانِ باد وباراں بھی حائل نہ ہو سکے۔ ڈرائینگ روم میں بیٹھتے ہی نہایت عمدہ قسم کی چائے اور رشتہ پکوڑے آگئے۔ فرمانے لگے: کوئی تشویش انگیز خبر تو نہیں لائے؟ میں نے عرض کیا: معاملہ کچھ اس قسم کا ہی ہے۔ میں نے مدعا بیان کیا کہ کل شام پانچ بجے اقبال لائبریری مری میں سیرت کے موضوع پر آپ کو خطاب فرمانا ہے۔ مجھے پھر کوسنا شروع کیا، میں حسبِ عادت خاموش رہا، بہرحال خطاب پر آمادہ ہوگئے۔ میں اگلے روز چار بجے حاضر ہوا تو میرے ساتھ چل پڑے، فرمانے لگے: اچھا عنوان بتاؤ کیا کہوں۔ حضرت! میں نے عرض کیا: میں اور آپ کو عنوان بتاؤں۔ تھوڑی دیر بعد فرمانے لگے: 'ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں' عنوان کیسا رہے گا؟ عرض کیا: ماشاء اللہ بہت ہی خوب ہے۔ لائبریری حال میں پہنچے، تعارف ہوا، کرسی صدارت پر ہمارے دوست ظہیر احمد

صاحب اے سی مری براجمان تھے۔ ان دنوں قادیانی مسئلہ اپنے زوروں پر تھا، میں نے عرض کیا: کوئی نزاعی مسئلہ نہ آئے جس سے ہمارے دوست اے سی صاحب کی پوزیشن پر کوئی حرف آئے۔ آپ کا خطاب شروع ہوا، ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔ اس بندے خدا نے عظمت [و] احترامِ نبوی (ﷺ) کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ اے سی سمیت تمام حاضرین پر ایک سکتہ طاری ہوگیا۔ اختتام پر فرمایا: حضور ﷺ کے بعد کسی نئی نبوت کو تسلیم کرنا شانِ رسالت ﷺ میں سب سے بڑی گستاخی ہے۔ آج ختم نبوت کا فیصلہ کر کے تم کون سا تیر مار رہے ہو۔ تم کس حماقت کی دنیا میں بستے ہو، عقل کے ناخن لو عقلمندو! اس کا فیصلہ تو آج سے 14 سو برس پہلے ہو چکا ہے اور پھر اس طرح اس مسئلہ میں چاشنی پیدا کی کہ تمام سامعین عش عش کر اٹھے۔

حکائت از قداں یار دلنواز کنیم
بایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

1975ء کلڈنہ کیمپ:

گزشتہ سال شاید مرحوم کی زندگی کا مصروف ترین اور ہنگامہ خیز سال تھا میں نے مئی جون میں ان کو خطوط لکھے، وہ بے پناہ مصروفیت کے باعث صرف ایک ہفتہ کے لیے مری تشریف لائے۔ اس مرتبہ انہوں نے کلڈنہ کیمپ کو منتخب کیا۔ مجھے فون پر لاہور سے اطلاع دی کہ میں کل کلڈنہ پہنچ رہا ہوں۔ میں دوسرے کلڈنہ حاضر ہوگیا۔ مکان پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اندر کچھ مستورات ان سے بعض مسائل پوچھ رہی ہیں۔ میرے پہنچتے ہی خادمہ نے اندر اطلاع دی تو فوراً تشریف لے آئے۔ چائے عنبری گولڈن، سیبوں کا وہی انداز، اس وقت پوری وادی کو کالی کالی گھٹاؤں نے گھیر رکھا تھا، ہلکی پھلکی بونداباندی اور مرحوم کے ساتھ یہ نشست زندگانی کا ماحصل نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر تشریف لے گئے اور مستورات کو رخصت کر دیا، واپس آئے اور فرمانے لگے: بیگم مدرث ہیں اور صبح سے اصرار کر رہی ہیں کہ میں ان کی کوٹھی پر جاؤں لیکن میں نے صاف انکار کر دیا ہے۔ میں نے عرض کیا: حضرت آپ کے انکار کی کوئی وجہ؟ برجستہ فرمانے لگے:

نِعَمَ الامیر عَلٰی باب الفقیر وبئس الفقیر علی باب الامیر

اس فقرے نے علماء سلف کی یاد تازہ کر دی جن کی خودداری کے سامنے بڑوں بڑوں کے سرنگوں رہتے تھے۔ میں نے عرض کیا: آپ درست فرماتے ہیں لیکن اگر آپ ایسے حضرات ان لوگوں کی راہنمائی نہیں کریں گے تو یہ دولت مند طبقہ غلط پیروں اور فقیروں کے ہتھے چڑھ جائے گا۔ فرمانے لگے: تمہاری اس بات میں وزن ہے، ٹھیک ہے میں ضرور ان کو وقت دوں گا۔ میں اس وقت ایک سوالنامہ مرتب کر کے لے گیا تھا جو ان کی علمی، ادبی اور جماعتی و خاندانی زندگی سے متعلق تھا، میں نے پیش کر دیا۔ مسکرا کر فرمایا: یہ سوالنامہ مرتب کرنے کی کیسے سوجی؟ میں نے عرض کیا: ان کے جوابات

پتہ نہیں میرے جیسے کتنے طلباء کی رہنمائی کا موجب بنیں گے۔ فرمایا: اگر اس قدر شوق ہے تو پھر ایک مہینہ نکال کر لاہور آ جاؤ، خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ اگلے روز جمعہ تھا میں نے درخواست کی خطبہ آپ دیں۔ حسبِ عادت پھر برسنے لگے: کیوں مجھے تنگ کرنے کے سوا تمہیں کوئی اور کام نہیں سوجھتا۔ ساتھ ہی میں نے کہہ دیا کہ حضور اگلی درخواست بھی ہے تو سنئے۔ کیا اس سے زیادہ تشویش کی بات ہے۔ میں کہا کہ سنیں تو عرض کردں۔ مسکرا کر فرمانے لگے: کہو۔ میں نے عرض کیا: آپ جناب بیگم سمیت تشریف لائیں اور کھانا بھی غریب خانہ پر ہوگا۔ اب ان کا جلال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس سے مجھے ان کا جمال بھی دکھائی دے رہا تھا، برس برسا کر دونوں چیزوں پر راضی ہو گئے۔ اگلے روز خود ہی اپنی کار پر بچوں سمیت کالج میں تشریف لے آئے، گھر میں دال ساگ حاضر تھا، کھانا کھا کر بہت خوش ہوئے۔ فرمانے لگے: آج میں نے جی بھر کر کھانا کھایا ہے کیونکہ کھانا میرا پسندیدہ تھا۔ میں نے عرض کیا: حضرت جی کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ فرمانے لگے: کھانا واقعی صحیح طریقہ سے پکا ہوا تھا اور تمہارا اخلوص کے تڑکے نے اسے سہ آتشہ بنایا۔ جمعہ میں ان کا خطاب ایک گھنٹہ جاری رہا، جمعہ کی نماز کے بعد جناب پرنسپل بریگیڈیئر سرمحمد رفیق صاحب آپ سے والہانہ طور پر بغلگیر ہوگئے، اساتذہ اور طلباء نے مصافحہ کیا۔ پرنسپل صاحب مجھے کہہ رہے تھے کہ غزنوی صاحب پہلے مقرر ہیں جن کی تقریر سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ پرنسپل صاحب نے حضرت سے گزارش کی کہ آئندہ جب بھی آپ کا مری آنا ہو ہمیں اپنے ارشاداتِ عالیہ سے محروم نہ رکھیں لیکن کسے معلوم کہ یہ مقرر یہاں دوبارہ کبھی نہ آ سکے گا۔

ستمبر 1975ء میں آپ نے بطور وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاول پور کا نظم و نسق سنبھالا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کام میں انہوں نے اپنی صحت تک کو داؤ پر لگا دیا۔

مجلس درس ذکر:

جیسے کہ اکثر احباب جانتے ہیں غزنوی صاحب مرحوم ہر جمعرات کو مجلس ذکر کا اہتمام فرماتے تھے بہاولپور منتقل ہونے کے بعد جامعہ کی مصروفیات کے پیشِ نظر یہ کام بہت دیر سے شروع ہوا، نومبر کے پہلے ہفتے میں وی سی ہاؤس میں خوبصورت مسجد کا افتتاح بھی تھا اور مغرب کے بعد مجلس ذکر کا بھی اہتمام کیا گیا تھا، مغرب کی نماز حضرت مرحوم نے خود پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر درس شروع کیا۔ ذکر الٰہی کی فضیلت واہمیت پر کوئی دس منٹ گفتگو کی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ دنیوی کاموں میں کامیابی کے لیے بہت سی دعائیں موجود ہیں لیکن ذکرِ الٰہی خالصۃً رضا الٰہی کے لیے ہونا چاہیے۔ مسجد سے نکل کر ہم حضرت کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم میں چلے آئے، خیر وعافیت دریافت کی، یہ ان سے میری آخری ملاقات تھی۔ 16 اپریل 1976ء کو ''نوائے وقت'' نے سیاہ حاشیہ کے ساتھ حضرت مرحوم کی وفات کی خبر شائع کی، اس خبر کو پڑھتے ہی سارے گھر میں ایک کہرام سا بپا ہو گیا۔ وہ جب بھی آتے بچوں کو پیار کرتے اور ڈھیروں دعائیں دیتے۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی دو تین مرتبہ غریب خانہ پر تشریف لا چکیں تھیں اور بچے ان سے بہت مانوس تھے۔ سب

اداس، سبھی آنکھیں اشکبار، اناللہ پڑھتے رہے۔ اس طرح علم وادب، اسلامی تہذیب وثقافت، جدید وقدیم کا سنگھم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا چھوڑ گیا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

ان چار پانچ سالوں کے راہ رسم میں، میں نے غزنوی صاحب کو جو سمجھا اس کا خلاصہ یہ ہے:

ان کی شخصیت کی دل آویزی، خوش خلقی وخوش پوشی، عربی، انگریزی، فارسی اور اردو ادب کا اعلیٰ ذوق ومطالعہ، قدیم وجدید استدلال کی قوت اور قرآن وحدیث میں اعلیٰ بصیرت کے سب معترف ہیں۔ وسعتِ نظر، توحید ورسالت پر کامل یقین اور ذکر الٰہی میں استغراق وجذب، بڑے بڑے سنگدلوں کی شقاوتِ قلبی دور کرنے کے لئے اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کتنے ہی بگڑے ہوئے نوجوانوں کو خدا کے در پر جھکا دیا۔

اعتدال پسندی:

حضرت غزنوی مرحوم مسلک اہل حدیث میں متشدد نہیں تھے بلکہ کبھی کبھی تو حیرانی بھی ہوتی تھی۔ ایک شام ہم مری کی مال روڈ پر گھوم رہے تھے کہ مغرب کی آذان سنائی دی، میں نے عرض کیا: حضرت مسجد کو چلیں۔ فرمانے لگے: تم پڑھ آؤ۔ نماز پڑھ کر واپس آیا تو فرمانے لگے کہ میں نے مغرب کو عشاء کے ساتھ جمع کر لیا ہے اور ساتھ ہی حدیث پڑھی: جمع رسول اللہ ﷺ بین الصلاتین بغیر عذر.[1] حوالہ کے لیے فتاویٰ ابن تیمیہ بتایا۔ میں نے کئی حضرات سے اس حدیث کی بابت پتہ کیا لیکن کامیابی نہیں ہو سکی۔

نمود ونمائش سے نفرت:

حضرت غزنوی علم وفضل کے وسیع تبحر کے باوجود ظاہری نمود ونمائش سے سخت متنفر تھے۔ وہ ہمیشہ اعلیٰ قسم کی ٹائی کے ساتھ سوٹ پہنتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ میں علماء اور علم کے وقار کے پیش نظر ایسا کرتا ہوں۔ مولانا عبدالرشید صاحب صدیقی (ملتانی) نے مجھے بتایا کہ گزشتہ سال ہم لوگ حج پر گئے تو وہاں بھارت سے بھی چند علماء آئے ہوئے تھے۔ ان حضرات نے پوچھا: کیا غزنوی خاندان کا کوئی چشم وچراغ باقی ہے؟ ابوبکر غزنوی صاحب قریب ہی صحن میں تشریف فرما تھے۔ ان حضرات نے ان سے ملاقات کی خواہش کی۔ میں کچھ دیگر احباب کے ساتھ غزنوی صاحب کے پاس گیا کہ ہندوستان کے علماء آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، لیکن غزنوی صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں یہاں اپنی شخصیت کی نمائش کے لیے نہیں آیا۔

---

[1] "جمع رسول اللہ ﷺ بین الصلاتین بالمدینۃ من غیر خوف" مذکورہ الفاظ کے ساتھ یہ روایت مسند بزار (15/326) میں موجود ہے۔ علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: فیہ عثمان بن خالد الأموی وھو ضعیف (مجمع الزوائد: 2/164) [مرتب]

مروّت کا مینار:

میں نے دیکھا کہ مرحوم میں مروّت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے تین خطوط دو عربی اور ایک اردو میں لکھا لیکن دو ماہ تک حضرت غزنوی صاحب کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے تنگ آ کر چوتھے خط میں لکھ دیا۔

خُونے نہ کردہ ایم وکسے را نہ کشتہ ایم

جُرم ہمیں کہ عاشقِ روئے تو گشتہ ایم①

بس پھر کیا تھا حضرت نے پورے چار خطوط لکھے اور معذرت بھی کرتے رہے۔

بطورِ وائس چانسلر:

جامعہ اسلامیہ بہاولپور کو ملک کی واحد اسلامی یونیورسٹی ہونے کا شرف حاصل ہے، لیکن یہ عظیم ادارہ عرصہ سات سال سے بغیر کسی وی۔سی کے چل رہا تھا۔ اس کا لاکھوں روپے کا بجٹ ضیاع کا شکار ہو رہا تھا۔ یوں تو برائے نام چند شعبہ جات کے بورڈ آویزاں تھے، لیکن نہ پڑھنے والے طلباء اور نہ اساتذہ۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ غزنوی مرحوم اس جامعہ کے سب سے پہلے سربراہ تھے جو اسے صحیح معنوں میں یونیورسٹی بنانے اور چلانے کی مکمل صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے جامعہ میں آتے ہی ملک بھر سے اہل علم و دانش کو چن چن کر جامعہ میں اکٹھا کیا، تمام شعبہ جات کو از سرِ نو مرتب کیا، سائنس سے تعلق رکھنے والے شعبہ جات پر خاص توجہ دی۔ یونیورسٹی کا عظیم الشان کیمپس قائم کرنے کے لیے انہوں نے 15 کروڑ روپے کی حکومت سے درخواست کی تھی اور پانچ سو ایکڑ اراضی وہ حاصل کر چکے تھے۔ مختلف درجات کے تدریسی نصاب کو از سر نو مرتب کرنے کے لیے انہوں نے متعدد کمیٹیاں مقرر کر دی تھیں۔ قائد اعظم میڈیکل کالج سمیت بہاولپور ریجن کے تمام کالجوں کا یونیورسٹی کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر دیا۔ اور 1976ء سے ان تمام کالجوں کے تمام امتحانات جامعہ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے تھے۔ جامعہ اسلامیہ کے مختلف مکتبِ فکر کے مدرسین علماء کو جس طرح انہوں نے قابو کیا یہ انہیں کا حصہ تھا، وہ خود بھی شب و روز کام کرتے تھے اور جامعہ کے اساتذہ سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ عید الاضحیٰ عید ملن پارٹی کے موقعہ پر انہوں نے جامعہ کے اساتذہ سے جو خطاب کیا وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''اساتذہ کرام! مجھے ایسے ساتھیوں کی ضرورت ہے جو جامعہ کی بنیادوں میں اپنی ہڈیوں کے گودے کو بطورِ کھاد استعمال کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔'' ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد جامعہ اسلامیہ پھر ایک بار یتیم ہو گیا ہے، وائس چانسلر تو شاید کوئی آ ہی جائے گا لیکن وہ غزنوی نہ ہوگا۔ ؎

عقل من پروانہ گشت وہم ندید

چوں تو شمعے در ہزاراں انجمن②

---

① ''نہ ہم نے کسی کا خون کیا ہے اور نہ ہی کسی کو قتل کیا ہے۔ ہمارا جرم یہی ہے کہ ہم تیرے چہرے کے عشق میں گھوم رہے ہیں۔''

② ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی نجی زندگی کی چند جھلکیاں

تحریر: سیّد ابراہیم غزنوی

بے غرضی اور بے نفسی جو علمائے ربانی کا طرۂ امتیاز ہے، مولانا سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم اس کی جیتی جاگتی اور منہ بولتی تصویر تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب عوامی حکومت نے مولانا کو مرکزی وزارت کی پیشکش کی تو عزیزوں، دوستوں اور تمام رشتہ داروں نے اصرار کیا کہ اسے ضرور قبول کرلیا جائے۔ بعض اصحاب نے تو مولانا مرحوم کی طبیعت کو اس جانب مائل کرنے کے لئے یہاں تک کہا کہ وزارت قبول کرنے سے اسلام کی تبلیغ واشاعت کا وہ جذبہ جو آپ کے رگ وپے میں جاری وساری ہے خوب پروان چڑھے گا۔ مگر مولانا کا دل جو اللہ ورسول کی محبت میں چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ وزارت کی پیش کش پر کسی طرح راغب نہ ہوئے۔ فرمایا: ہم فقیروں کو اس سے کیا غرض، دنیا ایک انتظار گاہ ہے منزل مقصود نہیں۔ وزارت ایک آنی جانی شے ہے مگر اطمینانِ قلب کی نعمت جو اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل و کرم سے عطا کی ہے ایک فانی چیز ہے۔ بھلا جب ایک مستقل نعمت مجھے حاصل ہے تو میں ایک عارضی شے لے کر کیا کروں گا۔

عزتِ نفس اور وضع داری بھی مولانا مرحوم کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور جہاں مولانا عربی کے استاد تھے۔ کالج مولانا کے گھر سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا، تاہم مولانا بجائے پیدل آنے کے تانگے پر سوار ہو کر آتے۔ مقصد یہ تھا کہ طلبہ کی نگاہ میں جو مادہ پرستانہ دور کی پیداوار ہیں علم کی سبکی نہ ہو۔ پاکیزگی اور صفائی بھی مولانا کی طبیعت کا وصف خاص تھا۔ ہمیشہ عمدہ لباس پہنتے، درس وتدریس کے پیغمبرانہ مسلک پر چلنے کے لئے وہ یہ بات لازم گردانتے تھے کہ بدن کی صفائی کی طرح باطن کی صفائی کا بھی خاص خیال رکھا جائے۔ اسے مکروہاتِ دنیا کی آلائشوں سے آلودہ نہ ہونے دیا جائے۔ چند خزف ریزوں کے لئے جن پر انسان اپنا دین وایمان سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے۔ مولانا کبھی پریشان نہیں ہوئے، وہ علم اور فقر کی دولت کو مادی دولت سے کہیں بڑھ کر خیال کرتے تھے۔ درس وتدریس کے مشغلے سے جب کبھی ان کی طبیعت اُکتا جاتی یا وہ تھکاوٹ سی محسوس کرتے تو گھڑی دو گھڑی آرام کرنے کے بعد اکثر سیر وتفریح کے لئے نکل پڑتے۔

مولانا کی مجلسی زندگی بھی خوب تھی، کبھی کبھار جب موج میں آتے تو دریائے راوی کے کنارے دوستوں کی محفل

جماتے۔ دن بھر دریا کے کنارے شعر و سخن کی محفل گرم رہتی۔ حیرت ہے کہ اردو، عربی اشعار کے علاوہ مولانا کو بڑے بڑے انگریزی شعرا کا کلام بھی خوب یاد تھا اور اکثر اس کے ایسے ایسے منتخبات اشعار میں پیش فرماتے کہ خود ان اساتذہ کے حاشیہ خیال میں کبھی نہ آئے جن کی تمام عمر انگریزی ادب کے پڑھانے میں گزر گئی۔ شعر و سخن کے ساتھ ساتھ شغل ناؤ نوش بھی جاری رہتا۔ شرکائے محفل کی اکثر دودھ، سوڈے سے خاطر تواضع کرتے۔

جب مولانا مرحوم کو خاندانِ غزنویہ کا امیر بنایا گیا، ان کی طبیعت کا انداز یکسر بدل گیا۔ وہ ایک عالم دین کی حیثیت سے اپنی بھاری ذمہ داریوں کو شدت سے محسوس کرنے لگے۔ سیر و تفریح، دوستوں اور عزیزوں سے ملنے ملانے کی وہ تمام تقریبات جن سے شگفتگی کا انداز ٹپکتا تھا، رخصت ہو گئیں۔ اب ان کی جگہ تبلیغی اجتماعات نے لے لی اور ان کی اہمیت کو بڑھانے اور افادیت کو کم کرنے کے لئے مولانا نے بہت سنجیدگی کے ساتھ سوچنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ اپنی زندگی کے آغاز سے آخری دم تک تبلیغ اسلام ہی مولانا کی زندگی کا حقیقی مقصد رہا۔

بحمد اللہ آج نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں جہاں مسلمان موجود ہیں، اہل حدیث کے مسلک کا قیام جہاں علمائے خاندانِ غزنویہ کی عمر بھر کی کوششوں کا نتیجہ ہے وہاں سید ابوبکر غزنوی کی مساعیٔ جمیلہ کا حصہ بھی مفید نتائج پیدا کرنے میں کسی سے کم نہیں۔ علمائے خاندانِ غزنویہ نے اسلام کی جو بے لوث اور مخلصانہ خدمات انجام دی ہیں اہل اسلام نے بھی ان کے اخلاص و ایثار کے جذبے سے متاثر ہو کر انہیں بغیر کسی شک و شبہ کے اپنا دینی رہنما تسلیم کیا ہے۔ اگر مولانا مرحوم کی دینی خدمات کو بھی سامنے رکھا جائے تو وہ بلاشبہ چمنستان تبلیغ اسلام کے گل سرسبد نظر آتے ہیں۔

وسیع القلبی اور فراخ دلی جو فکری اور نظریاتی اختلافات کے باعث اکثر مفقود ہو جاتی ہے۔ مولانا مرحوم کی طبیعت میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ایک مرتبہ مختلف مکاتبِ فکر کے علمائے دین مولانا مرحوم کے یہاں جمع تھے۔ ابھی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ نمازِ مغرب کا وقت آ گیا۔ مولانا وضو کرنے کے لئے گھر کے اندر چلے گئے اور علمائے کرام کے لئے باہر انتظام کر دیا گیا۔ اسی دوران یہ بحث چل نکلی کہ مختلف مکاتبِ فکر کے علمائے اسلام جمع ہیں۔ اہل حدیث کے علمائے اسلام سے ان سب کا اختلاف ہے۔ مولانا ابوبکر غزنوی کے پیچھے نماز پڑھنا گوارا نہیں تو اس صورت میں اب وہ کس کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں، کون امامت کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ ابھی یہ بات جاری ہی تھی کہ مولانا وضو سے فارغ ہو کر باہر تشریف لے آئے اور آتے ہی فرمایا: میرا یہ منصب نہیں کہ اتنے بڑے بڑے علماء کے ہوتے ہوئے میں نماز پڑھاؤں، بہتر یہی ہے کہ آپ حضرات ہی میں سے کوئی بزرگ آگے بڑھیں اور امامت کے فرائض انجام دیں۔

اس واقعہ سے جہاں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ مولانا ہمارے زمانے کے اکثر تنگ دل علماء کی طرح نہیں تھے بلکہ نہایت فراخ دل اور وسیع القلب تھے وہاں مولانا کے اس طرزِ عمل سے یہ بات بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ اگر اسلام کی تبلیغ کا جذبہ اخلاص اور ایثار پر مبنی ہے تو مختلف خیالات اور فروعی اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی تمام علمائے

اسلام ایک مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں اور اسلام کی تبلیغ کے لئے سب مل کر کام کر سکتے ہیں۔

''پہلے اپنوں کو پھر دوسروں کو'' یہ حکمِ الٰہی جو ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے نقش کالحجر ان کے دل و دماغ پر مرتسم تھا۔ چنانچہ مولانا اپنے تمام رشتہ داروں، عزیزوں سے ہمیشہ حسنِ سلوک سے پیش آتے۔ بعض اوقات دنیا کے معاملات کے باعث آپس میں تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بشری تقاضے سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کا بھی اپنے رشتہ داروں سے کسی نہ کسی مسئلے پر اختلاف ہوا ہے۔ جس نے بڑھ کر تھوڑی سی خفگی کی صورت اختیار کر لی مگر اس حال میں بھی مولانا کا سلوک اپنے رشتہ داروں [کے ساتھ] ہمیشہ قابلِ تعریف رہا۔ وہ اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کی تالیفِ قلب اور ان کے آرام و سکون کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔

ایک بار شامِ ہمدرد کی ایک تقریب میں جہاں وہ مہمان خصوصی تھے اور انہیں اپنا مقالہ پڑھنا تھا۔ مجھے بھی خاص طور سے اپنے ساتھ لے گئے۔ پہلی صف میں اس کی نشست کا انتظام تھا، انہوں نے ازراہِ محبت مجھے بھی اپنے قریب بٹھا لیا۔ دوسرے دن اخبارات میں جب اس تقریب کی تصویر شائع ہوئی تو مولانا کے قریب ہی بیٹھنے کے باعث میری تصویر بھی انہی کے ساتھ آ گئی۔ ہمارے عزیزوں میں سے بعض لوگ جو پارٹی پالیٹکس کا شکار تھے۔ مولانا سے اختلاف رکھتے تھے، وہ معترض ہوئے۔ میں نے ان کے اعتراض کا مولانا سے ذکر کیا، وہ بولے: ان لوگوں کو کیا معلوم، مجھے ابراہیم سے کس قدر محبت تھی اور محبت کا جذبہ پارٹی پالیٹکس سے نہ کبھی مجروح ہوتا ہے نہ متاثر۔

ایک بار میں اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ مری گیا ہوا تھا۔ حسن اتفاق سے مولانا بھی اپنے کنبے سمیت وہاں موجود تھے مگر مجھے اس کا علم نہ تھا۔ مری میں ان کی موجودگی کا مجھے اس وقت پتہ چلا جب ان سے ایک روز مال روڈ پر اچانک ملاقات ہوئی۔ مولانا بولے: ابراہیم کل تم اور تمہارے بچے میرے ساتھ چائے پئیں گے۔ سوئے اتفاق میرے ذہن سے بات محو ہو گئی اور میں اپنے بچوں کو لے کر تھیا گلی چلا گیا۔ واپسی پر جب دوبارہ مولانا سے میری ملاقات ہوئی اور انہوں نے تھوڑی سی خفگی کا اظہار کیا جس میں محبت کے جذبات برابر جھلکتے تھے۔ تب مجھے یاد آیا کہ مجھ سے وعدہ خلافی ہوئی ہے۔ میں نے مولانا سے بڑے عجز و انکسار سے معافی مانگی اور مولانا نے بہ طیب خاطر معاف کر دیا۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ اب کی بار بجائے چائے کے میرے ہمراہ کھانے میں شریک ہونا پڑے گا۔ دوسرے دن مع اپنے بچوں کے حاضر خدمت ہوا۔ مولانا نے پر تکلف دعوت دی۔ کھانے سے جب فراغت پائی تو فرمایا: ہمارے خاندان کا یہ دستور ہے کہ کھانے سے فارغ ہو جانے کے بعد مہمان اور میزبان دونوں اللہ تعالیٰ کا پہلے شکریہ ادا کرتے ہیں اور پھر ایک ایک لطیفہ سناتے ہیں۔ غرض کام و دہن کی تواضع اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد باری باری سب نے ایک ایک لطیفہ سنایا اور بخیر و خوبی یہ مجلس تمام ہوئی۔

مولانا کے بہنوئی سید احمد غزنوی صاحب میرے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ جب ان کی بیگم کے انتقال پر مجھے تعزیت

کے لئے کراچی جانا پڑا تو یہاں مجھے مولانا کو اور زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کئی روز تک مولانا کے ساتھ رہنے کی سعادت میسر آئی۔ اکثر نماز باجماعت ادا کی جاتی تھی۔ مولانا امامت کراتے تھے اور جس خشوع وخضوع کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں جھکتے تھے اور جس رقت انگیز لہجے میں آیاتِ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ میرے دل و دماغ پر اس کا ایک خاص اثر ہوتا تھا اور ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

مولانا کو اپنی زبان، اپنی تہذیب اور آداب واخلاق سے کس قدر انس تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے کہ انہی دنوں ڈاک سے میرے نام ایک چھٹی آئی۔ جس کے سرنامہ پر میرا نام انگریزی القاب کے ساتھ لکھا تھا۔ مولانا کی نظر سے جب یہ تحریر گزری تو فرمایا: یہ شخص ہم میں سے تو معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ جن القاب کے ساتھ اس نے تمہارے نام چھٹی لکھی ہے اس سے تو صاف بیگانگی کی بو آرہی ہے۔ یہ چھٹی ایک دعوت نامہ تھا۔

ایک بار مولانا کو جب دل کی تکلیف ہوئی تو وہ گنگا رام ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ جس سے مولانا کے آرام میں خلل پیدا ہو گیا اس پر ہسپتال والوں نے اوقات کی پابندی کر دی تاکہ مولانا کو آرام وسکون مل سکے۔ مختار مسعود صاحب جو اس زمانے میں لاہور کے کمشنر تھے۔ مولانا کی مزاج پرسی کے لئے ہسپتال آئے مگر وقت گزر چکا تھا۔ لہٰذا پہلی بار مولانا سے بغیر ملے واپس آنے پر مجبور ہوئے پھر جب وہ دوسری مرتبہ ملاقات کے اوقات میں ہسپتال گئے تو مولانا سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ ہسپتال والوں نے یہ پابندی خود مولانا کی اجازت ہی سے لگائی گئی تھی مگر میرے بارے میں مولانا کا حکم یہ تھا کہ ابراہیم جب چاہے آئے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ یہ مولانا کی میرے حال پر بہت بڑی مہربانی اور دلی محبت کا ثبوت ہے۔

ایک بار سعودی عرب کے چند مقتدر اصحاب لاہور آئے۔ ان کے اعزاز میں لاہور کے ایک اعلیٰ ہوٹل میں کھانا دیا گیا جس میں مجھے شرکت کی سعادت میسر آئی۔ میرے والد مولانا محمد اسماعیل غزنوی مرحوم ومغفور سے سعودی خاندان کے حکمران سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ بحمد اللہ میں نے بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دلی روابط کو قائم کر رکھا ہے۔ لہٰذا جب سعودی اصحاب کو پتہ چلا کہ میں ان کے شاہ کے منہ بولے بھائی کا بیٹا ہوں تو وہ مجھے پرجوش محبت کے ساتھ ملے اور مجھ سے پرتپاک معانقہ کیا۔ حسن اتفاق سے مولانا بھی اس تقریب میں مدعو تھے۔ اسی اثنا میں وہ بھی ادھر نکل آئے۔ مجھے اور سعودی اصحاب کو دیکھا تو میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک صاحب سے بولے: یہ اسمٰعیل غزنوی کا فرزند ہے۔

مولانا کے اس جملے سے میں نے اپنے والد مرحوم کی شان میں کچھ تعظیم کا اچھا سا انداز محسوس نہ کیا اور کئی دن مولانا سے ہم کلام نہ ہوا۔ اکثر جمعہ مولانا ہی کے یہاں جا کر پڑھتا تھا۔ اس کے بعد جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے بھی وہاں نہیں گیا۔ مولانا کو جب میں کئی دن دکھائی نہیں دیا تو انہیں ادھیڑ بن لگی۔ آخر ان پر خفا ہونے کی بات کھل ہی گئی۔ مولانا

بولے: ابراہیم کے برہم ہونے کا سبب معلوم کر کے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میرا چھوٹا بھائی اپنی بزرگوں کا کس قدر احترام اور ادب کرتا ہے۔ پھر جوشِ محبت میں مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور بولے: ''جانِ برادر تمہیں دکھ پہنچا، مجھے معاف کر دو''۔

مولانا سید ابوبکر غزنوی مرحوم سے میرے دو رشتے ہیں، ایک جسمانی اور دوسرا روحانی۔ وہ میرے سگے چچیرے بڑے بھائی تھے۔ میں انہیں ہمیشہ بھائی جان کہہ کر ملتا تھا اور وہ بھی مجھ سے نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اب اگرچہ جسمانی طور پر مولانا ہمارے درمیان موجود نہیں۔ تاہم جس انداز سے وہ کتاب وسنت کی روشنی میں اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کا فریضہ انجام دیتے رہے اس کے اثرات اب بھی محسوس کرتا ہوں۔

مولانا سیّد ابوبکر غزنوی خاندانِ غزنویہ کے منتخب امیر تھے اور مجھ احقر کو ناظم اعلیٰ (جنرل سیکرٹری) کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ مجھے فخر ہے کہ ان کو خاندانِ غزنویہ کا امیر منتخب کرنے کا فیصلہ میرے ہی مکان پر ہوا اور اس سے مجھے بزرگوں کی کچھ خدمت کا موقع میسر آیا۔[1]

یہ چند متفرق باتیں میں نے اپنے مولانا کی یاد میں عقیدت کے طور پر پیش کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔[2]

---

[1] سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے خاندانِ غزنویہ کے امیر مقرر کیے جانے کی مجلس کی روداد صاحب مضمون (سید ابراہیم غزنوی) کے قلم سے ہی ملاحظہ فرمائیں:

''خاندانِ غزنویہ کے اجتماع میں''

حضرت مولانا غزنوی رحمہ اللہ کے خلف الرشید سیّد ابوبکر غزنوی کی دستار بندی

25 دسمبر کو چار بجے شام دار العلوم تقویۃ الاسلام واقعہ شیش محل روڈ لاہور میں خاندانِ غزنویہ کا اجتماع ہوا جس میں لاہور، کراچی، کوئٹہ، منڈی صادق گنج، کیمبل پور اور دوسرے علاقوں خاندان کے تمام افراد نے شرکت کی۔

سب نے متفقہ طور پر حضرت مولانا سیّد داؤد غزنوی علیہ الرحمہ کے بعد ان کے صاحب زادے سیّد ابوبکر غزنوی کو خاندان کا امیر منتخب کیا اور دستار بندی کی رسم ان کے چچا مولانا زکریا صاحب غزنوی نے ادا کی۔ مولانا زکریا صاحب کے علاوہ شرکت کرنے والوں میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے نام قابلِ ذکر ہیں:

سیّد احمد محمود سیشن جج کوئٹہ، میجر عبدالرحیم صاحب امیر جماعت اہلحدیث کراچی، الحاج عبدالرحمٰن صاحب، حافظ عبدالستار صاحب، مولانا محمد ہارون صاحب، مولانا عمر فاروق صاحب، سید محمد عثمان صاحب، محمد اسماعیل صاحب منڈی صادق گنج والے، سیّد ابراہیم صاحب، نصر اللہ جان، شوکت عابد صاحب (کوئٹہ)، حافظ عبدالولی صاحب، محبوب شاہ صاحب، مسٹر یحییٰ صاحب، مولوی عبداللہ صاحب، مولوی احمد صاحب۔ ابراہیم غزنوی سیکرٹری (ہفت روزہ الاعتصام: 3 جنوری 1964ء)

[2] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں

تحریر: ڈاکٹر خالد غزنوی

مرحوم پروفیسر ابوبکر غزنوی میرے عم زاد تھے، لیکن میرے اور ان کے درمیان موانست کی بنیاد نسبی تعلق نہیں بلکہ وہ ذاتی تعلق تھا جو ہم دونوں کے درمیان ہم سبق اور ہم نشین رہنے کی وجہ سے پیدا ہوا۔

ان دنوں امرتسر کے ایم اے او کالج کی تعلیم کا بڑا شہرہ تھا۔ عم المحترم مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ نے اپنے چھوٹے صاحبزادے ابوبکر کو بی اے کے آخری سال کی تکمیل کے لئے امرتسر بھیج دیا۔ وہ امرتسر میں اس کمرے میں فروکش ہوئے جہاں چودھری عبدالعزیز ڈائرکٹر لوکل فنڈ آڈٹ اور میں پہلے سے موجود تھے۔ ابوبکر کی آمد سے ہماری پڑھائی اور گپ شپ کی مجالس کا رنگ بدل گیا، کیونکہ یہ مولانا ابوالکلام سے ان دنوں بھی حد سے زیادہ متاثر تھے اور وہ ہر وقت یہ کوشش کرتے تھے کہ ان کی اندازِ رفتار، گفتار ابوالکلام ہی کے نقشِ قدم پر ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میری تعلیم سائنس کے علاوہ قرآن مجید کے ترجمہ تک محدود تھی اور اس وقت ابوالکلام کا نام، ان کی تحریر یا تقریر میرے لئے نئی نئی باتیں تھیں یا دوسرے الفاظ میں ہم انہیں کہا کرتے تھے کہ ابوالکلام کی بجائے اپنا کوئی نیا سٹائل پیدا کریں کیونکہ وہ ایک روز ابوالکلام سے بھی بڑے آدمی بن سکتے ہیں۔ (وائے حیف کہ تقدیر نے انہیں اتنی مہلتِ حیات نہ دی ورنہ وہ جس لگن سے اس راہ پر گامزن تھے شاید وہ ابوالکلام کے مرتبے تک آجاتے)۔

لاہور میں جمعیت علمائے ہند کی کانفرنس منعقد ہوئی تو ابوبکر اپنے حجرہ نشینوں کو گرہ سے کرایہ دے کر لاہور لائے تاکہ وہ سب ابوالکلام کی تقریر سنیں۔ پہلے مولانا آزاد کی آمد غیر یقینی رہی پھر جب وہ ایک روز آئے بھی تو یہ ٹھیک علم نہ تھا کہ وہ تقریر کب کریں گے اور ہمارے لئے خشک قسم کی مذہبی اور علمی مجلس میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے ہم دونوں انار کلی کو کھسکنے کی کوشش کرتے اور ابوبکر ہمیں کبھی ابوالکلام کی علمیت کی تعریف سے اور کبھی موچی دروازہ کے فالودہ کی، کبھی چوک وزیر خاں کی مچھلی کے لالچ سے روک رکھتے، مگر وہ تقریر تھی کہ ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔ آخر ہمارا انتظار اور ابوبکر کا پیمانہ لبریز ہوا اور یہ طے ہو گیا کہ آج شام تک اگر تقریر نہ ہوئی تو ہم آخری گاڑی سے واپس چلے جائیں گے اور شرط یہ ہوگی کہ ابوبکر بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔

ابوبکر نے کالج کے ساتھ ساتھ درسِ نظامی کا کورس مکمل کر لیا تھا، اس لئے وہ جمعیت علماء کی کانفرنس کی تقاریر کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ جب کہ میں سائنس اور چودھری عبدالعزیز ریاضی کا طالب علم ہونے کے باعث سیاسی اور فقہی

مباحث کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس بے چارے نے ہمیں لانے اور پھر نخرے اٹھانے پر کافی محنت کی تھی، اب ہم اس پر پانی پھیر کر نہ صرف یہ کہ خود واپس جا رہے تھے بلکہ اسے بھی مجبور کر رہے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ چلے۔ جبکہ وہ ان مباحث میں دلچسپی لے رہے تھے۔ میرے والد مرحوم سیاسی طور پر جمعیت علماء اور کانگریس کے مخالف تھے لیکن اجلاس میں وہ بھی تشریف لائے اور ابوبکر نے ہمارے سامنے جواب دے دیا کہ وہ اس کے اور اس کے مہمانوں کے مسئلہ میں کوئی مداخلت نہ کریں گے۔ لیکن ساتھ ہی مجھے فرمایا کہ میں ان مولویوں کا سیاسی دشمن ہوں لیکن ان کا جلسہ اس لئے سننے آیا ہوں کہ ان میں سے بعض اتنے عالم ہیں کہ ایسا علم شاید پھر کبھی سننا نصیب نہ ہو۔ اور مجھے تاکید کی کہ رات کے اجلاس میں مولانا احمد سعید دہلوی کی تقریر ضرور سنوں کیونکہ وہ سیاست میں اتنی شگفتگی داخل کر دیتے ہیں کہ دلچسپی کسی لمحے کم نہیں ہوتی۔ انہوں نے ایک طرف تو ابوبکر کو انکار کر کے ہماری طرف کی بات کر دی لیکن ساتھ ہی اپنی طرف سے اجلاس میں ہماری دلچسپی بڑھا دی اور اس طرح ابوبکر کو ایک دن کے لئے ہماری ناز برداری سے فرصت مل گئی۔

عصر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا اور حاضرین شور مچا رہے تھے کہ اجلاس نماز کے لئے ملتوی کر دیا جائے کہ دہلی دروازہ کی جانب سے نعروں کا شور ہوا اور سینکڑوں رضا کاروں کے جلو میں مولانا ابوالکلام آزاد جلسہ گاہ میں غیر متوقع تشریف لائے۔ نماز کا غلغلہ سرد ہو گیا اور مجمع مولانا آزاد کی تقریر پر اصرار کرنے لگا۔ مولانا اپنی روایتی شان سے تشریف لائے اور تقریر کی ابتداء اپنی مصروفیتوں کی داستان اور ضعف سے شروع کی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی گفتار میں روانی اور زبان میں مشکل آتی گئی۔ ہم یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کی گفتگو کی نقل اگر مولوی فاضل کے امتحان میں طلباء کو سلیس اردو ترجمہ کرنے کے لئے دی جائے تو پاس ہونے والوں کی تعداد 10 فیصد سے زائد نہ ہوگی۔ ابوبکر ہمارے پاس بیٹھ کر مفہوم سمجھا رہا تھا لیکن پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ الفاظ کے مطالب سے دلچسپی نہ رہی اور ہم مولانا کی روانی سے لطف لینے لگے ترجمے کی حاجت نہ رہی۔

بی اے کے بعد ابوبکر لاہور آ گئے اور کچھ عرصہ قرآن وحدیث کا مزید درس لیا پھر کالج میں دوبارہ داخل ہوئے اور 1950ء میں پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے عربی کے امتحان میں اوّل آئے۔ میں نے بھی اسی سال ایم بی بی ایس کیا تھا، اس لئے 1951ء کی کانووکیشن میں ہم دونوں کو ڈگریاں اکٹھی ملیں۔

مرحوم سردار عبدالرب نشتر ان دنوں پنجاب کے گورنر یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ کانووکیشن کی صدارت انہوں نے خود کی اور ابوبکر کو تین تمغے اور تین مختلف انعام، تین مرتبہ طلب کر کے دیئے۔ ہر مرتبہ ابوبکر اور جناب گورنر کے درمیان ایک آدھ فقرے کا تبادلہ ہوا اور ابوبکر نے ان کے مزاحیہ اور تعریفی جملوں کا جواب ہر مرتبہ قرآن مجید کی آیات سے دیا۔ آخر انعام میں چاندی کے ایک سو روپوں کی تھیلی اور ایک وزنی کپ چاندی کا تھا۔ سردار عبدالرب نشتر نے ابوبکر سے کہا:

''اگر بوجھ زیادہ ہے تو آپ کے ساتھ مزدور کر دیا جائے۔''

ابوبکر نے کہا:

''اس دن کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا'' (مفہوم القرآن)

سردار نشتر اس حاضر جوابی اور علمیت پر بڑے محظوظ ہوئے اور انہوں نے اس کو گلے لگایا اور پیار کیا۔

اس کے بعد ابوبکر اسلامیہ کالج پر پروفیسر ہو گئے اور ان کی زندگی کورس کی کتابوں اور امتحان کے پرچوں تک محدود ہو گئی۔ ہم اسے مذاق میں ماسٹر کہا کرتے تھے کہ اس کا علم اور افتاد اسے مکتب میں مقید نہ رہنے دے گی اور وہ وہاں سے انجینئرنگ یونیورسٹی میں مذہبیات کے شعبے کا صدر ہو کر چلا گیا۔

اب ابوبکر کو ایک ایسی جگہ ملی جہاں وہ اپنی علمی جستجو کی تسکین کر سکے اور دوسرے تشنگانِ علم و ہنر کے لئے بھی کوئی ترکہ چھوڑ جائے۔ میں ایک مرتبہ اسے یونیورسٹی میں ملنے گیا اور محسوس کیا کہ اب وہ پہلے والا ابوبکر نہیں بلکہ اس میں علم کے ساتھ ساتھ اس کا استعمال اور صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔ انہی دنوں اس نے شامِ ہمدرد میں ''اخلاقِ حسنہ'' کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ شامِ ہمدرد کی اکثر تقریریں بوجھل اور تعریفی اور ابتدائیوں سے لدی ہوتی ہیں اس لئے وہاں جا کر علم میں اضافہ کبھی کبھار ہی ہوتا تھا، لیکن ابوبکر کا نام پڑھ کر پرانی یادیں لوٹ آتیں۔ بعد میں ڈاکٹر سید آغا طاہر زیدی اور ڈاکٹر امت اللطیف زیدی کے ہمراہ ان کی تقریر سننے ہوٹل کانٹی نینٹل گیا۔ ہم سب کا خیال تھا کہ اخلاقِ حسنہ کے موضوع پر اتنا مختصر اور تفصیلات اتنی بوجھل ہیں کہ اس پر کسی کے لئے بور کئے بغیر آدھا گھنٹہ بھی کچھ کہنا آسان نہ ہو گا۔ لیکن جب ابوبکر نے اس موضوع کو پکڑا تو سامعین ہر فقرے پر اس طرح داد دے رہے تھے کہ جیسے وہ گفتگو میں شاعری کر رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس کی علمیت سے کبھی بھی متاثر نہ ہوا تھا۔ لیکن اس شام اس نے حسنِ ادا، علمِ حدیث اور احادیث کے بیان کا جو شاندار مظاہرہ کیا۔ اس نے ابوالکلام کی تقریر کو بھی مات کر دیا۔ میں نے تقریر کے بعد اس کی تعریف کی اور مبارکباد دی کہ اس نے واقعی محنت کی ہے اور اس کی آج کی تقریر نے مجھے قائل کر دیا ہے۔ 1971ء میں میرا ارادہ ہوا کہ میں طبِ نبوی اور طبِ جدید کے موازنہ پر ایک ایسی کتاب تالیف کروں جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ موجودہ سائنس نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ اسلام کو پہلے سے معلوم تھا۔ اس غرض سے میں متعدد علماء کے پاس حاضر ہوا لیکن چند ''اقلیتی علماء'' کے علاوہ ہر عالم نے میری حوصلہ فرسائی کی یا معاونت سے انکار کر دیا۔ ان لوگوں کو شاید یہ گمان تھا علم دوسری چیزوں کی طرح استعمال سے کم ہوتا ہے بلکہ صوبہ سرحد کے ایک بہت بڑے عالم نے پہلے مجھے مسجد میں اور جب نمازی جمع ہو گئے تو مجھ سے میری تعلیمی قابلیت اور اسناد کے بارے میں سوال کئے پھر دو ایک جملے عربی بولے جو کہ درست نہ تھے۔ پھر فیصلہ دے دیا کہ مجھے چونکہ صرف نحو اور منطق نہیں آتی اس لئے میں یہ کتاب لکھنے کے قابل نہیں، اس لئے ان کی امداد دینا بیکار ہو گا۔ بدقسمتی سے یہ تمام گفتگو مقتدیوں کو بتانے کے لئے کی گئی تھی کہ پڑھے لکھے لوگ بھی

ان کے پاس استفادہ کے لئے آتے ہیں۔ علماء کی اس سردمہری نے مجھے مایوس کر دیا۔ ان دنوں ابوبکر کو قلب میں تکلیف تھی اور میں عیادت کے لئے یونیورسٹی گیا۔ جب تک برآمدے میں دھوپ رہی ہم ہنسی مذاق میں مصروف رہے لیکن اس روز مذاق یہ تھا کہ وہ سنجیدہ تھا اور مزاحیہ گفتگو میری جانب سے تھی جس میں اگرچہ اس کی اپنی ذات بھی طنز سے محفوظ نہ تھی۔ مگر وہ میرے مزاج سے لطف اندوز ہوتا رہا اور اس نے بھی اس تالیف کے لئے متعدد مفید مشورے دیئے لیکن میں نے انہیں قبول نہ کیا۔ کیونکہ اس میں اور لوگ ملوث ہوتے تھے اور دوسروں کے تلخ تجربات کے بعد میں اپنے آپ کو اسی عناد سے دو مرتبہ ڈسوا کر اپنا مومن ہونا مشتبہ کروانے پر تیار نہ تھا۔ آخر ابوبکر نے وعدہ کیا کہ وہ میرے مسودہ پر نظر ثانی کرے گا اور بھی احادیث کی اسناد اور ثقاہت کے بارے میں امداد کرے گا۔ لیکن میری بدقسمتی رہی کہ میں اپنی مصروفیت کے باعث اس پیش کش سے استفادہ نہ کر سکا اور وہ مسودہ ایک مدت سے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس فنی رائے کے انتظار میں پڑا ہے۔

جب حکومت پاکستان نے ابوبکر کو بہاول پور کی اسلامی یونیورسٹی پر مامور کیا اور پھر اسے لندن کی قرآن کانفرنس کے لئے مندوب [مقرر] کیا تو مجھے دلی مسرت ہوئی کیونکہ وہ ان دو مقامات پر اہم ملکی اور قومی خدمات بجا لانے کا اہل تھا۔ میری یہ خوشی اس لئے نہیں تھی کہ وہ میرا عزیز تھا یا میرے اور اس کے درمیان دوستی کا رشتہ ابھی موجود تھا۔ بلکہ میں ایمان داری سے یہ سمجھتا تھا کہ وہ اس قابل ہے کہ وہ دین اور ملک کو سربلند کرے ورنہ میں اس سے جتنا بے تکلف تھا یا ماضی میں جس قدر تنقید کا عادی تھا اسے طنز سے معاف نہ کرتا۔

ابوبکر کی وفات سے ہمارا خاندان اپنی دو [سو] سالہ روایت سے محروم ہو گیا۔ کیونکہ اس کے بعد بھی بزرگوں کی مسند سنبھالنے والا اپنے درمیان نظر نہیں آتا۔ جماعت اہل حدیث اپنے ملک کے ایک عمدہ ترجمان سے محروم ہو گئی۔ پاکستان سے ایک عالم دین اٹھ گیا اور میرا نہایت پیارا دوست اور بھائی جدا ہو گیا۔ مجھے اب تک یقین نہیں آتا کہ اس کی وفات حادثہ کی وجہ سے ہوئی، مجھے تو اس حادثہ میں ہمیشہ سے عالمی صیہونی تنظیم کی کارکردگی کی بو آتی ہے۔ ابوبکر کا جنازہ میری زندگی میں پہلی میت ہے جس پر میری آنکھیں پرنم ہوئیں اور سچی بات یہ ہے کہ:

''ابوبکر تیرے غم میں دل روتا ہے لیکن زبانی آہ و فریاد سے مجبور ہے کہ خدا کی رضا پر راضی ہونا ہمارا ایمان ہے۔''[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود

تحریر: مولانا محمد صادق سیالکوٹی

خبراً تأتی من لندن موجع
تکاد علیه تصدع الاکباد

"لندن سے میرے پاس (مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی) دردناک خبر آئی قریب ہے کہ اس خبر پر جگر پھٹ جائیں۔"

مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا سارا گھرانہ نور علی نور گزرا ہے۔ اگر کہا جائے کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب بود، تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ سید ابوبکر کے پردادا حضرت مولانا عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ صرف شمعِ سنت کی پروانگی، محض تمسکِ حدیث وسنت کی بنا پر غزنی سے نکالے گئے تو سارا مہاجر نورانی گھرانہ امرتسر میں جلوہ بار ہوگیا۔ مولانا عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ زبردست موحد، تقلید ناآشنا عالم، متبع سنت، ماحی شرک وبدعت، ما انا علیہ وأصحابی کی شاہراہِ جناں پر گامزن اہلِ حدیث تھے۔ اُس زمانہ میں سنت اور حدیث پر برملا عمل کرنا ایمان کے فلک بوس پہاڑ کو سر کرنے کے مترادف تھا اور کرامت سے کم نہ تھا۔ کیونکہ جہالت کی آندھی اور تقلیدِ جامد کے جھکڑ کے باعث چراغِ حدیث صرف کتابوں کے فانوس میں ہی جلتا تھا۔ یہ صرف حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی کوہ تمثال جراَتِ ایمانی تھی کہ وہ چراغِ حدیث کو ہتھیلی پر رکھ کر غزنی سے امرتسر آئے اور پھر تازیست اشاعتِ توحید کے روغن اور ذکرِ الٰہی کے زیت سے خوب روشن رکھا۔ کہتے ہیں کہ جو شخص بھی ایک آدھ گھنٹہ ان کے پاس بیٹھ کر گیا، اللہ نے اس کے دل کی حالت بدل ڈالی، اس کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ جو شخص بھی کوئی وظیفہ پوچھتا، آپ فرماتے: بگو یاحی یاقیوم۔ آپ کے قدومِ میمنت لزوم سے امرتسر توحید وسنت کے نور سے جگمگا اٹھا۔

یہی ہے مقصدِ تخلیقِ ہستیِ انساں!
کہ ہر نفس میں سراغِ جمالِ ذات ملے

جب حکم حضوری پہنچا تو حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے بصد جان اسے لبیک کہا اور اپنے صالح پاک باز فرزندوں کو اس چراغِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اور اسے روشن رکھنے کی وصیت فرمائی۔ آپ کی متبع سنت اولاد (اللہ ان کی قبروں

کو نور سے بھرے) بھی دریائے سنت وحدیث کی پوری پوری پیراک ثابت ہوئی۔ حدیث کا بادل بن کر مطلع تبلیغ پر چھائی اور عمل کی باراں بن کر برسی۔

توحید وسنت کی شراب میں دھت، اس خانوادہ میں سے مجھے صرف حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت اور مکالمت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ آپ متعدد مرتبہ اہلِ حدیث کانفرنس پر سیالکوٹ تشریف لائے، اس طرح کہ مولانا حافظ محمد شریف صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود جا کر ان کو بصد احترام لاتے رہے، میں نے دیکھا، تو ان کا قال اور حال دونوں ہم آہنگ تھے۔ ایک دفعہ میں نے عرض کیا: حضرت! آپ کا رخشِ عمر عرصہ دراز سے سیاست کے میدان میں دوڑ رہا ہے۔ میری گزارش ہے کہ اب آپ باقی عمر مسلک اہلِ حدیث کی خدمت میں بسر کر دیں۔ فرمانے لگے: میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب میں تا دمِ واپسیں مسلک کا ہی ہو کر رہوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ آل پاکستان اہلحدیث جماعت کے امیر ہوئے اور تا دمِ واپسیں جماعت کی تنظیم اور فلاح وبہبود میں منہمک رہے۔

ان کے خلوص، ایثار، تقویٰ اور انکسار کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ سیالکوٹ سے چلے، تو تانگے پر سوار ہوتے وقت مجھے فرمانے لگے کہ آپ سوتے ہیں یا نہیں۔ میں نے کہا: سوتا تو ضرور ہوں۔ کہنے لگے: کب سوتے ہیں؟ جس اخبار کو اٹھا کے دیکھیں، اس میں آپ کا مضمون ہوتا ہے۔ زمیندار، نوائے وقت، امروز، قندیل، چٹان، حرم، صحیفہ، اہل حدیث دہلی، نورِ توحید لکھنؤ وغیرہ میں مضامین آتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ تیس بتیس کتابیں بھی لکھ ڈالی ہیں۔ بتایئے کہ آپ سوتے کب ہیں؟ پھر کہنے لگے کہ ''اعتصام'' میں بھی ضرور لکھا کریں کہ یہ جماعت کا پرچہ ہے۔ اس پر حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھا:

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

''بما کنند'' کہتے وقت اسے تین دفعہ دہرایا اور ہر بار انگلی سے اپنی ذات کی طرف اشارہ کیا (سبحان اللہ! خلوص وانکسار کے آفتاب سے کیسی روشنی بکھر رہی ہے) یہ ہیں مولانا پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ''سیدی وابی'' ۔

از خیالِ لب نوشیں تو اے چشمہ نوش
غرقِ آب وعرق اکنوں شکری نیست کہ نیست

.... لعلے از کانِ دودمانِ غزنوی ....

مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ دودمانِ غزنوی کے علم وعمل اور تقویٰ کی کان سے لعل بن کر نکلے ..... لیکن آہ ..... یہ لعل ۔

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

مولانا ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن وحدیث اور ان کے خادم علوم سے بھی دامنِ عمل بھرا اور علومِ عصریہ کے پہاڑوں کی چوٹیوں کو بھی سر کیا۔ یہ دور بے شمار علوم وفنون کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے، ان علوم وفنون کرا بے شمار مشعلیں سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جل رہی ہیں۔ علومِ دینیہ کے کسبِ ضیاء کے ساتھ تو ایسا عالم نہ صرف اپنے ماحول میں ہی فریضہ تبلیغ سے عہدہ برا ہو سکتا ہے بلکہ وہ تمام یورپ میں بھی اسلام کا نور بکھیر سکتا ہے بلکہ سائنٹفک اصولوں سے صداقتِ اسلام کا لوہا منوا سکتا ہے۔ خلدِ آشیاں ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن اور حدیث کا بھی پورا علم دے رکھا تھا اور ماڈرن آرٹس کے زیور سے بھی متحلی کر رکھا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ اردو زبان میں بڑی مدلل، فصیح اور بلیغ تقریر کرتے تھے۔ اور ان کی تقریریں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بڑے شوق اور نہایت توجہ سے سنی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ ہائی کورٹ کے ججوں تک نے ان کی تقریروں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اسلام کی صداقت اور حقانیت کو جب وہ اپنی تقریر کا جامہ پہناتے تو سارا مجمع، اسلام کی خوبیوں، سچائیوں، صداقتوں اور حقیقتوں کے حسن پر قربان ہو جاتا۔ انگریزی زبان میں بھی وہ توحیدِ اسلامی، اتباعِ سنت، اخلاقیات، معاشیات اور اقتصادیات پر لیکچر دیتے تھے جو سامعین پر بڑے اثر انداز ہوتے تھے۔

سب سے بڑی خوبی مولانا ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ میں یہ تھی کہ وہ شرک اور بدعت سے نافر، عقیدتاً اہلحدیث، اہل سنت تھے۔ رواجی اہلسنت نہیں بلکہ سلف میں جو معنے اہلسنت کے لیے جاتے تھے ان معنوں میں اہل سنت تھے، یعنی تقلید نا آشنا اہل سنت۔ کیونکہ تقلید اور سنت دو ضدیں ہیں جو جمع نہیں ہو سکتیں کہ سنت دلیل ہے اور تقلید کی ماہیت میں عدمِ دلیل شامل ہے۔ وہ علی وجہ البصیرت دین پر چلتے تھے اور اسی دینی بصیرت کی دعوت دیتے تھے۔ آپ متبع سنت، ملنسار، خوش اخلاق، قدر دان، رذائل سے پاک، نرم گفتار، دوستوں کے دوست، بڑے زیرک، ذہین وفطین، صاحبِ فصل الخطاب، متقی، پرہیزگار، وضو کے عادی، اوراد ووظائف اور تسبیح وتہلیل سے زبان تر رکھتے تھے۔

صوم وصلوۃ کے سخت پابند تھے، حتی کہ بسترِ مرگ پر بھی انہوں نے سب نمازیں ادا کیں۔ الولد سرّ لابیہ کے سر کو چار چاند لگانے والے، خاندان کا نام روشن کرنے والے، اپنے تلامذہ میں محبوب ومقبول اور آباء کے عمل کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

لہو دے دے کے صحرا کو گلستاں کرلیا تو نے
نگاہ و دل کی شادابی کا ساماں کرلیا تو نے
جھلکتا ہے ابھی تک خونِ حسرت لالہ زاروں میں
خزاں کے دور میں جشنِ بہاراں کرلیا تو نے

(ثمر)

انہوں نے ایک رسالہ ''توحید'' بھی جاری کیا تھا اور مجھے لکھا کہ ''توحید'' کے لیے مضامین بھیجا کریں۔ لیکن افسوس کہ مشاغل کے ہجوم کے باعث وہ رسالہ جاری نہ رکھ سکے۔ دین کی تبلیغ کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور اپنے ماحول اور محافلِ احباب میں اس فریضہ سے کبھی بھی نہ چوکتے تھے۔ تلامذہ کے دل کی زمین میں وہ توحید باری تعالیٰ کی تخم ریزی کرتے رہتے تھے۔ تاکہ نژادِ نو کی اٹھان صحیح اسلامی عقائد پر ہو۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے مجھے چٹھی لکھی کہ اپنی تمام کتابوں کا ایک مکمل سیٹ مجھے بھجوادیں کہ میں اسے یونیورسٹی کی لائبریری میں رکھوانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں نے وہ چٹھی مولانا بشیر احمد صاحب مالک مکتبہ نعمانیہ گوجرانوالہ کو بھیج دی اور تاکید کی کہ میری کتابوں کا ایک سیٹ مولانا سید ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ کو پہنچا دیں۔ انہوں نے ایک سیٹ مکمل خود حاضر ہو کر ان کی خدمت میں لاہور پیش کر دیا، جو انہوں نے لائبریری میں رکھوا دیا تاکہ طلبہ استفادہ کر سکیں۔

مولانا ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ کا حال ان کے بہت بلند، نہایت روشن اور تاباں مستقبل کا پتہ دیتا تھا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ وہ حال کو یتیم کر کے راہی ملک عدم ہو گئے ۔

بزمِ طرب ہے سونی سونی، نغمہ نغمہ ساز کا شاکی
دھیما دھیما ذوقِ سماعت ساز کی دھڑکن الجھن الجھن
بجھی بجھی گھمبیر فضائیں دل میں ہے پرواز کی حسرت
پائے طلب ہے زخمی زخمی داغ لہو کے دامن دامن

(ثمر)

جماعت اپنے بارے میں ایک شکایت بھی سن لے اور سن کر ''گزشتہ را صلوۃ آئندہ را احتیاط'' کے زریں اصول پر کاربند ہو یعنی اس احتیاط کے زلال کا ایک قدح نوشِ جان کر کے مرنے والوں کو ان کی زندگی میں بھی قطار وشمار میں رکھا کریں، زندگی میں ابوبکر کی شخصیت گلدستہ طاقِ نسیاں رہا۔ جماعت نے ان کی قدر نہ کی۔ اگر قدرے کی بھی، تو وہ قدرے بھی نہ رہی۔ جماعت لااُبالی ہوئی، تو ابوبکر سمندِ استغناء پر سوار ہو گئے اور اسے ایڑ لگاتے چلے گئے۔ جماعت نے دم کھینچے رکھا اور رشتہ چاہ میں استحکام نہ رہا۔ (میں تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ صرف جماعت کی خوابیدگی دور کرنا چاہتا ہوں۔)

حالانکہ ابوبکر غزنوی صاحب نے اپنی خداداد قابلیت، ذہانت اور اپنے علم وعمل اور کردار کی خوبی سے اپنا ماحول آپ بنا لیا اور رفتہ رفتہ اپنی گوناگوں صفات اور اخلاقِ فاضلہ کے باعث ماحول پر چھا گئے۔ اور ماحول نے اس دُرِشہوار کو سینہ سے لگا لیا، یہ لعل چمکا، اس کی روشنی حکومت کے ایوانوں تک پہنچی تو حکومت نے اسے اسلامی کانفرنس میں لنڈن بھیج دیا تاکہ وہاں اسلامی فلسفہ کے نورانی چہرے کی نقاب کشائی کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ ایسا ہی منظور تھا کہ اس نے ابوبکر کو

اپنے پاس بلا لیا اس کے آگے کون دم مارے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ابو بکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ پر خدا اپنی رحمت اور بخشش کی برکھا برسائے ان کی خطائیں معاف کرے اور انہیں ''سیدی والی'' کے ساتھ جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین)[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ایم، اے

تحریر: مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی

بچپن سے جن صادق العقیدہ، متبع سنت بزرگوں اور خاصانِ خدا کا نام عظمت وعقیدت کے ساتھ کان میں پڑا، ان میں مولانا سید عبداللہ غزنوی اور ان کے خلف الرشید مولانا سید عبدالجبار غزنوی تھے۔ یہ حضرات غزنی (افغانستان) کے رہنے والے تھے، لیکن اپنے خالص عقیدۂ توحید وکامل پیروئ سنت واتباع سلف کے جرم میں ان کو افضل خاں امیر کابل کے عہد حکومت میں اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑا اور انھوں نے ﴿الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ﴾ (جو ناحق محض اس قصہ میں اپنے وطن سے نکالے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پالنے والا اللہ ہے) کا مصداق بن کر ہجرت کی اور اپنے خاندان کے ساتھ امرتسر میں سکونت اختیار کی۔ وہ بڑے پایہ کے بزرگ، داعی الی اللہ، توحید وسنت کے مبلغ اور ناشر قرآن وحدیث تھے۔ ان کی ولایت وبزرگی پر اس نواح کے لوگوں اور اہل نظر معاصرین کا اتفاق ہے۔ صاحبِ ''نزھۃ الخواطر'' نے ان کو ان الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے: "صاحب المقامات الشهيرة والمعارف العظيمة الكبيرة" ان کو زمانہ کے لیے باعثِ برکت اور ہندوستان کے لیے باعثِ زینت لکھا ہے۔ تیرہویں صدی کے آخر 1298ھ میں وفات پائی۔

ان کے صاحبزادے مولانا سید عبدالجبار غزنوی اپنے والد نامدار کے قدم بہ قدم تھے۔ وہی توحید واتباعِ سنت کا غلبہ، وہی ترک وتجرید، وہی زہد وتوکل، وہی قرآن وحدیث کی اشاعت وتبلیغ کا جذبہ، مصنف ''نزھۃ الخواطر'' نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ ''ان کی ولایت اور جلالتِ شان پر اہل زمانہ کا اتفاق ہے''۔ 1331ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ امرتسر میں وہ اپنے خاص رنگ میں قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ ''ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد'' کے بمصداق سننے والوں کے دلوں پر وہ اثر پڑتا تھا، جو بڑے بڑے علمانہ ومحققانہ درسوں، علمی موشگافیوں وفنی نکتہ آفرینیوں کا نہیں پڑتا۔ رجب 1320ھ (اکتوبر 1902ء) میں ندوۃ العلماء کا امرتسر میں سالانہ اجلاس تھا، ہندوستان کے چوٹی کے علماء اور مشاہیر شریک تھے۔ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی راوی ہیں کہ علامہ شبلی بھی ایک دن اس درس میں شریک ہوئے، وہاں سے آکر اپنا تأثر بیان کیا اور فرمایا کہ ''جس وقت وہ شخص اپنی زبان سے اللہ کا نام لیتا تھا تو بے اختیار جی چاہتا تھا کہ سر اس کے قدموں پر رکھ دیجیے'' انھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ رات کو کھانے پر جلسہ کے سب مہمان جو ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے تھے اور مقامی علماء اور معززین بھی شریک تھے۔ جس

کمرہ میں کھانا کھلایا گیا تھا، اس میں بیچ کے ہال کے علاوہ بغل میں دائیں بائیں کمرے تھے۔ دستر خوان ایک تھا لیکن کمروں کے الگ ہونے کی وجہ سے ایک طرف کا آدمی دوسری طرف کے آدمی کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میری نشست جہاں تھی، وہاں مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی بھی رونق افروز تھے۔ مولانا سید محمد علی مونگیری ناظم ندوۃ العلماء دوسری طرف کے کمرہ میں تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ ''مولوی حبیب الرحمٰن! تمہارے پاس اور کون کون بیٹھا ہوا تھا؟'' میں نے چند مشاہیر علماء کے نام بتائے، مولانا برابر پوچھتے رہے کہ اور کون تھا؟ آخر میں مَیں نے مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کا نام لیا۔ کہنے لگے کہ ہاں اب میں سمجھا میرا دل بے اختیار اس طرف کھنچ رہا تھا، اس کی یہی وجہ تھی۔

ان حضرات کی محبت وعقیدت دل میں ایسی جاگزیں ہوگئی تھی کہ اس کو کوئی جماعتی عصبیت، کسی معاصر کی تنقید، یا مسائل وتحقیقات کا اختلاف متزلزل نہیں کر سکا۔ اس میں کچھ اس کو بھی دخل تھا کہ یہ حضرات عامل بالحدیث ہونے کے ساتھ اہل دل اور صاحبِ نسبت بھی تھے۔ مولانا سید عبداللہ غزنوی کو مولانا حبیب اللہ قندھاری کے واسطہ سے حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کے سلسلہ میں نسبت واجازت حاصل تھی اور اس رنگ نے کتاب وسنت کی پیروی اور حدیث کے اشتغال وانہماک کے رنگ کے ساتھ مل کر ایک نیا رنگ پیدا کر لیا تھا جو ان کو انیک رنگ علماء ظاہر سے ممتاز کرتا تھا، جو اس رنگ سے ناآشنا تھے اور یہی ان حضرات کی صحبت کی اثر انگیزی اور محبوبیت وکشش کی وجہ تھی۔ یہی رنگ اسی جماعت کے ایک دوسرے بزرگ مولانا غلام رسول صاحب (قلعہ میہاں سنگھ) کا تھا، جن کے وعظ کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ انگریزی حکومت نے اس کو بند کر دیا تھا کہ اس کو سن کر کثرت سے غیر مسلم مسلمان ہو جاتے تھے۔ ان کی زبانِ کی تاثیر اور فیض صحبت کے واقعات حدِ تواتر کو پہنچ گئے ہیں جن کا انکار ممکن نہیں۔

میں مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کا زمانہ تو کیا پاتا کہ میری ولادت بھی ان کے انتقال کے دو سال بعد ہوئی۔ میری یہی خوش قسمتی تھی کہ میں نے ان کے صاحبزادے مولانا سید داؤد غزنوی صاحب کو پایا اور ان کی بار بار زیارت کی۔ میرے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب خاندانِ غزنویہ سے خاص ربط ضبط رکھتے تھے۔ چینیاں والی مسجد میں مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، جو مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کے چھوٹے بھائی تھے اور وہ اس جماعت اہل حدیث کے امام تھے، اور ان کے پیچھے بڑے شوق سے نماز پڑھنے جاتے تھے۔ وہ بھی قدیم تعلق کی بنا پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ میں نے ان کے صاحبزادے مولانا اسماعیل غزنوی کو بھی دیکھا ہے جو سلطان عبدالعزیز بن سعود اور ولی عہد سلطنت امیر سعود کے خاص معتمد ومقرب تھے اور حجاز میں ان سے کئی بار ملا ہوں۔ مولانا سید طلحہ صاحب کے ساتھ مولانا داؤد صاحب غزنوی کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ سانچہ میں ڈھلا ہوا جمال ظاہری، حسن مردانہ اور افغانی وجاہت کا ایک پیکر، سرو قامت دوہرا بدن، سرخ سفید رنگ، چہرہ پر حسب ونسب کا نور۔ معلوم ہوتا تھا

کہ فرشتہ آسمان سے اتر کر فرشِ زمین پر آ گیا ہے۔ لباس بھی نظیف و جمیل، ہر ادا سے خوش ذوق اور نستعلیق نمایاں، بہت اچھی مجلسی گفتگو کرنے والے اور بہت اچھے مقرر۔ میں نے ان کی ایک تقریر خواجہ عبدالوحید صاحب کے مکان پر سنی۔ ایک مرتبہ احرار کے ایک جلسہ میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے سنا، سیاست میں مولانا آزاد کے ہم مسلک اور تحریک آزادی میں ان کے ہم مشرب۔ شروع سے مجلس احرار الاسلام کے رہنماؤں میں رہے اور اس سلسلہ میں مولانا عطاء اللہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن غزنوی کے ہم سفر و ہم رکاب، تقسیمِ ہند سے متصل پنجاب کانگریس کے صدر بھی رہے۔ اس سیاسی دلچسپی و سرگرمی کے ساتھ صاحبِ مطالعہ اور صاحبِ درس، صاحبِ نظر اور صاحبِ ذوق عالم تھے۔ مولانا سید طلحہ صاحب کی ملاقات ہوتی تو نئی کتابوں ہی کا تذکرہ رہتا کہ مولانا سیاست کے مردِ میدان نہ تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''النبوات'' کا سب سے پہلے میں نے ان ہی سے نام سنا۔ ان کی تعریف سے مجھے بھی اس کے مطالعہ کا شوق ہوا اور معلوم ہوا کہ ان کی تصنیفات میں اس کا امتیازی مقام ہے۔

مولانا داؤد صاحب عیدین کی نماز منٹو پارک کے میدان میں پڑھتے تھے۔ ہمارے استاذ و شیخ مولانا احمد علی صاحب لاہوری بالالتزام ان کے پیچھے نماز عید ادا کرتے۔ مولانا طلحہ صاحب اور بہت سے ان حضرات کا بھی یہی معمول تھا، جو مساجد میں عید کی نماز ادا کرنے پر میدان میں نماز پڑھنے کو ترجیح دیتے اور اسے اقرب الی السنۃ سمجھتے تھے۔ مجھے بھی کئی بار مولانا کے پیچھے عیدین کی نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، وہ اردو میں خطبہ بھی دیتے جو مؤثر اور دلپذیر ہوتا تھا۔

تقسیم کے بعد ایک مرتبہ میں لاہور حاضر ہوا تو ہمارے فاضل دوست مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب اور ان کے رفقاء نے ازراہِ محبت جامعہ سلفیہ میں میرے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی اور اپنی جماعت کے ممتاز لوگوں اور فضلاء ندوہ کو مدعو کیا۔ میں حاضر ہوا تو میری حیرت و ندامت کی انتہا نہیں رہی کہ مجھے وہاں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا اور مولانا داؤد غزنوی صاحب نے جو میرے اساتذہ اور بزرگوں کی صف میں تھے، خود پڑھا۔ یہ ان کی بے نفسی اور تواضع کی انتہا تھی اور اس سے اس تعلق کا اندازہ ہو سکتا ہے جو ان کو حضرت سید صاحب اور ان کے خاندان اور مسلک سے تھا۔ 1962ء میں جس سال ''رابطۂ عالم اسلامی'' کی بنیاد پڑی، وہ حج کرنے آئے تھے۔ رابطہ کے پہلے اجلاس میں بھی وہ شریک ہوئے اور اس کے رکن منتخب ہوئے۔ مدینہ طیبہ کے ہوٹل ''فندق التیسیر'' میں ان کی خدمت میں کئی بار حاضری ہوئی، وہاں ان کو قلبی دورہ پڑا، طبی امداد بروقت پہنچی۔ اللہ نے فضل فرمایا اور وہ بخیریت لاہور واپس ہوئے۔ یہ ان کی آخری زیارت و ملاقات تھی جو نصیب ہوئی۔

لاہور کے قیام کے زمانہ میں ان کے صاحبزادے مولانا سید ابوبکر غزنوی سے تعارف ہوا، وہ اس وقت غالباً اسلامیہ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کو عربی ادب کا بڑا اچھا ذوق ہے، خاندانی اثرات ان میں

آئے ہیں۔ طبیعت میں بڑی صلاحیت، دین کا ذوق اور مردانِ خدا کی تلاش اور اصلاحِ حال اور ترقیٔ باطن کی فکر رہتی ہے۔ میں نے براہِ راست یا کسی واسطہ سے اپنی عربی کی بعض تصنیفات پیش کیں، بڑی مسرت کا اظہار کیا اور اندازہ ہوا کہ عربی کا صحیح ذوق رکھتے ہیں جو اس وقت یونیورسٹیوں کے فضلاء تو الگ رہے، عربی مدارس کے اساتذہ میں بھی کم یاب ہے۔ اس کے بعد وہ برابر اپنے عہدہ میں ترقی کرتے رہے، وہ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے صدر ہو گئے۔ میں ''برگ سبز ست تحفۂ درویش'' کے طور پر اپنی عربی اردو تصنیفات کسی ذریعہ سے پہنچاتا رہا کہ ان کو اہل نظر اور اہل ذوق بھی سمجھتا تھا اور مصنفین اور اہل قلم کی یہ جماعتی اور شاید عالمی کمزوری ہے کہ ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تحریریں اور نقوش اہل نظر اور اہل ذوق کی نظر سے گزریں۔ میں نے مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی ''تقویۃ الایمان'' کا ترجمہ ''رسالۃ التوحید'' کے نام سے عربی میں کیا تو ان کی خدمت میں بھیجا کہ وہ خود اس مسلک کے حامی و داعی ہیں۔ اُدھر ان کی کتاب اپنے والد ماجد کے تذکرہ میں شائع ہوئی جس میں انھوں نے از راہِ محبت میری بھی ایک تحریر شامل کی تھی۔ اس کتاب کے ساتھ جو خط آیا وہ درج کیا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ خط پر کوئی تاریخ نہیں ہے لیکن وہ دار العلوم تقویۃ الاسلام لاہور معروف بہ مدرسہ غزنویہ سلفیہ شیش محل روڈ، لاہور سے لکھا گیا ہے۔

''کئی برسوں سے روح آپ کی متلاشی ہے اور جی آپ سے ملنے کا آرزومند ہے۔ ایک یا دو خط بھی شاید رابطہ عالم اسلامی کے پتہ پر آپ کو بھیجے تھے۔ آپ کی خدمتِ اقدس میں کچھ وقت علمی اور روحانی استفادہ کے لیے رہنا چاہتا ہوں۔ آپ سے ملاقات کی کیا تدبیر کروں؟ مستقبل قریب میں پاکستان آنے کا کوئی پروگرام آپ کا ہے؟

''البعث الاسلامی'' رابطہ عالم اسلامی کے اخبارات اور مجلات بندۂ عاجز کو نہیں ملتے اور انھیں دیکھنے کا اشتیاق ہے۔

حضرت والد علیہ الرحمہ پر ایک کتاب حال میں راقم نے مرتب کی ہے جس میں آپ کی بھی ایک تحریر شامل ہے۔ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، قبول فرمائیے۔

اگر مناسب خیال فرمائیں تو ''البعث الاسلامی'' میں تبصرہ بھی فرما دیجیے۔ آپ کی کتاب ''رسالۃ التوحید'' مل گئی تھی۔ ترجمہ بہت ہی حسین اور معیاری ہے، کرم فرمائی کے لیے ممنون ہوں۔''

نیاز مند سید ابوبکر غزنوی

ان کا ایک خط اور درج کیا جاتا ہے جو میرے عریضہ کے جواب میں ہے۔ اس سے ان کے حقیقی جذبات اور دلی کیفیت کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے، اس سے ان کے قلبِ بیدار اور روحِ مضطرب کا بھی اندازہ ہوتا ہے، جس نے ان کو دنیاوی اعزاز، علمی ترقیوں اور دنیاوی مقاصد کے حصول پر مطمئن نہیں رہنے دیا اور جو اقبال کی زبان میں ان سے کہتی

رہی۔

مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

اسی بے اطمینانی اور روح کی تسکین کے سامان اور مقصدِ زندگی کی تکمیل کے خیال نے لوگوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اس خط میں مکتوب الیہ کی نااہلیت سے صرف نظر کر کے اور یہ کہ اس کا مخاطب کون ہے، لکھنے والے کے جذبہ اور اس کی اندرونی کیفیت کو دیکھنا چاہیے۔

''آپ کا شفقت نامہ ملا، باعثِ تسکین خاطر بھی ہوا اور شوق کی دبی ہوئی چنگاریوں کو سلگانے کا سبب بھی۔

أرى تحت الرماد وميض نار
ويوشك أن يكون لها ضرام

مکتوب گرامی ملا، پھر اردو تصنیفات ملیں، پھر عربی کی کتابیں آئیں، آپ کی نوازشیں پیہم ہونے لگیں۔

ہر مو میرے بدن پہ زبان سپاس ہے

ایک عرصہ سے روح کا رخ آپ ہی کی جانب ہے۔

جمالك فى عينى وحبك فى قلبى
وذكرك فى فمى فأين تغيب

''شاید روحانی استفاضہ مقدر ہو، وہ مقلب القلوب ہے، جس نے میرے دل کو آپ کی جانب پھیر دیا ہے، مجھے آپ کی خدمت میں پہنچانے پر بھی قادر ہے، ایک عرصہ سے باتیں دو ہی پیش نظر ہیں، تزکیہ اور تعلیم، کتاب وحکمت، افسوس نہ تزکیہ ہو سکا، نہ تحصیل علم دین کا حق ادا ہوا۔''

خورشید عمر برسر دیوار و خفتہ ایم
فریاد از درازئ خوابِ گران ما

''حضرت! بندۂ عاجز نے حرمین شریفین میں دعا کی تھی، یا اللہ کوئی ایسا صاحبِ حال محدث عطا فرما، جس کے ساتھ صحاح ستہ کا دورہ کروں اور ایک سال حدیث شریف اور درود شریف میں مستغرق رہوں۔ روحانی استفاضہ اور دورۂ حدیث کی کوئی صورت پیدا کیجئے، خدا کے لیے ڈاک اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔''

شعبۂ علوم اسلامیہ — نیاز مند
انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور — ابوبکر غزنوی

مولانا ابوبکر غزنوی اس کے بعد دینیات یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر منتخب ہوئے، جس کے وہ ہر طرح سے اہل تھے۔ افسوس ہے کہ ان سے برسوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ 1976ء میں رباط میں جامعات اسلامیہ (اسلامک

یونیورسٹیز) کے وفاق ''جمعیۃ الجامعات الاسلامیہ'' کا جلسہ تھا، جس کا نام اب ''رابطۃ الجامعات الاسلامیہ'' ہے۔ میں بھی ناظم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے اس کا رکن اور جلسہ میں شریک تھا۔ وہاں پاکستان سے جو مندوب آئے تھے، ان سے میں نے پوچھا کہ اور کن مندوبین کے آنے کی توقع ہے۔ اس لیے کہ اب پاکستانی احباب وفضلاء سے ملاقات کے یہی مواقع رہ گئے ہیں کہ ہندوستان، پاکستان سے باہر کسی علمی انجمن میں ملاقات ہو جائے۔ انھوں نے کہا کہ دینیات یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر مولانا سید ابوبکر غزنوی بھی شرکت کے لیے آ رہے ہیں۔ بڑا خوش ہوا کہ ہم دونوں دوست ایک دوسرے سے ملیں گے اور عہدِ کہن کو تازہ کریں گے۔ اچانک ایک دن یہ صاعقہ اثر خبر سنی کہ وہ لندن میں موٹر کے ایک حادثہ سے دوچار ہوئے اور اس سے جانبر نہ ہو کر وہیں جان جانِ آفریں کے سپرد کی ﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ﴾ نعش پاکستان لے جائی گئی اور غالباً وہیں اپنے خاندانی قبرستان میں سپردِ خاک کیے گئے۔

اِن کی باطنی صلاحیتوں، علمی کمالات، خاندانی اثرات اور لب ولہجہ کو دیکھ کر فارسی کا یہ مشہور مصرعہ پڑھنا پڑتا ہے ؎

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

یہ چند سطریں جس سے کسی طرح ان کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ ایک عزیز یادگار کو باقی اور ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے لکھ دی گئیں کہ شاید کوئی صاحبِ دل ان کو پڑھ کر اس جواں مردِ مرگ کے لیے دعائے خیر کر دے کہ اگر ان کی زبانِ قال یا زبانِ حال گویا ہو تو شاید سعدی کے الفاظ میں یہی کہے۔

غرض نقشیست کز ما یاد ماند
کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحب دلے روزے را رحمت
کند بہ حال ایں مسکیں دعائے[1]

[1] پرانے چراغ (243/2) مکتبہ فردوس مکارم نگر، برولیا، لکھنو۔20۔ [طبع: 2010ء]

چراغِ علم و عرفان .... پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

تحریر: محمد اشرف چٹھہ

ع خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

تقریباً دو ہفتے قبل کسی ضروری کام سے جامع غزنویہ شیش محل روڈ جانا ہوا، جہاں پروفیسر سیّد ابوبکر غزنوی خطبۂ جمعہ دیا کرتے تھے اور جہاں مجھ جیسے ان کے سینکڑوں مداح ان کا جامع خطاب سننے کے لیے اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔ میں ہال میں داخل ہوا ہی تھا کہ مرحوم ابوبکر غزنوی کے بڑے برادرِ محترم جناب سیّد عمر فاروق غزنوی سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ باتوں باتوں میں سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم کا ذکرِ خیر چھڑ گیا۔ ان کے برادرِ محترم اپنے مرحوم بھائی کو یاد کر کے غمگین ہو رہے تھے، مگر میں تھا کہ اپنے آپ کو مسلسل کوس رہا تھا کہ وہ سیّد ابوبکر غزنوی جن سے میں اکثر شرف ملاقات حاصل کیا کرتا اور جو مجھے شفقت و پیار سے ہمیشہ دین کی اشاعت اور اسلام کے سنہری اصولوں پر کاربند رہنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ آج انہیں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر میں بھی کتنا احسان فراموش ہوں کہ اس عرصہ میں ان کی یاد میں' ان کے علم و ادب، درس و تدریس اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر آج تک کچھ بھی نہ لکھ سکا۔ احساسِ ندامت تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی ذہن میں اُبھرنے لگا کہ مجھ جیسا ناقص العقل اور ناقص العلم' اتنے عظیم مفکر، ایک ممتاز ماہر تعلیم اور منفرد عالمِ دین کے بارے میں کیا لکھ سکے گا، مگر اس کے باوجود مرحوم کی دینی خدمات اور علم و فضل کے میدان میں ان کی کاوشوں کے علاوہ مرحوم کے ساتھ چند بیتے لمحوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے یہ سطور رقم کر رہا ہوں۔

سیّد ابوبکر غزنوی کا ہنستا مسکراتا، روشن چہرہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے، کہ جو غم کھانا جانتے ہی نہ تھے مگر دوسروں کو غم دے گئے۔ مرحوم اس خاندانِ غزنویہ کے چشم و چراغ تھے کہ برصغیر میں جس کی دینی و ملی خدمات کو اگر کوئی فراموش بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ آپ کے جدِ امجد سیّد عبداللہ غزنوی افغانستان کے دارالحکومت کابل سے ہجرت کر کے مشرقی پنجاب کے شہر امرتسر میں آباد ہوئے اور ہندوستان میں دین اسلام کی شمع روشن کی۔ یہاں خدا تعالیٰ نے انہیں مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ جیسا ہونہار بیٹا عطا فرمایا جو اپنے علم اور زہد و تقویٰ کے باعث برصغیر کے چوٹی کے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ یہی مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سیّد ابوبکر غزنوی کے دادا تھے جن کے ہاں آپ کے والد مکرم مولانا سیّد داؤد غزنوی جیسے بطلِ جلیل پیدا ہوئے۔ مولانا داؤد غزنوی اپنے عہدِ جوانی میں ہی حق کی خاطر انگریزی

سامراج کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ وہ ایک طرف تو امرتسر میں مدرسہ تقویۃ الاسلام کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے دین کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف تھے تو دوسری طرف سیاسی محاذ پر بھی اسلام کے ایک بے باک فرزند کا کردار ادا کر رہے تھے۔ آپ نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر آئین ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر بھرپور جدوجہد کرتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور چلے آئے۔ جب مولانا داؤد غزنوی لاہور تشریف لائے تو ان کے چھوٹے صاحبزادے ابوبکر غزنوی بی اے کے طالب علم تھے۔ لاہور آ کر سید ابوبکر غزنوی نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی اور پھر ایل ایل بی کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کیے اور اسلامیہ کالج سول لائنز میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں علوم اسلامیہ کے استاد کی حیثیت سے پڑھانا شروع کیا۔ آپ کے وہاں جانے سے پیشتر اس یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کے شعبہ کا وجود نہ تھا۔ آپ نے اس یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کے قیام کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیں وہ بلاشبہ آپ کا علمی و قلمی جہاد تھا۔ یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج انجینئرنگ یونیورسٹی میں اسلامیات کا ایک مستقل شعبہ موجود ہے، جس میں دین کی دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں ابوبکر مرحوم کی عظیم خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گی۔ چنانچہ ستمبر 1975ء میں آپ کو انہی دینی و تدریسی خدمات کے صلہ میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا پہلا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ اس یونیورسٹی کی تشکیل و تاسیس بڑا محنت طلب کام تھا۔ مگر آپ نے ستمبر 1975ء سے آخر مارچ 1976ء تک سات ماہ کے مختصر عرصہ میں شب و روز محنت کر کے ایک قدیم طرز کے دینی مدرسہ کو کافی حد تک جدید یونیورسٹی کے قالب میں ڈھال دیا۔

سید ابوبکر غزنوی مرکزی سیرت کمیٹی اور حکومت پاکستان کی مختلف کمیٹیوں کے رکن تھے اور اپریل 1976ء کے شروع میں برطانیہ میں منعقد ہونے والے جشنِ عالمِ اسلامی میں شرکت کے لیے سرکاری وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے لندن تشریف لے گئے اور وہاں سڑک عبور کرتے ہوئے ٹریفک کے ایک حادثہ میں شدید زخمی ہو گئے۔ جس کی تفصیلات سامنے نہیں آ سکیں اور نہ ہی ابھی تک سرکاری سطح پر اس حادثہ کی تحقیقات کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ چند دن ان کی حالت تسلی بخش ہونے کی خبریں آتی رہیں، مگر زخم اتنے شدید تھے کہ آخرکار 24 اپریل 1976ء کو لندن کے ایک ہسپتال میں ہی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اس طرح موت کے ظالم ہاتھ نے اس مشعلِ رشد و ہدایت کو گل کر دیا، جس کی ضیائے ایمان افروز سے لاکھوں فرزندانِ توحید اپنے دلوں کو منور کر رہے تھے۔ وہ شمع علم و عرفان گل ہو گئی کہ جس کے دامانِ فیض سے ان کے ہزاروں شاگرد فیض یاب ہو رہے تھے۔ خدائے بزرگ و برتر نے ابوبکر غزنوی کو بڑے اعلیٰ اوصاف سے سرفراز فرمایا تھا۔ وہ صاحبِ صورت بھی تھے اور صاحبِ سیرت بھی، وہ عالی حسب بھی تھے اور عالی نسب بھی۔ ان میں ایک کامل مسلمان اور سچے مومن کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

میرا ان سے جماعتی تعلق تو شروع ہی سے تھا اور ان سے اپنی عقیدت کی وجہ ہی سے میں نماز جمعہ اکثر ان کی امامت میں ادا کیا کرتا تھا۔ میں ان کے ارشاداتِ عالیہ سے مستفیض ہوتا اور ہر نماز جمعہ کے بعد ان سے شرفِ ملاقات حاصل کیا کرتا، تو اکثر فرمایا کرتے تھے: ''ڈٹے رہو! خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔'' مگر آج میرے کان یہ درد بھری آواز اور پُرخلوص دعا سننے کے لیے ترس گئے ہیں۔ مجھے ان کی خداداد صلاحیتوں کی بدولت ان سے بے حد عقیدت تھی۔ مجھے ان کے اندازِ بیان اور قلم حق گو سے انتہائی محبت تھی اور اپنی اس عقیدت و محبت کا اظہار میں اکثر اپنے دوستوں کی محفل میں کیا کرتا۔ یہ غالباً اپریل 1973ء کی بات ہے کہ میں گورنمنٹ کالج لاہور میں سال سوئم کا طالب علم تھا۔ مجلس اقبال گورنمنٹ کالج لاہور نے علامہ اقبال کے یوم وفات کے سلسلے میں ایک مجلسِ مذاکرہ منعقد کرانے کا اہتمام کیا، جس کا موضوع ''اقبال اور عشقِ رسول ﷺ'' تھا۔ تجویز زیر غور تھی کہ اس موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت کسے دی جائے۔ چنانچہ میں نے مجلسِ اقبال کے ایک رکن کی حیثیت سے سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کا نام تجویز کیا۔ ان دنوں آپ انجینئرنگ یونیورسٹی کے شعبۂ علوم اسلامیہ کے سربراہ تھے۔ میری یہ تجویز منظور کر لی گئی اور مجلسِ مذاکرہ میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے انہیں باضابطہ دعوت دینے کا فرض مجھے سونپا گیا۔ میں اپنے دوست کے ہمراہ جب سیّد صاحب کے ہاں حاضر ہوا اور اپنا مدعا بیان کیا تو فرمانے لگے کہ میں اپنے کرم فرماؤں کو مایوس نہیں کروں گا، اس مذاکرہ میں ضرور آؤں گا۔ چنانچہ مذاکرہ کے روز اپنے وعدہ کے مطابق وہ بروقت تشریف لے آئے۔ ''اقبال اور عشقِ رسول ﷺ'' کے موضوع پر وہ ایمان افروز تقریر کی کہ حاضرین جھوم جھوم گئے۔ ان پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ سامعین عش عش کر اٹھے۔ اور مذاکرہ ختم ہوا تو میرے دوستوں نے میرے انتخاب کی خوب داد دی۔

انہیں سرکارِ دو عالم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی اور اپنی محبت و عقیدت کے اظہار کے طور پر وہ اکثر درود شریف پڑھا کرتے تھے۔ عشقِ رسول ﷺ کا یہ عالم تھا کہ 1974ء میں جب قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے لیے ان کے خلاف تحفظ ختم نبوت کی تحریک شروع ہوئی اور اپنی تمام تر مصروفیتوں کے باوجود ہر جلسہ میں پورے ذوق وشوق سے شرکت فرماتے رہے۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں بادشاہی مسجد لاہور میں تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں حزبِ اختلاف کی جماعتوں کا مشترکہ جلسہ تھا۔ سیّد صاحب اس جلسہ میں ایک سامع کی حیثیت سے شریک ہوئے اور انتہائی نازک مزاج ہونے کے باوجود زمین پر بیٹھ کر پورے انہماک سے جلسہ کی پوری کارروائی سنی۔ اس جلسہ میں مولانا ابوبکر غزنوی، میں اور ہمارے ایک دوست مولانا محمود احمد میر پوری (حال مقیم لندن) زمین پر ایک جگہ بیٹھے تھے کہ میں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ یہ جلسہ ضرور کامیاب ہوگا کہ جس میں ابوبکر غزنوی جیسے نازک اور شستہ مزاج عالمِ دین اور بلند پایہ استاد زمین پر بیٹھ کر مسلسل دو گھنٹے تک تحفظ ختم نبوت کا جلسہ سنتے رہے ہوں۔ تو فوراً اپنا پُرجلال چہرہ میری طرف کر کے مخاطب ہوئے: ''عزیزم تحفظ ختم نبوت کی خاطر زمین پر بیٹھنا تو ایک طرف، اگر ناموسِ رسالت کی خاطر مجھے اپنی

جان کی قربانی بھی پیش کرنا پڑے تو میرے لیے یہ سعادت باعثِ فخر ہوگی۔'' مجھے ان کے یہ الفاظ آج بھی حرف بہ حرف یاد ہیں اور میں اپنے دوستوں سے اکثر ان کا ذکر کیا کرتا ہوں۔

ابوبکر غزنوی ایک نہایت خلیق اور ملنسار انسان تھے۔ وہ مسلک کے لحاظ سے اہلحدیث تھے۔ مگر ان کے اعلیٰ اخلاق کی بدولت میں نے ہر مکتبِ فکر کے اکابرین سے ان کی مدح وستائش سنی ہے۔ انہوں نے چند ہی سالوں میں ملک کے طول وعرض میں جس طرح شہرت حاصل کرنا شروع کر دی تھی اگر خدا تعالیٰ انہیں مزید زندگی عطا کرتا تو ان کا نامِ نامی ملک کے صفِ اوّل کے مشاہیر میں شامل ہوتا۔ مگر اے کاش! جس طرح وہ جلد ہی علم وعرفان کا آفتاب بن کر چمکے، اسی طرح بہت جلد غروب ہو گئے۔ اور اس طرح علم وحکمت، خلوص ودانش، عجز وانکسار اور شرافت وانسانیت کے پیکر اور بلند عزم وہمت کے مالک ابوبکر غزنوی ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے اور مجھ جیسے لاکھوں عقیدت مندوں کو چھوڑ کر اس دنیا میں جا بسے جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔ آج مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت اس جہانِ فانی سے اٹھ گئی ہے کہ جس کا وجود اس گئے گزرے دور میں ایک نعمت سے کم نہ تھا۔ خدائے بزرگ وبرتر سے دست بدعا ہوں کہ وہ مرحوم کے درجات بلند کرے اور ان کی قبر پر کروٹ کروٹ رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین!

ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں [1]

---

[1] نوائے وقت (اپریل 1978ء)، ہفت روزہ المنبر (29 دسمبر 1980ء تا 4 جنوری 1981ء)

مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

چند یادیں

تحریر: عبد الستار نیازی، اوکاڑہ

پروفیسر سید ابوبکر غزنوی بہت بڑے عالم اور علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور تحریکِ آزادی کے عظیم راہنما مولانا سید داؤد غزنوی کے صاحب زادے تھے۔ اپنے اسلاف مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ اور مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کی عظیم روایات کے نقوش پر چلتے ہوئے خاندانِ غزنویہ کے مشن کو زندہ جاوید رکھے ہوئے تھے۔ 3 اپریل 1976ء کی صبح تھی اس دن سید صاحب مرحوم جشن اسلامی کے سلسلے میں سفرلندن پر جا رہے تھے۔ احباب ملاقات کے لیے بڑی تعداد میں موجود تھے۔ جب غزنوی مرحوم ہوائی اڈے پر پہنچے تو وہاں بھی اپنے عقیدت مندوں کا ہجوم پایا۔ غزنوی مرحوم نے اپنے متبسم لبوں کو حرکت دی کہنے لگے: کون کون آیا ہے؟ اس کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ یہ الفاظ زبان پر جاری تھے: یا اللہ ہمیں اپنا کام بے لوث اور بے پناہ کرنے کی توفیق عطا فرما، یا اللہ رزقِ حلال عطا کر، یا اللہ صحت عطا فرما، یا اللہ نیک ساتھی عطا فرما۔ بعد ازاں اپنے احباب سے رخصت ہو رہے ہیں، اور الوداعی سلام کہتے ہوئے اور نہایت وقار سے چلتے ہوئے ہوئے طیارے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ احباب کی نگاہیں طیارے پر لگی ہوئی تھیں۔ پی آئی اے کا طیارہ آہستہ آہستہ پرواز کرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا کی پہنائیوں میں گم ہو گیا۔ اس واقعہ کو تین سال کا عرصہ بیت چکا ہے لیکن سید ابوبکر غزنوی کی یاد روانگی کا منظر دلوں پر نقش ہے۔ وہ زندگی میں پہلی بار سفر مغرب پر جا رہے ہیں۔

عرصہ دراز سے دل میں یہ جذبہ موجزن تھا کہ دیگر ممالک میں اسلام کی تبلیغ کی جائے۔ اسلام کے صحیح اصولوں کو کتاب وسنت کی روشنی میں لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں موقع عطا فرمایا کہ لندن میں سیرت کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔ تمام ممالک سے مندوبین شریک ہو رہے تھے جس میں غزنوی مرحوم بھی ایک تھے۔ سید صاحب کے مقالے کا موضوع ''محمدی انقلاب'' تھا، جس کی بہت سی کاپیاں آپ اپنے ساتھ لے کر گئے تھے تاکہ مندوبین میں تقسیم کی جاسکیں۔ کون جانتا تھا کہ یہ تمنا تشنۂ تکمیل رہے گی۔ 4 اپریل 1976ء کو صبح دس بجے لندن پہنچے۔ اسی روز 4 اور 5 اپریل 1976ء کی درمیانی شب کو سڑک پار کرتے ہوئے، کار کے حادثے کا شکار ہو گئے۔ آپ کی ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی، شدید زخمی ہو گئے۔ غزنوی مرحوم مقالہ نہ پڑھ سکے۔ بعد میں جناب ڈاکٹر شیر زمان نے جوان دنوں قائداعظم

یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، غزنوی مرحوم کا مقالہ پڑھا۔ جب مصری علماء نے یہ مقالہ سنا تو انہوں نے اعتراف کیا کہ صاحبِ مقالہ بہت بڑے عالم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سید صاحب کو علم و عمل کی خوبیوں سے نوازا تھا۔ خاندانی شرافت کا یہ عظیم پیکر شمع کی طرح روشنی پھیلاتا رہا تاکہ کتاب و سنت کی روشنی میں لوگوں کی اصلاح ہو سکے۔ ان کے ہاں ہر جمعرات کو مجلس ذکر بھی منعقد ہوا کرتی تھی جو اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ تاکہ مجلس ذکر کے ذریعے لوگوں کو مذہب کی حقیقت سمجھائی جائے۔ جس میں مسنون وظائف بھی سکھائے جاتے تھے تاکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دلوں کی سیاہی کا نور ہو جائے۔ غزنوی مرحوم کہا کرتے تھے: نبی اکرم ﷺ کا فرمان ''ہر چیز کی ایک پالش ہوتی ہے، دلوں کو پاک صاف کرنے کے لیے اللہ کے ذکر سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، اللہ کے ذکر سے اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے''۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے تحریک احیائے دین کے نام سے ایک مجلس تشکیل دی تھی جس کے تحت دین کی اشاعت و تبلیغ کا کام جاری ہے۔

غزنوی مرحوم کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے ساتھی کو پکارتے وقت خواہ وہ قدر و منزلت میں کسی قدر چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ ادب واحترام اور شفقت کے طریق کو کبھی فراموش نہ کرتے۔ آپ کی شخصیت میں ایک صفت یہ بھی تھی کہ آپ سے جس شخص نے بھی ملاقات کی آپ کے چہرے کو مسکراہٹوں سے لبریز پایا۔ ماتحت ملازم خاص طور پر ان کے حُسن سلوک کے مداح تھے اسی بات نے ہم کو بھی بہت متاثر کیا، یہاں تک کہ میرے عزیز دوست حافظ محمد اقبال قمر اور مسلم صاحبان نے جو اس وقت میرے کلاس فیلو تھے، غزنوی مرحوم کی وفات کے بعد مسلسل کئی ماہ تک آپ کی خوبیوں اور خصوصاً آپ کے چہرے پر پائی جانے والی مسکراہٹ کا بار بار تذکرہ کیا۔ غزنوی مرحوم دارالعلوم میں تفسیر کے موضوع پر لیکچر دیا کرتے تھے۔ مدرسے کے طلباء بھی آپ کے درسِ تفسیر سے مستفید ہوئے۔ آپ کا پڑھانے کا انداز نہایت شستہ اور فصاحت و بلاغت سے بھرپور ہوتا۔ دورانِ تدریس یہ جملہ اکثر فرماتے: میں آپ کو یہ بات اسلامیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ غزنوی مرحوم بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ موصوف اگرچہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر تھے لیکن پھر بھی اپنے آپ کو طالب علم گردانتے رہے۔ غزنوی مرحوم نے بہت سے مقالے لکھے جن کو اب کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے: محمدی انقلاب، ادب پہلا قرینہ ہے، قربت کی راہیں۔

جب کبھی اسلامیہ یونیورسٹی سے لاہور تشریف لاتے۔ جمعۃ المبارک کا خطبہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں ارشاد فرماتے، دارالعلوم کا ہال لوگوں سے بھرا ہوتا تھا۔ آج تک پاک و ہند میں کوئی ایسا صاحب طرز خطیب نظر نہیں آتا جسے بیک وقت قدیم اور جدید علوم پر دسترس حاصل ہو۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے قدرتِ کلام بھی عطا کی تھی۔ سیّد ابوبکر نے علم و فضل اور فصاحت و بلاغت اور خطابت کا ایک معیار اہل پاکستان کے سامنے پیش کیا۔ جس سے مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کے اسلوب کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ نامعلوم غزنوی مرحوم کی

یاد نے کتنے دلوں پر غم کے آثار چھوڑے ہیں۔ آپ اس واقعہ سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جس کے راوی میرے عزیز حافظ محمد اقبال قمر ہیں جو آج کل ٹیچر ٹریننگ کالج بہاولپور میں زیر تعلیم ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ غزنوی مرحوم کی وفات کے چند دن بعد جب میں اپنے شہر اوکاڑہ گیا تو ایک شخص بڑے مغموم اور اداس چہرے کے ساتھ میرے پاس آیا اور مجھ سے مرحوم کی تعزیت کرتے ہوئے رونے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ صاحب جو مرحوم کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہیں ضرور آپ سے قریبی تعلق رکھتے ہوں گے یا شرفِ زیارت ہوگا۔ مگر یہ جان کر کہ ان کی غزنوی مرحوم سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی، محض غائبانہ متاثر تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میرا اپنا یہ حال مسلسل کئی ماہ رہا، بیٹھتے اٹھتے ہر دم مرحوم کا خیال ذہن میں رہتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے کہتے: اب ہمارا مدرسے میں کون ہے، ہم کیوں نہ اپنے گھر واپس چلے جائیں۔ اب کیا ہے غم اور اداسیوں کی ایک گھٹا دل پر چھائی رہتی ہے۔ ہم سب طلباء جنہیں سید صاحب مرحوم کی صحبت میں بیٹھ کر دلی اطمینان اور سکون محسوس ہوتا تھا۔ جس منبر پر جمعۃ المبارک کا خطبہ دیا کرتے تھے، اب جب کبھی گزر ہوتا ہے تو انتہائی حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوں۔ دل پکار اٹھتا ہے کہ اے کاش ہمارے استاد اور قدر شناس محسن واپس اسی منبر پر لوٹ آئیں۔ مگر نگاہیں غم آلود آنسو ٹپکاتے کہتی ہیں: ''اے دل! اب وہ بہاریں کہاں، جسے تم ڈھونڈتے ہو۔ وہ مہربان اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اب تم اپنی حسرت کے آنسو بہا کے سو جاؤ''۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب اس منبر کو دیکھ کر جس پر غزنوی مرحوم خطبہ دیا کرتے تھے اور اپنے علمی و ادبی سمندر سے لعل و جواہر بکھیرتے لوگ آپ کی علمی وادبی باتوں سے پیاس بجھاتے ..... خیر..... یہی حال جانے والے چلے جاتے ہیں اور اپنے متعلقین پر غم کے گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو تا زندگی مٹنے کا نام نہیں لیتے۔ مگر انہیں احساس تک نہیں ہوتا آخر احساس ہو بھی کیونکر وہ اپنے رب کی رحمتوں کے گہرے سایہ میں آرام کر رہے ہوتے ہیں، اور ان کے متعلقین غموں کی آگ میں تڑپ تڑپ کر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ خداوند ذوالجلال کی بارگاہ میں دعا ہے کہ سید ابوبکر غزنوی تا قیامت اللہ کی رحمتوں کے سایہ سے لطف اندوز ہوتے رہیں اور جنت کی بہار کے مزے لیتے رہیں۔

24 اپریل 1976ء کو آپ لندن کے ایک ہسپتال میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ 29 اپریل 1976ء کو آپ کا جسد خاکی لاہور پہنچا اور اسی شام اپنے والد محترم کے پہلو میں قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔ [1]

---

[1] ہفت روزہ المنبر (3 تا 9 مئی 1980ء)

سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

تحریر: مولانا محمد عائش

جون 1963ء کی بات ہے، میں کالج کو خیر باد کہہ کر جامعہ اسلامیہ ڈھلیانہ ضلع اوکاڑہ میں شیخ الحدیث مولانا احمد اللہ بڈھیمالوی رحمہ اللہ سے بخاری شریف کا درس لیتا تھا۔ بعض دینی مسائل میں اشکال ہوا۔ کسی نے لاہور میں حضرت سید ابوبکر غزنوی کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا۔ 4 شیش محل روڈ پر دار العلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں مین گیٹ کے ساتھ ہی سیڑھیاں چڑھ کر حضرت سید صاحب کی رہائش تھی۔ میں نے چند سیڑھیاں چڑھ کر حضرت سید صاحب کو آواز دی، دیکھا کہ حضرت سید صاحب نیچے تشریف لا رہے ہیں، ساتھ ہی زبان مبارک سے ''جی جی'' فرما رہے ہیں۔ بندۂ عاجز نے پہلی دفعہ زیارت کی۔ سفید لباس زیب تن کئے ہوئے نہایت خوبصورت اور پُرنور چہرۂ بارعب شخصیت آج بھی میرے سامنے ہے۔ میں نے سلام عرض کیا، اُنہوں نے جواب دے کر آنے کا سبب دریافت کیا، عرض کیا: حضرت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اوپر کمرے میں لے گئے پانی پلایا اور پھر فرمایا: ''جی آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' میں نے اپنا روحانی مسئلہ گوش گزار کیا۔ فرمانے لگے: ''ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ وہ سیر ہو کر کھانا کھا رہے ہوتے ہیں اور اُن کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں، بھائی دیکھو! اللہ تعالیٰ نے سیب بنائے تو کتنی اقسام کے بنائے، آم بنائے تو ان کی کتنی اقسام پیدا فرمائیں۔ پھولوں کی کتنی انواع و اقسام پیدا کیں اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے روحانی نعمتوں کو تخلیق کیا تو اس کی صفت خلاقی زوروں پر تھی..... یہ روحانیت اور اس کے قرب کی لذتیں ہیں کہ کبھی انسان نماز میں لذت محسوس کرتا ہے، کبھی تلاوت قرآن مجید میں، کبھی نوافل کی ادائیگی میں اور کبھی ذکر میں، روحانی غذاؤں کی لذتیں الگ الگ ہیں دراصل یہ لطف و سرور قربِ خداوندی کا ہے۔''

اس سے میرے تمام اشکالات دور ہو گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے اُنہوں نے میرے تمام مسائل کا سبب اور حل ارشاد فرما دیا ہو۔ پھر مجھے لا الہ الا اللہ کے وظیفے کی تاکید کی فرمایا: اللہ کے قرب کے لئے اس کا ذکر نہایت ضروری ہے، ذکرِ الٰہی بڑی چیز ہے۔ اس کے بعد ایک دو دفعہ پھر اُن کی خدمت حاضر ہونے کا موقع ملا۔ اس دوران 16 دسمبر 1963ء کو ان کے والد گرامی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے اولین رہبر، سیاست کے سرگرم کردار حضرت مولانا سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے، اس المناک موقع پر تعزیت کے لئے حاضر ہوا۔ ستمبر 1965ء میں اُنہوں نے جہاد کے موضوع پر لاہور میں تقاریر کیں، اس دوران ان کی شخصیت مجھ پر آشکار ہوئی۔ وہ عظیم خطیب تھے، کمال درجے

کا جوہر رکھتے تھے۔تقریر کے لئے بلیغ اور مؤثر ترین الفاظ کا انتخاب کرتے۔ دلائل سے مرصع خطاب موقع بہ موقع اُردو، عربی اور فارسی اشعار سے تقویت پاتا اور دلوں میں گھر کرتا جاتا۔

وہ ہر جمعرات کو عصر کی نماز کے بعد ذکر کی محفل منعقد کیا کرتے تھے۔ لوگ حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے، وہ دس منٹ درس دیتے۔ پھر لوگوں سے کہتے: ''سب بھائی اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں اسے یاد کریں'' .....راقم بھی ان مجالس ذکر میں شریک ہوتا تھا۔ ان کے پاس حاضر ہوتا، سلام عرض کرتا، پھر دعا کی درخواست کرتا اور وہ آمین کہہ دیتے۔ ایک دفعہ ان کی رہائش آفیسرز کالونی میں ان کی معیت میں حج کے لئے دعا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تو بندہ عاجز نے یہ دعا کی: اے اللہ! بندے کو حرم پاک میں سید صاحب کی جوتیاں اُٹھانے کی سعادت نصیب فرما! حضرت بھی دعا کر رہے تھے۔ ان کے جسم پر خشیتِ الٰہی کی وجہ سے لرزہ طاری تھا۔ بندۂ عاجز کو یقین ہو گیا کہ دعا قبول ہو گئی۔ جب اُنہوں نے دعا کا اختتام فرمایا تو فرمانے لگے: میں نے تو حج کی دعا ہی نہیں کی، میں نے تو دعا کی ہے کہ ''اے اللہ! تو میرے وجود کے چپے چپے پر اپنی عبودیت کی مہریں نصب فرما''!

دلم براہ تو صد پارہ باد
ہر پارہ ہزار ذرہ
وہر ذرہ در ہوائے تو باد

''دِل کے تیرے راستے میں سو ٹکڑے ہوں۔ ہر ٹکڑے کے ہزار ذرے ہوں۔ اور ہر ذرہ صرف تیری محبت اور تیری رضا میں ہو، ہر ذرے سے صرف تیرے نام کی آواز آ رہی ہو۔''

حضرت سید صاحب رحمہ اللہ نے دو حج فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے بندۂ عاجز کو بھی 1969ء کے موسم حج میں حضرت سید صاحب کے ساتھ حج کی پر سعادت گھڑیاں گزارنے کا شرف ملا۔ انہوں نے حج کے ارکان نہایت عاجزی اور خشوع و خضوع سے ادا کئے۔ اللہ نے اس فقیر کو اپنے خاص فضل سے سید صاحب کی معیت کا اعزاز بخشا۔ میں ان کی خدمت کے لئے ان کے ساتھ ساتھ رہتا، وہ بیت اللہ آتے، طواف، ذکر واذکار کرتے، نوافل پڑھتے، جب تھکان محسوس کرتے تو رہائش چلے جاتے وہاں بھی ذکر واذکار میں مشغول رہتے۔ وہ قرآن کی آیت ﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ کی عملی تفسیر بنے ہوئے تھے۔ ایک دن میں نے عرض کیا: حضرت بیت اللہ چلیں، اُنہوں نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر عرض کیا تو دوبارہ خاموش رہنے کو کہا۔ راقم سے صبر نہ ہو سکا تو فرمایا: چلو، ساتھ ہی جلال کے عالم میں زبان سے یہ الفاظ کہے کہ ''کچھ لوگ بیت اللہ میں رہ کر بھی بیت اللہ سے ہزاروں میل دور ہوتے ہیں اور کچھ بیت اللہ سے ہزاروں میل دور ہوتے ہوئے بھی بیت اللہ میں ہوتے ہیں۔''

اس دوران وضو کر کے سیڑھیاں اتر رہے تھے، باب بلال کی طرف سے حرم پاک میں داخل ہوئے اور ایک ستون

کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور بیت اللہ کی طرف دیکھنے لگے، دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور پھر وہ آنسو لگاتار بہنے لگے۔ ان پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہوگئی، جسم پر لرزہ طاری ہو گیا، اس وقت ان کے چہرے پہ ایسا نور اور وہ کیفیت تھی کہ مَیں ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس عالم میں، میں نے ان کی زبان سے یہ الفاظ سنے ''ادھی ادھی'' اور پھر ''ایناں تاریاں توں پوچھ''! اس وقت ان کے چہرے پہ وہ رعب تھا کہ مَیں نہ تو کچھ پوچھ سکا اور نہ ہی سمجھ سکا۔ بعد میں جب ہم واپسی کے لئے حرم پاک سے نکل رہے تھے تو میں نے نہایت ادب سے عرض کیا: حضرت یہ کیا کیفیات تھیں؟ فرمایا: ''میں اپنے دل کو الٹا کر کے سوجاتا ہوں، اگر اسے اللہ کی رحمت کے سامنے کر دوں تو یہ پھٹ جائے، اس کا کرم مجھے ڈھانپ لیتا ہے اور میرے دل کو ریزہ ریزہ ہونے سے بچا لیتا ہے۔''

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ سید صاحب رحمہ اللہ کے ادھی ادھی کہنے کا مطلب یہ شعر تھا:

ادھی ادھی راتیں میں باری وچ بہنی آں
رو رو ہنجواں دے ہار پرونی آں
تیرے عشق وچ سڑ کے ہوئی آں سواہ
ایناں تاریاں توں پوچھ نہیں رہے چن دے

ان کی معیت میں غارِ حرا میں دو رکعت نماز پڑھنے کی سعادتِ عظمیٰ نصیب ہوئی۔ ان کے جسم مبارک پر خشیت کی وجہ سے شدید لرزہ طاری تھا، آنسوؤں کی جھڑیاں برس رہی تھیں اور میرے ذہن میں یہ آیت تازہ ہو رہی تھی: ﴿وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ﴾ ''کچھ پتھر ایسے ہیں جن میں سے (اللہ کے ڈر کے سبب) نہریں پھوٹ پڑتی ہیں''۔ غارِ حرا کے باہر پتھر پر بیٹھ کر ان کے ساتھ دعا کرنے کا شرف بھی اس عاجز کے حصے میں آیا اور دل نے کہا کہ جہاں اس عظیم انسان کے قدم ہیں، وہاں میرا سر بھی نہیں۔

ایک دن بیت اللہ میں ترکوں والے حرم میں رکن یمانی کی طرف تشریف فرما تھے۔ بندۂ عاجز نے عرض کیا: حضرت! کوئی نصیحت فرمائیں، فرمایا: ''ہر کام اللہ کے لئے کرو، یہ کہنا آسان ہے، لیکن عمل کرنا مشکل ترین کام ہے۔''

ان کی معیت میں حطیم میں دو رکعت نماز پڑھنے کی سعادتِ عظمیٰ بھی نصیب ہوئی۔ نماز کے بعد حضرت سید صاحب رحمہ اللہ نے اونچی آواز میں بندۂ عاجز کے لئے یہ عظیم دعا فرمائی جو کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے لئے فرمائی تھی:

﴿اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝﴾ [طٰہٰ: 31 تا 35]

''اے اللہ تو اس کے ذریعے میری پشت مضبوط کر دے اور اسے میرے کام میں شریک کر دے تاکہ ہم تیری تسبیح بیان کریں اور تجھے بہت زیادہ یاد کریں، بے شک تو ہمیں خوب دیکھنے والا ہے۔''

حرم پاک میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں ان کی زبان مبارک پر یہ شعر جاری ہوتا تھا:

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

یہ شعر بھی پڑھتے ہوتے تھے:

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پہ
سب پر تجھ سے کیا ضد تھی جو کسی قابل ہوتا

ایک دن میں نے عرض کیا: حضرت بندۂ عاجز..... ﴿وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ﴾ ..... یہ آیت تلاوت کر کے یہ دعا کرتا ہے: ''اے اللہ! مجھے روحانی پھل نصیب فرما''، تو نہایت سخت اور شفقتوں سے معمور بلند لہجے میں ارشاد فرمایا: ''یہ کیا مشقتیں ڈال رکھی ہیں، اللہ سے سیب مانگو، کیلے مانگو، کنو مانگو اصحاب شکر میں سے ہو جاؤ''..... چنانچہ ان کے ارشادِ گرامی کی تعمیل میں بندہ عاجز بھی ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا ﴿وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ﴾ کی حقیقت اور عمل کی زبان میں مستفید ہونے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے بندۂ عاجز کی عاجزانہ دعا کو شرف قبولیت سے نوازا۔ ایک دفعہ ان کی رہائش میں ان کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہو رہا تھا۔ حضرت سید صاحب اور بندۂ عاجز ذکر اذکار میں مشغول تھے تو فرمانے لگے: ''یہ کیا ہو رہا ہے جب مجھ پر انوار برس رہے ہوتے ہیں تو آپ پر بھی پڑتے ہیں، لیکن جب آپ پر انوار کا نزول ہوتا ہے تو مجھ پر نہیں ہوتا''۔ ادب کے باعث جواب تو نہ دے سکا، تاہم دِل میں سوچا کہ حضرت! آپ بحر ناپیدا کنار ہیں اور میں ذرا سی آب جو، اسی لئے آپ پر پڑنے والی رحمت کے چھینٹے قریب بیٹھے لوگوں پر بھی پڑتے ہیں۔ آپ کا فیض متعدی ہے، جبکہ میرا صرف اپنے جسم تک محدود۔ 1971ء میں پاکستان جب دولخت ہوا تو بہت غمزدہ ہوئے۔ وہ اکثر اس غم کا اظہار بھی کیا کرتے۔ کہتے تھے کہ پاکستان توڑنے کا سب سے بڑا مجرم دین کا دشمن ہے۔ ایک دفعہ فرمایا: ''بھائی! کچھ کام بھی کرو گے''؟ عرض کیا: ان شاء اللہ۔ کہنے لگے: ''کب! جب یہ پاکستان ٹوٹ جائے گا؟''

ایک دفعہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ان کا خطاب ''اسلامی حکومت کے ناگزیر تقاضے'' کے موضوع پر تھا۔ بندۂ عاجز کو بھی ان کی معیت کا شرف حاصل تھا۔ اُنہوں نے مدلل اور احسن انداز میں خطاب فرمایا۔ ان کی وہ تقریر بعد ازاں ایک کتابچے کی شکل میں شائع ہوئی۔ حضرت سید صاحب نے پینٹ شرٹ زیب تن کی ہوئی تھی اور ساتھ ٹائی بھی لگائی ہوئی تھی۔ واپسی پر مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا لیا، گھر پہنچ کر سب سے پہلے لباس تبدیل کیا، سادہ شلوار قمیض پہنے ہوئے میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور فرمایا: ''مجھے ان چیزوں سے کوئی محبت نہیں، صرف اللہ کی بات سنانے کے لئے بہروپیا بن جاتا ہوں۔''

وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ بہت سی دعاؤں میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک جمعرات مجلس ذکر کے اختتام پر یہ دعا فرمائی: ''اے اللہ! اپنی محبت کی وہ زنجیریں پہنا دے کہ جن کی جھنکار سے پورا عالم گونج اُٹھے۔''

وہ دعا کیا کرتے تھے تو نہایت خضوع کے ساتھ اور ان کی دعا میں اتنی عاجزی اور تاثیر ہوتی کہ بندے کو یوں لگتا کہ دعا ابھی قبول ہوگئی ہے۔ وہ یہ دعا کیا کرتے: ''اے اللہ! بے پناہ بے لوث اپنے دین کا کام کرنے کی توفیق عطا فرما۔''

ایک موقع پر انہوں نے فرمایا: آپ یہ دعا بھی کر سکتے ہیں: "أستغفر الله ربي من كل ذنب واتوب اليه" اور ساتھ یہ ارشاد فرمایا: ہم اللہ کی طرف کیا پرواز کر سکتے ہیں آپ یہ دعا کیا کریں: رب اغفرلي وتب علي انك انت التواب الغفور..... اور ساتھ یہ الفاظ کہے: میں تیری طرف کیا پرواز کر سکتا ہوں، اے اللہ! تو ہی اپنی رحمت سے میری طرف متوجہ ہو..... الهي أنت مقصودي ورضاك مطلوبي..... حضرت سیّد صاحب اللہ تعالیٰ سے بے پناہ محبت کرتے تھے، بلکہ والہانہ عشق کرتے تھے، وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اُردو، فارسی، عربی اور بعض دفعہ پنجابی کے شعر پڑھا کرتے تھے:

جُتّی نوں تو ہیر بنا دے
تیرا کیہڑا زور لگ دا

''اے اللہ! میں تو ایک عام سا تیرا بندہ ہوں۔ یا اللہ! تو مجھے اپنے محبوب اور مقرب بندوں میں شامل فرما لے اور ایسا کرنا آپ کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔''

حضرت سید صاحب بندۂ عاجز کے ساتھ نہایت شفقت فرماتے، اپنی صحبتوں میں ساتھ رکھتے، بندۂ عاجز کی اصلاح فرماتے۔ 1974ء میں میری درخواست پر تحریک احیائے دین سید ین شہید ین کے امیر صوفی محمد عبد اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حکومتِ وقت نے ان کو بڑے بڑے عہدوں کی پیشکش کی، مگر انہوں نے ٹھکرا دی۔ انہیں پیش کش ہوئی حضرت آپ وزارت کا عہدہ قبول فرما لیں۔ فرمانے لگے: ''وزارت کی زندگی چھ ماہ کی اور فقیر کی زندگی ابدی ہوتی ہے۔''

1975ء میں حکومت پاکستان نے انہیں پہلے وائس چانسلر کے طور پر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں تعینات کر دیا۔ حضرت سید صاحب نے مجھے مکتوب گرامی لکھا، جس میں انہوں نے اپنی نئی ذمہ داریوں کے بارے میں لکھا اور ساتھ فرمایا: دعا کریں، اللہ تعالیٰ نئی ذمہ داریاں احسن انداز سے نبھانے کی توفیق دے۔ 1976ء میں حضرت سید صاحب حکومتی وفد کے ساتھ لندن میں تعلیمی کانفرنس میں شریک ہوئے، وہاں پر انہوں نے مقالہ پڑھنا تھا۔ لیکن اچانک

سڑک عبور کرتے ہوئے ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ جب مجھے اس سانحہ کی خبر ہوئی تو میں نے فوراً تیاری کی کہ لندن اپنے محسن کی تیمارداری کے لئے جاؤں، لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا، 24 اپریل کو ان کی وفات کی افسوس ناک خبر ملی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

پانچ دنوں کے جاں گسل انتظار کے بعد جمعرات 29 اپریل 10 بجے ان کا جسد خاکی لاہور پہنچا، دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں تابوت میں بند ان کی میت پہنچی تو میں وہیں تھا۔ دارالعلوم کا ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، کہرام بپا تھا، میں انتہائی غم زدہ دل کے ساتھ ان کی میت کے ایک طرف کھڑا ان کو تک رہا تھا۔ شام تک وہیں کھڑا رہا اور روتا رہا، چہرہ آج بھی یاد ہے، روشن چہرہ۔ حضرت مولانا معین الدین لکھوی نے ان کا جنازہ پڑھایا۔ اللہ میرے محسن کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ (آمین)[1]

[1] روزنامہ پاکستان، لاہور (8 اپریل 2017ء)، ماہنامہ مجلہ اسوۂ حسنہ، کراچی (مارچ 2021ء)

تم کیا گئے دن روٹھ گئے بہار کے

کچھ یادیں، کچھ باتیں

تحریر: مولانا ارشاد الحق اثری

خاندانِ غزنویہ سے تعارف الجامعۃ السلفیہ میں دورانِ تعلیم حمائل غزنویہ اور مترجم مشکوۃ سے ہوا اور تعلق خاطر حضرت سید عبد اللہ غزنوی نور اللہ مرقدہٗ کے سوانح اور بالخصوص ان کے مطبوع خطوط سے ہوا۔ حسنِ اتفاق کہ اسی زمانہ میں حضرت مولانا غلام رسول صاحب قدس سرہٗ (قلعہ میہاں سنگھ) کے سوانح حیات مل گئے۔ انہوں نے جلتی پر تیل ڈالا اور یوں اس خاندان سے قلبی تعلق استوار ہوتا گیا۔

حضرت موصوف کے وہ خطوط جو انہوں نے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ارسال فرمائے فارسی ادب میں بلند مقام کے حامل ہیں۔ گو دونوں بزرگ ہم سبق ہیں، دونوں نے حضرت میاں محدث دھلوی کے سامنے اکٹھے زانوئے تلمذ تہہ کئے لیکن خطوط میں اسی عقیدت، ادب و احترام و محبت کا اظہار ہے جو ایک مرید کو شیخ سے اور ایک سچے طالب علم کو استاذ سے ہوتا ہے۔

حضرت غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق صاحب عون المعبود مولانا شمس الحق محدث ڈیانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے:

"الشيخ العلامة قدوة أهل الاستقامة، إمام الهدى واليقين رئيس الأتقياء الكاملين، صاحب الكشف والتحقيق....

كان عارفا بالله ساعياً في مرضاته، عابداً، كثير الذكر، راجعاً إلي الله، متضلّلاً، خاشعاً، ورعاً، متواضعاً، حنيفاً كاملاً، إمام الزمان، ولي الرحمن، خادم القرآن، متقربا إلي الله المنان، وكان في جميع أحواله مستغرقاً في ذكر الله عزوجل حتى أن لحمه وعظامه وعصابه وأشعاره وجميع بدنه كان متوجها إلي الله تعالي فانياً في ذكره عزوجل."[1]

حضرت مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی شخصیت کا تعارف محبت بھری زبان میں بیان فرمایا وہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ چنانچہ وصیت نامہ میں لکھتے ہیں:

---

[1] مقدمہ غاية المقصود

''صحبت محدثین لازم شمارند کہ اہلِ حدیث اہل اللہ وبعد فراغ از علم دینیہ دست بیعت بشیخ کامل مکمل دہند ودرین زمان مثل عبداللہ غزنوی در قیاس ما احدے نیست۔ صحبتش اکسیر است وتحقیقت آنحضرت کامل مکمل پیر است۔ وعبد القادر (۱) ترجمہ قرآن ازیشان شروع کنند وبسم اللہ عبدالعزیز (۲) ازیشان شروع کند کہ در عقیدۂ فقیر مثل جنید ونظیر حضرت بایزید است۔

لا یدرك الواصف المطری خصائصه
وان یك سابقا فی کل ما وصفا

ہمیں بس گرچہ بس کاسد تماشم
کہ در سلک فرید ارانش باشم

(سوانح مولانا غلام رسول مرحوم)

بلا شبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بجا فرمایا اور امید ہے کہ تاریخ کا طلب علم بھی اس سے اتفاق کرے گا کہ جس طرح سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے شریعت وطریقت کی ثنویت پر ضرب کاری لگا کر باطنیہ کے سیل رواں کے سامنے بند باندھا۔ دلائل وبراہین سے علم ظاہری یعنی علم شریعت کی برتری کو ثابت کیا اور کتاب وسنت ہی کو اساسِ روحانیت اور معیارِ ولایت قرار دیا۔ اسی طرح حضرت غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے بدعی تصوف اور نظامِ خانقاہی کے مقابلہ میں خالص کتاب وسنت کو اصلاحِ نفس کا معیار قرار دیا۔ غزل گوئی (جسے اصطلاحاً صوفیاء سماع کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں) اور اشتغالِ صوفیاء سے بیزاری کا اعلان کیا۔ تلاوتِ قرآنِ پاک اور ادعیہ ماثورہ کو اوڑھنا بچھونا بنایا بلکہ لطائف واشتغالِ صوفیہ کو احداث فی الدین قرار دیا۔

سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اس عظیم خانوادے کے چشم وچراغ تھے۔ آپ ماہر علوم قدیمہ وجدیدہ کے ساتھ ساتھ للّٰہیت، استغناء، درویشی میں بادشاہی، ذکر میں انہماک، فقراء سے محبت، اپنے خاندان سے ورثہ میں ملا۔

راقم السطور سے ان کا تعارف غالباً 1970ء میں ہوا۔ آپ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں لائل پور میں تشریف لائے۔ میں ان دنوں معتکف تھا۔

استاذِ محترم مولانا محمد عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے گذارش کی کہ میرا پیغام حضرت سید صاحب تک پہنچا دیں: ''مسجد کے کونہ میں ایک درویش زیارت کا متمنی ہے، شرعی حدود مانع نہ ہوتیں تو حاضر خدمت ہوتا۔''

حسبِ اطلاع دوپہر کے وقت پیغام پہنچا تو عصر کے بعد جناب میاں عبدالواحد صاحب کے ساتھ مسجد منٹگمری

---

(۱) آپ کے بڑے صاحبزادے کا نام ہے۔

(۲) آپ کے دوسرے صاحبزادے، دونوں علم وفضل کے حامل تھے۔ ذلك فضل الله یؤتیه من یشاء

بازار میں تشریف لائے، میں ابھی وضو سے فارغ ہو کر معتکف میں جا رہا تھا کہ پیچھے سے آواز سنائی دی کہ حضرت سید صاحب تشریف لائے ہیں۔ واپس لوٹا اور جلدی سے سلام کے بعد نعلین اٹھا کر معتکف میں رکھ لیے۔ آپ نے وضو کیا میں پاس کھڑا ان کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔ محسوس یوں ہوتا تھا کہ آپ ہاتھ پانی سے نہیں آنسوؤں سے دھو رہے ہیں اور بار بار وضو کے دوران یہ مسنون دعا پڑھ رہے ہیں:

اللّٰهم اغفرلي ذنبي ووسع لي داري وبارك لي في رزقي.

میں نے ایک دفعہ ان سے خطبۂ جمعہ میں سنا تھا کہ نماز میں اطمینان اور خشوع وخضوع کے لیے ضروری ہے کہ وضو پوری جمعیت سے کیا جائے اور ہاتھ دھوتے وقت خیال کرے کہ آقا کے سامنے ہاتھ مل مل کر گناہوں کی معافی مانگ رہا ہوں۔ اسی طرح دیگر اعضاء کو دھوتے ہوئے ان کی گناہوں کی معافی طلب کرے اور بار بار مسنون دعائیں پڑھتا جائے۔ الحمد للہ کہ آج اس کا عملی نمونہ ان گناہگار آنکھوں سے دیکھا۔ وضو سے فارغ ہو کر میرا نام پوچھا۔ میں نے نام بتلایا تو فوراً سینے سے لگالیا اور فرمایا: یہاں تم ہی سے تو ملنے آیا ہوں۔ اس کے بعد میرے ساتھ ہی معتکف میں تشریف لے آئے۔ لمحہ بھر خاموشی کے بعد عرض کیا کہ حضرت دعا فرمائیے۔ فرمایا: میں تو خود دعا کے لیے آیا ہوں، تم دعا کرو میں آمین کہوں گا۔ یہ سن کر ندامت سے سر جھک گیا۔ میں نے پھر عرض کیا: حضرت دعا فرمائیے، مجھے دعا کا سلیقہ نہیں آتا۔ انہوں نے پھر فرمایا: نہیں۔ تم دعا کرو میں آمین کہوں گا۔ چنانچہ ہاتھ اٹھائے اور مختصر مگر جامع دعا کی۔ دعا سے فارغ ہوئے تو میں نے پھر خیریت پوچھی۔ فرمایا: خیریت کیسی؟ میں نے عزم کرلیا ہے کہ واپس لاہور جا کر باقی ایام اعتکاف میں گزاروں گا۔ جو سکون یہاں چند لمحے میں حاصل ہوا اس کا تصور بھی باہر کی دنیا میں ممکن نہیں۔ اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا۔ نماز سے فارغ ہوئے تو الوداعی سلام کے بعد فرمایا: لاہور کبھی آؤ تو مجھے ضرور ملو پھر تفصیل سے باتیں ہوں گی۔ یہاں زیادہ گفتگو مناسب نہیں۔

یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی جس سے ان کی محبت وعقیدت کا آغاز ہوا اور پھر یہ تعلق بدستور بڑھتا گیا۔ اس کے بعد لاہور جاتا تو زیارت کی کوشش کرتا۔ گرمیوں کے موسم میں ایک مرتبہ عصر کی نماز کے قریب پہنچا۔ موسم کے مناسب مشروب سے مہمانی کی اور فرمایا: میں نے ابھی عصر کی نماز پڑھنی ہے۔ نماز سے فراغت کے بعد بیٹھیں گے۔ چند لمحے کے بعد وضو کر کے واپس تشریف لائے، انہوں نے نماز پڑھائی۔ کسی زمانہ میں غزنوی طریقۂ نماز سن رکھا تھا، آج مشاہدہ کیا۔ تقریباً بیس منٹ میں نماز سے فارغ ہوئے۔ نماز میں جو سکون واطمینان حاصل ہوا، افسوس وہ آج تک دوبارہ حاصل نہ ہوسکا۔

نماز کے بعد چائے آگئی۔ اسی دوران کچھ طالب علمانہ سوالات کیے۔ ذکر واذکار کے طریقہ کا سبق لیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد اجازت طلب کی تو فرمانے لگے: اتنی جلدی؟ میں بڑھ کر گلے چمٹ گیا اور گردن کا بوسہ لیتے ہوئے کہا:

لپٹ کر چوس لے گل کو اری بلبل
چمن میں پھر بہار آئے نہ آئے

فرمانے لگے: اس قدر دیوانگی اچھی نہیں۔ میں نے معاعرض کیا:

دیوانگیٔ عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ اُس کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا دے

تو ہنس دیئے، ان سے رخصت ہوا تو دیر تک یوں گنگناتا رہا۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است
رفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مجلسِ ذکر قائم کر رکھی تھی، تین چار مرتبہ اس میں بھی حاضری کا موقع ملا، جس کا طریقہ یہ تھا کہ ہر صاحب حسبِ حال آہستہ ذکر کرتے کوئی پابندی نہیں تھی کہ اب مل کر اسم اعظم کا ذکر کرو پھر افضل الذکر اکٹھے پڑھو جیسا کہ عموماً مجالسِ ذکر میں ہوتا ہے۔ البتہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ مخصوص غزنوی انداز میں کچھ وقت کے بعد استغفر اللہ فرماتے اور کبھی اللہ کا مبارک نام لیتے۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اس کے بعد ''ریاض الصالحین'' یا کسی اور کتاب سے دو تین احادیث کا مختصر درس ہوتا اور پھر موسم کے مطابق حاضرین کی تواضع کرتے۔ اس کے بعد یہ مجلس ختم ہو جاتی۔

اللہ ذوالجلال نے انہیں بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ جہاں جس مجلس میں بیٹھتے اپنی شاہانہ انفرادیت قائم رکھتے۔ جس موضوع پر گفتگو ہوتی اس پر عقلی ونقلی دلائل کے انبار لگا دیتے۔ فارسی تو آپ کی مادری زبان تھی، اردو کے علاوہ عربی اور انگلش پر بھی عبور تھا۔ جب چاہتے بلا تکلف سب زبانوں میں گفتگو کرتے۔ عربی بولتے تو یوں محسوس ہوتا کہ حجاز کے کوئی شیخ محوِ گفتگو ہیں۔ شعر وشاعری سے بھی آپ کو لگاؤ تھا۔ اردو، عربی اور پنجابی کے ہزاروں اشعار ازبر تھے۔

لائل پور تشریف لاتے تو اکثر و بیشتر جناب میاں عبدالواحد صاحب کے ہاں قیام ہوتا۔ ایک مرتبہ مجلس گرم تھی، عابد ومعبود کے موضوع پر باتیں ہو رہی تھیں کہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب نے ہیر وارث شاہ کا یہ جملہ پڑھا:

انا انا تے نحن کدو آکھیا میں
میں تے آکھیا قالو بلیٰ نا تھا

تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے برجستہ فرمایا:

میں کہہ کے بلیٰ پھنس گیا بلاء میں مدام

یہ بلاء اک میرے لیے ہے اور میں بلاء کے لیے

ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے اللہ سے محبت کی باتیں ہو رہی تھیں فرما رہے تھے کہ محبت کے بغیر اطاعت سے انسان منزلِ مقصود تک نہیں پہنچتا اور نہ ہی گوہرِ نایاب ہاتھ آتا ہے۔ اس کے بعد بڑے درد بھرے انداز میں یہ شعر پڑھا:

قد لسعت حية الهوى كبدی
فلا طيب لها ولا راقی

ایک مرتبہ ذکر کے موضوع پر بات کر رہے تھے کہ اللہ کی یاد سے کوئی لمحہ خالی نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں جس قدر وقت گذر جائے غنیمت ہے۔ فرمایا: کہ سیّد الاولین والآخرین کو حکم ہوا کہ ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ اور پھر اس کی ترجمانی میں جذب کے عالم میں شیخ فرید کا یہ شعر پڑھا۔

کوک فریدا کوک توں جیویں راکھا ہے جوار
جد تک ٹانڈا نہ پکے تو کردا رہ پکار

بلا شبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایک سچے صوفی اور درویش منش انسان تھے۔ کئی مجلسوں میں مسلمانوں کی زبوں حالی پر انہیں کڑھتے دیکھا۔ انہیں قوم کے واعظوں سے بھی شکوہ تھا۔ فرمایا کرتے: جس ملک میں خداوند قدوس کا انکار ہو، اس کے دین سے کھلے بندوں استہزاء ہو، شیطان چوراہوں میں ننگا ناچ رہا ہو، اس میں فروعی اختلاف کو ہوا دینا کوئی دین کی خدمت نہیں۔

وہ صحیح معنوں میں عالمِ دین تھے۔ اللہ کریم کی محبت اور اس کا ڈر ان کے رگ و ریشے میں رچا بسا تھا۔ واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ انہیں بسا اوقات غلبہ حال میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے بھی دیکھا گیا۔ میں نے کئی دوستوں اور بزرگوں سے ان کی ابتدائی زندگی اور حالیہ زندگی کی کچھ مجبوریوں کی بنا پر کوتاہیوں پر شکوہ بھی سنا۔ لیکن شاید کسی عارف کا یہ قول انہیں معلوم نہیں:

ہر کہ درد اہلِ ہنر در اہلِ عیب
آفتابے دارد اندر جیب غیب
عاقبت روزے بود کاں آفتاب
در برش گیر دلبر انداز نقاب

بلا شبہ وہ جلد ہی آفتاب بن کر چمکے اور جلد ہی غروب ہو گئے۔ بڑے خوش نصیب ہیں جنہوں نے اس سے روشنی حاصل کی۔ ان کی مجلسوں اور محفلوں سے دل کی اجڑی دنیا کو بسایا۔ اپنے اللہ کریم کو راضی کرنے کا ان سے سلیقہ سیکھا۔ لیکن آہ اپنا تو یہ حال ہے:

در مجلسِ وصالت خمہا کشند مرداں
چوں دور خسرو آید مے در سبو نماند

اللہ تعالیٰ ہماری اور ان کی لغزشوں پر نظرِ عفو فرمائے اور انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ بخشے۔ میں نے انہیں دعائے یوسفی بکثرت پڑھتے سنا۔ امید واثق ہے کہ اللہ کریم و رحیم نے اسی کے مطابق معاملہ کیا ہوگا۔ (1)

(1) ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)، مقالات (473/4) [اشاعت: ستمبر 2018ء]

حضرت مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

سپہر علم کا ایک آفتاب

تحریر: مولانا محمد خالد سیف

25 اپریل 1976ء کی شام حسرت کس قدر یاس انگیز تھی جب کہ لندن کے افق پر پاکستان ہی نہیں سارے عالمِ اسلام کا ایک بے مثل آفتاب غروب ہوگیا۔ میری مراد حضرت سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ جو لندن کے اسلامی میلے میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے اور 4، 5 اپریل کی درمیانی شب سڑک عبور کرتے ہوئے کار کے حادثہ میں شدید زخمی ہوگئے۔ زخم کاری ثابت ہوئے اور بالآخر یہ مردِ حق آگاہ اللہ اللہ کرتے ہوئے لندن کے ویسٹ منسٹر ہسپتال میں اپنے اللہ کے حضور جا پہنچے۔ رحمة الله عليه رحمة واسعة

سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ برصغیر پاک و ہند کے مشہور خاندان ''خاندانِ غزنویہ'' کے چشم و چراغ حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزندِ ارجمند تھے اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے پہلے وائس چانسلر تھے۔ لیکن آپ کی عظمت کا انحصار صرف اسی میں نہیں بلکہ آپ کی عظمت کا اصل سرمایہ اپنا حسنِ عمل ہے جس کی بدولت آپ آسمانِ رفعت پر ماہِ شب چہار دہم بن کر جگمگائے۔ عرفی نے کیا خوب کہا:

مایہ از زندگی از گہر خویش گیر
تا بکے ایں عز وناز از اب وعم داشتن

آپ پیکرِ شرافت، مجسم اخلاق اور نہایت منکسر المزاج تھے۔ مرنجان مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ جس محفل میں ہوتے کشتِ زعفراں بن جاتی۔ مزاج کے درویش، دل کے بادشاہ، دماغ کے غنی، زبان کے دھنی، علم وفضل کے پہاڑ، حسنِ عمل کے بحرِ ذخار، تہجد گزار اور شبِ زندہ دار تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ احسن الخالقین نے حبِ الٰہی، عشقِ رسول، علم وفضل، تڑپ احیائے دین، ولولۂ جہاد، سوز وگداز اور حسن وجمال سے ایک آمیختہ بنایا اور نام اس کا ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ رکھ دیا۔

رعنائی وزیبائی محبوبی وخوبی!
کیا بات ہے جو اس قد دلجو میں نہیں ہے

سید ابوبکر غزنوی کے سانحۂ ارتحال کو اگرچہ پانچ چھ ماہ ہو چکے ہیں، لیکن ابھی تک آپ کی وفات کا یقین سا نہیں ہو

رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے روٹھ کر کہیں روپوش ہو گئے ہیں آخر ماموں کانجن کی پہلی سالانہ کانفرنس کے خطاب میں خود بھی تو فرما رہے تھے کہ:

''میں تم سے روٹھ کر جب روپوش ہو جاتا ہوں تو تم ڈھونڈتے ہو کہ وہ دیوانہ کہاں گیا؟''

لیکن یقین آئے یا نہ آئے، دل مانے یا نہ مانے حقیقتوں کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ خصوصاً جب حقیقت بھی موت جیسی اٹل ہو تو اس کا انکار کون کر سکتا ہے؟

جی ہاں وہ ہم سے روٹھ کر روپوش ہو گئے ہیں اور دور چلے گئے ہیں۔ بہت دور...... جہاں جانے والا کبھی واپس نہ آیا۔ آہ موت کے آہنی ہاتھوں نے اتنی پیاری اور موہنی، باغ و بہار اور مرنجان مرنج شخصیت کو ہم سے جدا کر دیا اور ہم ایک گنجِ گراں مایہ سے محروم ہو گئے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

سید ابوبکر غزنوی نے اگرچہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی لیکن ان کے تحصیلِ علم کے شوق کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ فرصت کے لمحات میں اپنی آبائی درسگاہ ''دار العلوم تقویۃ الاسلام غزنویہ'' کے اساتذہ کرام سے کسبِ ضوء کرتے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ جب موسم گرما کی تعطیلات ہوتیں تو کبھی وہ ملک کی ایک عظیم دینی درسگاہ ''جامعہ سلفیہ'' لائل پور (مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم جس کے بانیوں میں سے تھے) میں منتقل ہو جاتے اور یہاں کے اساتذہ کرام بالخصوص حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی اور حضرت مولانا شریف اللہ خان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے اپنی علمی تشنگی کو تسکین بخشتے تھے۔

الغرض مرحوم نے بڑی محنت، شوق اور لگن سے اپنے تئیں قدیم و جدید علوم سے آراستہ کیا۔ اور بہت جلد نہایت ممتاز علمی مقام پیدا کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلامیہ کالج لاہور انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے عربی و اسلامیات کے شعبوں کی سربراہی سے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی وائس چانسلری کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔ آپ اس یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر تھے اور حکومت کے حسنِ انتخاب کی ایک بہترین مثال، اسلامک سٹڈیز کے علاوہ شعر و ادب اور تصوف آپ کے خاص موضوع تھے بلکہ شعر و ادب اور تصوف کا آپ کی شخصیت نہایت حسین امتزاج تھی۔ خطابت کی وادی میں اترے تو بہت جلد لوہا منوایا۔ اس سلسلہ میں کوئی آپ کا سہیم و شریک نہ تھا۔ ملک خصوصاً لاہور کے در و دیوار ابھی تک آپ کی بے مثل خطابت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ جب آپ خطاب فرماتے تو مجمع پر ایک عجب سناٹا طاری ہو جاتا۔ آپ کی زبان فیض ترجمان سے شعر و ادب، تصوف، تاریخ اور سیادت کے حقائق و معارف کا ایک چشمہ سا ابل ابل پڑتا اور لوگ تصویر حیرت بنے آپ کے رخ آتشیں کو تکتے رہ جاتے۔ گویا فیضی کی زبان میں کہہ رہے ہوں:

چہ جادہ ئیست ندانم بطرزِ گفتارش
کہ بازبستہ زبان سخن طرازاں را

اردو، عربی، فارسی، پنجابی اور انگلش پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ جب ان میں سے کسی زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے، تو اہلِ زبان کا سا گمان ہوتا۔ نہایت پاکیزہ، شستہ، فصاحت و بلاغت میں ڈوبی ہوئی اور کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان استعمال کرتے۔ جن لوگوں نے آپ کی تقریر کو سنا یا آپ کے مقالات کو پڑھا ہے وہ ہماری بات کی تصدیق کریں گے۔ شعر و ادب کے بے پناہ مطالعے اور نہایت بلند ذوق کے باوصف آپ نے شاعری کو اپنے لیے مشغلہ نہیں بنایا تھا۔ اس کے وجودِ جذبات سے مغلوب ہو کر اگر کبھار شعر کہتے تو یوں محسوس ہوتا کہ کسی بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر کا کلام ہے۔ مثال کے طور پر وہ نظم پیش کی جا سکتی ہے جو آپ نے الجزائر کی آزادی پر ھنیئالك یاارض الجزائر کے نام سے عربی میں کہی تھی اور مارچ 1962ء کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں شائع ہوئی تھی۔ [1]

آپ نے زندگی کی اکثر و بیشتر بہاریں لاہور ہی میں گزاری تھیں اس لیے آپ کے وائس چانسلر بننے کے بعد جب پہلی مرتبہ ماموں کانجن کانفرنس کے موقعہ پر ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا: ''سر'' آپ کو چمن سے اٹھا کر صحرا میں بھیج دیا گیا ہے۔ کیا آپ کو بہاولپور کا ماحول پسند آیا؟ فرمانے لگے: ''بھائی! میری زندگی کے کچھ معمولات ہیں، اگر ان میں فرق نہ آئے تو میں جہاں رہوں، ٹھیک ہوں۔ اور دوسری بڑی بات تو یہ ہے کہ میرے ذہن میں علمی میدان میں کام کرنے کا ایک خاص خاکہ تھا، دیرینہ آرزو تھی کہ موقع ملے تو اس کے مطابق کام کروں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کام کرنے کا موقع مہیا فرمایا ہے۔''

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نہایت ہی قلیل سی مدت میں آپ نے جو اصلاحات نافذ فرمائیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اگر آپ کو کچھ اور موقع ملتا تو شاید یونیورسٹی کو کتنے ہی چار چاند لگ جاتے۔

اسی طرح ایک اور موقع پر آپ نے راقم الحروف کے سامنے اظہار فرمایا تھا کہ: ''آج کے کفر و الحاد کی یلغار کے مقابلے میں اسلام کے مختلف موضوعات پر ایک سو مقالات سپردِ قلم کرنا چاہتا ہوں۔''

آپ کے مخصوص احباب یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ ان دنوں سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک احیائے دین کو زندہ کرنے کے لیے شدید بے تاب تھے۔ لیکن موت نے آپ کو اس کی مہلت نہ تھی۔ اگرچہ دنیا کے اس پل پر سے گزر کر آخرت کی طرف ہر انسان نے جانا ہے لیکن مذکورہ اوصاف کی حامل کچھ شخصیتیں سید صاحب جیسی ہوتی ہیں کہ ان کی وفات حسرت آیات سے سوگواری کا گہرا احساس چھا جاتا ہے۔ لہو کے دیپ جل اٹھتے ہیں اور سیل اشک تھمتے ہی نہیں اور بجا طور پر کہنا پڑتا ہے:

[1] نظم مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

پی گئی کتنوں کا لہو تیری یاد
غم تیرا کتنے کلیجے کھا گیا

آہ! آج دل فگار ہے اور آنکھیں اشکبار ہیں کہ وہ غمخوار نہ رہا بلکہ سچ پوچھئے تو کیفیت یہ ہے کہ

جب تیرا نام لیجیے، تب چشم بھر آوے

لیکن اشک بہانے سے فائدہ؟ ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے محبت اور عقیدت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔ جہاں تک حکومت کا تعلق تھا میں سمجھتا ہوں کہ وہ مرحوم کے بچوں کی مدد کر کے کسی حد تک اپنے فرض سے عہدہ برا ہوگئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کے عقیدت مند اور ارادت مند اپنے فرض سے کہاں تک عہدہ برا ہوتے ہیں؟ اس ضمن میں ان کی اپنی جماعت اہلِ حدیث کے افراد بطور خاص میرے مخاطب ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم اس بات کے منتظر ہیں کہ سید صاحب سے عقیدت اور محبت رکھنے والوں میں سے وہ کون ہے جو:

☆.... صحیح طور پر ان کے نقشِ قدم پر چلے؟

☆.... علمی خاکوں میں رنگ بھرے؟

☆.... اسلام کے مختلف موضوعات پر ایک سو مقالات سپردِ قلم کرے؟

☆.... تحریک احیائے دین کو زندہ کرے؟

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ

☆.... ذکر و فکر الٰہی کی مجلسوں کو گرم کرے؟

آخر میں قارئین کرام کی خدمت میں درخواست ہے کہ آیئے ہاتھ اٹھائیں، سر کو جھکائیں اور مرحوم کے لیے سوز و گداز کے ساتھ دعا کریں۔[1]

اللّٰهم اغفر له وارحمه، وعافه واعف عنه، واكرم نزله ووسع مدخله، واغسله بالماء والثلج والبرد، ونقه من الخطايا كما نقيت الثوب الابيض من الدنس، وابدله دارا خيرا من داره، واهلا خيرا من اهله، وزوجا خيرا من زوجه، وادخله الجنة واعذه من عذاب القبر، ومن عذاب النار.

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

هنيئًا لكِ، يا ارضَ الجَزائر

1 نُقدّم التّهانى وأطيبَ الامانى
وأخلَصَ التحايا، يا بقعَةَ الجزائر

2 قد دُقّتِ البشائر، قد دُقّتِ البشائر
يا بقعة الجزائر، قد صرتِ من حرائر

3 القسر والتجبّر، الجور والتجنّى
الحَوبة الكبيرة بل أكبر الكبائر

4 فضَحكتِ من كوارث وسَخِرتِ من منايا
فخلصتِ من فرَنْسا ونجوتِ من مرائر

5 من يظلم الصبايا، من يقتلِ المراضع
فعليهم الدّوائر، فعليهم الدّوائر

6 هل تقهر الفرنسا أو تغلب الجزائر
وخزانتنا القديمة نزّعت من ضمائر

يا بقعة الجزائر قد صرتِ من حرائر

ہفت روزہ الاعتصام (30 مارچ 1962ء)

حضرت سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

آسمان علم وفضل کے آفتاب

تحریر: مولانا محمد خالد سیف

حضرت سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا سب سے پہلی بار شرف 1962ء میں حاصل ہوا اور یہ شرف عظیم مسلسل دو ماہ تک حاصل ہوتا رہا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ راقم سطور 1962ء میں ملک کی عظیم دینی دانش گاہ جامعہ سلفیہ فیصل آباد (تب لائل پور) کے دوسرے درجے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ اس سال جب سکولوں، کالجوں میں موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو حضرت سید صاحب جامعہ سلفیہ میں تشریف لے آئے۔ آپ محض چھٹیاں گزارنے کے لیے تشریف نہیں لائے تھے بلکہ آپ کی آمد ایک عظیم ترین مقصد کی خاطر تھی۔ آپ ان دنوں جامعہ کی مسند تدریس پر فائز جہابذہ اساتذہ کرام شیخ العرب والعجم حضرت حافظ محمد محدث گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ المعقولات حضرت مولانا شریف اللہ خان سواتی رحمۃ اللہ علیہ سے اکتساب فیض کرتے ہوئے علمی تشنگی کو تسکین بخشنا چاہتے تھے۔ اسی قیام کے دوران آپ نے ایک اور اہم علمی شخصیت، مشہور مصنف ومترجم جناب پروفیسر غلام احمد حریری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی استفادہ کیا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں قارئین کرام خصوصاً عزیز طلبہ کی توجہ اس جانب مبذول کراؤں گا کہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب مزید طلبِ علم کے لیے جامعہ میں آئے تو اس وقت آپ ایم اے عربی کر چکے تھے، ایم اے عربی تو آپ نے 1950ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیا، یونیورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کی اور گولڈ میڈل حاصل کیا اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی بھی کیا اور قریباً دس سال سے اسلامیہ کالج لاہور (سول لائن) میں عربی کے لیکچرار اور عربی واسلامیات کے شعبوں کے سربراہ تھے نیز اورینٹل کالج لاہور میں جدید عربی زبان کے جزء وقتی لیکچرار بھی تھے۔ ان ساری کامیابیوں اور رفعتوں کے باوصف آپ سالانہ تعطیلات گزارنے کے لیے جامعہ سلفیہ میں تشریف لائے تاکہ علم وفضل کے اس چشمہ صافی کے آبِ زلال سے علمی تشنگی کی تسکین کا سامان فراہم کرسکیں۔ انہی محنتوں اور ریاضتوں کا ثمر اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ آپ فلک علم وفضل اور آسمان رشد وہدایت پر آفتاب نصف النہار بن کر چمکنے لگے!

حضرت سید صاحب جب جامعہ میں تشریف لائے تو اس وقت قریباً پینتیس برس کے جوانِ رعنا تھے۔ میانہ قامت، چہرے کے خوب صورت نقش ونگار، سرخ وسفید رنگ، کشادہ جبیں، چوڑا سینہ، آنکھوں میں ذہانت وفطانت کی چمک، آواز میں کھنک، صاف شفاف اُجلا لباس اور بے حد نفاست پسند طبع۔

اب تو جامعہ کی جدید عمارت بہت خوبصورت اور پرشکوہ ہے۔ میں جس دور کی بات کر رہا ہوں، اس وقت ساری عمارت ایک ہی لائن میں دو رویہ پچیس تیس کمروں پر مشتمل تھی۔ سامنے کی رو میں دائیں طرف جامعہ کے اساتذہ کرام کے کمرے تھے، انہی میں سے ایک کمرہ آپ کے لیے خالی کرا دیا گیا تھا۔ آپ اکثر و بیشتر اپنے کمرے ہی میں مطالعے میں مصروف رہتے اور بوقت ضرورت ہی باہر تشریف لاتے اور جب باہر آتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے بادلوں کی اوٹ سے چاند نمودار ہو گیا ہو۔ مجھے آپ کے والد گرامی منزلت حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہو سکا لیکن ان کے بارے میں جب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ الفاظ پڑھے:

''سانچہ میں ڈھلا ہوا جمال ظاہری، حسن مردانہ اور افغانی وجاہت کا ایک پیکر، سرو قامت، دوہرا بدن، سرخ سفید رنگ، چہرہ پر حسب نسب کا نور، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فرشتہ آسمان سے اتر کر زمین پر آگیا ہے، لباس بھی نظیف و جمیل، ہر ادا سے خوش ذوقی اور نستعلیقی نمایاں، بہت اچھی مجلسی گفتگو کرنے والے اور بہت اچھے مقرر۔''[1]

اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِّاَبِیْهِ کے مصداق سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا سراپا بھی ایسا ہی تھا۔ بس یوں سمجھئے کہ مرحوم پیکر شرافت، مجسم اخلاق، نہایت منکسر المزاج اور مرنجان مرنج طبیعت کے مالک تھے، جس محفل میں ہوتے کِشتِ زعفران بن جاتی، مزاج کے درویش، دل کے بادشاہ، دماغ کے غنی، زبان کے دھنی، علم و فضل کے پہاڑ، حسن عمل کے بحر ذخار، تہجد گزار اور شب زندہ دار تھے، معلوم ہوتا ہے کہ خالق و مالک کائنات نے حبِ الٰہی، عشقِ رسول، علم و عمل، تڑپ احیائے دین، ولولۂ جہاد، سوز و گداز، حسن و جمال، ذہانت و فطانت اور ذکر و فکر سے ایک آمیختہ بنایا اور نام اس کا ابوبکر غزنوی رکھ دیا۔ نور اللہ مرقدہ

آپ بڑی ہی خوب صورت گفتگو فرماتے، جو حشو و زوائد سے پاک لیکن اس میں ادب کی چاشنی ہوتی، کبھی کبھی دوران گفتگو انگلش کے بھی کئی الفاظ استعمال کر لیتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کی طرح آپ کا انگلش کا تلفظ بھی بہت خوب صورت تھا، آپ کے جامعہ میں قیام کے دور کی ایک چھوٹی سی بات یاد آگئی، عصر کے بعد کا وقت تھا اور میں آپ کے کمرے کے آگے سے گزر رہا تھا کہ آپ نے بڑی ملائمت سے بلایا اور فرمایا: بھائی! حافظ صاحب، استاد گرامی منزلت حضرت مولانا حافظ بنیامین طور رحمۃ اللہ علیہ، جن کا کمرہ آپ کے کمرے کے متصل تھا، سے وقت پوچھ کر بتائیں! میں نے حضرت حافظ صاحب سے وقت پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ پانچ بجے ہیں، میں نے حضرت سید صاحب کو وقت بتانے سے پہلے سوچا کہ پروفیسر صاحب اپنی گفتگو میں انگلش کے الفاظ استعمال کرتے ہیں لہٰذا میں بھی آپ کو وقت بتاتے ہوئے کوئی نہ کوئی انگلش کا لفظ ضرور استعمال کروں گا، اس وقت میں ساتویں جماعت کی انگریزی پڑھ رہا تھا۔ میں نے

---

[1] پرانے چراغ: ج 2 ص 278

عرض کیا: فکس پانچ بج چکے ہیں، آپ یہ سن کر مسکرائے اور وہ دل آویز مسکراہٹ اب تک یاد ہے، پھر بڑی ہی محبت اور شفقت سے فرمایا: بھائی! یہ فکس پانچ کیا ہوتا ہے؟ فکس فائیو یا پورے پانچ کہیں!

تعطیلات ختم ہوئیں تو حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی لاہور واپس تشریف لے گئے اور بڑی خوشگوار یادیں اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ یہ 1962ء کی بات ہے، 16 دسمبر 1963ء کو حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوئے، اس سے اگلے برس 1964ء میں جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کی کانفرنس ...... جو اوڈانوالہ سے جامعہ تعلیم الاسلام کے ماموں کانجن میں منتقل ہونے کے بعد پہلی کانفرنس تھی...... میں حضرت سید صاحب کا خطاب سننے کا پہلی دفعہ موقعہ ملا اور وہ منظر اب تک یاد ہے، بہت بڑا مجمع تھا اور رات کا وقت۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر الٰہی کے موضوع پر خطاب کیا اور ابتداء میں تمہید کے طور پر فرمایا کہ والد مرحوم اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا کرتے تھے کہ ابوبکر! تم بھی کچھ کہا کرو لیکن میں شرم کی وجہ سے بہت حجاب اور انقباض محسوس کرتا لیکن اب میں نے عزم کرلیا ہے کہ توحید کی جس شمع کو خاندان غزنویہ کے بزرگوں نے اپنے لہو سے فروزاں کیا تھا، میں اس کی لو مدھم نہیں ہونے دوں گا اور بستی بستی، شہر شہر جاکر ان کے پیغام کو پہنچاتا رہوں گا۔ جب آپ خطاب فرما رہے تھے، اس وقت اسٹیج پر حضرت صوفی عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بہت سی اہم علمی و روحانی شخصیتیں تشریف فرما تھیں۔ آپ نے ذکر الٰہی کی حقیقت، اہمیت، عظمت اور ثمرات و برکات اس قدر مؤثر اور دل نشیں انداز مین بیان فرمائے کہ سارا مجمع ہمہ تن گوش برآواز تھا، آپ نے دوران خطاب مناسب موقعوں پر کئی بار یہ الفاظ دہرائے:

اِلٰهِيْ اَنْتَ مَقْصُوْدِیْ وَرِضَاكَ مَطْلُوْبِیْ

اہل اللہ کا مطلوب ومقصود اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہوتا ہے، انہوں نے اس حقیقت کو پالیا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی توفیق کا مل جانا، دنیا بھر کی دولتوں اور حکومتوں کے مل جانے سے افضل ہے:

پس از سی سال ایں نکتہ محقق شد بہ خاقانی
کہ یک لحہ بودن باخدا بہتر از ملک سلیمانی

"تیس سال کی محنت وریاضت کے بعد خاقانی کو یہ نکتہ سمجھ میں آیا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں ایک لحہ گزارنا حکومتِ سلیمانی کے مل جانے سے بہتر ہے۔"

بہرحال آپ خطاب فرما رہے تھے اور سامعین پر ایک سناٹا طاری تھا، معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل اللہ کی محبت سے لبریز ہو رہے ہیں اور جب بھی اِلٰهِيْ اَنْتَ مَقْصُوْدِیْ وَرِضَاكَ مَطْلُوْبِیْ ...... والے الفاظ دہراتے تو یوں محسوس ہوتا کہ روحانی ہوا کا ایک جھونکا سارے مجمع کو نہال کر گیا ہے۔ الغرض شدت تاثیر کے پیش نظر سامعین کی محویت اور استغراق کی یہ کیفیت تھی، جیسے کسی ماہر اور مشاق جادوگر نے اپنی کرشمہ سازیوں اور سحر آفرینیوں سے ساکت وجامد کر دیا ہو، کیوں

نہ ہو جب کہ:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

اپنے اسی خطاب کے آخر میں آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ انتظامیہ کی ستم ظریفی ہے کہ لاہور شہر میں خطاب کے لیے مولانا محمد حسین شیخوپوری کو بلایا جاتا ہے اور ماموں کانجن میں ابوبکر غزنوی کو، میں پنجابی ادب کا بھی طالب علم رہا ہوں لہٰذا آئندہ اگر یہاں آیا تو پنجابی ادب کی کتابوں سے الفاظ ڈھونڈ ڈھانڈ کر لاؤں گا اور پنجابی میں تقریر کروں گا۔ اس کے بعد بھی آپ ماموں کانجن میں کئی بار تشریف لائے، کانفرنسوں میں خطاب فرمایا اور حسب معمول کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی اردو زبان ہی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ البتہ دورانِ خطاب جہاں آپ اردو، عربی اور فارسی کے اشعار موقع و محل کی مناسبت سے پڑھتے، وہاں کبھی کبھی پنجابی زبان کے اشعار بھی پڑھتے اور وہ اس قدر برمحل ہوتے کہ معلوم ہوتا کہ شائد شاعر نے اسی موقعہ ہی کے لیے یہ شعر کہے ہیں۔

حضرت سید صاحب کے کئی خطاب فیصل آباد کی کئی کانفرنسوں اور جلسوں میں سننے کا بھی اتفاق ہوا اور پھر 1972ء میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ آپ سے ارادت وعقیدت کے بے حد گہرے مراسم قائم ہو گئے اور آپ بھی بے پناہ محبت وشفقت سے سرفراز فرمانے لگے۔ میں ان دنوں ملک کے مشہور علمی وتحقیقی ادارے ادارہ علوم اثریہ فیصل آباد سے وابستہ تھا کہ ایک دن محب مکرم اخی فی اللہ حضرت مولانا عائش محمد حفظہ اللہ تشریف لائے اور انھوں نے فرمایا کہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ایک علمی کام کے سلسلے میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے لہٰذا آپ تیار ہو جائیں، ہم نے ان کی خدمت میں حاضری کے لیے لاہور جانا ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ میرے جیسا ادنیٰ سا طالب علم کسی علمی کام میں کیا تعاون کر سکتا ہے؟ شاید قدرت مجھے اس آفتاب علم وفضل سے اکتساب ضیاء کا موقع فراہم کرنا چاہتی ہے، جس کی ضو افشانیوں سے ایک دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ بہر آئینہ حضرت مولانا کی رفاقت میں لاہور روانہ ہوئے اور دوران سفر ذہن میں اسی طرح کے خیالات موجزن رہے۔ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ان دنوں قیام انجینئرنگ یونیورسٹی کی آفیسرز کالونی کی سرکاری رہائش گاہ میں تھا۔ مغرب وعشاء کے مابین کا وقت تھا، جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نہایت محبت وشفقت سے پیش آئے، دریافت احوال اور ابتدائی گفتگو کے بعد فرمایا کہ یہ "اثبات الالہام والبیعۃ" حضرت الامام عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے۔ میں اسے زیور طباعت سے آراستہ کرانا چاہتا ہوں۔ حضرت الامام رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کتاب مولانا غلام علی قصوری کی کتاب تحقیق الکلام کے جواب میں لکھی تھی، دونوں بزرگ اپنے اللہ کے پاس جا چکے ہیں اور حالات بھی بدل چکے ہیں لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے مضامین ومندرجات کو سوال وجواب کے بجائے اس طرح مثبت انداز میں مرتب کیا جائے کہ قارئین استفادہ کر سکیں۔ کام کی نوعیت سمجھانے کے بعد کتاب کا نسخہ سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ

کتاب کو احتیاط سے رکھنا کہ میرے پاس بھی اس کا بس یہی ایک نسخہ ہے۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ یہ پہلی باقاعدہ مجلس تھی جس میں مجھے شرکت کی سعادت نصیب ہوئی اور پھر جب آپ سے واپسی کی اجازت چاہی تو الوداع کرنے کے لیے ازراہ محبت وشفقت گھر سے باہر تک تشریف لائے اور میں اس وقت شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ جب بار بار آپ حضرت مولانا عائش محمد صاحب حفظہ اللہ سے مخاطب ہو کر فرمارہے تھے کہ ہمارے معزز مہمان ہیں، سلیقے کی سواری پر لے کر جانا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ کتاب "اثبات الالهام والبيعة بأدلة الكتاب والسنة الملقب بتضحيك الأنام على تحقيق الكلام" حضرت الامام عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف لطیف ہے، جو انہوں نے اپنے دور کے ایک عالم مولانا غلام علی قصوری کی کتاب ''تحقیق الکلام'' کے جواب میں لکھی تھی۔ مولانا قصوری نے اپنی اس کتاب میں الہام اور بیعت کی تردید کی اور تصوف وسلوک کو بدعت قرار دیا تھا۔ حضرت الامام رحمۃ اللہ علیہ نے محسوس فرمایا کہ اس کتاب کی بہت سی باتیں کتاب وسنت کے خلاف اور منہجِ سلف کے منافی ہیں، انہوں نے اس کتاب کے پانچ نسخے خریدے اور مزید احتیاط واطمینان قلب کی خاطر ان میں سے ایک ایک نسخہ اپنے دور کے درج ذیل اساطین علم وفضل کو ارسال فرمادیا تاکہ اس کے بارے میں ان کی رائے بھی معلوم کی جاسکے:

① حضرت شیخ الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

② نواب والا جاہ حضرت سید صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ

③ حضرت مولانا محمد حسین لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

④ حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ

ان چاروں اصحابِ علم وفضل نے بھی حضرت الامام رحمۃ اللہ علیہ سے اتفاق فرمایا اور مذکورہ بالا کتاب کے جواب لکھنے پر زور دیا تو آپ نے حدیث پاک "اَلدِّينُ النَّصِيحَةُ" (دین ہمدردی وخیر خواہی کا نام ہے) کے مصداق محض رضائے الٰہی کے حصول کے لیے مولانا قصوری کی غلطیوں اور مغالطات کو واضح فرمادیا اور اپنے موقف کی بنیاد کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال وآثار اکابرِ امت پر رکھی اور مولانا قصوری کی بات کو ''مغالطہ'' کے عنوان سے ذکر کیا اور اس کے جواب کے لیے ''هداية'' کا عنوان اختیار فرمایا۔

مؤرخ العصر حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں آپ کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اثبات الالهام والبيعة" یہ رسالہ اردو زبان میں ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے الہام و بیعت کے جواز

سے متعلق ہے۔"[1]

حضرت بھٹی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سہو ہوا ہے، اصل کتاب فارسی زبان میں تھی، مولانا محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ رئیس لدھیانہ نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو 1302ھ میں طبع ہوا اور پھر 80 سال بعد جب کہ یہ کتاب مرورِ زمانہ کے باعث نایاب تھی، حضرت مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش پر سیالکوٹ کے جناب فضل الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شعبان المعظم 1382ھ میں اسے اقبال پرنٹنگ پریس سیالکوٹ سے طبع کرایا اور اس پر ناشر کا نام حق سٹیشنری مارٹ لہائی بازار سیالکوٹ لکھا ہوا تھا، حضرت سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے جو نسخہ عطا فرمایا وہ اسی طبع دوم کا نسخہ تھا۔ بحمد اللہ فقیر نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایات کے مطابق اسے ازسرنو مرتب و مدون کر کے پیش کر دیا تھا، آپ نے اسے پسند فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا کہ میری خواہش ہے کہ اس پر مقدمہ میں خود لکھوں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے، اس کتاب کا مقدمہ لکھنے کے لیے آپ سے زیادہ موزوں شخصیت کون ہو سکتی ہے؟ افسوس کہ آپ کی اچانک شہادت کے باعث میرے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ کہیں گم ہو گیا اور اس کا سراغ نہ ملا، جس کی وجہ سے اس کتاب کی طباعت جدید سے متعلق آپ کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ مَاشَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ.

یاد رہے ہمارے جلیل القدر اکابر اور عظیم المرتبت اسلاف اس تصوف کے قائل تھے جو کتاب و سنت کے مطابق اور دین و شریعت کے تصورِ تزکیہ و احسان سے ہم آہنگ تھا۔ تصوف کے جس طریقے، عمل اور کیفیت کو وہ کتاب و سنت کے موافق نہ پاتے اسے دور ہی سے سلام کر دیتے تھے۔ وہ پاکباز لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ دین نے ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ کسی کے ذوق اور وجدان، مشاہدے یا کشف وغیرہ کی اطاعت بجا لانے کا حکم نہیں دیا۔

حضرت مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ تو لاہور کی ایک مشہور و معروف اور قدیمی چینیاں والی مسجد میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے تھے لیکن حضرت ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً 1965ء سے دار العلوم تقویۃ الاسلام، شیش محل روڈ کے ہال میں جمعۃ المبارک کا خطبہ ارشاد فرمانا شروع کیا۔ آپ جس موضوع پر بھی خطبہ ارشاد فرماتے دلائل کے طور پر قرآنی آیات، احادیث مبارکہ اور ائمہ و صلحاء کے اقوال کا حوالہ دیتے اور موقع و محل کی مناسبت سے اردو، عربی، فارسی اور کبھی کبھی پنجابی اشعار بھی پڑھتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد آپ کے خطبہ کی شہرت ہو گئی اور پروفیسروں، ڈاکٹروں، انجینئروں اور دیگر پڑھے لکھے لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے آپ کے خطبہ کے سننے اور آپ کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا کرنے کا اہتمام شروع کر دیا حتیٰ کہ خطبہ شروع ہونے سے پہلے ہی ہال فل ہو جاتا تھا۔ بحمد اللہ مجھے بھی کئی بار یہاں نماز جمعہ ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

---

[1] چمنستان حدیث، (ص 121)

ایک دفعہ نماز سے فراغت کے بعد سلام عرض کرنے کے لیے آگے بڑھا تو آپ ہال کے ساتھ ملحق اپنے دفتر میں لے گئے، غالباً حضرت مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسے اپنے دفتر کے طور پر استعمال فرماتے رہے، اسی میں لائبریری بھی تھی۔ بہرحال اسی مجلس میں کافی دیر تک بلاشرکت غیرے آپ کے ارشادات سے مستفید ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی مجلس میں آپ نے فرمایا کہ کسی صوفی بزرگ کے بارے میں بتائیں؟ میں نے حضرت الاستاذ مولانا محمد حنیف ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیا کہ میں ان کی تصوف کے موضوع پر بعض کتب پڑھ چکا تھا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے: مولانا ندوی علمی اور نظری صوفی ہیں جب کہ مجھے کسی عملی صوفی کی تلاش ہے۔

اسی مجلس میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ آپ لاہور آجائیں، مل کر کام کریں گے اور میرے جتنے بھی اسباب ودسائل ہیں اس کام کے لیے وقف ہوں گے۔ میں نے عرض کیا کام کی نوعیت کیا ہوگی؟ فرمایا: دیکھئے اس وقت الحاد اور زندیقیت کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک یلغار ہے اور ہم اس یلغار کے آگے بند باندھنے کے لیے مل کر ایک سو مقالات لکھیں گے اور انہیں طبع کر کے متعلقہ حلقوں تک پہنچائیں گے، آپ کے مخاطب کی نااہلی اور نالائقی سے قطع نظر آپ کے دل میں احیائے دین کے لیے جو تڑپ تھی اور جو درد تھا میں اس کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ بہرحال آپ کے ذہن میں کام کا ایک یہ منصوبہ بھی تھا جو آپ کی دیگر بہت سی مصروفیات کے باعث پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آخری ملاقات 1975ء میں دارالعلوم تعلیم الاسلام ماموں کانجن کی کانفرنس کے موقع پر ہوئی۔ رات کے اجلاس میں ان کا خطاب تھا، جو بڑا ہی درد انگیز تھا اور جس میں آپ نے بڑی ہی دل سوزی کے ساتھ جماعت کی کمزوریوں کی نشان دہی فرمائی اور اصلاح احوال کی طرف توجہ دلائی۔ اگلے دن نماز عصر کے بعد جب آپ اپنے کمرے کی طرف تشریف لے جارہے تھے تو عشاق کا ایک ہجوم تھا جو اس آفتاب علم وفضل کی ایک جھلک دیکھنے، سلام عرض کرنے اور مصافحہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ بہت سارے اصحاب کو یہ سعادت نصیب بھی ہوگئی۔ ان سعادت مند لوگوں میں برادر عزیز حضرت مولانا عتیق اللہ سلفی کے مرحوم برادر بزرگ اور ہمارے دوست مولانا بارک اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، انہوں نے جب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں سلام عرض کیا تو آپ نے ان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ: آپ تو صوفی معلوم ہوتے ہیں۔ اللہ اللہ! کس قدر مردم شناس تھی آپ کی نگاہ! مرحوم دوست مولانا بارک اللہ بلاشبہ بہت صالح، متدین اور صوفی مزاج تھے، اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ جوانی کے عالم میں راہگرائے ملک جاوداں ہوگئے تھے رحمۃ اللہ علیہ۔ بہرحال حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کشاں کشاں چلتے ہوئے آپ کے کمرے میں پہنچ گئے، برادر عزیز جناب محمد سرور طارق بھی ہمراہ تھے۔ اس مجلس میں آپ کے رات کے خطاب کا بھی ذکر آیا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے ساری کمزوریوں اور بیماریوں کی چن چن کر نشان دہی فرمائی، جن میں جماعت مبتلا ہے اور پھر آپ نے ان کا علاج بھی تجویز فرمایا ہے۔ اسی مجلس میں آپ نے حکم

دیا کہ میں آپ کے اس خطاب کو ٹیپ ریکارڈر سے سن کر مرتب کر کے آپ کی خدمت میں بھیج دوں، بندہ عاجز نے حکم کی تعمیل کی اور اسے مرتب کر کے ارسال کر دیا۔ آپ کا یہ وہی خطاب ہے جو جماعت اہل حدیث سے خطاب کے عنوان سے زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا ہے۔ ستمبر 1975ء میں آپ کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کا پہلا وائس چانسلر مقرر کیا گیا تھا اور اس تقریر کے بعد آپ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، اس لیے میں نے عرض کیا آپ کو چمن سے اٹھا کر صحرا میں بھیج دیا گیا ہے، کیا آپ کو بہاول پور کا ماحول پسند آیا؟ فرمانے لگے: میری زندگی کے کچھ معمولات ہیں، ان میں فرق نہ آئے تو میں جہاں بھی رہوں ٹھیک ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ میرے ذہن میں علمی میدان میں کام کرنے کا ایک خاص خاکہ تھا، دیرینہ آرزو تھی کہ موقع ملے تو اس کے مطابق کام کروں میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کام کرنے کا موقع عطا فرمایا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ شاید اس خاکہ میں رنگ بھرنے کی نیت سے آپ نے بہت ہی قلیل سی مدت میں یونیورسٹی میں بڑی دوررَس اصلاحات فرمائیں۔ یونیورسٹی کی تعمیر و ترقی کے لیے بہت جدو جہد فرمائی اور یونیورسٹی کا تعلیمی معیار بلند کرنے کے لیے کئی فاضل ماہرین تعلیم کو مسندِ تدریس پر فائز کیا، جن میں محترم پروفیسر غلام احمد حریری رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔

بندہ عاجز سے بھی انہوں نے فرمایا کہ جلدی سے ایم اے کریں، آپ کو یونیورسٹی میں کھپا دیں گے۔ اسی مجلس میں ایک صاحب آئے اور انہوں نے آپ کے سامنے وہ رجسٹر رکھ دیا، جس میں مدعوین حضرات علماء کرام اور دیگر مہمانانِ گرامی نے دارالعلوم اور کانفرنس کے حوالے سے اپنے تاثرات لکھے تھے۔ کئی حضرات نے بڑی لمبی تحریریں اور طویل تاثرات لکھے تھے لیکن حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ ان الفاظ پر اکتفا فرمایا: ''للہیت اور مرکزیت پیدا کرو، موحد اور مؤدب بن جاؤ'' یہ لکھ کر آپ نے اپنے دستخط ثبت فرما دیے۔

یہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آخری ملاقات تھی، اگر یہ معلوم ہوتا کہ یہ آخری ملاقات ہے، تو اسے طویل سے طویل تر کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن بات یہ ہے کہ ﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ﴾

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ 1975ء میں آپ کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا تھا۔ اپریل 1976ء میں لندن میں ایک اسلامک فیسٹیول تھا، آپ کو بھی حکومت پاکستان کی طرف سے اس میں مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی، آپ سرکاری وفد کے ہمراہ لندن روانہ ہو گئے لیکن 5،4 اپریل کی درمیانی رات ایک سڑک عبور کرتے ہوئے تیز رفتار کار کی زد میں آکر شدید زخمی ہو گئے جس کی وجہ سے انہیں لندن کے ویسٹ منسٹر ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا، ہسپتال کی طرف سے علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی لیکن 24 اپریل 1976ء کو وہ وقت موعود آ گیا جس میں کمی بیشی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ اس طرح آپ ہزاروں لاکھوں لوگوں کو داغ مفارقت دے کر داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے راہگرائے ملک جاوداں ہو گئے۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ عظیم شخصیت کے مالک تھے، ان کی شخصیت میں جو محبوبیت اور جاذبیت تھی وہ اور کہیں نظر نہیں آئی، ان کے دل میں اللہ کی محبت کا چراغ جل رہا تھا اور ان کا سینہ دینی حمیت وغیرت سے معمور تھا، ان کی غیرت ایمانی سے متعلق ایک واقعہ یاد آ گیا ہے، جی چاہتا ہے کہ قارئین کرام سے بھی اسے شیئر کیا جائے۔

اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان کے سابق چیئرمین محترم جناب ڈاکٹر شیر محمد زمان حفظہ اللہ نہایت بزرگ اور فاضل شخصیت ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں بے پناہ فہم وبصیرت اور فراست سے نوازا ہے۔ اردو، عربی اور انگریزی زبانوں پر کامل عبور رکھتے ہیں، قدرت کی طرف سے انہیں علم وفضل اور امانت ودیانت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں سے بھی نوازا گیا ہے۔ کونسل میں ان کے ساتھ کام کر کے ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ انہیں ایمان وسلامتی اور صحت وعافیت کے ساتھ دراز اور بابرکت عمر عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے حضرت سید ابو بکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بہت گہرے مراسم تھے۔ سید صاحب جب لندن میں اسلامک فیسٹیول میں تشریف لے گئے، اس وقت ڈاکٹر صاحب کا قیام بھی لندن میں تھا، آپ پاکستانی سفارت خانے میں غالباً کلچرل اتاشی تھے۔ فیسٹیول کے مہمانوں کے قیام وطعام کا اگرچہ سرکاری طور پر اہتمام تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے حضرت سید صاحب اور جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کو اپنے دوستوں کی حیثیت سے اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جب سید صاحب کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوا، اس وقت ہم تین چار دوست باتیں کرتے ہوئے پیدل چلے آ رہے تھے، آگے ایک روڈ تھا، جسے ہم نے کراس کرنا تھا، سید صاحب نے حسب معمول تیزی کے ساتھ روڈ کراس کرنے کی کوشش کی، وہ ایک بل کھاتی ہوئی سڑک تھی، ادھر سے ایک تیز رفتار گاڑی آ رہی تھی جو بل کی وجہ سے نظر نہ آئی اور سید صاحب کے ساتھ ٹکرا گئی اور آپ شدید زخمی ہو کر روڈ کے دوسری طرف گر گئے۔ یہ حادثہ اس قدر آناً فاناً ہوا کہ ہمیں پتہ ہی اس وقت چلا جب سید صاحب زخمی ہو کر گر گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بیان فرمایا کہ سید صاحب ہسپتال میں داخل تھے، تو میں روزانہ ان کی عیادت کے لیے جاتا تھا۔ ایک دن جب ان کے پاس گیا تو انہوں نے پوچھا: آج فیسٹیول میں کس کا لیکچر تھا اور انہوں نے کیا بیان کیا؟ میں نے بتایا کہ آج بیرسٹر کمال فاروقی کا لیکچر تھا اور انہوں نے اپنے لیکچر میں ایک عجیب بات یہ بھی کہی کہ دیہاتی ماحول کا ایک شخص جس نے صرف چند لمحات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں گزارے ہوں، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ امام ابو حنیفہ اور غزالی ورازی رحمہم اللہ جیسی شخصیتوں سے بھی بڑھ کر ہو؟ محترم ڈاکٹر صاحب نے بیان فرمایا کہ یہ بات سن کر سید صاحب کی پیشانی پسینے سے شرابور ہو گئی، شائد ان کا سارا جسم ہی پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئے تھے، اس کیفیت میں انہیں شائد یہ بھی احساس نہ رہا کہ میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ان کے ہونٹ ہل رہے ہیں، میں نے اپنے کان ان کے ہونٹوں کے قریب کر دیے تو میں نے ان کے یہ الفاظ سنے:

''اُسے (کمال فاروقی کو) کیا خبر کہ جس کی آنکھیں اُن کی آنکھوں سے چار ہوئیں، اُس نے کیا پالیا!''

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہ الفاظ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب بھی اشکبار ہو گئے اور فرمانے لگے: ''سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ سچے ولی اللہ تھے'' اللہ تعالیٰ اپنے اس سچے ولی کو جنت الفردوس کے بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ درجات سے سرفراز فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اختصار کے ساتھ یہ چند تاثرات ہیں، جس سے ان کی ہمہ گیر شخصیت کے بارے میں لکھنے کا حق ادا نہیں ہوتا۔ آپ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں تفصیل سے لکھنا تو ایک مستقل کتاب کا موضوع ہے، دیکھیے اللہ تعالیٰ یہ کتاب لکھنے کی کسے سعادت عطا فرماتے ہیں![1]

---

[1] ماہنامہ علم و آگہی، فیصل آباد (اکتوبر 2020ء)

میرے مربی، پروفیسر سید ابوبکر غزنوی

تحریر: حافظ عبدالاعلیٰ درانی، بریڈفورڈ۔ برطانیہ

ناظم نشرواشاعت مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ

ایک وقت تھا جب برصغیر پاک وہند میں غزنوی خاندان کا بہت چرچا تھا۔ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور آغا شورش کاشمیری تو ان کے ساتھ عقیدت و محبت میں بڑے سرشار رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں اس خاندان کا بڑی محبت وعقیدت سے تذکرہ کیا ہے۔ مولانا ظفر علی خان تو سید داؤد غزنوی کو ہست غزنوی اور محمود غزنوی کو بود غزنوی کہا کرتے تھے اور مجاہد ختم نبوت حضرت آغا شورش کاشمیری تو مولانا داؤد غزنوی کا نام بھی وضو کر کے لینے کے قائل تھے۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنے ہاتھ سید کے ہاتھوں میں شفاعت کے لیے دے رکھے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ کے سب سے بارعب گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خان بھاٹی چوک سے گزرنے والے تھے، پروٹوکول کی خاطر راستہ بند تھا۔ سید داؤد غزنوی کا تانگہ ناکے پر روکا گیا تو سید صاحب نے گرج کر بیریئر اٹھانے کا حکم دیا، افسروں کو بیریئر ہٹانا پڑا۔ اتنے میں گورنر کی گاڑی آگئی، ملک محمد خان نے سید صاحب کو تانگے میں بیٹھے ہوئے پہچان لیا۔ گاڑی روک کر نیچے اترے اور چلتے ہوئے سید صاحب کے تانگے کے سامنے آگئے، پھر فرطِ عقیدت سے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، سب لوگ یہ منظر دیکھ کر سخت حیران ہوئے۔ پیر سید مہر علی شاہ جیسی روحانی شخصیت سید صاحب کا غایت درجہ احترام واکرام کیا کرتے اور خطوط کے ذریعے تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے، لیکن کبھی سید صاحب کو احتراماً اپنے ہاں آنے کی دعوت نہیں دی۔ مشہور ولی اللہ مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی لاہوری نے ساری زندگی عید کی نماز سید صاحب کی اقتداء میں اقبال پارک میں پڑھی۔ ان کے گرامی قدر بیٹے سید ابوبکر غزنوی انجینئرنگ یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات کے ہیڈ تھے۔ ان کے رعب ودبدبے کا عالم یہ تھا کہ وقت کا وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اور پنجاب کا گورنر کبھی انہیں اپنی رہائش گاہ پر بلانے کی جسارت نہیں کرتا تھا، حالانکہ وائس چانسلر براہِ راست گورنر کے ماتحت ہوتا ہے۔ مجھ سمیت نجانے کتنے لوگوں کی زندگی سید ابوبکر غزنوی کی تربیت وتوجہ سے بدل گئی۔ بقول سید مرحوم بفحوائے خواجہ باقی باللہ ؎

این فقیر از سرتاپا زیر منت والد شما است

(کہ یہ فقیر سر سے پاؤں تک آپ کے والد گرامی کے احسانات تلے دبا ہوا ہے۔)

بنیادی طور پر فیصل آباد میں سید صاحب کی بچپن میں سنی گئی دو تقاریر نے میری کایا پلٹ ڈالی تھی۔ ایک کارخانہ

بازار رحمانیہ مسجد میں اور دوسری ماموں کانجن کانفرنس میں (ریکارڈڈ) تقریر، جن سے متاثر ہو کر میں نے لاہور منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور دو سال بعد جب میں اکیلا سفر کرنے کے قابل ہو گیا تو ان کے دار العلوم تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ میں داخلہ لے لیا۔ یاد رہے کہ لاہور کا بھاٹی چوک بڑا مشہور و معروف ہے، سید عثمان علی ہجویری کی قبر شیش محل روڈ سے متصل گلی میں تھی۔ اب تو اسے بہت بڑا ایریا بنا دیا گیا ہے لیکن اس وقت یہ ایک عام سی گلی میں تھی اور سرکلر روڈ شاہراہ پر ماڈل سکول تھا۔ سید صاحب کے ہفتہ وار درس و ذکر کی محفل میں باقاعدگی سے شریک ہوا کرتا جو انجینئرنگ یونیورسٹی میں ان کی رہائش گاہ پر ہر جمعرات کی شام منعقد ہوا کرتی تھی۔ اپنے دور کے سب سے بڑے خطیب سید ابوبکر غزنوی کے خطبات بڑے غور سے سنتا تھا۔ جو وہ شیش محل روڈ لاہور کے دار العلوم تقویۃ الاسلام کے ہال میں دیا کرتے تھے۔ مجھے سید صاحب کی تقاریر کے الفاظ و محاورے تک یاد تھے۔ اسی طرح ان کی ایک تقریر 1975ء میں بھی ماموں کانجن کانفرنس میں سنی تھی۔ دوران تقریر انہوں نے مجاہد ملت آغا شورش کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی خبر وفات بھی سنائی تھی جو اسی دن فوت ہوئے تھے۔ بڑی تعریف کی تھی انہوں نے آغا صاحب کی، مثلاً آغا شورش اس دور کا مردِ مجاہد تھا جسے نہ اپنے جھکا سکے نہ بیگانوں کو کامیابی مل سکی۔

خاندان غزنوی سے وابستگی کا سبب:

دار العلوم تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ میں کیسے داخلہ ہوا؟ یاد نہیں پڑتا۔ بہر حال اس ادارے سے وابستگی کا ایک سبب غزنوی خاندان سے والہانہ عقیدت تھی۔ مولانا سید ابوبکر غزنوی کی دو تقریریں میرے بچپن کی بہترین یادگار تھیں۔ ایک تو ان کا ماموں کانجن تعلیم الاسلام میں سالانہ کانفرنس کے موقع پر خطاب تھا جس میں سید صاحب بار بار مجدد الف ثانی کا یہ جملہ دہراتے تھے: الهي أنت مقصودي ورضاك مطلوبي۔ بڑی جاندار تقریر تھی جسے ہمارے ماموں میاں محمد عبداللہ مرحوم نے اپنے بڑے سائز کے ٹیپ ریکارڈر پر براہِ راست ٹیپ کیا تھا اور وہ اپنے گھر کے سپیکر پر چلایا کرتے تھے۔ اور سید ابوبکر غزنوی کی دوسری تقریر جامع رحمانیہ مندر گلی فیصل آباد میں بعد عصر رمضان المبارک میں سنی تھی۔ میں ان دنوں دار العلوم عبداللہ پور میں قرآن حفظ کر رہا تھا اور علماء کرام کے ساتھ والہانہ وابستگی تھی۔ مندر گلی رحمانیہ مسجد میں رمضان میں مختلف علماء کے دروس ہوا کرتے تھے۔ اس رمضان میں مولانا عبداللہ ثانی جڑانوالہ، مولانا محمد اسماعیل ذبیح راولپنڈی اور سید ابوبکر غزنوی کی تقاریر سنی تھیں اور عجیب بات ہے کہ ان علماء کی تقاریر ساری زندگی یاد رہیں۔ اس رمضان کے تمام مقررین میں ایک بات مشترک تھی یعنی تقاریر میں قرآن کی بہت زیادہ تلاوت، جس کے میرے ابا جی ہمیشہ قائل و فاعل رہے۔ مولانا اسماعیل ذبیح کی یہ عادت میرے ابا جی رحمۃ اللہ علیہ کو بہت بھاتی تھی کہ وہ اپنی تقریر میں قرآن بہت زیادہ پڑھا کرتے تھے۔ اور یہی عادت تھی مولانا عبداللہ ثانی آف جڑانوالہ کی تھی اور اسی پر عامل تھے، حضرت سید ابوبکر غزنوی بھی۔ سید ابوبکر غزنوی کی تقریر میں کچھ ایسی روحانی کشش تھی کہ جس سے میں بہت متاثر

ہوا اور ان کو دیوانگی کی حد تک چاہنے لگا تھا۔ میں مولانا احمد دین گکھڑوی علیہ الرحمہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مولانا احمد دین اپنے دور کے زبردست مناظر تھے۔ اس دور میں بہت بوڑھے تھے، مجھ سے پوچھا: یہ کون گرج رہا ہے؟ میں نے کہا: سید ابوبکر غزنوی، مولانا داؤد غزنوی کے صاحب زادے۔ مولانا کہنے لگے: میں زیادہ واقف نہیں ہوں، نئی نسل ہے نا۔

سید صاحب کی تقریر سن کر جب میں واپس عبداللہ پور آیا تو ان کی محبت سے سرشار تھا۔ اٹھتے بیٹھتے سید صاحب کا ذکر خیر کرتا رہتا۔ میں نے ان کو ایک خط بھی لکھا تھا۔ ہمارے گھر میں بھی خاندانِ غزنویہ کا تذکرہ عموماً کیا جاتا تھا۔ مدرسہ کے مہتمم مولانا شبیر احمد عثمانی فاضل دیوبند کے کالج میں زیر تعلیم بھتیجوں عطاء الرحمٰن، نسیم اور گڈو وغیرہ کے ساتھ دوستانہ تھا۔ مجھے بھی نوائے وقت میں مضامین یا بیانات بھیجنے کا بڑا شوق تھا جو عموماً چھپ بھی جاتے تھے (کیونکہ میں بچپن ہی سے ''نوائے وقتیا'' ہوں) جس کی وجہ سے میری عزت ان کی نظروں میں بہت زیادہ تھی۔ ان کے کالج میں سیرت پر ایک جلسہ ترتیب دیا گیا۔ خطاب کیلئے ایک بڑے مقرر کو مدعو کیا گیا تھا مگر وہ نہ آسکتے تھے جس کی وجہ سے منتظمین جلسہ بہت پریشان ہوئے۔ لیکن نسیم وغیرہ نے انہیں بتایا کہ فکر نہ کرو ہمارے پاس ایک خطیب موجود ہے اور مجھے تیار رہنے کا کہہ دیا۔ میں نے سوچا کہ کیا تقریر کروں گا (کہ اس سے پہلے تقریر کی عمر ہی نہ تھی)۔ اسی دن نوائے وقت میں سید ابوبکر غزنوی کا مقالہ ''ادب گاہِ رسالت'' کے عنوان سے چھپا تھا، میں نے اسے لفظ بلفظ حفظ کرلیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ تقریر کرنے کیلئے تیار ہوگیا تھا۔ میں کوشش کرتا رہتا تھا کہ سید صاحب کی طرح رعب وجلال اور ان جیسی بھاری بھرکم آواز میں تقریر کیا کروں لیکن میرا گلا ہی ساتھ نہیں دیتا تھا۔ کیونکہ سید صاحب مرحوم جیسا جلالی انداز کسی کا ہو نہیں سکتا تھا۔

پہلے پہلے ہم سوچتے تھے کہ سید صاحب اور امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہی طرح تقریر کرتے ہوں گے لیکن جب یوٹیوب پر امام الہند کی تقریر سنی تو پتہ چلا کہ ہمارے سید صاحب کا نمبر بہرحال پہلا ہی ہے۔ یوں وہ اپنی نوعیت کے منفرد دبنگ مقرر تھے۔ گویا بچپن ہی سے سید صاحب کا مقام ومرتبہ میرے دل ودماغ کو پوری طرح گھیر چکا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے دو سال کے بعد دار العلوم تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ میں داخلہ لینے کے قابل ہوگیا تاکہ سید صاحب کا قرب حاصل ہو سکے گا۔

ملی ہے خوش گماں تعبیر شبنم
کہ خوابوں کا نگر بھی سج گیا ہے

تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ میں:

بڑی سوچ وبچار کے بعد میرا تقویۃ الاسلام میں داخلہ ہوگیا جس کے مہتمم سید ابوبکر غزنوی اور ناظم جامعہ حافظ محمد ایوب صاحب تھے جو سید صاحب کے رفقاء میں سے تھے اور انجینئرنگ یونیورسٹی میں لیکچرار بھی تھے۔ حافظ صاحب

بڑے شریف الطبع آدمی تھے، طلباء کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے۔ سید صاحب کی رہائش یونیورسٹی میں تھی تاہم خطبہ جمعہ کے علاوہ بھی ہفتہ وار لیکچر دیا کرتے تھے۔ دار العلوم میں معمول کی کلاسز کے علاوہ بھی مختلف اہل علم اور عربی کے نامور پروفیسر حضرات درس دینے آیا کرتے تھے۔ سرفہرست تو سید صاحب کا ہفتہ وار لیکچر تھا۔ متکلم اسلام مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم کے خطابات کی تو بات ہی کیا تھی۔ ان جیسے علماء تو صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ معروف دانشور اور شاعر پروفیسر خالد بزمی اور پنجاب یونیورسٹی کے عربی کے مایہ ناز استاذ پروفیسر ظہور احمد اظہر وغیرہ سے ہم سبقاً سبقاً پڑھا کرتے تھے۔ ایک پروفیسر صاحب بلوغ المرام پڑھایا کرتے تھے، ایک بار بلی وغیرہ کے جوٹھے کی بات چل رہی تھی۔ ایک تبتی طالبعلم کو جوٹھے کا معنی سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے پروفیسر صاحب کی اجازت سے اس کا ترجمہ ''پسِ خوردہ'' کر کے بتایا تو استاذ بڑے خوش ہوئے اور کہا کہ یہ لفظ تو میرے ذہن میں بھی نہ تھا۔ پروفیسر ظہور احمد عربی کے بڑے ماہر تھے، انہوں نے اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر کرنل قذافی کی تقریر کا براہِ راست اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔ سالوں بعد ایم اے کے امتحان میں انہوں نے ہم سے تقریری امتحان لیا تھا۔ تب میں نے انہیں بتایا کہ میں آپ کا شاگرد رہا ہوں۔

درس نظامی میں میرے استاد شیخ الحدیث مولانا محمد اسحٰق صاحب تھے، جو روزانہ مانگا منڈی سے تشریف لایا کرتے تھے، بہت ہی صالح استاد تھے۔ ان کے ایک بھانجے حافظ عبدالرحمٰن بھی ہمارے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ مجھے بعض دفعہ مانگا منڈی ان کے ہاں جانے کا موقع ملا۔ شیخ الحدیث کا چار پانچ سال پہلے انتقال ہوا ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ

دوسرے استاد مولانا عبدالرشید تھے جو سنت نگر سے تشریف لایا کرتے تھے وہاں وہ مسجد کے متولی بھی تھے، ان کے دور میں بعض دفعہ مجھے اس مسجد میں جمعہ پڑھانے کا موقع بھی ملا۔ مولانا عبدالرشید سنت نگری بڑے خوش مزاج استاد تھے۔ موقع محل کی مناسبت سے بعض دفعہ اشعار بھی فٹ کیا کرتے تھے، انہوں نے ایک دفعہ کسی ایسی خبر پر یہ شعر سنایا۔

سبھی مجھی سے کہتے ہیں کہ رکھو نیچی نظر اپنی
کوئی ان سے نہیں کہتا کہ نہ نکلو یوں عیاں ہوکر

تیسرے استاد مولانا حافظ عبدالرشید گوہڑوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ بہت من موجی استاد تھے، گوہڑ چک ضلع قصور کے رہنے والے تھے۔ میں نے ان سے کوئی باقاعدہ سبق تو نہیں پڑھا لیکن استاد کی حیثیت سے ان کا ہمیشہ احترام رہا۔ 1985ء میں حج کے موقع پر مکہ مکرمہ حرم شریف میں مجھے حافظ عبدالرشید صاحب نظر آئے۔ میں انہیں گھر لے گیا اور حافظ صاحب کی مہمان نوازی کی سعادت حاصل کی اور ان سے دعائیں سمیٹیں۔ ملتان روڈ کی ایک مسجد میں (جو مولانا عطاء اللہ ثاقب کی رہائش کے پاس تھی) مجھے جمعہ پڑھانے کا موقع ملا تو وہاں خطابت کی پیشکش ہوئی۔ لیکن جب پتہ چلا کہ یہاں تو استاد حافظ عبدالرشید گوہڑوی خطیب ہیں تو میں نے پیشکش رد کر دی۔ حافظ صاحب کو پتہ چلا تو انہوں نے

بہت دعائیں دیں۔

حفظ کے مدرس قاری محمد حسین تھے جنہیں سید ابوبکر غزنوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انجینئرنگ یونیورسٹی میں امام مقرر کیا تھا۔ دار العلوم کا خادم بابا عمر تبتی تھا جو مولانا داؤد غزنوی کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ دار العلوم کے احاطے میں ایک مندر والا حجرہ تھا جو بابا عمر کی رہائش گاہ تھا۔ یعقوب کمیانہ باورچی تھا۔ ایک اور صاحب جو کہیں ملازمت کرتے تھے لیکن رہتے دار العلوم میں ہی تھے بڑے دلچسپ آدمی تھے، رات کو عجیب عجیب کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ لکھوی خاندان کے دو نوجوان بھی تھے جن میں سے ایک کا نام رضاء اللہ تھا۔ رفیق عابد کے نام سے ایک طالبعلم بھی تھے جو بعد میں مدنی صاحب بھی بنے اور آج کل وہ ہمارے ہی علاقے (بریڈفورڈ، برطانیہ) میں رہتے ہیں۔ عبدالستار نیازی نام کے ایک بڑے جی دار طالب علم بھی تھے۔ ایک اور طالب علم عارف' ریحان چیمہ سے تعلق رکھتے تھے خوب پہلوانی جسم رکھتے تھے۔ ایک نحیف وزار بابا جی سامنے گلی سے آیا کرتے تھے۔ بڑے شوق سے اذان دیا کرتے تھے۔ کلاس فیلو مسعود صاحب سے بھی دوستی بڑی گہری تھی۔ جو حافظ سعید صاحب کے بھتیجے یا بھانجے تھے۔ جمعدار اللہ دتا عیسائی ہونے کے باوجود بڑی جاندار اور اونچی آواز میں کلمہ پڑھا کرتا تھا۔ حافظ عبدالصمد بنگالی جو عرصہ دراز سے یہاں آئے تھے۔ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے بعد وہ یہیں کے ہو رہے تھے۔

دار العلوم کے ساتھ مکتبہ سلفیہ تھا جس کے بانی حضرت العلام محشیٔ سنن نسائی مولانا عطاء اللہ حنیف (نور اللہ مرقدہ) تھے۔ (بعد میں ان سے میں نے صحیح مسلم باقاعدہ پڑھی تھی) آپ ہفت روزہ الاعتصام بھی نکالا کرتے تھے۔ ان کے بھانجے مولانا محمد سلیمان انصاری الاعتصام کے منیجر اور مولانا حافظ صلاح الدین یوسف مدیر تھے۔ حافظ صاحب موصوف بڑی علمی وادبی شخصیت تھے۔ انہوں نے مولانا مودودی صاحب کی متنازعہ کتاب خلافت وملوکیت کا بڑا معروضی جواب لکھا تھا۔ بعد میں دار السلام کے تحت انہوں نے بڑا وقیع علمی وتفسیری کام کیا ہے۔ ان کے ذریعے محرم کے موضوع پر میرا زندگی کا پہلا مضمون الاعتصام میں چھپا تھا۔ مولانا عطاء اللہ کے اکلوتے فرزند حافظ احمد شاکر سے سلام ودعا تھی۔ مولانا عطاء اللہ حنیف جلیل القدر عالم، بلند پایہ ادیب، اسلام کے عظیم مفکر، اقدار سلف صالحین کے وارث اور مایہ ناز محدث ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے دھیمے، مشفق، شگفتہ مزاج اور بہت پیار کرنے والے تھے۔ دار العلوم میں نمازوں کی جماعت پہلے حافظ عبدالرحمٰن صاحب کرایا کرتے تھے۔ جبکہ بندہ عاجز دار العلوم کا غیر سرکاری امام تھا۔ اسی لیے مولانا حنیف مجھے ہمیشہ امام کہا کرتے تھے۔

مدرسہ تقویۃ الاسلام کے مہتمم مولانا سید ابوبکر غزنوی بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ خاندانی وجاہت کے ساتھ ساتھ نہایت ہی خوبصورت نین نقش اور قد کاٹھ، ان کے دو بیٹے تھے ایک کا نام جنید تھا۔ دوسرے کا نام یاد نہیں۔ چونکہ سید صاحب کا رجحان تصوف کی طرف تھا اسی لیے انہوں نے اپنے بیٹوں کا نام بھی ایسے ہی رکھا۔ بڑے ذاکر انسان

تھے۔ ان دنوں وہ انجینئرنگ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے، بعد میں وہ بہاول پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی بنے۔ انہوں نے یونیورسٹی میں اسلامی روایات کی خوب پاسداری کی اور طلباء کی ذہنی و تعلیمی تربیت میں سلف صالحین کی راہ متعین تھی۔ آپ کو دورِ جدید کے فتنوں خاص طور پر منکرین حدیث سے بڑی چڑتھی۔ مولانا حنیف ندوی جیسے جلیل القدر عالم نے دار العلوم میں تکمیل بخاری پر درس دیتے ہوئے بڑی خوبصورت نکتہ آفرینیاں فرمائیں، جو آج تک مجھے یاد ہیں۔

یونیورسٹی میں ایک بار رئیس منکرین حدیث غلام پرویز کا لیکچر رکھا گیا اور انہوں نے روایتی انداز میں طلباء میں انکارِ حدیث کا فتنہ جگانے کی کوشش کی۔ سید صاحب نے فوراً اس فتنہ باز کی شرارتوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ اپنے جلالی انداز میں قرآنی آیات کی مسلسل اور بے تکان تلاوت سے ثابت کیا کہ جو شخص حدیثِ رسول اللہ کا منکر ہے دراصل وہ قرآن کی ثقاہت ہی کا منکر ہے۔ آج مسٹر پرویز کا سامنا کسی روایتی مولوی سے نہیں ایک مستند اور خاندانی وجاہت والے انسان سے تھا۔ لہٰذا مسٹر پرویز نے پچھلے دروازے سے دم دبا کر بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی۔

سید صاحب یونیورسٹی ہی میں رہائش پذیر تھے۔ 22 سو روپے تنخواہ مشہور تھی جو اس زمانے میں بہت بڑی تنخواہ تھی۔ چونکہ خود بھی بہت تعلیم یافتہ اور خاندانی آدمی تھے، اس لیے ان کا حلقہ احباب بھی اسی قسم کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ جن لوگوں سے میں نہ صرف واقف ہوں بلکہ بہت زیادہ ان کے قریب بھی رہا ہوں ان میں ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ، چوہدری عبدالحفیظ، ڈاکٹر راشد رندھاوا (رحمہم اللہ) بھی تھے۔ ڈاکٹر ملک مرتضیٰ بعد میں مدینہ یونیورسٹی سعودی عرب میں رئیس دارالترجمہ بھی رہے۔ مدینہ یونیورسٹی میں دورانِ تعلیم ان سے ملاقات رہی بلکہ بہت قریبی تعلق بھی۔ غالباً 2003ء میں کسی بدبخت نے انہیں شہید کر دیا۔ مجھے ان کی شہادت کی خبر نے بڑا غمزدہ کر دیا اور مدینے میں ان کے گھر آنا جانا اور محبتوں کی کئی کہانیاں یاد آنے لگ گئیں۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ چوہدری عبدالحفیظ صاحب برطانیہ بھی تشریف لائے تھے ہماری دعوت پر۔ بڑے ہی متقی انسان تھے۔ حق تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔ اور ڈاکٹر راشد رندھاوا کی تو بات ہی کیا تھی۔ شادمان میں ان کا ذاتی کلینک تھا کارڈیالوجی کا۔ کلینک بہت مہنگا تھا لیکن علماء وطلباء کا علاج ڈاکٹر صاحب فری میں کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم اور حدیث رسول کی اشاعت کے بڑے شوقین تھے انہوں نے اپنے خرچ پر اس نوعیت کی کتابیں چھپوا کر رکھی ہوئی تھیں جو مریضوں اور آنے جانے والوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت حافظ عبداللہ شیخوپوری نے مجھے فون کیا کہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا ٹائم لے لو، میں نے اپنے بیٹے کو چیک کروانا ہے اور میں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے کہا: تم جو بھی ٹائم پسند کر لو میں حاضر ہوں اور پھر میں حافظ صاحب اور ان کے بڑے بیٹے حافظ عبدالباسط شیخوپوری کو ساتھ لے کر گیا تھا اور بڑا لمبا چیک اپ ہوا۔ اب یہی حافظ عبدالباسط بہت صحتمند نظر آتا ہے۔

خاندانِ غزنوی کا ذکر وفکر میں استغراق، انہماک اور نماز میں خشوع وخضوع بڑا مشہور رہا ہے۔ پچھلی صدی میں اس

خاندان نے سید عبداللہ غزنوی کی سربراہی میں افغانستان سے ہندوستان ہجرت کی تھی کیونکہ ان کے وطن میں ان پر حق پرستی اور توحید وسنت پر کاربند ہونے کے باعث جینا حرام کر رکھا تھا۔ سید عبداللہ غزنوی نے خود، اور ان کے بیٹے نے درسِ حدیث شیخ الکل حضرت سید نذیر حسین دہلوی سے لیا تھا۔ فراغت کے وقت سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ نے کہا: انہوں نے حدیث مجھ سے پڑھی لیکن نماز میں نے ان سے سیکھی ہے۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ 1857ء زمانہ جنگ کے دوران جامع مسجد دلی میں سید عبداللہ غزنوی درسِ حدیث دیا کرتے تھے۔ انگریز نے مسجد پر دھاوا بول دیا۔ اس دن مسجد میں چند طلباء کے علاوہ کوئی عام نمازی نہ داخل ہو سکا تھا۔ لیکن سید عبداللہ غزنوی نے اذان بھی کہی اور جماعت بھی کرائی۔ دوران درس حدیث انہیں جب اپنے جوان بیٹے کی خبر شہادت ملی، چند لمحے توقف کیا اور پھر فرمایا: جو قدرت کا کام ہے وہ کر رہی ہے آؤ ہم اپنا کام کریں (بیا کار خود بکنیم) اور پھر درس حدیث شروع کر دیا۔ اندرون لاہور کوچہ چابک سواراں میں چینیانوالی مسجد جو پنجاب میں مجاہدین کا گڑھ رہا ہے۔ اس کے امام سید عبدالواحد غزنوی اور مولانا داؤد غزنوی کے والد مولانا عبدالجبار غزنوی کے متعلق بھی بہت سی روایات مشہور ہوئیں۔ ہمارے ممدوح سید ابوبکر غزنوی میں بھی یہ خاندانی روایت بدرجہ اتم موجود تھی۔ نماز اس قدر خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھتے کہ نماز پڑھتے ہوئے ان کا جسم خمیرے آٹے کی طرح نرم ہو جاتا۔

کیا خبر تھی مجھے رکوع کی، کیا پتہ تھا مجھے سجود کا
ترے نقشِ پا کی تلاش تھی جو میں جھک رہا تھا
سجدہ عشق ہو تو عبادت میں مزہ آتا ہے
خالی سجدوں میں تو دنیا ہی بسا کرتی ہے

سید ابوبکر غزنوی کو ذکر وفکر سے بڑی دلچسپی تھی۔ تلاوت قرآن کے بڑے شیدائی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو خطیب اپنی تقریر میں جابجا تلاوت قرآن نہیں کرتا وہ منحوس خطیب ہے۔ یہ نہیں کہتے تھے کہ اس کی تقریر منحوس ہے کہا کرتے تھے کہ وہ مقرر ہی منحوس ہے۔ آج کے خطباء قصے، جھوٹی سچی کہانیاں اور شعروشاعری سے ڈنگ ٹپاتے ہیں قرآن کریم پڑھتے ہی نہیں شاید اس سے تعلق ہی نہیں ہے۔ علامہ اقبال کے بقول ؎

خوار از مہجوری قرآن شدی
شکوہ سنج گردش دوران شدی
در بغل داری کتاب زندہ ای
چوں شبنم برزمین افتندہ ای

(قرآن کریم سے رابطہ ختم کر کے دنیا میں ذلیل ہوا پھرتا ہے اور سامان عزت ڈھونڈتا ہے جبکہ بغل میں زندہ

کتاب موجود ہے لیکن ایسے ہی جیسے شبنم زمین پر گرتی اور مٹی میں مل جاتی ہے۔)

سید صاحب فرمایا کرتے تھے: موضوع ومناسبت کے بغیر بھی قرآنی آیات کی تلاوت کیا کرو۔ اس سے برکت ہوتی ہے۔ سید ابوبکر غزنوی فضائل ذکر کا تذکرہ عموماً کرتے رہتے تھے اور وہ کہا کرتے تھے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں کسی شیخ الحدیث سے صحیح مسلم کی اس حدیث کا مفہوم ومطلب پوچھوں جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے: لا يقعد قوم يذكرون الله الا حفتهم الملائكة ونزلت عليهم السكينة.

ذکر وفکر کی ایسی ہی ایک ہفتہ وار مجلس ان کے گھر میں ہر جمعرات کی شام منعقد ہوا کرتی تھی اور میں اس میں باالالتزام شریک ہوا کرتا تھا۔ سید صاحب کی اس مجلس نے بڑے بڑے گمراہ پروفیسروں اور ڈاکٹروں کو نمازی اور ذاکر وعابد بنا ڈالا تھا۔ سید صاحب کا طریق کار یہ تھا کہ وہ مغرب سے کچھ ہی دیر پہلے ذکر اذکار کرتے پھر چند منٹ درس دیتے جس میں ذکر کے فضائل پر بڑی جامع گفتگو ہوتی۔ نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد ہلکی پھلکی ریفریشمنٹ ہوتی۔ میں نماز مغرب کے بعد دیر تک مجلس میں بیٹھا رہتا۔ پھر ان کے کمرے میں بھی جا پہنچتا تھا۔ سید صاحب نے میری جستجو اور دلچسپی دیکھی تو میری طرف بھی توجہ فرمائی۔ پھر خاصی گرمجوشی ہوگئی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ میں کسی اور ساتھی کو بھی سید صاحب کی مجلس میں لے گیا۔ جس نے آدابِ محفل کا لحاظ نہ کیا۔ نماز کے بعد سید صاحب نے میری طرف دیکھا۔ علیحدگی میں لے گئے اور بڑے غصے سے تھپڑ لہرایا، میں نے سوچا اب شامت آگئی۔ کہا: یہ کس کو لے آئے ہو؟ جسے آمین کہنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔ میں چپ رہا اور انتظار میں تھا کہ سید صاحب کا بھاری بھرکم ہاتھ لہرائے گا......اور......لیکن انہوں نے ہاتھ نیچے کرلیا اور سخت وارننگ دی۔ جب ان کا غصہ کچھ کم ہوا تو عرض کیا: اس نے سنت کی ادائیگی میں ذرا تیزی سے کام لیا ہے۔ بولے: نہیں، انہیں کسی نے سکھایا ہی نہیں۔ عرض کیا! یہاں آدمی سیکھنے ہی تو آتا ہے۔ کہا: ایسی باتیں تم سکھا دیا کرو۔ بھائی یہاں بڑے بڑے پڑھے لکھے مگر راہِ راست سے بھٹکے ہوئے لوگوں کا تزکیہ کررہا ہوں۔ سید صاحب نے محسوس کیا کہ شاید میرے اس جلال کا غلط مطلب لیا جائے۔ انہوں نے مشفقانہ انداز میں میری طرف بند ہاتھ بڑھایا کہ یہ لو میں نے اپنا ہاتھ کھولا تو انہوں نے مونگ پھلی کے چند دانے میری ہتھیلی پہ رکھ دیے اور بڑی رازداری سے کہا: کسی کو بتانا نہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔ مونگ پھلی کے دانوں کی تو کوئی بات نہ تھی۔ البتہ ان کا جملہ اور اس کی بے ساختہ اور رازدارانہ ادائیگی پر بڑا پیار آیا۔ پھر جب جنرل ضیاء الحق نے امریکی امداد کو ''مونگ پھلی کے چند دانے'' کہہ کر ٹھکرا دیا تو میرے ذہن میں فوراً بات آگئی کہ جنرل صاحب کے ساتھ بھی کسی سید ابوبکر نے ایسا ہی کیا ہوگا۔ جیسا سید صاحب نے میرے ساتھ کیا تھا۔

سید صاحب کے نام بہت سے رسائل وجرائد اعزازی طور پر آیا کرتے تھے۔ مگر سید صاحب کو فرصت ہی نہیں ہوتی تھی انہیں دیکھنے کی۔ سیڑھیوں میں لگے ہوئے لیٹر بکس کی چابی پتہ نہیں کس کے پاس تھی البتہ ہر ہفتے لیٹر بکس بھر جاتا بلکہ

چھلکنے لگ جاتا تھا اور ہم طلباء ہاتھ ڈال کر رسالے نکال کر پڑھا کرتے تھے۔

میں شاہ صاحب کے ابوالکلامی اندازِ خطابت سے بہت متاثر تھا۔ بلکہ وہ اپنی نوعیت کے پہلے اور آخری خطیب تھے۔ ان جیسی گھن گرج، بھاری بھر کم اور رعب دار آواز، الفاظ کا چناؤ، صوتی ہم آہنگی، منظم گفتگو، جامع مگر دل میں کھب جانے والی خطابت زمانے میں انوکھی تھی۔ ان کی آواز اور گھن گرج تو مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی زیادہ بارعب لگی۔ ہمارے سید صاحب شیر دل انسان تھے۔ نفاست میں تاناشاہ تھے وہ کسی کی بے تحاشا بڑھی ہوئی ڈاڑھی، بے ہنگم مونچھوں، بے ڈھنگی چال، بے موقع گفتگو سے سخت متنفر تھے بلکہ یہ اور اس قسم کی باتیں ان کی طبع نزاکت کی برداشت سے باہر تھیں۔ رکھ رکھاؤ میں ان کا سا انداز میں نے زندگی بھر کسی کا نہ دیکھا۔

نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارند

(بادشاہوں کے مزاج نازک ہوا کرتے ہیں۔)

البتہ صوفی عائش محمد صاحب کو کافی خصلتوں کے باوجود سید صاحب نہ صرف گوارا کرتے تھے بلکہ ان سے محبت بھی کرتے تھے۔

سید صاحب کی فیصل آباد آمد:

ایک بار سید ابوبکر غزنوی نے جمعرات کے ذکری اجتماع کے بعد مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا اور پوچھا: تم فیصل آباد کب جا رہے ہو۔ عرض کیا: اگلے ہفتے۔ کہا: مجھ سے مل کر جانا اور پھر انہوں نے مجھے جھال خانوآنہ میں مقیم شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ کے نام ایک خط دیا اور تاکید کی کہ یہ صرف انہی کو پہچانا۔ فیصل آباد آکر میں شیخ الحدیث صاحب سے ملا اور سید صاحب کا خط پیش کیا تو انہوں نے مجھے بڑی قدر کے ساتھ پاس بٹھایا حال احوال پوچھا۔ میں نے ان سے خط کا مضمون دریافت کیا۔ تو انہوں نے بتایا کہ اس بار رمضان میں سید صاحب فیصل آباد تشریف لا رہے ہیں اور ان کا قیام یہاں ہماری مسجد میں ہوگا۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ پھر رمضان میں سید صاحب فیصل آباد تشریف لائے اور ایک ہفتہ مولانا کی مسجد میں قیام فرمایا۔ میں بھی خاص طور پر سید صاحب سے ملنے گیا۔ شاہ صاحب یہاں سال میں صرف ایک ہفتہ کیلئے ڈیرہ ڈالتے تھے۔ خود ہی بڑے بڑے سرمایہ والے لوگ ایسے کھنچے چلے آتے جیسے مقناطیس کے گرد لوہا۔ ایک ہفتے میں سال بھر کا دار العلوم کا بجٹ پورا ہو جاتا تھا۔ سید صاحب بڑے خوددار اور جلالی تھے۔ وہ کبھی کسی کے ہاں نہیں جایا کرتے تھے۔ حالانکہ فیصل آباد کے بڑے بڑے سرمایہ کار لوگ ان کے خاندانی مرید تھے۔ فیروز وٹواں ضلع شیخوپورہ اور قصور کا پورا علاقہ ان کے دادا اور والد کا مرید تھا۔ لیکن آپ ان میں سے کسی کے ہاں بھی نہیں ٹھہرتے تھے۔ اگر کہیں جاتے تو بڑے ٹھاٹھ باٹھ اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ وہ فرمایا کرتے تھے:

بئس الفقیر علی باب الامیر (کسی دنیا دار کی چوکھٹ پہ جانے والا فقیر بڑا بد بخت ہوتا ہے)۔

حافظ ایوب صاحب کی شادی قصور میں ہوئی تو ان کے گاؤں کے باہر نہر تک ہی سید صاحب گئے تھے اور اس بات کی بھی بڑی شہرت ہوئی کہ سید بادشاہ نے حافظ ایوب کی شادی میں شرکت فرمائی ہے۔ مولانا داؤد غزنوی (رحمہ اللہ) کی سیاست کی وجہ سے قصور کا سارا علاقہ انہی کا حلقہ انتخاب تھا جہاں سے مولانا معین الدین لکھوی (رحمہ اللہ) ہمیشہ انتخاب جیت کر قومی اسمبلی پہنچتے رہے۔ سنا ہے! اوقاف کے ایک افسر نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر سید صاحب صرف ایک بار میرے دفتر تشریف لے آئیں تو میں ان کے دار العلوم کیلئے ایک بھاری وظیفہ مقرر کرا دوں گا۔ لیکن سید صاحب نہیں گئے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ جھال والے:

مولانا محمد عبداللہ موصوف فیصل آباد میں اعاظم رجال میں سے تھے۔ ان کی صحبت میں بیٹھنا بہت بھلا لگتا تھا۔ مزاج نہایت سادہ، مہمان نواز، بات کرتے تو دل کھینچ لیتے، دیانت و شرافت ان کی سرشت تھی۔ ساری زندگی حدیثِ رسول کے خدمت گزار رہے۔ حدیث کی ایک مستند کتاب مسند ابویعلیٰ کی تخریج کی۔ ان کے سب سے قریبی ساتھی مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ تعالیٰ تھے۔ جسے وہ چھپوانے کا منصوبہ بنا رہے تھے کہ یہی کتاب انہی کی تخریج کے ساتھ بیروت سے چھپ کر کتب خانوں میں پہنچ بھی گئی۔ شیخ الحدیث اور مولانا ارشاد الحق اثری سوچتے ہی رہ گئے۔ جب ان دونوں بزرگوں کا نام آتا ہے تو ایک اور معتبر ہستی مولانا محمد اسحاق چیمہ (رحمہ اللہ) کا نام نامی فوراً آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ منٹگمری بازار جامعہ اثریہ کے سرپرست تھے۔ مولانا کی شخصیت بڑی بارعب تھی، وہ جامعہ سلفیہ فیصل آباد اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کا ٹمبر مارکیٹ میں بڑا اچھا کاروبار تھا۔ میں نے ان کی معاملہ فہمی، ذہانت و فطانت اور طاقت و طلاقت لسانی کا کئی دفعہ مشاہدہ کیا۔ جب میرا کلاس فیلو محمد جمیل بن حافظ عبدالرحمٰن کمیر پوری فوت ہوا تو جمیل کے دادا میاں اللہ بخش کمیر پوری غم سے بہت نڈھال تھے۔ مولانا اسحٰق چیمہ نے کچھ ایسے بے باکانہ طریقے سے ان سے بات کی کہ بابا جی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ مجھے ایک دفعہ فیصل آباد کے ایک تھانے سے کام پڑا تو مولانا چیمہ نے اس وقت کے معتبر سیاسی لیڈر سردار سالک صاحب کو فون کیا۔ سالک صاحب نے تھانے دار کو میرے سامنے بٹھا دیا۔ مولانا اسحٰق کی رہائش پیپلز کالونی میں تھی اور انہوں نے وہیں مسجد بنائی ہوئی تھی۔ مولانا اثری نے مولانا عبداللہ جھال والے کے بارے عربوں کا ایک لطیفہ بھی سنایا کہ ان کیلئے جھال (پانی والی جھال) اور جہال (جاہلوں کی جمع) میں فرق بتانے میں بڑی دقت اٹھانا پڑتی کہ مولانا عبداللہ ''پانی والی جھال'' سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ خود عربوں کیلئے بھی حیرت والی بات تھی کہ اتنا بڑا استاذ حدیث اور نام کے ساتھ...... جہال والا!!!

خانوادہ سید عبداللہ غزنوی کیلئے پہاڑ کا پھٹنا:

سید ابوبکر غزنوی صاحب کا مولانا عبداللہ جھال والے کے ساتھ بڑا قریبی تعلق تھا۔ کیونکہ آپ کا تعلق بھی امرتسر سے تھا اور وہ سید صاحب کے والد سید داؤد غزنوی کے رفقائے خاص میں سے تھے۔ خطبہ جمعہ میں ایک بار مولانا نے

ایک عجیب واقعہ سنایا کہ جب خاندانِ غزنوی کو افغانستان سے جلاوطن کیا گیا تو راستے میں (غالباً) دریائے ہرات کے کنارے انہوں نے دیکھا کہ سرکاری فوج انہیں ڈھونڈتی چلی آ رہی ہے۔ صورتحال بڑی عجیب ہوگئی۔ سامنے دریا، پیچھے سرکاری فوج، دائیں بائیں پہاڑ۔ سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ نے جب اپنے خاندان کو دشمنوں میں گھرے دیکھا تو پہاڑ کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے سورہ المومنون کی آخری آیات تلاوت کیں: ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴾ پہاڑ پھٹ گیا اور سارے لوگ اس میں داخل ہوگئے، پہاڑ مل گیا۔ تھوڑی دیر بعد فوج آئی اور علاقے کو خالی پا کر واپس چلی گئی۔ پہاڑ پھر پھٹا اور یہ سارا لشکر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوگیا۔ یہ واقعہ میں نے خود مولانا عبداللہ شیخ الحدیث سے سنا۔ جس کی صحت میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ منبر و مسجد اہل حدیث کی، بیان کرنے والے کوئی عام عالم نہیں شیخ الحدیث ہیں۔ اس کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔

مولانا سید ابوبکر غزنوی انہی سید عبداللہ غزنوی کے پڑپوتے اور سید داؤد غزنوی کے فرزند ارجمند تھے۔ داؤدی حسن ان کا خاندانی ورثہ تھا، مولانا داؤد غزنوی کو ہم نے نہیں دیکھا لیکن ان کے دونوں بیٹوں کو ضرور دیکھا ہے ان میں سید ابوبکر تو بہت پڑھے لکھے آدمی تھے اور دوسرے بیٹے عمر فاروق غزنوی تھے۔

سید عمر فاروق غزنوی رحمۃ اللہ علیہ:

جن دنوں میں دارالعلوم غزنویہ شیش محل روڈ لاہور میں زیر تعلیم تھا کبھی کبھی نماز فجر کے بعد جائے نماز پر ایک خوبصورت آدمی کو بیٹھے ذکر کرتے ہوئے دیکھا تو جانا کہ یہ سید صاحب کے بھائی ہی ہوسکتے ہیں۔ انہی جیسا نقش و نگار، رنگ تھوڑا سا مختلف، تصدیق چاہی تو پتہ چلا کہ یہی عمر فاروق ہیں۔ عقیدت سے سلام کیا، محبت سے جواب ملا۔ تھوڑی دیر مزید بیٹھ کر تسکین قلب حاصل کیا کیونکہ میں جب بھی ان کے ساتھ کچھ دیر کیلئے بیٹھتا تو دل کی حالت بدل جایا کرتی تھی۔ پھر کئی دن بعد دوبارہ نماز فجر کے بعد بیٹھے دیکھا پھر پہلی طرح ہی کی ملاقات رہی۔ عمر فاروق صاحب کے بڑے بیٹے عثمان میرے بڑے اچھے دوست بن گئے تھے۔ ان سے راہ رسم بڑھی تو پتہ چلا کہ عمر فاروق زمینداری کرتے ہیں اور شیخوپورہ ریلوے لائن پر ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن آتا ہے شاکر آباد کے نام سے۔ ایک دن میرا اور عثمان کا اکٹھے وہاں جانے کا پروگرام بنا، ہم شاہدرہ ریلوے اسٹیشن سے سوار ہوکر شاکر آباد اترے اور وہاں سے پیدل ان کی ڈیرے پر گئے۔ شام ڈھلے مکئی کے دانے بھنائے گئے اور گڑ ڈال کر کھایا گیا۔ رات کو گنے کے رس کی کھیر تیار کی گئی۔ ایک بھینس کی ''بُوہلی'' بھی نوش کی گئی۔ رات کو دیر تک کھیلتے رہے۔ پھر خدا کا کرنا ہوا کہ سید عمر فاروق تشریف لے آئے۔ میری چارپائی سید صاحب کے ساتھ بچھی اور بہت دیر تک ان سے باتیں ہوئیں۔ وہ سید احمد کی تحریک کے ہراول دستے میں رہے تھے۔ پتہ نہیں اس سمیت کتنے موضوعات پر معلوماتی گفتگو ہوتی رہی۔ اتنی بات ضرور یاد ہے کہ میری وجہ سے شاہ صاحب خلافِ عادت بہت رات تک جاگتے رہے لیکن انہوں نے اکتاہٹ ظاہر کی اور نہ ہی مجھے سو جانے کی ہدایت

کی۔ میں بھی جانتا تھا کہ اتنے تاریخی انسان کا قرب زندگی میں کہاں مل سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس موقع کو خوب خوب غنیمت جانا۔ رات گزری صبح کے معمولات اپنے اپنے۔ قیام اللیل یعنی نماز تہجد کی پابندی تمام صالحین کی عادت بلکہ فطرت رہی ہے۔ ہمیں یہ عادت والد صاحب سے وراثتاً ملی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ جلد سو جاتے اور پچھلی رات کو اٹھ کر تہجد ادا کرنے کے پابند تھے، ہم لوگ رات کو سوتے دیر سے ہیں بلکہ بہت دیر سے لیکن پھر بھی صبح جلد اٹھ جاتے ہیں۔ رات کے قیام کا سچ پوچھو تو عجیب نشہ ہے۔ ﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلًا﴾

رات کے پچھلے پہروں میں اک دولت بٹتی ہوت ہے

جو سووت ہے وہ کھوت ہے جو جاگت ہے وہ پاوت ہے

اسی لیے میرے والد عموماً اپنے خطبات میں کہا کرتے تھے کہ قیام اللیل عام لوگوں کیلئے تو نفلی عبادت ہے لیکن طلبائے دین اور علماء کرام کیلئے بمنزلہ فرض ہے۔ أوتروا یا أھل قرآن فرمانِ نبی ہے جو عالم و طالب اس کا عادی نہیں وہ معرفت و سلوک کی منزلیں طے کر ہی نہیں سکتا۔ غزنویوں کے ساتھ عقیدت میں اس قسم کی عادات کا پختہ ہو جانا فطری بات ہے۔

بہرحال اس سفر میں عثمان نے میری عزت افزائی اور مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ دن نکلے میں وہاں سے پیدل چلا اور تین چار میل کھیتوں سے ہوتا ہوا، کھالے، کھیت کھلیان پھلانگتا ہوا شیخوپورہ روڈ پر پہنچا۔ اس بس اسٹاپ کا نام ہے منڈیالی۔ وہاں سے بس پہ بیٹھ کر لاہور چلا آیا۔ یہ دن زندگی کے خوبصورت ترین دنوں میں سے ہے۔ اب تک یہ دن یاد بھی ہے اور لذت بھی دے دیتا ہے۔ سید صاحب سے اتنا قرب شاید کسی طالب علم کے حصے میں نہیں آیا ہوگا کیونکہ میری طبیعت ہی ہر دم جستجو والی تھی۔ اس کے بعد ہزاروں دفعہ بس پر منڈیالی سے گزرا ہوں، اپنی گاڑی پر بھی گیا۔ سکوٹر اور موٹر سائیکل پر بھی۔ لاہور سے شیخوپورہ، فیصل آباد، مموں والی اور تاندلیانوالہ جاتے ہوئے سینکڑوں دفعہ شاکر آباد کے چھوٹے سے اسٹیشن پر نگاہ پڑی۔ کئی بار جی چاہا وقت کا پہیہ پیچھے گھوم جائے تو میں اسی اسٹیشن پر سے اتروں اور عثمان بھائی کو ساتھ لوں اور شاہ جی کے ڈیرے پر پہنچوں سارا دن اسی ڈھب پر گزرے جیسا اس دن گزرا تھا۔ پھر رات کو سید عمر فاروق غزنوی کے ساتھ چارپائی ملا کر اسی طرح باتیں کروں اور پھر اگلے دن پیدل چل کر منڈیالی پہنچوں۔ پر یہ کیسے ممکن ہے؟ عثمان بھائی تو شاید اب مجھے پہچان بھی نہ پائیں (اور اب تو وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں) اور سید عمر فاروق صاحب...... سید صاحب کو کہاں سے تلاش کروں انہیں تو اللہ کے مہمان ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں اور پتہ نہیں ان کی زمینداری کا کیا بنا......؟ کیا یہ کم ہے کہ وہی اسٹیشن اور وہی بس سٹاپ اب بھی موجود ہے، جہاں سے گزرتے ہوئے یاد آتا ہے کہ یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے۔ سید عمر فاروق صاحب 22 جون 1978ء کو لاہور میں فوت ہوئے۔ رحمہ اللہ وادخلہ فسیح الجنة۔

اسی خانوادے میں سید داؤد غزنوی کا ایک اور بیٹا یحییٰ غزنوی بھی تھے۔ ایک اور چھوٹا بیٹا تھا جس کا نام تھا غزالی...... جو میرا بہت گہرا دوست اور ہم عمر تھا۔ ایک شام چوک میں پان سگرٹوں کی دوکان پر بیٹھا ہوا ایک شخص کسی فلمی شخص کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ میں اور سید غزالی نے یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی۔ غزالی کے ساتھ دوستانہ پکا ہو چکا تھا۔ اسی حادثے کو بنیاد بنا کر ہم گھنٹوں دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کرتے رہتے۔ اسی وجہ سے ہماری نمازوں میں پابندی اور دعاؤں میں عاجزی و گریہ زاری بڑھ گئی تھی۔

سید داؤد غزنوی کا تذکرہ انسائیکلو پیڈیا میں:

مکتبہ شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا کی مجلس ادارت میں شامل ہوا تو مجھے اس میں علمائے سلف اہل توحید وسنت کے حالات نہ ملے۔ سو ارادہ کیا کہ یہ کام تو مجھے کرنا ہی ہوگا۔ ان دنوں ''ع اور غ'' کی پٹی چل رہی تھی۔ میں نے اس پٹی میں ''عبداللہ'' کے ضمن میں سید عبداللہ غزنوی، صوفی عبداللہ ماموں کانجن والے، شیخ الحدیث حضرت العلام مولانا عبداللہ روپڑی وغیرہ کے حالات شامل کر دیے۔ اور ''غ'' کی پٹی میں غزنوی۔ مولانا داؤد غزنوی کے حالات بھی گھسیڑ دیے کہ کسی طریقے سے ان اعاظم کا ذکر خیر تاریخ کے صفحات میں داخل ہو جائے۔ چیف ایڈیٹر سید قاسم محمود نے میرے مقالے پڑھے اور ہنس دیے۔ لیکن حالات ایسے انداز میں مرتب کیے گئے کہ سید قاسم محمود بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بولے: ایک کام کرو کہیں سے سید داؤد غزنوی صاحب کی تصویر بھی مہیا کرو۔ یہ کام بڑا مشکل نظر آیا کیونکہ مرحوم کو فوت ہوئے کافی زمانہ گزر چکا تھا۔ برسوں پرانے اخبارات کہاں سے لاؤں۔ معاً میرے ذہن میں خیال آیا کہ دارالعلوم غزنویہ جاتا ہوں اور ان کے خانوادے کے ساتھ جو پرانے تعلقات ہیں انہیں کام میں لاتا ہوں لیکن کسی سے ملاقات نہ ہو سکی، نہ غزالی سے بات ہو سکی۔ البتہ یحییٰ صاحب سے فون پر بات ہوگئی انہوں نے کہا: گھر جا کر اماں جان (اہلیہ سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ) سے پوچھ لو۔ میں نے تقویۃ الاسلام کی سیڑھیاں چڑھ کر دروازے پہ دستک دی تو اماں جان نے دروازہ کھولا میں نے تعارف کرایا۔ انہوں نے اس شرط پر تصویر مہیا کی کہ ایک دو دن میں بحفاظت انہیں لوٹا دی جائے گی۔ میں نے اے فور سائز کی یہ خوبصورت تصویر اردو بازار کی نکڑ پر ایک فوٹو گرافر کے پاس اس کا نیگیٹو بنوانے کیلئے دیدی۔ وہ اتنی خوبصورت تصویر دیکھ کر بڑا متاثر ہوا۔ جب فوٹو گرافر کو تعارف کرایا تو اس نے فرطِ مسرت سے ایک تصویر اپنے سٹوڈیو میں لگوانے کی اجازت بھی مانگی۔ میں نے بحفاظت وہ تصویر اماں جان کو واپس کر دی۔ وہ آج بھی شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں چھپی ہوئی ہے۔ کافی عرصہ پہلے مولانا اسحٰق بھٹی کا قومی ڈائجسٹ لاہور میں مولانا غزنوی کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اور جو دلدوز تفصیلات مولانا کی وفات کے بعد ان کے اہل خانہ کی بیان کی گئی تھیں، مثلاً ان کا راوی روڈ پر نیشنل ہوزری جاب پر جانا وغیرہ۔ وہ جب یاد آتی ہیں تو ''غیرت قومی سے اکبر زمین میں گڑ جاتا ہے'' جماعت سے ایسا شکوہ سبھی کو رہا ہے۔ معلوم نہیں قصور کن کا ہے۔ اکابر کا بڑا پن، ان کی اولادوں کا جماعت سے کٹ جانا یا

جماعت کی بے حسی؟ حقیقت تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کئی بار ارادہ بنا کہ میں ان کے گھر جاؤں، ان سے حال احوال پوچھوں لیکن کس حیثیت سے؟ مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ چل سکا کہ سید ابوبکر غزنوی کی وفات کے بعد ان کی فیملی کہاں رہائش پذیر رہی۔ اور پھر عرصہ دراز کے بعد جنید بھائی کو بعض دفعہ TV پر دیکھا اور ان کی گھن گرج سید صاحب سے ملتی جلتی دیکھ کر آنکھیں چھلک پڑیں۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کے فرزند ابتسام الٰہی میں علامہ صاحب جیسی گھن گرج سن کر وہی جذبات انگیخت ہو جاتے ہیں۔ واقعی اولاد میں والدین کا عکس کتنی فراوانی سے پایا جاتا ہے۔ بہرحال یہ جماعت کی بدقسمتی ہے کہ ایسے ایسے قیمتی ہیروں کو انہوں نے اپنے دل و دماغ کی لوح سے اتار رکھا ہے۔

المناک حادثہ:

مولانا کوثر نیازی جو کسی زمانے میں جماعت اسلامی کے ممبر ہوا کرتے تھے۔ بھٹو صاحب کی زلف گرہ گیر کے ایسے اسیر ہوئے کہ ان کے خاص و بااعتماد ساتھی بن گئے۔ بھٹو حکومت میں وزیر مقرر ہوئے۔ لیکن اپنے پرانے دوستوں اور تعلقات کو نہ بھولے تھے۔ درویش صفت مولانا عطاء اللہ حنیف کو اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن بنوایا۔ اسی طرح غزنوی خاندان سے انہیں والہانہ عقیدت تھی اور انہوں نے سید ابوبکر غزنوی کو جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا وائس چانسلر بنوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وائس چانسلر بننے کے بعد انہیں وزیراعظم بھٹو سے بھی ملنا پڑتا تھا جبکہ پیپلز پارٹی کے ساتھ سید صاحب کا نظریاتی اختلاف تھا۔ بھٹو سوشلزم کے سحر میں مبتلا تھے اور سید صاحب نے سرکاری جاب ہونے کے باوجود سوشلزم کے اسلامی لبادہ اوڑھنے کو شراب کی بوتل پر روح افزا کا لیبل لگانا قرار دے رکھا تھا۔ اس لیے انہیں سرکاری عمال سے ملنا بڑا ہی ناگوار محسوس ہوتا تھا۔ اس بات کا تذکرہ سید صاحب کی اہلیہ محترمہ نے ایک مضمون میں بھی کیا تھا کہ ابوبکر صاحب کو وزیراعظم سے ملنا بڑا دشوار محسوس ہوتا تھا کیونکہ وہ ایک درویش صفت انسان تھے اور بئس الفقیر علی باب الامیر کے قائل و فاعل بھی۔ بہاول پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بننے کے کچھ ہی عرصہ بعد انہیں لندن میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں جانا پڑ گیا۔ لندن پہنچنے کے چند ہی دنوں بعد روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کی ٹانگ شدید زخمی ہو گئی۔ ان کا مقالہ ان کی جگہ ڈاکٹر شیر محمد زمان نے پڑھا تھا۔ لندن میں سید ابوبکر غزنوی بیس دن زیر علاج رہے۔ حکیم سعید صاحب شام ہمدرد کے حوالے سے سید صاحب کے عقیدتمندوں میں سے تھے۔ حکیم صاحب نے ان کی تیمارداری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ علاج ٹھیک چل رہا تھا۔ دوران علاج بھی ذکر الٰہی میں ڈوبے رہتے تھے۔ طہارت کا بڑا خیال رکھتے۔ ایک دن اچانک ان کی طبیعت بہت بگڑ گئی اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی خبر وفات سے ملک بھر میں سخت ہلچل پیدا ہو گئی۔

پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر میں ویرانی ہو گئی

اخبارات نے بڑے نمایاں انداز میں ان کی علالت اور پھر وفات پر خبریں شائع کیں۔ کچھ عرصہ بعد ہفت روزہ

الاسلام لاہور نے سید صاحب کے احوال پر مشتمل غزنوی نمبر بھی نکالا تھا۔

مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا علم ان کے اُٹھ جانے کے بعد ہی ہوا۔ بندہ عاجز آپ کے ہاں ایک سال رہا۔ تقویۃ الاسلام میں قیام کے دوران سیّد صاحب کے لیکچر بھی سنے اور ذکر الٰہی کی اہمیت سے بھی واقف ہوا لیکن بات رسمی تعارف سے آگے نہ بڑھ سکی۔ جب آپ جامعہ بہاولپور وائس چانسلر کی حیثیت سے تشریف لے گئے تو پھر ان کی عظمت کا مزید احساس ہوا۔ خدمت میں حاضر ہوا، محبت وشفقت کا وہ انداز جن کا طلب گار تھا مل گئے۔ سید صاحب کے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے میں ان سے جلد قریب نہ ہو سکا مگر جب قریب ہوا تو پھر بہت جلد احساس ہو گیا کہ ابوبکر واقعی بہت بڑے آدمی ہیں۔ آخری دنوں بات مشوروں تک جا پہنچی تھی۔ حدیث مبارکہ کی عام فہم توضیح وتشریح کی طرف توجہ سید مرحوم کے فرمان کے مطابق ہی ہے۔ چنانچہ بندہ عاجز نے ''تفہیم حدیث'' کے نام سے کام شروع کر دیا تھا اور اس کا مقدمہ سید صاحب نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا مگر افسوس بہار کی آمد سے پہلے خود بوئے گل ہی اڑ گئی۔ گل بوٹوں نے لاکھ حصار کئے مگر چمن کے لئے چنگاری اپنوں کی عدم موجودگی اور وطن سے دور' بہت دور یورپ میں کام کر گئی۔ یہ ایک بڑا صدمہ ہے' ملت اسلامیہ کے لئے عموماً اور مسلک اہلحدیث کے لئے خصوصاً۔ ان کی وفات پر تعزیتیں کی گئیں، رنج وغم کا اظہار ہوا اور وہ سب کچھ ہوا جو ایسے اوقات میں ہوا کرتا ہے۔

مولانا مہدی زماں، حکیم عبداللہ، مولانا اسمٰعیل ذبیح اور خود مولانا داؤد غزنوی اور مولانا اسمٰعیل سلفی، محدث روپڑی رحمہم اللہ علیہم اجمعین کے سانحہ ہائے ارتحال سے ہم دوچار ہو چکے ہیں۔ نام کی مالا ضرور جپی مگر ان کے مشن اور کام کی طرف توجہ نہ دی۔ آج میں اس جماعت کو ڈھونڈ رہا ہوں جس کے میر کارواں غزنوی، لکھوی اور روپڑی تھے۔ جو جماعت ثناء اللہ امرتسری ودیگر آیات من آیات اللہ کی امین تھی۔ یہ ہماری غفلت کا نتیجہ ہے کہ نام تو ضرور باقی ہے مگر کام مفقود۔ داستان سرائی تو ہے مگر عبرت پذیرائی معدوم!

آئینہ شخصیت ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

تحریر: محی الدین احمد فیروز پوری

سیّد ابو بکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اس دور کی ان چند شخصیات میں سے ایک تھے جن کے قلوب واذہان ہر وقت خدا کے جلال اور اس کی خشیت ومحبت کے نغموں سے فضا معطر رکھتے تھے۔ ان کی منفرد شخصیت کا سب سے محبت کرنے والا پہلو یہی تھا کہ وہ اتنے بڑے تھے جتنا خدا سے محبت کرنے والا ہوسکتا ہے۔

سیّد صاحب کو خدائے تعالیٰ نے تمام نعمتوں سے نوازا، علمی وادبی جوہرات ہوں یا زہد وتقویٰ کی وادیاں ہوں، فکر واجتہاد کے کوچے ہوں یا حسن وزیبائش کا آئینہ ہو، قانون ودانش کے میکدے ہوں یا فصاحت وصحافت کے میدان ہوں تعلیمی مہارت ہو یا فکری ذہانت ہو، محنت کے پراسرار زاویے ہوں یا توکل علی اللہ کی مشکل گھاٹیاں ہوں، فقر وعجز کی تنگ دامنی ہو یا تونگری ومالداری کی فراخی ہو، سید صاحب ہر میدان میں ایک درخشندہ وتابندہ ستارے کی طرح چمکتے ہوئے نظر آئیں گے۔ انہیں اگر نابغۃ العصر اور عبقریِ اسلام کے نام سے پکارا جائے تو یقیناً اس کے مستحق تھے۔ ان کی گفتار اور ان کا کردار، ان کا قول اور ان کا فعل ہر صورت میں یک رنگ ویک بو نظر آئے گا۔ وہ ہر مجلس میں وہی کچھ تھے جس کا تقاضا مجلس کرتی تھی۔ اگر وہ محراب ومنبر کی رونق ہوتے تو شیروانی وٹوپی اور پاجامہ کے پیرہن میں ہوتے اور جب کالج کی حدود میں داخل ہوتے تو سوٹ میں ملبوس ہوتے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمان ہی ہر میدان میں راہنمائی کے حقوق رکھتا ہے اور ایک مومن ہی سیادت کا اہل ہے۔ یقیناً انہوں نے راہنمائی بھی کی اور سیادت کے فرائض بھی سرانجام دیئے کہ وہ پکے مسلمان اور اس دور میں اہل اللہ کی صف کے شاہ سوار تھے۔ ان کی زندگی کے آخری سال سراپا سوز ودرد تھے انہوں نے ساری عمر تقلید وجمود کے خلاف جہاد کیا، جہاں انہوں نے طاغوتی طاقتوں کو للکارا وہاں انہوں نے اسلامی قوتوں خصوصاً اہلِ حدیث مکتبِ فکر کو بھی جھنجھوڑا۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کسی بھی شخصیت سے اس وقت کام نہیں لیا جاتا جب وہ بقیدِ حیات ہو، جونہی وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوئی ہم نے اس کے زہد وتقویٰ اور علم وفضل کے قصیدے لکھنے شروع کیے۔ یہی صورتِ حال سید صاحب کے ساتھ درپیش رہی۔ سید صاحب اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے بارے میں ساری عمر مضطرب وپریشان رہے ان کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ اہلِ حدیث پھر اپنی اصلی شکل وصورت میں جلوہ گر ہوں، ان میں تقلید وجمود کے اثرات ختم ہوں، پھر سے فکر واجتہاد کی قندیلیں روشن ہوں۔ سید صاحب چونکہ خود جدید وقدیم علوم کا حسین امتزاج تھے اور

اپنے وسعت مطالعہ و علمی قابلیت میں وہ جماعت اہلِ حدیث میں منفرد مقام کے حامل تھے۔

غزنوی خاندان کے ''امین'' ہونے کی وجہ سے انہوں نے اس پر بہت زور دیا کہ اس دور میں کتاب وسنت کو عصری تقاضوں کی روشنی میں پھیلانا اور جدید دور کے تقاضوں کے چیلنج کو قبول کرنا صرف اہلِ حدیث حضرات ہی کے حصہ میں آتا ہے، کیونکہ وہ اس امت کے صدیوں بلکہ ابتدائے اسلام سے امین ہیں، اور اب انہیں غیر ضروری تعلیم کی بجائے مثبت انداز کی جدید تعلیم سے آراستہ ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی میراث کی بہتر طور پر حفاظت کر سکیں۔

سیّد صاحب کے اضطراب و پریشانی کا وہ خطاب مکمل طور پر آئینہ دار ہے جو انہوں نے ماموں کانجن کانفرنس میں ایک عظیم اجتماع سے کیا تھا۔ ذیل میں اسی مضطرب غزنوی کی شخصیت کے بعض پہلو نمایاں کرنے کی کوشش میں بعض واقعات ہدیۂ قارئین ہیں۔ امید ہے ان واقعات کی روشنی میں غزنوی صاحب کی شخصیت، فکر و حدیث، علم و ادب اور فصاحت و بلاغت کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔

ذیل کے چار واقعات جناب پروفیسر محمد اسحاق قریشی گورنمنٹ کالج لائل پور کے بیان کردہ ہیں۔ پروفیسر صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنہیں غزنوی صاحب کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ قریشی صاحب بی اے میں عربی آنرز کے طالب علم تھے اور سید صاحب اسی اسلامیہ کالج میں عربی کے لیکچرار تھے۔ بی اے کے بعد قریشی صاحب ایم اے فلسفہ میں داخلہ لینا چاہتے تھے کہ سید صاحب نے انہیں حکماً ایم اے عربی میں داخل ہونے کو کہا اور خود ان کا داخلہ فارم پُر کیا۔ اس طرح چار سال تک وہ سید صاحب کی شاگردی میں رہے، سید صاحب بی اے آنرز کا مضمون انہیں اکثر تقویۃ الاسلام ہی میں پڑھاتے۔

(۱)

قریشی صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک دن سیّد صاحب اور وہ اسلامیہ کالج سے پیدل ہی تقویۃ الاسلام جانے کو چل پڑے، ابھی چوک علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ ہی میں تھے کہ اچانک بادل آئے اور تیز بارش شروع ہوگئی۔ میں نے سید صاحب سے کہا کہ دکان میں رک جانا چاہیے تاکہ بارش رک جائے اور ہم بھیگنے سے محفوظ رہ سکیں، یا تیز چلیں تاکہ جلدی سے تقویۃ الاسلام پہنچ جائیں۔ اس پر سیّد صاحب نے فرمایا کہ ''ہم دوکانوں سے آگے نکل آئے ہیں لہٰذا واپسی مشکل ہے، واپسی پر بھی تو بھیگ جائیں گے اور تیز چلنا وقار و تمکنت کے خلاف ہے لہٰذا ہم اسی طرح چلیں گے جس طرح چل رہے ہیں اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ کپڑے بھیگ جائیں گے۔''

قریشی صاحب کہتے ہیں کہ میں نے بغور دیکھا کہ شدید بارش میں سید صاحب کی چال میں ذرا برابر بھی تیزی نہ آئی اور وہ اسی وقار سے چلتے رہے، جب ہم تقویۃ الاسلام پہنچے تو دونوں بھیگ چکے تھے۔

(۲)

دوسرا واقعہ سید محمد داؤد غزنوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ہے کہ:

ایک مرتبہ قریشی صاحب حسبِ معمول غزنوی صاحب سے عربی پڑھنے گئے، ان دنوں مولانا محمد داؤد اور غزنوی صاحب میں کچھ خفگی تھی۔ جب قریشی صاحب نے غزنوی صاحب کو ان کے کمرے میں نہ پایا جو سیڑھیوں کے اوپر تھا، تو سیدھے ہال میں چلے گئے، وہاں مولانا داؤد صاحب تشریف فرما تھے۔ قریشی صاحب نے ان سے پوچھا کہ غزنوی صاحب کہاں ہیں؟ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔

پہلے تو غزنوی صاحب کے چہرے پر جلال نمودار ہوا اور پھر وہ گرجے کہ کون سے غزنوی صاحب سے آپ ملنا چاہتے ہیں؟ ہم نہیں جانتے، مولانا کی آواز میں دھمکی تھی کہ مزید بولنے کی کوشش مت کرو، اور چہرہ پر جلال تھا۔ انہوں نے مزید جرأت کر ڈالی اور کہا: میری مراد ابوبکر غزنوی صاحب ہیں، میں ان سے روزانہ پڑھنے آتا ہوں۔

اس پر حضرت سید صاحب کا جلال اپنے عروج پر تھا، اس پر وہ گویا ہوئے کہ ہم غزنوی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ وہ کون ہوتے ہیں۔ اسی اثناء میں عمر فاروق صاحب تشریف لے آئے اور انہوں نے مجھے بازو سے پکڑا اور اپنے پیچھے آنے کو کہا، اور تقویۃ الاسلام کی چھت پر لے گئے، وہاں سیّد ابوبکر غزنوی صاحب نیلی چھت کے نیچے، کھلی فضاء میں دھوپ میں نہا رہے تھے، انہیں دیکھ کر میری جان میں جان آئی اور پسینہ خشک ہوا، میں نے انہیں ساری کہانی سنائی تو وہ ہنس دیئے۔

چونکہ یہ تدریس بے تکلف ماحول میں ہوتی تھی اس لیے غزنوی صاحب کا طریقہ بھی جدا تھا۔ سب سے پہلے پڑھانا شروع کرتے پھر کہتے: اسحاق اٹھو اور جامِ جہالت فوراً بنوا لاؤ۔ جامِ جہالت سے ان کی مراد ''لسّی'' ہوتی تھی۔ قریشی صاحب اٹھتے اور نیچے بازار سے دہی کی لسّی لے آتے۔ جامِ جہالت (یہ غزنوی صاحب کا لسّی بے چاری کو بخشا ہوا خطاب ہے) [نوش] فرمانے کے بعد پھر تدریس ہوتی، جونہی لسّی کا خمار چڑھتا اور غنودگی شروع ہوتی تو فرماتے: اسحاق اٹھو جلدی کرو چائے بناؤ، جامِ جہالت نے تو طبیعت خراب کر ڈالی، ذہن ماؤف ہوا جا رہا ہے۔

میں اٹھتا تو چند منٹوں میں چائے تیار کر کے سامنے سجا دیتا، پھر چسکیوں کا دور چلتا اور فرماتے: ہاں اب دماغ کے دریچے کھل گئے۔ پھر تدریس شروع ہو جاتی، بہت کم وہ درسی نصاب ختم کرتے، بلکہ نفسِ فن پر زیادہ زور دیتے، یہ تدریس دو گھنٹوں سے کم نہ ہوتی لیکن شعر زیادہ سے زیادہ آٹھ دس ہوتے۔

(۳)

ایم اے کے دنوں کی بات ہے، غزنوی صاحب کو طٰہٰ حسین مصری پر بہت عبور حاصل تھا، انہیں طٰہٰ حسین کی کتابوں کے صفحات ازبر تھے، اور طٰہٰ حسین پر ان کا لیکچر بہت عمدہ اور دلچسپ ہوتا۔ بقول قریشی صاحب: شائد ہی کسی کو یونیورسٹی میں طٰہٰ حسین پر کسی کو اتنا عبور حاصل ہو جتنا کہ غزنوی صاحب کو تھا۔ شائد اس کی وجہ غزنوی صاحب اور طٰہٰ حسین میں مشترک صفت اجتہاد، حریت و آزادیِ افکار ہو، کیونکہ طٰہٰ حسین کو بھی ازہری علماء سے واسطہ پڑا جو مقید علم میں مقید،

جدید علوم سے ناآشنا اور قدامت پسندی پر خوش تھے۔ یہی وجہ تھی کہ طٰہ حسین نے ازہر کے بجائے دار العلوم میں حصولِ تعلیم کے دوران فرحت و سرور محسوس کیا۔

ایم اے کے طلباء کے لیے یونیورسٹی نے ایک پروگرام بنایا کہ ایم اے عربی کے طلباء کے لیے سکالرز اور علماء کرام کو مدعو کیا جائے اور گاہے گاہے ان کے لیکچرز ہوتے رہیں۔ ایک دن غلام احمد پرویز صاحب ایسی ہی تقریب میں تشریف لائے، پرویز صاحب وائس چانسلر کی معیت میں کلاس روم میں تشریف لائے، یہ پیریڈ غزنوی صاحب نے لے رکھا تھا، وائس چانسلر کے کہنے پر غزنوی صاحب نے پرویز صاحب کو وقت دے دیا۔ پرویز صاحب نے اپنے علم وفضل، فصاحت وبلاغت اور قرآن فہمی کا ثبوت دینے کے لیے ''نبی اور جادو'' کا موضوع منتخب کیا، اور بیان کیا کہ نبی پر جادو کا اثر نہیں ہوسکتا۔ یہ جو واقعہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ہے کہ آپ (ﷺ) پر یہودیوں نے جادو کر دیا تھا، صحیح نہیں۔

وہ پہلو بدل بدل کر یہی بات کرتے رہے، جب وہ اپنی بات مکمل کر چکے تو سیّد ابوبکر غزنوی جن کا رنگ ایسی گفتگو سنتے سنتے سرخ ہوگیا تھا، گویا ہوئے کہ آپ قرآن کی صداقت وثقاہت کے تو قائل ہی ہیں، حضرت موسیٰ کے بارے میں جو قصہ قرآن میں متعدد جگہ بیان ہوا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال [ہے]۔ اس کے ساتھ قرآنی آیات کی آپ نے تلاوت بھی کر دی اور پھر پورے جلال میں آگئے۔ بس پھر کیا تھا کہ پرویز صاحب کی بھری کلاس میں سبکی ہوئی اور وہ خاموشی سے رفو چکر ہوگئے۔ اس کے بعد پرویز صاحب کو کبھی جرأت نہ ہوئی کہ غزنوی صاحب کے پیریڈ میں اپنے خطاب سے طلبہ کو محظوظ کرتے۔

(۴)

قریشی صاحب کے بیان کردہ واقعات میں ایک مزید سن لیجیے کہ:

ایک دن وہ اسلام آباد میں تھے کہ اچانک سرِراہ غزنوی صاحب سے ملاقات ہوگئی وہ غالباً مری میں گرمیوں کی چھٹیاں گذار رہے تھے۔ یہ ملاقات بہت مدت بعد ہوئی، اب کی بار مسٹر ابوبکر غزنوی کی بجائے وہ مولانا ابوبکر غزنوی صاحب بن چکے تھے اور ننھی سی خوبصورت داڑھی نے چہرہ کو بقعہ نور بنا ڈالا تھا، قریشی صاحب نے ہاتھ بڑھایا تو بڑے مزاحیہ انداز میں فرمایا: اوبھئی اسحاق تم کہاں؟ پھر قریشی صاحب نے پوچھا کہ کسی دوست نے بتایا تھا کہ آپ اسلامیہ کالج سے ترقی کر کے انجینئرنگ یونیورسٹی تشریف لے گئے ہیں، تو غزنوی صاحب نے فرمایا: ہاں بھئی انہوں نے مجھے وہاں بہت بڑا افسر بنا کر بھیجا ہے، میرے آفس کے سامنے میرے نام کی تختی آویزاں ہے۔ ابوبکر غزنوی (قومہ) صدر شعبہ اسلامیات (قومہ) انجینئرنگ یونیورسٹی (پھر قومہ) پاکستان (فل سٹاپ) یہ الفاظ غزنوی صاحب نے اصل یعنی انگریزی میں کہے، اور ''قومہ'' پر بہت زور دیتے، اور ساتھ ہی شہادت کی انگلی کو شدید جھٹکا دیتے۔

غزنوی صاحب بہت بڑے خطیب تھے، آپ جب بھی عام گفتگو فرماتے تو پورے جلال کے ساتھ اور جب خطاب فرماتے تو پورے عشق کے ساتھ، لیکن ان کی جلالت کی چابی ان کی شہادت کی انگلی تھی جب بھی وہ جوش میں آتے تو اپنی شہادت کی انگلی کو شدید جھٹکا دیتے تھے۔

پروفیسر مرزا منور کا بیان کردہ واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو نوائے وقت میں چھپ چکا ہے کہ "مرزا صاحب، غزنوی صاحب اور دیگر چند دوست مری میں گرمیوں کی چھٹیاں گذار رہے تھے کہ ایک دن حسبِ معمول گپ شپ، شعر و شاعری، ادب عربی و فارسی شعراء، کا کلام قرآن پاک و حدیثِ رسول ﷺ سے ادبی ذوق پورا ہو رہا تھا کہ غزنوی صاحب نے اپنے داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو حسبِ عادت جھٹکے دے کر زورِ خطابت صرف کرنا شروع کیا۔ چونکہ مجلس انتہائی بے تکلف تھی، مرزا صاحب نے غزنوی صاحب کو بتایا کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کے ایک دوست سید کرامت حسین جعفری (جو بڑے ماہرِ نفسیات اور اسلام پسند عظیم دانشور ہیں) تھے (یہ طالب علمی کے زمانہ کی بات ہے) ان کا قد بھی ذرا چھوٹا تھا لیکن باتیں بہت کرتے تھے اور جب بھی بات کرنا ہوتی اپنے داہنے ہاتھ کی انگلی کو جھٹکا دیتے۔ ایک دن میں نے شرارت سے ان کی انگلی پکڑ لی تو وہ خاموش ہو گئے، میں سمجھ گیا کہ جعفری صاحب کی خاموشی کی چابی ان کے داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی ہے۔ پھر جب بھی میں نے ان کو خاموش کرانا ہوتا تو ان کی انگلی پکڑتا اور دبا دیتا اور وہ خاموش ہو جاتے۔ "کیوں غزنوی صاحب شاید آپ کی چابی بھی یہ انگلی ہے۔" یہ غزنوی صاحب نے سنا اور کھلکھلا کر ہنس دیئے۔"

مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب متعنا اللہ بطول حیاتہ نے راقم سے ایک واقعہ بیان فرمایا جس سے غزنوی صاحب کی عظمت کا پہلو بہت واضح ہے، اس سے ان کی مساوات اسلامی کی حس کی تیزی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ایک مرتبہ مولانا صاحب غزنوی صاحب کو ملنے یونیورسٹی میں تشریف لے گئے، کار پیچھے ہی رکوائی اور خود غزنوی صاحب کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں تشریف لے گئے۔ حسب موسم وہاں غزنوی صاحب نے مولانا صاحب کو فروٹ اور چائے پیش کی، اسی دوران کوئی بات ہوئی تو غزنوی صاحب کو پتہ چلا کہ باہر گاڑی میں مولانا صاحب کا ڈرائیور مسٹر مختار ابھی تک موجود ہے، وہ سمجھے ہوں گے کہ یہ گاڑی مولانا نے یہاں آنے تک ہی استعمال کی ہوگی اور کرایہ دے کر اسے رخصت کر دیا ہوگا۔ غزنوی صاحب کو جب یہ پتہ چلا تو فوراً اٹھے اور پورے تاسف کا اظہار کیا کہ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ مولانا کا ڈرائیور باہر ہے وہ تو بے چارہ بھوکا ہوگا اور ہم خاموشی سے سب کچھ کھا گئے۔ غزنوی صاحب نے کچھ فروٹ جس میں کیلا، کھجور وغیرہ تھا، ایک پلیٹ میں رکھا اور خود باہر ڈرائیور کو کھلانے تشریف لے گئے، ڈرائیور ہچکچایا، لیکن غزنوی صاحب نے کمال شفقت سے اسے بالاصرار کھلایا۔ اس سے اس شخص کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ملتا ہے۔

غزنوی صاحب جب کبھی کسی جگہ دعوت میں تشریف لے جاتے تو اس دعوت میں اپنے ڈرائیور کو بھی اس کھانے

میں شریک کرتے جس سے خود لطف اندوز ہوتے۔ ایسا ہی ایک واقعہ انہوں نے اپنے اس مقالہ میں بیان کیا ہے جو انہوں نے انگریزی زبان میں لنڈن میں ہونے والے اسلامی میلہ میں پڑھنا تھا، جو بالآخران کے زخمی ہونے کی وجہ سے لنڈن میں پاکستانی سفارت خانہ کے ایک اعلیٰ افسر نے پڑھا۔

ایک مرتبہ غزنوی صاحب کسی اعلیٰ دعوت میں مدعو تھے جہاں اعلیٰ سرکاری افسر بھی مدعو تھے۔ غزنوی صاحب جب وہاں پہنچ گئے تو ایک آدمی کو کہا کہ جاؤ میرے ڈرائیور کو بھی لے آؤ۔ یہ سن کر تمام لوگوں نے ناک بھوں چڑھائے، لیکن غزنوی صاحب نے ان کی قطعاً کوئی پروانہ کی اور ڈرائیور کو اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھایا۔ اس دعوت میں اسلام پسند علماء بھی موجود تھے لیکن کسی شخص نے اپنے ڈرائیور کو اپنے ساتھ کھانا کھلانے کو پسند نہ کیا۔

ایک واقعہ مزید مولانا عبد الرحیم اشرف صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ غزنوی صاحب ان کے ہاں لائل پور تشریف لائے، کھانا تناول کرنے کے بعد فروٹ کا دور چلا، مولانا نے اپنے ہاتھ سے کنوں چھیلا، سیّد غزنوی صاحب کو پیش کیا، لیکن مولانا کے اس کنوں چھیلنے سے کنوں سے دو قطرے پانی بہہ گیا، یہ دیکھ کر غزنوی صاحب نے ایک کنوں خود پکڑا اور اسے اس طرح چھیلا کہ نہ تو چھلکا ٹکڑے ٹکڑے ہوا نہ ہی کنوں سے پھر ایک ذرہ بھر پانی نکلا۔ میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا، پھر انہوں نے سیب کے چھلکے کو چاقو سے اتارا لیکن کمال یہ تھا کہ سیب کا چھلکا بھی ٹوٹے بغیر اتارا گیا۔

میں نے اس نفیس شخصیت کی نفاست سے اس بات کا اندازہ لگایا کہ جس شخص کو ایک کنوں سے پانی سے گرنا بھی گوارا نہیں آخر وہ خرافات اور مذہب کے مسئلے میں غلط رویوں کا کیسے شکار ہوسکتا ہے۔

ایک مرتبہ غزنوی صاحب نے اپنی کتاب ''سیدی وابی'' پر خالد بزمی سے تبصرہ لکھوا کر ہفت روزہ المنبر میں اشاعت کے لیے ارسال کیا۔ میں ان دونوں المنبر میں ادارہ تحریر کے رکن کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، مولانا عبد الرحیم اشرف صاحب نے یہ تبصرہ خالد اشرف صاحب کو دیا اور انہوں نے میرے پاس دفتر میں بھیج دیا۔ میں نے مسٹر یوسف جو ادارہ کے ایک مخلص کارکن ہیں کو دے دیا کہ اس مسودے کو ان مسوّدات میں رکھ دو جو آئندہ اشاعت کے لیے تیار ہیں۔ کام کی زیادتی تھی اس لیے مسٹر یوسف نے مجھ سے مسوّدہ لے کر کسی جگہ رکھ دیا اور پھر مسوّدہ کاغذوں میں ایسا گم ہوا کہ ملا ہی نہیں۔ چند ہفتوں کے انتظار کے بعد سیّد غزنوی صاحب نے مولانا کو ایک سخت خط لکھا کہ المنبر اور غزنوی صاحب کا مشن بہت ملتے جلتے ہیں پھر وہ کیوں نہیں ان سے تعاون کرتے۔ مولانا کا غصہ خالد صاحب پر نکلا، ادھر میں آفس میں بیٹھا تھا سہم گیا کہ آج یہ غصہ مجھ پر نکلے گا کیونکہ یہ مسوّدہ حقیقت میں میری غلطی کی وجہ سے گم ہوا تھا۔ میں نے غزنوی صاحب کا مولانا صاحب کے نام یہ مکتوب خود پڑھا۔ اف اللہ کتنا کرب تھا ان کے خط میں اور پھر کتنے حسین پیراؤں میں انہوں نے اپنے غصے کا اظہار کیا یعنی عام آدمی خط پڑھے تو سمجھے کہ یہ تو بہت خوش کن خط ہے۔

اگر قارئین سید صاحب کے بارے میں ان بیان کردہ واقعات کو ہنوز پڑھیں تو انہیں یقیناً ان کی ہمہ گیر شخصیت کے کئی پہلو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اب قلم روکتا ہوں اور یہی کہہ سکتا ہوں کہ اب یہ منفرد شخصیت کہاں ملے گی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

پروفیسر ابوبکر غزنوی

تحریر: پروفیسر مرزا محمد منور

غبار کارواں ہوں، رہ گیا ہوں
کوئی ان جانے والوں کو صدا دے

دوست یکے بعد دیگرے رخصت ہوتے جا رہے ہیں۔ کون روکے، رکتا بھی کون ہے، ابھی کل ہی کی بات ہے کہ مہربان اور مشفق دوست آغا شورش چل بسے۔ پھر میرے مسکین اور دردمند دوست مشیر کاظمی نے رحلت کی۔ پھر اچانک یار زندہ دل پروفیسر ابوبکر غزنوی نے داغِ مفارقت دیا۔ ان کے تشریف لے جانے کے جلد ہی بعد میرے مخلص اور ہم سبق اور قابلِ اعتماد دوست پروفیسر محمد اسلم ملک نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ آنسو پونچھ ہی رہا تھا کہ پتہ چلا کرنل نثار ترین جاذب، وہ گلشنِ شعر کا بلبل ہزار داستان، وہ یار عزیز بھی عالم عدم کو سدھارا۔ گرما کی چھٹیاں ہو گئیں، میں لاہور سے نکلا، مری کے ایک گوشے میں جا پڑا۔ وہاں حضرت شیخ عبدالشکور صاحب کا خط یہ خبر وحشت اثر لایا کہ ہمارے شگفتہ خو، مہمان نواز اور محفل آرا دوست شیخ عبدالواحد صاحب (واحد شو کمپنی انارکلی لاہور) نے بھی گلشن جنت میں آشیانہ جا بنایا ہے۔ کیا کیا جائے، لوگوں کی عادت ہے مر جاتے ہیں۔ ہم بھی مر جائیں گے ہمیں کون روک لے گا، مگر ہمیں روکنے والے رہ بھی کتنے گئے ہیں۔ وہ جو آگے جا چکے ہیں وہ بہت زیادہ ہیں وہاں کی محفل زیادہ بھری بھری، زیادہ خوش رنگ، زیادہ خوشبودار اور زیادہ پُر بہار ہے۔

جوں جوں غم زیادہ نازل ہوتے ہیں توں توں غموں کی مہمانی کا ڈھب آتا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ آدمی احساسِ کرب کو دبانے میں ماہر ہو جاتا ہے۔ فرض کر لیتا ہے کہ ہاں یہ تو ہونا ہی تھا۔ چلو ہو گیا مگر آدمی بے چارہ آخر آدمی ہے۔ عاجز، کمزور، احساسِ غم کے تار کبھی اچانک بے خبری میں بھی تو جاگ اٹھتے ہیں اور آدمی دل کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ دوستوں کے مقامات، محفلیں، چھوڑی ہوئی منزلیں، گزرگاہیں، شکایتیں، حکایتیں، شعر، لطیفے، قصے کہانیاں، وفا، جفا، یہاں یہ ہوا تھا، یہاں یہ دیکھا تھا، کب یاد رہ گیا کیا اور آہ وہ سب کچھ بھول گیا۔

دنیا چلی گئی مری دنیا لیے ہوئے

میں نے چاہا تھا ابوبکر غزنوی صاحب کو بھلا دوں، لہٰذا دم سادھ لیا تھا۔ چاہا تھا کہ اف بھی نہ کروں۔ لاہور میں حتی الوسع اس نواح میں نہ گیا جہاں ابوبکر غزنوی کا ذکر عام ہوتا ہے۔ ان دوستوں سے کنارہ کش رہا جو مجھے دیکھتے ہی ابوبکر کو

یاد کر کے رونے لگتے۔ مگر جب مری میں آیا تو بے بس ہو گیا۔ ابوبکر بہت یاد آئے، بار بار یاد آئے۔ اس میں بھی میرا قصور نسبتاً کم تھا۔ ابوبکر کو یاد کرنے والے مجھے غافل ہونے ہی نہ دیتے تھے۔ کبھی حافظ عبدالرشید صاحب نے کہا: یاد ہے، پچھلے سال اس بنچ پر ہمارے ساتھ ابوبکر بھی بیٹھا کرتے تھے۔ ہائے کیا کیا حکایتیں ہوتی تھیں۔ سید امجد الطاف نے ملتے ہی کہا: مری آئیں تو ابوبکر کو کیسے یاد نہ کریں۔ کسی ایک عزیز نے جن کا نام یاد نہیں ادھر پکڑا اور کہا: اس بار آپ ابوبکر صاحب کو نہیں لائے اور رونا شروع کر دیا۔ فرکوس ہوٹل میں چائے پینے کے لیے داخل ہوا تو مینجر نے پوچھا: آپ کے دوست پروفیسر غزنوی صاحب کب تک آجائیں گے؟ اس جان جلے کو خبر ہی نہ تھی کہ اب وہ فرکوس میں قدم رنجا نہ فرمائیں گے۔ وہ تو فردوس میں محو استراحت ہیں۔ ایک روز حافظ عبدالرشید صاحب فرکوس میں میری تلاش میں پہنچے۔ اداس ہو کر بیٹھ گئے، بولے: یاد ہے اس گوشۂ عافیت میں مرحوم مولانا غزنوی صاحب کیا کیا چہکتے تھے۔ کبھی شعر عربی، کبھی شعر فارسی، کبھی کوئی حدیث، کبھی کوئی آیت، کبھی لطیفہ، کبھی تلقین، بڑی سے بڑی بات کو ٹھٹھول کے انداز میں کہہ جاتے۔ ثقیل گفتگو سے اور ثقیل ندیم وجلیس سے گھبراتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ دل شکنی نہ کرتے تھے۔

میں نے تو کسی سے بھی ذکر نہ کیا۔ مطلب یہ کہ ذکر کرنے میں پہل نہ کی مگر مولانا نے مری میں یادیں ہی اتنی چھوڑی تھیں کہ کوئی ان کا دوست بھلانا بھی چاہتا تو کیا کرتا۔ پروفیسر اظہر جاوید طارق ہی کافی تھے۔ فرکوس کی اس نشست پر جہاں میں اکثر بیٹھتا ہوں اور جسے میرے دوست گوشۂ عافیت کہہ کے یاد کرتے ہیں پروفیسر اظہر طارق جاوید اور مولانا مرحوم سے طویل گپ شپ لگایا کرتے تھے۔ مولانا کی نکتہ آفرینیاں، عربی ترکیبیں اختراع کرنے کا ذوقِ فراواں اور عام طور پر بلند آہنگ گفتگو۔ میں حسبِ معمول اب بھی فرکوس میں چائے پینے کے لیے حاضر ہوتا رہا۔ اظہر طارق بھی حسبِ معمول ساتھ رہے۔ انہوں نے مولانا کی غیر حاضری کے احساس کو غیر حاضر نہ ہونے دیا۔ کبھی کہتے: یاد ہے مولانا اونچی آواز میں باتیں کرتے تھے۔ بھول جاتے تھے کہ یہاں وہ لوگ بھی ہیں جن کو ہماری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ کئی بار آہستہ سے متوجہ بھی کرتے تھے کہ مولانا ذرا آہستہ۔ لوگ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں مگر مولانا گپ کی سرشاری میں کہتے: چھوڑیں مرزا صاحب ہم مست لوگ ہیں۔ ہمارا اپنا انداز ہے۔ ہم دوسروں کے اسلوب گپ کے پابند نہیں۔ ایک دن پروفیسر اظہر طارق کہنے لگے: مرزا صاحب وہ شام نہیں بھولتی جب علامہ شبیر بخاری، مولانا غزنوی، آپ اور میں یہاں اکٹھے بیٹھے تھے۔ آپ تینوں نے اس روز قیامت ہی ڈھا دی تھی۔ یوں پتہ چلتا تھا گویا کہ تینوں جملہ موضوع مشترک ہیں۔ جس طرف طرح دی دوسرے دونوں نے مقطع تک غزل عرض کر دی۔ حضرت مرزا بیدل، حضرت بوعلی قلندر متنبّی، امراؤ القیس، حافظ شیرازی، مولانا روم، مرزا غالب، فیضی، علامہ اقبال، تصوف، فلسفہ، تاریخ، ادب، سیاست، تعلیم، تعلّم......سبحان اللہ، کیا شام تھی۔ کئی گھنٹے یہ کیفیت جاری رہی، بھلائی نہیں جاسکتی۔

ہاں مولانا کے اکثر موضوع میرے اور علامہ شبیر بخاری کے ساتھ مشترک تھے۔ ایک موضوع ابوبکر صاحب کے

یہاں زیادہ تھا۔ وہ یہ کہ انہوں نے لاء کی ڈگری بھی حاصل کر رکھی تھی مگر ہم ایسے ضابطے و قاعدے کے پابند لوگ ہیں کہ مولانا کو قانون کا حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کراتے تھے۔ لہٰذا ان کا وہ شعبہ ہماری گپ میں حصہ دار نہ ہوتا تھا۔ علامہ شبیر بخاری صاحب اور میں جب اکٹھے ہوتے غزنوی صاحب کی باتیں کرتے۔ میں اور غزنوی صاحب اکٹھے ہوتے تو بخاری صاحب کا ذکر چل نکلتا۔ لاہور کا قصہ ہے، میں نے ایک روز فون کیا۔ ان دنوں بخاری صاحب ملتان ڈائریکٹر تعلیم ہو کر گئے ہوئے تھے۔ غزنوی صاحب نے میرے سلام کے جواب میں پوچھا: بخاری صاحب کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا: یہ کیا شرافت ہے، فون میں کروں، حال آپ بخاری صاحب کا پوچھیں۔

خدا کروٹ کروٹ جنت عطا کرے پروفیسر غزنوی کو۔ وہ بڑے جامع الصفات شخص تھے۔ خوش گفتار، خوش پوشاک، خوش خوراک اور خود بھی خوشنما۔ ان کی رفاقت سراسر فرحت تھی۔ ان مجالست روح کی تازگی تھی۔ وہ دل کے مریض تھے مگر دوستوں کی محفل میں حاشا وکلا جو کبھی ایسا اشارہ بھی کیا ہو۔ اگر میرے منہ سے کبھی کوئی اداسی کی بات نکل جاتی تو بڑی دل آویزی سے اور رعب سے کہتے: چھوڑیں جی، جو لمحے دوستوں کی رفاوت میں گزر جائیں غنیمت جانیں۔ ہنسیں اور ہنسائیں ہر غم کو بھول جائیں۔ اگر میں کسی حالیہ قومی ابتلا کا تذکرہ کرتا تو فرماتے: اداس اور آزردہ ہونے سے مقاومت کم بلکہ ختم ہو جاتی ہے۔ جو کچھ بس میں ہے وہ قوم کی بہتری کے لیے کرنا ضرورمی ہے، غم کھانا فضول اور فالتو بات ہے۔

مولانا ابو بکر غزنوی بڑے راسخ العقیدہ اور صاحبِ یقین مسلمان تھے اور تمام اسلام دشمن پیوندی نظریات کے برملا مخالف تھے جو اسلام کی روح کو مسخ کر سکتے ہیں۔ وہ اسلام کے ساتھ کسی پیوند کے تصور کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ وہ علم کے ساتھ ادب اور ادب کے ساتھ اخلاص کے بھی مبلغ بھی تھے اور مظہر بھی۔ ان کی تقریر یا وعظ محض ادائے فرض نہ ہوتا تھا۔ یہ ان کے دل کی آواز تھی، یہ ان کا ذوقی معاملہ تھا، یہ ان کا روحانی نشہ تھا۔ انہوں نے خدا کے بعد کسی کو خدا نہ بنایا۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کی شریعت کا مبہم سا تصور بھی گوارا نہ کیا۔ وہ اہلِ حدیث کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے مگر انہوں نے اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا داؤد غزنوی کے مزاج اور خصوصاً عمر کے آخری سالوں کا پرتو بہت قبول کیا تھا۔ انہوں نے باضابطہ تصوف کی چاشنی پائی تھی۔ ایک روز فرمانے لگے: تمہیں صوبہ سرحد کے ایک منور گوشے میں لے جاؤں گا۔ وہاں اپنے مرشد سے ملواؤں گا۔ میں حیران، یہ کیا، آپ غیر مقلد، مقلد کیسے ہو گئے؟ اس پر زور کا قہقہہ لگایا، بھائی یہ بھی مزے کی بات ہے۔ کبھی چلو۔ میں نے کہا: ہاں مولانا چلوں گا۔

ایک روز باتوں باتوں میں فرمانے لگے: آپ زندگی میں کسی مرحلے میں دین کے باب میں تشکیک کا شکار ہوئے ہیں۔ کبھی دہریت کا دورہ بھی پڑا ہے، کبھی دینی پابندیوں سے گھبرا کر آزادی کا نشہ بھی کیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ تو پھر آپ کو وہ لطفِ ایمان کہاں ہے جو مجھے ہے۔ میں ان تجرباتی منزلوں سے گزرا ہوں پھر بصد شوق و ذوق بے تاب ہو کر

دین کی جانب لوٹا ہوں۔ میرا لوٹنا ایک عاشق کا لوٹنا ہے۔ آپ کو اس کیفیت سے کیونکر آگاہی ہو۔ ''کافر نہ شدی لذت ایمان چہ شناسی'' لہٰذا میری تلقین اور میرا وعظ عاشق کی نوا ہوتا ہے۔ وہ نوا دل کی آواز ہوتی ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ سننے والے کس دل سے سنتے ہیں۔ عاشق دوسروں کا پابند نہیں ہوتا۔

مولانا باتیں طراری کے ساتھ کرتے تھے۔ اکثر کیا میری ان کی گفتگو ہمیشہ اردو میں ہوتی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ ہم نے لاہور میں یا مری میں کبھی باہم پنجابی میں باتیں کی ہوں۔ وہ باتیں کرتے وقت دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کو زور زور سے جھٹکتے رہتے تھے۔ مجھے ان کی عادت دیکھ کر مرحوم فقیر مغیث الدین یاد آجاتے تھے۔ وہ اور پروفیسر کرامت حسین جعفری صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ ہم میں بڑا یارانہ تھا، جعفری صاحب بہت باتیں کرتے تھے مگر باتیں کرتے تو دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت اٹھا کر جھٹکتے جاتے اور بولتے جاتے۔ آخر میں سمجھ گیا کہ ان کی زبان کی کمانی ایک انگلی ہے۔ ایک بار میں نے وہ انگلی پکڑ لی۔ جعفری صاحب چپ ہو گئے۔ ازاں بعد آسانی ہوگئی۔ جب بھی انہیں چپ کرانا ہوتا میں ان کی انگلی پکڑ کر دبا دیتا۔ میں نے ابوبکر صاحب کو مغیث الدین صاحب کے یہ ملاحظات بتائے اور کہا: میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے جوشِ بیان کا سہارا بھی یہ انگشت شہادت ہے اور یہی گفتار کی طراری کو سہارا دیتی ہے۔ کیا خیال ہے کہ اگر آپ کی انگلی پکڑ لی جائے تو آپ کی باتیں پھر بھی جاری رہیں گی؟ سنا تو کھکھلا کر ہنسے۔ تردید نہ کی، چیلنج نہ دیا۔ مطلب یہ کہ ان کی زبان کی کمانی بھی ان کی انگشت شہادت کے ساتھ ضرور مربوط تھی۔

وہ تعلیم و تعلم کے ضمن میں بڑے سنجیدہ اور محنتی تھے۔ میرے کئی دوست ان کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ وہ ان کے تبحر علمی کی ہمیشہ داد دیتے ہیں۔ وہ طالب العلمی بھی متین تھے۔ میرے عزیز دوست محمد خورشید عاصم کہتے ہیں کہ 1942ء سے 1944ء تک یعنی گیارہویں بارہویں میں دو سال وہ اور مولانا اسلامیہ کالج لاہور میں ہم جماعت تھے۔ ان کا تاثر یہ ہے کہ مولانا کلاس میں بڑے کم گو، مؤدب اور مہذب رہتے تھے۔ ان میں شہری لڑکوں کی سی کوئی شوخی نہ تھی۔ وہ کہتے ہیں: دو سال کے عرصہ میں ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوئی جسے میں اتھلی یا ہلکی کہہ سکتا۔ خورشید صاحب کہتے ہیں کہ میں شکر گڑھ کا سادہ دل دیہاتی کالج میں گیا تو سہما سہما سا رہتا تھا لہٰذا کم گو تھا (خورشید صاحب بدستور کم گو ہیں) میں شہری مزاج کے ساتھیوں سے دور دور ہی رہتا تھا۔ بس مولانا کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی۔ ہم دو برس عموماً ایک ہی ڈیسک پر بیٹھتے رہے۔ خورشید صاحب کہتے ہیں: میں بی۔اے میں ایف سی کالج میں چلا گیا۔ پھر زندگی کے طوفان جدھر لے گئے اُدھر کا رخ کر لیا۔ مولانا ابوبکر کے ساتھ ربط بحال نہ رہا مگر انہیں جب بھی یاد کیا تو ایک بھلے، بھولے اور شریف النفس رفیق درس کی صورت لوحِ تصور پر جلوہ گر ہوتی۔

مولانا مجھ سے ناراض ہی تشریف لے گئے ہوں گے۔ خیر میں انہیں راضی کر لوں گا۔ مولانا یاروں کے یار تھے اور

یاری کی بڑی قدر کرتے تھے۔ یاروں کے حبیبوں کو بھی پیار اور درگزر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہوا یہ کہ جب وہ بہاولپور میں وائس چانسلر کی حیثیت سے تشریف لے گئے تو مجھ سے فرمایا اور بہ اصرار فرمایا کہ آپ میرے ساتھ چلیں اور وہاں شعبہ عربی کو چلانے میں میری مدد کریں۔ میں نے سوچنے کی مہلت چاہی۔ بڑی مشکل سے ایک ماہ کی مہلت دی۔ میرے احباب نے حامی نہ بھری۔ خود انہوں نے حامی نہ بھری جن کے بارے میں انہیں توقع تھی کہ میرا بستر بندھوائیں گے اور مجھے بہاولپور روانہ کر دیں گے۔ ادھر مولانا بے تاب، رقعہ، ٹیلیفون، قاصد اور آخر میں نے انکار کر دیا۔ اتفاق یہ کہ میرے اس خط کے بعد ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ دل میں کہا: اچھا مل ہی لیں گے۔ مولانا جمعہ پڑھانے لاہور آتے ہی ہیں۔ کسی نہ کسی سرکاری وغیر سرکاری میٹنگ کی خاطر بھی تشریف لاتے ہیں۔ کسی نہ کسی دن عزیزم خالد بزمی صاحب کی ڈیوٹی لگا دوں گا کہ اپنے استادِ مکرم سے ملوا دیں اور وہ مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔ مگر دیکھا اس وقت جب وہ لکڑی کے تابوت میں مکفون پڑے تھے۔ میں ان کی آخری زیارت کرنے والوں کی لمبی قطار میں کھڑا تھا۔ حمید المکی صاحب نے دیکھ لیا۔ آئے اور لے گئے اور تابوت کے پاس لے جا کے کہا: اب اپنے دوست کو دیکھ لیجئے۔ میں نے شیشے کی بند کھڑکی میں سے چہرہ دیکھا۔ ٹھہر نہ سکا، نکل گیا۔ غزنوی اور یہ خاموشی؟

ایک دن سنا کہ وہ پنجاب یونیورسٹی یونین کے فلاں اجلاس میں اسلامی غیرت کا درس دے رہے ہیں۔ اگلے دن سنا کہ وہ انگلستان تشریف لے گئے ہیں۔ پھر اخبار میں پڑھا کہ زخمی ہو گئے ہیں مگر تشویش کی کوئی بات نہیں۔ پھر اچانک اخبار ہی نے مطلع کیا کہ رحلت فرما گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ہمارے معاشرے میں صحیح الخیال لوگوں کا شدید قحط ہے اور وہ قحط شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک عام بھلے آدمی کی کمی بھی پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی چہ جائیکہ کوئی ایسا عالم، ایسا ادیب، ایسا خطیب، ایسا معلم، ایسا دوست، ایسا مسلمان، ایسا محبِ وطن اور ایسا مخلص انسان رخصت ہو جائے۔ صاحبِ علم کی موت تو ایک جہاں کی موت ہے۔ یہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ ایسے بھرپور آدمی موجودہ کھوکھلی سوسائٹی میں ہیں کتنے؟ اور ان میں بھی کوئی ابوبکر کہاں ہے؟ ہے کوئی ابوبکر؟ ابوبکر کے دوستوں سے پوچھیے، ان کے عزیزوں سے پوچھیے، شاگردوں سے پوچھیے، گھر والوں سے پوچھیے۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے [1]

---

[1] کرم فرما: پروفیسر محمد منور (ص: 165) الفیصل ناشران و تاجران کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ [طبع: مارچ 2012ء]

سیّد ابوبکر غزنوی

تحریر: ڈاکٹر خورشید رضوی

دنوں کی بھی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ یا شاید آدمی کے باطن میں کوئی نافہ ہوتا ہے جو اُسے باہر مہکتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ 1959ء کی بات ہے۔ اُن دنوں کی خوشبو آج بھی میرے مشام میں ہے۔ اورینٹل کالج میں داخل ہونا، یہاں کے در و دیوار کی سُرخی اپنے دل میں محسوس کرنا، ایک کھڑکی میں سے فیس داخلہ جمع کرانا اور پھر بطور طالب علم اپنا شناختی کارڈ حاصل کرنا (قومی شناختی کارڈ تو ابھی تھے ہی نہیں)۔

کالج کے اندر جانے کی مرکزی راہداری میں جو دوسری طرف وولنر ہاسٹل کے سامنے والے گراؤنڈ کی طرف کھلتی ہے، بائیں طرف کی دیوار پر نوٹس بورڈ آویزاں تھا۔ اس کے بڑے بڑے گول گول خانوں کی جالی کے اندر سے میں نے اپنا ٹائم ٹیبل نوٹ کیا۔ پروفیسر عبدالقیوم، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، پروفیسر عبدالصمد صارم اور مولانا نور الحسن جیسے اساتذہ ہمیں کب کب اور کیا کیا پڑھائیں گے۔ اس کی تفصیل نوٹ کرتے ہوئے ان اساتذہ کی ایک فرضی شبیہ بھی ذہن میں بنتی چلی گئی۔ ان ناموں میں ایک نام سیّد ابوبکر غزنوی کا بھی تھا جو ہمیں جدید عربی ادب پڑھائیں گے۔

اس نام "ابوبکر غزنوی" کی جو تصویر متخیلہ نے بنائی وہ ایک دُبلے پتلے، سانولے، دراز قد، باریش شخص کی تصویر تھی جو ڈھیلی ڈھالی عربی عبا میں ملبوس، عبا کے دامن کو لہراتا ہوا میری روشِ خیال پر گام زن تھا۔

ان دنوں لاہور بھر کے کالجوں سے چیدہ و برگزیدہ اساتذہ ہفتے میں دو یا تین پیریڈ، بلا معاوضہ پڑھانے کے لیے رضا کارانہ اورینٹل کالج تشریف لایا کرتے تھے۔ سیّد ابوبکر غزنوی صاحب اسلامیہ کالج سول لائنز میں فریضۂ تدریس انجام دیتے تھے اور ہفتے میں دو بار انہیں اورینٹل کالج آنا تھا۔ کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ پہلے ہفتے ہم ستم کشِ انتظار ہی میں رہے۔ غزنوی صاحب تشریف نہ لاسکے۔ آئندہ ہفتے جب وہ آئے تو ہم بس اُنہیں دیکھتے ہی رہ گئے۔ میانہ قد، کلین شیوڈ، سرخ و سپید رنگت، بڑی بڑی پُرجلال آنکھیں، چغتائی آرٹ کا نمونہ، خوبصورت سوٹ میں کمال جامہ زیبی کے ساتھ ملبوس، بوٹ چمکے ہوئے جو پیدل اسلامیہ کالج سے آتے آتے کچھ گرد آلود ہو جاتے تھے۔ چال میں تمکنت جسے بیان میں لانا بہت مشکل ہے۔ سرمستی، ناز، رعب اور دبدبے کا آمیزہ:

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی

اسی موجِ خرام سے گُل کترتے ہوئے سُرخ سیڑھیاں چڑھ کر کلاس روم میں داخل ہوئے تو سب کا اوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ حاضری لگائی تو پاٹ دار آواز کے زیر و بم نے بالکل ہی مار ڈالا۔ بہت ٹھہر ٹھہر کر طلبہ و طالبات کا نام بولتے تھے۔ لڑکوں کے ساتھ ''مسٹر'' اور لڑکیوں کے ساتھ ''مس'' کا سابقہ لگاتے۔ کہیں کہیں ''مس عثمان غنی'' جیسی غلطی بھی ہو جاتی ...... جو، مجھے یقین ہے کہ دانستہ ہوتی تھی۔ طلبہ بے ساختہ ہنس پڑتے تو غزنوی صاحب تیوری چڑھا کر کمال سنجیدہ لہجے میں فرماتے: "There is nothing to be laughed at" زبان ہے، لغزش کر سکتی ہے۔''

یہ لہجہ صرف سنجیدہ ہی نہیں، سفاک بھی ہوتا تھا۔ اُن کی آواز کی گمک اور ایک ایک لفظ پر زور دینے کے انداز میں ایک طرح کی سوچی سمجھی یلغار ہوتی تھی۔ وہ لڑکوں کو اسی لیے ہنساتے تھے کہ فوراً ہی پٹخنی دے کر ٹھکانے لگا دیں۔ اُن کی کلاس میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئے شاگردوں کو آغاز میں ٹل ڈوز کر دینے کے قائل تھے۔ میرا نام پکارتے تو قواعد کے اعتبار سے ''ال'' کی غلطی کی نمایاں کرنے کے لیے خورشید الحسن میں ''دُل'' پر خاص زور دیا جاتا۔ پھر رک کر فرماتے: ''جب دارالماہی'' جاتا ہوں تو آپ یاد آ جاتے ہیں اور جب آپ کو دیکھتا ہوں تو دارالماہی یاد آ جاتا ہے۔ (اشارہ بھاٹی دروازے کے باہر ایک مشہور دکان کی طرف ہوتا جہاں تلی ہوئی مچھلی بکتی تھی اور اس کے نام میں ''ال'' کی وہی غلطی پائی جاتی تھی) اس پر کلاس میں ہنسی کا ہلکا سا ہمہمہ اُٹھتا تو وہی مکمل مخارج کے ساتھ There is nothing to be laughed at کا رولر چلتا اور یہ غنچے بن کھلے ہی مرجھا جاتے۔

طٰہٰ حسین کی خودنوشت، الایام کا حصہ اوّل ہمارے نصاب میں تھا اور اُس کی تدریس غزنوی صاحب فرماتے تھے۔ مجھ پر اُستاذی ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق صاحب نے کئی برس پہلے سے خاصی جان مار رکھی تھی اسی لیے میں عبارت کچھ ٹھیک پڑھ لیتا تھا۔ غزنوی صاحب کی نگہ انتخاب مجھ پر پڑ گئی اور عربی متن پڑھنے کا کام میرے ذمہ ہوا۔ حاضری لگانے کے بعد غزنوی صاحب اُسی بارعب زیر و بم کے ساتھ فرماتے: ''گاڑی کھینچیے'' اور میں فی الفور اس گاڑی میں جُت جاتا۔ طٰہٰ حسین کے اسلوب پر جابجا تبصرہ کرتے ہوئے ہمیں سمجھاتے کہ اس کے ہاں صِلات کا التزام دیکھو ''عن اَن'' کو کس خوبی سے برتا ہے۔ کہیں واضح کرتے کہ دیکھو نابینا ہونے کے باوجود اس نے رنگوں کا امتزاج کیسا دکھایا ہے، الفاظ کا در و بست کیا خوب رکھتا ہے۔ ''الایام'' کا ایک جملہ جو شدتِ غضب کے بیان میں تھا، ستائشی انداز میں اکثر دہراتے: "ثَارَ وَفَارَ وَأَرْغَى وَأَزْبَدَ" (اس جملے کا زور اردو میں نہیں دکھایا جا سکتا۔)

طٰہٰ حسین کے لیے کبھی کبھی اپنا مخصوص لفظ ''لُوٹی'' استعمال کرتے جس کا مفہوم تھا ''شریر''۔ مثلاً داد کے انداز میں فرماتے: ''بڑا لُوٹی ہے۔'' عثمان غنی جو ہم سے ایک سال سینئر تھے، اسلامیہ کالج ہی سے غزنوی صاحب کے شاگرد چلے آتے تھے۔ گاہے گاہے اُنہیں مخاطب کر کے ''تو بڑا لُوٹی ہے'' کہتے تو اس میں بلا کا پیار چھپا ہوا ہوتا۔ بہت اچھے موڈ میں ہنستے تو سامنے کا ایک دانت جو ترچھے رُخ سے تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا، بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ طٰہٰ حسین کے بارے میں نوٹس لکھواتے ہوئے Pierre Cachia کی کتاب کا حوالہ دیتے۔ طٰہٰ حسین کے گاؤں ''مغاغہ'' کو کھینچ کر پڑھتے اور

فرماتے کہ ہر سال جب یہی نام دہرانا پڑتا ہے تو ''ماغاغا'' کہتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں تے کر رہا ہوں۔ عربی کا یہ شعر بہت پسند تھا اور گا ہے گا ہے لہک لہک کر اسے پڑھا کرتے تھے:

خيالك فى عينى وذكرك فى فمى
ومثواك فى قلبى، فاين تغيب

''تیرا تصور میری نگاہ میں ہے، تیری یاد میری زبان پر، تیرا ٹھکانہ میرے دل میں ہے، سو تو مجھ سے کہاں اوجھل ہوسکتا ہے۔''

موقع ومحل کی مناسبت سے کبھی کبھی اردو کا کوئی شعر بھی اُسی پُرزور لہجے میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک بار جدید عربی شاعری پڑھاتے ہوئے اختر شیرانی کا یہ شعر بڑی سرشاری کے عالم میں پڑھا:

سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے

یاد پڑتا ہے کہ عدم کا یہ شعر بھی ایک روز کلاس میں پڑھا:

کبھی آپس میں ملتے ہیں جو دو بچھڑے ہوئے ساتھی
عدمؔ ہم بے سہاروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے

ایک بار میں اُن کے عتاب کا شکار بھی ہوا۔ جدید شاعری کا سبق تھا۔ غزنوی صاحب متن خود پڑھ رہے تھے۔ مجھے ایک جگہ کچھ خلش محسوس ہوئی جس کے بارے میں' میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے عثمان غنی سے کچھ سرگوشی کی۔ غزنوی صاحب کلاس کی یکسوئی میں ذرا سا خلل بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایک ناراض نگاہ مجھ پر ڈالی اور یہ شعر پڑھا:

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

میں نے ہڑبڑا کر اپنی خلش بیان کر دی۔ اس پر، مولانا عبدالسلام نیازی کے محاورے کے مطابق، غزنوی صاحب کا ناریل چٹخ گیا۔ شاید اُن کی تدریسی زندگی میں یہ پہلا موقع ہو کہ کسی نالائق شاگرد نے بھری کلاس میں اُن سے اختلاف کی جسارت کی۔ جبکہ میری اس حماقت کی بنیاد حاشا وکلا کسی شوخ چشمی پر ہرگز نہ تھی اور ایک اناڑی کی سادہ دلی کے سوا اس کا کوئی اور سبب نہ تھا۔ غزنوی صاحب ہمیشہ کرسی پر بیٹھ کر پڑھایا کرتے تھے۔ درمیان میں اُٹھنا یا تختہ سیاہ پر (جو اُس زمانے میں سیاہ ہی ہوا کرتا تھا) کچھ لکھنا اُن کا معمول نہ تھا۔ اُس روز برہمی کے عالم میں اُٹھے اور چاک لے کر تختۂ سیاہ پر اُس شعر کی تقطیع شروع کر دی۔ میری شامت کہ تقطیع میں بھی ایک جگہ دخل اندازی کر دی۔ بس پھر کیا تھا۔ چاک وہیں رکھ کر مڑے اور کمال غصے کے عالم میں فرمایا: ''جب تک کچھ لوگوں کے سر پر علامگی کا بھوت سوار ہے کیا ہو سکتا ہے؟'' میں سناٹے میں رہ گیا۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ وہ جلال کی کیفیت میں کلاس سے نکلے تو میں پیچھے پیچھے ہو

لیا۔ آئی ہوئی عقل بھی زائل ہو چکی تھی۔ محض بات کرنے کے لیے اُسی اناڑی پن سے کچھ کہنا چاہا۔ غزنوی صاحب اُس روز سیاہ سوٹ میں ملبوس تھے۔ چاک کے ذرات اُن کی انگلیوں پر جمے ہوئے تھے جن کی سفیدی دائیں طرف کی جیب پر بھی لگ گئی۔ میں نے بوکھلاہٹ کے عالم میں عرض کیا: ''سر کوٹ پر چاک لگ گیا ہے۔'' انہوں نے غضبناک لہجے میں فرمایا: ''آپ کو میری آلودہ دامنی کا گلہ ہے۔'' میری تو سٹی گم ہوگئی۔ اُس وقت تک وہ نیچے اُترنے کے لیے سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔ میں سٹپٹا کر سیڑھیاں اُترنے لگا تو وہ وہیں رُک کر کھڑے ہو گئے اور کہا: ''دیکھو کیسا گستاخ ہے۔ اُستاد کے آگے آگے چلتا ہے۔'' اب میں نے دُم دبا کر بھاگنے ہی میں عافیت دیکھی۔ ہاسٹل پہنچ کر بھی دیر تک حواس بحال نہ ہو سکے۔

مگر مشیت کے رنگ بھی نرالے ہیں۔ خارزار سے گلزار کا راستہ نکل آتا ہے۔ اس عتاب نے ہی مجھ پر عنایات کے دروازے کھولے۔ جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ غزنوی صاحب کا خصوصی التفات مجھے حاصل ہو گیا ہے۔ وہ اورینٹل کالج سے نکلنے کے لیے اردو بازار کی طرف کھلنے والا گیٹ استعمال کرتے تھے اور پیدل ہی اس سڑک پر چلتے ہوئے بائیں طرف کٹنے والی سڑک سے ہوتے ہوئے بھاٹی چوک کی طرف نکلتے اور وہاں سے شیش محل روڈ پر اپنے دولت کدے کی جانب روانہ ہو جاتے۔ مجھے کچھ دور ساتھ چلنے کی خاموش اجازت ہوگئی۔ جس کے دوران وہ بے تکلف گپ شپ بھی کر لیتے۔ وہ عربی پڑھنے والوں کے عمومی ٹھس رویے سے ناخوش تھے۔ کند ذہن لوگوں سے، جنہیں وہ ''کودن'' کہتے تھے، ان کی طبیعت نفور تھی۔ عتاب سے چند ہی روز بعد بڑی شفقت سے فرمایا: ''اگر کسی کے بالائی منزل میں روشنی دکھائی دے تو خوشی ہوتی ہے۔''

ایک روز باتیں کرتے کرتے وہ مجھے اپنے گھر تک ساتھ لے گئے اور میں نے بالائی منزل پر اُن کے کمرے میں دوپہر اُن کے ساتھ گزاری۔ راستے میں بہت سی باتیں سناتے رہے۔ ایک واقعہ جو مجھے یاد رہ گیا بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب سے متعلق تھا، جنہیں مولانا ابوالکلام آزاد کی عربی آمیز نثر پسند نہیں تھی، جبکہ غزنوی صاحب مولانا آزاد سے بہت متاثر تھے۔ فرمایا کہ ریل کے ایک سفر میں مجھے مولوی صاحب کی ہم سفری کا اتفاق ہوا۔ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی نگارشات پر ان کی رائے معلوم کی تو کچھ موافق نہ پایا۔ میں نے پوچھا: مولانا حسرت موہانی کی زبان و بیان کے بارے میں کیا خیال ہے۔ انہوں نے کہا: سبحان اللہ کیا کہنے ہیں۔ میں نے کہا: تو مولانا حسرت تو یہ فرماتے ہیں:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرتؔ میں بھی مزا نہ رہا

غزنوی صاحب کے بقول شعر سن کر بابائے اُردو نے ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح قہقہہ لگایا۔

شیش محل روڈ پر ان کے آبائی مکان کے نچلے حصے میں مدرسہ تھا۔ دروازے سے داخل ہو کر جب بائیں ہاتھ سیڑھیاں چڑھنے لگے تو مدرسے کے دالان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''یہاں ایک سے ایک کودن مولوی

ہے" پھر گویا ہوئے کہ اپنے زمانۂ جاہلیت میں ایک بار میں انہی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا کہ اندر سے ایک مولوی لپکا ہوا آیا اور کہنے لگا: "غزنوی صاحب! آپ کی پتلون کے پائینچے ٹخنوں سے نیچے تک آرہے ہیں۔" میں نے کہا: "تو پھر؟" اس نے کہا: "یہ خلافِ شرع ہے" میں نے کہا: "کوئی دلیل؟" اُس نے إلى الكعبين (ٹخنوں تک) والی روایت پڑھی۔ میں نے کہا: "إلى الكعبين" میں ٹخنے داخل ہیں یا خارج؟ اُس نے کہا: "خارج" میں نے کہا: "وضو کی آیت ﴿فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ﴾ (دھولیا کرو اپنے چہرے اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک) میں کہنیاں داخل ہیں یا خارج؟ اُس نے کہا: "داخل" میں نے کہا: "کبھی خارج کرتے ہو کبھی داخل کرتے ہو چلو بھاگ جاؤ۔" وہ گھبرا کر بھاگ گیا۔ اُوپر کمرے میں جا کر مجھے احساس ہوا کہ بات تو مولوی کی درست تھی اس لیے اُسے مخمصے سے نکالنا بھی چاہیے۔ چنانچہ اُسے پھر بلوایا اور پوچھا: "روزے کے بارے میں آیت ﴿فَأَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴾ (پھر روزے کو رات تک پورا کرو) میں داخل ہے یا خارج؟" اس نے کہا: "خارج" میں نے کہا: "تو یہ دلیل اُس وقت کیوں نہیں دی؟ چلو بھاگ جاؤ۔ سو وہ غریب پھر بھاگ گیا۔

ایک دُھندلی سی یاد اور اُبھر رہی ہے مگر اُس کا سیاق وسباق یاد نہیں آتا۔ عرصہ بھی تو ساٹھ سال کا ہو چکا ہے۔ یاد یوں آتا ہے کہ مری کے ڈاک خانہ چوک میں ایک بار اُن سے سرسری سی ملاقات ہوئی تھی جہاں وہ ایک ہوٹل میں قیام فرما تھے، جو خاصی چڑھائی پر واقع تھا۔ سڑک پر کھڑے ہوئے اس بلندی کی طرف اشارہ کر کے انہوں نے فرمایا: "مجھے وہ جگہ پسند ہے۔ خدا وہاں سے نزدیک تر ہے۔"

ایم اے کا سال اوّل ختم ہوا۔ ہم لوگ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد دوبارہ یونیورسٹی آئے تو یہ خبر گرم پائی کہ غزنوی صاحب نے داڑھی رکھ لی ہے۔ اشتیاق تو ہم سب کو تھا کہ انہیں اس نئی وضع میں دیکھیں مگر ہمارے ہم جماعت حافظ محمد عبداللہ صاحب کو، جو خود ایک نرالی شخصیت کے مالک ہیں، تابِ انتظار نہ تھی۔ حافظ صاحب بہت تیز چلتے تھے۔ انہوں نے غزنوی صاحب کے پیریڈ کا انتظار کھینچے بغیر ہی خود کو مہمیز کیا اور برق رفتاری سے اُڑتے ہوئے اسلامیہ کالج سول لائنز پہنچ گئے۔ حافظ صاحب کو باریش لوگ بہت پسند تھے اور ان کی اپنی ریش مبارک یک مشت کی قید سے آزاد تھی۔ واپسی پر اُن کی چال ہم نے کچھ دھیمی دھیمی پائی۔ اشتیاق سے پوچھا: "دیکھ آئے غزنوی صاحب کی داڑھی؟" انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا: "ہاں دیکھ لی۔ یہ بھی کوئی داڑھی ہے۔ ہماری داڑھیوں کے آگے تو بس داڑھی کا بچہ ہے۔" اس پر خوب قہقہے پڑے۔ چند روز بعد غزنوی صاحب تشریف لائے تو ہم نے دیکھا کہ سوٹ بوٹ اُسی طرح نک سک سے درست ہے، چال میں طنطنہ بھی وہی ہے۔ تاہم سُرخ وسفید عارض پر سبزۂ خط کی طرح ایک سیاہ حاشیے کا اضافہ ہو چکا ہے۔ میں نے حافظ عبداللہ صاحب کا تبصرہ اُنہیں سنایا تو اپنے مخصوص انداز میں فرمایا: "ہم نے اپنی Asthetic Sense کو اُلٹی چھری سے ذبح کیا، آئینہ دیکھنا ترک کیا مگر ان مولویوں کی تشفی نہ ہو سکی۔"

ایم۔ اے عربی کے دو سال دیکھتے دیکھتے ہوا ہو گئے۔ میں جلد ہی لیکچرار کی حیثیت سے بہاولپور چلا گیا جہاں

غزنوی صاحب بہت بعد کو آئے۔ بہاولپور میں ایک سال گزار کر میں سرگودھا چلا آیا جہاں میری تدریسی زندگی کے بائیس برس گزرے۔ اس اثناء میں غزنوی صاحب پہلے انجینئرنگ یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور پھر جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے وائس چانسلر ہو کر بہاولپور تشریف لے گئے۔ اُن کا ذکر گاہے گاہے سننے میں آتا رہا۔ 1965ء کے لگ بھگ ریڈیو پاکستان کی وساطت سے واقعۂ کربلا کے موضوع پر اُن کا خطاب اُسی مانوس آواز اور پُرزور زیر و بم کے ساتھ سُنا اور ایامِ رفتہ کی یاد تازہ ہوئی۔ ان کا خطاب ان کے علم و فضل، لفظوں کے مؤثر انتخاب، تلفظ کی صحت، روایات کے استناد اور استدلال کی قوت کا آئینہ دار تھا۔ مگر پھر کبھی اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔ یہ سننے میں آتا رہا کہ اب ان کا میلانِ طبیعت تصوف کی جانب ہو گیا ہے اور وعظ و اصلاح کی محفلوں میں اُن کی عالمانہ اور دردمندانہ گفتگو سننے والوں کے دلوں میں گداز پیدا ہوتا ہے۔ مجھے اس پر تعجب نہیں ہوا کیونکہ اس باطنی سفر کا آغاز اُسی زمانے میں ہوا جس کی یادوں میں مَیں نے آج قارئین کو شریک کیا ہے۔ ایم اے کے سال اوّل کے دوران ان کے ہاں خودی کا جوسرِ جوش تھا سالِ دوم کی آمد کے ساتھ ہی بے خودی کی طرف بڑھتا دکھائی دینے لگا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز انہوں نے مجھ سے فرمایا: ''اللہ نے مجھے بیٹا عطا کیا ہے اور میں نے اُس کا نام جنید رکھا ہے۔'' میرا خیال ہے کہ اگر چند برس پیشتر وہ اس نعمت سے سرفراز ہوئے ہوتے تو عین ممکن ہے نام کچھ اور ہوتا مگر اُس وقت تک اُن کی طبیعت نے تصوف اور اہلِ تصوف سے وہ نسبت پیدا کر لی تھی کہ انہوں نے بیٹے کے لیے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا نام منتخب کیا۔

اوائل اپریل 1976ء میں یہ خبرِ وحشت سننے میں آئی کہ غزنوی صاحب جو ورلڈ آف اسلام فیسٹیول میں شرکت کے لیے پاکستانی وفد میں لندن تشریف لے گئے تھے، سڑک عبور کرتے ہوئے ایک تیز رفتار بس کی جھپٹ میں آ گئے اور کچھ عرصہ وہیں ہسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے بعد 24 اپریل کو انتقال کر گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

اس سانحے کی تفصیلات استادِ گرامی ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ زمان صاحب اپنے مضمون میں محفوظ کر چکے ہیں۔ 2005ء میں جب میں پہلی بار لندن گیا اور وہاں عبدالرحمٰن بزمی صاحب سے ملاقات رہی تو انہوں نے یہ ذکر کیا کہ غزنوی صاحب کے آخری ایام میں وہ باقاعدگی سے ان کے پاس حاضری دیتے رہے۔ غزنوی صاحب نے گھر سے دور، ابتلاء کا زمانہ صبر و رضا کے ساتھ گزارا جو اہلِ ایمان کا خاصہ ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

غزنوی صاحب میرے زمانہ طالب علمی میں مجھ پر مہربان ہوئے اور شاید اسی شفقتِ بزرگانہ کا تسلسل ہے کہ اب جنید اور حماد میرے ساتھ محبت و مودّت کا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ انہیں شاد و آباد رکھے۔[1]

---

[1] ماہنامہ الحمرا، لاہور [سالنامہ] (جنوری 2022ء)

شہید راہِ حق .... پروفیسر سیّد ابوبکر غزنوی

تحریر: پروفیسر عبدالحفیظ صاحب

آج دو سال ہوئے ہیں، 24 اپریل 1976ء کی سہ پہر آسمانِ علم وادب کا درخشاں آفتاب لندن کے افق میں غروب ہوگیا۔ خاندانِ غزنویہ کے مایہ ناز علمی ورثہ کے حامل پروفیسر سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ، 3 اپریل 1976ء کو اسلامک فیسٹیول میں شرکت کے لئے گورنمنٹ کے وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے لندن تشریف لے گئے تھے۔ انہیں وہاں فیسٹیول میں ایک مقالہ بھی پڑھنا تھا مگر 4 اپریل کی شام کو کار کے ایک حادثے نے انہیں مقالہ پڑھنے کی مہلت نہ دی۔ 20 دن برابر ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد اس جہانِ آب وگل سے مونہہ موڑ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

سیّد صاحب رحمہ اللہ راہِ حق کے شہید تھے۔ توحید وسنّت کی اشاعت اور دینِ اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ ان کی صبحیں، ان کی شامیں اسی درد سے لبریز ہوتیں۔ کوئی وقت، کوئی گھڑی، کوئی موقع ایسا نہ تھا جس میں وہ اس آگ میں نہ جلتے تھے۔ وہ خود بھی جلتے تھے اور اپنے احباب کو بھی اسی آگ میں جلاتے تھے۔ ان کی زندگی صحیح معنوں میں علامہ اقبال رحمہ اللہ کے شعر کی مصداق تھی ؎

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

ان کے بستر کے گرد ہر وقت کتابوں کا ایک انبار ہوتا تھا۔ جب بھی ان کے پاس جانا ہوتا، کتابوں کے مطالعے میں مصروف پایا۔ خداداد ذہانت اور محنت شاقہ سے انہوں نے قرآن وحدیث کو گویا گھول کر پی لیا تھا، وہ نہ صرف صاحبِ علم تھے بلکہ صاحبِ عمل بھی تھے۔ فرماتے تھے:

''نسبتِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاصا ہے کہ وہ باطل سے ٹکرا جاتی ہے۔''

اس لحاظ سے سیّد صاحب رحمہ اللہ ہر دم باطل قوتوں کے خلاف سینہ سپر رہے۔

ریڈیو، ٹیلی ویژن پر آپ کی پُرمغز علمی اور مؤثر تقاریر نے اہل پاکستان کے دل جیت لئے تھے۔ کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی زبان اردو مولانا ابوالکلام آزاد کی معنوی شاگردی میں اس کی نوک پلک سنوار کر یوں خطاب فرماتے گویا جو کچھ سامعین سننا چاہتے ہیں اور جس قدر سننا چاہتے ہیں اس سے ایک لفظ بھی زائد نہ بولتے۔ تحریر میں اور گفتگو میں ایجاز اور

اعجاز کی ایسی چاشنی ہوتی تھی کہ سامعین دم بخود بیٹھے رہتے تھے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تحریر کا ایک ایک لفظ ٹکسال کے سکوں کی مانند زبان سے کھن کرتا ہوا نکلتا تھا۔ اندازِ بیان اس قدر دلنشین اور اسلوبِ تحریر اس قدر دلچسپ ہوتا کہ سامعین داد کے ڈونگرے برساتے۔ تقریر کو کبھی اس قدر لمبا نہ کرتے کہ سامعین میں اکتاہٹ کے آثار بھی نمایاں ہوسکیں بلکہ مختصر وقت میں مرتب اور مربوط انداز میں وہ سب کچھ کہہ ڈالتے جس کے لئے لوگوں کو گھنٹوں درکار ہوتے ہیں۔ اسلامی نظام کو نافذ کرنے کے لئے نہ جانے انہوں نے اپنا کس قدر زورِ بیاں صرف کیا ''شامِ ہمدرد'' کی تقاریب میں جلے دل کے پھپولے پھوڑیں۔ کالجوں، یونیورسٹیوں، کانفرنسوں، عام جلسوں، دینی اجتماعات غرضیکہ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے ان کا واسطہ تھا اور ہر کہیں اسلامی نظام کے نفاذ کی انتہائی شد ومد سے تبلیغ کرتے تھے۔ ''سقوطِ مشرقی پاکستان'' پر میں نے انہیں آنسو بہاتے دیکھا۔ جس خفیہ ہاتھ نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی سازش کی، اسے اچھی طرح بے نقاب کرتے رہے۔ مجھے وہ دن آج تک نہیں بھولا جب انہیں سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے طلباء کی طرف سے اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔ لوگ سراسیمہ تھے، دل اس حادثے پر انتہائی غمگین، کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ مملکتِ خداداد پاکستان کی سالمیت پر یہ آنچ کیوں آئی۔ میرا پختہ یقین تھا کہ باقی سب کچھ تو ہوسکتا ہے مگر مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔ اِس لئے کہ پاکستان کی بنیاد ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' کے مقدس کلمے پر رکھی گئی تھی۔ لاکھوں انسانوں نے اپنا خون دے کر اس کی آبیاری کی تھی۔ کتنی عصمتیں لٹیں، کتنے معصوم بچے اس کی بھینٹ چڑھے، کس قدر سہاگ لٹے، کتنی ماؤں کی گودیں خالی ہوئیں، کتنے بچے یتیم ہوئے۔ اس لئے دل یہ کہتا تھا کہ اس کی سالمیت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی..... مگر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب کالج ہال کی سٹیج پر کھڑے ہوئے تو انہوں نے ''سقوطِ مشرقی پاکستان'' کو قوم کی بداعمالیوں پر اللّٰہ کا عذاب قرار دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہم تیس سال سے اللّٰہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے منافقت کرتے چلے آرہے ہیں۔ نام اسلام کا لیتے ہیں مگر اسلام کو اس ملک میں نافذ کرنے پر تیار نہیں لہٰذا اللّٰہ تعالیٰ نے ہماری اس منافقت اور مداہنت کی ہمیں یہ سزا دی ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ تیر ونشتر کی طرح دلوں میں پیوست ہوگیا۔ ہال میں سکوتِ مرگ طاری تھا۔ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی آواز لحہ بہ لحہ گونج رہی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ پچیس برس سے ہم پاکستان میں منافقت کی زندگی گزار رہے ہیں.....

ہم نے دنیا جہاں کی ناپاکیاں..... ارتکازِ دولت، علاقائیت پرستی، رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی، اقربا نوازی، کنبہ پروری، جوا، شراب، سود..... اس خطہ زمین پر اکٹھی کیں اور اس کا نام پاکستان رکھ دیا۔ کسی بت کدے کی دیواروں پر حرم کا لفظ لکھ کندہ کر دینے سے کوئی بت کدہ بیت اللّٰہ نہیں بن سکتا..... عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی غرض سے

حکومت یہ اعلان کرتی رہی ہے کہ ہمارا آئین قرآن وسنت کے منافی نہیں ہوگا۔ فقرے کے تیور دیکھئے کس قدر منافقانہ ہیں، اگر جی میں کھوٹ نہ ہوتا تو اعلان کے الفاظ یوں ہوتے:

''ہمارا آئین کتاب وسنّت کے عین مطابق ہوگا۔''

یہ الفاظ اس دور میں کہے گئے جب لوگوں کی زبانیں گنگ تھیں۔ بھٹو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن کر کرسی پر براجمان تھا...... جرأت اور بے باکی کا یہ شرف ان کی فطرت کا حصہ تھا۔ اپنے اسلاف حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ، اپنے والد مولانا محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے اس ورثہ کا دافر حصہ ملا تھا۔ انہوں نے کسی رورعائت اور کسی خوف کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سرکاری ذرائع ابلاغ سے ہونے والے اس پراپیگنڈا کی قلعی کھولی کہ ''غزوۂ احد ہوا ہے، یہ غزوۂ حنین ہوا ہے۔'' انہوں نے فرمایا: ''مشرقی پاکستان کا سقوط آزمائش نہیں عذاب ہے۔ یاد رکھیئے کہ انبیاء (علیہم السلام) اور ان کے پیروؤں کی ہزاروں برس کی تاریخ اس بات کو جھٹلاتی ہے کہ اللہ نے اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو کبھی یوں بین الاقوامی طور پر ذلیل کیا ہو کہ بیک وقت پوری کائنات کے ذرائع ابلاغ سے اس قوم کی ذلت ورسوائی کا اعلان کیا گیا ہے۔ آدھا ملک چھن جائے اور 90 ہزار افراد کافروں اور بت پرستوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیں اور ہم کہیں یہ غزوۂ احد ہوا ہے۔

یہ نئی پود، یہ نوجوان نسل، یہ غریب طالب علم، انہوں نے اپنے حکمرانوں کی زبان سے اسلام کا نام سنا ہے۔ انہوں نے اسلام کا نام یحییٰ خاں کی زبان سے سنا جو ملک وملت کو ذلت اور ہلاکت کے غار میں دھکیلنے کے بعد بھی اپنی آخری تقریر میں اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ کہہ رہا تھا...... وہ جو اس وقت بھی نشے میں دھت تھا اور اس کی زبان ہکلا رہی تھی۔''

سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آواز بھرا گئی۔ صحافیوں کی اس دیدہ دلیری پر کہ ''سقوط مشرقی پاکستان'' اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد' کے مصداق ہے مگر سیّد صاحب نے اسے سانحہ کربلا سے تشبیہ دینے پر صحافیوں سے دوٹوک کہا:

''تم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہو جس کے سامعہ سے اُس کی پیاسی اور بلکتی ہوئی بچیوں کی آوازیں ٹکرا رہی تھیں مگر اس نے ہتھیار نہ ڈالے، وہ جس نے قاسم اور علی اکبر کے لاشے دیکھے مگر ہتھیار نہ ڈالے، وہ جس نے اپنے پورے گھرانے کو خاک وخون میں تڑپتے ہوئے دیکھا، وہ عزم وہمت کا پیکر، وہ صبر واستقامت کا ہمالہ، وہ عزت وناموس کا سراپا...... جو دشمنوں کے نرغے میں تنہا رہ گیا تھا مگر اس کے عزم اور ہمت کا دامن بے داغ رہا۔ ہاں وہ بھی دشمنوں کے نرغے میں آگئے تھے، وہ دشمنوں کی صفوں پر ٹوٹ پڑے اور بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ نوے ہزار تندرست وتوانا آدمی ہتھیار ڈالیں اور کہا جائے کہ حادثۂ کربلا ہوا ہے۔ خدارا اہل بیت اور حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کی توہین نہ کرو۔ غزوہ اُحد اور حنین کا ذکر بے محل ہے۔ عاد وثمود کی قوموں کے عذاب کا ذکر کیوں نہیں کرتے جیسے ایک اناڑی وکیل تعزیرات کی غلط دفعہ لگاتا ہے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن پر آنے والے علماء نے بے محل آیتیں پڑھیں۔''

یہ عوامی دور کی تقریر کے اقتباس ہیں۔ ظلم اور اندھیر گردی کے اس دور میں بھی سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ باطل کے خلاف تیغ براں نظر آتے تھے۔ کمیونزم، سوشلزم اور سرمایہ داری پر تحریر وتقریر میں انہوں نے ہمیشہ کاری ضربیں لگائیں۔ اسلام کے خودساختہ دعویداروں کی قلعی کھولنے میں بھی انہیں کبھی باک نہ تھا۔

نیم ملّاں بقول سیّد صاحب Half Educated جب مزدوروں کو اللہ کا نام لینے کی تلقین کرتے اور ان کے معاشی مسائل کا حل تلاش نہ کرتے تو سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے ان پڑھ علماء اور سیاسی لیڈروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''عین اس وقت جب کہ غریب مزدور کے پیٹ میں بھوک کی قراقر اُٹھ رہا تھا ہم نے اس سے کہا کہ دیکھو تمہاری زندگی کا مقصد پیٹ نہیں دل ہے۔ وہ بھوکا تھا۔ وہ دل کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا تھا، عین اُس وقت جب کہ بھوک سے پیچ وتاب کھارہا تھا ہم خدا کی محبت کے گیت اس کو سنانے لگے۔ وہ بھوک سے نڈھال تھا۔ وہ محبت کے گیتوں سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ہم سے روٹی مانگ رہا تھا۔ ہم اسے محبت کے گیت سناتے رہے۔ نتیجہ کیا ہوا کہ وہ سرخ جھنڈیاں لے کر چوراہوں میں ناچنے لگا۔ وہ مذہب سے برگشتہ ہوا، وہ علماء سے برگشتہ ہوا۔ وہ سرخ جھنڈیاں لے کر چوراہوں میں ناچ رہا تھا۔ وہاں وہ غیروں سے اپنی وابستگی کا اعلان کررہا تھا۔ میں نے جو اُسے دیکھا تو میرے ذہن کو کوئی جھٹکا نہ لگا اس لئے کہ میرے آقا (ﷺ) نے یہ کہا تھا: کاد الفقر أن یکون کفرا[1] مفلسی انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔''

پیپلز پارٹی نے جب سوشلزم ہماری معیشت ہے، کا نعرہ لگایا اور اسلامی سوشلزم کی اصطلاح ایجاد کی تو سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''اسلام میں گردشِ دولت'' کے موضوع پر ایک مقالہ قلمبند کیا اس میں سوشلزم، کمیونزم اور سرمایہ داری کا اسلامی نظامِ اقتصاد سے موازنہ کرکے ایسے باطل نظریات کی نفی کی۔ انہوں نے فرمایا:

''پس آپ یقین کیجئے کہ اگر ملک میں سوشلزم آتا ہے تو ہماری روحانی قدروں کا برباد ہونا یقینی امر ہے۔ اگر سوشلزم اس ملک میں آتا ہے تو ہماری اخلاقی اور روحانی قدروں کا یقیناً وہی حشر ہوگا جو سمرقند وبخارا میں ہوا جو مشرقِ وسطیٰ میں ہوا۔ جب کوئی شخص کہتا ہے کہ اسلام اور اشتراکیت کو یکجا کردیا تو وہ دونوں کے مفہوم سے ناواقف ہے یا وہ لوگوں کی آنکھوں میں قصداً اور ارادتاً دھول جھونک رہا ہے۔''

وہ دور جس کی خاطر وہ دن رات جلتے تھے۔ اسلامی نظام کا صحیح نفاذ تھا۔ منافقت کو چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے بنائے ہوئے نظام ہی کے نفاذ سے انسانیت کے سب مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ انہوں نے دل کی گہرائیوں سے کہا: ساتھیو! ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم ملی انفرادیت کھو بیٹھے ہیں، ہم کبھی امریکہ اور کبھی روس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کبھی چین کو دیکھ کر ہماری رال ٹپکتی ہے۔ ہر دور کے لات وعزیٰ ہوتے ہیں۔ ﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ

---

[1] السلسلة الضعيفة، رقم (4080)

وَالْعُزّٰی﴾ اور یہ چین ﴿وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰی﴾ وقت کا سب سے عظیم انسان اور سب سے عظیم مسلمان میری نظر میں وہ ہوگا جو ان تازہ خداؤں کی ذہنی غلامی سے انسانیت کو رہا کر کے اور اسلام کے اقتصادی اور سیاسی نظام کو ایک مکمل اور باضابطہ صورت میں پورے یقین اور اذعان کے ساتھ کائنات کے سامنے پیش کرے اور اس کائنات میں اس نظام کو نافذ کرنے کے لئے ایسا مؤثر اور گرجدار آوازہ کرے کہ یہ کائنات اس آواز سے گونج اٹھے۔

مگر آہ! آج جب کہ اسلامی نظام کے نفاذ کی عملی صورت کے آثار پاکستان میں ہویدا ہیں۔ سید صاحب ہم میں نہیں۔ کاش وہ اپنی زندگی میں یہ منظر دیکھ سکتے مگر انہوں نے راہِ حق میں جان دے کر ثابت کر دیا۔

ہر اک روش تھی خاک بیاباں کی طرح
گلشن کو رنگ دے گیا اک پھول کا لہو[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (12 مئی 1978ء)

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

میرے استاد' میرے مرشد

تحریر: ڈاکٹر خالد علوی، برمنگھم

سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضر ہوئے کئی برس ہوئے ہیں لیکن ان کی یاد کسی نہ کسی بہانے تازہ رہتی ہے۔ احساس کی شدت نے سید مرحوم سے تعلق کے حوالے سے یہ سطور سپرد قلم کرنے پر آمادہ کیا۔ میں سید کا شاگرد ہوں، ان سے تین سال باقاعدہ پڑھا ہے، اس لئے ایک شاگرد کا یہ منصب نہیں کہ وہ اپنے استاد کے علمی مقام کے بارے میں گفتگو کرے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ وہ بلند پایہ مقام کے حامل تھے اور اپنے ہمعصروں میں ہر اعتبار سے ممتاز تھے۔ فلسفہ اور عربی زبان و ادب تو ان کے خصوصی موضوعات تھے لیکن دوسرے علوم میں بھی انہیں دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے طور پر وقت کے ممتاز محدثین و علماء سے حدیث و نحو کے بنیادی مصادر کے سلسلہ میں خصوصی درس کا انتظام کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اخاذ طبیعت اور بے پناہ ذہانت سے فیض یاب کیا تھا اور اس پر مستزاد ان کے مزاج کی لطافت اور فکر کی گہرائی تھی جو اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت تھی۔ اسلام کے بنیادی مآخذ پر گہری نظر کے ساتھ انہیں عصر حاضر کے افکار و مسائل اور امت مسلمہ کے حالات کا گہرا ادراک حاصل تھا۔ عصری مسائل پر ان کی آراء مجتہدانہ تھیں اور کتاب و سنت کے دائرے میں رہ کر انہوں نے معاشی و معاشرتی مسائل کے بارے میں فکر انگیز تحریریں وتقریریں فرمائیں۔

سید صاحب رحمہ اللہ سے تعارف:

سید صاحب رحمہ اللہ کے جاہ وجلال کی وجہ سے کسی طالب علم کو ان سے قریبی تعلق قائم کرنے کا یارا نہیں ہوتا تھا، لیکن اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور کے پورے ماحول پر ان کی شخصیت کی تاثیر موجود تھی۔ میں اسی کالج میں بی اے کا طالب علم تھا اور معاشیات کے ساتھ عربی لازمی مضمون کی حیثیت سے منتخب کیا، یوں اس کلاس کے ذریعہ ان سے تعارف ہوا۔ ان کی کلاس ادب اور شگفتگی کا مرقع ہوتی تھی۔ ایک حسین وجمیل انسان اپنے خصوصی انداز سے گفتگو کرتا تو اسے سنتے رہنے کو جی کرتا، بات اتنی مکمل ہوتی کہ سوال کی نوبت ہی نہ آتی۔ ان کی ذات اور ان کے اندازِ گفتگو کا اتنا گہرا تعلق تھا کہ سننے والا ان کے سحر سے نکل نہیں پاتا تھا۔ بقول شاعر:

پھول جھڑتے ہیں دم نطق لبوں سے تیرے
تلخ گفتار ہیں ہم ہونٹ سیئے بیٹھے ہیں

خوش باش، شگفتہ مزاج اور دلنواز شخصیت کے مالک اس استاد نے پوری کلاس کو مسحور کر رکھا تھا۔ سال اول دنوں میں ہی گزر گیا اور ہم نصاب اور غیر نصاب کے حوالے سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں اور اساتذہ و طلبہ اپنی اپنی راہوں پر چل دیئے۔ چھٹیوں کے دوران جن ساتھیوں سے رابطہ ہوا سب کو مسحور اور سب کو اسی زلف کا اسیر پایا۔ ہم لوگ جب چھٹیاں گزار کر آئے اور عربی کی کلاس میں گئے تو وہاں ایک مختلف شخصیت سے آمنا سامنا ہوا۔ سید رحمہ اللہ میں ایک تبدیلی محسوس کی، داڑھی مونچھ صاف، ولایتی سوٹ میں ملبوس، پائپ سلگائے کلاس میں ادبی لطائف اور رومانی اشعار مزے لے لے کر سنانے والی ایک جدت پسند شخصیت کی جگہ مردانہ وجاہت کا حسین نمونہ جس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی سجی تھی اور لہجے میں وہ شوخی نہ تھی جس کا ہمیں تجربہ ہوا تھا۔ طبیعت میں ایک ٹھہراؤ تھا جس پر اداسی کا گمان ہوتا۔ ہم نے پہلی مرتبہ کلاس میں ایک استاد کی آنکھوں کو پرنم دیکھا۔ میں چونکہ کالج کا فعال طالب علم تھا اور ان کے علم میں تھا کہ میں اونچی مسجد بھاٹی دروازہ میں خطبہ جمعہ دیتا تھا۔ اس لئے مجھے خصوصی طور پر بلایا کہ تم سے بات کرنی ہے۔ میرے لئے یہ خوشگوار تجربہ تھا۔ یہ گفتگو جو ابھی تک میرے ذہن میں تازہ ہے، تصوف، ذکر الٰہی، روحانیت کے متعلق تھی۔ میرا مذہبی تجربہ مختلف نوعیت کا تھا۔ کئی فکری مراحل سے گزر کر ایک مقام پر پہنچا تھا۔ میں بریلویت کے رسوماتی اور خوش عقیدگی کے ماحول سے شدید قسم کی دیوبندیت کی طرف آیا تھا اور تنقید و تفتیش کے خارزار سے گزر کر سید مودودی رحمہ اللہ کی فکری تعبیر پر آ کر رکا تھا۔ مجھ پر شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے تجدیدی اور اصلاحی افکار کا اثر بھی تھا۔ گو ان دونوں بزرگوں کے بارے میں میرے تحفظات تھے۔ میرے لئے تصوف کی بات اجنبی تو نہ تھی لیکن غیر متعلق ضرور تھی۔ میں نے تصوف کے بارے میں اپنے تحفظات کا کھل کر ذکر کیا اور سید صاحب رحمہ اللہ نے ایک ایک اشکال کا جواب دیا۔ اہل حدیثوں میں خاندانِ غزنویہ نفیس مزاج اور روحانی تاثیر رکھنے والا خاندان ہے۔ مجھ سے انہوں نے سید عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ اور دوسرے بزرگوں کے احوال کا جس طرح حوالہ دیا اس کی جھلکیاں ان کی کتاب میں دیکھی جاسکتی ہیں جو انہوں نے اپنے والد مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ پر لکھی ہے۔ ہماری گفتگو میں یہ طے پایا کہ تصوف کا چونکہ تعلق قلب و روح کے تجربے سے ہے، اسے علمی و فلسفی استدلال سے سمجھنا ایک مشکل کام ہے۔ اس بحث کے نتیجے میں کلاس کے کچھ طالب علم اولین مجالس ذکر میں حاضر ہونا شروع ہوئے۔ 1960ء سے 1975ء تک جب میں پی ایچ ڈی کے لئے برطانیہ آیا یہ وابستگی قائم رہی۔ مجلس ذکر کا ہفتہ وار روحانی اجتماع تھا جس نے آہستہ آہستہ شہر کی فضا کو معطر کرنا شروع کیا۔

مجلسِ ذکر:

مجھے بلاشبہ مجلس ذکر کے اولین شرکاء میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے بلکہ سید صاحب رحمہ اللہ کی موجودگی میں ان کے شیخ رحمہ اللہ سے مستفیض ہونے کا موقعہ بھی ملا۔ میں ان کے نالائق شاگردوں میں سے ہوں۔ بارہا اس مجلس سے غائب

ہوا اور بار بار ان کی شفقتوں کی تاثیر نے واپس کھینچا۔ مجلس ذکر یقیناً مجلس نور تھی۔ ذاتی اسباق اور توجہ کے علاوہ ایک مجموعی روحانی ماحول تھا۔ مجھے یہ بھی شرف حاصل ہے کہ میں نے اس مجلس میں عارفانہ کلام پڑھا۔ اگرچہ سبقت چوہدری ریاض اور غلام مرتضیٰ کو حاصل ہے۔ اس مجلس نے طبیعت میں کو سوز وگداز پیدا کیا اور مزاج کو لطافت کے جن پہلوؤں سے آشنا کیا، انہیں سرمایہ حیات سمجھتا ہوں۔ مجھے آج بھی ان اشعار پر وارد کیفیات کی لذت کا احساس ہے جو اس مجلس میں اکثر پڑھے جاتے۔ پنجابی کے یہ اشعار سید رحمہ اللہ کی توجہ سے خاص تاثیر پیدا کرتے۔

اللہ اللہ نال دل دے کردی رہو ویہلی نہ بوہ

رات دن ایہہ خالی بھانڈے بھردی رہو ویہلی نہ بوہ

جے توں کھیڈیں عشق بازی جوۓ بازاں وانگوں کھیڈ

ہار تے پئی ہار آوے ہردی رہو ویہلی نہ بوہ

ذاتی تعلقات کے دو واقعے:

سید صاحب رحمہ اللہ سے خصوصی تعلق کی بنا پر ان کی شفقتیں میسر رہیں لیکن دو واقعات ایسے ہیں جن کی وجہ سے میں ان کی شخصیت کی تاثیر اب بھی محسوس کرتا ہوں۔ ایم اے عربی میں وہ ہمیں جدید عربی ادب پڑھاتے تھے۔ میں اس دوران میں سخت بیمار ہو گیا اور کئی دن پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج نہ جا سکا اور یوں مجلس ذکر میں بھی حاضر نہ ہو سکا۔ میں ان دنوں بھاٹی دروازہ میں ایک بوسیدہ مکان میں رہائش پذیر تھا۔ ایک روز دروازہ پر دستک ہوئی تو پتہ چلا کہ سید صاحب رحمہ اللہ تشریف لائے ہیں۔ ان کے ساتھ میرے ہم جماعت اور عزیز دوست چوہدری عبدالحفیظ بھی تھے۔ میرے پاس اس وقت بھی اور اب بھی الفاظ نہیں ہیں کہ میں ان لمحات کی کیفیت کو بیان کر سکوں۔ سید صاحب رحمہ اللہ پاس بیٹھے، دعا دی، شہد کا تحفہ عنایت کیا۔ میں نے اس بوتل کو بڑا عرصہ محفوظ رکھا جو بالآخر رہائشوں کی تبدیلی کی نذر ہوئی۔ اب بھی تصور کرتا ہوں تو دعائیہ کلمات کی نغمگی محسوس کرتا ہوں۔

دوسرا واقعہ یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران کا ہے۔ میں شعبہ اسلامیات میں لیکچرار تھا اور اونچی مسجد بھاٹی دروازہ میں خطبہ جمعہ دیتا تھا۔ میں اعتکاف میں تھا کہ سید صاحب رحمہ اللہ کا پیغام آیا کہ تقویۃ الاسلام میں قیام اللیل کا پروگرام ہے اور تم آکر قرآن سناؤ۔ اعتکاف کی بات ہوئی تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے حوالے سے جواز کا فتویٰ ملا۔ یوں مجھے سعادت حاصل ہوئی کہ میں دو رکعت نفل کی امامت کروں اور اپنے شیخ کی توجہ میں تلاوت کروں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس جماعت میں مولانا سید داؤد غزنوی بھی موجود تھے۔ ہم مجلس ذکر میں توجہ کی تاثیر سے آشنا تھے لیکن نماز کے دوران میں تاثیر کا تجربہ انوکھا تھا۔

سید صاحب کی خطابت:

اللہ تعالیٰ نے سید صاحب رحمہ اللہ کو جہاں علم کا حظِ وافر عطا فرمایا تھا وہاں زبان و بیان کی انوکھی قدرت بھی بخشی تھی۔ ان کا ذہن مرتب تھا اس لئے بیان میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی تھی۔ انہیں اپنے مضمون پر عبور حاصل ہوتا اور اظہار کے سلیقے میں وہ اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز تھے۔ تصوف کی تاثیر کی وجہ سے وہ علم و بیان کے میدان میں قیامت کا طوفان تھے اور ذکرِ الٰہی کی نورانیت کے بعد تو دلوں میں رچ بس جانے والی شخصیت تھے۔ ایم اے عربی کی کلاسوں میں وہ طٰہٰ حسین پر دلکش گفتگو کرتے لیکن جب الھمزیۃ النبویۃ پڑھاتے تو کچھ اور سماں ہوتا۔ ان کی شخصیت، ان کا علم اور ان کا بیان ہر ایک اپنی جگہ پرکشش کا ساماں لئے ہوئے تھا۔ جب یہ سب خصوصیات جمع ہو جائیں اور اس پر ذکرِ الٰہی کے طور کا رنگ ہو تو پھر کون بچ کر جا سکتا ہے۔ ایک استاد کی حیثیت سے سب سے بڑی خوبی ان کا علمی رسوخ اور اظہار و بیان کا جادو تھا جو سننے والے کو جذب کرتا تھا۔ سید صاحب رحمہ اللہ کی خطابت کا انداز منفرد تھا۔ اس میں علم و معرفت، زبان و ادب کی چاشنی اور مواد کی ترتیب و تنظیم ہوتی۔ ان کے عہد میں تقویۃ الاسلام کا خطبہ اہلِ علم و دانش کے لئے کشش کا باعث تھا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی خطابت میں ابوالکلام آزاد اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جمع ہو گئے تھے ان کے ہاں کھوکھلی گھن گرج نہیں تھی اور الفاظ کا بے جا استعمال نہ تھا۔ ان کے ہمعصروں میں کوئی شخص بھی خطابت کے میدان میں ان کا ہم پلہ نہ تھا۔

تصانیف:

وہ بی اے اور ایم اے کی سطح پر عربی زبان و ادب پڑھاتے تھے، اس لئے مطالعہ میں عربی ادب پر خصوصی توجہ تھی۔ ادب، فلسفہ اور قانون ان کی دلچسپیوں کا محور تھے۔ عربی کے ساتھ وہ انگریزی اور اردو ادب سے بھی شغف رکھتے تھے۔ عمدہ کتابیں پڑھنا اور ان پر تنقیدی تبصرے کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ کالج میں ان کے صرف ایک کتابچے کا تذکرہ ہوتا جو انہوں نے واقعہ کربلا کے حوالے سے لکھا۔ جب تبدیلی آئی تو پھر لکھنا شروع کیا لیکن موضوعات اسلامی اور دعوتی تھے۔ کتابتِ حدیث عہدِ نبوی میں، آدابِ بارگاہِ رسالت، اسلام اور گردشِ دولت کے علاوہ خطباتِ جمعہ بھی مرتب ہو گئے ہیں۔ جہاد کے عنوان سے ان کے خطبات کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔

تصنیف و تالیف کے بارے میں ان کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔ ایک تو موضوع کا اہتمام کرتے، اسی موضوع پر قلم اٹھاتے جس پر کام کی ضرورت ہوتی۔ وہ تحریر برائے تحریر کے قائل نہ تھے۔ دعوت الی اللہ سے انہیں جذباتی لگاؤ تھا۔ اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ ان کی ترجیح تھی۔ جس زمانے میں پاکستان میں سوشلزم کا غلغلہ تھا۔ اسلامی معاشی تصور ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ بڑی بڑی کتابیں لکھنے کی بجائے وہ انہی تحریروں کو پسند کرتے تھے جنہیں ایک آدھ نشست میں ختم کیا جائے۔ وہ کہا کرتے: بات مرتب، جامع، مختصر اور دلنشین ہونی چاہیے۔ الفاظ کے انتخاب اور زبان

کے اسلوب کے بارے میں بہت حساس تھے۔ جو لفظ لکھتے ذمہ داری سے لکھتے اور جو بات لکھتے مستحکم لکھتے۔ الفاظ کے در و بست اور جملوں کی ساخت پرداخت کا خاص اہتمام کرتے۔ ان کی تحریریں حشو و زائد اور غیر ضروری تکرار سے پاک ہیں۔ زبان و بیان کی دلکشی اور عبارت کا حسن ہر جملے سے ظاہر ہے۔ جا بجا عربی، فارسی اور اردو کے اشعار پڑھ کر ابو الکلام رحمہ اللہ کے اسلوب کا گمان ہوتا ہے۔ یقیناً وہ ابو الکلام رحمہ اللہ سے متاثر تھے۔ ان کا انداز سہل ممتنع کا ہے۔ مشیت ایزدی کے اپنے معاملات ہیں، مہلت ملتی تو شاید کچھ اور لکھتے اور یقیناً جو لکھتے اپنی مثال آپ ہوتا۔ اللّٰھم اغفر له وارحمه[1]

---

[1] ماہنامہ صراط مستقیم، برمنگھم (مارچ 1999ء)

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

چند یادیں، چند باتیں

تحریر: پروفیسر خالد بزمی

برصغیر پاک و ہند میں علمائے اسلام کے دو خاندانوں کو خاص طور پر جو اعزاز و اکرام نصیب ہوا اس سے دوسرے بہت سے خاندان محروم رہے۔ ان دو خاندانوں میں سے ایک شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی کا خاندان ہے جس میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ جیسی نابغۂ روزگار شخصیت پیدا ہوئی۔ اور پھر ان کے بیٹوں اور پوتوں میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین محدث دہلوی، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، شاہ عبدالغنی محدث دہلوی اور شاہ محمد اسماعیل شہید دہلوی (رحمۃ اللہ علیہم) جیسے نامور بزرگ پیدا ہوئے جن کی زندگیوں کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت و خدمت میں گزرا۔ اس خاندان کے علاوہ دوسرا خاندان علمائے غزنویہ کا خاندان ہے جس میں مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالواحد غزنوی، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسمٰعیل غزنوی، مولانا عبدالغفار غزنوی اور مولانا ابوبکر غزنوی (رحمۃ اللہ علیہم) ایسے ممتاز علمائے دین اور دانشور پیدا ہوئے۔

ان میں سے پروفیسر ابوبکر غزنوی مرحوم ایک عالمِ دین کے علاوہ ممتاز دانشور اور معروف ماہرِ تعلیم بھی تھے۔ سیّد ابوبکر غزنوی صاحب کے ساتھ میرا تعلّق گزشتہ پچیس برس کی مدت کو محیط ہے۔ میں 1950ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں سال اوّل کا طالب علم تھا۔ مجھے کالج میں داخل ہوئے چند ہی ماہ گزرے تھے کہ ابوبکر غزنوی صاحب عربی کے لیکچرار کی حیثیت سے ہمارے کالج میں آئے۔ میں عربی کا طالب علم تھا اس لئے مجھے پہلے ہی روز ان سے متعارف ہونے کا موقع مل گیا۔ کسی زمانے میں میرے والد ماجد کے تعلقات ابوبکر غزنوی صاحب کے والد مکرم مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے رہے تھے۔ میں نے ان تعلقات کا حوالہ دیا تو بہت خوش ہوئے اس کے بعد وہ مجھے شاگرد کم اور دوست اور بھائی زیادہ سمجھتے تھے۔ اس طرح سال اوّل سے سال چہارم تک پورے چار برس ان سے عربی پڑھنے اور ایک طرح کی دوستی پیدا کرنے کا موقع ملا۔ غزنوی صاحب ایک استاد کے طور پر نہایت قابل، محنتی اور خوش اخلاق تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کالج سے فارغ ہونے کے بعد بھی ہمارے درمیان روابط و تعلقات نہ صرف قائم رہے بلکہ روز بروز مضبوط اور گہرے ہوتے گئے۔ جب میں عربی میں ایم اے کر لیا تو غزنوی صاحب کوشش کر کے مجھے اپنے شعبے میں لے گئے اور اس طرح مجھے ان کے ساتھ تدریسی فرائض انجام دینے کا بھی اعزاز حاصل ہوا۔

پروفیسر ابوبکر غزنوی صاحب جب پہلے پہل اسلامیہ کالج کے لیکچرار بن کر آئے تو وہ دین سے زیادہ فلسفے کی طرف مائل تھے۔ ہم دونوں کے تعلقات میں جلد ہی ایک قسم کی بے تکلفی کی پیدا ہوگئی تھی، اس کی وجہ کچھ مسلک کی ہم آہنگی اور کچھ عمروں کے درمیان بہت تھوڑا فرق تھا۔ ایک روز باتوں باتوں میں مَیں نے کہہ دیا کہ آپ کے خاندان میں ایک تواتر کے ساتھ علمائے دین کا جو سلسلہ چلا آ رہا ہے وہ مجھے مولانا داؤد غزنوی صاحب کے بعد ٹوٹتا نظر آ رہا ہے۔ میری یہ بات سن کر غزنوی صاحب چونکے اور فوراً کہنے لگے: ''آپ فکر نہ کیجئے جب ضرورت پیش آئی یہ فقیر داڑھی بڑھا لے گا اور منبر پر کھڑا ہو کر الحمد للہ...... سے خطبہ شروع کر دے گا۔ ابوبکر صاحب نے اپنی اس بات کو پورا کر دکھایا۔ داڑھی تو انہوں نے اپنے والد مکرم کی زندگی ہی میں رکھ لی تھی اور خطبہ ان کی وفات کے بعد شروع کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں سے اپنی خطابت کا لوہا منوا لیا۔

جن دنوں میں غزنوی صاحب کا شاگرد تھا ان دنوں میں جب بھی ان کے پاس جاتا انہیں ہمیشہ مطالعے میں مصروف دیکھتا۔ وہ واقعتاً بہت زیادہ پڑھنے والے آدمی تھے، پھر ان کا مطالعہ کسی ایک زبان یا کسی ایک مضمون تک محدود نہ تھا وہ بیک وقت انگریزی، اردو، عربی، فارسی اور پنجابی تک کی کتابیں پڑھتے تھے۔ پھر ان کتابوں میں دین، ادب، تاریخ، شعر اور تصوف سب ہی کچھ شامل تھا۔

اس زمانے میں غزنوی صاحب صرف پڑھتے تھے انہیں شاید لکھنے کا خیال ابھی نہیں آیا تھا۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے انہیں لکھنے کی طرف راغب کیا اور ان کے ابتدائی مضامین نظم و نثر مختلف جرائد و رسائل میں خود چھپوائے۔

اُس زمانے کی بات ہے ابھی اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی، ایک روز مجھ سے کہنے لگے: خالد بھائی! جب آپ آتے ہیں مجھے تقریریں کرنے اور کتابیں لکھنے کا مشورہ دیتے ہیں مگر مجھے معلوم ہے کہ میری عمر بہت تھوڑی ہے۔ میں نے کہا: عمروں کا معاملہ تو اللہ ہی جانتا ہے اس سلسلے میں آپ کو کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔ کہنے لگے: نہیں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ میں آج ان کی وفات کے بعد سوچتا ہوں کہ انہیں بہت پہلے سے انہیں یہ احساس کیوں پیدا ہو گیا تھا۔

بہرحال جب غزنوی صاحب میدان میں آ گئے تو پھر جلد ہی ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات اور اجتماعات، ہر حلقے میں لوگ اُن کی قابلیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ غزنوی صاحب نے اور مختلف محفلوں کے علاوہ خاص طور پر ''شامِ ہمدرد'' اور مجلس اقبال کے جلسوں میں جو تقاریر کی ہیں ان کا تاثر سامعین کے دِلوں میں تا زندگی قائم رہے گا۔

جب 1965ء میں غزنوی صاحب نے مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کا رسالہ ''توحید'' دوبارہ جاری کیا تو مجھے تقریباً ایک برس تک اس رسالے کی ادارت کے سلسلے میں ان کی معاونت کا اعزاز حاصل رہا۔ اس دوران میں مَیں ان سے کوئی مضمون مانگتا تو انہیں مجبوراً کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا تھا۔ ان کے بہت سے کتابچے اسی زمانے کے لکھے ہوئے مضامین کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں۔

اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور سے انجینئرنگ یونیورسٹی چلے جانے کے بعد غزنوی صاحب کو علمی اور دینی خدمت کے لئے نسبتاً زیادہ وقت ملا۔ اس دوران میں انہوں نے متعدد دینی، علمی اور ادبی مضامین و مقالات سپرد قلم کئے۔ انجینئرنگ یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں بھی مجھے تقریباً ایک سال تک ان کی رفاقت کار کا موقعہ ملا۔ اس دوران میں انہوں نے اپنے والد مکرم کے حالاتِ زندگی اور علمی و دینی خدمات کے بارے میں ''سیّدی وابی'' کے نام سے کتاب شائع کی۔

غزنوی صاحب اپنے مقالات کتابی صورت میں چھاپنا چاہتے تھے اور یہ کام انہوں نے میرے سپرد کیا۔ لیکن افسوس کہ یہ کام کچھ ان کے بے شمار مصروفیات اور کچھ میری کوتاہیوں کے باعث ان کی زندگی میں پورا نہ ہوسکا۔ وہ مضامین و مقالات اپنی اہمیت کے اعتبار سے قابلِ قدر ہیں۔ اگر وہ چھپ جاتے تو ان سے علمی استفادے کی ایک مستقل صورت پیدا ہوسکتی تھی۔

غزنوی صاحب اکثر شہادت کی آرزو کیا کرتے تھے۔ حال ہی میں وہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر مقرر ہوگئے، تو انہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں تعلیمی ترقی میں انقلاب لانے کی کوشش شروع کردی تھیں۔ افسوس کہ انہیں اپنے عزائم پر عمل کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔

غزنوی صاحب نے گزشتہ تھوڑے عرصے میں ملک کے طول وعرض میں جس طرح شہرت اور مقبولیت حاصل کرنا شروع کردی تھی۔ اگر وہ مزید زندہ رہتے تو ان کا نام ملک کے صفِ اوّل کے مشاہیر میں شامل ہوتا۔

آج ان کے نہ ہونے سے مجھے وہ الفاظ رہ رہ کر یاد آرہے ہیں کہ:

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری عمر بہت تھوڑی ہے!

اے کاش! وہ بہت عمر لے کر آئے ہوتے اور زیادہ سے زیادہ دینی اور علمی خدمت کرسکتے، اے کاش۔ [1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی

ایک بااخلاق شخصیت

تحریر: ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر

مرحوم سید ابوبکر غزنوی بے شمار اوصاف و محامد سے متصف اور متنوع شخصیت کے حامل تھے۔ راقم الحروف نے انہیں کئی مرتبہ قریب سے دیکھا اور انہیں ایک ''عظیم انسان'' کی جملہ صفات کا بہترین نمونہ پایا۔ مرحوم ایک نامور خانوادے کے نامور فرزند تھے۔ جسے برصغیر پاک و ہند کا بچہ بچہ جانتا پہچانتا ہے۔ ان کے اہل خاندان کے اخلاق عالیہ و فاضلہ کی اَن گنت حکائتیں اور داستانیں زباں زدخواص وعوام ہیں۔

مرحوم نے خود راقم الحروف سے ایک ملاقات کے دوران فرمایا: ''جس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اہل علم و فضل علماء وطلباء جنہیں قوم کی راہنمائی کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ جوں جوں ان کا علم وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان میں روحانی امراض زیادہ ہوتی چلی جاتی ہیں اور اخلاقی پستی کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ انہیں بلند اخلاق کا مینارہ ہونا چاہیے۔ میرا بارہا کا تجربہ ہے کہ علماء میں حسد، بغض، کینہ اور غیبت جیسی مہلک امراض بکثرت پائی جاتی ہیں۔''

راقم نے عرض کیا: آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

فرمانے لگے: ''اس کی وجہ واضح ہے۔ قرونِ اولیٰ میں یہی علماء وطلباء اخلاق و کردار کا بہترین نمونہ ہوا کرتے تھے۔ دراصل قرونِ اولیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ باقاعدہ تربیت اور اصلاحِ نفس کے مدارس ہوا کرتے تھے۔ حدیث وتفسیر اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان مدارس میں انہی امراض کی ''اصلاحِ قلب'' کی طرف سے مجرمانہ غفلت برتی جاتی ہے جو سبب ہے ہماری اخلاقی پستی کا۔''

مرحوم خود بھی اصلاحِ نفس میں کوشاں رہتے تھے اور ''احیاء دین کی تحریک'' اسی کا حصہ تھی جسے وہ ترقی و وسعت چاہتے تھے اور اس لئے افراد کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مگر عمر نے وفانہ کی وہ اس حسرت کو لے کر قبر میں جا سوئے۔

مرحوم ذاتی طور پر بڑے بلند اخلاق آدمی تھے۔ غالباً اس کا سبب ان کے عظیم المرتبت بزرگوں کی صحبتیں ہیں۔ وہ برسوں اپنے والد محترم سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی صحبت میں رہے۔ مولانا غزنوی مرحوم کی خدا شناسی اور ذوقِ عبادت کے بارے میں لوگ بہت کچھ جانتے ہیں۔

مرحوم سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ سے راقم الحروف کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میرا رسالہ ''سید محمد داؤد غزنوی''

شائع ہوا۔ انہوں نے اس پر بے حد مسرت کا اظہار فرمایا۔ میں وہ الفاظ دھرا ہی نہیں سکتا جو انہوں نے مجھ سے کہے اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ مجھے گھر پر (انجینئرنگ یونیورسٹی) لے گئے اور شام کا کھانا میرے ہمراہ کھایا اور کمال شفقت و محبت سے روٹی اٹھا کر مجھے پکڑاتے اور پلیٹ میں سالن ڈالنے کی کوشش کرتے اور میں ایک دینی مدرسہ کا فقیر طبع طالب علم تھا، عمر یہی کوئی 18/19 برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس وقت ان سے کوئی دو گھنٹے بڑی پُر کیف گفتگو رہی تھی جس کا ایک حصہ میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

آج پانچ برس گذر جانے کے باوجود میں جب تصوّر کرتا ہوں تو اپنے آپ کو مولانا مرحوم کے اسی بڑے کمرے میں پڑے ہوئے بڑے میز کے قریب بیٹھا ہوا سید مرحوم کے خوبصورت چہرے کو دیکھ رہا ہوں اور ان سے محوِ گفتگو ہوں۔

گذشتہ سال مرحوم کی کتاب ''سیدی وابی'' چھپ کر آئی تو انہوں نے ازراہِ عنائت ایک نسخہ راقم کے نام ارسال فرما دیا اور اس پر تبصرہ لکھنے کا حکم دیا۔ میں نے لکھا وہ پڑھ کر بے حد خوش ہوئے اور اس کا اظہار ایک خط میں بھی کیا اور مجھے لاہور آنے کو کہا۔ میں چند دن نہ جاسکا تو پے در پے دو خط اور لکھ دیئے، تاریخ، دن اور وقت بھی مقرر کر دیا۔ مرحوم کا گرامی نامہ ملاحظہ فرمائیں:

مکرمی و محترمی مولانا عبدالرشید صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ نے تبصرہ بہت عمدہ لکھا ہے، جذبہ صادق کی جھلک اس میں نظر آتی ہے۔

کیا آپ کے لئے ممکن ہے کہ آپ 11 اپریل بروز جمعہ 5:30 بجے شام بندۂ عاجز کے غریب خانہ پر ملاقات کے لئے تشریف لائیں۔

راقم الحروف توقع کرتا ہے کہ تبلیغی اور دینی کام میں ہم ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا سکیں گے۔

جواب ارسال فرمایئے۔

مخلص

ابوبکر غزنوی

میں نے جمعہ میں پہنچنے کی اطلاع دی لیکن بروقت نہ پہنچ سکا۔ ملاقات کا وقت شام 5 بجے تھا، میں سیدھا یونیورسٹی چلا گیا، وہ نماز مغرب ادا کر رہے تھے، میں نماز سے فارغ ہو کر ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو فرمانے لگے: خانیوال سے عبدالرشید ہیں۔ میں نے جی کہتے ہوئے سلام عرض کیا، تو فرمانے لگے: میں خطبہ جمعہ کے بعد دارالعلوم میں مارے مارے پھرتا رہا کہ کہیں آپ ہوں اور ساتھ لے چلوں مگر آپ نہ ملے۔ میں اب تک پریشان تھا کہ کہیں آپ کو آنے کی تکلیف نہ ہو۔

مغرب کے بعد کی بات ہے کھانا کھایا اور تین گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ راقم کو اپنے پاس بلانے پر اصرار کرتے رہے اور علم و تصوف کی باتیں چھڑ گئیں اور اس دیپک راگ سے راقم نے بڑا لطف اٹھایا۔ مرحوم نے اس ملاقات میں کسی شیخ الحدیث سے بخاری شریف پڑھنے کی خواہش کا اظہار بھی فرمایا جس میں وہ یقیناً سنجیدہ تھے۔ چونکہ حضرت الاستاذ مولانا محمد عطاء اللہ صاحب مدظلہم سے بھی ایک ملاقات میں انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا۔

اسی ملاقات میں مرحوم نے فرمایا تھا: میں جب حدیث پڑھا کرتا تھا تو اساتذہ کرام سے پوچھتا تھا کہ حدیث میں جو "لا یقعد قوم یذکرو ن اللہ إلا حفتهم الملائکة وغیشتهم الرحمة ونزلت علیهم السکینة وذکرهم فیمن عنده"[1]

جو قوم بھی ذکر اللہ کے لیے بیٹھتی ہے فرشتے اسے اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں، رحمت ان پر تن جاتی ہے اور رب العزت اس کا ذکر اپنے مقربین کے پاس کرتے ہیں۔

دھوپ چھاؤں کو ہم محسوس کرتے ہیں۔ گرمی سردی سے ہمارے جسم آشنا ہیں۔ ہوا کے جھونکوں کا لمس ہمیں محسوس ہوتا ہے۔ آخر غیشتهم الرحمة و حفتهم الملائکة کی پرکیف حالت سے ہم کیوں نہیں لطف اندوز ہوتے۔ میں کہتا یہ تھا کہ رسالت مآب ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے کلمات یقیناً معنویت رکھتے ہیں۔ یا تو ہم اپنی کم علمی و کم فہمی کی وجہ سے ان کا صحیح مطلب نہیں سمجھ رہے یا پھر ہمارا ایمان ناقص ہے کہ رحمتِ خداوندی کے جھونکوں سے ہمارا مشامِ جان معطر نہیں ہوتا، اللہ کی رحمت ہم پر سائبان کی طرح تن جاتی ہے اور ہمیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

اساتذہ کرام میرے اس سوال کا جواب نہیں دیتے تھے اور مجھے منطقی دلائل سے ٹال دینے کی کوشش کرتے تھے۔

یہی سوال میں نے ایک مرتبہ حضرت العلام حافظ محمد صاحب گوندلوی مدظلہ العالی سے کیا تو انہوں نے اس کا بڑا معقول جواب دیا۔ فرمایا: یہ کوئی فقہی مسئلہ نہیں اس کا تعلق دماغ سے زیادہ دل سے ہے، مجاہدہ و ریاضت سے کوئی شخص اپنے اندر طاقت پیدا کر لے تو یہ چیزیں اسے محسوس ہو سکتی ہیں۔ آج میں محسوس کرتا ہوں واقعی بات ایسے ہی ہے۔ اب میری خواہش ہے کہ ہر مومن بھائی رحمتِ الٰہی سے لطف اندوز ہو مگر یہ مجاہدہ و ریاضت کے بغیر ممکن نہیں، اسی لیے میں لوگوں کو اس طرف توجہ دلاتا ہوں اور "تحریک احیاء دین" میری انہی کوششوں کا مظہر ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ حافظ ابن تیمیہ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے بھی کسی ایسے ہی مسئلے پر بحث کے دوران فرمایا ہے: المسئلة حالیة لا علمیة محضة، جس میں مرحوم کی باتوں کی مکمل تائید ہوتی ہے۔

سید صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مجھے سر پھروں کی تلاش رہتی ہے۔ جو میرے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر اس موضوع پر باتیں کریں، مجھے ان باتوں میں بڑا لطف محسوس ہوتا ہے۔ سید صاحب مرحوم آج ہم میں نہیں ہیں مگر ان کی باتیں ساری

زندگی نہیں بھولیں گی۔ انہوں نے آخری خط میں لکھا تھا کہ ''شاید موسم گرما کی تعطیلات میں لاہور ملاقات ہو سکے۔'' میں جب اس کو پڑھتا ہوں تو بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور قرآن کریم کی صداقت پر ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

میں مرحوم کی باتیں یاد کر کے بے اختیار ہو جاتا ہوں۔ اگر جناب بشیر انصاری صاحب کا برادرانہ اصرار نہ ہوتا تو میں یہ باتیں بھی نہ لکھ پاتا۔

اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ عنہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ.

آپ شاید گستاخی خیال فرمائیں مگر حقیقت یہی ہے ؎

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام لیا[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

چند یادیں

تحریر: مولانا عبدالرشید راشد ہزاروی

اس عالم ناپائیدار میں ابتدائے افرنیش سے لیکر آج تک رنگا رنگ کی لاتعداد نسل انسانی ہو گزری ہے۔ ہر شخص اپنے ماحول کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا رہا۔ کتنے ہی خدا رسیدہ اپنی مسائی میں کامیاب رہے اور کتنے ہی خدا کے باغی اپنے ماحول کو رب کائنات سے باغی رکھنے میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ انبیاء اور صلحاء کا ہر دور میں ایک ہی مشن رہا کہ ذریتِ آدم کا خالقِ حقیقی سے رشتہ جوڑ دیا جائے اور اس کی رضاء کا کلمہ ہر فرد کی زبان سے سنائی دے۔ علمی دنیا علماء کے وجود سے آباد ہے۔ کتنے ہی علماء ہو گزرے کہ ان کی حیات پوری قوم کی حیات تھی۔ ان کے چلے جانے سے ساری قوم بے روح ہوگئی۔ دور کی بات نہیں یہ کل کی بات ہے۔

پاک و ہند کے اہلحدیث علماء:

پاک و ہند کی جماعت اہلحدیث کے کس قدر جید علماء کرام تھے جن کے علم کا سورج روئے زمین کو منور کئے ہوئے تھا۔ آج اس سورج کی ایک کرن تک نظر نہیں آتی۔ بتایئے وہ وقت کے امام اور علمی مرکز کہاں ہیں۔ استادِ پنجاب حافظ عبدالمنان وزیر آبادی، مولانا عمر دین وزیر آبادی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالجبار غزنوی، مولانا عبدالاحد غزنوی، مولانا ابراہیم سیالکوٹی، مولانا محمد جونا گڑھی، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا عبدالوہاب دہلوی، مولانا سید محمد شریف گھڑیالوی، مولانا صوفی ولی محمد فتوحی والے، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی، مولانا نور حسین گرجاکھی۔ یہ لوگ پاکستان سے پہلے یا قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اللہ کو پیارے ہو گئے اور اپنی یاد ہمیشہ کے لئے دنیا میں باقی چھوڑ گئے۔ وہ چیدہ چیدہ علماء کرام جن کو اس دور کے عوام و خواص اپنے لئے مشعلِ راہ خیال کرتے تھے۔ آج وہ بھی ہم میں موجود نہیں۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا محمد اسمٰعیل سلفی، مولانا محمد یوسف کلکتوی، مولانا عبدالستار دہلوی، مولانا عبدالعزیز ملتانی، مولانا احمد دین گکھڑوی، مولانا حافظ محمد عبداللہ روپڑی، مولانا حافظ محمد اسمٰعیل روپڑی، مولانا محمد اشرف سندھو، مولانا محمد یحییٰ حافظ آبادی، مولانا سید عبدالغنی شاہ صاحب کاموں کی والے۔ یہ اور اس طرح کے بیسیوں علمی چراغ گل ہو گئے۔

عرصۂ ڈیڑھ سال کے علمی نقصانات:

1975ء اور 1976ء میں ہم نے کیسے کیسے علماء اور اولیاء کو اپنے ہاتھوں، اشک بار آنکھوں اور زخمی دلوں سے خود سپرد خاک کیا۔ کس کو بھولا ہے مولانا مہدی زمان خان صاحب، مولانا محمد عبداللہ جہانیاں، مولانا محمد ادریس تتر یلوی، مولانا حافظ محمد شریف سیالکوٹی، مولانا حافظ عبدالغفور ہنجانوالی، مولانا رضاء اللہ سرگودھوی، مولانا عبدالغنی سرگودھا، امیر المجاہدین ابوالمساکین مولانا صوفی محمد عبداللہ بانی دار العلوم ماموں کانجن، شیخ الحدیث حافظ محمد اسماعیل ذبیح راولپنڈی، سید مولا بخش کوموی، علامہ راغب احسن کراچی، مولانا حافظ عبدالحق صدیقی۔

فیا ضیعة العلم:

ماہِ اپریل کے آخری عشرہ کی آمد پر مجھے بانئ دار العلوم کے آخری ایام یاد آرہے تھے کہ اچانک غزنوی خاندان کی آخری علمی شمع کے گل ہو جانے کی اطلاع ملی۔ دل کو لے کر بیٹھ گیا اور گزشتہ ایام میں موصوف کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات ایک ایک کر کے سامنے آ گئے۔ 1955ء میں فاضل عربی کے امتحان کے سلسلہ میں دو ماہ کے لیے شیش محل روڈ تقویۃ الاسلام میں حاضری کا موقع ملا۔ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے امیر حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کو ان ایام میں بہت قریب سے دیکھا۔ ان کے مفید نصائح بھی کئی بار سننے کا اتفاق ہوا۔ ان دنوں سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کا نام ضرور سنا اور دو چار مرتبہ بات مصافحہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ حضرت مولانا سید داؤد غزنوی کے انتقال کے بعد ان کو جمعیت کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا تو موصوف پہلی مرتبہ سمندری اور ماموں کانجن، اوڈانوالہ تشریف لائے۔ تینوں مقامات پر موصوف کی باتیں بغور سنیں ہر بات قیمتی موتی اور ہر لفظ جوہر نایاب تھا۔ بانی دار العلوم ان ایام میں عدمِ صحت کی وجہ سے گاؤں میں مقیم تھے۔ سید صاحب ان کی ملاقات اور عیادت کو اوڈانوالہ تشریف لے گئے۔ طلباء کے خصوصی اجلاس میں آپ نے ایک بات ایسی فرمائی کہ اب بھی سن کر ایمان تازہ ہوتا ہے، فرمایا: آپ علم دین حاصل کرتے ہیں اس کے حصول میں کوئی دنیوی غرض نہیں ہونی چاہئے۔ آپ اللہ کی رضا کے لیے دین سیکھیں، دنیا آپ کے پاس خود چل کر آئے گی۔ خدا آپ کو کبھی بھوکا نہیں مارے گا۔ آپ لوگ جب اس کے در پر بیٹھ ہی گئے تو وہ کبھی خالی ہاتھ اور ناکام ہرگز واپس نہیں کرے گا۔ وہ تو خالق، مالک اور مختار ہے۔ انسان بھی بار بار اپنے در پر آنے والے کو خالی واپس نہیں کرتا۔ انسان تو انسان ہے اگر کسی کے در پر بار بار کتے جیسا نجس جانور بھی آتا ہے تو انسان کو شرم آتی ہے کہ میں اس کو اپنے در سے خالی واپس کروں تو کیا خدا ہی تمہیں اپنے در پر دیکھ کر تمہیں کچھ نہ دے گا، ضرور دے گا۔ سید صاحب کی دعا میں عجب کیفیت نظر آئی۔

سمندری جامع اہلِ حدیث میں نماز کے بعد آپ نے دعا شروع کی۔ عربی الفاظ وہ پڑھ رہے تھے۔ ادعیہ مسنونہ کو بار بار دہرا رہے تھے اور سامعین آمین کہہ رہے تھے۔ اور ہر شخص دعا کے الفاظ پر رو رہا تھا، جیسے ہم سب خدا کو اپنی

آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور ہماری خطائیں بھی نظر آ رہی ہیں۔

اہلحدیث کانفرنس ماموں کانجن:

1964ء میں ماموں کانجن میں اہل حدیث کانفرنس پہلی مرتبہ ہوئی۔ سید ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لائے۔ آپ کا باوقار انداز میں استقبال کیا گیا۔ غالباً اتوار کو ظہر کے بعد کانفرنس میں ان کا خطاب تھا۔ علاقہ بھر سے ہر مکتبِ فکر کے افراد پروانہ وار چلے آ رہے تھے۔ جلسہ گاہ عظیم جلسہ گاہ کے باوجود اپنی تنگ دامانی کے لیے شکوہ کناں تھا اور سامعین دور دور تک سڑک پر غزنوی خاندان کے مثالی نوجوان عالمِ دین کا خطاب سننے کے لیے ہمہ تن گوش کھڑے تھے۔ آپ نے اس کانفرنس میں خدمات اہل حدیث کے عنوان پر بھی روشنی ڈالی۔ پاک و ہند میں علماء اہل حدیث کے کارناموں کے ذکر میں جب غزنوی خاندان کا ذکر آیا تو ہر آنکھ اشک بار تھی۔ ماموں کانجن میں 1964ء سے لے کر 1975ء تک آٹھ بار کانفرنس ہو چکی ہے۔ غالباً اس عظیم کانفرنس میں دوبارہ شریک نہ ہو سکے۔ چھ مرتبہ ہر کانفرنس میں شریک ہوئے۔

میرا مطلوب تیری ہی رضا:

سیّد صاحب رحمہ اللہ ہر کانفرنس پر نیا ہی عنوان پیش فرماتے اور علمی جواہرات متلاشیانِ علم میں تقسیم فرماتے، اور ان کے خطاب سے ہر شخص مطمئن ہو جاتا اور ہر فرد ان کو دادِ تحسین دیتے نہ تھکتا۔ بلکہ دین حق کی بات سن کر ہر شخص کا ایمان تازہ ہو جاتا۔ غالباً چوتھی کانفرنس پر سیّد صاحب رحمہ اللہ نے فکر و ذکر کے عنوان پر خطاب فرمایا اور کتاب و سنت سے ذکرِ الٰہی کے تمام شواہد پیش کیے اور ہر مومن کو ذکر سے جو سکونِ قلب میسر آتا ہے اس کی صحیح ترجمانی ایک جامع اور پُرسکون کلمہ سے کر دی اور اس کا اصل موقف بار بار اسی کلمہ کو دہرا کر واضح کیا اور یہی کلمہ ہر سامع کے ذہن میں نقش فی الحجر کی طرح ثبت کر دیا۔ وہ بار بار فرماتے: "الٰهي انت مقصودی ورضاك مطلوبی" اس فقرہ سے ایمان کو جو تازگی ملتی تھی اس کی کیفیت اس مجلس کے سامعین ہی بیان کر سکتے ہیں۔ بانی دار العلوم حضرت امیر المجاہدین مولانا صوفی محمد عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس قدر محبت و عقیدت تھی جو ان تاثرات سے واضح ہوتی ہے:

"بسملًا، حامدًا و مصلّیًا"

میں 2 اکتوبر 1974ء کو جو کانفرنس ماموں کانجن میں منعقد ہوئی تھی حاضر ہوا۔ محترم حضرت صوفی محمد عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مل کر روحانی مسرت ہوئی۔ ان کے وجود میں ذکر کے اثرات محسوس کیے۔ سفر کی تھکاوٹ کے باوجود میرا ذکر بھی جاری ہو گیا۔ ان کا وجود جماعت اہل حدیث میں غنیمت معلوم ہوا۔ دار العلوم تعلیم الاسلام کو روز بروز فروغ ہو رہا ہے وہ محض ان کے توکل اور امانت کی برکت ہے۔ (الفقیر الی اللہ ابوبکر غزنوی)

استاذ محترم جناب مولانا محمد صادق [خلیل] صاحب شیخ الحدیث راولپنڈی کی معیت میں ایک دفعہ شیش محل روڈ ان کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ مہمان نوازی کے تمام اسلامی احکام کو عملاً ان کے پاس بیٹھ کر

ملاحظہ کرتا رہا۔ فروٹ اور چائے کی ضیافت سے فراغت کے بعد استاذ محترم سے جماعتی سلسلہ کی باتیں بھی کچھ دیر ہوتی رہیں۔ مگر اکثر گفتگو اشاعتِ اسلام کے بارے میں ان کے نئے پروگرام سے متعلقہ ہی تھی۔ وہ بار بار مجھ سے حضرت صوفی صاحب کے بارے میں دریافت فرماتے۔ اور ان کے ذکر و عبادت کے بارہ میں معلومات سنتے رہے اور فرماتے آپ خوش نصیب ہیں اتنے عظیم انسان کی خدمت میں وقت گزار رہے ہیں۔ آخر میں آپ نے حضرت الاستاذ اور راقم الحروف کو اپنے مطبوعہ علمی مقالات تحفۃً عنایت فرمائے اور اپنے دست مبارک سے نام بھی تحریر فرمایا جو زندگی بھر اب یادگار کے طور پر محفوظ رہے گا۔

آہ! علم و فضل، ذکر و فکر اور عمل کا مثالی نمونہ، جماعت کا ہر دلعزیز، ملک کا عظیم ماہر تعلیم اور ہر مجلس کا میر محفل اب ہمیشہ کے لیے ابدی راحت فرماتے ہوئے ہم سے جدا ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس نصیب فرمائے، آمین۔ [1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام، لاہور (22 اکتوبر 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ میری نگاہ میں

تحریر: پروفیسر غلام احمد حریری

سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ وغفرلہ غزنوی خاندان کے تابندہ ستارے، صاحبِ جلال و جمال اور قدامت و جدت کا حسین امتزاج تھے۔ طبیعت میں ظرافت کا عنصر غالب تھا۔ طبیعت بڑی بذلہ سنج اور نکتہ آفریں پائی تھی۔ قنوطیت آشنا قطعاً نہ تھے، مزاج پر رجائیت پسندی کا غلبہ تھا۔ نفاست پسند بلکہ نفاست پرست تھے۔ جملہ لوازمِ حیات میں پاکیزگی اور طہارت کو پسند کرتے تھے۔ لندن کے ہسپتال میں جب آپ زیرِ علاج تھے اس وقت اگر انہیں وہاں کے اربابِ حل وعقد سے کوئی شکوہ تھا تو بس یہی کہ وہاں طہارت کا اہتمام نہ تھا۔

حد درجہ کے ذہین وفطین مگر اس کے ساتھ ساتھ اس درجہ کے راحت پسند بھی تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیت اور مصادر وماٰخذ سے وسیع واقفیت کے باوجود کوئی تحقیقی کام نہ کر سکے۔ ان کا قلمی سرمایہ بس چند ایک رسالے اور تقریریں ہیں۔ ذہانت کے پہلو بہ پہلو اگر طبیعت محنت کی عادی ہوتی تو گراں قدر علمی ورثہ چھوڑ جاتے۔ مسلمہ خطیب تھے، بڑے بڑے برجستہ فقرے بولتے۔ زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ مترادفات بکثرت استعمال کرتے، دورانِ تقریر سامعین ان کی حسین وجمیل بارعب شخصیت اور پروقار جذباتی تقریر سے گہرا اثر قبول کرتے۔

حق پرست تھے اور باطل کا ان کے یہاں گزر نہ تھا۔ جس بات کو حق سمجھتے کوہِ گراں کی طرح اس پر ڈٹ جاتے اور دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس سے متزلزل نہ کر سکتی۔ بکثرت لوگوں سے ان کی خودنمائی اور کبر کا گلہ سنا، اکثر بڑے لوگوں میں کسی حد تک انفرادیت پسندی پائی جاتی ہے مگر جو شخص سید ابوبکر غزنوی سے جتنا زیادہ قریب ہوتا جاتا اس کا یہ گلہ دور ہوتا جاتا اور وہ آپ کی خوش اخلاقی کا اعتراف کرنے لگتا۔ مزید برآں ایسے ذمہ دار منصب پر فائز شخص کو ڈسپلن قائم رکھنے کے لیے کچھ رکھ رکھاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ممکن ہے اگر اللہ تعالیٰ انہیں مزید مہلت دیتا تو سن وسال کی پختگی سے اس خامی کا ازالہ ہو جاتا۔

عقیدۃً پکے اہلحدیث اور غزنوی خاندان کی روایات کے حامل تھے مگر متنازعہ فقہی مسائل میں تعصب سے گریزاں تھے۔ جہاں رواداری کی ضرورت ہوتی وہاں اہلحدیث کے امتیازی مسائل پر عمل نہیں کرتے تھے۔ اسی کے زیرِ اثر وہ اہلِ حدیث حلقہ میں اہلِ حدیث تصور نہیں کیے جاتے تھے۔ بخلاف ازیں ان کی یہ رواداری (اور اہلِ حدیث کے نزدیک مداہنت) احناف میں وجہ قبولیت قرار پائی۔ اور سب مسلمانوں نے ان کی وفات پر اس قدر اظہار الم ورنج کیا

کہ شاید کسی کی وفات پر نہ کیا گیا ہوگا۔

سنجیدگی اور وقار کا کوہِ گراں تھے اور کسی شخصیت سے مرعوبیت کا ان کے ہاں کوئی سوال نہ تھا۔ غیرت و خود داری کے پیکر اور آپ اپنی عزت کرنے والوں میں سے تھے۔ غیر معیاری گفتگو اور اپنے مقام سے فروتر نشست و برخاست انہیں گوارا نہ تھی۔ اگر کوئی شخص انہیں ٹیلیفون پر تقریر وغیرہ کی دعوت دیتا تو ناراض ہو کر ٹیلیفون بند کر دیتے اور فرماتے کہ جو شخص میرے پاس آ کر دعوت نہیں دیتا میں بھی اس کے یہاں نہیں جاتا۔

سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ حسرتؔ کے اس شعر کے صحیح مصداق تھے:

رعنائی و زیبائی و محبوبی و خوبی
کیا بات ہے جو اس قدِ دل جو میں نہیں ہے

جامع اوصاف بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ کسی میں حسن و جمال ہے تو زبان اظہار و بیان سے قاصر ہے۔ اگر جوہرِ لسانی کا وصف پایا جاتا ہے تو جسمانی رعنائی و زیبائی کا فقدان ہے۔ کسی ایک موضوع پر کھل کر بول سکتے ہیں۔ مگر جونہی موضوعِ گفتگو بدلا زبان گنگ ہوگئی، اور کہنے کے لیے کچھ نہ رہا۔ بازارِ سخن گرم ہے مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال ہو رہا ہے جونہی ایک نمایاں شخصیت مجلس میں آ براجمان ہوئی زبان پر تالا لگ گیا اور احساسِ مرعوبیت نے قوتِ گویائی چھین لی۔ اگر ادبی چاشنی پائی جاتی ہے تو دینی معلومات سے بے بہرہ ہیں اور اگر دینی مطالعہ کی سعادت حاصل ہے تو شعر و سخن کی وادی سے نا آشنا محض ہیں۔ مگر سید ابوبکر میں یہ سارے اوصاف یک جا تھے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشید کہ جا ایں جا است

سید ابوبکر غزنوی ہمہ گیر اور جامع شخصیت کے مالک تھے۔ غزنوی خاندان کی قدیم روایات کے مطابق وہ اپنی ذات میں مردانہ حسن و جمال کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ جس مجلس میں بیٹھ جاتے کسی کا چراغ ان کے سامنے جل نہ سکتا۔ بڑی جاذب نظر اور پرکشش شخصیت تھے۔ زبان میں دریا کی روانی، جلال میں تلوار کی درخشانی اور جمال میں صبا کی لطافت پائی جاتی تھی۔ تحکمانہ اندازِ گفتگو، جچے تلے الفاظ، موضوعِ زیرِ بحث میں ماہرانہ بصیرت، پر تاثیر جملے ان کی گفتگو کو پرکشش بنا دیتے حتیٰ کہ ان کے نظریات کا مخالف بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔

شوق کی ایک نظر میں ہوئے وہ سب قائل
جن پہ صدیوں نہ ہوئی صدق و وفا کی تاثیر

راقم کے قلب و ذہن پر غزنوی خاندان کی عظمت کا سکہ آغاز طفولیت میں ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ ضلع گورداسپور مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے جب میں نے لائل پور شہر کو اپنا مسکن بنایا تو سید صاحب مرحوم کے والد محترم سید محمد داؤد

غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ متعدد مرتبہ لائل پور اور لاہور میں آپ کی اقتداء میں نمازِ جمعہ پڑھنے کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوا۔ میں نے علماء اور فضلاء میں مولانا داؤد جیسا لطافت و نفاست پسند انسان بہت کم دیکھا ہے۔ آپ خوش خوراک، خوش پوش تھے اور بڑی صاف ستھری زندگی گزارتے تھے۔ ایک مرتبہ چند علماء کی معیت میں مجھے آپ کا شرفِ میزبانی حاصل ہوا اور اس موقع پر آپ کی نزاکتِ طبع اور نفاست پسندی کا بچشم خود ملاحظہ کیا۔ مگر اس خوش ذوقی کے ساتھ ساتھ آپ میں حد درجہ کا عجز و انکسار بھی تھا۔ میرے جیسے ادنیٰ غلام کے احترام میں بھی سرو پا کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ کبر و نخوت کا ان کے یہاں گزر بھی نہ تھا۔ میں نے کچھ معمولی سا علمی کام کیا تھا اس پر پورے مجمع میں تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کرتے رہے۔ خطابت میں تو آپ کی شعلہ نوائی مسلمہ ہے، جس میں کسی کو کلام نہیں۔ آواز میں گھن گرج تھی سامعین کے دل و دماغ پر چھا جاتے تھے۔ آخر 16 دسمبر 1963ء کو بارگاہِ ربانی سے بلاوا آگیا اور آپ ملک عدم کے مکین ہو گئے۔

چاندنی افسردہ گل بے رنگ و بو نغمے اداس
اک ترے جانے سے کیا بتلاؤں کیا کیا ہوگیا

غزنوی خاندان سے عقیدت کی بنا پر سید ابوبکر غزنوی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی میں پہلے ایم اے عربی اور پھر ایل ایل بی کے امتحانات امتیازی حیثیت کے ساتھ پاس کئے اور اسلامیہ کالج لاہور میں عربی کے لیکچرار تعینات ہو گئے۔ یہ 1950ء کی بات ہے، ان دنوں آپ صرف سید ابوبکر تھے۔ میں ان ایام میں اسلامیہ کالج لائل پور میں عربی و علومِ اسلامیہ کا لیکچرار تھا۔ ہم پیشہ ہونے کے اعتبار سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی تھی مگر روابط میں زیادہ استحکام نہ تھا۔ غالباً جولائی 1960ء کی بات ہے کہ تعطیلات گرما میں سید ابوبکر مع اپنی اہلیہ اور فرزندِ ارجمند جنید کے ہمراہ جس کی عمر اس وقت دو سال تھی پیپلز کالونی لائل پور کے ایک مکان میں جو میرے مکان کے بالکل قریب تھا تعطیلات گزارنے کے لیے تشریف لے آئے۔ اس مکان میں جامعہ سلفیہ لائل پور کے مشہور استاد مولانا شریف اللہ خان کے صاحبزادے پروفیسر حامد خان حامد (حال گورنمنٹ کالج لاہور) مقیم تھے اور وہ بمعہ اہل و عیال تعطیلات گزارنے کے لیے دہلی چلے گئے تھے۔ سید ابوبکر صاحب میں اس دور میں یہ احساس پیدا ہوا کہ عربی زبان و ادب میں پورا اعتماد پیدا کیا جائے اور یہاں رہتے ہوئے جامعہ سلفیہ کے اساتذہ سے استفادہ کیا جائے۔ چنانچہ اس دورانِ قیام میں آپ نے حافظ محمد گوندلوی صاحب سے تفسیر بیضاوی اور مولانا شریف اللہ خان صاحب سے صرف و نحو کی بعض کتابیں پڑھیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

من تعلمت منه حرفا فانا عبد.

"جس سے میں نے ایک حرف سیکھا میں اس کا غلام ہوں۔"

تو مجھے بھی یہ شرف حاصل ہے کہ مرحوم سید ابوبکر صاحب نے مجھ سے الفیہ کی شرح ابن عقیل کا کچھ حصہ پڑھا۔

فی الجملہ نسبتے بہ تو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است[1]

یہی وہ دورِ مسعود تھا جس میں سید صاحب کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان کے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم استوار ہوئے۔ یوں ہم پیشہ، ہم مسلک اور معاصر ہونے کا شرف تو پہلے بھی حاصل تھا۔ یہ تین ماہ کا عرصہ میرا حاصل زندگی ہے۔

زندگی زندگی نہ سمجھو کہ زندگی سے مراد ہیں بس
وہ عمر رفتہ کی چند گھڑیاں جو ان کی صحبت میں کٹ گئیں ہیں

سید صاحب مع اہل و عیال صرف تعطیلات گزارنے یہاں آئے تھے اور مختصر لوازمِ زندگی ہمراہ لائے تھے۔ میرے کاشانہ میں تقریباً روزانہ محفل جمتی، چائے کا دور چلتا اور علمی و ادبی تذکرے ہوتے۔ اس زمانہ میں سید صاحب نے لائل پور کے وابستگانِ علم و ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔

سب میر کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنی
اس خاک راہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو

سید صاحب اور میں سروس کے معاملہ میں بھی قریباً پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ جب آپ اسلامیہ کالج لاہور سے انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں تشریف لے گئے تو میرا تقرر بھی اسلامیہ کالج لائل پور سے زرعی یونیورسٹی لائل پور میں ہو گیا۔ سید صاحب کے جانے سے پہلے انجینئرنگ یونیورسٹی میں علومِ اسلامیہ کے شعبہ کا کوئی وجود نہ تھا۔ آپ نے مستقل شعبہ کے قیام کے سلسلہ میں جو مساعی جمیلہ انجام دیں وہ آپ کا قلمی و علمی جہاد تھا۔ آج اس کے نتیجہ میں یونیورسٹی میں اسلامیات کا ایک مستقل شعبہ موجود ہے جس میں چھ اساتذہ دین کی دعوت و تبلیغ میں مشغول ہیں، یہ آپ کا صدقہ جاریہ ہے جس کا اجر و ثواب تا ابد انہیں پہنچتا رہے گا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی میں دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں آپ کی خدمات تا ابد تابندہ و درخشندہ رہیں گی۔

ستمبر 1975ء میں آپ کی دینی و تدریسی خدمات کے صلہ میں آپ کو اسلامیہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ قومی اخبارات میں اس کو حسنِ انتخاب کا عملی نمونہ قرار دیا۔ اس منصب پر فائز ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی استادِ حدیث کی حیثیت سے مجھے آپ کا شرفِ رفاقت حاصل ہو گیا۔ یہ ادارہ ایک دینی درس گاہ کی حیثیت سے خاصا پرانا ہے،

---

[1] قصہ مختصر، تجھ سے نسبت ہی میرے لیے کافی ہے۔ بلبل کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ گل کا قافیہ ہے۔

صدر ایوب کے زمانہ میں اس میں علومِ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ علومِ جدیدہ کی تعلیم بھی شامل کر دی گئی مگر اسے مکمل یونیورسٹی کا درجہ موجودہ حکومت کے دور میں حاصل ہوا۔ اسے پہلا سربراہ بھی ایسا ملنا چاہیے تھا جو جدید وقدیم علوم کا ذوق آشنا ہو اور ساتھ ہی ساتھ یونیورسٹی کے نظم وضبط سے بھی بخوبی آگاہ ہو۔ سید ابو بکر ان تمام صفات کے حامل تھے اور اس منصب کے بہ ہمہ وجوہ اہل تھے۔

اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی تشکیل وتاسیس بڑا محنت طلب کام تھا اور سید صاحب نے ستمبر 1975ء سے آخر مارچ 1976ء تک اس کے لیے شب وروز محنت کی۔ ایک قدیم طرز کے دینی مدرسہ کو ایک جدید یونیورسٹی کے قالب میں ڈھالنے کے لیے سات ماہ کے قلیل عرصہ میں جو ممکن تھا آپ نے کیا۔ میرے خیال میں سید صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ اس ادارہ میں یہ تھا کہ آپ نے اس فرقہ وارانہ فضا کو یکسر بدل دیا جو اس ادارہ کا طرۂ امتیاز مشہور تھا۔ کسی زمانہ میں راقم یہاں آیا تو بچشمِ خود دیکھا کہ مغرب کی نماز بیک وقت الگ الگ امام کی اقتداء میں پڑھی جارہی ہے۔ سید صاحب کا مسلک اباً وجداً اہل حدیث تھا اور یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی مگر آپ دیگر غزنوی اکابر کی طرح مسلکِ اعتدال پر گامزن تھے۔ ائمہ اربعہ کی مدح وستائش میں رطب اللسان رہتے تھے، ہر مکتبِ فکر کے علماء کو قدر وقیمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ فرقہ وارانہ تعصب ان کے لیے قابلِ برداشت نہ تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں کوئی فرقہ وارانہ ناخوشگوار واقعہ رونما نہ ہوا۔ تصوف کی جانب میلان تھا، مگر فرمایا کرتے تھے کہ شریعت سے ہٹ کر میں تصوف کا قائل نہیں ہوں، شریعت کا وہ حصہ جو تزکیۂ باطن سے متعلق ہے وہی تصوف ہے۔ ذکرِ الٰہی کے بڑے رسیا تھے اور اس کے لیے انہوں نے اوقات مقرر کر رکھے تھے۔

بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہار سی مایوس
ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا

آخر مارچ میں آپ کسی کام سے بہاول پور سے لاہور گئے وہاں اچانک مولانا کوثر نیازی صاحب کے وفد کے ساتھ لندن کے اسلامی میلہ میں شرکت کا پروگرام بن گیا، مگر ابھی جانے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم [تکلیف سے دوچار] ہوئے۔ 2 اپریل کو لندن پہنچے اور چار اور پانچ اپریل کی درمیانی شب کو سڑک عبور کرتے ہوئے شدید زخمی ہو گئے۔ سنا ہے اور میرا مشاہدہ ہے کہ سید صاحب دوڑ کر سڑک عبور کرنے کے عادی تھے۔ ایک دوست نے کوئی پندرہ سال پہلے کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ سید صاحب ایک انگریز پروفیسر کے ساتھ کھڑے تھے، ایک موٹر کار آرہی تھی۔ سید صاحب نے دوڑ کر سڑک پار کر لی اور وہ دونوں ساتھی سڑک کے کنارے کھڑے کار گزرنے کا انتظار کرتے رہے۔ جب دونوں ساتھی سڑک عبور کر کے ان کے پاس پہنچے تو آپ نے ان دونوں کو بزدلی کا طعنہ دیا۔

یہاں بھی کچھ اسی قسم کا معاملہ پیش آیا ہوگا۔ سنا ہے شدید زخمی ہونے کے ایام میں بھی آپ چنداں مغموم نہ تھے

اور اقبال کا یہ شعر تو بارہا میں نے ان کی زبان سے سنا:

بہ ملکِ جم نہ دہم مصرعِ نظیری را
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

آخر 24 اپریل کو شام کے قریب یہ حسین و جمیل چہرہ دیارِ غیر میں بے کسی و کسمپرسی کی حالت میں ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔

مرتے ہی میرؔ سب پہ نہ اس بے کسی کے ساتھ
ماتم میں تیرے کوئی نہ رویا پکار کر

وہ چمکتا دمکتا چہرہ گو نظروں سے غائب ہو گیا مگر لوحِ قلب پر اس نے جو انمٹ نقوش ثبت کیے تھے تا زندگی محو نہ ہو سکیں گے۔ خداوند کریم انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کی کوتاہیوں کو معاف فرمائے۔[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

تحریر: مولانا محمد اسحاق بھٹی

مولانا ابوبکر غزنوی، جن کو مرحوم لکھتے ہوئے دل دھڑکتا اور قلم کانپتا ہے۔ حضرت عبداللہ غزنوی کے پڑپوتے، حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی کے پوتے اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے فرزند ارجمند تھے۔ دودمانِ غزنویہ کے میر کارواں حضرت عبداللہ غزنوی جو محض اعلاء کلمۃ اللہ اور تبلیغ توحید وسنت کی اشاعت کے نتیجے میں اس وقت کے والیٔ افغانستان امیر دوست محمد کے تشدد کا ہدف بنے اور اسی جرمِ حق گوئی کی پاداش میں ترکِ وطن کر کے اپنے خاندان اور اہل وعیال سمیت پہلے لاہور آئے اور بعد میں امرتسر کے قریب ایک بستی ''خیر دین'' میں جا کر قیام پذیر ہوئے۔ کچھ عرصہ وہاں ٹھہرنے کے بعد امرتسر منتقل ہوئے اور پھر مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے بیٹے مولانا عبدالجبار غزنوی تھے، جو افغانستان سے ہجرت کے وقت اپنے عظیم باپ کے ہمرکاب تھے۔ یہ مولانا داؤد غزنوی کے والد گرامی تھے۔

مولانا عبداللہ غزنوی کے بارہ بیٹے تھے جو اپنے باپ کے ساتھ پنجاب میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ وہ سب کے سب علم وفضل کی دولت سے مالا مال اور تقویٰ و پرہیزگاری کی نعمت سے بہرہ ور تھے اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ قرآن وحدیث کی تبلیغ اور اللہ کے دین کی نشر واشاعت ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پنجاب میں دینِ حق کی اشاعت کے سلسلے میں اس خاندان کی مساعی جلیلہ اور جہدِ مسلسل تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ مولانا ابوبکر غزنوی اس سلسلۃ الذہب کی ایک مضبوط کڑی تھے۔ بے شک زمانہ ایک طویل جست لگا کر بہت آگے نکل گیا ہے، روحانیت کی جگہ مادیت نے لے لی ہے اور پرانی قدروں کی بساط الٹ گئی ہے لیکن مولانا ابوبکر غزنوی اس دور میں اپنے اسلاف کے اوصافِ حمیدہ کے صحیح رہنما تھے اور ان خصوصیات واقدار کے حامل تھے جو ان کے آباؤ اجداد نے اپنے ورثے میں چھوڑی تھیں۔ انہوں نے علم وفضل کی گود میں پرورش پائی تھی اور نیکی وصالحیت کے ماحول میں پلے بڑھے تھے۔ قدیم علوم سے بھی انہوں نے اپنا دامنِ طلب بھرا اور جدید میں بھی مہارت پیدا کی۔ وہ بیک وقت کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ تقریر میں ان کا ایک خاص انداز تھا، جس سے لوگ بہت اثر پذیر ہوتے تھے۔ وہ برمحل قرآن کی آیات اور احادیث پڑھتے اور بزرگانِ دین کے نصیحت آموز واقعات سناتے تھے۔ تحریر اور مقالہ نگاری میں بھی ان کو عبور حاصل تھا اور اس ضمن میں

الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی دروبست کا خاص خیال رکھتے تھے۔ شعر وشاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ کسی زمانے میں خود بھی شعر کہتے تھے مگر کبھی کبھی، کسی خاص کیفیت میں آکر۔ حافظہ اس درجہ تیز پایا تھا کہ عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار انہیں زبانی یاد تھے۔ اگرچہ کچھ عرصہ سے طریقت وتصوف کی خشک وادی میں چلے گئے تھے، مگر خوش طبعی بدستور موجود تھی اور دوستوں کی مجلس میں ایک خاص حد میں رہتے ہوئے طنز ومزاح کا سلسلہ پہلے کی طرح چلتا تھا۔ وہ بہترین استاد تھے اور خوب تیاری کر کے کلاس میں جاتے تھے۔ ان کے تلامذہ ان کے اسلوبِ تعلیم سے پوری طرح مطمئن اور بہت متاثر تھے۔ پھر تبلیغ توحید، اشاعتِ اسلام اور احیائے دین کا ایک خاص جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے اور ہر جگہ بلا جھجک اس کا اظہار کرتے تھے۔ انجینئرنگ یونیورسٹی میں بھی ان کا یہ سلسلہ جاری رہا جس سے طلباء میں گہرا دینی ذوق اُبھرا اور تبلیغی جذبہ پیدا ہوا۔ بہاولپور یونیورسٹی میں بھی انہوں نے اپنے اس اسلوب دعوتِ دین کو باقاعدہ جاری رکھا۔ یہی جذبۂ تبلیغِ اسلام انہیں جشنِ اسلامی کی تقریب میں شرکت کے لئے لندن لے گیا، جو ان کی حیاتِ مستعار کے خاتمے کا باعث بنا۔ وہ اپنے لیے شہادت کی دعا کیا کرتے تھے۔ ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور اللہ نے انہیں شہادت کے مرتبہ بلند سے سرفراز کیا۔ وہ جوانی کے عالم میں اللہ کو پیارے ہوئے اور اپنے اہل وعیال، احباب ومتعلقین اور اعزّہ واقارب سے ہزاروں میل دُور دیارِ غیر میں ان کا سانحۂ ارتحال پیش آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی دعوت وتبلیغ کا جذبہ صادقہ ہی انہیں وہاں لے گیا تھا اور اسی پر ان کا انتقال ہوا۔ لازماً اس کو شہادت فی سبیل اللہ سے تعبیر کیا جائے گا۔ مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر ان پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ ؎

اللہ ہی کے رستے میں جو موت آئے تو اچھا
اکسیر یہی ایک دعا میرے لیے ہے

ابوبکر غزنوی نے جوانی ہی کی عمر میں ترقی وتقدم کی بہت سی منزلیں طے کیں اور بڑی عجلت کے ساتھ طے کیں۔ اللہ نے ان کو اپنے بے شمار انعامات سے نوازا اور ان کو خدمتِ علم ودین کے مواقع عطا فرمائے جن کو انہوں نے اللہ کے دین ہی کے لیے استعمال کیا۔ وہ انہیں ضرور اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے گا اور ان کی مغفرت کا ذریعہ بنائے گا۔

ابوبکر غزنوی کی موت ایک فردِ واحد کی موت نہیں ایک بہت بڑے علمی خاندان کی موت ہے اور تبلیغِ اسلام کے ایک ادارے کا نوحہ ہے۔ اس قسم کے لوگ روز پیدا نہیں ہوتے ان کی موت سے جہاں علم ودانش کے حلقوں میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے، تبلیغ ودعوت کی فضاؤں میں اداسی چھا گئی ہے اور تعلیم کی دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے وہاں خاندانِ غزنویہ کا چراغ بھی گل ہو گیا ہے۔ یہ اس بلند مرتبت خاندان کی آخری نشانی تھے، ان کے بعد اس خاندان میں جس کے بزرگوں نے اپنی شمع علم اور مشعل تصوّف سے ظلمت کدہ ہند میں پھیلی ہوئی ظلمتوں میں نور وضیاء کے سامان فراہم کئے تھے تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ افسوس ہے بظاہر دورِ گزشتہ کی روایات کے زندہ ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

تاہم مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ روشنی کی کوئی کرن نمودار کر دے۔

مولانا ابوبکر غزنوی کے نانا حضرت مولانا عبدالاوّل غزنوی تھے جو علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے زیور سے آراستہ تھے۔ ان کی وفات 1911ء میں ہوئی تھی۔ دادا کا اسم گرامی مولانا عبدالجبار غزنوی تھا جو امام صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ انہوں نے 1913ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ یہ دونوں بزرگ علم و فضل میں یگانہ اور ورع و عبادت میں منفرد تھے۔ ان کے واقعات بیان کرتے ہوئے ان کے ایک ارادت مند بزرگ نے بتایا کہ جب مولانا عبدالاوّل کا انتقال ہوا تو امام صاحب کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور فرمایا: ''عبدالاوّل، اللہ کی ایک نعمت تھے۔ ہم نے ان کی قدر نہ کی اور اللہ نے یہ نعمت ہم سے چھین لی۔''..... اس مادی دور میں ان الفاظ کا اطلاق ابوبکر غزنوی مرحوم پر بھی ہوتا ہے۔ اس چھوٹی عمر میں اللہ نے اسلام کے لیے تڑپ اور اخلاص ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور یہی ان کا سرمایہ زندگی تھا۔ ورنہ دنیا کی کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی حتیٰ کہ رہنے کے لیے مکان بھی نہ تھا۔ وہ اپنے تمام دنیوی اعزازات کے باوجود دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی عمارت کے ایک گوشے میں سکونت گزین تھے اور یہی ان کے عظیم باپ مولانا سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ کا مسکن تھا۔

ابوبکر غزنوی سے میرے تعلقات دسمبر 1948ء سے قائم تھے جب وہ ایم اے عربی کے طالب علم تھے، میرا اور ان کا کمرہ قریب قریب تھا۔ اس طویل مدت میں ان سے بے شمار باتیں ہوئیں، بہت سے مسائل پیش آئے نرم و گرم گفتگو تک بھی نوبت پہنچی۔ وہ آج کل کچھ علمی پروگرام مرتب کر رہے تھے افسوس ہے موت نے اس پر عمل کی مہلت نہ دی۔

الوداع! اے ابوبکر!! الوداع!!! اب تو ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا ہے۔ یہ مادی دنیا تجھے راس نہیں آئی، اللہ نے تجھے اپنے سایۂ رحمت میں اپنے پاس بلا لیا ہے۔ تیرا جسدِ خاکی آج سپردِ خاک ہو رہا ہے اور تیری روح اعلیٰ علیین میں چلی گئی ہے۔ تو شہادت کا متمنی تھا اور اسی کی دعا کرتا تھا، اللہ نے تیری دعا قبول فرمائی اور تجھے درجہ شہادت عطا فرمایا ..... تیری تعزیت کے لیے کس کے پاس جائیں، ہر صاحبِ دل تیرا وارث ہے، ہر شخص تیرے اخلاص کا مداح ہے اور تیرے لیے دعا گو ہے۔

أیتها النفس المطمئنة ارجعي إلى ربك راضية مرضية فادخلي في عبادي وادخلي جنتي
یرحمك الله إلي یوم التلاق.[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (7 مئی 1976ء و 18 اکتوبر 1976ء)

مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعزیت

تقریر: مولانا عبدالغفار حسن

(مرسلہ: عبدالغفور متعلم اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ)

بتاریخ 5 جمادی الاولیٰ 1396ھ بمطابق 4 مئی 1976ء پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کی وفات حسرتِ آیات کے سلسلہ میں دارالحدیث مدینہ منورہ میں پاکستان اور اردو بولنے والے دوسرے ممالک کے طلبہ کا تعزیتی جلسہ ہوا جس میں ہر مکتبِ فکر کے طلبہ شریک ہوئے۔

اس جلسہ میں اظہارِ افسوس اور دعاء پر مشتمل قرارداد پیش ہونے کے بعد ہمارے استاذ و مربی حضرت مولانا عبدالغفار حسن صاحب مدرس جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ نے اپنی تقریر میں حسبِ ذیل نکات پر اظہار خیال کیا۔

① پیش کردہ تعزیتی قرارداد میں دو لفظ ایسے درج کیے گئے ہیں جو مناسب نہیں ہیں:

الف: ''بے وقت موت'' عام طور پر جب کوئی قابلِ قدر شخصیت دنیا سے کوچ کرتی ہے تو یہ لفظ کہا یا بولا جاتا ہے، حالانکہ جس وقت بھی کسی شخص کی وفات ہوتی ہے، وہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ وقت ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ﴾ (آل عمران:145)

یعنی ''کسی شخص میں طاقت نہیں ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر مر جائے (اس نے موت کا) وقت مقرر کر کے لکھ رکھا ہے۔''

ب: مولانا مرحوم کو روشن خیال کہا گیا ہے، یہ لفظ آج کل بہت ہی گمراہ کن معنوں میں استعمال رہا ہے۔ اس سے پرہیز ضروری ہے۔

② واضح رہے کہ یہ اجتماع کسی ماتم یا گریہ زاری کے لیے نہیں منعقد کیا جا رہا ہے۔ بلکہ اس آیت پر عمل مقصود ہے:

﴿وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ﴾ ان کو خدا کے دن یاد دلاؤ، یہاں دن سے مراد واقعات و حوادث ہیں۔ یعنی جو حوادث رونما ہوتے رہتے ہیں، ان سے عبرت حاصل کریں اور کسی عظیم شخصیت یا قابلِ قدر کارکن کی رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے کیسے پُر کیا جائے۔ اس پر اجتماعی طور پر غور کیا جائے اور آپس میں ایک دوسرے کو صبر و ضبط کی تلقین کی جائے اور مرحوم کے پسماندگان کو بھی سب کی طرف سے قرارداد کی صورت میں پیغامِ

تعزیت پہنچایا جائے۔

③ سید ابوبکر غزنوی مرحوم کی شخصیت گوناں گوں اوصاف وخصوصیات کی حامل تھی۔

الف: قدیم دینی علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ جدید علوم پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مرحوم قدیم و جدید کا حسین امتزاج تھے اور اس دور کے گمراہ کن افکار ونظریات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ آپ کو ایسے افراد تو بہت ملیں گے جو صرف قدیم علوم سے واقفیت رکھتے ہیں یا محض جدید افکار ونظریات پر ہی ان کی نظر ہے لیکن ایسی مثالیں شاذ ونادر ہی ملیں گی جو قدیم وجدید کی جامع ہوں۔ ہمارے دینی مدارس کے طلبہ کا فرض ہے کہ وہ قدیم دینی علوم میں گہری بصیرت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ جدید علوم اور انگریزی زبان میں بھی مہارت پیدا کریں۔ اس طرح آپ مرحوم سید غزنوی کی رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پُر کرنے کی کوشش کریں۔ واضح رہے کہ انگریزی زبان کی تعلیم سے انگریزی تہذیب وثقافت کو اپنانا مقصود نہ ہو، بلکہ انگریزی زبان کے ذریعہ موجودہ دور کے افکار ونظریات کا براہِ راست ناقدانہ مطالعہ مطمحِ نظر ہونا چاہیے۔ اس طرح آپ صحیح معنوں میں اسلام کی ٹھوس خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دورِ پُرفتن میں دعوت وتبلیغ کے وہی علمبردار ہو سکتے ہیں جو اپنے زمانہ کے حالات، نشیب وفراز اور فکری واخلاقی فتنوں سے پوری طرح باخبر ہوں۔

ب: سید غزنوی مرحوم کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ سیاسی جکڑ بندیوں اور مذہبی دھڑے بندیوں سے بالاتر ہو کر اسلام کی برتری کے لیے کوشاں تھے۔ انہوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وقت کا بڑا تقاضا یہ ہے کہ نئی نسل کو صحیح اسلام سے روشناس کرایا جائے اور اس دَور کے مسحور کن فتنوں سے محفوظ رکھا جائے۔ اس بنا پر انہوں نے اپنی سرگرمیوں کی جولانگاہ جدید درس گاہوں کو بنایا تھا۔ ان کالجوں میں قادیانی، پرویزی، اشتراکی، الحاد واباحیت کے فدائی اور صوبائی وعلاقائی زہر پھیلانے والے اساتذہ نئی نسل کو گمراہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس صورتِ حال کے ہوتے ہوئے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ صحیح فکر وعقیدہ رکھنے والے اہلِ علم اس زہر کا تریاق لے کر کالجوں میں پہنچیں اور بھٹکتے ہوئے نوجوانوں کو سیدھی راہ دکھائیں۔ بس یہ احتیاط ضروری ہے کہ یہ اساتذہ حضرات ان جدید درس گاہوں میں جا کر ''ہر چہ در کان نمک رفت نمک شد'' کے مصداق نہ بننے پائیں بلکہ اپنا تشخص برقرار رکھتے ہوئے دینِ حق کے لیے کام کریں۔

ج: مرحوم کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے فرقہ وارانہ تنگ دامانی سے باہر رہتے ہوئے کھلی فضا میں ہر مکتب فکر کے افراد سے ربط وضبط قائم رکھا اور یہ طرزِ عمل ان کو اپنے والد محترم مرحوم ومغفور سے ورثہ میں ملا تھا۔ باوجود فقہی اختلافات کے مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ اور مفتی محمد حسن علیہ الرحمۃ میں گہرے روابط اور مراسمِ محبت

قائم تھے اور اسی وسعت ظرفی کا نتیجہ تھا کہ مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی زندگی میں ہمیشہ مولانا احمد علی صاحب رحمہ اللہ نے ان کی اقتدا ہی میں عیدین کی نماز ادا کی۔

د: تنقید کے معاملہ میں مرحوم سید ابوبکر غزنوی انتہائی جرأت مند اور بے باک تھے۔ اپنے والد محترم کی طرح آواز میں رعب و جلال اور پُرشکوہ دبدبہ تھا۔ مرحوم اپنے والد کا بڑا احترام کرتے تھے جیسا کہ ان کی مرتب کردہ تصنیف ''حضرت مولانا داؤد غزنوی سیدی و ابی'' سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی بات کھٹکتی تو ادب کے ساتھ تنقید کیے بغیر نہ رہتے۔ اپنے والد کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے والدِ محترم کی خدمت میں عرض کیا کہ دینی جماعت کی تنظیم و تشکیل سیاسی جماعت کے طرز پر نہیں ہونی چاہیے۔ آخر یہ کیسے مناسب ہے کہ کانگریس کے دستور کا چربہ دینی جماعت کے آئین میں شامل کرلیا جائے۔ دینی جماعت کا اپنا خاص مزاج اور رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ اوکما قال [1]

عزیز طلبہ کا فرض ہے کہ اکابر کی اندھی عقیدت و تقلید سے بالاتر ہو کر اپنے اندر روحِ تنقید پیدا کریں۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو مرحوم کی اچھائیاں اپنانے کی توفیق عطا فرمائے، ان کی لغزشیں معاف فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور ان کے صاحبزادگان کو ان کا صحیح معنی میں جانشین بنائے۔

اللّٰھُمّ لا تحرمنا أجره ولا تفتنا بعده، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين. [2]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ (ص: 264، 265)

[2] ہفت روزہ المنبر (2 جون 1976ء)، ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

خاندانِ غزنویہ کا درخشندہ ستارہ

انہیں بھی یاد کرو جب کبھی بہار آئے

تحریر: آغا طاہر سلیم قصوری، تبلیغی کالج کراچی

حضرت مولانا سید ابوبکر غزنوی سابق وائس چانسلر بہاولپور یونیورسٹی جو لندن میں منعقدہ جشن اسلامی کی تقریب میں شرکت کرنے والے وفد کے ممتاز رکن تھے۔ آپ 3 اپریل 1976ء کو لندن پہنچے۔ اسی روز 4، 5 اپریل کی درمیانی شب کار کے حادثہ میں آپ کی ہنسلی، دونوں ٹانگیں اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ آپ کو ویسٹ منسٹر ہسپتال لندن میں داخل کیا گیا جہاں وہ 25 اپریل کو اس دارِ فانی سے عالم بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ ان کی میت بذریعہ طیارہ 29 اپریل کو لاہور لائی گئی جہاں 2:30 بجے دوپہر سے رات کے آٹھ بجے تک آخری دیدار کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ریلوں، بسوں اور ہوائی جہاز کے ذریعے ملک گوشہ گوشہ سے لوگ لاہور پہنچے۔ یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہزاروں لوگوں نے اشکبار آنکھوں سے نماز جنازہ پڑھی اور میانی صاحب کے قبرستان میں مولانا سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ (والد حقیقی) کے پہلو میں آپ کو دفن کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یوں تو دنیا میں ہر روز انسان پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں یہاں پر کسی کے لئے بقا نہیں، ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝﴾ یہاں تو انسان پیدا ہی اس لئے ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن اُسے اجل کے ترکشِ نازکِ خدنگ کا نخچیر [شکار] ہونا ہے، ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ لیکن اس دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جس کی موت سے ایک ایسا خلاء پیدا ہو جاتا ہے جو سالہا سال تک پُر نہیں ہوتا۔

سید ابوبکر غزنوی ایک جامع الصفات انسان تھے۔ قدرت نے انہیں دل و دماغ کی بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا موصوف ایک خاص سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ یہ سانچا اب ٹوٹ چکا ہے اور اس عہد کے لوگ بھی رفتہ رفتہ اُٹھتے جا رہے ہیں۔ سید صاحب فکر ونظر اور جہد وعمل کے ایک خاص عہد کی پیداوار تھے۔ اس عہد نے واقعۃً ہماری قومی صفوں میں بڑے بڑے آدمی پیدا کئے۔ سید صاحب گویا اس محفل کا آخری چراغ تھے۔ ایک دو نشانیاں اور ہوں گی لیکن وہ بھی مہمانِ یک دو نفس ہیں ؏

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

آپ ایک بلند پایہ خاندان کے چشم و چراغ اور تحریک آزادی کے عظیم رہنما مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے

صاحبزادے تھے۔

سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ اگر کسی اور ملک میں ہوتے یا اس ملک کے بہترین دور میں ہوتے تو لازماً ملک میں ان کا طوطی بولتا، معاصرین انہیں آنکھوں پر بٹھاتے، دوستوں میں ڈنکا بجتا، دشمن بظاہر قدح' باطن مدح کرتے۔ لیکن قدرت نے انہیں اس ملک اور زمانے میں پیدا کیا جس ملک میں دشمن کم ظرف اور دوست بے حوصلہ ہیں۔ کسی چیز کی بہتات ہے تو وہ حاسدوں کا گروہ ہے! علم کی کمی، ذوق کی محرومی، جہد کی نامرادی، ایثار کے فقدان، استقامت کی جانکنی اور رفاقت کی بے ہجری نے اپاہجوں کی ایک جماعت پیدا کر دی ہے جو اپنی محرومیوں کا انتقام دوسروں کی کامیابیوں سے لیتی ہے اور اپنی خاکستر میں سلگتی رہتی ہے۔

سید صاحب کی پاکیزہ نورانی صورت ان کی پاکیزہ سیرت کی ترجمان تھی۔ ان کا شگفتہ چہرہ ان کے کھلے دل کا آئینہ تھا۔ ان کی رسیلی آواز' چمکدار آنکھوں سے ان کی طباعی اور ذہانت کا پردہ فاش ہوتا تھا۔ اور ان کے بشرہ کی رعنائی، ان کے اخلاق کی صفائی اور طبیعت کی ستھرائی کا نشان تھی جس کا ظہور ان کے مجلسی کلام اور اجتماعی بیان بلکہ ان کی ایک ایک ادائے دلربا سے ہوتا تھا۔ ان کی بے نظیر خطابت جہاں اسلامی مقاصد کی ترجمان تھی وہیں اسلامی مدافعت کے لئے مضبوط ترین سپر بھی تھی۔ خطابت ان کی جاذبیت کا ایک جادو تھی جس میں بے پناہ کشش تھی انسان ان کی تقریر کی مسلسل زنجیر میں جکڑا ہوا محسوس ہوتا تھا جس میں سے کسی کا اکتا کر اُٹھ جانا تو کیا معنی اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ان کی تقریر انہیں جکڑ کر باندھ لیتی تھی اور کیا مجال تھی کہ کوئی شخص اپنی توجہ کو بھی ان سے ہٹا سکے۔ یہ کشش محض الفاظ کی نہ تھی اور محض الفاظ میں یہ جاذبیت ہو بھی نہیں سکتی جب تک کہ الفاظ میں یہ گہری معنویت نہ ہو اور محض معنویت بھی زنجیر کشش نہیں بن سکتی جب تک اس معنویت میں معرفت نہ ہو اور محض معرفت بھی کشش کے اس مقام پر نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ اس میں محبت نہ ہو۔ اسی لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بے مثال خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ معانی، صاحبِ معرفت اور صاحبِ عشق و محبت تھے۔ بالفاظِ دیگر وہ صاحبِ لسان نہ تھے بلکہ صاحبِ دل انسان تھے۔ عشق نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی رگ وپے میں سمایا ہوا تھا۔ اسی سے ان کے جوش کا تعلق تھا اور اسی سے ہوش کا اور اسی سے ان کی خطابت کا چشمہ ابلتا تھا جس میں دوسروں کے دلوں، رگ وپے میں سما جانے کی صلاحیت ہوتی تھی۔

شاید کالی داس نے آپ ہی کے متعلق کہا تھا کہ رعد کی گونج، بادل کی گرج، ہوا کا فراٹا، فضا کا سناٹا، صبح کا اجالا، چاندنی کا جھالا، ریشم کی جھلملاہٹ، ہوا کی سرسراہٹ، گلاب کی مہک، سبزے کی لہک، آبشار کا بہاؤ، شاخوں کا جھکاؤ، طوفان کی کڑک، سمندروں کا خروش، پہاڑوں کی سنجیدگی، صبا کی چال، اوس کا نم، چنبیلی کا پیراہن، تلوار کا لہجہ، بانسری کی دھن، عشق کا بانکپن، حسن کا اغماض اور کہکشاں کی مسجع و مقفیٰ عبارتیں جب انسانی پیکر میں ڈھلتی ہیں تو ابوبکر غزنوی کا مرقع تیار ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سید صاحب کو ایسا نسب عطا فرمایا جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ یہ وہ خاندان ہے جس کی ایک ایک کرن آفتاب جہاں تاب بن کر چمکی۔ یہ عظیم خاندان علم و عمل کا گہوارا رہا جس میں امام طریقت مولانا سید عبداللہ غزنوی، فاتح مرزائیت مولانا عبدالحق غزنوی، ناشر کتب اسلامی مولانا عبدالغفور غزنوی، مشیر سلطان ابن سعود (حکومت سعودیہ) مولانا اسماعیل غزنوی، پروفیسر سید ابوبکر غزنوی وغیرھم۔ ان کواکب افلاک کی قبا پاشیوں سے کفر و بدعت کی گھٹا ٹوپ تاریکیاں کافور ہو گئیں۔ ان عظیم ہستیوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں گم کردہ راہ قوم کو درسِ حیات دیا۔ حق و باطل کا وہ کون سا معرکہ ہے جسے سر نہ کیا ہو۔ دین حق کی تبلیغ و اشاعت کا وہ کون سا مرحلہ ہے جہاں اس خاندان نے علمی گوہر افشانی نہ کی ہو۔ جہاد کا میدان ہو یا اتحاد کا، علمی ہو یا تبلیغی، سیاسی ہو یا معاشی، کالج کا ماحول ہو یا اسمبلی کا ایوان ہر جگہ غزنوی علماء صف اوّل میں دکھائی دیتے ہیں۔ سید صاحب کی پرکشش شخصیت ان کے علم و فضل، ان کی فصاحت و بلاغت، ان کی چال، ان کی گفتار، ان کا دلنشین اسلوبِ بیان اور لیکچر کا وہ انداز جس میں شعر و ادب پڑھاتے پڑھاتے قرآن و حدیث، فقہ اور مسائل تصوّف اس حسین اور مؤثر ترین انداز سے دل و دماغ میں اتار دیتے تھے کہ آج بھی ان کی چاشنی سے دل و دماغ باغ و بہار ہیں۔ وہ چال، وہ گفتار، وہ کردار وہ کون سی خوبی تھی جو اس شخصیت میں نہیں تھی۔ ان کی ذات قدیم و جدید کا سنگھم تھی۔ ان کا خطبہ، ان کی تقریر، ان کی گفتگو ہمیشہ علمی ہوتی۔ اسلوبِ بیان اس قدر آساں ہوتا کہ ہر سطح کا آدمی اُسے سمجھ سکتا تھا، اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ بیان اس قدر حسین اور مؤثر ہوتا تھا کہ ان کی ایک ایک بات دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی۔ جب وہ تقریر کے لئے کھڑے ہوتے تو ایک سناٹا محفل پر طاری ہو جاتا۔ علماء الگ لطف اندوز ہوتے، طلباء اور نوجوان طبقے اپنی جگہ شادماں نظر آتے تھے۔ پروفیسر حضرات اپنی جگہ خوش نظر آتے۔ وکیل، انجینئر، جج سمجھ رہے ہوتے تھے کہ ان کے دل کی بات ہو رہی ہے۔ شعراء، ادیب حضرات ان کے ادبی چٹکلوں سے محظوظ ہوتے۔ عام پڑھے لکھے لوگ خطاب کی مقصدیت کو دیکھ کر خوش ہوتے کہ ان کے دل کی بات بیان ہو رہی ہے۔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

فن خطابت کے وہ شہوار تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور آغا شورش کاشمیری (رحمۃ اللہ علیہم) کی طرح قادر الکلام خطیب بھی تھے۔ بات ہمیشہ مدلل اور مربوط کرتے تھے۔ الفاظ کی تراش خراش کا انہیں بے پناہ ملکہ حاصل تھا۔ وہ فصاحت و بلاغت کے موتی رولتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کے بعد آج تک برصغیر پاک و ہند میں کوئی ایسا صاحب طرز خطیب نظر نہیں آتا جسے بیک وقت قدیم اور جدید علوم پر دسترس کے ساتھ ساتھ ایسی قادر الکلامی بھی عطا ہوتی ہو جو سید ابوبکر غزنوی کو حاصل تھی۔

سید صاحب کو اسلام سے والہانہ پیار تھا۔ وہ کسی بھی مجلس میں اسلام کے خلاف کوئی بات نہ سن سکتے تھے۔ اسلام کی

حقانیت کے بارہ میں سید صاحب اتنے دلائل پیش کرتے کہ دوسرے انسان کو بھی قائل ہونا پڑتا۔ 1970ء کے انتخابات میں اسلام اور سوشلزم کی بحث جاری تھی تو سید صاحب نے باوجود سرکاری ملازمت کے اسلام کی بھرپور [حمایت] کرتے ہوئے سوشلزم کی حامیوں کے دلائل کا تار پود بکھیر دیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ سوشلزم کی وکالت کرنے والے اسلامی تعلیمات سے ناواقف اور ذہنی وفکری انتشار کا شکار ہیں۔ اسلام کے روشن سورج کے ہوتے ہوئے مٹی کے دیئے کی تلاش کرنے والے احمق ہیں۔ ان کا اسلامی تعلیمات پر عبور کا یہ عالم تھا کہ جب انہوں نے عالمی سیرت کانفرنس میں اپنا مقالہ پڑھا تو مندوبین حیرت سے منہ تکتے رہے اور اس نشست کے مہمانِ خصوصی حمود الرحمان سابق چیف جسٹس آف پاکستان بے ساختہ پکار اٹھے کہ ہمیں آج پتہ چلا کہ مولانا سید ابوبکر غزنوی کس پایہ کے عالم ہیں اور میں ان کے آگے طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتا ہوں۔

سید ابوبکر غزنوی جلد ہی آفتاب بن کر چمکے اور جلد غروب ہو گئے۔ موت ایک انسان کو خاموش تو کر سکتی ہے لیکن اس کی صفات اور کردار وعمل کی خوبیاں ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام دیتی ہیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا اسماعیل سلفی اور آغا شورش کاشمیری (رحمۃ اللہ علیہم) کے بعد چشم کائنات نے ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی جنازہ اٹھتا ہوا دیکھا۔ شیش محل روڈ پر انسانوں کا ایک امڈتا ہوا ہجوم تھا۔ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر علماء رو رہے تھے، خطباء رو رہے تھے، صلحاء رو رہے تھے۔ جدائی کے ان لمحات میں رونا ایک قدرتی امر ہے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر دل خونفشاں تھا اور ہر نظر عالم فانی کے اس مسافر کے تابوت پر گڑی ہوئی تھی۔ جنازہ اُٹھا سید ذی وقار اب اہل وعیال کو گریہ کناں چھوڑ کر عقیدت مندوں کے شانوں پر سوار اس دنیا کی طرف قدم فرما ہو گئے۔ سید صاحب ہم سے رخصت نہیں ہوئے بلکہ ہم ایک ہمہ گیر شخصیت سے محروم ہو گئے اور اتنی دور چلے گئے جہاں سے کوئی نہیں آتا۔ وہ اب نہیں آئیں گے کہ ایک روز ہم بھی ان سے جا ملیں گے ؏

اللہ بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں [1]

---

[1] ہفت روزہ اہلحدیث، لاہور (12 مئی 1978ء)

سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

شخصیت اور یادیں

تحریر: سلیم تابانی

مولانا ابوبکر غزنوی کا شمار موجودہ دور کے ان علماء اور دانشوروں میں ہوتا تھا جن کی نظر مسائل کے فطری پہلو کے ساتھ عملی پہلو پر بھی ہوتی ہے اور جو دینی مصلحتوں سے آگاہ ہیں۔ ہر چند اس دور میں علماء کی کمی نہیں اور جدید اصطلاحی دانشوروں کی قلت کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن ایسے حضرات کی ہمیشہ کمی رہی ہے اور اب تو قحط کی سی کیفیت ہے جو علم وفضل کے ساتھ نکتہ رس طبیعت بھی رکھتے ہوں اور ہر بات کی تہہ تک پہنچ جانا ان کے لیے آسان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے سید موصوف کو جہاں علم وفضل اور کردار وعمل کی خوبیوں سے نواز تھا اور صاف ستھرا اور اجلا ادبی ذوق بخشا تھا وہاں نکتہ رس طبیعت بھی عطا کی تھی جس کی بدولت وہ بہت جلد ایک خاص مقام پر فائز ہو گئے اور خدمت دین اور خدمت خلق کے جذبہ سے بیتاب رہنے لگے۔ واحسرتا کہ ان کے فضل وکمال سے ملک وقوم نے استفادے کا آغاز ہی کیا تھا کہ ان کی شمع حیات لو دے گئی اور اس دیار میں داعیٔ اجل نے ان کو آن پکارا جس کی دانش وتہذیب کے جلوے ان کی نگاہ کو کبھی خیرہ نہ کر سکے تھے اور جن کی مرعوبیت کو ختم کرنا انھوں نے اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا۔

پروفیسر موصوف برعظیم پاک وبھارت کے ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے علمی، عملی اور اصلاحی کارناموں کے بدولت منفرد وممتاز حیثیت رکھتا ہے اور جس کی دینی وسیاسی خدمات اس سرزمین میں مسلمانوں کے تاریخ کا ایک زریں باب ہیں۔ اس خطہ ارضی میں ان کے مورث اعلیٰ حضرت عبداللہ غزنوی اپنے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی وجہ سے وقت کے امام مانے جاتے تھے اور لوگ بلا امتیاز عقیدہ ومسلک کا احترام کرتے تھے۔ ان کے والد ماجد مولانا سید داؤد غزنوی کی عملی وسیاسی زندگی کا حال ظفر علی خان نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

قائم ہے ان سے ملت بیضا کی آبرو
اسلام کا وقار ہیں داؤد غزنوی
رجعت پسند کہنے لگے ان کو دیکھ کر
آیا ہے سومنات میں محمود غزنوی

پھر سب سے بڑھ کر سید ابوبکر غزنوی خود ایک ثقہ عالم دین تھے، نکتہ رس طبیعت پائی تھی اور دین کے مزاج شناس تھے۔ ظاہر ہے جس شخص کی ذات میں اتنی خوبیاں جمع ہو جائیں۔ علم دین کے گھرانے میں ان کی پیدائش ہوئی ہو، علم

دین کے ماحول میں اس نے آنکھیں کھولی ہوں، علم دین کے زیر تربیت پروان چڑھا ہو اور پھر علم دین نے اپنی رفاقت و خدمت کے لیے اسے چن لیا ہو اس کے فضل و کمال کا کیا عالم ہو گا اور کیسے کیسے نیک اور اعلیٰ جذبات اس کے نہاں خانۂ دل میں کروٹیں لیتے ہوں گے۔

مولانا سید غزنوی فطرتاً علم دوست، مطالعہ پسند اور کم آمیز قسم کے آدمی تھے۔ جن لوگوں نے ان کا بچپن دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ کتاب و مطالعہ سے ان کا کتنا گہرا دلی تعلق تھا۔ ابھی ان کا ابتدائی تعلیمی زمانہ ہی تھا کہ ان کا کتاب سے شغف اور مطالعہ کا شوق دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔

ابھی سے شوخیاں ان کی بلائیں لیتی ہیں
جو کمسنی ہے قیامت شباب کیا ہو گا!

چینیانوالی مسجد کا ماحول ہوتا تھا اور سید ابوبکر غزنوی اور کتاب ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ اردو، فارسی اور انگریزی زبان پر بھی پوری دسترس رکھتے تھے اور ان زبانوں میں بھی انھیں اہل زبان کی سی مہارت حاصل تھی تاہم عربی زبان نے کئی وجوہ سے اپنی محبت کا اسیر اور اپنے دامِ وفا کا نخچیر بنا لیا تھا اور اس میں انھوں نے خاص قابلیت واستعداد بہم پہنچائی تھی۔ بچپن ہی میں عربی سے ان کا ربط وعلاقہ کا یہ عالم تھا کہ اہل زبان کو اپنی زبان دانی سے متاثر کرنے اور داد وانعام پانے لگے تھے۔ پھر جب انھوں نے پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے عربی کا امتحان دیا تو صوبہ بھر میں اول رہے۔ اس طرح محبوبِ کائنات ﷺ اور اپنے دین کے اصل ماخذ کی زبان سے محبت کا حق ادا کر دیا۔

پروفیسر ابوبکر غزنوی نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں عربی کے لیکچرر کی حیثیت سے کیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد اسلامیہ کالج سول لائنز کو ڈگری کالج کی حیثیت حاصل ہوگئی تو موصوف شعبۂ عربی کے صدر بن کر وہاں منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں عربی کے خصوصی لیکچر بھی دیتے تھے۔ اس کے بعد جلد ہی انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور نے اپنے دروازے ان کے لیے کھول دیے اور شعبۂ اسلامیات کے صدر کی حیثیت سے وہاں اٹھ گئے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں ان کے تقرر سے پہلے بعض تعلیمی حلقوں میں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ آیا فنی درسگاہوں میں اسلامی تعلیمات کا شعبہ ہونا چاہیے یا نہیں اور کچھ سرے سے اس کے مخالف تھے کہ کسی فنی درسگاہ میں اسلامیات کا شعبہ کھولا جائے لیکن پروفیسر ابوبکر غزنوی نے ایک فنی درسگاہ کے طلبہ کے لیے اسلامیات کا ایسا نصاب مرتب کیا اور اس انداز سے پڑھائی شروع کی کہ تعلیمی حلقے حیران رہ گئے اور معلوم ہوا کہ اسلامیات کا مطالعہ فنی طالب علموں کے لیے بھی اسی قدر ضروری اور آسان ہے جس قدر آرٹس کے طلباء کے لیے ضروری اور سہل ہے۔ اس کے بعد بہاولپور یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے طور پر ان کا تقرر ہوا اور ابھی وہ یونیورسٹی کے اصلاح وترقی کے پروگراموں پر عمل کرا ہی رہے تھے اور یونیورسٹی کا معیار بلند ہو رہا تھا کہ موت آگئی اور وہ اللہ کو عزیز ہو گئے۔

مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات متعدد اوصافِ فاضلہ کا مجموعہ تھی، وسعتِ مطالعہ، معلومات کی فراوانی نے جہاں ان کے اندر صحت مند تنقید وتقریظ کا ملکہ راسخہ پیدا کر دیا تھا وہاں بعض مسائل میں پر اعتماد محقق کی طرح اپنی انفرادی رائے بھی رکھتے تھے۔ وسعتِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ ابھی ہیگل کا فلسفہ اور مارکس کی معاشیات پر گفتگو ہو رہی ہے اور ایسے مضبوط دلائل کا ساتھ دونوں نظریات کی تردید کر رہے ہیں کہ معقولات ومنقولات کا دفتر کھلا ہوا ہے اور معاً تفسیر، حدیث اور فقہ کے مسائل پر بولنے لگے ہیں اور ابن کثیر، زمخشری اور رازی کے حوالے دے رہے ہیں اور امام احمد بن حنبل، امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے ارشادات پیش کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسلامیانِ ہند کی مذہبی، معاشرتی اور سیاسی ومعاشی زندگی موضوعِ گفتگو بن رہی ہے اور شواہد کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی سنی سنائی بات نہیں ہو رہی بلکہ گہرا مطالعہ ہے جو بول رہا ہے اور علم کی گرہیں کھول رہا ہے۔

آج کل ہمارے ہاں حدیث اور سیرت وتاریخ کے واقعات کے بیان میں جس طرح بے احتیاطی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ انتہائی قابلِ افسوس ہے۔ سید ابوبکر غزنوی اس بے احتیاطی اور اس کے نتائج سے کما حقہ آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پس پردہ اسلام دشمنوں کی سازش کارفرما ہے اسی لیے وہ جب کوئی حدیث بیان کرتے تو پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد اور جب سیرت وتاریخ کوئی واقعہ ان کی زبان پر آتا تو پوری صحت اور تاریخی یقین کے ساتھ ادا ہوتا تھا۔

سید موصوف کے خاندان کا انفرادی اور امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بدعت وضلالت کے خلاف ایک محاذ قائم کیا اور اپنے علم وفضل اور کردار وعمل سے دین خالص کی تبلیغ مجاہدانہ انداز سے کی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء

سید ابوبکر غزنوی بھی اپنی خاندانی روایت عمل پیرا رہے اور اسلام کے گہرے مطالعے کا تقاضا بھی ان سے یہی تھا لیکن انھوں نے اس سلسلہ میں جو طریق کار اختیار کیا اور وقتی تقاضوں کے تحت جس جادۂ اعتدال پر گامزن رہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے انتقال کے بعد لوگ یہ سوچنے لگے کہ موصوف کیا مسلک رکھتے تھے اور مسلمانوں کے کس مکتبِ فکر کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی تقریروں اور تحریروں میں اگر محبت واخوت کی باتیں، محبت واخوت کی داستانیں اور محبت واخوت کے محاسن کا بیان ہوتا تھا تو اس لیے نہیں کہ انھوں نے اپنا وہ آبائی مسلک چھوڑ دیا تھا جسے وہ اپنے عمیق اور گہرے اسلامی مطالعہ کے بعد حق سمجھتے تھے، بلکہ یہ اس لیے تھا کہ مسلمانوں کی زبوں حالی اور نکبت وادبار کا علاج اس دور میں ان کے نزدیک یہی تھا کہ مسلمان پھر سے محبت واخوت کے رشتے میں منسلک ہو جائیں اور لا تفرقوا پر عمل پیرا ہو کر اتحاد واتفاق کی دولت سے مالا مال ہو جائیں، وگرنہ جہاں تک ان کے مسلک کا تعلق تھا وہ ان کی تقریروں، تحریروں اور ان کی گفتگو کے دوران دلائل وحوالہ جات سے دیکھا جا سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ اور رسول ﷺ اور صحابہ کرام کے بعد کن لوگوں کو قابلِ استناد سمجھتے تھے اور اپنی باتوں کو ان کے ارشادات وملفوظات سے آراستہ کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل، امام ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، علامہ ابن کثیر اور شاہ ولی اللہ (رحمہم اللہ) وغیرہم حضرات کے علمی مباحث سے ان کا خصوصی تعلق تھا اور زیادہ تر مسائل میں انہی حضرات کی کاوشوں سے متاثر تھے۔

سید ابوبکر غزنوی کے نمایاں اوصاف میں ایک نمایاں وصف یہ تھا کہ تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں نمود ونمائش کو سخت ناپسند کرتے تھے اور ان اجری الا علی اللہ کی راہ پر گامزن رہنا ہی اسلام کی صحیح خدمت سمجھتے تھے۔ علماء حق اور پاکستان کی ممتاز علمی شخصیتوں سے ان کو خصوصی محبت تھی اور ان کی محفل میں بیٹھنا اور مسائل شرعیہ کے سلسلے میں ان سے رابطہ رکھنا ان کے لیے باعث افتخار تھا۔ علم ومطالعہ کی وسعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خود داری اور اعتماد کی دولت بے پایاں بھی ان کے لیے ارزاں کر دی تھی۔ چنانچہ جب وہ کسی مسئلے پر تقریر کرتے یا اسے حیطۂ تحریر میں لاتے تو یہ دونوں خوبیاں ظاہر ہوتیں اور ایسا محسوس ہوتا کہ بولنے یا لکھنے کے ساتھ وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں ؎

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

پروفیسر سید ابوبکر غزنوی ایک ریسرچ سکالر ہونے کی حیثیت سے اگرچہ جلوت سے زیادہ خلوت پسند واقع ہوئے تھے لیکن جب جلوت میں ہوتے تو علمی موتی بکھیرنا اور اہل محفل کی فکری وعملی اصلاح وتربیت کی طرف توجہ دینا ان کے پیش نظر رہتا تھا تاہم یبوست وخشکی کا سایہ بھی ان پر نہیں پڑا تھا۔ شائستہ لطائف وظرائف سے محظوظ ہونا اور دوسرے کو محظوظ کرنا بھی انہیں خوب آتا تھا لیکن ہلکی باتوں سے نفور رہتے تھے۔

سید ابوبکر غزنوی ایسے لطیف الطبع اور نفاست پسند واقع ہوئے تھے کہ ان کو دیکھ کر ان کی محفل میں بیٹھنے اور ان کی گفتگو سننے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ اسلام نے جس اعلیٰ درجے کی طہارت وپاکیزگی کی تعلیم اپنے ماننے والوں کو دی ہے موصوف اس کا عملی نمونہ تھے۔ چنانچہ لندن میں حادثہ پیش آنے کے بعد وہ ہسپتال میں داخل ہوئے تو سب سے زیادہ جس بات کی طرف ان کی توجہ رہی ہے وہ یہی طہارت دپاکیزگی ہے۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل انھوں نے اپنے اس ذہنی کرب اور دلی تکلیف کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ اس حالت میں طہارت وپاکیزگی کا وہ معیار قائم نہیں رکھ سکتے جس کے وہ عادی ہیں اور جسے قائم رکھنا ان کی نزدیک ازبس ضروری ہے۔

آج مولانا سید ابوبکر غزنوی بہ نفس نفیس ہم میں موجود نہیں اور حیاتِ فانی کی دیوار پھلانگ گئے لیکن ان کے علمی وادبی کارنامے ایک حد تک محفوظ ہیں جن سے بہت کچھ استفادہ کیا جا سکتا ہے اور قلب ونظر کو روشنی کا سامان بہم پہنچایا جا سکتا ہے۔ وفات سے چند ماہ قبل انھوں نے اپنے والد گرامی مولانا سید داؤد غزنوی پر ''سیدی وابی'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی تھی۔ اس میں ''سیدی وابی'' کے عنوان سے ان کا اپنا مضمون علم وادب کے حسین امتزاج کا نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ ملکی اخبارات خصوصاً نوائے وقت میں مختلف موضوعات پر ان کے شائع ہونے والے مضامین، حال ہی میں منعقد ہونے والی سیرت کانفرنس میں مقالہ اور شامِ ہمدرد میں کی جانے والی تقریروں سے آج بھی بہت سے علمی وادبی جواہر حاصل کیے جا سکتے ہیں اور سید ابوبکر غزنوی کی سیرت وزندگی کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔[1]

---

[1] ماہنامہ محدث، لاہور (جون 1976ء)

آہ! مولانا سیّد ابوبکر غزنوی

تحریر: حافظ صلاح الدین یوسف

ضرورت جتنی جتنی بڑھ رہی ہے صبح روشن کی
اندھیرا اور گہرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے

خانوادۂ غزنویہ کے گوہر شب چراغ، جماعت اہل حدیث کے ایک فاضل دانشور، حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم و مغفور کے خلف الرشید، دارالعلوم تقویۃ الاسلام غزنویہ لاہور کے مہتمم اور اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر جناب مولانا سید ابوبکر غزنوی 24 اپریل کو لندن میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

سیّد صاحب مرحوم لندن میں منعقدہ اسلامی فیسٹیول میں شرکت کے لیے سرکاری وفد کے ہمراہ وہاں تشریف لے گئے تھے لیکن وہاں جاتے ہی غالباً پہلی ہی رات کو کار کے ایک حادثے میں شدید زخمی ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ کار ان کے اوپر سے گزر گئی جس سے ان کی ریڑھ کی ہڈی، ہنسلی اور دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ یہ حادثہ 4 اور 5 اپریل کی درمیانی شب کو سڑک عبور کرتے ہوئے ہوا۔ اس وقت سے ہی وہاں کے ویسٹ منسٹر ہسپتال میں زیر علاج تھے اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ سیّد صاحب محترم بارہ ہفتوں تک صحت یاب ہو جائیں گے۔ اِدھر پاکستان میں ان کے تلامذہ، حلقۂ ارادت، احبابِ جماعت اور افرادِ خاندان بھی گو کافی پریشان تھے تاہم یہ وہم و گمان کسی کو نہ تھا کہ موصوف اتنی جلدی داغِ مفارقت دے جائیں گے۔

ان کے ارتحال کا یہ المناک سانحہ اس طرح اچانک رُونما ہوا کہ جس نے بھی سُنا، سکتے میں آ گیا۔ اس برق آسا خبر نے لاکھوں دلوں کو تڑپا دیا، جذبات کی دنیا میں ایک تلاطم برپا ہو گیا اور عقیدت و محبت کی فضا آنسوؤں اور آہوں سے بھر گئی۔ ابھی سید صاحب کی عمر ہی کیا تھی، عام حالات کے مطابق ان کے مرنے کے دن تو نہ تھے، وہ تو عزائم و جذبات سے بھرپور تھے، نہ جانے کتنے عظیم منصوبے ابھی ان کے دماغ میں تھے۔ ابھی ان کا حلقۂ ارادت بھی یہ المناک خبر سننے کے لیے آمادہ نہ تھا لیکن مشیت ایزدی کے آگے کون دم مار سکتا ہے؟ وہ بارگاہِ ابدیت سے اتنی ہی عمر لے کر آئے تھے جسے وہ گزار گئے۔ ان کی موت بھی دیارِ غیر میں لکھی ہوئی تھی جو انہیں پاکستان کی سرزمین سے اٹھا کر ہزاروں میل دُور لے گئی اور اس قرآنی حقیقت پر مُہر تصدیق ثبت کر گئی:

﴿وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ (سورہ لقمان: 34)

"کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی موت کس سرزمین پر واقع ہوگی۔"

غفر اللہ لہ ورحمہ رحمۃ واسعۃ.

سیّد صاحب موصوف جن کو مرحوم لکھتے بولتے ہوئے زبان وقلم پر رعشہ طاری ہوتا ہے۔ بڑی خوبیوں کے حامل اور غیر معمولی ذہانت وفطانت سے بہرہ ور تھے۔ وہ صرف خاندانِ غزنویہ کے چشم وچراغ ہی نہ تھے، اس کی تابندہ روایات کے حامل اور اس کی آبرو تھے۔ وہ بیک وقت بہترین خطیب، اعلیٰ پائے کے انشاء پرداز، قدیم وجدید دونوں علوم کی درس گاہوں کے سربراہ تھے۔ پنجابی تو مادری زبان تھی لیکن عربی، انگریزی، فارسی اور اُردو پر بھی اچھا خاصہ عبور تھا۔ بیک وقت اتنی زبانوں کی ایسی مہارت شاذ ونادر ہی دیکھنے میں آتی ہے، یہ ان کی غیر معمولی اور خداداد ذہانت کی ایک مثال ہے۔

تعلیم انہوں نے اسکول وکالج میں پائی تھی لیکن بعد میں والد مرحوم کی مخلصانہ دعاؤں سے ان کی کایا کلپ ہوگئی اور ازخود طبیعت کا میلان دین کی طرف ہوگیا، اللہ تعالیٰ کی اس دستگیری ورہنمائی کے ساتھ ہی موصوف نے قدیم علوم سے بھی اپنے آپ کو آراستہ کرلیا۔ دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کی بے پایاں جذبہ دل میں موجزن تھا اور جہاں رہے اس جذبے کے مطابق بھرپور کام کیا۔ پہلے اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں پروفیسر ہوئے، پھر انجینئرنگ یونیورسٹی میں گئے اور جلد ہی شعبۂ اسلامیات کے صدر بن گئے، یہاں سے ترقی کرکے اب اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ ان تینوں جگہوں پر ملک وملت اور علم ومذہب کی خدمت کے ایسے تابندہ نقوش اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں کہ وہ رہروانِ راہ کے لیے یقیناً مینارۂ نور ثابت ہوں گے۔

اسی جذبۂ تبلیغ کا ایک مظہر دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں خطبۂ جمعہ کا آغاز تھا جس کی ابتداء انہوں نے اپنے دورِ نظامت میں کی اور یہاں تشنگانِ علم ومذہب کو سیراب کرتے رہے، یہ سلسلہ بہاولپور جانے سے پہلے تک قائم رہا۔ وائس چانسلر بن جانے کے بعد موصوف کا یہاں ہر جمعہ کو آنا مشکل تھا، اس لیے بعد میں کسی دوسرے قابل شاگرد کو اپنا نائب بنادیا۔ تاہم اس سنّتِ حسنہ کے جاری اور مستحکم کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے جس کا ثواب امید ہے کہ ان کو پہنچتا رہے گا۔

سیّد صاحب مرحوم خود بھی اپنے سینے میں بڑے عزائم رکھتے تھے جنہیں وہ بتدریج عملی جامہ پہنانے میں مصروف تھے اور جماعت کو بھی ان کی ذات سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ گرامی قدر والد مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی مرحوم کی وفات کے بعد دارالعلوم تقویۃ الاسلام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ جو اپنی شاندار روایات کے مطابق دینی علوم کی خدمت میں مصروف ہے۔ اب دارالعلوم کے انتظام کی ساری ذمہ داری مرحوم کے برادرِ اکبر مولانا سیّد عمر فاروق صاحب غزنوی پر آپڑی ہے۔ الحمد للہ وہ بھی خاندان کی دینی روایات کے حامل اور علمِ دین کی اشاعت اور علماء کی خدمت کے جذبے

سے سرشار ہیں اور وہ اس شجرۂ طیبہ کی مسلسل آبیاری کا مصمم عزم رکھتے ہیں جسے ان کے اکابر نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو توفیق دے کہ وہ اپنے عزم کے مطابق دارالعلوم کو مزید ترقی و رفعت سے ہمکنار کرسکیں۔

خاندانِ غزنویہ نے برّصغیر پاک و ہند میں جو دینی و تبلیغی اور اشاعتی خدمات سرانجام دی ہیں، وہ ہنوز کسی دیدہ ور مؤرخ و محقق کی منتظر ہیں۔ سیّد صاحب مرحوم کو اس تاریخی خلا کا بھی بڑا شدید احساس تھا، وہ خود چونکہ اس کام کو بحسن وخوبی سرانجام دینے کی صلاحیت سے بہرہ مند تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ان سے بہتر غزنوی اکابر کے کارہائے نمایاں کوئی اور مرتب بھی نہیں کرسکتا تھا، اس سلسلے میں ان کے پاس بزرگوں سے سُنی ہوئی روایات بھی تھی، کچھ قلمی ذخیرہ تھا اور کچھ غیر منقح مطبوعہ چیزیں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ ضرور کسی وقت اس پورے مواد کو حُسن وسلیقے سے مرتب کر کے اس خلا کو پُر کریں گے۔ اس کی ابتدا وہ کر بھی چکے تھے اور ابھی حال ہی میں انہوں نے اپنے والد گرامی قدر جناب مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم ومغفور پر ایک کتاب مرتب کی تھی جس میں ان کے معاصر علماء واحباب کے ان کے بارے میں تاثرات تھے۔ اور خود ان کا اپنا مضمون ''سیّدی وابی'' کے عنوان سے شاملِ کتاب تھا۔ یہ گویا اس کام کا آغاز تھا جو ان کے ذہن میں تھا لیکن افسوس ان کی اچانک موت سے یہ کام بھی شرمندۂ تکمیل ہونے سے رہ گیا۔ اب غزنوی خاندان میں ایسا کوئی فردِ علمی و مذہبی میدان میں نظر نہیں آتا جو اُردو زبان وادب پر کامل عبور اور تصنیف وتالیف کے سلیقے سے بہرہ ور ہو۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلك امراً.

مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے سانحۂ ارتحال کے بعد قیادت کے لیے بھی جماعت کی نظریں رہ رہ کر سید ابوبکر غزنوی ہی کی طرف اٹھتی تھیں، وہ کچھ عرصے کے لیے مرکزی جمعیت اہلحدیث کے ناظم اعلیٰ منتخب بھی ہوئے لیکن بعض وجوہ سے وہ یکسوئی سے کوئی کام نہ کر سکے۔ بالآخر انہوں نے از خود ہی اپنی طبعی شرافت اور نسبی نجابت کی بنا پر اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا اور جماعتی امور سے اپنے آپ کو یکسر الگ کرلیا۔ جماعت اہلحدیث کے لیے یہ بڑا المناک حادثہ ہے کہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ اور مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم (گوجرانوالہ) کی وفات کے بعد قیادت کا جو خلا پیدا ہوا، وہ ابھی تک پُر نہ ہوسکا۔ ابھی لوگ گو زبان سے اظہار نہ کرتے رہے ہوں لیکن اکثر لوگوں کے دل اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ ایک نہ ایک دن سید ابوبکر غزنوی اس جماعتی قیادت کے خلا کو بھی پُر کرے گا لیکن آہ وہ ابوبکر جو ہماری جماعت کا ایک قیمتی سرمایہ، مایۂ افتخار اور مستقبل کا مرجعِ امید تھا ہم سے بہت جلد منہ موڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ آہ ۔

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
پیدا کئے فلک نے تھے جو خاک چھان کے

بہرحال مرحوم کی کس کس خوبی کا ماتم کیا جائے، وہ تو گنجینۂ خوبی تھے۔ ان کی موت فردِ واحد کی موت نہیں، ان کی موت سے بیک وقت کئی شعبوں میں ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کے بظاہر پُر ہونے کے کوئی اسباب نہیں۔ وہ جدید علوم

کے ماہر ہی نہ تھے، علوم دین کے رمز شناس بھی تھے۔ وہ بہترین انشاء پرداز ہی نہ تھے، تقریر وخطابت کے بھی دُرِّ شاہوار تھے۔ وہ محض منبر ومحراب ہی کی زینت نہ تھے، حکومت کے نگار خانوں اور تعلیم وثقافت کے دانش کدوں میں بھی کلمۂ حق بلند کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند تھے۔ وہ جدید تعلیمی اداروں ہی کی آبرو نہ تھے، قدیم مدارسِ دینیہ کے لیے بھی باعثِ فخر وناز تھے۔ ان کا وجود سراپا حُسن، مجسم تہذیب اور پیکرِ رعنائی تھا، ان کا تکلم سراپا ادب وشائستگی تھا، ان کی تقریر فصاحت وبلاغت کا جوئے رواں اور علم وادب کا شہ پارہ ہوتی۔ الغرض ان کی دل آویز اور باوقار شخصیت عربی کے اس شعر کی پوری مصداق تھی ؎

ولیس على الله بمستنكر
أن يجمع العالم فى واحدٍ

وہ اپنی انہی ممتاز اور خداداد صلاحیتوں کی بنا پر ہر مکتبِ فکر میں عزت واحترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ہر فرقے کے لوگ ان کے لیے دیدہ ودل فرشِ راہ کرتے اور ان کی تکریم وتوقیر کو باعثِ سعادت گردانتے تھے۔

مرحوم کو احسان وتصوف وراثت میں ملا تھا، بنا بریں تصوف اور سلوک سے انہیں قدرۃً خاصہ لگاؤ تھا اور ایک سلسلۂ بیعت سے منسلک تھے اور خلیفۂ مجاز تھے۔ ان کا اس انداز کا حلقۂ ارادت بھی کافی وسیع تھا۔ شاہانہ مزاج کے ساتھ سلوک ومعرفت کی ہم آہنگی بہت ہی نادر ہوتی ہے اور سیّد صاحب مرحوم اس دَور میں اس کی ایک نمایاں مثال تھے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کی دینی خدمات کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔ ہم مرحوم کے برادر اکبر جناب سید عمر فاروق غزنوی اور برادران صغیر یحییٰ غزنوی اور احمد غزالی غزنوی، ان کی اہلیہ محترمہ، ان کے صاحبزادگان اور دیگر اہل خاندان کے غم میں برابر کے شریک اور ان کے لیے دعاء گو ہیں۔ اللّٰھم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه.[1]

[1] ہفت روزہ الاعتصام (7 مئی 1976ء)

سیّد ابوبکر الغزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال

تحریر: مولانا محمد ابراہیم کمیر پوری

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستان
حالی بھی ہو گیا سُوئے فردوس رہ نورد
اکنوں کسے دماغ کہ پُرسد ز باغبان
بُلبل چہ گفت وگُل چہ شنید وصبا چہ کرد

قیامِ پاکستان سے قبل متحدہ ہندوستان میں اہل حدیث گو عددی حیثیت میں احناف سے بہت کم تھے لیکن علم وفضل، تحقیق وتصنیف، درس وتدریس اور دوسرے علمی مشاغل میں اہل حدیث کا مقام انتہائی ارفع اور اعلیٰ تھا۔ اُس دور میں ہمارے اسلاف میں اتنے زیادہ محقق، مصنف، مدرس، محدث، مفسر، شارح اور مناظر موجود تھے جن کی عظمت کا انکار آج کے کورچشم کریں تو کریں اس دور میں اکابر احناف ان اساطینِ علم کا لوہا مانتے اور اُن کے سامنے سرِ احترام خم کرتے تھے۔

اہل حدیث کے زیادہ ادارے مشرقی پنجاب، دہلی اور مسلم اقلیتی صوبوں میں تھے اور تقسیم کے بعد بھارتی حکومت اپنے مذموم مقاصد کے تحت یہ علاقے مسلمانوں سے خالی دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے برعکس جن صوبوں میں احناف کے مرکزی ادارے تھے وہاں سے گاندھی وغیرہ مسلمانوں کا انخلاء پسند نہ کرتے تھے۔ علاوہ ازیں احناف کے ان مراکز سے متعلق اہم شخصیات کا علمی تعلق تقسیم ملک کی حامی جماعت سے نہیں تھا۔ اہل حدیث اور احناف میں یہی وہ بنیادی فرق تھا جس کے نتیجہ میں اہل حدیث مدارس کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ اہل حدیث علماء سینکڑوں کی تعداد میں جامِ شہادت نوش کر گئے اور اُن کا کوئی قابلِ ذکر ادارہ یا کتب خانہ پاکستان منتقل نہ ہو سکا۔

پاکستان پہنچنے کے بعد مختصری مدت میں اہل حدیث اکابر یکے بعد دیگرے رحلت کر گئے اور چل چلاؤ کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اس نئے وجود میں آنے والے ملک اور اس افراتفری کے عالم میں ان عظیم اسلاف کی جگہ پُر کرنا اور ان کے کام کو از سرِ نو جاری رکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ بہرحال اس پندرہ سال میں جماعت کے اتنے نامور علماء اللہ کو پیارے ہو گئے جو بلاشبہ علم کے پہاڑ، عظمت کے مینار، تقویٰ وطہارت کے معیار اور انسانی مجد وکمال کی نادر مثال تھے۔ تاہم ان میں اکثر بزرگ اپنی طبعی عمر گزار اور علم وتحقیق کے میدان میں اپنا کردار ادا کر چکے تھے۔ اُنہوں نے عالمِ فنا سے عالمِ بقا

کو جانا ہی تھا۔ (رضی اللہ عنہم وارضاہم)

دکھ اس بات کا ہے کہ جانے والے پورے تسلسل اور بڑی تیزی سے جا رہے ہیں اور طبعی عمر سے بہت پہلے کہولت بلکہ عالمِ شباب میں داغِ مفارقت دے رہے ہیں، اور حال یہ ہے کہ گزشتہ ایک سال سے محفل ہی سُونی ہو رہی ہے اور بزمِ اہل حدیث کچھ اس طرح خزاں رسیدہ ہے کہ جھڑنے والے پتوں اور خشک ہونے والی شاخوں کا شمار مشکل ہو رہا ہے اور گلستانِ اہل کے باغبان حیران اور سراسیمہ ہو گئے ہیں کہ بہار کے روٹھے ہوئے ایام کو کس طرح واپس لایا جائے۔

آج ان اکابر کے ممبر، مصلّے اور مسندیں ان کے فراق میں نوحہ کناں اور ان کے جانشینوں کی تلاش میں محوِ انتظار ہیں۔

دور کی بات چھوڑیئے، ابھی پرسوں ہی مولانا محی الدین سلفی کی وفات پر آنسو بہا رہے تھے کہ کل مولانا حافظ عبدالحق صدیقی اور حکیم ثناء اللہ (برادر نسبتی ذبیح مرحوم) پر نالہ وشیون کو ساتھ ملانا پڑا اور ابھی ان حضرات کے کفن میلے نہ ہونے پائے تھے کہ ہمیں ایک ایسے حادثہ سے دوچار ہونا پڑا جسے مؤرخ 1976ء کے ایک دوسرِ فہرست حوادث میں شمار کرے گا اور جس کی تلافی ملک کی سطح پر ایک عرصہ تک اور ہماری جماعت کی سطح پر شاید کبھی نہ ہو سکے۔ ہم نے ملکی اور جماعتی اکابر کی وفات پر بارہا اس کثرت سے آہ وبکا کیا ہے کہ اب ہمارے پاس نہ تو مناسب مقدار میں آنسو ہیں اور نہ ہی نوحہ اور ماتم سے تازہ غم ہلکا ہو سکتا ہے۔ نہ ہی وطن سے دور، احباب سے دور، خویش واقارب سے دور، باپ برادر سے دور، جاں گسار رفیقۂ حیات سے دور، قابلِ احترام والدہ اور عزیزہ کم سن بہن بھائیوں سے دور، کم سن اور معصوم بچوں سے دور نہ صرف دور بلکہ ہزاروں میل دور، اتنی دور چلے جانے کا صدمہ اس وقت تک بھول سکے گا، جب تک خود ان کا تصور ہمارے دل ودماغ اور قلوب واذہان سے محو نہ ہو جائے۔

مرحوم سیّد ابوبکر غزنوی جن کے ساتھ سانحۂ ارتحال کی تفصیلات اخبارات میں آ چکی ہیں، ایک ایسے خاندان کے چشم وچراغ تھے جو اپنے علم وفضل، تقویٰ وطہارت، فقہ وتصوف کے علاوہ اپنے وقت اور ماحول کے مطابق استخلاصِ وطن (آزادیٔ وطن) کے لئے برسرِ پیکار رہے، اور ان ہی اوصافِ کمال کے سبب ملک کے تمام حلقوں میں عزّت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے۔ مرحوم کے آباؤ اجداد میں ان کے پردادا حضرت عبداللہ غزنوی معرفتِ الٰہیہ میں، ان کے دادا مولانا عبدالجبار الغزنوی تبحر فی علوم الحدیث میں اور ان کے والد محترم حضرت مولانا سیّد داؤد الغزنوی علومِ شرعیہ کے ساتھ جنگِ آزادی کے سپہ سالاروں میں سرِفہرست ہیں۔

مندرجہ بالا اشارات سے یہ امر پوری طرح عیاں ہے کہ سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ نہ صرف خود صاحبِ کمال تھے بلکہ کریم ابن کریم، ابن الکریم ابن الکریم تھے۔ ان کی ذات میں جو جوہر تھے وہ مکتب کی کرامت سے کہیں زیادہ فیضانِ

نظر کا کرشمہ تھے، اور ان میں علم کی گہرائی اور معلومات کی وسعت، اظہارِ خیال کی قدرت، مطالعہ کی فراوانی، کلام کی روانی، آنکھ کی حیاء، طبیعت کی وفا، ظاہر کی نفاست، باطن کی طہارت، ذکر کی عادت، فکر کی اصابت، کلام کی ثقاہت، بیان کی فصاحت، عبادت میں ریاضت، عمل میں استقامت، فقر میں قناعت، غنا میں سخاوت، زبان میں سلاست، کلام اللہ کی تلاوت، صلوٰۃ وسلام میں حلاوت، مزاج میں بے نیازی اور دل میں استغناء جو کچھ بھی تھا وہ سب کا سب بزرگوں کی تربیت اور دعاؤں کا نتیجہ تھا۔

سیّد صاحب دو تین مضامین میں ایم اے اور ایل ایل بی تھے، اس کے ساتھ مرحوم نے حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف، حضرت مولانا شریف اللہ صاحب دہلوی اور اپنے والد حضرت داؤد الغزنوی رحمہ اللہ سے دینی علوم میں استفادہ بھی کیا تھا۔ طبیعت کمال درجہ نکتہ رس تھی اور مطالعہ کا شوق نہیں شغف تھا۔ معمولی توجہ سے دینی مسائل کی تہ تک پہنچ جانا ان کے لئے چنداں مشکل نہ تھا۔ انہوں نے اچھا قانون دان ہونے کے باوجود عدلیہ پر تعلیم کو ترجیح دی۔ اگر وہ عدلیہ کی طرف رجوع فرماتے تو گمانِ غالب ہے کہ ہائی کورٹ تک پہنچ گئے ہوتے۔ تعلیمی میدان میں ان کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اپنے تلامذہ میں علم کا صحیح شعور اور اپنی کی ذات سے مکمل شیفتگی اور عقیدت پیدا کرنے میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، اس کا اثر ان کے انتقال کے بعد ظاہر ہوا کہ ان کے صدہا شاگرد بڑے اہم اور ممتاز عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود ائیرپورٹ پر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اور اپنے محسن مربی، مزکی اور مشفق استاد کے فراق میں دیوانہ ہو رہے تھے اور ان کا یہی وصف انہیں اسلامیہ کالج سے انجینئرنگ یونیورسٹی میں پھر پینتالیس سال کی قلیل عمر میں جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی وائس چانسلر شپ تک لے گیا اور بہاولپور کے مختصر قیام میں انہوں نے وہ کچھ کر دکھایا جسے کئی سال میں سرانجام دینا بھی کارے دارد والا معاملہ تھا۔ ان کی کارکردگی کا یہ دور اتنا ہنگامہ خیز تھا کہ: ؎

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

عملی لحاظ سے مولانا مرحوم صحیح معنیٰ میں عشقِ جسور اور فقرِ غیور کا حسین امتزاج تھے۔ ان سطور کے راقم نے عمر کا ایک حصّہ ان کے ساتھ گزارا اور ان کو ہمہ پہلو قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے ایک عظیم انتخاب میں ان کے دو ابتدائی سپورٹروں سے ایک عاجز تھا اور ہم اس میں کامیاب رہے۔ پھر کچھ دن بُعد بھی رہا۔ میں نے ان سے تخلیہ میں کئی امور میں تبادلہ خیال کیا اور ایک آدھ دفعہ اختلاف کا اظہار بھی ہوا ہے۔ مجھے ان کا میزبان بننے کا شرف اور مہمان بننے کی سعادت بھی نصیب ہوئی ہے۔ میں نے ان کے ساتھ سفر بھی کیا ہے اور ایک اسٹیج پر پبلک خطاب بھی کیا ہے۔ غرضیکہ میں نے ہر طرح اور ہر پہلو سے ان کو دیکھا اور ایک عظیم انسان پایا۔ میرے علم اور تجربہ میں مرحوم ہر حال میں پاک نفس، صاف گو اور ظاہر و باطن کے تضاد سے محفوظ تھے۔ وہ اعلیٰ درجہ کے استاد اور کامیاب روحانی مرشد تھے۔ وہ اپنے تلامذہ

میں صحیح علمی شعور اور اپنے متوسلین میں ذکر وفکر کی استعداد پیدا کرنے میں خاص مقام رکھتے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے عظیم اسلاف کے عظیم اور لائق ترین جانشین تھے۔ اور آج ان کے انتقال کے بعد احساس ہو رہا ہے کہ مرحوم اس قحط الرجال کے دور میں ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ عظمت کے حامل تھے۔ رات کے بارہ بج چلے ہیں اور میں ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ان کا حق نہیں، محض اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ ان کا مزاج تو جیتے جی بھی مدح وثنا کا متحمل نہ تھا، اب تو وہ ویسے ہی ان تکلفات سے بہت دور جا چکے ہیں۔ میری خواہش یہ ہے کہ میرا نام یوسف کے خریداروں میں آ جائے۔ میں اس آہِ نیم شبی کو اس رباعی پر ختم کرتا ہوں۔ ؎

غالب ہے، نہ شیفتہ، نہ نیر باقی
وحشت ہے، نہ سالک ہے، نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

پابرکاب بسوئے دار المعاد: حافظ کمیر پوری 27-4-76ء [1]

[1] ہفت روزہ اہلحدیث، لاہور (7 مئی 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم کی موت پر چند تاثرات

تحریر: عنایت اللہ نسیم سوہدروی صاحب علیگ

پروفیسر ابوبکر غزنوی اس خانوادے کے فرزند تھے جنہوں نے اس برعظیم میں توحید کی شمع روشن کی اور شرک وبدعت کے خلاف ساری عمر جہاد کیا۔ اسی کی پاداش میں ان کے جدامجد مولانا سیّد عبداللہ غزنوی کو سنتِ نبوی کی پیروی میں ترکِ وطن کرنا پڑا لیکن ایک ایسے مومن کے مصداق کہ ساری دنیا ان کا وطن ہے اور بقول اقبال ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست، نہ صرف ترکِ وطن کی صعوبت کو تہ دل سے قبول کیا بلکہ جہاں بھی گئے فریضہ احکامِ الٰہی سے سرگردان نہ ہوئے۔ درسِ حدیث وفہم دین میں ان کے دادا مولانا عبدالجبار غزنوی کو ایسا مقام حاصل تھا کہ ان کے مخالفین ہی ان سے فیضان حاصل کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ مولانا عبدالواحد غزنوی نے برسوں مسجد چینیانوالی میں بیٹھ کر شمع توحید وہدایت روشن رکھی۔ ان کے تقویٰ وخلوص کی پورے برصغیر میں دھوم تھی۔ بہت سے لوگ صرف آپ سے دعا کروانے کے لئے حاضر خدمت ہوتے اور ان کی دعا کا انداز اس قدر مؤثر تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ذرحق سے اجابت استقبال کے لئے چلی آرہی ہے۔ یہی وجہ ہے بہت سے لوگوں نے ان سے فیض پایا۔ غزنوی خاندان اپنی وضع داری، توکل علی اللہ اور دین داری میں اس برعظیم میں ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ اس خاندان کے نامور فرزند سیّد ابوبکر غزنوی کے والد سیّد محمد داوٗد غزنوی بھی اپنے علم و استقامت، حوصلہ واستعداد کی وجہ سے اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ فرنگی استبداد کے خلاف ہمیشہ مصروف جدوجہد رہے اور متعدد دفعہ قید وبند کو لبیک کہا۔ تحریکِ خلافت میں جب گرفتار ہوئے تو آپ اس وقت بیمار تھے۔ پولیس آپ کو کندھوں پر اُٹھا کر جیل لے گئی جس پر مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا۔

دی مولوی داوٗد کو چڈی جو پولیس نے
احباب نے پوچھا یہ کیا ہے
فرمانے لگے ہنس کے کہ میں عالم دین ہوں
اور مرتبہ سرکار میں عالم کا بڑا ہے

پھر ان کی قوتِ گفتار، طرزِ تخاطب اور مجاہدانہ للکار پر ظفر علی خاں یوں پکار اٹھے۔

قائم ہے ان سے ملّتِ بیضا کی آبرو
اسلام کا وقار ہیں داوٗد غزنوی

رجعت پسند کہنے لگے ان کو دیکھ کر
آیا ہے سومنات سے محمود غزنوی

مولانا داؤد دورِ تحریکِ خلافت میں میدانِ سیاست میں داخل ہوئے اور جلد ہی نامور رہنماؤں میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ مجلسِ احرار کے روحِ رواں اور جنرل سیکرٹری تھے۔ صوبہ کانگرس کے صدر بھی رہے مگر ہندو کی ذہنیت سے بددل ہو کر تحریکِ پاکستان میں قائداعظم کے ساتھیوں میں شامل ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام ان کی قابلیت و استعداد سے بہت متاثر ہوئے۔

آخری عمر میں جماعت اہلحدیث کے امیر تھے۔ جمعیۃ علمائے ہند میں بھی خاص عزت و وقار سے دیکھے جاتے۔ ان کا لباس، رہن سہن اور خوراک ہمیشہ معیاری ہوتی تھی۔ انہی داؤد غزنوی کے ہاں اس عظیم فرزند نے جنم لیا ہے جسے ہم سیّد ابوبکر غزنوی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ سید ابوبکر اپنی خاندانی وجاہت، وقار و تمکنت، خلوص و وفا کا ایک ایسا عظیم پیکر تھے۔ آپ حسن و رعنائی و زیبائی رکھتے تھے جسے دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا تھا۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دال می کشد کہ جا اینجاست

یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک ایسے مردِ مومن تھے جنہیں دیکھ کر اقبال پکار اٹھے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

مجھے اور میرے خاندان کو خاندانِ غزنویہ سے ہمیشہ عقیدت رہی اور مولانا داؤد سے یوں بھی یاد اللہ تھی۔ سوہدرہ میں جماعت اہلحدیث کی تشکیل پر اختلاف کے سلسلہ میں ان سے کھل کر گفتگو بھی ہوئی۔ اس لحاظ سے ابوبکر غزنوی کا میرے دل میں ایک خاص مقام تھا۔ ملاقات پہلی دفعہ سوہدرہ میں اس وقت ہوئی جبکہ وہ یہاں جماعت اہلحدیث کے جلسہ میں تشریف لائے۔ نیازمندانہ مراسم کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہوا جو تا مرگ جاری رہا۔ سوہدرہ کے بعد سیالکوٹ اہلحدیث کے ایک جلسہ میں ایک کتب خانہ کے اسٹال پر مل گئے۔ دیر تک سلسلہ خلوص و محبت جاری رہا۔ اس کے بعد لاہور شامِ ہمدرد میں ان کی ملاقاتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ آخری بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں لاہور انٹر کانٹی نینٹل میں مل گئے۔ روایتی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا کہ آپ یہاں موجود ہیں۔ میں نے کہا: جی ہاں! آپ کی دعاؤں اور حکیم سعید صاحب کی نوازش کے طفیل۔ پھر سیرت نبوی اور مسائل حاضرہ پر سلسلہ گفتگو شروع کیا کہ ایک اور صاحب آ گئے اور یوں سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ ملاقات آخری ہے۔ اس کے بعد سید صاحب کو دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔ ان کے شامِ ہمدرد کے خطبات جو مختلف موضوعات پر تھے اور اب چھپ چکے ہیں، رہ رہ کر میرے کانوں میں گھوم رہے

ہیں۔خصوصاً ان کے یہ الفاظ کہ اسلام میں گردشِ دولت کا نظام اس طرح ہے جس طرح جسم میں خون کی گردش، جیسے خون کی گردش بند ہو جانے سے انسانی جسم پر مرگ طاری ہو جاتی ہے۔اس طرح اگر اسلام میں گردشِ دولت جاری نہ رہے تو اسلام کا مقصد اصلی فوت ہو جاتا ہے۔اس سلسلہ میں وہ حضرت علامہ اقبال کا یہ شعر ورد کرتے ؎

وہ حرف جو قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شائد وہ حقیقت ہو نمودار

وہ اس پر اکثر اظہارِ افسوس کرتے کہ اسلام کو اس کی اصلی شکل میں پیش نہیں کیا جاتا اور اسی وجہ سے اشتراکیت و سرمایہ داری نے جنم لیا۔جدید و قدیم علوم پر ان کی گہری نظر تھی۔امام ابن قیم، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ کے افکار کا گہری نظر سے مطالعہ رکھتے تھے۔باوجود اہلحدیث ہونے کے مسلک اعتدال پر قائم تھے۔ان کے عزائم یہ تھے کہ بہاولپور یونیورسٹی کو مشرق میں ایک اعلیٰ پایہ کی معیاری یونیورسٹی بنا دیں جس سے ایسے نامور فرزند پیدا ہوں جو دورِ حاضر کے مسائل اور اس کے حل سے پوری طرح باخبر ہوں۔وہ اس امر پر ہمیشہ مغموم رہتے کہ اسلام کے پاس ان تمام مسائل کا حل موجود ہے مگر اسے پیش کرنے والے موجود نہیں۔یعنی ؎

لبالب شیشہ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے
ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا

اس پیمانۂ الا کے لئے انہوں نے بہاولپور کا رخ کیا جس کے لئے وہ خطوط استوار کر ہی رہے تھے کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے آلیا جس پر بے اختیار کہنا پڑتا ہے ؏

ہائے اے موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

اس لئے ابوبکر غزنوی کی اس دور میں موت علم و فضل کی موت ہے، فراست و تدبر کی موت ہے، عزم و ہمت اور یقین و ایقان کی موت ہے۔

آج کے اس دورِ قحط الرجال میں ایسے افراد کہاں ہیں جو بیک وقت جدید و قدیم علوم سے باخبر، مسائل حاضرہ پر گہری نظر اور اس کے علاج سے واقف ہوں۔تحریر و تقریر میں یکساں عبور رکھتے ہوں۔ادب و شعر سے گہرا لگاؤ ہو۔زبان کی بندش، الفاظ کی صحت اور محاورہ سے پوری طرح آگاہ ہوں۔کردار و گفتار میں وقار و تحمل اور خلوص ہو۔سینہ دردِ ملّت سے معمور اور قلب جذبات سے بھرپور اور دماغ افکار کا خزانہ ہو۔کچھ حوادث و اموات ایسی ہوتی ہیں کہ جن کی یاد ہمیشہ کسک بن کر دل میں محسوس ہوتی ہے۔ابوبکر غزنوی کی موت بھی ایسی ہی تھی۔لندن کا اسلامی فیسٹیول ہمیشہ اس حادثہ کی یاد تازہ کرتا رہے گا اور مرحوم کا یہ جلسہ ہمیشہ دل میں رنج و غم کا ایک طوفان برپا کرتا رہے گا۔شاید اللہ کو میرا یورپ آنا پسند نہیں آیا اور بے اختیار یہ منہ سے نکلتا ہے ؎

داغ لگنا تھا یہ انگلستان ہی کے نام پر
موت کی بجلی گرائی ضیغم اسلام پر

اخبارات کے ذریعے یہ اطلاع ملتی رہی کہ چوٹ خطرناک نہیں۔ حالات سنبھل رہے ہیں اور صحت دن بدن بحال ہو رہی ہے۔ ایک ماہ تک بخیریت وطن واپس آ جائیں گے مگر کارکنان قضا و قدر اس پر مسکرا رہے تھے۔ وہاں کچھ اور ہی طے ہو چکا تھا۔ یک بیک یہ خبر دل و دماغ پر بجلی بن کر گری کہ مولانا ابوبکر غزنوی کو اللہ کا یہ بلاوا آ گیا جسے انہوں نے یہ کہہ کر قبول کر لیا ؎

یہ حور بہشتی کی طرف سے ہے بلاوا
لبیک کہ مقتل کا صلہ میرے لئے ہے

اور ہم یہ کہہ کر فریاد کناں ہوئے ؎

ہاں اے فلک پیر جوان تھا ابھی عارفؔ
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دم اور

تاہم یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں ؎

موت دو روحوں کو کر سکتی نہیں ہرگز جدا

یا یوں کہہ کر مصروفِ درد و غم ہیں ؎

خدا بخشے کہ مجنوں مر گیا اور ہم کو مرنا ہے
پس از محبوب جینا عشق کو بدنام کرنا ہے(1)

---

(1) ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

تحریر: ملک عبدالرشید عراقی (سوہدرہ)

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے

ابھی ہم مولانا محی الدین سلفی رحمہ اللہ اور حافظ عبدالحق صدیقی رحمہ اللہ کے غم سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ایک دوسرا حادثہ پیش آ گیا۔ آہ! کہ خاندانِ غزنویہ کا ایک لائق ترین فرزند، ملک وملت کا دردمند، دین کا داعی، اسلام کا سپاہی، دینی غیرت و اسلامی حمیت کا پیکر، اردوٗ عربیٗ فارسی اور انگریزی کا ایک بلند پایہ انشاء پرداز، متدین مقرر سید ابوبکر غزنوی 24 اپریل 1976ء کو لندن میں انتقال کر گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون!

مولانا سید ابوبکر غزنوی برصغیر پاک وہند کے نامور عالم مولانا سید داؤد غزنوی کے فرزند، حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی کے پوتے، عارف باللہ مولانا عبداللہ غزنوی کے پڑپوتے اور مولانا عبدالاول غزنوی کے نواسے تھے۔ مولانا عبدالاول غزنوی حضرت مولانا عبداللہ الغزنوی کے پوتے تھے (ابن مولانا محمد بن عبداللہ الغزنوی صاحبِ حواشی تفسیر جامع البیان، متوفی 1396ھ) رحمۃ اللہ علیہم

مولانا عبداللہ الغزنوی رحمہ اللہ کا شمار اہل اللہ میں ہوتا ہے۔ امیر دوست محمد والیٔ کابل کے سامنے کلمہ حق کہنے کی پاداش میں ملک بدر ہوئے، آخر میں امرتسر آ گئے اور وہیں رہائش اختیار کی۔ مولانا عبداللہ الغزنوی رحمہ اللہ نے حدیث شیخ الکل حضرت مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ سے پڑھی تھی۔ علیٰ ہذا مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ بھی حضرت محدث دہلوی کے تلمیذ خاص تھے۔ مولانا سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ اسی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔

سید ابوبکر غزنوی 1927ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر اور لاہور میں حاصل کی، تاہم تکمیل لاہور ہی میں ہوئی۔ عربی میں ایم اے تھے اور غالباً پنجاب بھر میں اول آئے تھے۔ اس کے ساتھ وکالت کی ڈگری (ایل ایل بی) بھی حاصل کی۔

عربی دینیات اور عربی ادب کے اساتذہ میں مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی مدظلہ العالی، مولانا عبدالرحیم صاحب حسینوی، مولانا شریف اللہ صاحب اور مولانا محمد عبدہٗ کے اسمائے گرامی لئے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں والد گرامی کی توجہ بھی تھی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں لیکچرار لگ گئے۔ پھر وہاں سے انجینئرنگ یونیورسٹی میں پروفیسر اسلامیات ہو کر چلے گئے۔ اب کچھ عرصہ قبل ہی ہوتا ہے کہ وہ اسلامی یونیورسٹی بہاولپور میں وائس چانسلر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔

مرحوم کو قرآن وحدیث سے بھی خاصہ شغف تھا۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں عربیت ان پر اتنی سوار تھی کہ اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔

فتنوں کے اس دور میں جب کہ الحاد و دہریت نوجوانوں کے ذہنوں میں سیاسیات، معاشیات، عمرانیات کے راستوں سے گھس آئی ہے۔ شمع نبوت کی روشنی سے بے نیاز ہو کر ان شعبوں میں قومیت اور نسلیت کے نظریات کو اپنانا یا سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نظام سے اپنے معاملات کے حل تلاش کرنا، مولانا کے نزدیک کسی طرح بت پرستی سے کم نہ تھا۔ وہ اس بارے میں ٹھوس دلائل اور معقول استدلال سے بات کرتے تھے اور اس میں کسی رعایت اور مداہنت کے قائل نہ تھے۔

مرحوم بہت ہی صاف گو تھے اور ان کی یہ صاف گوئی ایسے احباب کے دلوں میں شکوک وشبہات کا موجب بن سکتی تھی، جو ان کی طبیعت سے بخوبی واقف نہ تھے۔ اس صاف گوئی کے معاملہ میں وہ اپنی ذات کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ بار ہا اپنی خامیوں کی طرف سے اشارہ کرتے اور ان کو ہدفِ تنقید بناتے تھے۔ اپنے جماعتی رفقاء پر بھی منہ در منہ صاف تنقید کرتے۔

چونکہ ہر صاحب ان کی دیانت، خلوص اور خاص طبیعت سے واقف تھے، اس لئے اس تنقید کو اس کی روشنی میں خوشی خوشی سنتے اور برداشت کرتے۔ مرحوم عزم وہمت کی چٹان تھے۔ اصول کی خاطر وہ کسی سے دبتے نہیں تھے بلکہ مردانہ وار بھری مجلس میں دندان شکن جواب دے کر مخاطب کو چپ کرا دیتے تھے۔

ایک دفعہ اپنے مدرسہ تقویۃ الاسلام میں جمعہ کی نماز کے بعد دورانِ گفتگو فرمایا:

> ''میرے دوستانہ روابط میں یک رنگی ہوتی ہے، ظاہر باطن دونوں یکساں! مجھے تصنع، بناوٹ اور منافقانہ ظاہر داری سے سخت نفرت ہے۔ اگر میں کسی سے ملتا ہوں تو پوری طرح ملتا ہوں، اور کٹتا ہوں تو پھر اس کٹنے میں کوئی لچک نہیں ہوتی۔''

مولانا مرحوم اپنے تلامذہ، رفقاء کے لئے ہمدرد ساتھی تھے اور مشفق وغمگسار استاد بھی، ان کی تنبیہ اور زجر وتوبیخ میں بھی شفقت کی مٹھاس ہوتی تھی۔ کسی سے کوئی شکایت ہوتی تو برملا کہہ دیتے تھے۔

لباس صاف ستھرا پہنتے تھے اور اس کا پورا خیال رکھتے تھے۔ پابند وقت ایسے کہ جب تک تقویۃ الاسلام میں رہے، پابندی سے اسلامیہ کالج اور یونیورسٹی جاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشن فکر اور دردمند دل اور سلجھا ہوا دماغ پایا تھا۔ ذہن و ذکاوت کے ساتھ حافظہ بھی بہت قوی تھا۔ دوستوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور ان کی تکلیف وراحت کا خیال رکھتے۔ بہت زیادہ خوددار بھی تھے، عفاف اور استغناء کا دامن بھی کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ جاہ وریاست کے طالب نہ تھے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں دن بدن ترقی کا سامان فراہم ہو رہا تھا اور اس کی ترقی کو آپ عطیۂ خداوندی سمجھتے تھے۔ چنانچہ راقم نے انہیں سیرت کانفرنس کے موقعہ پر وائس چانسلر مقرر ہونے کی مبارک باد دی تو فرمانے لگے: ''یہ سب عطیۂ خداوندی ہے!''

احباب اور عقیدت مندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ عزیزوں اور شاگردوں کا خاص خیال رکھتے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی اور جزوی باتوں پر بھی نظر رہتی تھی اور اپنے ماتحتوں اور شاگرد پیشہ ملازمین کے ساتھ بھی بالکل مساوات کا برتاؤ کرتے تھے۔

جدید عربی ادب پر ماہرانہ اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔ نئی مطبوعات ان کی نظر سے گزرتی رہتی تھیں۔ جدید عربی رجحانات سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔

اپنے آباء واجداد کی طرح مصلحین امت میں امام احمد، امام ابن تیمیہ، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید اور محمد بن عبدالوہاب نجدی (رحمہم اللہ) سے عقیدت رکھتے تھے اور اپنے ملنے جلنے والوں کو ان کے حالات پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔

مسلکاً سلفی العقیدہ تھے مگر فروعی مسائل میں نہ الجھتے تھے اور نہ اسے پسند کرتے تھے کہ ان میں الجھا جائے۔

سیرت کانفرنس پر آپ نے جو مقالہ پڑھا، اس سے آپ کی علمی قابلیت سیرت کانفرنس کے مندوبین پر ظاہر ہوئی۔ اس وقت جلسہ کے مہمانِ خصوصی، سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس حمود الرحمٰن نے فرمایا کہ ''آج ہمیں پتہ چلا ہے، مولانا سید ابوبکر کس پایہ کے عالم ہیں۔''

بہرحال مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ نہ صرف ممتاز ماہر تعلیم، دانشور اور محقق تھے بلکہ ایک عالم باعمل بھی تھے۔ مرحوم نے ٹھوس اور تحقیقی مطالعہ کا ذوق اپنے والد گرامی قدر مولانا سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ سے پایا تھا۔ یہ شمع بھی درحقیقت اسی شمع فروزاں سے روشن ہوئی تھی، مگر فرشتۂ اجل نے اسے زیادہ دن تک روشن نہ رہنے دیا اور جلد ہی یہ شمع گل ہوگئی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور انہیں کروٹ کروٹ چین نصیب کرے۔ آمین![1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (4 جون 1976ء)

سید ابوبکر غزنوی

تحریر: عبدالرشید عراقی

مولانا سید ابوبکر غزنوی 1927ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم کا آغاز اپنے والد بزرگوار مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے کیا۔ دنیوی تعلیم میں ایم اے اسلامیات، ایم اے عربی اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ دینی تعلیم میں اپنے والد کے علاوہ مولانا شریف اللہ خان، مولانا محمد عبدہ اور مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے استفادہ کیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں شعبہ عربی کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ بعد میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں شعبہ اسلامیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں کچھ مدت تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد آپ کو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔

مولانا سید ابوبکر غزنوی بڑے عبادت گزار، صوفی منش اور وسیع المطالعہ انسان تھے۔ بڑے وسیع الاخلاق، بردبار، ذہین، طباع اور وسیع المعلومات عالم دین تھے۔

16 دسمبر 1963ء کو مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے انتقال کیا۔ مولانا غزنوی جمعیۃ اہلحدیث مغربی پاکستان کے امیر تھے۔ چنانچہ ان کی جگہ مولانا محمد اسمٰعیل السّلفی کو امیر مقرر کیا گیا۔ مولانا محمد اسمٰعیل السّلفی پہلے ناظم اعلیٰ تھے اور مولانا سید ابوبکر غزنوی کو مولانا سلفی کی جگہ جمعیۃ اہلحدیث کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا مگر آپ زیادہ دیر تک اس عہدے پر نہ رہ سکے اور مولانا محمد اسمٰعیل نے انہیں ناظمِ اعلیٰ کے عہدے سے برطرف کر دیا جس سے جماعت اہلحدیث انتشار کا شکار ہوگئی۔ ان کی جگہ میاں فضل حق مرحوم جو اس سے پہلے مدرسہ جامعہ سلفیہ کمیٹی کے صدر ہو گئے تھے اب جمعیۃ اہلحدیث مغربی پاکستان کے ناظم اعلیٰ بن گئے۔ جمعیۃ اہلحدیث ایک دینی و مذہبی جماعت تھی سیاسی نہ تھی۔ اس اہم عہدہ پر ایک جید عالم دین کا ہونا ضروری تھا۔ میاں فضل حق مرحوم پابند صوم وصلوٰۃ تھے مگر عالم دین نہ تھے۔ اس کے بعد مولانا سید ابوبکر غزنوی ایک طرح سے جمعیۃ اہلحدیث سے علیحدہ ہوگئے اور جمعیۃ اہلحدیث سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھا۔ مولانا محمد علی جانباز لکھتے ہیں:

> ''میں سمجھتا ہوں کہ شاید یہی وجہ تھی کہ سید ابوبکر صاحب نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''سیدی وابی'' میں اپنے والد محترم مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ''اہلحدیث'' ہونے کا کہیں اس انداز سے ذکر نہیں کیا جتنا کہ وہ اہلحدیث ہی کے حوالے سے معروف تھے اور جتنی انہوں نے امیر جمعیۃ اہلحدیث پاکستان کی حیثیت سے

خدمات سرانجام دی تھیں۔ بہر حال یہ بھی ایک جماعتی سانحہ تھا۔'' [1]

لاہور میں حکیم محمد سعید شہید نے سیرت کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کے ایک اجلاس میں راقم محترم حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی مرحوم کے ساتھ شریک اجلاس ہوا۔ اجلاس کی اس نشست میں مقررین میں امامِ کعبہ شیخ عبداللہ بن سبیل رحمہ اللہ، جسٹس حمود الرحمٰن سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان اور مولانا سید ابوبکر غزنوی شامل تھے۔

امام کعبہ نے سب سے پہلے عربی میں تقریر کی اور ان کی تقریر کا اردو ترجمہ ایک صاحب نے کیا ان کا نام اس وقت ذہن میں نہیں رہا۔ دوسرے نمبر پر جسٹس حمود الرحمٰن نے تقریر کی، جسٹس صاحب نے انگریزی زبان میں تقریر کی جس کا ترجمہ نہیں سنایا گیا تھا۔ تیسرے نمبر پر مولانا سید ابوبکر غزنوی کی تقریر تھی آپ کی تقریر کا عنوان تھا: ''اسلام کا مالیاتی نظام'' اور سید صاحب نے بھی انگریزی میں تقریر کی۔ آپ کی تقریر میں ایسی روانی تھی کہ سامعین میں جو انگریزی زبان پر عبور رکھتے تھے انہوں نے تالیاں بجا بجا کر سید صاحب کو داد دی۔

تقریر ختم ہونے کے بعد راقم اور حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی مرحوم سید صاحب کو ملے۔ بڑی محبت اور خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ میں نے عرض کی کہ آپ نے جمعیۃ اہلحدیث سے علیحدگی کیوں اختیار کی جس جماعت کی آبیاری اور اس کو فعال اور منظم بنانے میں آپ کے والد بزرگوار مولانا محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی محنت کی۔

سید صاحب نے فرمایا:

''میں خود علیحدہ نہیں ہوا بلکہ علیحدہ کیا گیا ہوں اور میں نے اب جماعت اہلحدیث سے مکمل علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ میرا ایک اصول ہے کہ میں نے جو کام کرنا ہے اس کو کرنا ہے اور جماعت اہلحدیث سے جو علیحدہ ہوا ہوں اب میرا ان سے کسی قسم کا تعاون نہیں ہے اور اس میں ذرہ برابر لچک نہیں ہے۔''

مولانا سید ابوبکر غزنوی نے قدرت کی طرف سے روشن فکر اور سلجھا ہوا دماغ پایا تھا۔ حافظہ بہت قوی تھا، ٹھوس اور قیمتی مطالعہ ان کا سرمایۂ علم تھا۔ تمام علوم اسلامیہ پر ان کی نظر وسیع تھی۔ تفسیر، حدیث، تاریخ پر ان کا مطالعہ بہت زیادہ تھا۔ ادب عربی کا بہت اعلیٰ اور ستھرا انداز رکھتے تھے۔ ان کی تقریر بڑی شستہ ہوتی تھی، وہ فطری انشا پرداز تھے، تحریر میں برجستگی، ملائمت اور روانی ہوتی تھی۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے انتقال کے بعد ان کی مسندِ تحدیث و تدریس کے وارث ہوئے اور دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور کے مہتمم مقرر ہوئے، خود لکھتے ہیں کہ:

''والد علیہ الرحمہ کے بعد دارالعلوم کی ذمہ داری اس بندہ عاجز کو سونپی گئی۔ راقم الحروف اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کی وجہ سے حضرت عبداللہ غزنوی اور حضرت الامام عبدالجبار غزنوی کی مسند پر بیٹھنے کا اپنے آپ کو کسی

---

[1] تذکرہ علماء اہلحدیث: 82/2

طرح بھی اہل نہیں سمجھتا تھا لیکن اس بات کے پیش نظر کہ بزرگوں نے کتاب وسنت کا جو فیض جاری کیا ہے اور مدتوں سے جاری ہے کہیں بند نہ ہو جائے اس ذمہ داری کو قبول کیا۔

فتشبهوا إن لم تكونوا مثلهم
إن التشبه بالكرام كرام

اگر تم ان جیسے نہ ہو سکو تو ان کا روپ ہی دھارو، بزرگوں کا روپ دھارنا بھی ایک سعادت اور شرف کی بات ہے۔"[1]

مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے یکم اپریل 1927ء کو امرتسر سے ہفت روزہ توحید جاری کیا جو یکم مئی 1929ء تک جاری رہا۔ مولانا سید ابوبکر غزنوی نے جولائی 1965ء میں لاہور سے ہفت روزہ توحید جاری کیا۔ اس کے ناشر مولوی عمر فاروق غزنوی تھے اور نگران پروفیسر سید ابوبکر غزنوی اور اس کے ایڈیٹر مولانا محمد اسحٰق بھٹی تھے لیکن یہ اخبار صرف سات ماہ تک جاری رہا۔

مولانا سید ابوبکر غزنوی بڑے علم دوست عالم دین تھے۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔

مولانا سید ابوبکر غزنوی نے 24 اپریل 1976ء کو ایک حادثے سے لندن میں وفات پائی۔ پانچ دن بعد 29 اپریل کو نعش لاہور پہنچی اور میانی صاحب کے قبرستان میں اپنے والد مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

تصانیف:

مولانا سید ابوبکر غزنوی ایک کامیاب مصنف بھی تھے، آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں۔ آپ کی تمام تصانیف مکتبہ غزنویہ شیش محل روڈ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

① حقیقت ذکرِ الٰہی
② اسلام اور آدابِ معاشرت
③ اسلام میں گردشِ دولت
④ عصر حاضر میں استاد اور شاگرد کا رشتہ
⑤ اسلامی ریاست کے چند ناگزیر تقاضے
⑥ کتابتِ حدیث عہدِ نبوی ﷺ میں
⑦ خطباتِ جہاد
⑧ واقعہ کربلا
⑨ اس دنیا میں اللہ کا قانون جزا و سزا
⑩ قرآن مجید کے صوری اور معنوی محاسن (ایک اجمالی جائزہ)
⑪ محمدی انقلاب کے چند خدوخال
⑫ سیدی وابی (مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ)

یہ کتاب 464 صفحات پر مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے حالات اور ان کے علمی وسیاسی کمالات پر مشتمل ہے۔ 214 صفحات میں 22 مشہور اہل علم وقلم کے تاثراتی مقالات شامل ہیں جن میں مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا محمد حنیف ندوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، شورش کاشمیری، رئیس احمد جعفری اور مولانا محمد

---

[1] داؤد غزنوی، ص: 456

اسحاق بھٹی جیسے اساطین علم وفن اور صاحبِ قلم شامل ہیں۔

215 تا 464 صفحات میں مولانا سید ابوبکر غزنوی نے ''سیدی وابی'' کے عنوان سے مولانا سید داؤد غزنوی کے حالاتِ زندگی اور ان کے علمی کمالات پر روشنی ڈالی ہے۔شروع میں اپنے جد امجد مولانا سید عبداللہ غزنوی اور اپنے دادا امام مولانا سید عبدالجبار غزنوی کے حالات بھی قلمبند کئے ہیں۔یہ کتاب پہلی بار دسمبر 1974ء میں شائع ہوئی۔①

---

① غزنوی خاندان، (ص:2۔1)

آہ! سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

ع اک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی!

تحریر: ملک ولی الرحمٰن ناصر سوہدروی

مولانا سید ابوبکر غزنوی ایک نامور باپ مولانا داؤد غزنوی اور ایک انتہائی ممتاز علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ وہ ذاتی حیثیت سے بھی ایک ممتاز اور ہر حلقہ میں مقبول عالم دین تھے۔ دینی اور مروجہ تعلیم (وہ ایم اے ایل ایل بی تھے) حاصل کرنے کے بعد وہ کافی عرصہ تک اسلامیہ کالج اور انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں صدر شعبۂ اسلامیات رہے۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان، روشن خیال عالم دین اور دانشور اور سب سے بڑھ کر اسلامی شرافت اور اسلامی محبت کے پیکرِ عظیم تھے۔ اپنے گوناگوں محاسن واوصاف کی وجہ سے انہیں علمی، تہذیبی اور دینی حلقوں میں بھی عزت وتکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

سید ابوبکر غزنوی ایک عظیم انسان تھے۔ صحیح معنوں میں عظیم انسان کی نشانی محض یہ نہیں ہوتی کہ اس کی عظمت صرف بڑے بڑے کاموں اور کارناموں میں دکھائی دے بلکہ اس کی عظمت کی جھلک چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی نظر آئے۔ اور سید صاحب کو اگر اس کسوٹی پر پرکھا جائے تو وہ کتنے عظیم انسان ثابت ہوتے ہیں اُس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ امیر سے امیر آدمی سے لے کر غریب ترین شخص کے ساتھ ایک ہی طرح سے پیش آتے کسی سے کوئی امتیاز نہ برتتے۔

سیّد صاحب عملی طور پر ہمیشہ سیاست سے کنارہ کش رہے، تاہم ان کی تقریر میں تیغِ اصیل کی بارش اور گفتگو میں مومنانہ دلنوازی تھی گویا ع

گرم دمِ جستجو، نرم دمِ گفتگو

سید صاحب اس کی بڑی تڑپ رکھتے تھے کہ پاکستان میں قرآن وسنت پر مبنی اسلامی آئین کا نفاذ ہو، وہ اس سلسلے میں ہمیشہ ہر اس شخص اور ہر اس جماعت سے پورا پورا تعاون کرنے کے لیے تیار رہتے جو اس مملکت میں آئین کے لیے جدو جہد کرنا چاہتا تھا۔

راقم چونکہ اہل حدیث خاندان سے تعلق رکھتا ہے اسی نسبت سے سید صاحب جب لاہور ہوتے تو راقم ان کی خدمت میں نیازمندی کے لیے حاضر ہوتا رہتا، سید صاحب بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ میرے تایا

ابو یحییٰ امام خان نوشہروی رحمہ اللہ نے باتوں باتوں میں ایک دن فرمایا کہ موجودہ صدی میں عالم اسلام پر خاندانِ غزنویہ کے بہت احسان ہیں اور کچھ ایسے ہی الفاظ میرے والد (محترم عبداللہ خان نصر) نے خاندانِ غزنویہ کے متعلق کہے۔ سید صاحب خود شاعر نہیں تھے لیکن شعروں کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے، راقم جب بھی حاضر خدمت ہوتا تو سیّد صاحب اصرار کرتے کہ کوئی شعر سناؤ۔ راقم نے ایک دفعہ کچھ شعر سنائے تو ایک شعر ان کو بہت پسند آیا اور جی کھول کر داد دی کوئی بخل قطعاً نہیں برتا اور ایک بلند مرتبہ ادبی شخصیت ہوتے ہوئے بھی انہوں نے کوئی مربیانہ انداز اختیار نہیں کیا اور پھر جب راقم ان سے مل کر باہر نکلا تو ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے ایک عرصہ سے سید صاحب راقم صاحب کے کرم فرما ہیں۔

سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم اخلاص ومروّت کے پیکر، وضع داری اور محبت کے مجسمہ تھے۔ وہ نہایت خوش گفتار، خوش طبع اور خوش پوش تھے۔ ہر بات، ہر عمل میں سادگی اور دل کشی نے ان کی شخصیت کو باوقار اور پرکشش بنا دیا تھا۔ وہ ایک باکمال اور بڑے محبوب انسان تھے۔ ایسے مخلص، بے غرض، وسیع القلب، فضائل اخلاق سے مزین اور ہر نوع کی ذاتی منفعت سے بے نیاز افراد کہاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کبھی جھوٹی شہرت کی آرزو نہ کی ۔

کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

اتنی خوبیوں کے مالک سیّد ابوبکر غزنوی تقریباً تین ہفتے ہسپتال میں بستر مرگ پر رہنے کے بعد 25 اپریل کو اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے اور اپنے پیچھے محبوب یادوں کے ایسے چمن زار چھوڑ گئے جن کی شادابی، طراوت میں ان شاء اللہ کبھی کمی نہیں آئے گی۔

سیّد صاحب کی موت ایک شہید کی موت ہے۔ وہ دیارِ فرنگ میں پیغامِ اسلام دینے گئے، مرحوم نے خود کہا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کو میرا دیارِ فرنگ میں آنا پسند نہیں آیا۔ مرحوم کی ملّی، دینی اور دنیاوی خدمات کے پیش نظر جامعہ اسلامیہ بہاولپور یونیورسٹی کا نام ''ابوبکر یونیورسٹی'' رکھا جائے۔ یہ کارنامہ ایسا ہوگا کہ جسے مکتب فکر کے لوگ پسند کریں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین [1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (11 جون 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں

تحریر: مولانا حافظ عبدالغفور جہلمی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

خوش گفتار و خوش پوش، سادہ و متین، مجسمہ صدق و صفا، اکبر الٰہ آبادی کی ظرافت لیے ہوئے، اخلاص و محبت کا سراپا، مانند گلاب مسکراتا ہوا وجیہہ چہرہ، میانہ قد غیرت اسلامی کا مرقع، جانِ محفل' بات کریں تو منہ سے پھول جھڑیں، کم گو' گفتگو بادلیل، فضول اور بے مقصد گفتگو سے پرہیز، سنتِ رسول کے شیدائی، بلند پایہ ادیب، منجھے ہوئے خطیب' نام و نمود سے بے نیاز، وسیع الالقاب اور خاندانِ غزنویہ کے گل سرسبد، سید ابوبکر غزنوی جنھیں اب مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ قلم لرزتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے جسے بہر حال تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ وہ ہمیں اب ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے چکے ہیں اور میانی صاحب کے مشہور قبرستان میں لاکھوں بندگانِ خدا کی طرح منوں مٹی تلے دبے ہیں ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

خاندانِ غزنویہ کے یگانہ روزگار فرزند جماعتِ اہلحدیث کے عظیم رہ نما سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ آج سے کوئی پچاس سال پہلے امرتسر کے مردم خیز خطہ میں پیدا ہوئے۔ امرتسر کی سرزمین سے کتنی ہی مایۂ ناز شخصیتیں اٹھیں کہ عرصہ تک زمانے میں ان کا طوطی بولتا رہا۔

مناظرِ اسلام شیخ القرآن والحدیث فاتح قادیان حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا عبد الجبار غزنوی، مولانا عبد اللہ معمار امرتسری، مولانا حافظ عبد الحق صاحب صدیقی، مولانا عبد اللہ ثانی (رحمۃ اللہ علیہم) وغیرھم سب امرتسر کے ہی مردم خیز علاقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

سید صاحب نے ابتدائی تعلیم امرتسر اور لاہور میں حاصل کی۔ تکمیل علم کے آخری مراحل لاہور میں طے کئے اور امتیازی حیثیت سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا۔ قانون میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔

تعلیم جدید کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کی۔ ان کے اساتذہ کرام میں اپنے زمانہ کے فاضل ولائق اساتذہ وعلماء کے نام آتے ہیں۔ شیخ العرب والعجم استاذ الاساتذہ حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی مدظلہ العالی، مولانا محمد عبدہ، مولانا

شریف اللہ صاحب اور دیگر علماء کے علاوہ اپنے والد بزرگوار محترم سید داؤد غزنوی کی صحبت سے بھی استفادہ کیا تھا۔

قدیم وجدید دینی و دنیوی تعلیم کا جو حسین امتزاج سید صاحب کے ہاں نظر آتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے سید صاحب کے ہاں وہ تشدد و سختی نہیں ملتی جو کم علم علماء کا وطیرہ ہے۔ فروعی مسائل میں نہ الجھتے اور نہ ہی اسے اچھا تصور کرتے۔

اپنے والدِ محترم سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے مگر جلد ہی اس بھاری پتھر کو چوم کو چھوڑ دیا کہ وہ بعض جماعتی افراد کی بدانتظامی کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ وہ ہر کام کو اصول وضوابط کے تحت سرانجام دینے کے خواہش مند تھے۔ نہ خود بے اصولی کرتے اور نہ ہی کسی کو اس کی اجازت دیتے۔ چنانچہ ان کی اصول پسند طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ وہ ناظم اعلیٰ کی حیثیت میں اس خرابی کو دیکھتے رہیں مگر جب اصلاح کی کوششوں سے زیادہ خرابی کا امکان نظر آیا تو انہوں نے نظامت سے قطع تعلق کرلیا۔ وہ علماء کے آپس کے انتشار کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ جس کا برملا اظہار انہوں نے اپنے خطبات جمعہ میں کئی بار کیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سید صاحب اسلامیہ کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے، پھر پنجاب یونیورسٹی اور بعدہٗ انجینئرنگ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اسلامیات مقرر ہوئے اور کچھ عرصہ قبل جب آپ کو اسلامی یونیورسٹی بہاولپور میں وائس چانسلر کی حیثیت سے تعینات کیا گیا تو اس تقرر کو ہر کسی نے سراہا اور حکومت کے اس حسنِ انتخاب کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ کیونکہ اسلامی یونیورسٹی کے لیے بحیثیت وائس چانسلر جن صفات کے حامل فرد کی ضرورت تھی وہ آپ میں بدرجہ اتم موجود تھیں اور یہ اعزاز آپ کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا جسے آپ نے قبول کیا۔ مرحوم بہاولپور یونیورسٹی کو دنیا کی مثالی یونیورسٹی بنانے کا عزم رکھتے تھے جس کا اظہار انہوں نے اپنی پہلی پریس کانفرس میں کیا گیا تھا مگر افسوس عمر نے وفا نہ کی اور یہ انمول موتی موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا۔

سید صاحب کو اسلام سے والہانہ پیار تھا، وہ کسی بھی مجلس میں اسلام کے خلاف کوئی بات نہ سن سکتے تھے۔ اسلام کی حقانیت کے بارہ میں سید صاحب اتنے دلائل پیش کرتے کہ دوسرے انسان کو بھی قائل ہونا پڑتا۔

1970ء کے انتخاب میں جب اسلام اور سوشلزم کی بحث جاری تھی تو سید صاحب نے باوجود سرکاری ملازمت کے اسلام کی بھرپور وکالت کرتے ہوئے سوشلزم کے دلائل کا تار پور بکھیر دیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے: ''سوشلزم کی وکالت کرنے والے اسلامی تعلیمات سے ناواقف اور ذہنی وفکری انتشار کا شکار ہیں۔ اسلام کے روشن سورج کے ہوتے ہوئے مٹی کے دیئے کی تلاش کرنے والے احمق ہیں۔ ان کا اسلامی تعلیمات پر عبور کا یہ عالم تھا کہ جب انہوں نے عالمی سیرت کانفرنس میں اپنا مقالہ پڑھا تو مندوبین حیرت سے منہ تکتے رہے اور اس نشست کے مہمانِ خصوصی جناب جسٹس حمود الرحمن سابق چیف جسٹس آف پاکستان بے ساختہ پکار اٹھے کہ ''ہمیں آج پتہ چلا ہے مولانا سید ابوبکر غزنوی کس پایہ کے

عالم ہیں؟“

سید صاحب کی طبیعت کا خاص پہلو ان کی صاف گوئی اور دیانت واخلاص ہے۔ جو بات کہنی ہوتی، لگی لپٹی رکھے بغیر منہ پر صاف فرما دیتے تھے۔ تصنع اور بناوٹ نام کو نہ تھی۔ دوستوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ سمجھتے۔ عزیزوں اور شاگردوں کا خاص خیال رکھتے تھے، ان کی معمولی سے معمولی بات ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہتی تھی۔ شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔

غزنوی سید صاحب جیسی قابلِ فخر ہستیاں دنیا میں کم ہیں۔ اس انمول ہیرے پر جماعت اہلحدیث جتنا بھی فخر کرسکتی کم تھا مگر موت نے جلد ہی ان کو ہم سے چھین لیا۔ آپ یورپ کے بت خانہ میں اذانِ بلالی دینے گئے تھے کہ حادثہ کا شکار ہوگئے اور ہمیں سوگوار چھوڑ کر خود اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی میت مبارک کو پاکستان لایا گیا۔ جنازہ کا منظر قابلِ دید تھا، ہزاروں کی تعداد میں سوگوار کندھا دینے کے لیے بے تابانہ تابوت سے بندھے ہوئے بانسوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ شیخ الحدیث والقرآن مولانا معین الدین لکھوی صاحب نے انتہائی رقت آمیز لہجہ میں نماز جنازہ پڑھائی۔ لوگ شدتِ غم سے ڈھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ دور دراز علاقوں سے ہزاروں افراد آئے ہوئے تھے۔ جنازہ میں شریک ہونے والے متشرع اور دین کے شیدائیوں کی اتنی کثرت تھی کہ آخر سید صاحب خدا کی مغفرت بھی حاصل کر گئے کیونکہ حدیث میں چالیس مسلمانوں کا تذکرہ ہے۔

بہرحال سید صاحب زندہ تھے تو ایک شان کے ساتھ اور راہی ملک عدم ہوئے تو بھی انوکھی شان کے ساتھ ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے

آخر میں حکومت سے گزارش ہے کہ وہ سید صاحب کی خدمات کے اعتراف کے طور پر بہاولپور یونیورسٹی کا نام بدل کر ”ابوبکر یونیورسٹی“ رکھ دے تاکہ اُن کی یہ یادگار اُن کے سنہری کارناموں کی یاد تازہ کرتے ہوئے دوسروں کو راہِ عمل دکھاتی رہے۔ [1]

[1] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

واہ سیّدی! ابو بکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

تحریر: پروفیسر محمد مزمل احسن شیخ، لاہور

آہ! میں نے یہ کیا سنا، کہ سیّد ابو بکر غزنوی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یقین نہیں آتا لیکن یقین نہ کرنے کی وجہ بھی کوئی نہیں کیونکہ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ والا فیصلہ پورا ہو کر رہتا ہے۔

آخرش منزل ما وادیٔ خموشاں است
حالیہ در گنبدِ افلاک غلغلہ انداز

ابھی کل ہی کی تو بات ہے، جب وہ لاہور سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے کہ "عین ممکن ہے کہ بہاول پور کی اُس وادِ غیر ذی زرع میں ایسے مجاہد تیار کر سکوں جو دین و دنیا دونوں میں کمال رکھتے ہوں اور امت کی رہنمائی کا فریضہ بطریق احسن ادا کر سکیں۔ ورنہ میں کسی لالچ سے ہرگز وہاں نہیں جا رہا کہ اللہ کا دیا سب کچھ ہے" اور پھر وہاں سے یقیناً لندن بھی وہ کسی لالچ سے نہیں گئے کہ ع

ازل سے رہا ہے یہ مردِ قلندر کا طریق

لیکن عجب اتفاق ہے کہ وہاں سے اُن کی واپسی تو ہوئی پر کیسی واپسی! جو دنیا سے ہمیشہ کے لئے آخرت کی طرف واپسی پر منتج ہوئی۔

حیات آوارۂ دیر و حرم رہتی ہے صدیوں تک
تو بزمِ عشق سے ہوتا ہے اِک اہلِ نظر پیدا

اب اُس اہلِ نظر کے جانے کے بعد کیفیت یہ ہے کہ لکھنا چاہتا ہوں لیکن لکھ نہیں سکتا۔

اے عزیزانِ گرامی، اے رفیقانِ قلم
طائرِ افکار کے پیش نظر پروانہ ہے
بعض پُرمعنی حقائق ہیں قلم کے سامنے
دل پریشان حال ہے طبع ناساز ہے

آہستہ آہستہ وہ روشن چراغ گل ہو گیا، جس کے دم سے قومی زندگی میں حرارت اور ملی شاہراہ پر اُجالا تھا۔ موت العالِم موت العالَم کے مصداق جہانِ خطابت میں ہی موت وارد ہو گئی۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
عجب دستِ اجل کو کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے پھول چننا اور ویرانے میں رکھ دینا

سید ابوبکر نے ابھی کل ہی کی بات تو ہے، جب ''سیدی دابی'' کے نام سے اپنے والد محترم مولانا سید داؤد غزنوی مرحوم ومغفور کے حالات اور کارناموں پر مشتمل کتاب کی تالیف کی، اور آج وہ خود سیدی اور ابی بن گئے ہیں! ؎

اے بزمِ سفیرانِ دول کے سخن آرا
ہر خورد و کلاں تری فصاحت پر فدا ہے
یہ سچ ہے کہ جادو ہے ترے میں لیکن
کچھ سحر بیانی کا ترے ڈھنگ جدا ہے

مجھے اپنے استادِ محترم جناب ڈاکٹر محمد اسلم صاحب چیئرمین شعبہ تاریخ کے وہ الفاظ یاد آ رہے ہیں جو میرے فرزند طاہر محمود کی پیدائش کی موقع پر انہوں نے اوائل 71ء میں تحریر فرمائے تھے: ''اللہ تعالیٰ اُسے نیکوں کے راستہ پر گامزن ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور میراث النبی ﷺ کا وارث بنائے۔ اہل حدیث کے ہاں اس وقت علم کا قحط ہے کوئی نامور عالم اس جماعت میں موجود نہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ کے فرزند ارجمند کو علم وعمل کی دولت سے مالا مال کرے، اور کیا عرض کروں''؟

اور میں بھی یہی کہتا ہوں کہ اور کیا عرض کروں، سوائے اس کے کہ ع ''ایک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی''۔ اب تو کچھ سجھائی نہیں دیتا، کیونکہ کس کس کو یاد کروں اور کس کس کا ماتم کروں، ایک قطار لگی ہوئی ہے کہ رکنے کا نام نہیں، پتہ نہیں کس کی نظر کھا گئی ہے اس جماعت کو! جانشین نظر ہی نہیں آتا۔ ایک کے جانے کے بعد دوسرے کا قدر بڑا محسوس ہوتا ہے تو وہ بھی چند سانس کا مہمان ثابت ہوتا ہے اور بڑے بڑے قد آوروں کا حال یہ ہے کہ انہوں نے حالات کے سامنے سپر تو نہیں ڈالی لیکن موت کے آگے کس کا بس چل سکتا ہے؟

ممکن ہے اس سیّد کی دفات حسرت آیات ہی اس جماعت کے لئے تازیانہ عبرت ثابت ہو اور وہ سنبھلنے کی کوشش کرے۔ ورنہ حشر نہ ہوگا کبھی والا معاملہ ہوگا۔ افراد باقی نہیں رہتے لیکن کردار باقی رہتے ہیں اور اُن کے اثرات رہتے ہیں۔ شخصیات ختم ہو جاتی ہیں، لیکن اُن کے مقاصد اور اصول جاوداں ہوتے ہیں ؎

بشر کو چاہیے ہر دم خیالِ قضا رہے
ہم کیا رہیں گے جو نہ رسول خدا رہے

باقی نام اللہ کا! پس دوستو ایک ہی بات کہتا ہوں اور اُسی کی خاطر یہ سب کچھ کہا جاتا ہے کہ اپنی ہستیوں کو اور

عہدوں کو مٹادو لیکن اللہ کے دین کو نہ مٹنے دو جاؤداں ہو جاؤ گے، ورنہ یاد رکھو کہ مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے!

یا اللہ! اپنی خاص رحمت سے اپنے بندے ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ پر رحم فرما اور جنت الفردوس میں ٹھکانہ بخش کہ وہ تیرے دینِ متین کا مجاہد تھا!

اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام، لاہور (14 مئی 1976ء)

سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کا پیغام

تحریر: پروفیسر محمد مزمل احسن شیخ

سید ابوبکر غزنوی جسے مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے، کو جدا ہوئے کتنے مہینے گزر چکے ہیں، لیکن حال یہ ہے کہ دل مانتا ہی نہیں، جیسے ماننے والی بات ہی نہ ہو، حالانکہ یہ کوئی انہونی نہیں ہوئی، یوں ہوتا چلا آرہا ہے اور ہوتا چلا جائے گا:

آخرشِ منزل ما وادئ خموشاں است
حالیا در گنبد افلاک غلغلہ انداز

والا معاملہ ہے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ.

اصل میں جسم مرتا ہے روح نہیں مرتی۔ بالفاظِ دیگر نیکی کو دوام ہے اور یہی حیات جاودانی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اور

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ ٹوٹا ہوا تارا کہیں مہِ کامل نہ بن جائے

سید انجمن تھا، اُسے قدرت نے جمال وجلال کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ وہ ان میں سے تھا جو دل کے اندر گھس جاتے ہیں اور پھر اپنی اداؤں، پیار بھری فضاؤں اور دینی محبت کی انتہاؤں کی وجہ سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔

مجھے ان سے صرف اس قدر تعلق خاطر رہا ہے کہ کبھی کبھار جمعہ ان کی اقتدار میں ادا کر لیتا تھا یا شامِ ہمدرد اور اسی قسم کی تقریب میں اتفاق ہو گیا تو سن لیا لیکن ان کے اخلاق اور ورد کے اثرات آج بھی اپنے قلبِ ناتواں پر بخوبی محسوس کر رہا ہوں۔

آج کی محفل میں ان کے مختلف تاثرات کو پیغام کی صورت میں حیطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کرنے لگا ہوں۔ اللہ کرے کہ ان سے ہی ہم کوئی درسِ عبرت حاصل کریں۔ ع

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

موحد ہونے کے ساتھ ساتھ مؤدب نہ ہونا ان کے نزدیک ناقابلِ تلافی جرم تھا، کہ جیسے ہم توحید کے پرستار نہ ہوئے، بے ادبی کے ٹھیکے دار بن گئے۔ یبوست اور خشکی کے مارے ہوئے، جیسے دنیا جہاں کی سختی ہمارے اندر نشیمن بنا چکی ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے والے اتنے باادب اور بااخلاق ہونے چاہئیں کہ دنیا جہاں ان پر رشک کرے اور انہیں راہنما مانے۔

اس خشکی کو دور کرنے کے لیے سید ذکر کا نسخہ تجویز فرمایا کرتے تھے کہ یہی وہ کیمیا ہے، جس سے یبوست کا مارا انسان حد درجہ شائستہ اور مہذب بن جاتا ہے۔

دوسری بات جس کا اکثر انہیں دکھ ہوتا تھا وہ جاہل قسم کے نام نہاد حضرات کا وجود تھا۔ جو دینِ متین کی سربلندی اور اعلائے کلمہ الحق کی بجائے آپس میں دست و گریبان ہیں۔ سب سے زیادہ دین کو نقصان پہچانے والے یہی دین دار ہیں اور اس میں انہوں نے کبھی کسی گروہ، فرقہ یا طبقہ یا فرد پر کیچڑ نہیں اچھالا تھا جبکہ درحقیقت وہ اس شعر کی تفسیر تھے۔

میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
نے آبلۂ مسجد ہوں نے تہذیب کا فرزند

بلاخوف لومۃ لائم وہ دل کی بات زبان پر بے اختیار لے آیا کرتے تھے۔ منافقت ان میں نام کو نہ تھی اکثر حکومت کو بھی اصطلاح کی خاطر ہدایات سے نوازنے سے دریغ نہ فرماتے۔

طلباء کو بھی اکثر خطبہ جمعہ میں خصوصی ہدایات سے نوازا کرتے تھے، کہ بے ریا، بے خوف، بے طمع، بے باک اور سنت نبوی کے سچے عامل بن کر انسانیت کی فوز و فلاح کے لیے تن من دھن سے اپنے آپ کو وقف کر دو، ورنہ ؎

تمہاری داستان تک نہ ہو گی داستانوں میں

کھانے، پینے اور نمود و نمائش سے بے نیاز ہو جاؤ کیونکہ علم صرف ان سینوں کو نشیمن بناتا ہے جو رضائے الٰہی کے طالب اور ذکر الٰہی کے شائق اور سنت نبوی ﷺ کے سچے عاشق ہوں۔ قربانی کرو اور وقف ہو جاؤ، حیاتِ جاوداں پاؤ گے۔ اوڑھنا بچھونا طلبِ علم بناؤ، سطح پر نہ تیرو بلکہ بحرِ علوم کے شناور بنو۔ سطحیت ہمیشہ ڈوب جاتی ہے اور ڈبو دیتی ہے۔

ہر سال سیرت النبی ﷺ کے موقع پر خصوصی اور دیگر اسلامی تہواروں پر عموماً اس چیز کا رونا رویا کرتے تھے کہ ہم نے صرف دن منانا کافی سمجھ لیا ہے، حالانکہ اصل معاملہ عمل سے متعلق ہے۔ اسی نبی ﷺ کا نام لے کر اسی کے احکام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ جو مزامیر توڑنے آیا تھا، اسی کے نام پر طبلے کی تھاپ پر ناچ کر کے اُس کی روح کو تکلیف دیتے ہیں۔ اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو گی کہ ہندو مسلمانوں کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے اور مسلمان اسلام کو۔

ہمیں اپنے اعتقادات، عبادات اور معاملات کو سیرت النبی ﷺ کے رنگ میں رنگنا چاہیے تھا نہ کہ خود ساختہ وضع کردہ اعمال کر کے سبکدوش ہو جاتے کہ ہمارا کام سال بھر کے لیے اب ختم ہو گیا۔

سید انتہائی باادب اور متواضع شخصیت تھا۔ ع

جھکتی ہے ڈالی میوے سے لدی

تکبر نام کو نہ تھا، جسے ہم لوگ سختی سے گردانتے ہیں یہ دراصل اصول پرستی ہے۔ اسی وجہ سے انہیں زندگی میں بھی اور پھر مرنے کے بعد تو انتہائی احترام ملا کہ فرمانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ''جو اللہ کے لیے پست ہوا، اللہ تعالیٰ اسے بلند فرماتے ہیں'' کا نقشہ ان کی زندگی اور موت میں نظر آتا ہے۔

ایک محترم نے بیان فرمایا کہ اللہ کی محبت اور خشیت کی یہ کیفیت تھی کہ بیت اللہ میں اہل اللہ کی طرح فرمایا کہ دل کو الٹا کر دیا ہے اگر سیدھا رہے تو تجلیاتِ الٰہی سے کہیں پھٹ نہ جائے۔

اللہ اللہ! کیا انسان تھے وہ بھی، ضرورت ہے کہ ہم بھی آج ان کی اچھائیوں کو نقشِ راہ بنائیں تاکہ دینِ متین کی شمع کی روشنی سے ہمیں دین و دنیا میں جلا ملے اور اللہ کی رضا بھی۔ (1)

---

(1) ہفت روزہ الاسلام، لاہور (8 اکتوبر 1976ء)

پروفیسر سید ابوبکر غزنوی مرحوم

کہاں ہے آج تو اے آفتابِ نیم شبی!

تحریر: جاوید بن عبداللہ، لاہور

موت کا ظالم ہاتھ بڑھا اور اُس مشعلِ رشد و ہدایت کو بجھا کر چلا گیا جس کی ضیائے ایمان افروز میں زندگی کے لاتعداد مسافر جادہ زیست سمیٹ رہے تھے۔ وہ شمع علم و عرفان گل ہوگئی جس کے دامانِ فیض سے ہزاروں شاگرد کسبِ ضیاء کر رہے تھے۔ فقر کے اس جھونپڑے پر برقِ اجل گری جہاں فقرِ فخری کا محرمِ اسرار، اقبال کا مردِ مومن ابوبکر غزنوی دعوت و تبلیغ میں مصروف تھا۔ مینائے لاجورد سے اسرافیل نمودار ہوا اور اُس پیکرِ خلق و اکرام کی روح لے کر پہنائے فلک میں روپوش ہوگیا۔ فطرت کا پیغامبر آسمان کی سیڑھیوں سے اترا اور اس مردِ درویش کو ابد کی نیند سلا کر چلا گیا۔ ؏

ہائے او موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

علی الصبح اخبار اٹھایا تو آپ کے وصالِ پُرملال کی خبر نمایاں حروف میں دیکھی، سینہ دھک سے رہ گیا اور میں سوچنے لگا کہ شاید خداوند قدوس کو اہلِ علم پر کوئی عذاب بھیجنا مقصود ہے۔ ایک دو سال کے اندر ملک کی کتنی مایہ ناز اور ہمہ صفت موصوف ہستیاں اس دنیائے رنگ و بو سے رختِ سفر باندھ گئیں۔ کتنے ہی اہلِ فکر و نظر طالبانِ علم کو تشنہ لب چھوڑ کر اس دار المحن کو خیر باد کہہ گئے۔ آج چشمِ فلک نے داؤد غزنوی مرحوم، مولانا اسمٰعیل سلفی اور شورش کشمیری کے بعد اس عظیم الشان کا جنازہ اٹھتا ہوا دیکھا جسے دنیا ابوبکر غزنوی کے نام سے جانتی ہے۔ شیش محل روڈ پر انسانوں کا ایک ہجوم تھا۔ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر علماء رو رہے تھے، طلباء رو رہے تھے، صلحاء رو رہے تھے، اعزا و اقرباء رو رہے تھے۔ جدائی کے ان لمحات میں رونا ایک قدرتی امر ہے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر دل خون فشاں تھا اور ہر نظر عالمِ فانی کے اس مسافر کے تابوت پر گڑی ہوئی تھی۔ جنازہ اٹھا سیّد ذی وقار کا پیکر اب اہل و عیال کو گریہ کناں چھوڑ کر عقیدت مندوں کے شانوں پر سوار اسی دنیا کی طرف قدم فرسا ہوا جہاں سے مڑ کر کوئی واپس نہیں آیا، جہاں افعال و اعمال کی قدر و قیمت ہے حسب و نسب کی نہیں۔ جہاں ہر کس و ناکس اپنے کئے کی جزاء و سزا پاتے ہیں جہاں ہر کسی سے مساوی سلوک کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر غزنوی کو ہر خوبی سے نوازا تھا وہ صاحبِ صورت بھی تھے اور صاحبِ سیرت بھی، عالی حسب بھی تھے اور عالی نسب بھی۔ ایک اچھا مسلمان اُن میں پوری آب و تاب سے جلوہ گر تھا۔

موت اور زندگی کی مصالحت ناممکن ہے۔ عرصۂ دنیا میں آنے والا ہر انسان اُسی راہ کا مسافر ہے جس کی منزل موت

ہے۔خوبیوں والے انسان مرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہمارے درمیان سے ایک ہمہ گیر شخصیت اُٹھ گئی ہے جس کا وجود ایک نعمت سے کم نہ تھا۔موت ایک انسان کو خاموش تو کرسکتی ہے لیکن اُس کی صفات اور کردار وعمل کی خوبیاں ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام دیتی ہیں۔

ابوبکر غزنوی! تیری مرنجانِ مرنج شخصیت کی یاد آتی ہے تو آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیل بے پناہ اُمڈ آتا ہے۔ کبھی فکر تآل سے آنسو چھلک پڑتے ہیں اور کبھی بھولی بسری یادوں اور گزرے ہوئے لمحات کو یاد کر کے تخیلات کی وادیوں میں نغمہ زن ہو جاتا ہوں۔

اے سرزمین افرنگ میں گہنانے والے چاند تیرے بغیر شہر کے در و دیوار پر سکوت طاری ہے۔اے چراغِ ہدایت تیرے بجھنے سے راہ و منزل تیرہ و تاریک نظر آتے ہیں۔اے عندلیب نغمہ سنج تیرے جانے سے ہم پر وبال جلائے بیٹھے ہیں۔گل و لالہ کا رنگ فق ہے، سنبل و ریحاں کا سینہ شق ہے۔ابوبکر تیری موت کا گمان تک نہیں تھا لیکن خدائے لایزال کے بھیدوں سے کون واقف ہے۔اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ علمِ غیب خاصہ خداوندی ہے۔ابوبکر غزنوی! ابھی تیری زندگی کی بہت ضرورت تھی نہ جانے کتنے شاگرد تیری شفقت کو یاد کر کے روتے ہوں گے اور کبھی دفعتہً منہ سے نکل جاتا ہوگا۔ ع

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ شمع تھی محفل میں پروانے کی خاک

میں سید صاحب کا بے حد مداح تھا، وہ ذاتی طور پر مجھے نہ جانتے تھے لیکن میں اُن کا ایک غائبانہ عقیدت مند تھا۔ مجھے اُن کے دھن مشک افشاں اور قلم صاف گو سے انتہائی محبت تھی۔ دولتِ دیدار سے فیض یاب ہو چکا تھا اور حسرتِ ملاقات ابھی دل میں باقی تھی کہ ابوبکر غزنوی جانِ شیریں جان آفرین کے سپرد کر گئے اور میرے جیسے ہزاروں طالب علم کچھ مسلک سے ہم آہنگی کے باعث اور کچھ ذاتی رجحانات کی وجہ سے اُن پر فریفتہ و شیدا تھے۔پچھلے سال اُن کی اقتداء میں نماز جمعۃ المبارک پڑھنے کا اتفاق ہوا۔تقریر سنی اور ختم ہوگئی تو مجھے خیال آیا۔

برس رہا ہے مگر تشنگی نہیں بجھتی
میں ریگ زار ہوں اور وہ گھٹاؤں جیسا

میں نے ہر مسلکِ فکر کے لوگوں کو اُن کی مدح و ستائش میں رطب اللسان دیکھا ہے۔ وہ خطابت میں دُرّ افشاں تھے۔قرآن وحدیث کی عطر بیزی کے ساتھ ساتھ تو حالاتِ حاضرہ پر دانشمندانہ اظہارِ خیال اور سیاست کی چاشنی نے اُن کو ایک بلند پایہ، دل پذیر اور دل نواز خطیب بنا دیا تھا۔ میں کئی بار شیش محل روڈ گیا اور حسرتِ دیدار لے کر واپس آ گیا۔ میں شاید اُن کی جبینِ درخشاں پر فطری جلال و جمال سے مرعوب تھا لیکن یہ نہ سمجھئے کہ اُن کے چہرے پر کم آمیزی کے آثار تھے بلکہ رب العالمین نے انہیں انتہائی خلیق و ملنسار بنایا تھا۔

اے کاش! اُن کی عمر فانی کچھ اور وفا کرتی تو ہم اُن کے دامانِ علم و فضل کو چھو کر اپنے متعلق لکھتے کہ ع اُن سے ہم

مدت تک کسبِ ضیاء کرتے رہے۔ جناب آغا صادق کو شاید کسی ایسی کیفیت سے دو چار ہونا پڑا ہوگا تو انہوں نے کہا ہے۔

عمر ہی نے وفا نہ کی افسوس
ورنہ ہم اور بھی وفا کرتے [1]

روییئے کس کس کو..... اور ..... کس کس کا ماتم کیجئے

یادِ رفتگان، ابوبکر غزنوی

تحریر: آزاد شیرازی

یادِ رفتگاں کے عنوان سے میری ایک پرانی غزل کا مطلع اور مقطع یوں ہے۔

چمن میں اُجڑی ہوئی بہاروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی
خزاں کے دامن میں شاخساروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی
مریضِ غم گرچہ چارہ سازی کے بوجھ سے دب کے مر چکا ہے
جبینِ تربت پہ غم گساروں کی یاد سی رہ گئی ہے باقی

گزشتہ کئی برسوں سے اپنی موت کے انتظار میں نظریں جمائے بیٹھا ہوں لیکن ع ''موت آتی ہے پر نہیں آتی'' والا سماں ہے۔ اس دوران بیشتر احباب سفرِ آخرت پر روانہ ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ میرے ہم عمر، کچھ عمر میں بڑے اور کچھ عمر میں چھوٹے تھے، سیّد ابوبکر غزنوی مجھ سے عمر میں خاصے چھوٹے تھے۔ لیکن علم میں، زہد و تقویٰ میں، دینی اور دنیاوی مناصب میں مجھ سے بہت بڑے تھے۔ میں نے انہیں جامع اہلحدیث چینیاں والی کے صحن میں سبزہ آغاز کے عالم میں دیکھا تھا۔ اُن کے والدِ گرامی سیّد محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ جلال و جمال کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ ابوبکر اُن دنوں کالج کے نو گرفتاروں میں تھے۔ اور مادی فلسفہ کی بھول بھلیوں میں گم عرفانِ نفس کی تلاش میں تھے.....

ایک مدت بعد آج سے پانچ برس پہلے راقم الحروف کو جناب حنیف رامے روزنامہ مساوات میں کھینچ لے گئے۔ مساوات کے دفتر کے قریب ہی سید ابوبکر غزنوی خطبہ جمعہ دیا کرتے تھے۔ برسوں بعد نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے راقم الحروف شیش محل روڈ پہنچا تو ابوبکر غزنوی اب اقبال کے ''فلسفہ زدہ سیّد زادے'' کے بجائے ''ہر اک مقام سے آگے گزر گیا اقبالؔ'' کے مصداق ہو چکے تھے۔ [2]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

[2] ماہنامہ تذکرہ، لاہور (اگست 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم.... ایک باغ و بہار شخصیت

تحریر: حمید المکی

سیدی ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہماری جان پہچان کا آغاز نوعمری میں مسجد چینیاں والی سے ہوا تھا۔ مولانا سیّد عبدالواحد غزنوی کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بھائی مولانا سیّد عبدالجبار غزنوی کے فرزندِ اکبر مولانا سید داؤد غزنوی نے مسجد چینیا نوالی کی امامت اور خطابت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ مسجد چینیا نوالی شہر لاہور کے قلب محلہ چابک سواراں میں واقع ہے اور یہ ایک قدیم دینی مرکز ہے۔ جہاں بڑے بڑے عالم درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھے رہے ہیں۔ ہزاروں طلبہ نے اس مرکز سے قرآن اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ میرا خاندان بھی مسجد چینیا نوالی سے وابستہ رہا ہے۔ راقم کے دادا مولوی محمد مکی نے بھی مسجد چینیا نوالی کی امامت کی ہے۔ میرے والد اور ہم سب بھائیوں نے بھی قرآن پاک اسی مسجد میں پڑھا۔

مولانا سید داؤد غزنوی کے دو صاحبزادے مولوی عمر فاروق غزنوی اور سیدی ابوبکر غزنوی تھے۔ بعد میں ایک دوسری شادی سے بھی صاحبزادے اور صاحبزادیاں بفضل تعالیٰ زندہ ہیں۔ مولوی سیّد عمر فاروق غزنوی ہم سب میں عمر میں بڑے ہیں ان کا احترام ہمیشہ ہی بڑے بھائی کا سا رہا ہے۔ والدین کے تعلقات نے ہم بھائیوں کو غزنوی خاندان سے بہت قریب کر دیا اور ہم بڑے گہرے دوست بن گئے تھے۔ مولانا ابوبکر غزنوی میرے چھوٹے بھائی قیوم المکی کے ہم جماعت تھے مگر ہم سب میں دوستی تھی اور جاننا بھی مشکل تھا کہ کون کس کے زیادہ قریب ہے۔ مولانا سید داؤد غزنوی سیاسی طور پر مجلس احرارِ اسلام ہند سے وابستہ تھے اور احرار کے پلیٹ فارم سے انگریزوں کے خلاف تقریر کرنے کی پاداش میں متعدد بار جیل بھجوائے گئے تھے۔ حضرت مولانا سیّد داؤد غزنوی نے اپنی جوانی اور صحت سب قید و بند کی صعوبتوں کی نظر کر دیا تھا۔ حضرت مولانا جب جیل چلے جاتے تو ہم بھائی قرآن پاک کا سبق مولانا ابوبکر کی والدہ سے پڑھا کرتے تھے۔ مولانا سید عبدالجبار غزنوی کا علم و فضل اور مولانا سید داؤد غزنوی کی فراست و خطابت اور اپنے اجداد کی ہر خوبی مولانا ابوبکر غزنوی کے ورثے میں آئی تھی اور عین عالم شباب میں مولانا ابوبکر غزنوی نے اپنے لئے وہ مقامِ محمود پیدا کر لیا تھا جس کا کوئی عام آدمی خیال بھی نہیں کر سکتا۔

ابوبکر غزنوی فلسفہ، ادب، شاعری اور عربی، فارسی اور اردو زبان کے دلدادہ تھے۔ اپنی تقاریر میں اشعار کا برمحل استعمال کرتے تھے۔ شیریں کلام ان کا عمدہ ترین وصف تھا۔ عادات پاکیزہ، گفتگو لطیف اور باطن شستہ تھا۔ لطیف

احساسات پر اگر کوئی بات گراں گزر بھی جاتی تو اسے درگزر فرماتے۔ کتنے بے تکلف دوست کیوں نہ ہوں وہ ناشائستہ بات نہ کرتے اور نہ ہی سنتے۔ دل شکنی انہیں سخت ناگوار تھی۔ ہر ممکن طریقے سے یہی کوشش رہتی کہ دل جوئی کریں اور شاید یہی جوہر تھا کہ جس کی وجہ سے ان کے بے شمار عقیدت مند تھے۔ بچپن سے شعور تک اور پھر پختگی کی منازل طے کرنے میں ہم نے اپنے قرب میں ذرا برابر فرق نہیں آنے دیا۔ جس محبت و احترام سے پہلے دن سے آخری ایام تک وہ خلوص اور احترام قائم رہا۔ ہم بچپن کے چند ساتھی ایک ہی جگہ رہنے کی وجہ سے ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ جن میں مولوی سید عمر فاروق، ابوبکر غزنوی، محترم عبداللہ ملک اور ان کے برادر عبدالرؤف ملک، شیخ محمد سلیم اشرف مرحوم، ڈاکٹر محمد اجمل سیکرٹری تعلیم پاکستان، سید فراست حسین، میرے بڑے بھائی مجید المکی اور چھوٹے بھائی قیوم المکی اور راقم شامل ہیں اور ہم دوستوں کا غم کھانے کے لئے بچ گئے ہیں۔

ابوبکر غزنوی سیر و تفریح کے بڑے رسیا تھے۔ جب بھی موقع ملتا پیدل دریائے راوی کی سیر کو نکل جاتے اور پہروں پاؤں دریا میں لٹکا کر بیٹھے رہتے یہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ پانی کی لہروں سے کھیلتے اور محظوظ ہوتے رہتے تھے۔ مولانا غزنوی فطری طور پر سرد آب و ہوا پسند فرماتے۔ اگر موسم گرما میں پہاڑی مقام پر نہ جاتے تو طبیعت مضطرب رہتی۔ مولانا ابوبکر غزنوی خوش پوش، خوش کلام اور خوش خوراک تھے جو نہایت ہی فراخ دل میزبان تھے۔ کوئی ملنے کو آتا تو موسم کے لحاظ سے تواضع اس خاندان کا وصف ہے۔

حصولِ علم کا شوق بے پناہ تھا، انہوں نے لاتعداد کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ ایم اے عربی میں کیا اور ایل ایل بی بھی کر لیا کہ فقہ اور قانون دونوں پر قدرت حاصل کر لیں۔ اوّل اسلامیہ کالج میں ملازم ہوئے اور کئی برس تک وہاں پڑھاتے رہے، بعد ازاں انجینئرنگ یونیورسٹی میں تقرری ہوگئی۔ دین سے محبت کرنے والے احباب جانتے ہیں کہ ان کی مضطرب طبیعت صرف اللہ کے ذکر سے تسکین پاتی تھی۔ انہوں نے باضابطہ تزکیۂ نفس کیا اور برسہا برس کی ریاضت، عبادت اور ذکرِ الٰہی کی وجہ سے اپنے لئے روحانیت میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا۔[1]

---

[1] ہفت روزہ الا ... (۸) اکتوبر ۱۹۷۶ء)

سید ابو بکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں

تحریر: جناب محمد یوسف ہارون، لائل پور

غزنوی رحمۃ اللہ علیہ وصدیقی رحمۃ اللہ علیہ نمبر کا اشتہار نظروں کے سامنے ہے۔ میں اسے بار بار حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوں اور میری سوچوں کے زاویے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ دل و دماغ عجب کشمکش میں ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ ان شخصیتوں کے بارہ میں کیا لکھوں؟ جبکہ خیالات پریشان ہیں اور لفظوں کا تانا بانا بھی، ذہن بھی بلا ترتیب گردش میں ہے۔ میں ان کو ایک حسنِ ترتیب کے ساتھ صفحہ قرطاس پر بکھیرنا چاہتا ہوں تاکہ میرے جذبات کی ایسی دردناک تصویر بن سکے جسے غیر بھی دیکھ کر تڑپ کر رہ جائیں۔ مگر کیا کروں؟ دل غم سے بوجھل ہے۔ دماغ جانے والوں کی یاد میں کھو چکا ہے۔ آخر کچھ نہ کچھ تو لکھنا ہی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا ابتدا کہاں سے کروں؟

سوچتا ہوں ابو بکر کی یاد میں آنسو بہاؤں یا مولانا حافظ عبدالحق صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کی محرومی کا ماتم کروں۔ اسے بدنصیبی ہی کہیے کہ جماعت اہلحدیث اس وقت آلام کے گہرے بادلوں کی لپیٹ میں ہے۔ کتنے ہی اکابر واصاغر جماعت کو داغِ مفارقت دے گئے، جن کی یاد سے کارناموں کے دفتر وابستہ ہیں۔ کبھی وہ دن تھے کہ گلستان اہلحدیث میں ہر سو بہار تھی۔ رنگا رنگ کے پھول اپنی تمام تر خوشبو کے ساتھ اہل چمن کے دل و دماغ معطر کر رہے تھے۔ پھر خزاں کا ایک جھونکا آیا اور بہت سے گلِ سرسبد مرجھا کر رہ گئے۔ ان میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے جنہوں نے اپنی پوری زندگی اسلام کی سربلندی اور دین حق کی نشر واشاعت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ آپ کی خدمات کا دائرہ صرف مذہب تک محدود نہیں تھا بلکہ آپ سیاسی راہنما بھی تھے۔ تحریک آزادی میں آپ نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ آپ کی وفات کا صدمہ ابھی بھولا نہ تھا کہ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ ابھی یہ زخم تازہ ہی تھا کہ یکے بعد دیگرے حکیم عبداللہ جہانیاں، مولانا حافظ عبدالغفور ہنجانوالی، مولانا عبیداللہ احرار، حافظ محمد اسماعیل ذبیح، مولانا صوفی محمد عبداللہ ماموں کانجن، مولانا محی الدین سلفی اور حکیم عبداللطیف روپڑی راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔ ان جانکاہ حادثات اور مسلسل صدمات سے دل ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ ایک المناک خبر سننے میں آئی کہ خطیب اہلحدیث حضرت مولانا حافظ عبدالحق صدیقی (ساہیوال) خود مسکرا کے ایک دنیا کو رلا کر چل دیئے۔ پھر یہ خبر بھی کیا آئی کہ سید ابو بکر غزنوی لندن میں انتقال کر گئے۔ یہ خبر کیا تھی' بجلی تھی، جہاں گری قیامت برپا کر گئی۔ اب تو ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جی چاہتا تھا کہ بازار میں جا کر خوب سینہ کوبی کروں مگر یہ امر فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے

خلاف تھا، ایسا نہ کر سکا۔ جی چاہا کہ اتنا روؤں اور اتنی گریہ زاری کروں کہ قادرِ مطلق کو میری حالت پر رحم آ جائے اور دور جانے والے واپس آ جائیں، مگر یہ قانونِ قدرت کے خلاف تھا۔

بلاشبہ مولانا سیّد ابوبکر غزنوی کی موت، علم و حکمت، خلوص و محبت، عجز و انکساری، شرافت و دیانت اور فکر و نظر کی موت تھی۔ کون نہیں جانتا کہ آپ صرف عالم دین ہی نہیں تھے بلکہ جدید علوم میں بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ خداداد صلاحیتوں کی بدولت ایم اے عربی میں یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے اور گزشتہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ چنانچہ آپ اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر پھر انجینئرنگ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے سربراہ بنا دیئے گئے۔ آپ کی علمی قابلیت اور قومی و ملّی خدمات کے پیشِ نظر آپ کو بہاولپور اسلامک یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا گیا۔ جسے اہل علم نے حسنِ انتخاب کی بہترین مثال قرار دیا۔ آپ نے مختصر سے عرصہ میں یونیورسٹی میں تدریسی سطح پر جو خدمات سرانجام دیں وہ آپ کی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ آپ جامعہ اسلامیہ کو جامعہ ازہر کی طرز پر چلانا چاہتے تھے مگر زندگی نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ جم کر کام کر پاتے۔

سید صاحب جس طرح ایک کامیاب اہلِ قلم تھے۔ اسی طرح ایک فصیح البیان مقرر بھی تھے، جس مجلس میں جاتے اپنا اثر چھوڑ جاتے۔ حال ہی میں شام ہمدرد کی ایک تقریب میں جسٹس حمود الرحمٰن کی صدارت میں انہوں نے جو عالمانہ اور فاضلانہ خطاب فرمایا تو جسٹس صاحب بے ساختہ کہہ اٹھے: ''ابوبکر صاحب کے آگے میں طفلِ مکتب کی حیثیت رکھتا ہوں''۔

حق مغفرت کرے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں [1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ..... چند تاثرات

تحریر: قاری محمد ادریس عاصم لاہوری

متحدہ پنجاب میں اور تقسیم ملک کے بعد جماعت اہلحدیث میں تین خاندانوں کی دینی، تبلیغی اور تدریسی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان سے میری مراد لکھوی، روپڑی اور غزنوی خاندان سے ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ ان خاندانوں سے وابستہ اکابرین کے علاوہ دیگر علماء کرام کی خدمات کوئی کم حیثیت نہیں رکھتی ہیں۔ حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا محمد شریف گھڑیالوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے علاوہ اور بھی بہت سے علماء کرام نے کتاب وسنت کی نشر واشاعت اور فرقِ باطلہ کی تردید میں بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ، خاندانِ غزنویہ کے جد امجد تھے۔ آپ افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان پہنچے اور شیخ الکل حضرت میاں سیّد نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ سے علم حدیث حاصل کیا اور اپنے بارہ بیٹوں کو بھی حدیث کی تعلیم دلوائی۔ ان میں حضرت امام عبدالجبار غزنوی اور حضرت امام عبدالاوّل غزنوی نے قرآن وحدیث کی درس وتدریس میں بہت کام کیا۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی اور حضرت العلام مولانا حافظ عبداللہ روپڑی رحمہ اللہ جیسی نابغہ روزگار شخصیتیں امام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ حضرت الامام کے نامور فرزند بطلِ حریت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی متبحر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم سیاسی راہنما بھی تھے۔ پاکستان میں اہلحدیث کی شیرازہ بندی کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ آج کا تذکرہ انہیں کے فرزند ارجمند اور جانشین مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے لئے وقف ہے۔ پروفیسر غزنوی قدیم وجدید علوم کے سنگھم تھے۔ آپ ایک ممتاز ماہر تعلیم، کامیاب اہل قلم اور نامور خطیب تھے۔ مرحوم کے استاذِ مکرم حضرت العلام مولانا حافظ محمد گوندلوی مدظلہ العالی نے فرمایا کہ ابوبکر بہت ذہین تھا، اس کو عربی ادب پر بہت عبور تھا اور ادب میں پختہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے کافی ترقی کی۔ آپ شرافت و دیانت کا مجسمہ، زہد وتقویٰ کا پیکر اور استغنا ومودت کی تصویر تھے۔ طلبہ سے بے حد شفقت فرماتے اور ان کی دلی طور پر قدر کرتے۔ کچھ عرصہ ہوا، رمضان المبارک میں شاہ جمال کالونی لاہور کے ایک بنگلہ میں خصوصی اجتماع سے خطاب فرما رہے تھے۔ فرمانے لگے: قراء اور علماء نہایت قابلِ احترام ہیں۔ دیکھو انہیں معلوم ہے کہ پڑھنے کے بعد انہیں سو دو سو روپیہ تنخواہ ملے گی اس کے باوجود قرآن مجید کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

راقم الحروف کو ایک مرتبہ مدرسہ تقویۃ الاسلام میں رمضان المبارک کے موقعہ پر قرآن مجید سنانے کا اتفاق ہوا۔ فرمانے لگے: حافظ صاحب! قرآن مجید سنانے اور سننے کا فائدہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب سننے اور سنانے والے دونوں کی نیت خالص ہو یعنی رضائے الٰہی کی خاطر سنا اور سنایا جائے۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ ہو کہ ختم قرآن کے موقع پر میری بڑی خدمت ہوگی اور لوگ کہیں گے کہ قاری صاحب نے بہت اچھا پڑھا تو اس سے اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ اگر ہمارے ذہن میں یہ ہو کہ قاری صاحب ہمارے ملازم ہیں تو بھی درست نہیں۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم آپ کو اپنا مقتدا تصور کریں اور آپ کی عزت کریں اور آپ بھی کسی لالچ اور شہرت سے بے نیاز ہوں۔ اسی اثناء میں فرمانے لگے کہ آپ تراویح کے لئے ایک دو صاف ستھرے جوڑے مخصوص رکھیں اور خوشبو لگا کر نماز پڑھایا کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا اور اس کے حضور مناجات پیش کرنا بڑی سعادت ہے، وہ نفاست والا ہے اور نفاست پسند ہے۔

آہ سیّد غزنوی رحمہ اللہ ایسے وقت میں ہم سے جدا ہوئے جب ان کی سخت ضرورت تھی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جماعت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ [1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

آہ! سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

ایک خاندان!! ایک تاریخ!!!

تحریر: مولانا حافظ عبدالرحمٰن مدنی

آہ سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ .... جانے والے والے! تجھے روئے گا زمانہ برسوں .... اس لیے کہ سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ ایک فرد نہیں' ایک خاندان تھے، ایک تاریخ تھے۔ ان کے بزمِ حیاتِ فانی سے اچانک اٹھ جانے کا شدید احساس اس وجہ سے بھی ہے کہ قحط الرجال کا رونا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سید موصوف کا تعلق برصغیر پاک وہند کے ایک ایسے عظیم المرتبت خاندان سے تھا جس کے افراد دعوت وعزیمت کے پیکر ہونے کے ساتھ سلف صالحین کے اس امتیاز کا منہ بولتا ثبوت بھی تھے کہ فرد ومعاشرہ میں دینی انقلاب کا واحد طریقہ جذبۂ ایمانی کے ساتھ صالح عمل کا مکمل ترین نمونہ پیش کرنا ہی ہے۔ اس خاندان سے وابستہ اور دلبستہ اشخاص آج بھی اپنے فکر وعمل کا سرمایہ اور آخرت کی پونجی ان اعمال کو خیال کرتے ہیں جو انہوں نے اس خاندان کے عظیم سپوتوں کی قیادت میں سرانجام دیئے۔ اس خطۂ زمین میں اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ جنہیں بظاہر موجودہ دور کے نقطہ نظر سے چند معمولی سنتوں سے دست بردار نہ ہونے کے سبب سے جلاوطنی بلکہ ہجرت تک سامنا کرنا پڑا، اس بات کے علمبردار تھے کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی عمل کی نسبت خواہ وہ کیسا فرعی مسئلہ ہو بڑی عظیم ہے۔ اس کا عملی تحفظ ہی دین ودنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔ پھر سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے جد امجد حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ نے عقیدۂ سلف کا تحفظ کرتے ہوئے اسی راہ کو اپنایا اور لومۃ لائم سے بے نیاز ہو کر برصغیر کے معروف درسِ نظامی میں پہلی مرتبہ اشعری اور ماتریدی عقائد کی کتب کی جگہ اہل سنت کے بے باک ترجمان شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتب ''حمویہ'' وغیرہ داخل نصاب کیں اور غیر منقسم پنجاب کے دینی مرکز ''امرتسر'' میں ''مدرسہ سلفیہ غزنویہ'' کی بنیاد رکھی۔ موصوف کو دینی حلقوں میں بے پایاں علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی بدولت ''امام صاحب'' کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اس مجاہدانہ روش کے ساتھ غزنوی بزرگ اس بصیرت سے بھی مالا مال تھے کہ صحیح اقدار کا استقلال اپنے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے والد ماجد مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی نے علم وعمل کے ساتھ سیاست کی پُرخار وادی میں قدم رکھنا ضروری خیال کیا اور ''اجل عالم دین'' کی مسلّمہ حیثیت حاصل کی۔ اب سیّد مرحوم کا دور آیا تو انہوں نے اپنے پیش رووں کے جادۂ علم وعمل پر گامزن ہونے کے علاوہ چند ایک ان

دشوار راہ گزاروں پر پُل کا کام دیا۔ جو بعض انتہا پسند اور تنگ ظرف لوگوں کی وجہ سے باہم متخالف و متضاد سمجھے جاتے ہیں۔ اپنی مخصوص وسعت ظرفی کی بدولت موصوف مذہبی اور سیاسی گروہ بندی سے نہ صرف کنارہ کش رہے بلکہ اکثر اپنی بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ ان خلیجوں کو پاٹنے کے لیے جہاں ادبی میدانوں میں اپنی فاضلانہ خطابت اور زوردار تحریر سے بھرپور کام لیتے رہے وہاں علمی سطح پر قدیم اور جدید علوم دونوں کی مہارت پر زور دیا کرتے تھے اور عرصہ سے اس غرض سے ایک اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ادارہ بنانے کے خواہاں تھے۔ یہی خواہش موصوف کو اسلامی یونیورسٹی بہاولپور میں بطور وائس چانسلر لے گئی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ موصوف اس سوچ کا خود بہترین نمونہ تھے۔ وہ قدیم و جدید علوم کا وسیع مطالعہ اور عربی، فارسی، انگریزی میں مافی الضمیر ادا کرنے کی پوری طرح دسترس رکھتے تھے جبکہ اردو، پنجابی تو ان کی مادری زبانیں تھیں لیکن وہ مشہور پنجابی اردو شعراء کے ذوق آشنا بھی تھے۔ علوم و فنون کی یہی جامعیت موصوف کی ذاتی عظمت کا نشان تھی جو گویا خاندانی پس منظر میں سونے پر سہاگہ تھی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اس خاندان کی صلبی اور روحانی اولاد میں سے ایسے جانشین بنائے جو خاندانی نقوش کا تحفظ کر سکیں۔ آمین الٰہ الحق آمین۔ [1]

[1] ماہنامہ محدث، لاہور (مئی 1976ء)، ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

سید ابوبکر غزنوی

تحریر: سید محمد فاروق القادری

تلاشِ آدمی کا جذبہ میری گھٹی بلکہ خمیر میں شامل رہا ہے۔ جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے اپنے دور کے صاحبانِ علم و فضل، مشاہیر خطابت و ادب عالیہ، ماہر اساتذہ اور نامور حضرات کی خدمت میں ہر جگہ مجھے یہی جذبہ کشاں کشاں لیے پھرا ہے۔ غالباً علامہ اقبال نے اسی جذبے کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

قدم در جستجوئے آدمی زن
خدا ہم در تلاش آدمی ہست

مولانا روم کی پرواز اپنے مقام کے اعتبار سے بلند تھی، اسی لیے انھوں نے فرمایا:

آنکہ یافت نمی شود آنم آرزوست

مگر میں غلط بیانی کیوں کروں مجھے انسانوں کی اس بھیڑ میں موتی و جواہرات ایسے لوگوں کو دیکھنے، ان کی محفلوں میں بیٹھنے اور ان کی جوتیوں کے صدقے ہی علم کی کچھ شد بد نصیب ہوئی ہے۔ ورنہ ساری عمر کوئی راویتی پیر یا مولوی اللہ بخش ہی رہتا۔

سید ابوبکر غزنوی کا ذکر کرنے سے پہلے سادات کے اس نامور خانوادے کی طرف دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے۔

ایں سلسلہ از طلائے ناب است
ایں خانہ ہمہ آفتاب است

مولانا عبداللہ غزنوی، مولانا عبدالجبار غزنوی، سید داؤد غزنوی اور ابوبکر غزنوی سادات کے حسن و جمال، بے کراں علم و فضل، عزیمت و استقامت، عربی لب و لہجے اور عربی طرزِ بود و باش کے چلتے پھرتے نمونے تھے۔ یہ گھرانا شروع سے عامل بالحدیث تھا مگر انتہائی وسیع المشرب اور صوفیانہ خصوصیات کا حامل تھا۔ 1967ء کے اواخر میں مستقل طور پر لاہور آیا تو اس وقت لاہور کی علمی و ادبی فضا پر جن لوگوں کا طوطی بول رہا تھا ان میں سید ابوبکر غزنوی کا شمار صف اول میں تھا۔ پہلی دفعہ مدرسہ تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ نزد داتا صاحب حاضر ہوا تو یہ ذکر و فکر، وعظ و نصیحت، خدا یاد محافل کی تاثیر، حلاوت اور معنویت کو دیکھ کر دل سے آواز نکلی کہ جا ایں جاست۔ سید ابوبکر غزنوی اپنی موہنی صورت، دودھ کی طرح سفید مگر سرخی مائل رنگت اور عقابی نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھتے تو وہ ان کی علمی تبحر، برمحل عربی، فارسی اور اردو

اشعار کے ساتھ قرآن وحدیث اور سیرت محمدیہ کے واقعات کی پلٹ سے مسحور ہو جاتے۔ میں گاہے بگاہے مغرب اور عشاء کے درمیان ہونے والی ان محافل میں حاضری دینے لگا۔

سید صاحب اور ان کا خاندان تصوف وطریقت مثلاً بیعت وارشاد، سلوک الی اللہ میں جدوجہد ومراقبے اور کشف وسلوک کا نہ صرف قائل بلکہ عامل رہا ہے۔ میں نے بارہا ان کی زبان سے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، امام عبدالوہاب شعرانی، ابن الفارض، شیخ فرید الدین عطار، مولانا روم اور تمام اکابر صوفیہ کی تعریف اور تقریروں میں ان کے حوالہ جات سنے ہیں۔

مولانا صوفی عبدالحمید سواتی نے اپنی کتاب ''مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے علوم وافکار'' میں یہ واقعہ درج کیا ہے کہ ایک دفعہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مولانا سید داؤد غزنوی سے پوچھا کہ علامہ ابن تیمیہ نے شیخ ابن عربی کی تکفیر کی ہے آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: ''وہ دونوں بڑے لوگ ہیں ہمیں ان کی باتوں میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

سید صاحب اپنی نشست وبرخاست، ذوقِ شعروادب اور علمی تبحر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی نفاست اور علمی وادبی ورثے کے امین تھے۔ وہ انجینئرنگ یونی ورسٹی میں شعبہ علومِ اسلامیہ کے سربراہ تھے اور برسوں سے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل آپ اسلامی یونی ورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ یہ عہدہ ہر اعتبار سے آپ کے شایانِ شان تھا بلکہ اس کرسی کو سید صاحب نے اعزاز بخشا۔

راقم السطور کی حاضری کافی عرصہ موقوف رہی۔ ایک روز ملاقات کی خاطر حاضر ہوا۔ وی سی آفس میں اطلاع بھجوانے پر حسب معمول فوراً بلا لیا، دیر تک خیر وعافیت پوچھتے رہے۔ اچانک مجھے فرمانے لگے: یار تم یہاں یونی ورسٹی میں میرے پاس آجاؤ۔ میں نے عرض کیا: میں ایک آزاد پنچھی کس طرح قید میں گزارہ کروں گا۔ فرمانے لگے: خاطر جمع رکھو! تمھیں آزادی ملے گی۔ پھر فرمانے لگے: ''میں کل ایک ہفتے کے لیے لندن روانہ ہو رہا ہوں، اس وقت لاہور جانے کے لیے پابہ رکاب ہوں، تمھارے ساتھ باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا، میں ایک ہفتے تک واپس آجاؤں گا، جیسے میں آؤں گا فوراً آجانا''۔ میں اسی انتظار میں تھا کہ حادثے کی جانکاہ خبر ملی۔ پھر ایک دن اچانک یہ روح فرسا اطلاع آئی کہ آپ خالق حقیقی سے جا ملے۔ سید صاحب کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ رہ رہ کر دل سے یہ آواز نکلتی ہے ؎

پھر پلٹ کر نہ وہ کبھی آئے
جو یہ کہتے تھے ہم ابھی آئے

سید ابوبکر غزنوی کا خمیر محبت سے اٹھایا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ، حبیبِ خدا ﷺ کی لافانی محبت، صحابہ کی محبت اور اہل

بیت اطہار کی محبت میں تو وہ ڈوبے ہوئے تھے۔ حُبِ اہل بیت کے نام سے انھوں نے جو رسالہ لکھا اسے پڑھتے ہوئے روح وجد میں آجاتی ہے۔ آج کل ناصبیت کی جو وبا پھیلی ہوئی ہے علمائے اہلحدیث بالخصوص اس جید عالم کے عقیدے پر غور کریں۔ جی چاہتا ہے کہ یہ کتاب بار بار پڑھی جائے۔ اس کتاب کا ایک اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے جو امت کے چودہ سو سالہ تعامل کا خوب صورت اظہار ہے۔ فرماتے ہیں:

''ساتھیو! اپنے حریمِ دل میں جھانک کر دیکھو اگر اس میں اہل بیت کی محبت بالخصوص حسین ابن فاطمہ رضی اللہ عنہما کی محبت نہیں پاتے ہو تو تم یقین کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمھاری محبت محض فریب نفس ہے۔..... اگر تم اپنے سینوں کو حسین بن فاطمہ (رضی اللہ عنہما) بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ومحبت سے خالی پاتے ہو تو یہ بہت بڑی محرومی اور شقاوت ہے۔..... آہ! یہ کیسی للّٰہیت کی موت اور ایمان کی جان کنی ہے کہ بعض علماء عین منبر رسول پر کھڑے ہو کر اس محبوبِ بارگاہِ رسالت، اس جگر گوشۂ بتول کا ذکر حقارت آمیز لہجے میں کرتے ہیں۔ وہ گھرانا جس سے تم نے فیض حاصل کیا، وہ جن کی جوتیوں کے صدقے میں تمھیں ایمان واسلام کی معرفت حاصل ہوئی، تم کو کیا ہوا کہ تم ان ہی کی عیب چینیاں کرتے ہو پھر اس عیب چینی وخوردہ گری کے لیے تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ملتی۔ پھر تم اپنے لب ولہجے کو دیکھو، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شمر بن ذی الجوشن، یزید اور ابن زیاد نے اہل بیت کے خلاف مقدمے میں تمھیں اپنا وکیل بنا لیا ہے۔ حدیث قدسی ہے:

من عادلي وليًا فقد آذنته بالحرب.

''جو میرے کسی ولی سے عداوت رکھتا ہے۔ میں اس کے خلاف جنگ کا اعلانِ کرتا ہوں۔''

حضرت حسین کے ولی اللہ ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے؟ وہ صحابی بھی تھے، اہل بیت میں سے بھی تھے، وہ صرف صحابی ہی نہ تھے جلیل القدر علماء صحابہ میں سے تھے۔ وہ صرف اہل بیت ہی میں سے نہ تھے محبوبِ بارگاہِ رسالت تھے۔ پس حضرت حسین کی شان میں گستاخی، ان کی تنقیص، ان کے بارے میں سوء ادب سراسر موجب حرماں ہے۔''

از خدا خواہیم توفیقِ ادب
بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

(قربت کی راہیں، ص: 91، 92)[1]

---

[1] یادوں کے خواب: سید محمد فاروق القادری، (ص:32) ترتیب وتدوین: سید صبغت اللہ سہروردی

آہ! پروفیسر ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

تحریر: مولانا محمد تقی عثمانی

گزشتہ اپریل میں حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی صاحب رحمہ اللہ کے دانش ور صاحبزادے جناب پروفیسر ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ ایک ناگہانی حادثہ میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی صاحب رحمہ اللہ ان اکابر علمائے اہل حدیث میں سے تھے جن کے احسانات سے ملتِ پاکستان کی گردن ہمیشہ جھکی رہے گی۔ احقر کے والدِ ماجد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہم کے ساتھ ان کے بے تکلف اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ یہ پاکستان کے ابتدائی دور میں کتنی مہمات ان حضرات نے اکٹھے ہو کر سر کیں۔ اور اختلاف مسلک کے باوجود یہ حضرات خلوص و محبت اور باہمی احترام و رواداری کے پیکر اور مختلف مکاتب فکر کے علمبردار بن کر رہے۔

پروفیسر ابوبکر غزنوی صاحب رحمہ اللہ اپنے جلیل القدر والد کی یادگار تھے، انہوں نے قدیم و جدید دونوں قسموں کے علوم سے حصہ پایا تھا اور علمی محفلوں میں ان کا نام عقیدت سے لیا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے والدِ ماجد کی سوانح حیات ''میرے ابا جی'' کے نام سے بڑے علمی اور ادبی سلیقے کے ساتھ مرتب کی تھی، ابھی اس کتاب کو شائع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ کسے خبر تھی کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد خود ان کی سوانح مرتب کرنے کی ضرورت پیش آ جائے گی۔ انگلستان کے بین الاقوامی جشن اسلامی میں پاکستانی مندوب کی حیثیت میں وہ لندن تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں کار کے حادثے میں شدید مجروح ہوئے اور ہسپتال میں کئی روز زیرِ علاج رہنے کے باوجود جاں بر نہ ہو سکے۔

موصوف مسلکاً اہل حدیث تھے لیکن مزاج کا اعتدال و توازن اپنے والد ماجد سے ورثہ میں پایا تھا۔ خوش وضع، خوش پیکر اور خوش خلق تھے۔ احقر کو صرف ایک مرتبہ نیاز حاصل ہوا اور اس ملاقات کا نقش اب بھی دل پر قائم ہے۔ چند سالوں سے وہ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کی طرف بہ طور خاص متوجہ تھے اور احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم سے اس غرض کے لئے رجوع بھی فرمایا تھا۔ حضرت والد صاحب مدظلہم اپنے ضعف و علالت کی بنا پر عذر فرماتے رہے لیکن وہ مُصر تھے اور ابھی بات کسی حد پر نہ پہنچی تھی کہ محبوبِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اور کیا عجب کہ جو راستہ وہ طے کرنا چاہتے تھے اللہ نے اس طرح پورا کر دیا ہو، ؎

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

اسلامی معاشیات سے متعلق موصوف کی بعض تحریروں سے احقر کو ہمیشہ اختلاف رہا، لیکن بحمد اللہ ان کا احترام اور ان کی قدر ہمیشہ دل میں رہی اور آج یہ سطور انتہائی حسرت کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ علم و دانش کا یہ نوطلوع ستارہ اتنی جلدی کیسے غروب ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ادارہ البلاغ، دارالعلوم کراچی اور ان کے تمام متعلقین مرحوم کے اہل خاندان کے غم میں شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں مقام بلند عطا فرمائے، پسماندگان کو صبر جمیل بخشے اور اس علمی خانوادے کا فیض آئندہ بھی جاری رہے۔ آمین [1]

[1] ماہنامہ البلاغ، کراچی (جون 1976ء)، ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

مولانا ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے دو ملاقاتیں

تحریر: عطاء الحق قاسمی

مولانا ابوبکر غزنوی دیارِ فرنگ میں خدا کو پیارے ہو گئے۔ میں نے زندگی میں ایک بار ان سے ملاقات کی ہے اور ایک بار ان کی تقریر سنی ہے۔ ملاقات ان کے گھر پر ہوئی تھی جب والد ماجد نے سیرت النبی ﷺ کے ایک جلسے میں انہیں مدعو کرنے کے لئے مجھے ان کے پاس بھیجا تھا۔ مولانا بہت شفقت سے پیش آئے اور جاتی دفعہ انہوں نے اپنے تصنیف کردہ کچھ کتابچے دیئے کہ ان کی طرف سے والد محترم کی خدمت میں پیش کر دوں۔ مجھے اس پہلی اور آخری ملاقات میں مولانا بہت اچھے لگے۔ میں چونکہ خود علماء کے خانوادے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس لئے اپنی ''ابتدائے آفرینش'' سے اب تک بے شمار علماء کی محفلوں میں شریک ہو چکا ہوں۔ لیکن مولانا ابوبکر غزنوی مجھے ان سب سے مختلف لگے۔ ان کے گورے رنگ پر بہت کم رقبہ گھیرتی ہوئی سیاہ داڑھی بہت بھلی لگتی تھی۔ اس مختصر سی ملاقات میں ان سے جو گفتگو ہوئی وہ بھی ان کی شخصیت ہی کی طرح دل نواز تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ بسم اللہ کے گنبد میں اسیر نہیں ہیں بلکہ اسلام کو قومی اور بین الاقوامی مسائل کے پس منظر میں سمجھنے اور سمجھانے پر پوری طرح قادر ہیں۔ مجھے وہ ان علوم سے بھی باخبر لگے جن کے ذریعے جدید ذہن کو اسلام کے بارے میں مخمصے میں ڈالا جا رہا ہے اور مجھے یوں لگا جیسے اس زہر کا تریاق بھی ان کے پاس موجود ہے۔

اس مختصر سی ملاقات میں میرے ذہن پر ان کی شخصیت کا جو تاثر مرتب ہوا تھا وہ ایک انجمن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے یومِ اقبال میں کی تقریر سن کر مزید قوی ہو گیا۔ اس جلسے میں مقررین آتے تھے اور ایک ایک کر کے اقبال رحمہ اللہ کے حوالے سے اسلام کی تکرار کرتے چلے جاتے تھے۔ اگر کسی لفظ اصلاح یا نظریے کو بے معنی بنانا ہو تو اسے آج کی صورت حال سے الگ تھلگ کر کے اس کا وظیفہ شروع کر دینا کافی ہوتا ہے۔ اسلام کے ساتھ اس ملک میں گزشتہ انتیس برسوں سے یہی ہو رہا ہے اور عام جلسوں میں یہ پریکٹس قدرے عروج پر نظر آتی ہے۔ سو اس جلسے میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے کہ اتنے میں مولانا ابوبکر غزنوی کا نام سٹیج سے پکارا گیا۔ مولانا نے خطبہ مسنونہ کے بعد اقبال کے حوالے سے اسلام کے معاشی نظام پر اظہارِ خیال شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ''جماہی آلود'' چہروں پر دلچسپی کے آثار ابھرے اور پھر ''پن ڈراپ سائلنس'' میں ان کی پرجوش تقریر اپنے کلائمکس کی طرف پہنچتی گئی۔ مولانا کہہ رہے تھے کہ مزدوروں اور کسانوں کا ملجا و ماویٰ اسلام ہے۔ موجودہ جاگیرداری اور سرمایہ کاری اسلامی اصولوں سے اسی طرح متصادم ہے جس طرح

اشتراکیت ہے۔ ان کی یہ بات اگرچہ بہت چبھنے والی تھی مگر درست تھی کہ ہمارے ہاں اسلام کے نام لیواؤں نے غربت، افلاس، بیماری اور استحصالی طبقوں کے خلاف جنگ کرنے کے بجائے محض تجریدی طور پر ''اسلام اسلام'' کی دھائی دی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ان لوگوں کے ہاتھ میں آ گیا جو محض روٹی کے وعدے پر عوام سے ان کا بہت کچھ چھیننے کے عزائم رکھتے تھے۔

مولانا نے اپنی تقریر میں استعمار، سامراج اور استحصالی طبقوں کے خلاف کہے گئے۔ اقبال کے وہ تمام اشعار پورے جوش اور جذبے سے پڑھے جنہیں اسلام کے بعض نام لیوایوں چھپا چھپا کر رکھتے ہیں جیسے وہ اقبال کے ''ناجائز اشعار'' ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس جلسے میں علمائے کرام سے اپیل کی کہ وہ غریب عوام کے دکھ درد کو سمجھیں اور اس کے لئے بھرپور آواز اٹھائیں۔ یہ حسین رضی اللہ عنہ کا پرچم ہے جو یزید کے ہاتھوں میں نہیں آنا چاہیے۔

یہ توانا آواز خاموش ہو گئی ہے لیکن میری طرح لاکھوں دلوں اور دماغوں میں اس کی گونج آج بھی باقی ہے۔ یہ باتیں زبان پر لانے سے اگر کسی ایک طبقے کا اسلام خطرے میں پڑتا ہے تو پڑنے دیجئے لیکن اگر قیامت کے روز ہمیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منہ دکھانا ہے تو حضور کے کروڑوں غریب، مفلس اور فاقہ زدہ امتیوں کے زرد چہروں پر زندگی کی رونقیں بکھیرنا ہوں گی اس کے بغیر ہمیں ان کی شفاعت نصیب نہیں ہو سکتی۔

مولانا ابو بکر غزنوی جاتے جاتے ہمیں یہی پیغام دے گئے ہیں۔ [1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

عبداللہ غزنوی سے پروفیسر ابوبکر غزنوی تک

تحریر: محی الدین بن احمد دین

پروفیسر سید ابوبکر غزنوی اس غزنوی توحیدی' جہادی' تصوف کتاب و سنت کے قافلہ کے وارث تھے جنہوں نے ''غزنی'' صرف اپنے توحیدی عقائد' کتاب و سنت' جہادی تبلیغ پر اصرار کے سبب چھوڑا' کیونکہ حکمران ان سے تقلیدی عمومی معتقدات کو اپنانے کا تقاضہ کرتے تھے۔ غزنوی قافلہ علماء ہجرت کر کے امرتسر شہر میں قیام پذیر ہوا۔ یہاں بھی ان کی تبلیغ توحید' شرک و بدعت' جہاد' اسلامی تصوف' تہجد' نوافل کے حوالے سے ہوتی۔ پھر یہ لاہور میں منتقل ہوئے اور پرانے لاہور میں مسجد چینیانوالی ان کا مکتب و مدرسہ رہا۔ مولانا داؤد غزنوی کے ذاتی تعلقات مولانا ابوالکلام آزاد سے تھے' وہ جمعیت العلمائے ہند کے بانیوں سے بھی تھے مگر بعد ازاں تحریک پاکستان کے رفیق بنے۔ سید ابوبکر غزنوی انہی کے لخت جگر' عبدالماجد دریاء آبادی کی طرح الحاد' زندیقیت تک چلے گئے' ان دنوں والد سے تلخ تعلقات تھے۔ مگر والد کی وفات کے بعد ان کی کایا ہی پلٹ گئی' وہ اسلامیہ کالج لاہور میں عربی کے استاذ' ساتھ ہی پنجاب یونیورسٹی سے اورینٹل کالج میں ایم اے عربی کی کلاسیں لیتے۔ بعد ازاں انجینئرنگ یونیورسٹی کے شعبہ عربی و اسلامیات کے سربراہ رہے اور پھر ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں جامعہ بہاولپور کا وائس چانسلر مقرر کیا۔ ''سیدی وابی'' ان کی مشہور کتاب ہے۔

آخری عمر میں وہ جہاں تہجد' نوافل کی بات کرتے وہاں حسن اخلاق اور ادب کی بہت زیادہ تبلیغ کرتے۔ میں جب بھی لاہور جاتا جمعہ ان کی اقتداء میں پڑھتا۔ سفید کرتا پاجامہ' سر پر صوفیا کی طرح کی سفید ٹوپی' آواز میں گرج اور رعب اور سفید چہرے پر وقار اور تمکنت۔ علماء اور اہل دین کو نصیحت کرتے کہ عزت نفس کا بہت خیال رکھو، خود ''مالدار جاہل قائدین'' سے کافی دور رہتے۔ غزنوی خاندان کی یہ نشانی شہادت پاگئی کہ وہ ہر جمعہ کی نماز میں شہادت کی موت کی دعا کرتے' علامہ احسان الٰہی ظہیر بھی اکثر یہی دعاء کرتے' دونوں ہی شہید ہوئے۔ ظہیر بم دھماکے لاہور میں' غزنوی لنڈن میں روڈ ایکسیڈنٹ میں۔ ظہیر جنت البقیع میں اور غزنوی لاہور میں مدفون ہیں۔

سوچا کچھ تعارف بھی قارئین کی خدمت میں پیش کردوں۔ میرے تو وہ روحانی قائد' پیر و مرشد تھے حالانکہ وہ مجھے جانتے نہ تھے۔ ہاں جمعہ کی نماز کے بعد سلام و دعاء ضرور ہوتی تھی۔ مگر جب وہ شہید ہوئے تو ایسے لگا کہ میرا روحانی باپ فوت ہوگیا ہے۔ تصوف میں کچھ اہم بریلوی علماء بھی ان کے شاگرد رہے اور عربی زبان کی تعلیم میں بھی۔

تھوڑا سا مزید تعارف اگر ہو جائے امرتسر' لاہور کے غزنوی علماء کا تو کیا مضائقہ ہے؟ غزنی سے ہجرت کر کے آنے

والے بزرگ مولانا عبداللہ غزنوی تھے جو امرتسر میں قیام پذیر ہوئے۔ ان کے بیٹے مولانا عبدالجبار غزنوی تھے جو لاہور کی مسجد چینیانوالی میں بھی خطبہ جمعہ اور درس قرآن دیتے تھے[1]، ان کے بیٹے مولانا داؤد غزنوی تھے۔ ان کے ایک بھائی یعنی عبدالجبار غزنوی کے دوسرے بیٹے ابراہیم غزنوی تھے۔[2] شاہ عبدالعزیز آل سعود نے جب 1932ء میں مملکت نجد و حجاز کو مملکت سعودیہ عربیہ بنایا تو علمائے اہل حدیث پنجاب سے اپیل کی کہ وہ ریاض و حجاز میں آ کر قیام کریں اور مملکت کو کامیاب ریاست بنانے کا فریضہ سرانجام دیں۔ یہ بھی بتلایا کہ مملکت اتنی مالدار نہیں لہٰذا مالی تعاون ممکن نہ ہوگا۔ یہ دعوت سابق وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری کے دادا عبدالقادر قصوری اور ابراہیم غزنوی کو بھی دی گئی تھی، ابراہیم غزنوی تو اس ''مفلس'' سعودی عرب کی مفت میں خدمات کرنے چلے گئے ریاض میں مگر مولانا عبدالقادر قصوری (بیرسٹر علامہ اقبال کے ہمعصر اور لاہور ہائیکورٹ کے بہت کامیاب وکیل) نے معذرت لکھ بھیجی کہ وکالت سے انہیں تین ہزار روپیہ ملتا ہے ماہوار، لہٰذا ان کی مجبوری ہے کہ گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے وکالت جاری رکھیں۔ شنید ہے کہ چونکہ ابراہیم غزنوی لاہوری ہونے کے سبب انگریزی میں بھی تعلیم رکھتے تھے لہٰذا شاہ عبدالعزیز نے انہیں وزارت خارجہ میں ذمہ داریاں تفویض کیں۔

مولانا داؤد غزنوی نے حجۃ اللہ البالغہ کے توحید سے متعلق ابواب کا اردو میں ترجمہ کیا بلکہ اس کی تشریح بھی لکھی یہ کتابی صورت میں موجود ہے۔ وہ اتنے حاضر دماغ تھے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بانی، مشہور فلسفی اسکالر خلیفہ عبدالحکیم ان کے علم و فضل اور قوت گفتار کے اسیر ہمیشہ کے لئے ہو گئے تھے۔ اہل فلسفہ کے ساتھ وہ فلسفی بن جاتے، اہل سیاست کے ساتھ سیاستدان۔ ابوبکر غزنوی کھدر کا کرتہ پاجامہ بھی پہنتے۔ پینٹ کوٹ کا استعمال یونیورسٹی میں کرتے۔ قصیدہ بردہ

---

[1] چینیانوالی مسجد میں مولانا عبدالواحد غزنوی خطیب تھے۔ (مرتب)

[2] جناب محی الدین بن احمد دین اپنے اگلے کالم ''غزنوی، قصوری علماء، مفلس سعودیہ کا غزنوی سفیر'' میں وضاحت کرتے ہیں:

''گزشتہ کالم 22 مئی (عبداللہ غزنوی سے ابوبکر غزنوی تک) میں مولانا عبدالجبار غزنوی کا ذکر لکھا تھا کہ ان کے دو بیٹے تھے داؤد غزنوی اور غلطی سے دوسرے بیٹے کا نام ابراہیم غزنوی لکھ دیا۔ مجھے فیصل آباد سے محقق، مصنف، علوم اصول حدیث کے اسکالر، دو مرتبہ رکن اسلامی نظریاتی کونسل رہنے والے درویش صفت ارشاد الحق نے فون کر کے تسامح کی طرف متوجہ کیا کہ یہ ابراہیم نہیں اسمٰعیل غزنوی تھے جنہیں شاہ عبدالعزیز آل سعود نے ان کی انگریزی مہارت کے سبب یورپ کے لئے اپنا سفیر مقرر کیا تھا۔ غالباً اسمٰعیل غزنوی لاہوری پہلے غیر سعودی اور عجمی اہل حدیث عالم دین تھے جن کو وزارت خارجہ سعودیہ میں بہت اہم مقام و مرتبہ ملا۔ یہ وہ عہد ہے جب شاہ عبداللہ کی تیسری سعودی مملکت نجد و حجاز انتہائی مفلس تھی صرف علمائے اہل حدیث برصغیر میں شاہ عبدالعزیز حکومت کے مالی تعاون کی اپیلیں کرتے، لوگوں کو حج کی تلقین کرتے تاکہ مفلس سعودی حکومت کے ذرائع آمدن میں اضافہ ہو۔ امرتسر میں مقیم مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی اپنے ہفت روزہ اہل حدیث میں یہ اپیلیں شائع کرتے اور جو رقم شاہ عبدالعزیز حکومت کو بھجوائی جاتی اس کے رسیدی اعلانات شائع کرتے۔'' (روزنامہ اوصاف: 26 مئی 2023ء)

کے نعتیہ اشعار ہر خطبہ جمعہ میں درود شریف کے ساتھ ملا کر پڑھتے۔ داؤد غزنوی مینار پاکستان گراؤنڈ میں نماز عیدین پڑھاتے۔ دیوبندی، بریلوی علماء شیر و شکر رہتے۔ کیا خوب صورت زمانہ تھا، فقہی اختلاف محض علمی اختلافات ہوتے۔ سیاسی معاملات یا دینی معاملات میں علماء آپس میں مشاورت کرتے اور ایک ہی موقف اپنا لیتے۔ شیعہ و سنی دینی معاملات میں یکساں رہتے۔ (1)

---

(1) روزنامہ اوصاف (22 مئی 2023ء)

آہ! سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

تحریر: جناب مظفر حسین

بہاولپور یونیورسٹی کے جوان عمر وائس چانسلر، علوم اسلامیہ کے عالم متبحر اور صاحبِ دل صوفی سید ابوبکر غزنوی کی بے وقت وفات سے پاکستان کے دینی حلقوں میں جو خلاء پیدا ہو گیا ہے وہ مدتوں پورا نہیں ہو پائے گا۔ آپ کا شمار ملک کے ان معدودے چند علماء میں کیا جاتا تھا، جو علوم اسلامیہ پر کامل دسترس رکھنے کے علاوہ دورِ جدید کے حالات اور تقاضوں سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ عصرِ حاضر کے فتنہ ہائے علم وفن کی بیخ کنی کے لئے جس قسم کی معلومات کی فراوانی اور جس قدر وسعتِ مطالعہ کی ضرورت ہے وہ آپ کے اندر بدرجہ اتم موجود تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کا معتدل نکتۂ نظر مختلف مکاتیبِ خیال کے لوگوں میں اس حد تک مقبول تھا کہ آج، ان کی وفات کے بعد، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ مسلمانوں کے کس مکتبِ فکر کے نمائندہ تھے اور خود آپ کا اپنا کیا مسلک تھا۔ یہ وسیع مشربی بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ ان محاسن کے پیش نظر آپ سے بجا طور پر یہ امید بندھتی تھی کہ آپ بہاولپور یونیورسٹی کو صحیح معنوں میں ایک ایسی یونیورسٹی میں تبدیل کر دیں گے جو ملک میں اسلامی تعلیم کا ایک مثالی نمونہ پیش کرے گی لیکن ....

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

غفلت شعاری کے اس دور میں اصلاحِ معاشرہ کے لئے آپ نے ''تحریک احیائے دین'' کے نام سے ایک چھوٹا سا حلقۂ قصرِ درویشی بھی قائم کر رکھا تھا، جہاں ہر جمعرات کو مجالس ذکر کا بڑی باقاعدگی سے اہتمام ہوتا تھا۔ چند مجالس میں راقم کو بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی اور ان میں آپ کو سوز و گداز کے خزانے لٹاتے دیکھا۔ اسی تحریک کی طرف سے شائع کردہ چند پمفلٹ بھی نظر سے گزرے، جو اپنے اندر علم وادب کی ایک چاشنی کے ساتھ ساتھ پند وحکمت کا انمول خزانہ سمیٹے ہوئے ہیں اور یہ سبھی تحریریں سیّد مرحوم کے پاکیزہ قلم کا صدقہ جاریہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنی رحمتیں نچھاور کرے اور آپ کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون[1]

[1] دو ماہی اسلامی تعلیم، لاہور (جولائی، اگست 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم و مغفور

ایک فاضل شخصیت

تحریر: ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

26 اپریل 1976ء کی صبح کو جب اخبار دیکھا تو اس میں مع تصویر یہ خبر تھی کہ ممتاز ماہرِ تعلیم اور عالمِ دین مولانا ابوبکر غزنوی انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ کیفیت الفاظ میں ہرگز بیان نہیں ہوسکتی کہ طبیعت پر کیا اثر ہوا، کیا کیا خیال آئے۔ ایک گل دگلزار شخصیت ہم سے جدا ہوگئی۔ میری ان سے آخری ملاقات سیرت کانفرنس کے موقع پر ہوئی تھی۔ مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں کئی امور پر ظریفانہ لہجہ میں شریفانہ تجربے بھی کئے اور مختلف امور پر اظہارِ خیال کرتے رہے۔

مرحوم بے شمار خوبیوں کے مالک تھے جو عام لوگوں کے احاطہ علم میں نہیں آسکتیں۔ وہ ایک موقر غزنوی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان کی بے شمار دینی خدمات ہیں جن کا اب ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب لاہور کی مسجد چینیانوالی کے خطیب مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ کا ڈنکہ بج رہا تھا۔ ابوبکر مرحوم کے دادا چچا سید عبدالواحد غزنوی رحمہ اللہ اس مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ ان کا تقویٰ اور پرہیز گاری لاثانی تھی۔ ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا کچھ اور ہی لطف آتا تھا۔ میں نے ان پر نماز کی حالت میں جو رقت دیکھی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جب وہ الحمد شریف کے الفاظ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ پڑھتے تو واقعی پتا چلتا کہ خدا کے سوا کوئی مددگار نہیں جب وہ عشاء کی نماز میں دعائے قنوت پڑھاتے تو یوں لگتا کہ جیسے آسمان سے رب تعالیٰ کی رحمت نازل ہو رہی ہو۔ بہرحال ان کی باتیں اب بھی لوحِ دل پر محفوظ ہیں۔

اسی دور کا ذکر ہے کہ میں تحریک عدمِ تعاون کے سلسلے میں لدھیانہ میں تھا۔ وہاں ایک شام یہ 24 مارچ 1930ء کا ذکر ہے، ایک جلسہ تھا۔ جلسے کے مقررین میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولوی عبدالواحد کے بھتیجے نوجوان مولوی داؤد غزنوی تھے۔ دونوں نے وہاں انگریز کے استبداد کے خلاف بہت بلند پایہ تقریریں کیں۔ غرض غزنوی خاندان کے افراد تقویٰ وطہارت اور علم و فضل میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ مولانا داؤد غزنوی بھی چینیانوالی مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ان کے بعد میں مجھے مولانا ابوبکر غزنوی مرحوم کے پیچھے بھی نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ ایک دردمند دل رکھنے والے سچے مسلمان تھے، خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ (بشکریہ نوائے وقت)[1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (7 مئی 1976ء)، ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

مولانا ابوبکر غزنوی

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْن

تحریر: جناب عبدالقادر حسن

اس دارِ فانی میں جو آتا ہے جانے کے لئے آتا ہے رہنے کے لئے نہیں آتا۔ کیوں کہ سدا دوام صرف اللہ کو ہے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس طرح دنیا سے جاتے ہیں کہ ان کا اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف جانے کا گمان بھی نہیں ہوتا اور ایسے وقت میں جاتے ہیں جب ملک وملت کو ان کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

مولانا ابوبکر غزنوی عالم شباب ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پہلے وہ انجینئرنگ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے ڈین (سربراہ) تھے اور اب بہاولپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے تھے۔ ان کے علم وفضل اور تقوے پر ان کی جوانی کے شب وروز گواہ ہیں۔ وہ جوان تھے لیکن بڑے بڑے شب زندہ دار عابدوں کے لئے قابلِ رشک تھے۔ وہ عالم تھے لیکن ہر نوجوان عالم کو ان کی ذات پر فخر تھا۔ وہ ایک پروفیسر تھے مگر ہر پروفیسر کے لئے ایک مثالی دوست تھے۔ وہ ایک وائس چانسلر تھے لیکن اپنے معاصرین کے لئے ایک قابلِ قدر اور قابلِ فخر نمونہ تھے۔ اہل حدیث مکتب فکر میں وہ واحد عالم دین تھے جن کے یہاں ہر ہفتہ حلقہ ذکر ہوتا تھا۔ بلاشبہ ان کی زندگی بھی قابلِ رشک ہے، وہ جہاد فی سبیل للہ میں کام آئے۔ ان کا سفرِ لندن اسلام اور صرف اسلام کے لئے تھا۔ اب ان جیسی خُوبوان کے کسی ہمعصر نوجوان میں نظر نہیں آتی۔ ان کی بے وقت موت ایک ایسا صدمہ ہے جسے قلم لکھنے سے قاصر ہے۔ مرحوم کے والد مولانا سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ بہت پایہ کے بزرگ تھے اور ہر مکتبِ فکر میں عقیدت ومحبت سے پکارے جاتے تھے۔ مرحوم نے ان کی علمی اور روحانی دولت کو سنبھال رکھا تھا۔ وہ شاید غزنوی خاندان کے آخری چراغ تھے جن کی روشنی اس عالم جوانی میں اتنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے قیمتی انسان کا دنیا سے اٹھ جانا ایک قومی المیہ ہے۔ بہرحال ان کے اہلِ خانہ امانت وہمدردی کے قابل ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)[1]

---

[1] ہفت روزہ افریشیا، لاہور (7 مئی 1976ء)

حضرت سید ابوبکر غزنوی مرحوم کی یاد میں

تحریر: ابوعمر شیخ محمد نعیم بادشاہ (مرکزی سیکرٹری اطلاعات)
متحدہ جمعیت اہل حدیث پاکستان

سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم بے شمار خوبیوں کے مالک تھے جن کو احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اپنی زندگی کا ایک واقعہ جو کہ حضرت سیّد ابوبکر غزنوی کے متعلق ہے، ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

حضرت پروفیسر سیّد ابوبکر غزنوی انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں شعبہ اسلامیات کے سربراہ تھے۔ جبکہ اُن کے رفقاء میں پروفیسر حافظ محمد سعید، پروفیسر چوہدری عبدالحفیظ مرحوم، پروفیسر محمد یحییٰ مرحوم، پروفیسر میاں خان مرحوم، پروفیسر ظفر اقبال گجر شامل تھے۔ یہ وہ دور تھا کہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایک مکمل اسلامی ماحول تھا۔ حضرت سیّد ابوبکر غزنوی اور اُن کے رفقاء کی شبانہ روز محنت اور لگن سے ایک مکمل اسلامی یونیورسٹی کا ماحول پیش کر رہی تھی۔ انہی دنوں انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایک بڑی جامع مسجد تعمیر کی گئی جس کے خطیب حضرت ابوبکر غزنوی مقرر ہوئے۔ اعلان ہوا کہ حضرت سیّد ابوبکر غزنوی نے افتتاحی خطبہ جمعۃ المبارک ارشاد فرمانا ہے۔

ہمارے گھر میں جب بڑے بزرگ اکٹھے ہوتے تو اکثر حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کا ذکرِ خیر کرتے۔ ہمارے آباؤ اجداد بھی امرتسری تھے اس لیے بھی اس خانوادے سے بہت زیادہ پیار اور عقیدت تھی۔ افتتاحی خطبہ جمعۃ المبارک کے وقت میری عمر لگ بھگ 12، 13 سال تھی اور میں نے ابھی تک حضرت غزنوی کی زیارت نہیں کی تھی تو میں نے اپنے والد گرامی حضرت الحاج شیخ عبدالرحمٰن مرحوم سے پوچھا کہ جب میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لیے مسجد میں جاؤں تو مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ حضرت غزنوی کون ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ سیدھی سی بات ہے جو شخص خطبہ جمعۃ المبارک ارشاد فرمائے گا وہی سیّد ابوبکر غزنوی ہوں گے۔ میں نے والد گرامی سے کہا: اگر میں ممبر پر تشریف لانے سے پہلے دیکھنا چاہوں؟ تو انہوں نے مجھے کہا کہ جو شخص تمہیں ساری مسجد میں خوبصورت نظر آئے وہی حضرت ابوبکر غزنوی ہوں گے۔ میں تقریباً 11 بجے مسجد میں پہنچ گیا۔ تقریباً 200 کے قریب افراد مسجد میں تلاوتِ قرآن اور نوافل کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ میں نے سب کے چہروں کی طرف دیکھا اُن میں سے ایک آدمی بہت خوبصورت نظر آیا۔ میں نے اپنے دل میں یہ گمان کیا کہ یہ شخص ہی حضرت غزنوی ہوں گے۔ آہستہ آہستہ مسجد میں رش بڑھتا گیا اس دوران ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت افراد مسجد میں آتے گئے۔ ہر خوبصورت شخص کے بارے میں میرا یہی گمان ہوتا کہ یہی حضرت غزنوی ہیں۔

اس وقت تک مسجد میں کئی ہزار افراد آچکے تھے۔ اسی اثناء میں ایک روشن چہرے والے کریم شخص ممبر رسول پر آکر رونق افروز ہوئے۔ میں نے کھڑے ہو کر ایک نظر اُن کے چہرے پر ڈالی اور ایک نظر ہزاروں سامعین پہ ڈالی۔ اللہ کی قسم حضرت غزنوی مجھے سارے مجمعے میں بارعب، باوقار اور خوبصورت نظر آئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت غزنوی اسلامیہ یونیورسٹی (بہاولپور) کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اسی دوران لندن میں ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں پاکستان کی نمائندگی حضرت پروفیسر سید ابوبکر غزنوی نے کرنا تھی۔ حضرت لندن تشریف لے گئے لیکن افسوس کہ وہاں ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہوئے۔ ہسپتال میں داخل کرا دیے گئے۔ روزانہ اخبارات میں اُن کی علالت کی خبریں آتی رہیں اور میں اللہ کریم کے حضور دعائیں کرتا تھا کہ ''اے اللہ! اپنی خاص رحمت سے حضرت غزنوی کو صحت عطا فرما'' لیکن اللہ کریم کا فیصلہ آگیا اور حضرت غزنوی جامِ شہادت نوش کر کے ربّ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ شہادت کے تقریباً ایک ہفتہ بعد اُن کا جسدِ خاکی لاہور لایا گیا اور مدرسہ غزنویہ شیش محل روڈ میں آخری دیدار کے لیے رکھ دیا گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں حضرت غزنوی کو تابوت میں بند نہ دیکھوں۔ تاکہ میرے سامنے اُن کا انجینئرنگ یونیورسٹی میں خطبہ جمعۃ المبارک والا چہرہ رہے۔

غالباً دو دن کے بعد اعلان ہوا کہ آج بعد نمازِ مغرب نمازِ جنازہ چوبرجی گراؤنڈ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا معین الدین لکھوی MNA کی امامت میں ادا کی جائے گی۔ میں پروگرام کے مطابق مدرسہ غزنویہ کی طرف روانہ ہوا، جنازہ بھاٹی چوک میں پہنچ چکا تھا۔ چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھے گئے تھے۔ اُس وقت چارپائی پروفیسر حافظ محمد سعید، پروفیسر حافظ محمد ایوب، پروفیسر چوہدری عبدالحفیظ اور پروفیسر محمد یحییٰ کے کندھوں پر تھی۔ یہ حضرات زار و قطار رو رہے تھے اور جنازہ میں ہزاروں کی تعداد میں علماء کرام سمیت ہر طبقہ کے افراد شامل تھے۔ جسدِ خاکی جب چوبرجی گراؤنڈ میں پہنچا اور عوام کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تو اس موقع پر شہید ملّت حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ مائک پر تشریف لائے اور لوگوں کو تلقین کی کہ نظم و ضبط کا خیال کریں، نمازِ جنازہ کے بعد آخری دیدار کروایا جائے گا۔ پھر حضرت مولانا معین الدین لکھوی کی امامت میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ لوگوں کے شدید رش اور بدنظمی کی وجہ سے یہ اعلان کیا گیا کہ میانی صاحب قبرستان میں آخری دیدار کروایا جائے گا۔ یوں حضرت غزنوی کا جسدِ خاکی میانی صاحب قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ اسی دوران میں نے اپنا فیصلہ تبدیل کیا کہ جیسے ہی حضرت کا جسدِ خاکی دیدار کے لیے رکھا جائے گا میں اُن کے چہرے کا دیدار کروں گا۔ قبرستان پہنچنے پر حضرت کی چارپائی کو بڑے بلب کی روشنی کے نیچے رکھا گیا اور میں پہلے ہی چارپائی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ جیسے ہی چارپائی کو نیچے رکھا گیا میں نے حضرت غزنوی کے چہرے کا آخری دیدار کیا۔ اللہ کی قسم جیسے مسکراتے ہوئے میں نے اُن کو ممبر رسول پر دیکھا تھا اس سے زیادہ وہ تابوت میں مسکرا رہے تھے۔ بعدازاں اُن کو ہزاروں غلامان اور عوام کی موجودگی میں آہوں اور سسکیوں میں اُن کے عظیم والدِ گرامی حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے پہلو میں رحمتِ خداوندی کے سپرد کر دیا گیا۔

پروفیسر سید ابوبکر غزنوی

تحریر: انجینئر محمد افضل (سابق چیف انجینئر واپڈا)

عظیم محقق، ہردلعزیز معلم، ماہر تعلیم پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور میں درس و تدریس سے وابستہ تھے۔ آپ شعبہ اسلامیات کے چیئرمین تھے۔ بندہ ناچیز بھی آپ کے تلامذہ میں شامل تھا۔ آپ کی زبان انتہائی شیریں اور گفتگو تعصب سے پاک تھی۔ آپ الفاظ وفقرات ایسی خوبصورتی اور شگفتگی سے ادا کرتے کہ ہر طالب علم کے ذہن نشین ہو جاتا۔ آپ نے کلاس میں کبھی فرقہ پرستی کا اظہار نہ کیا۔ آپ کا محورِ گفتگو دینِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا۔ جب آپ گفتگو فرماتے تو ایسے محسوس ہوتا کہ زبان سے خوشبودار پھول گر رہے ہیں۔ آپ کی زبان پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین، علمِ تفسیر اور مسائلِ فقہ رہتے تھے۔ آپ انبیاء کرام کے وارث' صاحبِ درد علماء میں سے تھے۔ آپ رحمٰن کے مقبول بندے تھے۔ اپنی راتیں رب کے لیے سجدہ ریزی اور قیام میں بسر کرتے تھے۔ زندگی ذکر وفکر، معرفتِ الٰہی، مجلسِ محمدی، شوقِ توحید اور لقمۂ حلال کے گرد گھومتی تھی۔ مولانا روم نے کیا خوب فرمایا:

آنکہ او را لقمۂ شد نور جلال
ہرچہ خواہد میخورد بردے حلال

''جس کا کھانا نورِ جلال ہو وہ جو بھی کھائے اس پر حلال ہوتا ہے۔''

یہ ایک حقیقت ہے کہ عارف کے حلق سے لقمۂ حلال ہی اترتا ہے کیونکہ وہ حق کے ساتھ دائمی وصال پا چکا ہوتا ہے۔ پروفیسر صاحب کا اندازِ بیان بہت دلکش اور آسان تھا۔ آپ معرفت اور توحید کے اسرار قدرے کھول کر بیان فرماتے تھے تاکہ مجلس محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی حضوری تک رسائی ممکن ہو سکے۔ آپ کا درس اسرار معرفت سے لبریز اور بے حد گہرے معنی لیے ہوتا تھا۔ آپ عربی اور فارسی زبان کے الفاظ اس قدر خوبصورت استعمال کرتے تھے جو کئی کئی معنی دے رہے ہوتے تھے۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ذکرِ روحانیت اور تصورِ اسم اللہ ذاتِ طالب کو نورِ ایمان میں غرق کر دیتی ہے جس کی بدولت وہ ظاہری طور پر ہمیشہ شریعت پر عمل پیرا رہتا ہے اور باطن میں کامل عارف باللہ ہو جاتا ہے۔ رسول محتشم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین اشیاء تمام چیزوں سے افضل ہیں:

(۱) علم، (۲) نقر، (۳) زہد۔

آپ کو نہ طالب علم بنانے کی خواہش ہوتی تھی نہ مرید بنانے کا شوق تھا بلکہ وہ توحید میں غرق رہتے تھے۔ ابیات باہو رحمہ اللہ:

نجات مردم جان لا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ
کلید قفل چٹان لا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ

''لوگوں کی نجات کا ذریعہ لا الٰہ الا اللہ ہے اور ہر قفل کی کلید بھی لا الٰہ الا اللہ ہے۔''

پروفیسر صاحب کا اسلوبِ تحریر انتہائی دلکش اور خوبصورت تھا۔ آپ کی ان علمی اور تحریری کاوشوں سے ایک عام آدمی سے لے کر علمی اور تحقیقی کام کرنے والے طلبہ اور اساتذہ کرام تک مقدور بھر استفادہ کر سکتے تھے۔

سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم

تحریر: ملک نصر اللہ خان عزیز

سید ابوبکر غزنوی وائس چانسلر بہاولپور یونیورسٹی کا سانحۂ وفات ایسا سانحہ ہے جسے سن کر بے اختیار یہ الفاظ زبان سے نکل جاتے ہیں کہ ؏

ہائے اے موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

وہ ہر اعتبار سے ایک نہایت قیمتی متاع تھے۔ سنتے تھے کہ موت العالم موت العالَم ہے مگر اس قول کا مصداقِ صحیح اس دور میں ان کی موت ہے۔ ان کی اصل قیمت ان کا وائس چانسلر ہونا نہیں تھا بلکہ ان کی گوناگوں صفات، صلاحیتیں اور علمی، دینی، اخلاقی اور شخصی خوبیاں تھیں جن کے باعث وہ پاکستان کے مسلمانوں کے لئے ایک بیش بہا خزانہ تھے۔

ان کے والد مرحوم مولانا محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ بھی ایک طرح سے جامع کمالات تھے مگر ابوبکر غزنوی تو متعدد اوصاف میں اپنے جلیل القدر والد سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ جدید تعلیم سے پوری طرح آراستہ تھے مگر اس کی سیئات سے بالکل پاکدامن۔ قدیم اسلامی علوم سے بھی انہوں نے وافر حصہ پایا تھا مگر اس کی جمود آفریں خاصیتوں سے مبرّا انسان، اچھا انسان اور اچھا مسلمان صحیح العقیدہ، صحیح الفکر، صحیح الذہن، وسیع النظر اور تعصبات سے دامن کش ہوتا ہے۔ ابوبکر غزنوی مرحوم ایک اچھے مسلمان اور عقائد و افکار و اعمال و عواطف کے اعتبار سے ایک خوبصورت آدمی تھے۔

چوتھی پشت سے وہ مولانا عبداللہ غزنوی سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے موحدانہ اور پابندِ سنت عقائد و اعمال کی پاداش میں غزنی سے ہجرت کر کے پنجاب آ گئے تھے۔ ان کا خاندان اس طرح چار پشتوں سے کتاب و سنت کی پیروی اور تبلیغ اسلام اور اشاعتِ اسلام کا ذریعہ بن گیا تھا۔ ابوبکر غزنوی اس خانوادے میں غالباً آخری شخص تھے جو مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کی یاد دلاتے تھے۔ اپنے والد مولانا محمد داؤد غزنوی کے بعد وہ کتاب و سنت ہی کی اشاعت میں مصروف رہے اور مدرسہ تقویۃ الاسلام میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ معاش کے لئے انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے تعلق رکھا، اپنے وسیع علم اور پاکیزہ کردار سے نوجوان طالب علموں کی رہنمائی کرتے رہے۔

حکومت پنجاب نے انہیں لاہور کی انجینئرنگ یونیورسٹی سے لے کر بہاولپور یونیورسٹی کی وائس چانسلری پر فائز کر دیا تھا۔ یہ تقرر اسلام دوست حلقوں کے لئے بے حد پسندیدہ تھا۔ مگر مشیتِ الٰہی کو منظور نہ ہوا کہ محکمہ تعلیم ان کی خدمات سے زیادہ مستفید ہو۔ وہ اسلامک فیسٹیول میں شرکت کے لئے لندن گئے، ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہوئے، چند روز ہسپتال

میں رہے، موت سے کش مکش کرتے رہے اور آخر کار یہ مرنجاں مرنج شخص خاموشی سے اپنے خالق حقیقی کے پاس چلا گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی غمزدہ بیوہ اور دو کمسن یتیم بچوں کے لئے سب مسلمانوں کی طرف سے تعزیت کی جائے گی۔ مگر حقیقت میں پیغامِ تعزیت کی مستحق ملتِ اسلامیہ کا علم و فضل ہے، حسن کردار ہے، حسن سیرت ہے اور نو جوان نسل ہے جس کو وہ اپنی خدمت سے محروم کر گئے ہیں۔

وہ ایک روشن شمع تھے جس کی روشنی تو بہت جلد بجھ گئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور تعلیمی شعبے کو ان کا بہتر نعم البدل عطا فرمائے۔ ہم غزنوی خاندان کے جملہ افراد سے تعزیت کرتے ہیں۔ [1]

[1] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

(باب ششم)

آخری لمحات، وفات و جنازہ

پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

آخری سفر اور سفرِ آخرت

عینی شاہد کے تاثرات واحساسات

تحریر: ڈاکٹر شیر محمد زمان
(سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

اپریل 1976ء کے پہلے عشرے میں لندن میں ورلڈ آف اسلام فیسٹیول (جشنِ عالمِ اسلام) کا انعقاد ہونے والا تھا۔ تاریخی وثقافتی موضوعات پر اسلام کے حوالے سے لیکچر، نمائش کتب، متعلقہ عجائب گھروں میں اسلامی دور کے علمی، سائنسی، تکنیکی، عسکری آثار وباقیات کے خصوصی گوشوں کے علاوہ دیگر علمی وثقافتی تقریبات کا اہتمام اس تاریخی مہرجان کے پروگرام میں شامل تھے۔ پاکستان سے بھی مولانا کوثر نیازی وزیرِ مذہبی امور کی قیادت میں ایک وفد لندن پہنچنے والا تھا۔ میں ان ایام میں وفاقی وزارتِ تعلیم کی طرف سے سفارت خانہ پاکستان میں بطور قونصل برائے تعلیمی اُمور (ایجوکیشن کونسلر) متعین تھا۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ سفیر پاکستان کے منصب پر متمکن تھے۔ پاکستانی وفد میں پروفیسر سید ابوبکر غزنوی (وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور)، مشہور فاضل محقق اور ماہر تعلیم ڈاکٹر این اے بلوچ، ڈاکٹر مجیب الرحمٰن (جامعۃ الازہر سے عربی ادب میں پی ایچ ڈی ڈگری کے حامل؛ پروفیسر عربی، اسلامیہ کالج پشاور)، کراچی کے ممتاز وکیل کمال فاروقی (کراچی میں قائم عربیک لینگویج سوسائٹی کے موسّس اور روحِ رواں) شامل تھے۔ یہی نام اس وقت مستحضر ہیں۔ سفارتخانہ پاکستان کی طرف سے مجھے وفد کے ساتھ رابطہ کار (Liaison Officer) مقرر کیا گیا تھا۔

چار اپریل کی صبح وفد کے ارکان کی پرواز کو ہیتھرو ایئرپورٹ پر اترنا تھا۔ صرف مولانا کوثر نیازی اسی روز بعد کی پرواز سے تشریف لا رہے تھے۔ میں صبح ٹھیک وقت پر ارکانِ وفد کے استقبال اور رسمی امور میں سہولت کاری کے لیے موجود تھا۔ مجھے صرف ڈاکٹر بلوچ اور پروفیسر سید ابوبکر غزنوی سے ذاتی طور پر نیازمندی کا شرف حاصل تھا۔ دوسرے ارکان پروفیسر مجیب الرحمٰن اور جناب کمال فاروقی سے بالمشافہ ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔ میں نے غزنوی صاحب رحمہ اللہ اور بلوچ صاحب رحمہ اللہ سے درخواست کی کہ تقریب کے ایام میں وہ ذاتی طور پر مجھے میزبانی کا شرف بخشتے ہوئے غریب خانہ پر ہی قیام فرمائیں جو انہوں نے بکمال شفقت ومحبت قبول فرمائی۔ وفد کے باقی ارکان کو طے شدہ انتظامات کے

مطابق ان کی قیام گاہ پر پہنچانے کے لیے سفارت خانے کی گاڑیوں میں روانہ کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سربراہی میں حکومت پاکستان نے سانحہ مشرقی پاکستان میں برطانیہ کے کردار کے خلاف احتجاجاً برطانوی دولتِ مشترکہ (کامن ویلتھ) سے الگ ہونے کا فیصلہ کر دیا تھا اور پاکستان ہائی کمیشن اس وقت سفارت خانہ (Embassy) ہی کہلاتا تھا۔

میری رہائش گاہ لندن کے مضافات میں گرین فرڈ سے متصل پیری ویل (Perivale) نام کی ایک چھوٹی سی آبادی میں تھی۔ میرا مختصر سا مکان ایسے ہی مکانوں کے ساتھ لندن کی زیرِ زمین ریلوے کے سٹیشن (پیری ویل) سے دو چار منٹ کا پیدل راستہ تھا۔ (کئی پچھلے سٹیشنوں اور آگے گرین فورڈ تک ٹرین زمین کے اوپر ہی چلتی تھی۔) گھر کے دروازے میں داخل ہوتے ہی چھوٹی سی راہداری کے دائیں جانب ایک مختصر سی نشست گاہ تھی۔ اس سے جڑا زینہ اوپر پہلی منزل کو جاتا تھا۔ زمینی منزل (گراونڈ فلور) پر زینہ سے آگے راہداری کے اختتام کے ساتھ ہی ایک نسبتاً بڑا کمرہ تھا جسے ڈرائنگ روم، لِونگ (Living) روم، ٹی وی روم کچھ بھی کہہ لیجیے اسی کمرے سے صحن کی طرف ایک دروازہ کچن میں کھلتا تھا اور اس کے ساتھ مختصر سے صحن میں چھوٹا سا باغیچہ (بلکہ باغیچی) تھا۔ شمالی اور عقبی دیواروں سے پرے ایک چھوٹا سا جنگل نما پارک تھا۔ میں اور میری اہلیہ کشور اور چاروں بچے نُبلیٰ، رُشدیٰ، احمد حصیف اور ودیعہ اس گھر کے مکین تھے۔ پہلی منزل پر اڑھائی بیڈ روم تھے۔ طے یہ تھا کہ ماسٹر بیڈروم ہم مہمانوں کے لیے خالی کر دیں گے اور ہم مناسب ردّ و بدل (Adjustment) کر لیں گے۔ معزز مہمانوں کو لے کر میں دوپہر کے قریب گھر پہنچا۔

ہم راہداری میں ہی رکے۔ میں زینے کے سامنے کھڑا انہیں بتا رہا تھا کہ اوپر زینے کے اختتام پر داہنی طرف والا دروازہ آپ کا بیڈ روم ہے۔ غزنوی صاحب اپنی طبعی مستعدی اور بانکپن کے ساتھ سیڑھیاں پھلانگتے اوپر جا پہنچے اور دروازے کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ میں اور بلوچ صاحب نیچے کھڑے تھے اور بلوچ صاحب سرگوشی کے لہجے میں مجھے کہہ رہے تھے کہ وہ نیچے والی نشست گاہ میں الگ شب باشی کو ترجیح دیں گے۔ (بعد میں بھی بلوچ صاحب کی اس خلوت پسندی کی توثیق ہوئی کہ یہ ان کے دائمی معمولات کا حصہ ہے۔ صبح بیدار ہوتے ہی نماز سے فراغت کے ساتھ وہ اپنی خواب گاہ میں پوری چائے دانی سامنے رکھ لیتے۔ یہ وقت ان کی تحریری مصروفیت کے لیے مختص تھا۔ ساتھ ساتھ گھونٹ گھونٹ چائے بھی چلتی رہتی۔ تخلیقی کام کے لیے اس مخصوص وقت میں تنہائی اور چائے کی رفاقت کے علاوہ کسی اور ارضی یا سماوی مخلوق کی مداخلت انہیں پسند نہیں تھی)۔ غزنوی صاحب کو بھی بھنک پڑ گئی۔ ہم نے اوپر نگاہ کی۔ غزنوی صاحب کے لبوں پر ان کا وہی دلآویز تبسم تھا۔ پاٹ دار لہجے میں تحت اللفظ یہ شعر زبان پر جاری ہوا:

اجارتنا اِنّا غریبانِ ھٰھنا
وکلّ غریب للغریب نسیب

یہ شعر جاہلی دَور کے اشعر الشعراء امرؤ القیس کا ہے جو کندہ کے شاہ کا فرزند تھا۔ اس کا پسِ منظر یہ ہے کہ شاعر اپنے والد کا انتقام لینے کے لیے قیصر روم کی مدد حاصل کرنے کسی طور انقرہ پہنچا تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہاں اس نے ایک رومی شاہزادی کی قبر دیکھی جو غریب الوطنی میں انتقال کر گئی تھی اور عسیب نامی پہاڑ کے دامن میں مدفون تھی۔ اس کا حال معلوم ہونے پر اس نے یہ شعر کہے:

اجارتَنا إنّ المزار قریب
وإنی مقیمٌ ما اقام عسیب
اجارتنا إنّا غریبانِ ھٰھنا
وکلّ غریب للغریب نسیب

پڑوسن! ملاقات قریب آ پہنچی ہے۔ اب میں یہیں مقیم رہوں گا جب تک کوہ عسیب اپنی جگہ قائم ہے۔ پڑوسن! ہم دونوں یہاں غریب الوطن ہیں۔ اور ہر غریب الوطن دوسرے غریب الوطن سے قرابت رکھتا ہے۔ (1)

بلوچ صاحب بھی علی گڑھ میں مولانا عبدالعزیز میمنی کے شاگرد رہ چکے تھے۔ غزنوی صاحب کی اس برجستہ و بر موقع شعر خوانی سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ گو ان کے ارادے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور اہتمام یہی ہوا کہ بالائی خواب گاہ میں غزنوی صاحب اور زیریں نشست گاہ میں بلوچ صاحب کا ڈیرا لگے گا، یہاں ان کے لیے ایک فولڈنگ بیڈ لگا دیا گیا۔

سفارت خانہ کی طرف سے مجوزہ پروگرام کے مطابق مندوبین کو سہ پہر کے وقت قائدِ وفد مولانا کوثر نیازی سے ملاقات کرنا تھی۔ غالباً Mayfair کے ایک ہوٹل میں ان کا قیام تھا۔ ہم ٹرین سے ہی وہاں پہنچے۔ دوسرے مندوبین بھی وہیں تشریف لائے۔ نیازی صاحب کے ساتھ وزارتِ مذہبی امور کے جائنٹ سیکرٹری زاہد ملک صاحب بھی تھے۔ بعد میں سرکاری ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر راولپنڈی سے ہفت روزہ حرمت اور اسلام آباد سے انگریزی روزنامہ ''آبزرور'' شائع کر کے انہوں نے ملک گیر شہرت پائی۔ چائے کی پیالی پر باہم تعارفی گفتگو اور عالمی اسلامی میلے کے سلسلے میں ضروری مشاورت کے بعد نیازی صاحب اور ملک صاحب کے سوا وفد کے باقی سب ارکان نے پاپیادہ ہی نائٹس برج (Knights Bridge) کے قریب اس پاکستانی ریسٹورنٹ جانے کا فیصلہ کیا جہاں سفیر پاکستان میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے وفد کے اعزاز میں عشائیہ کا اہتمام کیا تھا۔ یہ درست نہیں کہ عشائیہ کونسل آف پاکستان جرنلسٹس (Council of Pakistan Journalists) کی طرف سے دیا گیا۔

(1) ماخوذ و منقول از ڈاکٹر خورشید رضوی: عربی ادب قبل از اسلام، جلد اوّل (ادارہ اسلامیات، لاہور کراچی)، 2010ء، ص 355

فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا اور موسم بھی خوش گوار۔ گو ابھی اپریل کا آغاز تھا جب لندن میں خاصی خنکی ہوتی ہے مگر اس روز چمکیلی دھوپ میں چہل قدمی بہت راحت بخش تھی۔ علماء کا یہ مختصر سا قافلہ ٹکڑیوں میں بٹا رواں دواں تھا۔ ہلکی پھلکی گپ شپ کا دور چل رہا تھا۔ غزنوی صاحب اور کمال فاروقی آگے آگے تھے۔ میں نے غزنوی صاحب کو پکار کر کہا کہ جناب کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں، کچھ پس افتادگان کی بھی خبر رکھیں۔ ایک زوردار قہقہہ لگایا اور فرمایا، بھائی! یہ اہلِ دل کا معاملہ ہے۔ (دونوں مریضِ قلب تھے)۔

منزل پر پہنچتے کچھ زیادہ وقت نہیں لگا۔ تھوڑی دیر میں نیازی صاحب بھی تشریف لے آئے۔ دولتانہ صاحب کی آمد پر سب شرکاءِ مجلس کا ان سے تعارف ہوا۔ عشائیہ کے اختتام پر انہوں نے مختصر رسمی خطاب فرمایا۔ پھر نیازی صاحب نے جوابی تقریر کی۔ اب حافظے پر کئی دہائیوں کی دھول پڑ چکی ہے مگر ان کے خطاب کی فصاحت و بلاغت اور دل نشینی کا تاثر ابھی تک تازہ ہے۔ کاش ان کی غیر معمولی علمی و ادبی صلاحیتیں سیاست کی نذر نہ ہوتیں۔

عشائیہ سے فارغ ہوئے تو سب لوگ اپنی اپنی قیام گاہوں کو روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنے دونوں ذی مرتبت مہمانوں کے ساتھ انڈر گراونڈ ٹرین کے نائٹس برِج (Knights Bridge) سٹیشن کا رخ کیا۔ سٹیشن سے پہلے ہمیں برومپٹن روڈ (Brompton Road) کو عبور کرنا تھا۔ دو طرفہ سڑک کے پہلے حصے سے گزر کر ہم درمیانی ٹریفک آئی لینڈ پر ذرا سا رُکے کہ ٹریفک دیکھ کر دوسری طرف چلیں۔ غزنوی صاحب کی طبیعت میں ایک مخصوص معصومانہ چلبلاہٹ کا عنصر تھا۔ مجھے یاد ہے 1957ء کی بات ہے میں ان ایام میں گورنمنٹ کالج میں لیکچرار تھا۔ اس دن کی آخری کلاس لے کر کالج کے لوئر مال والے گیٹ سے نکلا اور اسلامیہ کالج سول لائنز میں اپنے نہایت قریبی اور محترم دوست حافظ احمد یار صاحب سے ملنے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد پروفیسر ابوبکر غزنوی صاحب کی معیّت میں ہم تینوں کالج سے نکلے اور سڑک کی ضلع کچہری والی جانب کے فٹ پاتھ پر لوئر مال کی طرف چل دیے۔ غزنوی صاحب بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔ ہم ضلع کچہری والے راونڈ اباوٹ (Round about) تک پہنچے۔ سڑک کے پار ہمارے مقابل گورنمنٹ کالج کا گیٹ تھا۔ ہم ٹریفک نکل جانے کے انتظار میں تھے کہ موقع ملتے ہی غزنوی صاحب یکدم برق رفتاری کے ساتھ بھاگتے سڑک کی دوسری جانب جا پہنچے ہم ابھی اسی جانب تھے اور وہ سامنے گیٹ کے سامنے کھڑے فاتحانہ مگر دوستانہ خندہ استہزاء کے ساتھ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

تو واپس آتے ہیں لندن کی چکا چوند میں اس تاریک اندوہ گیں شام کی طرف۔ ہم ٹریفک آئی لینڈ پر کھڑے ہیں کہ غزنوی صاحب ایک برق آسا لپک کے ساتھ آگے نکل جاتے ہیں۔ ایک دھماکے کی سی آواز آتی ہے۔ نظریں اٹھتی ہیں، دوسری طرف غزنوی صاحب کہیں نظر نہیں آ رہے۔ ایک تیز رفتار گاڑی بائیں طرف موڑ سے آتی ذرا آگے جا کر رک جاتی ہے۔ ٹکر نے غزنوی صاحب کو ہم سے کوئی ساٹھ ستر فٹ آگے سڑک پر پھینک دیا ہے۔ ہم بھاگ کر ان کے

پاس پہنچتے ہیں۔ وہ نیم بے ہوش پڑے ہیں مگر اس مردِ درویش کی زبان سے ہائے وائے کی بجائے وقفے وقفے سے اللہ اللہ کی صدا ہی سنائی دیتی ہے۔ فوراً ہی پولیس کی گاڑی بھی پہنچ گئی انہیں قریبی ویسٹ منسٹر (Westminster) ہسپتال لے جایا گیا۔ ہم دونوں بھی پہنچ گئے۔ غزنوی صاحب ایک سٹریچر پر تھے۔ دو ڈاکٹر ان کا معائنہ کر رہے تھے۔ دونوں ٹانگیں (رانیں) ٹوٹ گئی تھیں۔ ایک ڈاکٹر دوسرے سے کہہ رہا تھا: He has an enlarged heart too (ان کا دل بھی بڑھا ہوا ہے۔) ضروری کارروائی کے بعد انہیں آپریشن تھیٹر لے جایا گیا اور ہمیں جانے کے لیے کہہ دیا گیا۔ یہ چار اور پانچ اپریل کی درمیانی رات تھی۔

اگلے دن ہسپتال گیا وہ ہسپتال کے کنگ جارج وارڈ میں اپنے بیڈ پر لیٹے تھے۔ دونوں ٹانگیں طبّی پلستر میں جکڑی ہوئی تھیں نقاہت تو تھی ہی، مگر خندہ روئی سے میرے سلام کا جواب دیا اور سکون سے حال احوال بتاتے رہے۔ میں ہر روز خیر و عافیت دریافت کرنے اور کیفیت معلوم کرنے غزنوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ بیسویں گریڈ کے لیے مقابلہ کے ضمنی امتحان (Lateral Entry) کا نتیجہ آنے پر میری ترقی بطور جائنٹ سیکرٹری اور اسلام آباد تبادلے کے احکام آ چکے تھے اور اپریل کے چوتھے ہفتے میں اہل و عیال سمیت میری واپسی طے تھی۔ تاہم لندن سے روانگی تک یہی معمول رہا۔

فیسٹیول کی ہفتہ بھر کی تقریبات کے دوران میں شام کو حاضری دیتا تو ان کا حال احوال پوچھنے کے ساتھ فیسٹیول کی گزشتہ روز کی سرگرمیوں کا تذکرہ بھی ہوتا۔ ایسی ہی ایک حاضری کی یاد میرے ذہن میں ہمیشہ نقش رہے گی اور میرے ایمان کو نئی تازگی اور حرارت بخشتی رہے گی۔ میں حاضر ہوا، حسبِ معمول سلام دعا ہوئی۔ اس روز طبیعت خاصی بہتر نظر آئی۔ میں نے عرض کیا کہ گزشتہ شام ایک جگہ ہمارے وفد کے اعزاز میں عشائیہ پر سب جمع تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علوِ مرتبت کا ذکر چھڑ گیا۔ کمال فاروقی صاحب نے سوال اٹھا دیا کہ اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کی فضیلت مسلّم مگر میں یہ باور نہیں کر سکتا کہ عرب کا ایک جاہل بدّو (اعرابی) جسے ایک بار حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہو گیا، وہ غزالی رحمہ اللہ جیسے علماء و حکماءِ اسلام سے افضل بلکہ ان کا ہم پلّہ بھی ہو سکتا ہے۔ میری زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہی غزنوی صاحب پر عجب کیفیت طاری ہو گئی۔ پیشانی عرق سے تر ہو گئی۔ ایسے موقع پر عرق آلود کی ترکیب کو میں سوءِ ادب سمجھتا ہوں۔ یہ عرقِ مطہر ایسی ہستیوں کی پیشانیوں کو آلودہ نہیں آراستہ کرتا ہے۔

پورے چہرے پر پسینے کے قطرے دمکنے لگے۔ اس وقت گویا وہ مجھ سے مخاطب نہیں تھے۔ خود کلامی کی سی کیفیت میں منہ سے یہ الفاظ نکلے جن کا ایک ایک حرف مجھے زندگی بھر اسی طرح ازبر رہے گا۔ فرمایا: ''اس بیچارے کو کیا پتا کہ جن کی آنکھیں ان کی آنکھوں سے چار ہوئیں وہ کیا سے کیا ہو گئے۔'' ربِ کریم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عاشقِ صادق پر سدا اپنی رحمت کی بارش فرماتا رہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے مقام کا ادراک ہم ایسے بندگانِ دنیا کے فہم و شعور

سے ماورا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حاضری کا یہ سلسلہ لندن سے روانہ ہونے تک جاری رہا اور حاضری کی یہ ساعتیں میرے لیے سدا سرمایہ افتخار رہیں گی۔ میں نے اس حادثہ فاجعہ سے مولانا کوثر نیازی اور میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ سمیت سفارت خانہ کے ذمہ داران کو باخبر رکھا، مگر افسوس صد افسوس کہ کسی کو عیادت کی توفیق ارزانی نہ ہوئی۔

24 اپریل 1976ء کو غزنوی صاحب کے وصال الی الحق اور 29 اپریل کو ان کے جسدِ خاکی کی میانی صاحب کے تاریخی قبرستان میں تدفین کا حال سب کو معلوم ہے اور اس کا تکرار لا طائل۔ ان کے مریدین و معتقدین کے ساتھ مجھ ایسے نیازمندوں کے سینے ان کی یاد سے آباد رہیں گے۔

وسعتِ علم و فضل، اخلاقِ عالیہ، حبِ الٰہی اور عشقِ حبیب ﷺ تو ان کی ذات کے گویا اجزاء ترکیبی تھے مگر ان سطور کے اختتام سے پہلے میں ان کی شخصیت کے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا جو نسبتاً کم معروف ہیں۔ عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی ادب سے گہرا شغف بیک وقت بہت کم لوگوں میں جمع ہوتا ہے۔ اُردو ادب کے بلند پایہ ذوق اور وسیع احاطہ کے لحاظ سے عربی کے اساتذہ کا تو خیر کیا ذکر، خود اساتذہ اُردو میں بھی کم کم ہی ملیں گے۔ مجھے یاد ہے، اسلامیہ کالج سول لائینز میں جانا ہوتا تو ان کے سٹاف روم میں ڈاکٹر وحید قریشی جیسے اساطین زبان و ادب اُردو و فارسی کے ساتھ ان کی دلچسپ علمی و ادبی نوک جھونک سے سب محظوظ ہوتے۔ ایک دفعہ اپنے مخصوص ڈھنگ انداز میں اساتذہ اُردو کو دعوتِ مبارزت دیتے ہوئے فرمایا: میں نے (پنڈت رتن ناتھ) سرشار کا فسانہ آزاد اوّل تا آخر پڑھا ہے آپ میں کوئی ہے جس نے یہ ہفت خواں عبور کیا ہو؟ اور واقعی اُردو کلاسیکی ادب کے اس ضخیم شاہکار کی مکمل شناوری کا دعویٰ شاید ہی کوئی کر سکے۔

اسی دور میں بی اے (اسلامیات آپشنل) کے نصاب میں مجوّزہ چند قرآنی سورتوں (بشمول سورۃ الفتح اور سورۃ محمد) کی تفسیر حافظ احمد یار صاحب کی شراکت کے ساتھ تالیف فرمائی۔ حافظ صاحب خود مزے لے لے کر بتایا کرتے کہ میں کچھ آیات کے ترجمہ و مطالب کا مسودہ تیار کر کے ان کے پاس لے جاتا اور ان کی مشاورت و اصلاح کے بعد اسے آخری شکل دی جاتی۔ پہلی قسط لے کر گیا تو اسے شروع سے آخر تک پڑھا۔ پھر مخصوص تبسم کے ساتھ فرمایا: حافظ صاحب! یہ جہاں جہاں آپ نے اگرچہ، چونکہ، چنانچہ، کیونکہ وغیرہ لکھا ہے، سب کاٹ دیجیے۔ حافظ صاحب کہتے ہیں: میں نے تعمیل کی۔ فرمایا! اب پھر پڑھیں، معنی، مطلب، اظہار، تفہیم میں کوئی فرق پڑا؟ حافظ صاحب اعتراف کرتے تھے کہ واقعی میں نے محسوس کیا کہ فہم مطالب میں کسی نقص یا خامی کے بغیر عبارت زیادہ رواں ہوگئی ہے۔ یہ حکایت صرف ان کے لطیف ادبی ذوق کی مثال کے طور پر پیش کی ہے۔

پاکیزہ مزاح وظرافت اور بذلہ سنجی بھی انہیں گویا فطری طور پر ودیعت کی گئی تھی۔ میرے ایک نہایت عالم وفاضل دوست جن کی ثقاہت پر مجھے کامل اعتماد ہے، راوی ہیں کہ ابوبکر غزنوی صاحب کا جنازہ یونیورسٹی گراونڈ سے قبرستان میانی صاحب کی طرف لے جایا جارہا تھا۔ ایک دوراہے پر کسی بزرگ نے اشارہ کیا کہ اس طرف سے چلیں، مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کا جنازہ بھی اسی طرف سے لے جایا گیا تھا۔ جم غفیر میں پیچھے سے ایک توانا آواز بلند ہوئی تقلید اسی کو کہتے ہیں۔ یہ آواز یکے از اکابر جماعت اہلِ حدیث علامہ ذوالفخامہ مولانا محمد اسحٰق بھٹی کی تھی۔ جن کی ذات میں غزارت علمی کے ساتھ لطیف طنز ومزاح کا اجتماع تھا اور اس موقع پر ان کی یہ سخن رانی گویا غزنوی صاحب کا روحانی تصرف تھا۔ رب رؤف ورحیم اپنے ہاں دونوں بزرگوں کے مراتب بلند و بالا فرمائے۔ آمین [1]

---

[1] ماہنامہ علم وآگہی، فیصل آباد (دسمبر 2021ء)

آہ! مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

تحریر: مولانا صہیب حسن (نیروبی، کینیا)

کل سہ پہر پی آئی اے کے دفتر میں پاکستان کے اردو اخبارات کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ 28 اپریل کے اخبار میں یہ روح فرسا خبر نظر سے گزری: ''مولانا ابوبکر غزنوی کی میت ہوائی جہاز سے پاکستان لائی جا رہی ہے۔''

زمین پیروں تلے کھسکتی نظر آئی، دل دھک سے کر کے رہ گیا، چند لحظوں تک مجھے اپنے گردوپیش کا احساس نہ رہا۔ یا الٰہی یہ کیا ہو گیا، ابھی چند دن قبل تو میں انہیں لندن میں جیتے جاگتے دیکھ کر آیا ہوں۔ اُن سے میری یہ پہلی اور آخری ملاقات رہی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

اس مختصر سی ملاقات کی روئداد قلم بند کرتا ہوں۔

اپریل 1976ء کے اوائل میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں دارالافتاء (سعودی عرب) کی جانب سے میں نیروبی سے لندن کے لیے عازم سفر ہوا۔ کانفرنس میں کیا کچھ دیکھا، اس کے لیے الگ سے ایک دفتر درکار ہے۔ ایک شام ایک دوست سے لندن کا اخبار جنگ ہاتھ آیا۔ دیارِ فرنگ میں اردو اخبار کا ہاتھ آ جانا ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ لندن ہلٹن کے پُرسکون کمرہ میں اخبار کی ورق گردانی کرتے ہوئے یکا یک ایسا محسوس ہوا کہ ہوٹل کے در و دیوار لرز اٹھے ہیں۔ میرے سامنے جنگ اخبار کی یہ خبر تھی جس کا تراشہ جوں کا توں پیش کرتا ہوں۔

''اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر ابوبکر غزنوی حادثہ میں زخمی ہو گئے۔

لندن (نمائندہ جنگ) اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر پروفیسر ابوبکر غزنوی جو پاکستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے ورلڈ آف اسلام فیسٹیول میں شرکت کرنے لندن آئے ہوئے ہیں۔ کل (اتوار) رات نائٹس برج ٹیوب اسٹیشن کے قریب سڑک پار کرتے ہوئے زخمی ہو گئے اور ان کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور جگہ جگہ چوٹیں آئیں۔ یہ حادثہ تب پیش آیا جب کل شب پروفیسر ابوبکر اس عشائیہ میں شرکت کرنے کے بعد جو کہ کونسل آف پاکستان جرنلٹس کی طرف سے مولانا کوثر نیازی کے اعزاز میں دیا گیا تھا، ریسٹورنٹ سے نکل کر سڑک پار کر رہے تھے۔ پروفیسر صاحب کو فوری طور پر سینٹ جیمز ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے اور وہ سینٹ جارجز وارڈ میں ہیں جہاں ان کی حالت خطرہ سے باہر بتائی جاتی ہے۔''

گو میں مولانا غزنوی سے ذاتی طور پر متعارف نہ تھا لیکن مسلک کی یگانگت کی بنا پر جب کبھی اُن کی کوئی تحریر

سامنے آئی بڑے شوق سے پڑھی۔ اپنے والد مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے حالات انہوں نے جس خوبصورتی سے بیان کئے ہیں، میرے لیے اُن کی ذات میں مزید دلچسپی کا باعث ہوئے۔ مجھے یہ کتاب اتنی پسند آئی کہ میں اسے اپنے دوست مولانا ابراہیم خلیل سے زبردستی اٹھا لے گیا۔ پڑھنے کے بعد کئی دوستوں کو مطالعہ کے لیے دے دی جنہوں نے اس تحریر کو دیکھنے کے بعد مولانا داؤد غزنوی مرحوم سے عقیدت کا اظہار کیا۔

اخبار جنگ میں جس ہسپتال کا ذکر ہے وہاں فون کیا معلوم ہوا کہ ہسپتال کا نام غلط درج ہو گیا ہے۔ چنانچہ پھر مولانا کوثر نیازی سے فون پر رابطے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے ہوٹل میں نہ تھے۔ اگلے دن شوقِ تجسس مجھے انگریز مسلمان کے مرکز واقعہ پیڈنگٹن لے گیا۔ اس وقت مرکز کے مختصر سے کمرے میں تیس پینتیس مسلمان موجود تھے اور چند حلقے بنا کر محو گفتگو تھے۔ ہمارے یہ بھائی مراکشی طرز کا عربی لباس پہنتے ہیں۔ گلے میں ایک موٹی سی تسبیح حمائل رہتی ہے۔ بلند آواز سے ذکر کے قائل ہیں۔ کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا، لباس اور طرزِ معاشرت صحیح مسلمانوں کی مانند ہے۔ میلان صوفیہ کی طرف ہے اور طریقہ شاذلیہ کا اتباع کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں مولانا کوثر نیازی اپنے رفقاء کے ساتھ تشریف لائے، اُن کے رفیق سے معلوم ہوا کہ مولانا غزنوی ویسٹ منسٹر ہسپتال کے کنگ جارج وارڈ میں داخل ہیں اور اُن کی حالت خطرہ سے باہر ہے۔

اگلا مرحلہ ہسپتال تک پہنچنے کا تھا۔ ایک دوست برادرم امانت اللہ کو جو کہ فی الحال دارالافتاء کی طرف سے نائیجیریا میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں، ساتھ آنے پر آمادہ کیا اور لندن کی رہنما کتاب (A to Z) لے کر مختلف راستے ناپتے ہوئے ویسٹ منسٹر ہسپتال پہنچے۔ کنگ جارج وارڈ کی راہداری طے کرتے ہوئے آخری کمرے میں داخل ہوئے جہاں متجسس نگاہیں فوراً ہی مولانا غزنوی کی نگاہوں سے جا ٹکرائیں۔ انہوں نے لیٹے لیٹے مصافحہ کے لیے ہاتھ پھیلائے، اُن کی حالت دیکھ کر دھچکا لگا۔ دونوں ٹانگیں پلاسٹر میں جکڑی ہوئیں بستر کے قریب ایک سٹینڈ کا سہارا لیے ہوئے تھے۔ چہرے پر معمولی خراشوں کے آثار نظر آ رہے ہیں۔

میں نے اپنا تعارف کرایا۔ والدگرامی مولانا عبدالغفار حسن (مدرس جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) کے تذکرہ سے انہوں نے پہچانا۔ ممباسا (کینیا) میں مقیم ہمارے دوست ابراہیم خلیل صاحب کا ذکر آیا تو مولانا نے اُنہیں بہت بہت سلام کہا۔

مولانا کے سرہانے چھوٹی سی الماری میں سے ایک کاغذ جھانکتا نظر آیا جس پر پنج وقتہ نمازوں کی فہرست تھی اور ہر نماز کے ذکر کے بعد اثبات یا نفی کے نشانات تھے۔ اللہ اللہ یہ نحیف و نزار، جان لیوا حادثے کا شکار نمازوں کی ادائیگی پر کتنا بے تاب ہے۔ میں نے پوچھا: میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔ کہنے لگے: صرف دُعا، میرے لیے ایسے دعا کرو کہ خیریت کے ساتھ گھر پہنچ جاؤں۔ پھر مزید کہا کہ کانفرنس کے شرکاء سے بھی میرے لیے دُعا کراؤ۔

کیا معلوم تھا کہ مولانا لقاء الٰہی کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ اُن کا لندن آنا پیامِ الٰہی کو لبیک کہنے کے لیے تھا۔

اللّٰھم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه

میں اُن کے پاس بیٹھتا اور دیر تک بیٹھا رہتا، لیکن غالباً سفارتخانہ پاکستان کے ایک صاحب تشریف لے آئے جنہوں نے داڑھی کا خط بنانے کے لیے آمادگی ظاہر کی، چنانچہ مولانا نے رخصتی کے لیے ہاتھ بڑھائے اور میں بوجھل دل کے ساتھ واپس ہوا۔ طبیعت بڑی افسردہ تھی کہ لندن جیسے مصروف شہر میں کتنے احباب ہوں گے جو اس حادثہ کا علم رکھتے ہوں گے اور پھر مولانا کی عیادت اور دُسراہٹ کے لیے یہاں آنے کی ہمت کر پائیں گے۔

اگلے دن برمنگھم جانا ہوا جہاں جناب فضل کریم عاصم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ موصوف نے کچھ عرصہ ہوا جمعیت اہل حدیث کی تنظیم کا آغاز کیا ہے۔ انہیں اس حادثہ کی اطلاع ہو چکی تھی اور وہ ایک وفد کی صورت میں مولانا کے پاس جانے کا عزم رکھتے تھے۔

میں 18 اپریل کی شام کو مولانا سے دوبارہ ملاقات کی تمنا رکھتے ہوئے نیروبی کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ 28 اپریل کا اخبار میری حسرتوں میں اضافہ کر رہا تھا۔

یا الٰہی! عالم اسلام کے اس فرزند جلیل کی مغفرت کر دے اور اس تھکے ماندے مسافر کے لیے اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دے۔ آمین ثم آمین۔ [1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (28 مئی 1976ء)

پروفیسر مولانا ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

لندن میں آخری لمحات

تحریر: حکیم محمد سعید دہلوی

4 اپریل کی شب لندن میں ایک شب تاریک تھی کہ ہمارے پاکستان کا ایک چاند گرہن میں آ گیا۔ ایک تیز رفتار موٹر کار نے میرے عظیم دوست کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ان کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور وہ بُری طرح زخمی ہو گئے۔ 5 اپریل کی صبح جب میں نے حال احوال معلوم کرنے کے لئے ڈاکٹر ایس ایم زمان (ہمارے ایجوکیشن قونصلر) کو ٹیلی فون کیا تو انہوں نے اس حادثہ شدید کی اطلاع دی کہ وہ خود بھی غزنوی صاحب کے ساتھ تھے اور بال بال بچے تھے۔ میں سر سے پیر تک سُن ہو گیا۔ ویسٹ منسٹر ہسپتال (کنگ جارج وارڈ) پہنچا تو میرے دوست ست پڑے تھے اور بے حال زبان پر اللہ اکبر اللہ اکبر جاری تھا۔

میں نے سر پر ہاتھ رکھا اور ان پر جھکا تو انہوں نے دونوں آنکھیں کھول دیں۔ آہا حکیم صاحب! وہ ہمیشہ کی طرح مسکرائے اور معانقہ کے لئے جیسے برقرار۔ ان کی شدتِ تکلیف کا میں ہی بخوبی احساس کر سکتا تھا۔ میری بے چینی اور بے قراری کو انہوں نے محسوس کر لیا اور بیک وقت ہم دونوں دوستوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

ہرچند کہ جشن عالمِ اسلام اور اس دوران اسلامک کاؤنسل فار یورپ کے زیر اہتمام ایک عظیم اور مثبت اور پُرمقصد کانفرنس کی مصروفیات شدید تھیں مگر مولانا غزنوی کی خدمت میں حاضری میرا معمول رہی اور میں جب ان سے ملتا ان کو پہلے سے زیادہ مطمئن پاتا اور میں اپنی جگہ پہلے سے زیادہ غیر مطمئن۔ ان کو ایک بے اطمینانی عدم طہارت کی تھی۔ تیمم کے لئے میں نے ان کو سامان پہنچا دیا تھا۔ شدت کرب والم میں بھی انہوں نے نماز ترک نہیں کی، تکبیر اور درود وسلام ان کا مشغلہ اور معمول تھا۔

ان کا چوڑا چکلا ورزشی سینہ اس کا گواہ تھا کہ اس میں ایک ایسا بڑا دل ہے کہ جو نورِ الٰہی سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے ان کے اس وسیع وفراخ قلب میں جب بھی جھانکا اللہ کا نور ہی وہاں پایا، ریا کا نام نہ نشان۔ اس میں ایک اللہ کا خوف تھا اور اس ایک خوف نے ان کو ہر خوف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں نے ایک اول صبح ملاقات میں ان کے دل پر ہاتھ رکھا، مسکرائے۔ ان کی ہر مسکراہٹ پر ہزار غنچوں کی مسکراہٹ قربان! فرمایا: حکیم صاحب! زخم تو ٹانگوں میں آیا ہے اس

دل کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے محفوظ رکھا ہے۔

ان کی ٹانگوں کا اپریشن ہو چکا تھا (4 اپریل) مجھے سب سے بڑا ڈر یہ تھا کہ حادثے کی شدت و کسر کہیں سرجن کو ٹانگیں کاٹ دینے کے فیصلے پر نہ پہنچا دے مگر سرجن نے بتایا کہ ہڈیاں جڑ جانے کے امکانات ہیں۔ آپریشن کے بعد ان کی دونوں ٹانگیں ڈوریوں سے بندھی وزن میں جھول رہی تھیں۔

میں نے کہا: مولانا! پاکستان میں لوگ آپ کی صدائے حق اور کلمۂ صادق پر آپ کے پیروں میں بیڑیاں ڈالنے کی جرأت نہ کر سکے۔ مگر دیکھئے مقدر میں ایسا ہی لکھا تھا!

ڈاکٹر رانی میری عزیزہ ہیں اور لندن میں ہیں۔ بنک کامرس اینڈ کریڈٹ کے ولایت عابدی اب لندن آ بسے ہیں۔ نقوی صاحب میرے میزبان، ان تینوں کو میں نے دیکھ بھال کے لئے کہا اور انہوں نے قبول کر لیا۔ انہوں نے دیکھ بھال شروع بھی کر دی۔ اس سے مجھے اور خود پروفیسر صاحب کو اطمینان ہو گیا۔ ڈاکٹر ایس ایم زمان بلند پایہ انسان ہیں اور ایک اسکالر کی حیثیت سے پاکستان کے اس عظیم ممتاز عالمِ دین اور پُرجوش مقرر اور اس پاک دل انسان کی دیکھ بھال ان سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر وہ تبادلے پر تھے اور 29 اپریل 1976ء کو لندن سے ان کی روانگی تھی۔ ان کی عدم موجودگی میں میری طرف سے یہ انتظامات ناگزیر تھے۔ حکومت کے انداز اور دوستوں کی محبت میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے۔

پروفیسر ابوبکر غزنوی کی یہ بڑی بجا خواہش تھی کہ ان کو پرائیویٹ وارڈ میں منتقل کر دیا جائے۔ ہر چند کہ وہاں مخصوص حالات کے تحت عدم توجہ کا خطرہ تھا تاہم ان کے عبادات کے معمولات کی تکمیل کے لئے یہ ضروری تھا بالخصوص جبکہ یہ طے پا گیا کہ ان کی اہلیہ محترمہ ان کی دیکھ بھال کے لئے جلد لندن پہنچ جائیں گی۔ محترمی ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب نے بکمال دلچسپی اعلیٰ سطح پر انتظامات کرا دیئے۔

میں پروفیسر صاحب سے ملتا رہا اور توقع اب یہ قائم ہوئی کہ شاید 6، 7 ہفتوں میں وہ اٹھا دیئے جائیں گے اور ہسپتال میں رہنے کے بجائے ان کو فزیوتھراپی وغیرہ کے لئے ہسپتال آنا ہو گا۔ ایسے حالات میں ان کے قیام کا انتظام ضروری تھا اور الحمد للہ میں نے لندن میں اپنی قیام گاہ میں ان کے لئے تمام ضروری انتظامات کر دیئے اور مولانا سے کہا: آپ دنیا کے ہر مسئلے کو اپنے ذہن سے نکال دیجئے، ہر فکر سے خود آزاد کر لیجئے۔ مجھے تو آپ یہ بتایئے کہ کاغذ و قلم کتنے فراہم کروں اور مطالعہ کے لئے کون کون سی کتابیں پیش کروں۔ اب تین مہینے کی مہلت ہے، شامِ ہمدرد کے لئے کئی انقلابی تقریریں تیار ہو سکتی ہیں۔ پاکستان کے نوجوان اسلام کی رہنمائی قبول کرنے کو تیار ہیں، اب اس مہلت میں یہ تیاری شروع کر دیجئے۔

ان کے چہرے پر میں نے ایک نور دیکھا، وہ پاکستان میں اسلام کی سربلندی کے لئے ہمیشہ کی طرح آج بھی بے

چین ہوئے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ، ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی زبان سے بارہا ادا ہوا۔ انہوں نے دونوں آنکھیں بند کر لیں، جیسے وہ تھک گئے ہوں مگر ذرا دیر بعد جب مجھے دیکھنے کے لئے آنکھیں کھلیں تو ان میں وہی آنسو تھے کہ جو آج پاکستان کے ہزارہا ان محبانِ وطن کی آنکھوں سے شب و روز رواں ہیں کہ جن کے قلوب حالاتِ وطن پر بے چین ہیں۔

بالآخر 15 اپریل آ گئی۔ دوسرے دن میری پاکستان روانگی تھی۔ میں دن کے کوئی دو بجے ہسپتال گیا۔ مولانا سو رہے تھے۔ میں ان کے قریب بیٹھ گیا اور ایک گھنٹے تک بیٹھا مسلسل ان کو دیکھتا رہا۔ انہوں نے جب آنکھیں کھولیں تو ان میں نقاہت میں نے دیکھی، خون کی کمی بھی محسوس ہوئی۔ میں اشارۃً بتاتا رہا کہ میری واپسی 16، 17 اپریل کو ہو گی۔ آج میں ان کے پاس خلافِ معمول زیادہ بیٹھا۔ پانچ بجے میں نے اجازت چاہی وہ سمجھ گئے اور خود ہی فرمایا: کیا آپ کل پاکستان جا رہے ہیں۔ میں بڑے تامل سے کہا: ہاں! میں نے اضافہ کیا، 25 جون 1976ء کو ان شاء اللہ میں اپنے مریضوں کو دیکھنے پھر آؤں گا مگر اس وقت آپ بالکل تندرست ہوں گے۔ اچھا! مولانا اس پرانی اسکیم پر جولائی میں عمل کیوں نہ ہو جائے کہ امریکی جامعات میں آپ کے لیکچرز ہوں۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔ یہ ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ مغربی اور امریکی جامعات میں اسلام پر لیکچرز دیں اور میں نے انتظامات کرانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ فرمانے لگے: میں اب تیاریاں کرتا ہوں۔ طے پایا کہ جولائی میں وہ اور میں ساتھ امریکہ جائیں گے۔ اس عنوان پر دوبارہ ملاقات کے لئے ان سے جدائی ہوئی اور ذہن و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ان سے میری آخری ملاقات ہو گی۔

27 اپریل 1976ء کو پاکستانی اخبارات کے مطابق علم و حکمت کے شیدائی، عالم باعمل، پاکستان کو حقیقی معنی میں قلعۂ اسلام بنانے کے آرزومند، طلبہ کو شب و روز قرآن و سنت کی روشنی سے منور کرنے والے شفیق استاذ و پروفیسر ابوبکر غزنوی ہفتہ 24 اپریل 1976ء کو ہم سے رخصت ہوئے اور خالقِ دو جہاں اور مالکِ حقیقی کی خدمت میں انہوں نے خود کو پیش کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

لاریب! پروفیسر غزنوی کی یہ موت ان کی تنہا اپنی موت نہیں ہے۔ یہ علم و حکمت، خلوص و انس، عجز و انکسار، شرافت اور انسانیت، حلم و بردباری، بلندی اخلاق، رفعتِ کردار کے گہن میں آ جانے کے مترادف ہے۔ قیامت یہ ہے کہ پاکستان کا نظامِ تعلیم ایسے عظیم انسانوں کو جنم دینے کا ضامن نہیں ہے۔ خلا کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ بھرتا نہیں۔

میرے دوست! میں اعتراف کرتا ہوں اور بڑی ندامت اور شرمساری کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ اب میں اپنی دل کی گہرائیوں میں جا کر دیکھتا ہوں و اس دلِ ناداں میں تمہارے لئے وہ تڑپ نہیں ملی۔ تمہارے لئے وہ لامحدود محبت نہیں ملی کہ جس کا تقاضا مجھ سے تمہاری برتر شخصیت کرتی تھی۔ اگر اس میں کھوٹ نہ ہوتا تو میں تم کو ویسٹ منسٹر ہسپتال میں تنہا چھوڑ کر پاکستان کیوں چلا آتا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم کو میرے دل کا حال معلوم ہو اور تم مجھ سے روٹھ کر چلے گئے ہو۔

میرے پیارے دوست! اب تم میرے سامنے نہیں ہو ورنہ میں تم سے ضرور معافی مانگتا اور تم مجھ سے اس طرح روٹھ کر اللہ کے ہاں نہ چلے جاتے جہاں یقیناً تمہارے مقامات بلند ہیں۔ تمہیں وہاں ضرور رفعت وعظمت میسّر ہے تم اس شرافت کش ماحول سے بے نیاز ہو۔ مگر دوست! تم غلطی پہ ہو۔ تم حکیم سعید کے دل سے اس کی حیات تک نہیں نکل سکتے اور پھر بالآخر ہم ایک دوسرے سے ملیں گے۔ [1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (14 مئی 1976ء، بشکریہ روزنامہ وفاق)، ہفت روزہ اہلحدیث (4 جون 1976ء)، ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا سفرِ آخرت

تحریر: مولانا برق التوحیدی

سید صاحب اسلامک فیسٹیول منعقدہ لندن میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے اپنا مقالہ پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے لیکن 4، 5 اپریل 76ء کی درمیانی شب کو حادثہ کا شکار ہوگئے۔ یہ حادثہ بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ 26 اپریل کو یہ روح فرسا اطلاع ملی کہ علم وادب کا خزینہ، تقویٰ و معرفت کی تصویر مجسم، شجاعت وقناعت کا پیکر، ذکرِ الٰہی کے دلدادہ، خاندانِ غزنویہ کے گلِ سرسبد، پاکستان کے مایۂ ناز ماہرِ تعلیم اور تبحر عالم دین جناب مولانا سید ابوبکر غزنوی رحلت فرما گئے۔ اس حادثہ فاجعہ کی خبر سنتے ہی جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور زبان سے بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون کی آواز نکلی۔ لندن سے سید صاحب کی میت لانے کے انتظامات میں 86 گھنٹے گزر گئے۔ یہ وقفہ غم واندوہ اور قلق واضطراب میں گزرا۔ چنانچہ جنازہ میں شمولیت اور آخری دیدار نیز أحب الصالحین ولست منهم لعل الله يرزقني صلاحا کے تحت عازم لاہور ہوا۔ راستے میں ایک شخص نے پوچھا: مولوی صاحب آپ کہاں جارہے ہیں؟ میرے ساتھی نے جواب دیا: سید ابوبکر غزنوی کا جنازہ پڑھنے کے لیے۔ میں نے فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: نہیں بھائی، سید ابوبکر کا نہیں خاندانِ غزنویہ کا جنازہ پڑھنے کے لیے جارہے ہیں۔ لیکن شاید آپ کو اس بات سے اتفاق نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ ابوبکر اپنے خاندان کی امتیازی روایات کے امین تھے۔ ان کا وجود ایک خاندان کا وجود تھا، ان کا ذہن ایک قوم کا ذہن تھا۔ ان کی سوچ ایک معاشرے کی سوچ تھی اور وہ اپنی ذات نہیں، ملک وملت کی فکر کرتے تھے۔

آہ! ذکرِ مخدوم میں دور چلا گیا۔ لاہور پہنچا تو اس شہر کے چہرے سے وہ رعنائی مفقود تھی۔ لوگ شیش محل روڈ کی طرف جوق در جوق چلے آرہے تھے۔ ہر شخص غم واندوہ میں ڈوبا ہوا نظر آرہا ہے۔ ہم میّت کے انتظار میں تقویۃ الاسلام کے ہال میں بیٹھ گئے۔ اضطراب بڑھتا گیا حتیٰ کہ سید صاحب کی میت شیش محل پہنچ گئی۔ تابوت خاص مقام پر رکھ دیا گیا تاکہ لوگ اطمینان سے چہرہ سید دیکھ سکیں جب رُخِ سیّد سے پردہ اٹھایا گیا تو لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے لیکن چہرۂ سید کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل ہوگیا کہ وہ زندہ ہیں یا...... کیونکہ نور بھری پیشانی اسی طرح دمک رہی تھی جیسی پہلے دیکھی تھی۔ گلاب کی مانند رخسار اسی طرح مہک رہے تھے جیسے پہلے تھے۔ جن ہونٹوں کی فطرت میں مسکرانا ہی مسکرانا تھا وہ نہ مسکرانے کے باوجود بھی مسکراتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

غرض یہ کہ وہ نورانی چہرہ اسی طرح چمک رہا تھا جیسے پہلے تھا۔ لوگ قطار اندر قطار چہرۂ سیّد دیکھ رہے تھے۔ تاہم انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور جنازہ اٹھانے کا وقت آیا۔ ٹریفک بند ہوگئی۔ نماز مغرب کے بعد تابوت اٹھایا گیا تو اللہ اکبر کی صدا گونج اٹھی اور ساتھ ہی چیخ وپکار کی آواز بھی بلند ہوئی۔ لوگوں کے فرطِ جوش کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ابوبکر کے تابوت کو کندھا دینے کے لیے نہیں بلکہ اپنے دلوں اور پلکوں پر اٹھانے کے لیے آئے ہیں۔ میں تابوت کے بالکل ساتھ تھا اور دیکھ رہا تھا کہ آگے اور پیچھے کی طرف جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی شرکائے جنازہ ہی نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے جنازے دیکھے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی نہ دیکھا۔ اہل لاہور کہنا ہے کہ سید ابوبکر غزنوی کا جنازہ ان جنازوں میں سے ایک تھا جن کا ذکر کیے بغیر تاریخ لاہور مکمل نہیں ہوسکتی۔ جنازہ میں لوگوں کی کثرت دیکھ کر مجھے بار بار امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول یاد آرہا تھا: بیننا وبینکم یوم الجنائز.

جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ پہنچا تو دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ جتنے لوگ جنازہ کے ساتھ تھے اس سے کہیں زیادہ پہلے ہی گراؤنڈ میں پہنچ چکے تھے۔ اتنے جم غفیر پر کنٹرول کرنا کوئی آسان نہ تھا تاہم علامہ احسان الٰہی صاحب ظہیر نے بکمال فراست مجمع پر کنٹرول کیا اور صفیں درست کروائیں تو اس اللہ کے ولی کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے حضرت مولانا معین الدین لکھوی امیر جمعیۃ اہل حدیث مغربی پاکستان آگے بڑھے۔ نماز جنازہ اس رقت آمیز انداز میں پڑھائی گئی کہ لوگ گڑگڑا رہے تھے خدا کے حضور اتنی آہ وزاری، خشوع وخضوع اور خلوص وللّٰہیت کو دیکھ کر دل چاہتا تھا کہ آج ابوبکر کی جگہ اس جنازہ کی میت میں ہوتا۔ اس عظیم جنازے کے پیش نظر اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ جس نے جنتی کو دیکھنا ہو وہ ابوبکر کا دیدار کرلے کیونکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس مسلمان کے لیے چالیس مسلمان صمیم قلب کے ساتھ دعا کریں اور لوگ اسے جنتی کہہ دیں تو اس کے لیے جنت واجب ہوجاتی ہے۔ تو یہاں ایک چالیس نہیں ہزاروں چالیس تھے اور ہر شخص ابوبکر کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔

نماز جنازہ سے فارغ ہوئے تو میت کو لے کر قبرستان کی طرف چل دیئے۔ قبر پہلے سے تیار تھی۔ بڑے انتظام واحترام کے ساتھ میت کو لحد تک لایا گیا۔ جب تابوت کو لحد میں اتارا جارہا تھا، سبھی لوگ اشکبار تھے، آخری دعا کے بعد لوگ واپس آگئے۔ خاندانِ غزنویہ کے اس گل سرسبد کو ان کے والد محترم اور اسلام کے بطل جلیل حضرت مولانا داؤد غزنوی علیہ الرحمۃ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی سے نوازے۔ آمین ![1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

خاندانِ غزنویہ کے نامور فرزند مولانا سید ابوبکر غزنوی

نماز جنازہ کی مختصر روداد

لاہور، 29 اپریل (وقائع نگار) خانوادۂ غزنویہ کے نامور فرزند جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے وائس چانسلر، ممتاز عالم دین اور ماہر تعلیم مولانا پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کو آج یہاں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ نماز جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ میں ادا کی گئی۔ جس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی۔ مولانا پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کی میت آج جب لندن سے لاہور پہنچی تو لاہور کے ہوائی اڈے پر ہزاروں سوگوار موجود تھے جن میں پنجاب کے تمام حصوں سے آئے ہوئے علمائے کرام، نوجوان وکیل اور دانشور شامل تھے۔ سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی میت لندن سے اسلام آباد پہنچی تھی جہاں سے دوپہر ساڑھے تین بجے پی آئی اے کی پرواز 615 کے ذریعے لاہور پہنچی۔

لاہور کے ہوائی اڈہ پر صبح ہی سے لوگ جمع ہو رہے تھے جن میں انجینئرنگ یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے عہدے دار اور دیگر طلباء بھی شامل تھے۔ جیسے ہی میت لانے والا طیارہ ہوائی اڈہ پر اترا لوگ بیرونی جنگلے کے ساتھ جمع ہو گئے۔ وزیر تعلیم و وزیر خوراک اور دیگر بعض علماء طیارہ تک پہنچ گئے اور تابوت کو کندھا دے کر پی آئی اے کی ایمبولینس تک پہنچایا، ہوائی اڈے کے رن وے کا چکر کاٹ کر ایمبولینس بڑے دروازے کی طرف آئی تو بیرونی جنگلے کے گرد جمع ہزاروں لوگ اس طرف بھاگے۔ جیسے ہی ایمبولینس باہر آئی ہزاروں سوگواروں نے اسے گھیر لیا۔ وہ تابوت کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے۔ بہت سے لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ صوبائی وزیر تعلیم ملک غلام نبی جنہوں نے چند روز پہلے پنجاب اسمبلی میں ایک تحریک التوا کے جواب میں مرحوم کی تعلیمی و علمی خدمات کو شاندار الفاظ میں سراہا تھا اور پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے عہدے دار جنہیں لاہور میں مرحوم کی آخری تقریر سننے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ سب غمناک آنکھوں سے ایمبولینس کو ہجوم میں سے راستہ بنا کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اسلام آباد سے جماعت اہل حدیث کے متعدد لوگ میت کے ساتھ لاہور آئے۔ جن میں حاجی محمد شفیع، مولانا محمد صدیق، محمد فاضل، مولانا عبدالعزیز، قاری عبدالسلام، چودھری محمد یعقوب، چودھری یاسین شامل ہیں۔ ہوائی اڈے سے میت کو شیش محل روڈ مرحوم کی اقامت گاہ تک پہنچایا گیا۔ جہاں بعد نماز مغرب جنازہ اٹھایا گیا۔

پروفیسر مولانا ابوبکر غزنوی کے آخری دیدار کے لیے ان کے جسد خاکی کو دارالعلوم تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ میں

رکھا گیا جہاں ان کے ہزاروں عقیدت مندوں اور شاگردوں نے آخری دیدار کیا۔ نماز مغرب کے فوراً بعد ان کا جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازہ میں شرکت کے لیے دوسرے شہروں سے ان کے ہزاروں مرید اور عقیدت مند آئے تھے۔ ان کے جنازہ کا بہت بڑا اجتماع براستہ بھاٹی گیٹ انارکلی سے ہوتا ہوا ساڑھے آٹھ بجے کے قریب یونیورسٹی گراؤنڈ پہنچا جہاں کئی ہزار افراد پہلے سے موجود تھے۔ جمعیت اہل حدیث کے مرکزی امیر مولانا معین الدین لکھوی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ نماز جنازہ میں سپریم کورٹ کے سابق چیف جج مسٹر ایس اے رحمان، میاں فضل الحق، علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا عبدالقادر روپڑی، مولانا نعیم صدیقی، مولانا حنیف ندوی، مسٹر ابوسعید انور، چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف مسٹر آفتاب احمد خان، انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، اساتذہ وطلباء، پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ، پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے عہدے دار، پنجاب بھر سے آئے ہوئے ممتاز اہل حدیث علماء، صحافیوں، وکیلوں اور سیاسی وسماجی کارکنوں نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔ نماز جنازہ کے بعد میانی صاحب قبرستان میں ان کے جسد خاکی کو ایک بار پھر آخری دیدار کے لیے رکھا گیا تا کہ وہ لوگ آخری دیدار کر سکیں، جو تاخیر سے پہنچے تھے۔ بعد میں انہیں ان کے والد گرامی مولانا داؤد غزنوی کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ جب ان کے جسد خاکی کو لحد میں اتارا جا رہا تھا، ہر آنکھ اشکبار تھی۔

(نوائے وقت: 30 اپریل 1976ء)[1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (7 مئی 1976ء)

(بابِ ہفتم)

تعزیتی بیانات

سید ابوبکر غزنوی کی وفات پر زعمائے ملت کے تاثرات

ترتیب: ڈاکٹر خالد محمود زاھد

علامہ احسان الٰہی ظہیر:

مرحوم صحیح معنوں میں قابل اجل تھے، ان کے انتقال سے ہم ایک شریف انسان، خلیق دوست اور جید عالم سے محروم ہو گئے ہیں، ان کے انتقال پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

مولانا معین الدین لکھوی امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث پاکستان:

مرحوم کو خداء تعالیٰ نے وافر صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ علم ودانش، تقویٰ وطہارت، فہم وفراست میں اپنا ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ مرحوم کا تعلیم وتربیت کے لحاظ سے اعلیٰ مقام تھا۔ مرحوم کے انتقال سے جو خلاء پیدا ہوا وہ پُر کرنا مشکل نظر آتا ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد عبد اللہ صاحب امیر جمعیت اہلِ حدیث گوجرانوالہ:

ابوبکر غزنوی مرحوم کی وفات سے علم وادب کو عظیم نقصان پہنچا ہے۔ آپ غزنوی خاندان کے علم وعمل کی آخری کرن تھے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کے بعد اس خاندان میں پھر ایسے فرزند پیدا کرے جو اعلاءِ کلمۃ اللہ کی سربلندی کے لیے خود کو وقف کر دیں۔

وفاقی وزیر مذہبی امور جناب مولانا کوثر نیازی:

اس قحط الرجال کے دور میں مرحوم علم ودانش، تقویٰ، ذکر وفکر اور فہم وفراست میں اپنے آباء واجداد کی روایات کے حامل اور تعلیم وتربیت کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔ مرحوم کو خدا نے گوناں گوں خوبیوں سے نوازا تھا، مرحوم نامور اہل علم غزنوی خاندان کے چشم وچراغ تھے، ان کی وفات سے بلاشبہ ملت کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔

وزیرِ اعلیٰ پنجاب جناب صادق حسین قریشی:

سید ابوبکر غزنوی کی اپنی دینی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔ مولانا مرحوم نے پاکستان میں اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا عہد کیا ہوا تھا، ان کے انتقال سے ملک ایک ماہرِ تعلیم اور مذہبی عالمِ دین سے محروم ہو گیا ہے۔

پنجاب کے وزیرِ تعلیم ملک غلام نبی صاحب:

مرحوم کی وفات سے ہم نہ صرف ایک ماہرِ تعلیم سے محروم ہو گئے ہیں بلکہ اعلیٰ اخلاق کا حامل شخص ہم سے جدا ہوا ہے، مرحوم اسلام اور علم کے مختلف شعبوں پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ سید صاحب مرحوم کی وفات سے ہزاروں اساتذہ طلبہ اور ان کا حلقہ احباب ماتم کرتا رہے گا۔

مولانا حکیم عبدالرحمٰن (ڈکٹیٹر):

مولانا غزنوی مرحوم قدیم و جدید علوم کا حسین امتزاج اور خوبصورت سنگھم تھے۔ آپ نے شب کی ظلمتوں میں اجالوں کو بکھیرنے کا عزم کر رکھا تھا، انہوں نے جدید تعلیم یافتہ ماحول میں پیدا شدہ الحاد و آوارگی میں معرفتِ الٰہی کی ایسی جوت جلائی کہ ان دلوں میں ذکر الٰہی سے ایمان وایقان کی روئیدگی دکھائی دینے لگی۔ جو آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی:

مرحوم ملک وملت کا عظیم سرمایہ تھے، وہ علم وفضل سیرت وکردار کے اعتبار سے ممتاز شخصیت اور اپنے نامور اسلاف کی عظمت وشرافت کے امین تھے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ لائل پور:

مولانا مرحوم ہمارے گمان میں ایک جنتی روح تھے اور جنت میں بسیرا کر چکے۔ اللہ پاک نے انہیں دیارِ غیر میں وطن سے دور شہادت کی موت عطا فرما کر مقربین میں شامل کر لیا۔

شیخ الحدیث مولانا محمد اسحاق چیمہ لائل پور:

آہ! لندن میں آج علم وفضل، تحقیق و دانش، فصاحت و بلاغت، دعوت وارشاد، زہد وورع، ذکر وفکر، خشیت الٰہی کا آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی پاکستان:

سید ابوبکر غزنوی اپنے اسلاف کے علم وفضل اور نیکی اور شرافت کے پیکر تھے، کسی کو بھی یہ وہم وگمان نہ تھا کہ مرحوم عالمِ جوانی میں اچانک ہم سے جدا ہو جائیں گے، مرحوم کی وفات سے مجھے از حد دلی صدمہ ہوا۔

مولانا مفتی محمود ایم این اے ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ علماء اسلام:

سید مرحوم ایک ممتاز عالمِ دین اور دردِ دل رکھنے والے مسلمان تھے۔ مرحوم نے اپنی ساری زندگی نئی نسل کو اسلامی علوم اور دینی تقاضوں سے آگاہ کرنے میں صرف کر دی اور پورے اعتدال، میانہ روی اور متانت کے ساتھ دینِ حق

کی خدمت کرتے رہے۔

دیارِ غیر میں مرحوم کی حادثاتی موت ایک ایسا المیہ ہے جس کا درد دیر تک اسلامیانِ پاکستان کو محسوس ہوتا رہے گا۔

مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف ایڈیٹر ہفت روزہ ''المنبر'' لائل پور:

میں اس خبر سے شدید متاثر ہوا ہوں۔

مولانا نے حسرت بھرے انداز میں فرمایا کہ مرحوم کی اچانک وفات سے اسلامی محاذ میں ایک زبردست شگاف پڑ گیا ہے اور ایک ایسا ہولناک خلاء پر ہونا بہت مشکل ہے۔

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف مدیر ہفت روزہ ''الاعتصام'':

اس المناک اور برق آسا خبر نے لاکھوں دلوں کو تڑپا دیا۔ مرحوم ابھی کم عمر ہی تھے کہ وہ عزائم و جذبات سے معمور اور عظیم منصوبے اپنے دماغ میں لئے ہوئے تھے۔ وہ بڑی خوبیوں کے حامل غیر معمولی ذہانت وفطانت سے بہرہ ور تھے۔ وہ صرف غزنوی خاندان کے چشم و چراغ ہی نہ تھے بلکہ اس کی تابندہ روایات کے حامل اور اس خاندان کی آبرو تھے۔ مرحوم بہترین خطیب، اعلیٰ انشاء پرداز، قدیم و جدید علوم سے بہرہ ور تھے۔

الاحباء (محبانِ عالمِ اسلامی) کے صدر نذیر احمد خان:

مرحوم پاکستان کی ان بلند پایہ اور نامور ہستیوں میں سے تھے جنہوں نے اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے کا عہد کیا ہوا تھا، اور وہ اس نصب العین پر کامیاب تھے۔ مرحوم ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے مدت العمر تک اسلامیانِ پاک وہند کی خدمت کی۔ مرحوم بیک وقت عربی، انگریزی، فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ مرحوم ایک قابل استاد، مدلل مقالہ نگار اور مؤثر خطیب تھے۔ مرحوم کی بے وقت موت سے پاکستان میں علم اور ادب اور اسلامیات کی صف میں عظیم خلاء پیدا ہو گیا ہے۔

مولانا محمد حسین ہزاروی صدر جمعیت مبلغین توحید وسنت پاکستان:

مرحوم کے انتقال سے عالمِ اسلام ایک عظیم نامور مفکر سے محروم ہو گیا ہے۔ وہ اپنے والدِ گرامی مولانا سید داؤد غزنوی صاحب مرحوم کی طرح اسلام کے شیدائی تھے۔

مولانا مجاهد الحسینی سابق ایڈیٹر ہفت روزہ خدام الدین:

مرحوم اپنے عظیم اسلاف و عظیم باپ کے عظیم وارث تھے۔ ان کے انتقال سے اتحاد بین الاسلامی کا پل ٹوٹ گیا۔

قاضی محمد اسلم سیف فیروزی، مولانا عبدالقادر ندوی دار العلوم ماموں کانجن:

سید ابوبکر غزنوی کی وفات سے دار العلوم اہلِ حدیث ماموں کانجن پر جو قیامت ٹوٹی اور جس شدت سے یہ صدمہ محسوس ہوا وہ بیان سے باہر ہے، اے کاش ہم گناہگاروں کی عمروں میں سے کاٹ کر سید صاحب کی عمر میں اضافہ کیا جا سکتا۔ مرحوم کی اس عالمِ جوانی میں ناگہانی موت کو شہادتِ عظمیٰ قرار دینا چاہیے۔ مرحوم کو خدا نے جو سوزِ دروں اور دینی شوقِ جنوں عطا فرمایا تھا۔ اس کی نظیر ان کے اقران و اماثل میں کہیں نظر نہیں آتی۔

مولانا احمد رحمانی صدر سٹوڈنٹس ریسرچ کمیٹی لائل پور پنجاب:

مرحوم عالمِ اسلام کے مایہ ناز فرزند تھے۔ مرحوم خطابت میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کی وفات سے ملتِ اسلامیہ کو ایک حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ مرحوم ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جس نے برسوں دینِ اسلام کی بے مثال خدمت کی تھی۔ [1]

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر

جناب مولانا سیّد ابوبکر غزنوی کا سانحۂ ارتحال

مختلف مکاتبِ فکر کے علماء، زعماء اور اربابِ حکومت کے تأثرات اور پیغامات

مولانا معین الدین لکھوی، امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان: اللہ تعالیٰ نے مرحوم غزنوی کو مخصوص اور وافر صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ علم و دانش، تقویٰ وطہارت اور فہم وفراست میں وہ اپنے آباء واجداد کی روایات کے حامل اور تعلیم وتربیت کے لحاظ سے نمایاں مقام پر فائز تھے، ان کے انتقال سے جو عظیم خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا بظاہر مشکل ہے۔

مسٹر صادق حسین قریشی وزیر اعلیٰ پنجاب: ان کے انتقال سے ملک ایک ماہر تعلیم اور مذہبی عالم سے محروم ہو گیا ہے۔ مرحوم کی دینی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے امیر مولانا محمد عبداللہ درخواستی، ناظم عمومی مولانا مفتی محمد ایم این اے، صوبہ پنجاب کے امیر مولانا عبیداللہ انور کا مشترکہ بیان: مرحوم ایک ممتاز عالم دین اور دردِ دل رکھنے والے مسلمان تھے جنہوں نے ساری زندگی نئی نسل کو اسلامی علوم اور دینی تقاضوں سے آگاہ کرنے میں صرف کر دی اور پورے اعتدال، میانہ روی اور متانت کے ساتھ دین حق کی خدمت کرتے رہے۔ دیارِ غیر میں ان کی حادثاتی موت ایک ایسا المیہ ہے جس کا درد دیر تک اسلامیانِ پاکستان کو محسوس ہوتا رہے گا۔

جماعت مبلغین توحید وسنت پاکستان کے صدر مولانا محمد حسین ہزاروی: ان کے انتقال سے عالمِ اسلام ایک نامور مفکر سے محروم ہو گیا ہے، وہ اپنے والد گرامی مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی طرح اسلام کے شیدائی تھے،

مولانا حافظ احسان الٰہی صاحب ظہیر (لاہور): مرحوم صحیح معنوں میں فاضل اجل تھے، ان کے انتقال سے ہم ایک شریف انسان، خلیق دوست اور جید عالم سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان کے انتقال پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

مولانا حافظ عبدالقادر صاحب روپڑی: مرحوم ملک وملّت کا عظیم سرمایہ تھے، وہ علم وفضل، سیرت وکردار کے اعتبار سے ممتاز شخصیت اور نامور اسلاف کی عظمت وشرافت کے امین تھے۔

چوہدری نذیر احمد، صدر الاحباء (لاہور): سیّد ابوبکر غزنوی مرحوم تعلیماتِ اسلام کو عام کرنے کے اپنے نصب العین میں بہت کامیاب تھے۔ مرحوم ایسے خاندان کے چشم وچراغ تھے جس نے مدت العمر اسلامیانِ ہند اور اسلامیانِ

پاکستان کی خدمت کی ہے۔ ان کا امتیاز یہ تھا کہ وہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور اسی لیے ان کا دائرۂ اثر بہت وسیع تھا۔ انہوں نے اپنے طلباء میں ایک ایسا اسلامی جذبہ پیدا کر دیا تھا جو اس وقت لاہور کی تعلیمی درس گاہوں میں منفرد حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ایک قابل استاذ، ایک مدلل مقالہ نگار اور ایک مؤثر خطیب تھے۔ ان کی بے وقت وفات سے پاکستان میں علم وادب واسلامیات کی صف میں نمایاں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ یقیناً یہ ایک قومی المیہ ہے۔

ملک غلام نبی، وزیر تعلیم پنجاب: مرحوم کی وفات سے ہم نہ صرف ایک معروف ماہر تعلیم سے محروم ہو گئے ہیں بلکہ اعلیٰ اخلاق کا حامل ایک شخص ہم سے جدا ہو گیا ہے۔ مرحوم اسلام اور علم کے مختلف شعبوں پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ مرحوم کی وفات سے ہزاروں اساتذہ، طلبہ اور ان کا حلقۂ احباب عرصے تک ماتم کرتا رہے گا۔

میاں طفیل محمد صاحب، امیر جماعت اسلامی پاکستان: مرحوم اپنے اسلاف کے علم وفضل اور نیکی وشرافت کا پیکر تھے۔ کسی کے بھی وہم وگمان میں نہ تھا کہ وہ اس جوانی کے عالم میں اچانک ہمارے درمیان سے اٹھ جائیں گے۔

جمعیت اہل حدیث لاہور شہر کے امیر مولانا محمد عطاء اللہ حنیف، مولانا محمد حنیف ندوی اور میاں فضل حق ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کا مشترکہ بیان: سید ابوبکر غزنوی کی وفات سے پاکستان ایک عظیم انسان، اعلیٰ پایہ کے ماہر تعلیم اور جید عالم دین سے محروم ہو گیا ہے۔

مولانا عبدالستار خان نیازی: ان کی وفات موت العالم موت العالَم کا درجہ رکھتی ہے۔ انہوں نے چھیالیس برس کی عمر میں اپنے خاندان کی علمی وروحانی روایات اور وقار وشرافت کی صفات کو ارفع واعلیٰ مقام پر پہنچا دیا تھا۔ وہ دیارِ فرنگ میں دعوتِ اسلام دینے گئے تھے اور اسی جہاد باللسان وبالقلم میں معنوی شہادت کا رتبہ حاصل کیا۔ ان قلب عشقِ نظامِ شریعت سے سرشار تھا۔

مولانا عبدالقادر آزاد، خطیب بادشاہی مسجد لاہور: مرحوم نے اپنی زندگی مسلمانوں کے اتحاد اور تمام مکاتب فکر کو مشترکہ قدروں میں جمع کرنے کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس ضمن میں ان کے خطبات ہمیشہ یاد رہیں گے جو انہوں نے بادشاہی مسجد میں اس مقصد کے لیے دیئے تھے۔

مولانا کوثر نیازی نے مولانا سید ابوبکر غزنوی کی اچانک وفات پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔

موصوف نے اپنے تعزیتی بیان میں مرحوم کی بیوہ کو یقین دلایا ہے کہ حکومت مرحوم کے پسماندگان کی امداد کے لیے ہر ممکن اقدام کرے گی۔ [1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (7 مئی 1976ء)

مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو خراجِ عقیدت

ترتیب: مولانا محمد یوسف انور

مولانا کوثر نیازی:

وفاقی وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی نے مولانا ابوبکر غزنوی کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی موت کو ملک کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ انہوں نے مرحوم کی اہلیہ کے نام ایک پیغام میں کہا ہے کہ مرحوم پاکستان کے سرکاری وفد کے ساتھ بین الاقوامی اسلامی فیسٹیول میں شرکت کرنے کے لئے گئے تھے لیکن بدقسمتی سے پہلے ہی روز ٹریفک کے حادثہ میں زخمی ہو گئے جس پر انہیں ہسپتال داخل کر دیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ لندن میں قیام کے دوران کئی مرتبہ ہسپتال گئے اور پاکستانی سفارت خانہ کے افسروں کو ہدایت کی کہ انہیں بہترین علاج فراہم کیا جائے۔ انہوں نے مرحوم کی اہلیہ کو یقین دلایا کہ حکومت پاکستان انہیں ہر ممکن مدد فراہم کرے گی۔

گورنر پنجاب:

گورنر پنجاب محمد عباس عباسی نے کہا کہ پروفیسر غزنوی رحمہ اللہ نے عمر بھر دین کی خدمت کی۔ انہوں نے جامعہ اسلامیہ بہاول پور کو بہتر بنانے کے لئے دن رات محنت کی اور قابل ترین اسٹاف مہیا کیا۔

وزیر اعلیٰ پنجاب:

صوبائی وزیر اعلیٰ صادق حسین قریشی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی وفات سے ملک ایک ممتاز ماہر تعلیم اور نامور مذہبی رہنما سے محروم ہو گیا ہے۔ انہوں نے مذہبی تعلیمات کو فروغ دینے میں جو اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

میاں ممتاز دولتانہ:

پاکستانی سفیر متعین برطانیہ میاں ممتاز دولتانہ نے سیّد غزنوی رحمہ اللہ کی وفات کو تعلیمی دُنیا پر ایک شدید ضرب قرار دیا۔

وزیرِ تعلیم پنجاب:

پنجاب کے وزیر تعلیم ملک غلام نبی نے کہا ہے کہ مرحوم معتدل مزاج اور ممتاز عالم دین تھے۔ وہ شائستہ اطوار والے اور شریف النفس انسان تھے۔ تعلیمی حلقے اور ان کے ہزاروں شاگرد و مداح ان کی وفات سے ہونے والے نقصان

کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔

جمعیۃ علمائے اسلام کے اکابرین:

جمعیۃ علمائے اسلام کے امیر مولانا عبداللہ درخواستی، ناظم عمومی مولانا مفتی محمود، پنجاب کے امیر مولانا عبیداللہ انور اور ناظم پنجاب مولانا نیاز احمد شاہ گیلانی نے پروفیسر ابوبکر غزنوی کی وفات پر گہرے رنج وملال کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اپنے مشترکہ بیان میں مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ مرحوم ایک ممتاز عالم دین اور دردمند دل رکھنے والے مسلمان تھے، اور انہوں نے ساری زندگی نئی نسل کو اسلامی علوم اور دینی تقاضوں سے آگاہی میں صرف کی۔ ان کی حادثاتی موت ایک ایسا المیہ ہے جس کا درد اسلامیانِ پاکستان ہمیشہ محسوس کرتے رہیں گے۔

صدر محبانِ عالم اسلامی:

صدر محبانِ عالم اسلامی چودھری نذیر احمد خان (سابق وزیر تجارت پاکستان) نے اپنے ایک تعزیتی بیان میں کہا کہ مرحوم پاکستان کی بلند پایہ اور نامور ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے اسلام تعلیماتِ اسلام کو عام کرنے کا عہد کیا ہوا تھا اور وہ اس نصب العین میں بہت کامیاب تھے۔ انہوں نے کہا: مرحوم ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس نے مدتوں اسلامیانِ ہند اور اسلامیانِ پاکستان کی خدمت کی ہے۔ ان کا امتیاز یہ تھا کہ مرحوم عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور اسی لئے ان کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ جب وہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اسلامیات تھے تو انہوں نے اپنے طلباء میں ایک ایسا اسلامی جذبہ پیدا کر دیا تھا جو اس وقت لاہور کی تعلیمی درسگاہوں میں منفرد حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ایک قابل استاد، ایک مدلل مقالہ نگار ایک مؤثر خطیب تھے جن کی اچانک وفات سے پاکستان میں علم وادب اور اسلامیات کی صف میں نمایاں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ مرحوم کی وفات ایک قومی المیہ ہے۔

جماعت اسلامی:

امیر جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل محمد نے کہا کہ سید ابوبکر غزنوی اپنے اسلاف کے علم وفضل اور نیکی وشرافت کے پیکر تھے۔ کسی کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ وہ اس جوانی کے عالم میں اچانک ہمارے درمیان سے اُٹھ جائیں گے۔ ان کی دفات سے مجھے شدید صدمہ ہوا ہے۔[1]

مرکزی انجمن شبان اہل حدیث لائل پور:

مرکزی انجمن شبان اہل حدیث لائل پور کے تعزیتی اجلاس میں انجمن کے رہنماؤں مولانا محمد شریف اشرف، مولانا محمد یوسف انور، پروفیسر ایس ایم شریف، مولانا محمد اسرائیل معاذ اور شیخ بشیر احمد نے سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے انتقال

---

[1] ہفت روزہ الحدیث (7 مئی 1976ء)

پُرملال پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم درس وتدریس کے علاوہ تبلیغ واشاعتِ دین میں بھی مقدور بھر کوشش کرتے رہے، انجمن کی دعوت پر آپ کئی بار لائل پور تشریف لائے اور تبلیغی جلسوں میں خطاب کر کے نوجوانوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے رہے ایک تعزیتی قرارداد کے ذریعے مرحوم کے لئے رفع درجات اور پسماندگان کے لیے صبر واستقامت کی دُعا کی گئی۔ (ناظم دفتر مرکزی انجمن شبان اہل حدیث لائل پور)

تعزیتی اجلاس جامعہ سلفیہ لائل پور:

مورخہ 27 اپریل 1976ء بروز منگل جامعہ سلفیہ لائل پور کے اساتذہ اور طلباء کا ایک ہنگامی اجلاس شیخ الحدیث مولانا محمد صدیق صاحب نائب امیر مرکزیہ کی زیر صدارت منعقد ہوا۔

تلاوتِ قرآن حکیم سے اس اجلاس کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد مولانا محمد صدیق صاحب نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

سید ابوبکر غزنوی کے انتقال پُرملال سے جماعت اہل حدیث کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ اس کی تلافی بظاہر ناممکن نظر آتی ہے۔ آپ غزنوی خاندان کے آخری فرد تھے، اب یہ علمی خاندان ختم ہو کے رہ گیا ہے۔ آپ بیک وقت سیاسی بصیرت کے حامل، مذہبی مسائل پر گہری نگاہ رکھنے والے عظیم منتظم اور مقرر تھے۔ ابھی آپ نے زندگی کی صرف چھیالیس بہاریں دیکھی تھیں، اور ہماری نظریں آپ پر جمی ہوئی تھیں کہ آپ مستقبل قریب میں اپنے اکابرین کی طرح بے مثال کارہائے نمایاں سرانجام دیں گے لیکن خدا کو شاید یہ منظور نہ تھا۔ آپ نے اپنی قابلیت کی بدولت ایک بلند مقام حاصل کیا تھا۔ صرف 45 برس کی عمر میں ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنا دیئے گئے، اس دوران آپ نے یونیورسٹی میں جو اصلاحات نافذ کیں اور جس طرح جامعہ اسلامیہ کو ایک معیاری یونیورسٹی کا مقام دلایا، سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس کے باوجود کہ آپ حکومت کے ملازم تھے، پھر بھی بلاخوف وتردید ہر حق بات کا اظہار برملا کرتے دیتے تھے۔

اس کے بعد قرارداد پیش کی جسے حاضرین نے بیک آواز منظور کیا، پھر دعا کے ساتھ یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

جامعہ سلفیہ لائل پور کے اساتذہ اور طلبہ کا یہ اجتماع بانی جامعہ سلفیہ حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے عظیم فرزند اور ملک وملّت کی مایۂ ناز شخصیت سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی وفات پر رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور مرحوم کے پس ماندگان کو سپاسِ تعزیت پیش کرتا ہے۔ سیّد صاحب کی وفات پاکستان کے لئے عموماً اور جماعت اہل حدیث کے لئے خصوصاً ایک عظیم المیہ ہے جس کی وجہ سے علمی حلقوں میں ایک ایسا خلاء واقع ہوگیا ہے جس کی تلافی بظاہر ناممکن ہے، سیّد صاحب مرحوم کی ذات نوجوانانِ ملّت کے لئے اخلاص اور خدمت میں روشنی کا ایسا مینار ہے جس سے آنے والی نسلیں راہنمائی حاصل کرتی رہیں گی۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے اور امت مسلمہ کو ایسے قائدین نصیب فرماتا رہے۔

اساتذہ وطلبہ جامعہ سلفیہ لائل پور

تعزیتی اجلاس دارالعلوم محمدیہ شیخوپورہ:

دارالعلوم محمدیہ اندرون پرانا اڈہ لاریاں شیخوپورہ شہر میں بتاریخ 27/ 4/ 76ء ایک تعزیتی اجلاس زیر صدارت مولانا محمد حسین صاحب شیخوپوری منعقد ہوا جس میں اسلام کے بطل جلیل پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا محمد حسین شیخوپوری نے فرمایا کہ علمائے کرام کا بہت تیزی سے اُٹھتے جانا نازک ترین حالات کی غمازی ہے۔ مولانا حافظ عبدالحق صدیقی رحمہ اللہ کے بعد مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی وفات ایک ناقابلِ برداشت نقصان ہے۔ مولانا نے نوجوان نسل پر زور دیا کہ وہ مرحومین کے نقشِ قدم پر چلنے اور اُن کی کمی کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔

غمزدہ: عطاء الرحمٰن ایم اے، ناظم دارالعلوم محمدیہ پرانا اڈہ لاریاں شیخوپورہ[1]

---

[1] ہفت روزہ الحدیث (14 مئی 1976ء)

مولانا سید ابوبکر غزنوی کے انتقالِ پُرملال پر اظہارِ تعزیت

مولانا عزیز الرحمٰن صاحب، خطیب سکھانہ باجوہ:

آہ! اسلام کی شمع روشن تجھے 24 اور 25 اپریل کی درمیانی شب کو بجھا دیا گیا۔ اے آسمان علم و فضل کے تابندہ ستارے تو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

جس طرح تیری مسندِ جلال کے گرد شاگردوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ اسی طرح آج تیری میّت کے گرد ہزاروں عقیدت مندوں کا ہجوم گویا انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر چلا آ رہا ہے۔

آہ! خاندانِ غزنویہ کی عظمت کا امین منوں مٹی تلے دفن ہو گیا۔ عظیم باپ کے عظیم بیٹے، اتحاد عالمِ اسلام کے داعی، جشنِ عالم اسلامی کے مندوب ذی شان، تیری موت اپنے جلو میں حیاتِ جاوید لائی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آہ! ہم تو دردِ فراق سے نڈھال ہوئے جاتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو؟ موت العالم موت العالَم، عالم کی موت تو دنیا کی موت ہوتی ہے۔ تیری قبر منور ہو اور اعلیٰ علیین میں مقام ہو (آمین)۔ ان العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول إلا ما یرضي ربنا، آنکھیں اشک بار اور دل غم سے بھرا ہے مگر زبان سے ہم کہتے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

مولانا حافظ عبدالرحمٰن نعیم شیخ:

خطیب شکرگڑھ ناظمِ اعلیٰ مرکزی جمعیۃ طلبہ اہلحدیث پاکستان

مولانا ابوبکر غزنوی ایک نامور باپ حضرت مولانا سیّد داؤد غزنوی کے فرزند اور ایک انتہائی ممتاز علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کی علمی اہلیت و دینی خدمات کے صلہ میں انہیں تھوڑی دیر پہلے پاکستان کی واحد یونیورسٹی جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا وائس مقرر کیا گیا۔ جسے بجا طور پر حسین انتخاب کی نہایت عمدہ مثال قرار دیا گیا تھا۔ مگر افسوس کہ انہیں یہاں خدمت کرنے کی بہت کم مہلت ملی۔ آپ نے اسلامیانِ برصغیر کی جو خدمات سرانجام دیں وہ قابلِ صد تحسین ہیں۔ آپ کا دائرہ اثر بہت وسیع تھا نیز آپ اپنے اسلاف کے علم و فضل، نیکی اور شرافت کے پیکر تھے۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ وہ دیارِ غیر میں اچانک ہمارے درمیان سے اُٹھ جائیں گے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

جمعیۃ شبان اہلحدیث بورے والا:

جامع مسجد اہل حدیث بورے والا میں غزنوی خاندان کے عظیم فرزند مولانا سید ابوبکر غزنوی کی وفات حسرتِ آیات پر ایک تعزیتی اجلاس منعقد ہوا جس میں مولانا محمد عبداللہ صاحب گورداسپوری امیر جمعیت اہلحدیث ضلع ملتان اور مولانا حافظ عبدالرحیم صاحب نعمانی صدر جمعیت علمائے اسلام بورے والا نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ قحط الرجال کے اس دور میں جب کہ بیشتر علمی مسندیں خالی پڑی ہیں۔ ایک نابغۂ دوران کا یکا یک اُٹھ جانا پوری ملتِ اسلامیہ کے لئے ایک ایسا جاں گداز حادثہ ہے جس کی کسک تادیر محسوس ہوتی رہے گی اور مجالسِ علم وادب مدت تک ان کی یاد میں نوحہ کناں رہیں گی۔ ان کے پردادا حضرت الامام سیّد عبداللہ غزنوی نے افغانستان سے جانبِ ہند ہجرت الی اللہ ہوکر برصغیر میں جو چراغِ ہدایت جلایا تھا اور جس کی تابنا کی میں سیّد ابوبکر کے دادا حضرت الامام عبدالجبار غزنوی و مولانا عبدالواحد غزنوی اور والد مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی نے اپنے اپنے دور میں اضافہ کیا وہ سید ابوبکر کے دور میں اپنی ضوفشانیوں کی معراج پر پہنچ کر عالمِ اسلام کے لئے شمعِ ہدایت بن چکا تھا اور آج اُن کے فیض یافتگان نہ صرف برصغیر پاک وہند اور سعودی عرب میں بکثرت موجود ہیں بلکہ اُن کے وابستگانِ دامن انگلینڈ، امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

آخر میں تمام حاضرین نے مرحوم کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کی۔

جماعت اہلحدیث مرید کے:

30 اپریل کو جمعۃ المبارک کے روز جماعت اہلحدیث وحید کالونی منڈی مرید کے ضلع شیخوپورہ کا تعزیتی اجلاس ہوا جس میں پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کی اندوہناک شہادت کو جماعت اہلحدیث کا عظیم نقصان تصور کیا گیا اور حکومتِ پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ بذریعہ سفارت خانہ حکومتِ برطانیہ سے مطالبہ کیا جائے کہ مجرم ڈرائیور کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دی جائے اور سیّد صاحب کے لئے دعا کی گئی کہ رب العزت آپ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کے لئے صبر کی تلقین کی گئی۔

حکیم جان محمد ناظمِ اعلیٰ جماعت اہلحدیث:

وحید کالونی منڈی مرید کے ضلع شیخوپورہ، انجمن تعمیرِ نو پاکستان گوجرانوالہ

گوجرانولہ (نمائندہ خصوصی) انجمن تعمیرِ نو پاکستان (رجسٹرڈ) گوجرانوالہ کے قائم مقام صدر نثار احمد چودھری، جنرل

سیکرٹری محمد اسمٰعیل اور سیکرٹری نشر واشاعت طارق بشیر انصاری نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں جمعیت اہلحدیث کے مایہ ناز فرزند، ممتاز عالم دین، معروف ماہرِ تعلیم اور خاندانِ غزنویہ کے آخری چشم و چراغ سید ابوبکر غزنوی کی اچانک وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ مرحوم نے اسلام کے لئے جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں اور ان کی وفات صرف ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ پوری جماعت کے لئے ایک المیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) انجمن اس غم میں برابر کی شریک ہے۔ مرحوم کی جنازہ میں انجمن کے سرپرست صوفی نذیر احمد بھلر دی اور رکن مجلس شوریٰ قاری قمر الدین صاحب نے انجمن کی نمائندگی فرمائی۔

مولانا عبدالعظیم انصاری، قصور:

سید ابوبکر غزنوی کی وفات کا سن کر دل دھک سے رہ گیا۔ موت سے کسی کو رستگاری نہیں لیکن بعض موتیں ایک قومی اور ملّی المیہ بن جاتی ہیں۔ غزنوی صاحب کی موت سے ملک و ملّت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی مشکل ہے۔ ان کی شخصیت ہمہ پہلو بلند و بالا اور مکمل تھی۔ ان کی ذات مجموعہ اوصاف اور مجسمہ اخلاق کریمانہ تھی جنہیں ان سے ملنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ مرحوم پیکرِ علم و عمل تھے اور تقویٰ و طہارت کی تصویر اور اپنی خاندانی روایات و وراثت کے حامل تھے۔ مجھے ان کے والدِ گرامی حضرت مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دس سال اور ان کے ساتھ تقریباً ایک سال کام کرنے کا موقع ملا۔ بعض ذہنی صلاحیتوں اور دل و دماغ کی رو سے میں نے انہیں اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر پایا۔ ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا ناممکن نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

جمعیۃ القراء ضلع گوجرانوالہ:

مرکزی جمعیۃ القراء اہلحدیث ضلع گوجرانوالہ کے امیر جناب قاری محمد یحییٰ خان اور جناب قاری محمد ادریس صاحب عاصم لاہوری ناظم نشر واشاعت جمعیۃ القراء اہل حدیث پاکستان اور دیگر اراکین نے ایک مشترکہ بیان میں مفکرِ اسلام جناب مولانا سید ابوبکر غزنوی کی اچانک وفات حسرتِ آیات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور ان کی وفات کو پورے پاکستان کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔ سید صاحب کی شخصیت کوئی معمولی شخصیت نہ تھی، وہ بیک وقت صفِ اول کے ادیب، اعلیٰ پایہ کے خطیب، جید عالمِ دین، مایہ ناز اہل قلم تھے اور ایک شفیق استاد ہونے کے باوجود زہد و تقویٰ کے پیکر تھے۔ غرضیکہ انہیں جس شعبہ میں دیکھا جائے وہ نمایاں نظر آتے تھے۔ ان کی وفات سے جو نقصان خصوصاً جمعیۃ اہل حدیث کو پہنچا ہے وہ ایک بڑا حادثہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جمعیۃ کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی

توفیق دے۔

مولانا ابوالطیب محمد اسحاق فردوسی، خطیب سلانوالی ضلع سرگودھا:

30 اپریل 1976ء کا خطبہ جمعۃ المبارک جامع مسجد اہل حدیث الفردوس منڈی سلانوالہ میں حسبِ سابق راقم الحروف نے دیا۔ جمعہ خطبہ کے بعد ملک کے نامور خطیب اور مجلس عمل تحفظ ختم نبوت ضلع ساہیوال کے صدر جناب مولانا حافظ عبدالحق صدیقی اور خانوادہ غزنویہ کے مایہ ناز فرزند جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے وائس چانسلر ممتاز عالم دین اور ماہر تعلیم مولانا سید ابوبکر غزنوی اور حضرت مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی کی اہلیہ محترمہ اور حضرت مولانا الحاج عبدالغفار سلفی و مولانا عبدالجبار سلفی مالک مکتبہ ایوبیہ کی والدہ ماجدہ اور حضرت العلام مولانا محمد عبداللہ صاحب جھال خانوآنہ کی اہلیہ محترمہ کی وفات حسرت آیات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا اور مرحومین کے لئے نماز جنازہ غائبانہ ادا کی گئی اور دعاءِ مغفرت بھی کی گئی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔[1]

دارالحدیث رحمانیہ کراچی:

26 اپریل بروز پیر ایک انتہائی ہولناک خبر کا سامنا کرنا پڑا کہ حضرت مولانا پروفیسر ابوبکر صاحب غزنوی لندن میں انتقال فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ لہٰذا 27 اپریل کو صبح ہی اساتذہ وطلبہ دارالحدیث رحمانیہ کا ایک تعزیتی اجلاس زیر صدارت حضرت مولانا حاکم علی صاحب شیخ الحدیث مدرسہ ہذا منعقد ہوا۔

پاک و ہند کے ممتاز خاندان کی ممتاز شخصیت حضرت مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی وفات ملک کے لئے ایک سانحہ عظیم ہے اور علمی دنیا کے لئے ایک لاتلافی نقصان ہے اور خصوصیت کے ساتھ جماعت اہلحدیث کا ایک ایسا نقصانِ عظیم ہے جس کا پورا ہونا مستقبل قریب میں بعید ہے۔ اس موقع پر حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب خائف نے خاندانِ غزنویہ کی علمی خدمات اور زہد وتقویٰ پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور مولانا ابوبکر غزنوی کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا، نیز ان کے حق میں دعاءِ مغفرت اور ان کے پس ماندگان کے حق میں صبر جمیل کی توفیق کی دعا مانگی۔ اجلاس سے خطاب مولانا کرم الدین صاحب ناظم تعلیمات نے فرمایا اور قرارداد کے ساتھ یہ مجلس برخواست ہوئی اور حسبِ ذیل قراردادیں پاس کی گئیں۔

1. یہ اجلاس حضرت مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے اچانک سانحہ ارتحال کو موجودہ نسل اور ملک کے لئے ایک عظیم نقصان قرار دیتا ہے اور اس قحط الرجال کے دور میں مولانا کی وفات یقیناً جمیع مسلمانانِ عالم اور بالخصوص جماعت اہلحدیث کے لئے ایک عظیم المیہ ہے جس کی تلافی مستقبل بعید میں ہونا ناممکن ہے۔
2. یہ اجلاس حضرت مولانا مرحوم کی ان خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے جو انہوں نے اسلام کے سلسلہ میں

[1] ہفت روزہ الاسلام، لاہور (14 مئی 1976ء)

سرانجام دیں۔

④ آخر میں یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ مولانا مرحوم کے حادثہ کی تحقیق کروائی جائے اور اس کے صحیح حقائق واسباب منظرِ عام پر لائے جائیں۔

مولانا محمد صدیق صاحب، ناظم اعلیٰ جمعیۃ اہلحدیث ضلع ہزارہ:

اخبارات میں پروفیسر صاحب کی وفات کی خبر پڑھ کر خاندانِ غزنویہ کے مرحومین بزرگوں کا صدمہ اور غم تازہ ہو گیا کیونکہ پروفیسر صاحب اس خاندان کے آخری علمی سپوت تھے۔ جن میں اپنے اسلاف کا زہد وتقویٰ، دینی لگن، جماعتی جذبہ، علوم قدیم وجدید پر گہری دسترس، حق گوئی و بے باکی اور دیگر جملہ اوصاف ومحاسن بدرجہ اتم موجود تھے اور جماعت اہلحدیث کی امیدوں کی آخری کرن تھے۔ پوری جماعت ان پر نازاں تھی کیونکہ گزشتہ چند برسوں سے جماعت کو اپنے سرکردہ اور مشہور علماء کرام ودیگر مذہبی وسیاسی شخصیتوں سے محروم ہونا پڑا۔ جن کی خالی جگہیں پُر ہوتی نظر نہیں آرہیں اور ان کے خلا کو شدت سے محسوس کیا جارہا ہے۔ ان حالات میں پروفیسر صاحب، جن کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے، کی رحلت اور جدائی کا صدمہ بیان سے باہر ہے۔ ان کی وفات کی خبر بجلی بن کر گری اور علاقہ گلیات کے تمام قصبات و دیہات میں پھیل گئی اور اسی ہزار کی آبادی کی تمام مساجد میں ان کے لئے دعائے مغفرت اور نمازِ جنازہ غائبانہ ادا کی گئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق دے اور جماعت اہلحدیث کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

تعزیتی اجلاس زیر اہتمام انجمن اہلحدیث قصور:

30 اپریل جامع مسجد اہلحدیث قصور میں جمعۃ المبارک کے موقعہ پر خاندانِ غزنویہ کے نامور فرزند سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ مولانا محمد خالد صاحب ساقی خطیب مسجد ہذا نے غزنوی مرحوم کے آباؤ اجداد مولانا عبداللہ الغزنوی، امام عبدالجبار غزنوی، مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی (رحمہم اللہ) کی ان بیش بہا دینی، ملی اور روحانی خدمات کا ذکر کیا جو اس عظیم خاندان نے برصغیر پاک وہند میں سرانجام دیں۔ خصوصاً مولانا سیّد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی ان خدمات کا ذکر کیا جو انہوں نے استخلاصِ وطن اور آزادیِ ملک کے سلسلہ میں انجام دیں اور اس کے بعد جماعت اہلحدیث کی تنظیم اور اتحاد کے لئے شب وروز جدوجہد اور کوشش کی اور جماعت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی سعی فرمائی، ان کو شاندار الفاظ میں سراہا اور ان کے فرزندِ جلیل مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی وفات سے جو نقصان ملک وملّت اور جماعت اہلحدیث کو پہنچا ہے اس کو عظیم المیہ قرار دیا۔ جمعہ کا تمام خطبہ غزنوی خاندان کے حالات وواقعات پر دیا گیا۔ نمازِ جمعہ کے بعد ایک قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی جس میں سید ابوبکر غزنوی کی وفات پر اظہارِ رنج وغم کے ساتھ ساتھ دعائے مغفرت کی گئی اور پسماندگان سے اظہارِ ہمدردی کیا گیا۔ آخر میں نمازِ جنازہ غائبانہ ادا کی گئی۔ تمام مسجد حاضرین

سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔

جمعیۃ طلبہ غرباء اہلحدیث کراچی:

جمعیت طلبہ اہلحدیث کے زیر اہتمام ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا پروفیسر ابوبکر غزنوی کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔ جمعیت طلبہ غرباء اہلحدیث کے جنرل سیکرٹری مولوی حافظ عبدالحق آفریدی نے فرمایا کہ مولانا غزنوی کی وفات سے جماعت اہلحدیث کا ہر فرد مغموم ہے۔ مولانا کی بہت سی دینی وعلمی اور ملی خدمات ہیں۔ اسی طرح جماعت غرباء اہلحدیث کے ایک قدیم رکن مدرسہ عربیہ اسلامیہ دارالسلام کراچی کے معاونِ خاص اور طلبہ کے ہمدرد جناب حاجی شمس العارفین المعروف حاجی چھما کے انتقال پُرملال سے ہمیں بہت صدمہ پہنچا ہے۔ حاجی صاحب مرحوم نے مدرسہ کی ساری عمر جو خدمت کی تھی بس اللہ تعالیٰ ہی ان کو اس کا اجر دے گا۔ ہم مولانا ابوبکر غزنوی اور حاجی چھما صاحب کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں رب العالمین سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل احباب اور جماعتوں کی طرف سے بھی قرار دادیں موصول ہوئیں ہیں، ہم تنگیٔ داماں کی بنا پر اس سب کے متن شائع کرنے سے قاصر ہیں۔

- جماعت اہلحدیث روڈو سلطان ضلع جھنگ
- اراکین، اساتذہ، طلبہ، مدرسہ فیض القرآن والحدیث روڈو سلطان ضلع جھنگ
- قاری احسان الٰہی اظہر سرگودھوی
- مدرسہ عربیہ محمودیہ دارالقرآن والحدیث رجسٹرڈ محمود کوٹ مظفر گڑھ
- انجمن اہلحدیث گیمبر ضلع ساہیوال
- انجمن محبان اہلحدیث منصور پور ضلع لائل پور
- الندوۃ السّلفیہ گوجرانوالہ
- جمعیۃ رفقاء اہلحدیث پاکستان گوجرانوالہ
- جناب محمد یحییٰ اسد صاحب گوجرہ
- جمعیۃ اہلحدیث فتح جنگ
- جناب قاری شکیل احمد صاحب ساہیوال
- جمعیۃ طلبہ جامعہ محمدیہ اوکاڑہ

- انجمن شبان اہلحدیث منصور پور
- جمعیۃ شبان اہلحدیث حیدر آباد
- جمعیۃ شبان اہلحدیث کہروڑپکا
- جمعیت اہلحدیث جہلم
- جمعیۃ طلبہ اہلحدیث میر پور خاص سندھ
- محمد عطاء اللہ بن سلطان احمد جامعہ محمدیہ ٹنڈو غلام علی سندھ۔[1]

آہ سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

خاندانِ غزنویہ کی آخری علمی شمع بھی گل ہوگئی!

انا للہ وانا الیہ راجعون

قارئین کرام! کو معلوم ہی ہوگا کہ مولانا سید ابوبکر غزنوی وائس چانسلر بہاولپور یونیورسٹی ابھی کچھ دنوں قبل لندن کے اسلامی فیسٹیول میں شرکت کے لئے یورپ تشریف لے گئے تھے اور وہاں کار کے حادثے میں شدید زخمی ہوگئے تھے اور ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ متوسلین اور احباب مطمئن تھے کہ سید صاحب موصوف زیر علاج ہیں اور عنقریب صحت یاب ہوکر مراجعت فرمائے وطن ہوں گے۔

لیکن 26 اپریل کو اچانک یہ پُرملال خبر ملی کہ سید صاحب 24 اپریل بروز ہفتہ (23 ربیع الثانی 1396ھ) لندن کے ہسپتال میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مزید تفصیلات کا ابھی علم نہیں، بہرحال یہ المناک خبر برقِ خاطف[2] بن کر گری اور حواس معطل کر گئی تاہم سوائے صبر کے چارہ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ ان کے برادران، بچوں، بیوہ اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق دے اور قوم و جماعت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔[3]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام، لاہور (11 جون 1976ء)

[2] بینائی چھین لینے والی

[3] ہفت روزہ الاعتصام، لاہور (30 اپریل 1976ء)

مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر

ضلع لائل پور کے علماء کرام کے تاثرات

ترتیب: قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری، ماموں کانجن

ہم نے ریڈیو پاکستان کے ذریعے جونہی حضرت مولانا سید ابوبکر غزنوی وائس چانسلر اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کی لندن میں اچانک وفات حسرتِ آیات کی خبر سنی تو نہ صرف دارالعلوم بلکہ پاکستان بھر میں صفِ ماتم بچھ گئی اور ہر سننے والا اس منحوس خبر سے سکتے میں آ گیا کیونکہ کوئی بھی ذہن ایسی خبرِ وحشت اثر سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ دارالعلوم تعلیم الاسلام ماموں کانجن کو غزنوی خاندان خصوصاً حضرت مولانا سید ابوبکر سے جو تعلق خاطر رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ چنانچہ اس خبر سے اساتذہ، طلباء اور دیگر خدام دارالعلوم پر جو قیامت ٹوٹی اور جس شدت سے یہ صدمہ محسوس ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔

اے کاش! ہم گناہگاروں کی عمروں سے کاٹ کر سید ابوبکر غزنوی کی عمر میں اضافہ کیا جا سکتا۔ جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ابھی تک ان کی نعش پاکستان نہیں پہنچی بلکہ جمعرات کو ان کی میت یہاں پہنچے گی تو اساتذہ دارالعلوم اور دیگر نامور علماء سے رابطہ قائم کر کے مولانا سید ابوبکر کی اس جوانی کے عالم میں اچانک موت کے بارے میں تاثرات و کیفیات معلوم کی گئیں جو ذیل میں حوالۂ قرطاس ہیں:

یہ خبر سن کر مولانا محمد اسحاق چیمہ صاحب نے فرمایا کہ آہ آج لندن میں علم و فضل، تحقیق و دانش، فصاحت و بلاغت، دعوت و ارشاد، زہد و ورع، ذکر و فکر اور خشیتِ الٰہی کا آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

شیخ الحدیث مولانا عبداللہ لائل پوری نے فرمایا کہ مولانا سید ابوبکر ہمیشہ کے لئے ہم سے روٹھ کر ملاءِ اعلیٰ میں جا ملے۔ وہ ایک جنتی روح تھے، جنت میں بسیرا کر چکے۔ اللہ پاک نے انہیں دیارِ غیر میں وطن سے دور شہادت کی موت عطا فرما کر مقربین بارگاہ میں شامل کر لیا ہے۔

غزنوی خاندان کے قدیمی فداکار المنبر لائل پور کے مدیرِ اعلیٰ مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف سے فون پر جب رابطہ کیا گیا تو وہ اس خبر سے اس قدر متاثر تھے کہ اندیشہ محسوس کیا گیا کہ کہیں ان پر دل کا دورہ نہ پڑ جائے۔ وہ حسرت بھرے انداز میں فرما رہے تھے کہ ابوبکر غزنوی کی اچانک وفات سے اسلامی محاذ میں ایک زبردست شگاف پڑ گیا ہے اور ایک ایسا ہولناک خلا پیدا ہو گیا ہے کہ جس کے پُر ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ہفت روزہ خدام دین کے سابق ایڈیٹر، جامع مسجد کچہری بازار لائل پور کے خطیب، مشہور صحافی اور ادیب مولانا مجاہد الحسینی نے فرمایا کہ سیّد ابوبکر غزنوی اپنے عظیم اسلاف و عظیم باپ کے عظیم وارث تھے۔ ان کے انتقال سے اتحاد بین الاسلامی کا پل ٹوٹ گیا ہے۔

دارالعلوم ماموں کانجن کے مہتمم مولانا عبدالقادر ندوی نے مولانا ابوبکر غزنوی کی بے وقت موت کو شہادتِ عظمیٰ قرار دیا اور کہا کہ مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے جو سوزِ دروں اور دینی شوقِ جنوں عطا فرمایا تھا ان کی نظیر ان کے اقران و اماثل میں کہیں نظر نہیں آتی۔

دارالعلوم ماموں کانجن کے صدر مدرس علامہ پیر محمد یعقوب قریشی نے مولانا ابوبکر غزنوی کی موت کو اسلامیانِ پاکستان کے لئے عظیم المیہ اور جماعت اہل حدیث کے لئے ناقابلِ برداشت صدمہ سے تعبیر کیا۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب مہتمم جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ نے جمعۃ المبارک کے عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے مولانا سید ابوبکر غزنوی کی دینی و ملی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ مرحوم اس وقت جماعت کے کوئی عہدے دار نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ جماعت کے تمام حلقوں میں نہایت محترم تھے۔

دارالعلوم کے نائب صدر مدرسین شیخ الحدیث مولانا حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی نے مولانا غزنوی کے سانحہ ارتحال کو موت العالِم موت العالَم قرار دیا۔ مولانا حافظ ثناء اللہ حنیف مدرس دارالعلوم نے حضرت غزنوی کی اس اچانک موت ناقابلِ تلافی نقصان گردانا۔

دارالعلوم کے شعبہ حفظ و تجوید کے صدر مولانا قاری عبدالشکور برق نے فرمایا کہ مولانا غزنوی کی اس جواں مرگی نے ہمیں یتیم کر دیا ہے۔ مولانا رضی اللہ مدرس دارالعلوم نے فرمایا کہ مولانا غزنوی کے انتقال پُرملال سے ہماری کمر ٹوٹ گئی ہے۔

مولانا ابوبکر غزنوی کے عاشق زار مولانا ارشاد الحق اثری کی اس وحشت اثر خبر سے حالت دیدنی تھی۔ ان کے حزن و ملال کی کیفیات صدمہ کی شدت اور تاثرات کو الفاظ و حروف بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ مولانا عبدالرشید ہزاروی، مولانا عبداللہ مشتاق، مولانا حافظ محمد صدیق اظہر، مولانا عبد الرشید اثاروی، مولانا رفیع الدین اور مولانا عبدالرب مجاہد سوموار 26 اپریل کو ہی عازم لاہور ہو گئے تھے۔

المنبر کے رکن ادارہ جناب خالد اشرف صاحب نے حزن و ملال میں ڈوب کر فرمایا کہ خدا شاہد ہے کہ مجھے اپنی والدہ مرحومہ کا صدمہ بھی اتنی شدت سے محسوس نہ ہوا تھا جتنا کہ مولانا غزنوی کا محسوس ہوا ہے۔

حضرت مولانا حافظ عبدالغفور صاحب امیر جمعیۃ اہلحدیث جہلم، مولانا عبدالعزیز صاحب حنیف خطیب اسلام آباد، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمانی خطیب کاموئکے، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب ضیاء خطیب قلعہ دیدار سنگھ،

حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب خلیق خطیب جامع مقدس گوجرانوالہ اور مولانا قاری محمد یونس صدیقی مہتمم جامعہ ثنائیہ ساہیوال نے سید صاحب کی وفات کو جماعت کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

باقی میرے جذبات واحساسات اور کیفیاتِ قلب وذہن کیا ہیں؟ وہ ان شاء اللہ بہت جلد قسط وار حوالہ قلم وقرطاس ہوں گے کیونکہ یہ وقت اور صفحات کی قلت میرے وسعت بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مرحوم سے میرے جو مراسم و تعلقات تھے اس بندہ عاجز کو ان سے جو عقیدت ومحبت تھی اور مرحوم کو ان سطور کے راقم سے جو شفقت و پیار تھا وہ واقفانِ حال سے مخفی نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ابھی تک حضرت مولانا حافظ عبدالحق صدیقی کے انتقال کے صدمہ کے زخم مندمل نہیں ہوئے تھے کہ مولانا سید ابوبکر غزنوی کی وفات کی صورت میں ہم پر مصائب کا ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ایسی عبقری شخصیتیں روز روز نہیں پیدا ہو جایا کرتیں بلکہ لیل ونہار کی ہزاروں لاکھوں گردشوں کے بعد ایسے دیدہ ور جنم لیتے ہیں اور نابغہ عصر پیدا ہوتے ہیں۔ بہرکیف تفصیلات آئندہ صحبت پر اٹھا رکھتا ہوں۔ (1)

آہ! مولانا ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے وائس چانسلر اور ممتاز دانشور مولانا ابوبکر غزنوی مرحوم لندن میں منعقدہ جشنِ عالم اسلام میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے تھے۔ 5 اپریل کو مرحوم کار کے حادثہ میں زخمی ہو گئے اور اب خبر آئی ہے کہ خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی اچانک شہادت سے جو صدمہ اہلِ پاکستان کو ہوا ہے وہ ظاہر ہے۔ خصوصاً دینی حلقوں میں ان کی شہادت کی خبر نے اضطراب برپا کر دیا ہے۔ مولانا ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند تھے۔ جن کی دینی وسیاسی خدمات سے پاک وہند کے اہلِ علم بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے اتنی عمر میں جتنی خوبیاں اپنے اندر جمع کر لی تھیں، وہ اس دَور میں کم ہی لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائے ...... ادارہ ترجمانِ اسلام ان کے پسماندگان اور جمعیۃ اہلِ حدیث کے ساتھ اس صدمہ میں برابر کا شریک ہے۔ (2)

اکرام القادری

---

(1) ہفت روزہ الاسلام، لاہور (7 مئی 1976ء)، ہفت روزہ الاعتصام (7 مئی 1976ء)

(2) ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور (30 اپریل 1976ء)

لائل پور میں سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں

عظیم الشان جلسۂ عام

مورخہ 27 مئی بروز جمعرات عید باغ دھوبی گھاٹ لائل پور کے وسیع و عریض میدان میں دارالمطالعہ ختم نبوت کے زیر اہتمام جلسۂ عام منعقد ہوا۔ جس کے انعقاد کا مقصد مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ اور خاندانِ غزنویہ کی دینی و ملی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنا تھا، مقررین میں شہر لائل پور کے تمام مکاتبِ فکر کے علماء، وکلاء اور پروفیسرز شامل تھے۔ ان کے علاوہ ملک کے مایۂ ناز اور شعلہ نوا مقرر علامہ احسان الٰہی ظہیر اور خطیب پاکستان مولانا محمد حسین صاحب شیخوپوری بھی مدعو تھے، یہی وجہ ہے کہ اس عظیم الشان جلسہ میں ہر حلقہ کے ہزارہا سامعین کا ٹھاٹیں مارتا سمندر تاحدِ نگاہ تک نظر آتا تھا۔

کارروائی کا آغاز قاری عبدالسلام صاحب آف راولپنڈی کی تلاوتِ قرآنِ حکیم سے ہوا جس کے بعد طلبائے جامعہ سلفیہ حافظ محمد سعید اطہر، آغا حبیب الرحمٰن اور ریاض احمد خان نے غزنوی مرحوم کے حالاتِ زندگی بیان کئے۔ مقامی مقررین میں سے قاضی محمد اسلم صاحب سیف فیروزپوری اور جناب اعجاز احمد چشتی ایڈوکیٹ کی تقاریر نہایت معلوماتی تھیں۔

اس تعزیتی جلسہ کے خصوصی مقرر جناب علّامہ احسان الٰہی ظہیر نے پروفیسر سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ مرحوم کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ اسلام کے سچے شیدائی وفدائی اور رسول اللہ ﷺ کے عاشقِ زار تھے۔ ان کے جنازہ کے اژدہام کو دیکھ کر یہ معلوم ہو رہا تھا کہ آج بھی ہزاروں افراد کے دل اسلام کی محبت میں دھڑکتے ہیں۔ سیّد غزنوی رحمہ اللہ کی وفات پر اسلامیانِ وطن کے گہرے تاثرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے ان کا اپنا بھائی یا بیٹا انتقال کر گیا ہے۔ علّامہ صاحب نے کہا کہ دین اسلام کے امین اور منبرِ رسول اللہ کے وارث جب دُنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو دنیا کو پتہ چل جاتا ہے کہ حقیقی عزّت کس کا نصیبہ اور کس کا مقدر ہے۔ لوگ ان کے جنازہ کو کندھوں پر نہیں بلکہ پلکوں پر اٹھائے جاتے ہیں۔

علامہ صاحب نے بڑے پُرجوش انداز میں سلسلۂ خطاب جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے دادا سیّد عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ نے یہ کردار پیش کیا کہ وطن تو چھوڑا جاسکتا ہے لیکن رسول اللہ کی سنت نہیں چھوڑی جاسکتی، ہمارے اسلاف کی تاریخ غیرت کی تاریخ ہے، علّامہ صاحب نے علمائے صادق پور، خاندانِ غزنویہ کے بزرگانِ کرام اور

دیگر نامور اہل حدیث اکابر کی استقامت و عزیمت کے واقعات کچھ ایسے انداز میں بیان فرمائے کہ حاضرین عش عش کر اٹھے اور فضا مسلک اہل حدیث زندہ باد، علمائے اہل حدیث زندہ باد اور نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھی۔

آخر میں علامہ صاحب نے کہا کہ ابوبکر مرحوم کے نام کو زندہ رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کے آباء واجداد کے طرزِ عمل کو اپنایا جائے۔ آپ کے بعد مرکزی جمعیت کے ناظم تبلیغ مولانا محمد حسین صاحب شیخوپوری نے قریباً ڈھائی گھنٹہ تک مسلک اہل حدیث کی صداقت میں قرآن حکیم کی بارش برسائی اور اپنے دل نشین و سلیس اندازِ خطابت سے شرک وبدعات کے جال تار تار کیے۔ آپ سے قبل ایک تعزیتی قرار داد کے ذریعے سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی مغفرت اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کی گئی۔

جلسہ کی صدارت مولانا عبدالرحمٰن صاحب (فاضل دیوبند) مدرس دارالمطالعہ ختم نبوت نے فرمائی اور اسٹیج سیکرٹری کے فرائض مولانا محمد یوسف صاحب انور ناظم جمعیت اہل حدیث نے ادا کیے۔

مرزا محمد اسحاق زیدی ناظم دارالمطالعہ ختم نبوت

نشاط ہوٹل بلڈنگ بھوانہ بازار لائل پور (۱)

آہ! اہلحدیث جماعت کے مایۂ ناز سپوت

سیّد ابوبکر غزنوی رحلت فرما گئے

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

مرحوم لندن میں منعقدہ جشن اسلامی میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ 4 اور 5 اپریل کی درمیانی رات سڑک عبور کرتے ہوئے ایک کار کے نیچے آ گئے۔ اس حادثہ میں ان کی ریڑھ کی ہڈی اور ہنسلی اور دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ وہ لندن میں ویسٹ منسٹر ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ کل بروز اتوار ضربات کی تاب نہ لاتے ہوئے اس دنیائے فانی سے دارالخلد کی طرف چل بسے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ادارہ ''الاسلام'' اور جمعیت اہلحدیث گوجرانوالہ مرحوم کے پسماندگان کے غم واندوہ میں برابر کے شریک ہیں۔ (۲)

---

(۱) ہفت روزہ اہلحدیث، لاہور (18 جون 1976ء)

(۲) ہفت روزہ الاسلام، لاہور (30 اپریل 1976ء)

مکتوب مولانا کوثر نیازی وفاقی وزیر مذہبی امور پاکستان

محترم جناب بشیر انصاری صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ آپ ہفت روزہ ''الاسلام'' کے ایک خصوصی شمارہ میں سید ابوبکر غزنوی مرحوم ومغفور کی دینی وعلمی اور ملی خدمات کی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں۔

مرحوم سید ابوبکر غزنوی ایک ایسے علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کی اسلامی خدمات کا شہرہ برصغیر پاک وہند میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ کے آباء واجداد غزنی سے چل کر برصغیر میں محض خدمت اسلام اور استرضاء ربانی کی خاطر سکونت پذیر ہوئے اور یہاں آ کر فروغِ علوم دین اور قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ اور دیگر علومِ متداولہ کی تعلیم وتدریس کے لیے کوشاں رہے جو میرے نزدیک سب سے بڑی سعادت اور خوش بختی ہے۔

جناب سید ابوبکر غزنوی مرحوم نے اپنے آباء واجداد کے جلائے ہوئے چراغوں کی روشنی کو مدہم نہ ہونے دیا اور ان کی روایات کو زندہ و پائندہ رکھنے میں شبانہ روز کوششیں کیں۔

وہ نہ صرف علومِ اسلامیہ سے ہی بہرہ ور تھے بلکہ علومِ مغرب، فلسفہ اور تصوف کے بھی ایک متبحر اور بے مثال عالم تھے۔ حکومتِ پاکستان نے جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے ''وائس چانسلر'' کے عہدے کی تفویض کے لیے ان پر نگاہِ انتخاب ان کے بہت سے محاسن واوصاف کے پیشِ نظر ڈالی تھی مگر خدائے جبار وقہار کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ اس جامعہ میں زیادہ دیر تک اپنی اہلیت وقابلیت کے جوہر دکھاتے۔ کاش وہ کچھ اور دیر زندہ رہتے اور ہم ان کے علوم وفنون سے استفادہ کرتے۔

اب انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ عشقِ رسول مدنی ﷺ، محبتِ صالحین، طلبِ علمِ دین، اصلاحِ امت، باہمی محبت ومروت اور احترامِ آدمیت کی جو شمعیں انہوں نے روشن کی تھیں ان کی روشنی کو مدہم نہ ہونے دیا جائے۔ [1]

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر

مدینہ یونیورسٹی میں اظہارِ تعزیت

مکتوب: مولانا محمود احمد میرپوری، مولانا محمد مدنی

مدینہ منورہ میں پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ وائس چانسلر بہاولپور یونیورسٹی کی وفات کی اندوہناک خبر اخبارات کے ذریعہ سے پہنچی جس کسی نے بھی یہ خبر سنی رنج والم کی تصویر بن گیا۔

طلبہ کے مشترکہ مطالبہ پر 5 جمادی الاوّل 1396ھ کو دارالحدیث مدینہ منورہ میں محترم مولانا عبدالغفار حسن مدرس مدینہ یونیورسٹی کے زیرِ صدارت ایک تعزیتی اجلاس منعقد ہوا جس میں پاکستان کے تمام مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے علاوہ ہندوستانی، مالدیپی اور نیپالی طلبہ نے بھی شرکت کی۔

مقرّرین نے پروفیسر صاحب مرحوم اور ان کے عظیم خاندان کی خدماتِ جلیلہ کا تذکرہ کیا۔ مولانا عبدالغفار حسن نے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ سیّد صاحب مرحوم قدیم و جدید کا حسین مرقع اور اتحادِ اسلامی کے مخلص داعی ہونے کے اعتبار سے طلبہ و علماء کے لئے ایک لائق تقلید مثال تھے۔

آخر میں تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جس کا متن حسبِ ذیل ہے:

تعزیتی قرارداد: اسلامک یونیورسٹی مدینہ منورہ میں زیرِ تعلیم پاکستانی طلبہ کا یہ مشترکہ اجلاس پروفیسر سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی اچانک موت پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

اجلاس کی نظر میں پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کی اندوہناک موت ایک قومی سانحہ ہے اور مرحوم کی وفات سے علمی اور دینی حلقوں میں ناقابلِ تلافی خلا پیدا ہو گیا ہے۔ آپ اس عظیم خاندان کے چشم و چراغ تھے جسے اعلائے کلمۃ اللہ اور احیاء سنتِ رسول اللہ ﷺ کی پاداش میں غزنی سے نکالا گیا تو اس نے سرزمین پنجاب میں شمعِ توحید و اتباعِ سنت فروزاں کی اور لاکھوں سینوں کو نورِ ایمان سے منوّر کیا۔ پروفیسر صاحب مرحوم اپنے خاندان کی روایات کے امین اور والد محترم مولانا سیّد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے کمالات کی تصویر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ بصیرت عالمِ دین، ممتاز ماہرِ تعلیم اور مشفق استاذ و مربی تھے۔ قحط الرّجال کے اس دور میں قرونِ وسطیٰ کی یادگار تھے۔ قوم کو ان کی جامع کمالات ہستی سے بجا طور پر بہت سی امیدیں تھیں اور وہ بلاشبہ ان پر پورا اُترنے کے اہل تھے۔

ایسے حالات میں جبکہ ملک و قوم کو ان کی سخت ضرورت تھی۔ ان کا اس طرح سے رخصت ہو جانا باعثِ صدمۂ عظیم ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اجلاس پروفیسر صاحب مرحوم کے پس ماندگان ان کے برادر بزرگ جناب سیّد عمر فاروق غزنوی اور خاندانِ غزنویہ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

اجلاس دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں درجات بلند عطا فرمائے۔ ان کے پسماندگان واہلِ خاندان کو صبر جمیل کی توفیق دے اور قوم وملک کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین ثم آمین (۱)

قوم ایک جید عالم اور ماہر تعلیم سے محروم ہوگئی

کراچی 27 اپریل جماعت غرباء اہلحدیث حلقہ ڈرگ کالونی کے ناظم قاضی عبدالحکیم بلوچ نے سیّد ابوبکر غزنوی وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی وفات پر ایک ہنگامی اجلاس بلایا۔ جس میں حضرت مولانا کرم الجلیلی مدیر صحیفہ اہلحدیث، مولانا محمد سلیمان جونا گڑھی مدرس مدرسہ عربیہ دارالسلام کراچی، مولانا عبدالجبار سلفی نائب سیکرٹری جماعت غرباء اہلحدیث، شیخ افضال احمد نائب ناظم ڈرگ کالونی، حافظ محمد شعیب سلفی آفس سیکرٹری، شیخ رفیق احمد صاحب نائب ناظم ڈرگ کالونی نے شرکت کی۔

قرارداد: آج کا یہ اجلاس عالم دین اور ماہر تعلیم وائس چانسلر سید ابوبکر غزنوی کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ ان کے انتقال سے قوم اور ملک ایک جید عالم اور ماہر تعلیم سے محروم ہوگئی ہے۔ ہم غزنوی خاندان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور غزنوی خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

قاضی عبدالحکیم ناظم جماعت غرباء اہلحدیث
ڈرگ کالونی، کراچی۔ (۲)

---

(۱) ہفت روزہ الاعتصام، لاہور (28 مئی 1976ء)، ہفت روزہ اہلحدیث، لاہور (4 جون 1976ء)، ہفت روزہ الاسلام، لاہور (11 جون 1976ء)

(۲) ہفت روزہ الاسلام، لاہور (21 مئی 1976ء)

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال

سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ اس دار فانی سے رحلت کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم اس سرکاری وفد کے ہمراہ لندن میں منعقدہ ایک جشن اسلامی میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے جس کی سربراہی وفاقی وزیر مذہبی واقلیتی اُمور و امور بیرون ملک پاکستانی نے کی تھی۔ 4 اور 5 اپریل کی درمیانی شب ٹریفک کے حادثہ میں شدید زخمی ہو گئے۔ ویسٹ منسٹر ہسپتال لندن میں انھیں بروقت طبّی امداد بہم پہنچائی گئی۔ جناب مولانا کوثر نیازی خود بہ نفس نفیس کئی بار اُن کی تیمارداری کے لیے تشریف لے جاتے رہے اور آپ نے پاکستانی سفارت خانے کو ہدایت کی کہ ان کی دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔ مگر قدرت کی طرف سے ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ والا فیصلہ صادر ہو چکا تھا۔ سیّد ابوبکر غزنوی 25 اپریل کو چار بجے شام زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کی اچانک رحلت پر ہر صاحبِ دل پاکستانی کو صدمہ پہنچا ہے۔ اس قحط الرجال کے دور میں مرحوم علم ودانش، تقویٰ وطہارت، ذکر وفکر اور فہم وفراست میں اپنے آباء واجداد کی روایات کے حامل اور تعلیم تربیت کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو گونا گوں خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ مرحوم نامور اہل علم، اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر اور خاندانِ غزنویہ کے چشم وچراغ تھے۔ اُن کی وفات حسرتِ آیات سے بلاشبہ ملّت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اور ملک کے علمی ودینی حلقوں میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ ہم اس موقع پر مرحوم کے رفع درجات کے لیے دعا گو اور پسماندگان کے رنج میں برابر کے شریک ہیں۔ (امین اللہ وثیر)[1]

برطانیہ سے سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر

ناظم اعلیٰ کے نام تعزیتی پیغام

محترم جناب ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان

السلام علیکم

بھائی صاحب آگے ہی کیا غم واندوہ ہے جماعت کے لئے کہ ایک اور چراغ گل ہوگیا۔ مجھے غزنوی خاندان کے ساتھ خاص لگاؤ اور تعلق تھا کیونکہ میں نے کافی زمانہ مدرسہ غزنویہ سلفیہ میں گزارا۔ پانچ پشتوں سے یہ خاندان خالص توحید کی تبلیغ اور اشاعت میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا، اوران کے بزرگوں کے تربیت یافتہ شیخ الحدیث حضرت مولانا نیک محمد صاحب جیسی شخصیتیں بھی گزری ہیں اور مولانا ابوبکر صاحب علمی اور عملی لحاظ سے اپنے اسلاف کے صحیح جانشین ہوتے جارہے تھے، اور اس زمانہ میں ان جیسی باہمت شخصیتوں کی جماعت کو بہت زیادہ ضرورت تھی۔ مگر تقدیر کے سامنے کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہیں ورنہ ان کی ابھی دُنیا کو بڑی ضرورت تھی اوران کی عملی، علمی بصیرت سے ابھی دُنیا والوں کو بہت کچھ حاصل کرنا تھا۔

ہمیں انتہائی دکھ ہے کہ یورپ کی متمدن دنیا میں آکر اتنی بڑی شخصیت کا ایک معمولی حادثے کا شکار ہوکر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنا بہت بڑا المیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جماعت اہل حدیث کو اور زیادہ آزمائش میں نہ ڈالے اور ہماری تقصیریں معاف فرمائے۔

فضل کریم عاصم امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث انگلینڈ [1]

---

[1] ہفت روزہ اہلحدیث، لاہور (21 مئی 1976ء)

مولانا سیّد ابوبکر غزنوی کی وفات

جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے وائس چانسلر مولانا سید ابوبکر غزنوی کی وفات سے تعلیمی حلقوں میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ مولانا سید داؤد غزنوی کے فرزند ارجمند تھے اور ایک اونچے خاندان کے سلجھے ہوئے فرد تھے۔

سید ابوبکر غزنوی بیک وقت کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ نامور عالمِ دین، ماہر تعلیم، بہترین استاد، اچھے مقرر، جدید سے باخبر، قدیم سے آگاہ اور روشن خیال انسان تھے۔ وہ بڑی محنت سے اپنے تدریسی فرائض سر انجام دیتے تھے اور طلبہ ان کے اندازِ تعلیم سے بہت متاثر تھے۔ طلبا میں علمی روح کے ساتھ ساتھ وہ ایک خاص اسلوب سے نیکی وصالحیت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے اور نوجوان ذہن ان سے اثر پذیر ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنی علمی وتدریسی زندگی کا آغاز اسلامیہ کالج لاہور کی لیکچرر شپ سے کیا۔ پھر انجینئرنگ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے استاد اور بعد ازاں اسی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے۔ 1975ء میں ان کی گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر انھیں جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا وائس چانسلر بنا دیا گیا۔ اس جامعہ کے یہ پہلے وائس چانسلر تھے۔ نہایت مختصر مدت میں اس ادارے کو انھوں نے ملک کے اونچے تعلیمی اداروں کی سطح پر پہنچا دیا تھا۔ اس میں علمِ حدیث کا ایک خاص شعبہ قائم کیا اور ان وہ دینی واسلامی علوم کے ساتھ ساتھ دیگر سائنسی علوم کے شعبے بھی قائم کرنا چاہتے تھے۔ افسوس ہے زندگی نے ان کو مہلت نہ دی اور وہ اپنے ان منصوبوں کو جو اُن کے نقطۂ نظر سے اس یونیورسٹی کی شان کو دوبالا کرنے کا باعث تھے، عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

تبلیغ اسلام کا داعیہ اللہ نے ان کو خاص طور سے ودیعت کیا تھا۔ وہ عام جلسوں میں شامل ہونے کے عادی نہ تھے۔ لیکن جہاں ضرورت سمجھتے، تبلیغی مقاصد کے لیے ضرور جاتے اور وہاں ایک اثر چھوڑ کر آتے۔ اسی جذبہ کے تحت وہ لندن کی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں سرکاری وفد کے رکن کی حیثیت سے گئے تھے اور موٹر کے حادثے میں وفات پا گئے۔ ابھی ان کے سفرِ حیات کی تیز رفتار گاڑی نے پچاس منزلیں بھی طے نہ کیں تھیں کہ یکا یک رک گئی اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی میت لاہور لائی گئی اور ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں 29 اپریل کو انھیں اپنے عظیم باپ مولانا سید داؤد غزنوی کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم ابوبکر غزنوی کو ادارہ ثقافت اسلامیہ سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اس کے تصنیفی وتحقیقی کارناموں کی تحسین کرتے تھے۔ ارکانِ ادارہ نے اپنے ایک اجلاس میں ان کی وفات پر گہرے حزن وملال کا اظہار کیا اور ایک تعزیتی قرارداد منظور

کی، جس میں ان کی علمی خدمات کو سراہا گیا اور ان کے پس ماندگان سے اظہارِ افسوس کیا گیا۔ اللّٰھم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه.

(محمد اسحاق بھٹی)①

سید ابوبکر غزنوی کی تعزیت

محترمی انصاری صاحب!

السلام علیکم "الاسلام" کا غزنوی وصدیقی نمبر ملا۔ ماشاء اللہ آپ نے اس کی تدوین وترتیب میں جس فن کاری سے کام لیا ہے موجودہ کساد بازاری میں یہ آپ کی ہی ہمت ہے۔ سید ابوبکر غزنوی صاحب مرحوم کے چند خطوط میرے پاس تھے۔ افسوس کہ وہ میری بار بار نقل مکانی سے کہیں کھو گئے، ورنہ خاصے کی چیز تھی اور میں آپ کو نہ بھیج سکا۔

انصاری صاحب! سیّد غزنوی مرحوم کو اپنی شہرہ آفاق تالیف میں ﴿قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ کا ترجمہ لکھتے ہوئے جو ذہول ہوا اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ نیز مرحوم نے مروّجہ تصوف کی روشنی میں جو حلقۂ ذکر قائم کیا تھا شاید میری طرح کے کچھ اور اصحاب بھی ہوں جو ذکر کے ایسے حلقوں کو شریعت کے تقاضوں کے منافی سمجھتے ہوں۔

اس قسم کی چند باتوں کے علاوہ مرحوم کی زندگی ایک مثالی زندگی تھی اور آپ نے تو مرحوم کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ غزنوی خاندان کا ہم مسلمانوں پر جو احسان ہے آپ نے سب کی طرف سے قرض ادا کر دیا۔②

غمزدہ: فیض عالم صدیقی

---

① ماہنامہ المعارف، لاہور (جون 1976ء)

② ہفت روزہ الاسلام (24 دسمبر 1976ء)

آہ! خاندان غزنویہ کا آخری روشن ستارہ بھی رُوپوش ہو گیا

ہماری جماعت پر غالباً ہمارے رب کی ناراضگی ہے، اس سال پے در پے ہمارے درمیان سے علماء، خطباء اور ادباء اللہ کو پیارے ہوتے جا رہے ہیں۔ 25 اپریل کو سید ابوبکر غزنوی بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ واقعہ کی تفصیل اخبارات سے آپ کو معلوم ہے۔ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ہمیں، ہماری جماعت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ بڑی خوبیاں تھیں، زہد وتقویٰ، علم وادب، جدید وقدیم سب سے مزین تھے۔ (1)

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ﴾

قرار دادِ تعزیت بر انتقال پُر ملال

جناب پروفیسر مولانا ابوبکر صاحب غزنوی وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بھاولپور

دودمانِ غزنویہ کے چشم وچراغ، عالم دین، ماہر تعلیم، وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ مولانا ابوبکر صاحب غزنوی جولندن میں حادثہ کے باعث انتقال کر گئے۔

جمعیت اہلحدیث کراچی کا یہ جلسہ مرحوم کی ناگہانی موت پر انتہائی رنج وغم محسوس کرتا ہے۔ کسی عالم کی وفات ایک عالَم کی موت سے کم نہیں بالخصوص تمام برادران اہلحدیث کو اس حادثۂ جانکاہ سے عظیم دلی صدمہ ہوا۔ خدا مرحوم کا نعم البدل عنایت فرمائے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین (2)

---

(1) الارشاد جدید، کراچی (مئی 1976ء)

(2) الارشاد جدید، کراچی (جون 1976ء)

مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر تعزیتی قرار دادیں

مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی اچانک وفات پر ملک کے اطراف و جوانب سے مسلسل تعزیتی قرار دادیں اشاعت کے لئے موصول ہو رہی ہیں جن میں انہوں نے سید صاحب کی وفات پر رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ اور اس حادثے کو ملک و ملت کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا ہے اور پس ماندگان سے اظہارِ ہمدردی کیا گیا ہے۔ ''الاعتصام'' چونکہ اپنی تنگ دامانی کی بنا پر ان سب کو شائع کرنے سے قاصر ہے، اس لئے اس کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ صرف اُس حلقے اور شہر کا نام شائع کر دیا جائے جہاں سے وہ قرار داد آئی ہے۔ امید ہے کہ احباب ہماری مجبوری کے پیشِ نظر اظہارِ ناگواری نہیں فرمائیں گے۔ (ادارہ)

- جمعیت اہلحدیث کراچی
- مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ کراچی
- جمعیت اہلحدیث جھنگ
- جمعیت شبان اہلحدیث حیدرآباد سندھ
- جامع مسجد اہلحدیث نواب شاہ سندھ
- جمعیت شبان اہلحدیث ملتان ڈویژن
- جمعیت اہلحدیث ضلع مردان
- جمعیت شبان اہلحدیث کہروڑ پکا (ملتان)
- جمعیت اہلحدیث میانوالی
- مدرسہ دارالحدیث محمدیہ ملتان
- جامعہ سلفیہ لائل پور
- جمعیت اہلحدیث بہاولنگر
- انجمن شبان اہلحدیث منصور پور
- انجمن تعمیرِ نو پاکستان گوجرانوالہ
- انجمن اہلحدیث غازی آباد (کمہار پورہ) لاہور

- انجمن اہلحدیث مصطفیٰ آباد (دھرم پورہ) لاہور
- مرکزی جمعیت طلباء اہلحدیث پاکستان
- جماعت اسلامی ضلع لائل پور
- جمعیت شبان اہلحدیث کاموںکے
- جماعت غرباء اہلحدیث ڈرگ کالونی کراچی
- دارالعلوم محمدیہ پرانا اڈہ لاریاں شیخوپورہ
- انجمن اہلحدیث قصور
- جمعیت شبان اہل حدیث خانیوال
- انجمن شبان اہلحدیث عثمان والا
- جمعیت الطلبہ جامعہ محمدیہ کہروڑ پکا (ملتان)
- جمعیت الطلبہ جامعہ محمدیہ اوکاڑہ
- دارالمطالعہ قاسم العلوم بدوملہی (سیالکوٹ)
- جمعیت طلبہ اہلحدیث جلال پور پیروالا ضلع ملتان
- مولانا محمد ادریس بھوجیانی، ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائل پور
- محمد یوسف ہارون آبادی، سمن آباد لائل پور
- قاری احسان الٰہی ظہیر ماموں کانجن
- جمعیت الطلبہ مدرسہ ضیاء الاسلام گہلن ہٹھاڑ ضلع لاہور
- جماعت اہل حدیث گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
- جمعیت اہل حدیث ہڑپہ شہر
- جمعیت اہل حدیث منڈی بہاؤالدین
- جمعیت شبان اہلحدیث اسلام پورہ خانیوال
- انجمن شبان اہل حدیث ڈجکوٹ [1]
- جمعیت طلبائے جامعہ اسلامیہ چاہ شاہاں گوجرانوالہ

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام، لاہور (14 مئی 1976ء)

- جمعیت اہلحدیث چک 11-L/7 لاہوریاں والا، ضلع ساہیوال
- انجمن اہل حدیث اوڈ راجپوت
- جمعیت اہلحدیث چھترپڑی میرپور آزاد کشمیر
- جمعیت اہلحدیث محلہ فرید گنج ساہیوال
- انجمن شبانِ اسلام کوٹ رادھاکشن لاہور
- طلبائے مدرسہ دارالحدیث محمدیہ کوٹ رادھاکشن لاہور
- جماعت اہل حدیث بہاولپور
- ڈاکٹر محمد نذیر مسلم ہومیو پیتھ، رحیم یار خان
- مدرسہ دارالقرآن والحدیث محمود کوٹ
- جمعیت اہل حدیث وحیدیہ کالونی مریدکے
- مدرسہ دارالحدیث محمدیہ لیہ ضلع مظفر گڑھ
- انجمن تبلیغ الاسلام اہلحدیث کڑیالہ تحصیل حافظ آباد
- دارالعلوم بلتستان غواڑی
- عہدے داران مرکزی جمعیت القرآء اہلحدیث
- جمعیت اہل حدیث لودھراں ضلع ملتان
- انجمن اشاعت التوحید وسنت اہل حدیث منڈی فیض آباد
- جامع مسجد اہلحدیث محمدیہ عارف والا
- جمعیت طلبہ اہلحدیث ادارۂ علوم اثریہ لائل پور
- جمعیت الطلبہ دارالحدیث محمدیہ کوٹ رادھاکشن
- جمعیت اہل حدیث ڈسکہ
- جماعت اہلحدیث روڈو سلطان ضلع جھنگ
- جمعیت الطلبہ مدرسہ دارالحدیث محمودیہ کوٹ کبیر تحصیل میلسی ضلع ملتان
- جماعت اہلحدیث مصری شاہ لاہور
- جمعیت اہل حدیث ضلع لاہور

- ڈاکٹر عنایت اللہ نسیم سوہدروی، جنرل سیکرٹری پاکستان طبی ایسوسی ایشن۔ لاہور
- جمعیت اہلحدیث گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
- جمعیت دادفتیانہ چک نمبر 12L/27 حاجیانوالہ، ضلع ساہیوال
- جامع اہل حدیث بیگ ڈاک خانہ دادووالی تحصیل وزیر آباد، ضلع گوجراں والہ [1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام، لاہور (4 جون 1976ء)

(باب ہشتم)

منظوم گلہائے عقیدت

سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

کلامِ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے آئینہ میں

مرحوم سیّد ابوبکر کے تصور میں بالِ جبریل کی ورق گردانی شروع کی کہ یہ عاجز رنج واندوہ کے وقت تنہائی میں کلامِ اقبال پڑھنے اور اس سے کسی حد تک غم غلط کرنے کا عادی ہے۔ پورے دو گھنٹے بالِ جبریل کا مطالعہ کیا اور اس کی متعدد نظموں اور قطعات کو حسبِ حال پایا۔ میری دانست میں پروفیسر غزنوی حضرت علامہ کے مخصوص تصورِ خودی کے مثالی پیکر بلکہ علَم بردار اور اقبال کے مردِ مومن کے بیشتر اوصاف کے حامل تھے۔ مزید برآں وہ مغربی علوم وتہذیب سے پوری طرح آشنا لیکن مشرقی اخلاق وآداب کا مرقع اور اسلامی تہذیب وشرافت کی چلتی پھرتی تصویر تھے، ان ہی جذبات سے مغلوب کلامِ اقبال سے چند اشعار نقل کر رہا ہوں۔ اگر جذبات اور حالات نے ساتھ دیا تو شاید کچھ اور بھی ..... حافظ کبیر پوری

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دِلی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے اَبلہِ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ ایک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
پُرسوز و نظر بازنکو ہیں و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند [1]

[1] ہفت روزہ الحدیث، لاہور (7 مئی 1976ء)

بیادِ ابوبکر غزنوی

جناب اسلام اللہ شاکر

علم کی سب بستیاں دیکھو تو ویراں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

موتِ عالم موتِ عالَم سی احادیثِ رسول
غزنوی سید تری ہستی کے شایاں ہوگئیں

پہلے ہی تھا جماعت میں بہت قحطِ رجال
جب ہوئے ابوبکر رخصت سونی گلیاں ہوگئیں

غزنوی داود (رحمۃ اللہ علیہ)، اسماعیل سلفی (رحمۃ اللہ علیہ) روپڑی
کیسی کیسی ہستیاں اب طاقِ نسیاں ہوگئیں

موت تجھ کو موت آئے کیا ستم تو نے کیا
غم کی راہیں آج پھر ہم پر نمایاں ہوگئیں

روزِ محشر ارضِ لندن کیا ہمیں دے گی جواب
جس کی کاریں ہم سے یوں دست وگریباں ہوگئیں

سید ابوبکر تیرے بعد تیرے شہر میں محفلیں
علم و ادب کی مرثیہ خواں ہوگئیں

خاندانِ غزنوی کے آخری چشم و چراغ
بجلیاں کیا جانے کتنی تجھ پر خنداں ہوگئیں

بندہ شاکر کہاں ہے اور کہاں تخلیقِ شعر
پر لگی جب چوٹ تو آہیں غزل خواں ہو گئیں (1)

سیّد ابوبکر غزنوی

جناب ولی وارثی

سپہرِ علم و ادب پر وہ مہرِ روشن تھا
افق پہ چرخِ تصوف کے ماہتاب تھا وہ

نظیر اس کی ملے گی کہیں؟ یہ مشکل ہے
ہماری بزم میں اک مردِ لاجواب تھا وہ

سلوک اس کا تجمل تھا خلق اس کی ادا
نگاہِ عشق میں وہ رشکِ صد نگاراں تھا

وہ خلوتوں میں اگر تھا فقیرِ گوشہ نشیں
و جلوتوں میں سدا صدرِ بزمِ یاراں تھا

شہیدِ عظمتِ آئینِ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہو کر
مقامِ جنتِ فردوس کو سدھار گیا

برا نہ مانیے گر سچی بات کہتا ہوں
غلط نہیں ہے کہ وہ دوستوں کو مار گیا (2)

(1) ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

(2) ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

آہ! سید غزنوی

جناب محمد سعید عابد، قصور

خاندانِ غزنوی کے اے چراغِ بے مثال
برقِ خاطب سے سوا ہے تیری رحلت کا خیال

آنکھ ہے خونبار، دل محزوں، جگر ہے پاش پاش
ایک میرا ہی نہیں، ہیں سینکڑوں دل قاش قاش

محفلِ عرفان و علم و آگہی سونی ہوئی
تو ہوا رخصت تو گویا زندگی سونی ہوئی

تو دیارِ کفر میں پیغامِ حق لے کر چلا
جلد ہی تجھ کو شہادت کا بلاوا آ گیا

تھا سراپا نور مانند سحر تیرا شباب
ولولہ انگیز تھا کیا خوب ہی تیرا خطاب

تھا عیاں تجھ سے تمہارے خانوادے کا کمال
اپنے ابا کا جلال اور اپنے دادے کا جمال
اے علمبردارِ توحیدِ الٰہ تجھ پر سلام
آسمانِ علم کے خورشید و مہ تجھ پر سلام

خاندانِ غزنوی سے تو نہیں رخصت ہوا
خاندانِ غزنوی سے علمِ دیں رخصت ہوا

ہے دعاء عابدِ مغموم مالک کے حضور
دے ٹھکانہ جنت الفردوس میں ربِ غفور

خالق آفاق و انفس بخشش ارزانی کرے
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے (۱)

بیادِ غزنوی

جناب زبیر احمد ظہیر

اسلام کی عظمت کا علمدار اُٹھا ہے
دنیا سے وہ دیدۂ بیدار اُٹھا ہے

وہ علم و فضیلت میں تھا یکتائے زمانہ
اوصاف و کمالات کا گلزار اُٹھا ہے

مشکل سے ہی ملتی ہے یہ دولت بھی کسی کو
کس شوکت و عظمت سے ضیاء بار اُٹھا ہے

اب ہم سے جدا ہو گیا اعمال کا پیکر
اس بزم سے وہ صاحبِ کردار اُٹھا ہے

اب اس کو کوئی ڈھونڈ کے پھر لائے کہاں سے
اسلام کی خدمات کا شاہکار اُٹھا ہے

دل تڑپتا ہے ظہیرؔ اس مہرباں کی موت سے
روح پر ہے کپکپی عزمِ جواں کی موت سے (۲)

---

(۱) ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

(۲) ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

آہ! ابوبکر غزنوی

جناب آغا صادق

رفت از جہانِ خاک ابوبکر غزنوی
سوئے جہانِ پاک ابوبکر غزنوی

عالم، فقیہ، ماہرِ تعلیم نکتہ داں
شُد علم، سینہ چاک ابوبکر غزنوی

آں مردِ حق پرست ابوبکر غزنوی
نباض بود و ہست ابوبکر غزنوی

سرشار بود از خم خمخانۂ الست
صد شیشہ ہا بہ دست ابوبکر غزنوی

فخرِ حدیث نازِ کتاب آبروئے دین
آورد بندگانِ خدا را بکوئے دین

ام الکتاب بر لب او مثلِ گل شگفت
ہر لحہ داشت وردِ زباں گفتگوئے دین

ملتِ زر حلقش ہمہ در ماتمے نشست
آوخ لوائے علم شدہ سرنگوں پست

تاریک شد حریم ادب محفلِ رشاد
چوں آں چراغِ مدرسہ رخت از جہاں بہ بست

آں مردِ پاکباز وریغا جواں گذشت
توحید را زبان و سنن را بیاں گذشت

بوبکر غزنوی ہمہ سرمایۂ وطن
دور از وطن بہ کشورِ انگلیساں گذشت[1]

ابن غزنہ

جناب پروفیسر عثمان خالد یورش صاحب
رئیس شعبۂ علوم وتواریخ گورنمنٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ

ہے جسارت آفریں قائدِ روشن دلیل
راست گو تیرا نفس تیرے شاہِ بارِ جلیل

مستند اِک اِک لفظ ثابت خیالاتِ جمیل
تیریں تقریریں دہر میں ہیں مثالِ سنگِ میل

تیری ہر مساعی رہی وقفِ فروغِ دینِ سلف
تیرا ہر مناظرہ کون و مکان میں مستحیل

فکر و فن جس کے لیے پیدا ہوئے اک تو وہ ہے
گوہرِ یکتا و دیدۂ بینا و پختۂ عقیل

ابن غزنہ پیکرِ عزم و عمل کا تو ستون
سوزِ دل میں کفیل، مردِ مومن سلسبیل

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

حق مغفرت کرے تو سراپا حلیم تھا
"گلدستۂ حدیث" میں دُرِ نسیم تھا①

سید ابوبکر غزنوی

جناب ثناء اللہ زاھدی، گوجرانوالہ

ابوبکر بھی گئے اب غزنوی کی انجمن سے
رخصت ہوئی بہاریں پھولوں کے اس چمن سے

بے کیف ہو گئی ہے غنچوں کی بزم ساری
آباد تھی جو اب تک سرو و گل و سمن سے

پھیل رہی ہیں دامن تاریکیاں جہاں میں
محوِ سکوں ہے مشعل محفل کے بانکپن سے

خاموش ہو گئے ہیں ساز و سرودِ دلکش
اٹھتی نہیں صدائیں ان کی اب اس وطن سے

مرجھا گیا وہ غنچہ گلشن میں اب کے جس نے
نشوونما تھی پائی سورج کی اک کرن سے

اجڑی ہوئی بہاریں ماتم کناں ہیں اب تک
پتیوں پہ جو گری ہیں پہلوئے یاسمن سے

جھونکے صبا کے گلشن میں ڈھونڈتے ہیں نکہت
اٹھتی رہی جو اب تک آغوشِ نسترن سے

① ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

بوسیدہ ہوگئی کیوں گُل کی قبائے رنگیں
صرصر کی شورشوں سے گلشن کے بانکپن سے

اُف سو گئیں وہ لہریں ساحل کی گود میں اب
طوفاں بن کے اٹھیں جو بحرِ موجزن سے [1]

آہ! مولانا ابوبکر غزنوی

جناب راز کاشمیری

بوبکر، آہ! داغ جدائی کا دے گیا
مجھ نغمہ گو کو اذن دہائی کا دے گیا

وہ پتھروں کے درمیاں اک آبشار تھا
دورِ خزاں میں صورتِ ابرِ بہار تھا

فکر و نظر کی وادی میں مہکار اُس سے تھی
نطق و قلم میں شوخیٔ اظہار اُس سے تھی

لہجہ کہ جیسے غنچے چٹکتے ہوں دم بدم
الفاظ یوں کہ موتی ہوں تسبیح کے بہم

سیرت تھی اجلی جیسے تبسم بہار کا
صورت کہ جیسے صبح کے تارے کی ہو ضیاء

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

اسلاف کے نقوش نمایاں تھے ذات میں
اسلام کا تھا رنگ نمایاں صفات میں

غزنی کے ماہ تاب کی ضو پہلی اک کرن
اک پھول جس سے مہکا مرے دیس کا چمن

خلوت میں ذکر وفکر کی رعنائیاں رہیں
جلوت میں عزم و جہد کی تابانیاں رہیں

وہ علم و فضل و دانش و حکمت کا اعتبار
اس دور میں تھا منبر و محراب کا وقار

اک جانثارِ سیدِ خیر الوری (ﷺ) تھا وہ
اک پاک باز بندۂ ربّ علی تھا وہ

آباد اُس کی ذات سے تھی بزمِ دوستاں!
اب ایسے پیارے لوگ زمانے میں ہیں کہاں! [1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (4 جون 1976ء)، ماہنامہ ترجمان الحدیث (جولائی 1976ء) ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

آہ! مولانا سید ابوبکر غزنوی

جناب ڈاکٹر عبدالواحد نقیب

خلقِ خدا شناس وہ مردِ خدا شناس
وہ پیکرِ خلوص و محبت وفا شناس

بغض و حسد، عناد و عداوت سے ناشناس
دارِ فنا سے ہوگیا رخصت بقا شناس

مسلک تھا جس کا دینِ محمد کی پیروی
اک شخص جس کا نام تھا بوبکر غزنوی

عقدہ کشائے علم و بصیرت کہیں جسے
فیضانِ مصطفٰے کی شہادت کہیں جسے

ایقاں نصیب دل کی حرارت کہیں جسے
اک دورِ غزنوی کی علامت کہیں جسے

ہوتا ہے ایسا آدمی پیدا کبھی کبھی
اک شخص جس کا نام تھا بوبکر غزنوی

بیباک مردِ حر کی کہانی کہیں جسے
دریائے علم و فن کی روانی کہیں جسے

بے داغ زندگی کی جوانی کہیں جسے
داؤد غزنوی کی نشانی کہیں جسے

توحید سے ملا تھا جسے نورِ آگہی
اک شخص جس کا نام تھا بوبکر غزنوی

دامن میں لے گیا جو متاعِ غمِ حبیب
قرآں سے جس نے علم کو سمجھا وہ خوش نصیب

شعلہ بیان مقرر و شیریں بیاں خطیب
سنت کا پاسدار وہ اللہ کا نقیب

آتی ہے جس کی یاد تو بڑھتی ہے بے کلی
اک شخص جس کا نام تھا بوبکر غزنوی[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)، ہفت روزہ المنبر (3 تا 9 مئی 1980ء)

آہ! ابوبکر غزنوی

جناب علیم ناصری

دودمانِ غزنوی اے معدنِ علم و یقیں
اے امینِ سرِّ دینِ رحمۃ للعالمین

اے غمِ ابنائے فرخ رو سے مغموم و حزیں
ساری ملت تیرے غم کے ساتھ ہے اندوہگیں

وائے قسمت بجھ گئے سب تیری عظمت کے چراغ
بادۂ عرفاں سے خالی ہو گئے تیرے ایاغ

تیرے سب فرزند تھے توحید و سنت کے نقیب
جن کے دم سے خطۂ پنجاب کے جاگے نصیب

نورِ قال اللہ سے ظلمت گریزاں ہوگئی
سطوتِ قال رسول اللہ (ﷺ) نمایاں ہوگئی

کاروانِ اہلِ حق جب منتشر ہونے لگا
تیرے گھر سے لحنِ داؤدی بنا بانگِ درا

اس نے بخشا آبجو کو اس کی منزل کا نشاں
جس کی اک اک موج میں پنہاں ہیں بحرِ بیکراں

وہ تیرا بوبکر اس گلشن کا سروِ سربلند
علم و عرفاں کے چمن کا اک نہالِ ارجمند

آہ وہ تیری روایاتِ کہن کا پاسدار
سیرت و کردار میں اپنے سلف کی یادگار

خوش خیال و خوش جمال و خوش نگاہ و خوش بیاں
حق پرست و حق سرشت حق پسند و حق نشاں

قوم کے علمی افق پر اک ابھرتا آفتاب
معدنِ توحید و سنت کا درخشاں لعلِ ناب

آہ وہ بھی راہگرائے عالم باقی ہوا
مردِ آفاق آشنا خود بڑھ کے آفاقی ہوا

تیرا دامن حکمت و عرفاں سے خالی ہوگیا
طالع بیدار تیرا دم زدن میں سوگیا

رحلت بوبکر سے تو ہی نہیں سینہ فگار
قوم کا ہر اک دلِ درد آشنا ہے سوگوار

رحمتِ حق اس کی تربت پر رہے سایہ فگن
اس کے قول و فعل پر راضی ہو ربِ ذوالمنن

جنت الفردوس میں اس کو ملے اونچا مقام
ہر طرف سے آرہا ہو حور و غلماں کا سلام

اس کو صدیقوں، شہیدوں کی معیت ہو عطا
یہ فقط میری نہیں ہے، ساری ملت کی دعا

اے حریم غزنوی گہوارۂ صدق و صفا
تو نے برسوں تک دیا ملت کو پیغامِ ہدیٰ

چشمۂ حیواں ترا بے آب ہو کر رہ نہ جائے
سیلِ دوراں میں تیری عظمت رہ نہ جائے

پھر سے عبداللہ جیسا لا کوئی بطلِ جلیل
پھر کوئی جبار جیسا صاحبِ قولِ جمیل

لا کوئی داؤد سا پھر صاحبِ قلب و نظر
عرصۂ علم و عمل کا شہسوار، خود نگر

پھر کوئی بوبکر کا ثانی کہیں سے کر تلاش
پھر سے علم و حکمت و عرفاں کے پیکر تراش

تیرے سب فرزند تھے عالی گوہر عالی جناب
لا کہیں سے ڈھونڈ کر ان شیر مردوں کا جواب[1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (21 مئی 1976ء)، ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

آہ! سید ابوبکر غزنوی

جناب حافظ اللہ رکھا کلیم سیالکوٹی

تیری وفات سے رنجور اپنے بیگانے
سلام شمع رسالت امین کے پروانے

تیری سرشت میں حسنِ کلام صدق و صفا
تیرا مقام کوئی کج کلاہ کیا جانے

یہ اہلِ فکر و نظر میں یگانی تیری
روش روش کے تصدق ہزار فرزانے
خوشہ جبین مروت خوشا یہ عجز و نیاز
نگاہِ ناز سے آباد ہیں یہ ویرانے

کمال علم و ہنر میں اداء حلم تیری
کہ در فراقِ تو از چشمِ تر چہ دامانے

وفورِ زہد پہ شیدا ہیں ساکنانِ فلک
شکستِ فاش عزازیل برملا مانے

لگا کہ آگ سی دل میں وہ ہو گیا روپوش
جنوں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں اس کو دیوانے[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (18 اکتوبر 1976ء)

آہ! پروفیسر سید ابوبکر غزنوی

جناب پروفیسر خالد بزمی

وہ ابوبکر غزنوی مرحوم
ناگہاں مرگ جن کا تھا مقسوم

وہ مرے محسن وہ شفیق استاذ
جن کے اوصاف سب کو ہیں معلوم

وہ تھے ملت میں فیض کا چشمہ
آج اُس فیض سے ہیں ہم محروم

غزنوی صاحب اور خوش ذوقی
دونوں باہم تھے لازم و ملزوم

وہ نہیں ہیں تو چین رخصت ہے
ان کے احباب کیوں نہ ہوں مغموم

یہ حوادث بھی کتنے ظالم ہیں
اور انسان کس قدر مظلوم

ان میں جو خوبیاں تھیں اے بزمی
سب کی سب کس طرح ہوں مرقوم (1)

---

(1) ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

حق پر تھے حق بیاں تھے ابوبکر غزنوی

مولانا عبدالرحمٰن عاجز مالیر کوٹلوی

اک نیک نوجواں تھے ابوبکر غزنوی
نیکی کے قدر داں تھے ابوبکر غزنوی

اک ماہرِ علوم تھے، اک نامور ادیب
اک شمع گمراہاں تھے ابوبکر غزنوی

کرتے تھے دوستوں پہ سدا اپنی جاں نثار
اور جانِ دوستاں تھے ابوبکر غزنوی
جو دین ہے جہاں میں نشانِ رہِ بہشت
اس دین کے نشاں تھے ابوبکر غزنوی

جس دیں کا بزمِ دہر میں اسلام نام ہے
اس دیں کے ترجماں تھے ابوبکر غزنوی

دل میں کسی سے بغض نہ لب پر کوئی گلہ
ہر اک پہ مہرباں تھے ابوبکر غزنوی

منزل کی سمت ہی تھا رواں کاروانِ علم
اور میرِ کارواں تھے ابوبکر غزنوی

جو راہِ مستقیم خدا کی نظر میں ہے
اس راہ پر رواں تھے ابوبکر غزنوی

ذکرِ اللہ ان کا تھا محبوب مشغلہ
اور اس پہ شادماں تھے ابوبکر غزنوی

کلفت زدہ کو دیکھ نہ سکتے تھے آنکھ سے
ہمدردِ بیکساں تھے ابوبکر غزنوی

جو دین پاسبانِ بشر ہے قدم قدم
اس دیں کے پاسباں تھے ابوبکر غزنوی

تھے حق شناس اور تھا حق مقصدِ حیات
حق پر تھے حق بیاں تھے ابوبکر غزنوی

عاجزؔ وہ وقت یاد رہے گا سدا ہمیں
جب اپنے درمیاں تھے ابوبکر غزنوی![1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (28 مئی 1976ء)، ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)، ہفت روزہ المنبر (17 جولائی تا 31 جولا 1987ء)

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ

آہ! سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا عبدالرحمٰن عاجز مالیر کوٹلوی

صورت میں لاجواب ابوبکر غزنوی
سیرت کا ایک باب ابوبکر غزنوی

جو آسمانِ علم پر رخشندہ تر رہا!
ہائے وہ آفتاب ابوبکر غزنوی

خوش شکل وخوش لباس وخوش خلق وخوش مزاج
اک پیکرِ حجاب ابوبکر غزنوی

یہ شدتِ اثر کہ تڑپتے تھے سامعین
کرتے تھے جب خطاب ابوبکر غزنوی

لاریب علمِ دین کے رموز ونکات
گویا تھی اک کتاب ابوبکر غزنوی

اُبھرا تھا بحرِ علم میں اور ایسا مٹ گیا
جیسے کہ اک حباب ابوبکر غزنوی

طلاب علم کیسے نہ روئیں وہ جنہیں
کرتے تھے فیضیاب ابوبکر غزنوی

ہوتی تھی جس سے محفلِ احباب مستنیر
ہائے وہ ماہتاب ابوبکر غزنوی

لندن، کہ تھا جہاں پہ مقدر میں جامِ موت
پہنچے وہاں جناب ابوبکر غزنوی

عاجزؔ کی ہے دُعا رہِ عقبیٰ میں ہر قدم
یا رب ہوں کامیاب ابوبکر غزنوی[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (7 مئی 1976ء)، ہفت روزہ اہلحدیث (14 مئی 1976ء)

سید ابوبکر غزنوی کے انتقال کی خبر سن کر ارتجالاً

جناب احسان دانش

کہاں مقام یہ ہر آدمی کے لیے
کہ موت بن گئی پیغام زندگی کے لیے

قلم اٹھا تھا یونہی ذکرِ سرسری کے لیے
دریچے کھل گئے اسرارِ داخلی کے لیے

میں اس کے میکدۂ علم و فن سے در گزرا
کہیں خودی نہ مچل جائے بے خودی کے لیے

اندھیرے جس سے لرزتے ہوں رات کانپتی ہو
ترس رہی ہے نظر ایسی روشنی کے لیے

وہ اک چاند تھا تاریخِ نو کے ماتھے پر
وہ فرد ایک قبیلہ تھا زندگی کے لیے

گناہ و جرم سے محفوظ تھا ضمیر اُس کا
تھا اس کا قلب فقط علم و آگہی کے لیے

قدم قدم پہ سہی علمِ ظاہری کے چراغ
ترس کہ رہ گئے تعلیم باطنی کے لیے

جو اس نے درس دیا اس سے جاگ اٹھی روحیں
وہ خضر راہ تھا دستور مذہبی کے لیے

کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں کہاں تلاش کریں
جس آدمی میں ہو ایثار آدمی کے لیے

یہاں تو پہلے ہی تھا قحط الرجال یارو
اصول پوچھئے اب کس سے زندگی کے لیے

یہ حادثہ بھی مقدر میں تھا کہ میں دانش
لکھوں گا شعر ابوبکر غزنوی کے لیے [1]

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

جناب ابوبکر غزنوی کی یاد میں

جناب نصیر احمد ناصر سہنسرہ گورایہ

یاد یادِ مہرباں پھر آگئی
آہ میری جاں پھر گھبرا گئی

عاشقوں کا پھر کلیجہ کھا گئی
زندگی کا موت راستہ پا گئی

روتے ہیں بے حال اُف اب کیا کریں
شامتِ اعمال اُف اب کیا کریں

چل بسا وہ آفتابِ زندگی
اب کہاں سے آئے گی تابندگی

بن گئی ہے زندگی شرمندگی
دل شکن ہے یہ ہماری بے بسی

موت العالم موت العالم جانیے
ہے یہ فرمانِ نبی سچ جانیے

اُٹھو گے بھی پڑ رہو گے یا یونہی
نام اُٹھنے کا نہیں لیتے کہیں

نیند ایسی ہے کہ خراٹا نہیں
موت ہے یہ نیند کب ہے بالیقیں

مل گئے ہیں کیسے کیسے خاک میں
موت بھی ہے زندگی کی تاک میں

غزنوی میں اللہ سے ہوں خواستگار
ہو تیری اولاد کا یونہی وقار

رحمتیں ہوں تیری تربت پر ہزار
بلکہ ناصرؔ رحمتیں ہوں بے شمار

خاندان کا یہ دیا روشن رہے
پھیلتا ہوں علم کا دامن رہے[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

موت بھی بس نیک لوگوں کا لگاتی ہے سراغ

مولانا محمد ابراہیم صاحب (فاضل فارسی، فتوحی والہ ضلع لاہور)

چل بسا بوبکر سب چھوڑ کر یہ باغ وراغ
موت بھی بس نیک لوگوں کا لگاتی ہے سراغ

مدتوں سے جس سے روشن ہو رہے آفاق تھے
خاندان غزنوی کا بجھ گیا ہے وہ چراغ

قوم کو جبکہ ضرورت نیک فرزندوں کی تھی
عین ایسے موقع پر وہ دے گیا فرقت کا داغ

تشنگانِ علم و فن اب ساقیا ڈھونڈیں کسے
علم کی ئے کے جو بھر کے پلائے گا ایاغ

تقریر اس کی پُرمغز، تحریر اس کی دل نواز
مذاکرات اس کے مؤثر، منفرد اس کا بلاغ

اس کے علم و فضل کا دنیا میں وہ شہرہ ہوا
کہ مجلسوں میں جانے کا بھی کم ہی ملتا تھا فراغ

وہ بھانپ لیتا تھا کفر کی سازشی تدبیر کو
قدرتِ کامل نے اس کو دے دیا تھا وہ دماغ

نالہ شب اللہ والوں کا بھی ہے کیا اثر خیز
کہ دے گیا رنگت بزرگوں کی دعاؤں کا صباغ

شاہین صفت انسان تو ہیں اس جہاں سے اٹھ رہے
اور ان کی خالی جگہ پر اب آ رہے ہیں زغن و زاغ (1)

بیادِ مولانا ابوبکر غزنوی مرحوم

پروفیسر اسرار احمد سہاروی

زندگی موت کا شکار ہوئی
چیز کیا تھی کہاں نثار ہوئی

کس کا پیغام لے کے موت آئی
جان کنی باعثِ قرار ہوئی

نوجوانی میں ترکِ دنیا کی
بات کیا تم کو ناگوار ہوئی

روشنی دین کی ہوئی مدھم
تم کو دنیا نہ سازگار ہوئی

علم و فن کی قبا نہ راس آئی
یہ قبا کیسی تار تار ہوئی

(1) ہفت روزہ الاعتصام (4 جون 1976ء)

ایک شمع تھی زندگی اُن کی
حادثے کا کہاں شکار ہوئی

دوسروں کے لئے جو تھی گلشن
وہ زمیں ان کو نوکِ خار ہوئی

اُن کی صورت نظر نہ آئے گی
خاکِ رہ اُن کی پردہ دار ہوئی

ایک دریا تھا علم کا نہ رہا
بزمِ دین آج سوگوار ہوئی

تھی خطابت کمالِ گویائی
خاموشی اُن کا اب شعار ہوئی

اتنی جلدی تھی کیا سفر کی ابھی
کس کی تاکید بار بار ہوئی

پھول اپنے چمن کا مُرجھایا
زندگی اپنی خارزار ہوئی

تھا تبسم لبوں پہ وقتِ سفر
آخرت کیسی خوشگوار ہوئی

مر کے وہ شہید کہلائے
مرگِ عاشق پیامِ یار ہوئی

زندگی علم کی طلب میں کٹی
اور اُسی کے لئے نثار ہوئی

کیوں عزیزوں سے منہ موڑ لیا
اُن کی کیا بات ناگوار ہوئی

غم کے بادل دلوں پہ چھائے ہیں
بے دلی اپنی غم گسار ہوئی

آپ جنت میں خوش ہیں مولانا
زندگی اپنی دِلفگار ہوئی[1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (14 اپریل 1978ء)

ایک المیہ!! ایک درد!!

دوستو! ہمارے بزرگوں کی تصانیف کو دیمک چاٹ رہا ہے۔ ہم میں سے کوئی نہیں، جو ان بزرگوں کے حالاتِ زندگی کو ضبطِ تحریر میں لائے۔ عظیم شخصیتیں تمہارے ہاں گزری ہیں۔ لوگوں نے اپنے بزرگوں کے خادموں کے حالاتِ زندگی بھی لکھ ڈالے۔ تم کو کیا ہوا کہ جن لوگوں نے ساٹھ ساٹھ برس تک تمہاری بے لوث خدمت کی، ان پر قلم اُٹھانے کے لیے تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔ تمہیں الیکشن جیتنے اور ہارنے کا ایسا لپکا پڑ گیا ہے کہ اور کسی بات کا تمہیں ہوش باقی نہیں رہا۔ تمہاری درس گاہیں بنجر ہو گئیں، بانجھ ہو گئیں۔ ان درس گاہوں سے اب کوئی مولانا ثناء اللہ رحمہ اللہ پیدا نہیں ہوتے، کوئی مولانا ابراہیم سیالکوٹی رحمہ اللہ پیدا نہیں ہوتے، کوئی داؤد غزنوی رحمہ اللہ پیدا نہیں ہوتے۔ نہ اہلِ قلم پیدا ہوتے ہیں، نہ مقرر پیدا ہوتے ہیں، نہ محقق پیدا ہوتے ہیں اور یہ باتیں تمھیں غور کی دوستو۔ تم دن رات اُکھاڑ پچھاڑ میں لگے رہتے ہو۔ یہ کیا زندگی ہے جو تم نے اختیار کر رکھی ہے۔ آہ! کس قدر درد ہے میرے سینے میں جس کا اظہار کر رہا ہوں اور اس تلخ نوائی کے لیے آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ (تقاریر و خطبات، ص:20)

(باب نہم)

تحریری و تقریری افادات

میں الحاد سے اسلام تک کیسے پہنچا؟

خطاب: سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ

14 مارچ 1965ء (11 ذی قعدہ 1384ھ) کو جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں ایک اہم اجلاس منعقد کیا گیا جس میں دیگر علماء کے علاوہ خاندانِ غزنویہ کے عظیم سپوت پروفیسر سید ابوبکر غزنوی نے بھی خطاب فرمایا۔ اس اجلاس کی مفصل روداد ''المنبر'' میں شائع ہوئی، اسی روداد میں سے سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے خطاب کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

جب میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی ہوئی تو یکا یک میرے اعتقادات میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی اور اسلامی عقائد کے متعلق میرے دل میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اُبھرنے شروع ہوئے۔ مثلاً یہ کائنات معرضِ وجود میں کیسے آئی؟ وہ ہستی جو ناقابلِ ادراک ہے، وہ ہستی جو حواس کی گرفت میں نہیں آتی، وہ اگر خالقِ کائنات ہے تو خود کیوں خالق ازلی ہے؟ خود روح کی حقیقت کیا ہے؟ کیا مادہ سے ہٹ کر روح کا کوئی وجود ہے بھی کہ نہیں؟ حیات بعد الموت کیا ہے؟ وحی و تنزیل کی حقیقت کیا ہے؟ جب خدا غیر مرئی ہے۔ ملائکہ غیر مرئی اور غیر مشہود اور وحی و تنزیل غیر مرئی ہیں تو پھر عوام سے ان کے ماننے کا مطالبہ کیوں؟...... آہستہ آہستہ شکوک و شبہات کے ان کانٹوں کی چبھن ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ میں نے چاہا کہ عقل کے راستے ان کی حقیقت تک پہنچوں لیکن عقل ان مابعد الطبیعات حقائق کو ماننے کی طرف راغب نہیں تھی۔

برٹن رسل کا طالب علم ہونے کی وجہ سے میرا یہ نظریہ تھا کہ کسی حقیقت کا انکار یا اقرار کرنے سے پہلے اس کا مالہ وما علیہ کے متعلق جتنا ڈیٹا [مواد] ہو اسے اکٹھا کر لیا جائے اور پھر اس کے دونوں پہلوؤں کو اچھی طرح جانچنے کے بعد اس کو مانا جائے یا ٹھکرایا جائے۔ میرے جی نے کہا کہ تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ تم ان لاکھوں لوگوں کی باتوں کو ٹھکرا دو جنہوں نے ان حقائق کو تسلیم کیا۔ ان میں سے اکثر و بیشتر فلسفہ کی راہ سے ان حقائق تک پہنچے اور ان میں سے اکثر بڑے بڑے ذہین اور عبقری تسلیم کئے گئے ہیں۔ ان میں شاہ ولی اللہ، حضرت علی ہجویری، حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہم) جیسی ہستیاں بھی شامل ہیں۔ چنانچہ میں نے ان حضرات کی تصوف اور طریقت کے متعلق لکھی ہوئی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ میں نے دیکھا کہ جس راستے سے یہ سب حضرات دعوت دیتے ہیں وہ محض پڑھنے پڑھانے کا راستہ نہیں بلکہ علمی تجزیہ کا راستہ ہے۔ میں طے کیا کہ اس راستہ سے گزرا جائے اور میں اس وقت بھی متشکک تھا کہ شاید کوئی

اور راہ نکل آئے۔ میں نے دیکھا کہ اس راستہ سے گزرنے کے لئے بھی ایک استاد کی ضرورت ہے اور یہ سب حضرات اس پر متفق ہیں۔ چنانچہ میں نے اصحابِ طریقت سے ملاقاتیں کیں اور میں نے ان کتابوں میں پڑھا تھا کہ اس راہ کی پہلی منزل فنائے نفس ہے، یعنی کہ اپنے نفس کی محبت بالکل ختم ہو جائے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان اصحابِ طریقت میں سے اکثر کے متعلق جب میں نے تجزیہ کیا تو مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ ان میں سے اکثر نے اپنے سینوں میں کبر ونخوت اور رعونت کے موٹے موٹے سانپ پال رکھے ہیں اور پھر اس پر سیا کی چشمکیں اللہ اکبر۔

اس دوران میں اللہ تعالیٰ کے چند اسمائے صفاتی کا ذکر کرتا رہا اور آدمی کی تلاش میں رہا اور اللہ تعالیٰ سے کرتا رہا کہ اے اللہ مجھ پر اپنی راہیں کھول دے۔ اسی دوران میری ملاقات ایک غیر معروف درویش سے ہوئی جس کی کوئی گدی نہ تھی بلکہ ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ میں نے اس سے جب اس موضوع پر گفتگو کی اور حسبِ عادت ان کا تجزیہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ کتابوں میں فنائے نفس کی جو پہلی نشانی بیان کی گئی ہے وہ ان کے ہاں موجود ہے۔ میں نے ان کی انانیت سے یہ دیکھنے کے لئے چھیڑ چھاڑ کی کہ وہ اُبھر کر مجھ سے جھگڑتی ہے کہ نہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ وہ پہلے بزرگ تھے جن میں انانیت کا شائبہ تک نہ تھا۔

میں نے ان بزرگ کے حسبِ ارشاد اسمِ ذات کا ورد شروع کیا۔ اسم ذات پڑھتے ہوئے مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اس میں ایک ایسا سرور اور ایک ایسا جذب، ایک ایسی کیفیت، ایک ایسی لذت مجھے حاصل ہوئی جس سے میں اس سے پہلے آشنا نہ تھا۔ میں نے اس لذت کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی کہ اس لذت کے ترکیبی عناصر کیا ہیں؟ میں نے محسوس کیا کہ یہ لذت محض داخلی نہیں بلکہ اس میں کچھ خارجیت بھی ہے یعنی اس میں محض Subjectivity نہیں بلکہ Objectivity بھی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ وہی شے ہے جسے حدیث میں رحمت یا سکینت کہتے ہیں، جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ:

لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُونَ اللهَ عَزَّوَجَلَّ إِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَنَزَلَتْ عليهِمِ السَّكِينَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللهُ فِيمَن عِنْدَهُ.

یعنی ”جب بھی کچھ لوگ اس لئے اکٹھے ہو کر بیٹھتے ہیں کہ اللہ کا ذکر کریں تو فرشتے ان کا احاطہ کر لیتے ہیں اور رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے اور سکینت ان پر نازل ہوتی ہے۔“

حدیث شریف پڑھتے وقت ہم لوگ سمجھا کرتے تھے کہ سکینت سے مراد اطمینان اور سکون ہوگا۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے کچھ تعجب ہوا جب میں نے اس لذت کے ترکیبی عناصر کا تجزیہ کیا اور محسوس کیا کہ اس میں محض داخلیت نہیں بلکہ خارجیت بھی ہے۔ یہ ایک ایسا جوہر ہے جس کا ورود میرے دل پر ہو رہا ہے جس کو حدیث کی بولی میں رحمت اور سکینت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جب رحمت کا یہ ورود میرے دل پر ہونے لگا، میں نے محسوس کیا کہ میں برٹن رسل کی جو باتیں اس کی کتابوں میں پڑھا کرتا تھا وہ غلط تھیں۔ میں نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں پڑھا تھا کہ عالمِ جبروت میں آگہی حاصل کرنے کے لئے ذکر سے افضل کوئی چیز نہیں۔ تو اس راہ میں جوں جوں آدمی آگے بڑھتا ہے، مابعد الطبیعاتی حقائق اس پر منکشف ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ میں ان مشاہدات سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ روح سے ہٹ کر بھی اپنا وجود ہے اور حیات بعد الموت، ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔

میرا خطاب ان لوگوں سے ہے جو شکوک وشبہات کی ان بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ اگر وہ اس راہ پر چلیں تو تمام شکوک خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ جب انسان پر اس راہ میں کوئی القاء بھی ہو جائے اور پھر اس کا ظہور بھی ہو جائے تو انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جب مجھ جیسا کمینہ انسان چند دن اللہ تعالیٰ کا نام لے تو اس پر یہ کیفیتیں طاری ہو سکتی ہیں تو وہ لوگ جو نفوسِ قدسیہ تھے، وہ لوگ جن کی زندگی سراپا پاکیزگی تھی تو وہ لوگ اگر وحی وتنزیل کے مہبط ہوئے تو بجا طور پر وہ مہبط ہوئے ہوں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کشف وشہود میں کبھی غلطی نہیں ہوتی اور نہ میں اس وقت اس مسئلہ کا تجزیہ کرنے بیٹھا ہوں بلکہ میں تو اپنے وہ تاثرات ومشاہدات اور وہ باتیں بیان کرنے حاضر ہوا ہوں جن سے میری تشفی ہوگئی۔ ان اسباق کے لینے اور ان مشاہدات سے یہ حقیقت مجھ پر واضح ہوگئی کہ ان کتابوں میں ہم جو باتیں پڑھتے تھے، لوگ محض ایک حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر وہ باتیں کرتے ہیں اور یہ حقیقت مجھ پر واضح ہوگئی کہ تمام روحانی بیماریوں اور تمام شکوک وشبہات کا علاج خصوصاً ان بیماریوں کا جو مابعد الطبیعات سے تعلق رکھتی ہیں، ذکر الٰہی اور صحبتِ اہل اللہ ہے۔ یہی وہ کبریتِ احمر ہے جو اکسیرِ اعظم ہے، نہ محض ذکر سے بات بنتی ہے اور نہ محض صحبت سے، بلکہ ذکر وصحبت دونوں کی یکجائی سے تزکیۂ نفس حاصل ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] ہفت روزہ المنبر (19 مارچ 1965ء)

اربابِ صفا کس حال میں تھے؟

حضرت میاں سیّد نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت عبداللہ غزنوی علیہ الرحمہ، مولانا غلام رسول رحمۃ اللہ علیہ قلعہ والے

1857ء کی ہولناک تباہی کے ایام میں اگر مجھے اپنے احباب کے حالات کی تلاش ہے تو یہ ایک طبعی سی بات ہے جب بھی کوئی ہمہ گیر آفت ٹوٹتی ہے، ہر شخص اپنے احباب کی خبر لینے کے لئے بے تاب ہو ہی جاتا ہے۔ میاں نذیر حسین صاحب اس وقت کس عالم میں تھے؟ حضرت عبداللہ غزنوی علیہ الرحمہ اور مولانا غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تو اس وقت دہلی ہی میں تھے اور ان کے حلقۂ درس میں شریک تھے۔ اس ہنگامۂ دار و گیر میں ان اربابِ صدق و صفاء کا کیا حال رہا؟

عین اس وقت جبکہ دہلی آگ اور خون کی لپیٹ میں آ چکی تھی، ہراس اور سراسیمگی ہر سو پھیلی ہوئی تھی اور ہر شخص مال و جان کے غم میں گھل رہا تھا، میاں نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسجد اورنگ آبادی میں ٹاٹ پر بیٹھے سی گھمبیر آواز میں قال قال رسول اللہ ﷺ کی صدائیں پیہم بلند کرتے رہے اور حضرت عبداللہ علیہ الرحمہ اور مولوی غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان سے پیہم مستفید ہوتے رہے۔ حضرت عبداللہ غزنوی علیہ الرحمہ خود فرماتے ہیں:

بخدمت خاتم المحدثین شیخنا سید نذیر حسین صاحب رسیدم و کتاب صحیح بخاری شروع نمودم دراں میاں بلوائے دہلی شروع شد۔ درحین بلوائے شدید کہ ہر کس بہ غم جان خود بود من بخواندن کتاب مذکور۔ (1)

یعنی جب سخت بلوا ہوا اور ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا، مجھے صحیح بخاری پڑھنے سے فرصت نہ تھی۔ ؎

مصلحت دین من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند

ہاں انھیں اپنی جان کا غم نہ تھا اس لئے کہ وہ ان اربابِ کمال میں سے تھے جن کی روحیں سرمدی اور لافانی ہوتی ہیں اور موت کا پنجہ جن کی 'حیات' پر نہیں چل سکتا ہے۔ ہاں وہ موت سے خائف نہ تھے۔ اس لئے کہ وہ مقامِ ولایت کے اس ذروۂ علیا پہ سرفراز تھے جہاں موت و حیات کے سربستہ راز منکشف ہو جاتے ہیں۔

مولوی غلام رسول صاحب لکھتے ہیں کہ جب فساد کی آگ بھڑک اٹھی، خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا اور ہر شخص کی

---

(1) الحیاۃ بعد المماۃ، ص: 272

زبان پر اپنے مال کی تباہی اور احباب سے جدائی کی کہانی تھی تو آپ فرماتے: مارا ایک فکر است کہ مبادا بے یاد مولائے خود جاں بجاں آفریں بدہم و بغفلت روح پرواز کند۔ (۱)

یہی ہیں وہ بندگانِ الٰہی جن کی نظر میں خدا کی یاد سے ایک لمحہ کے لئے غافل ہونا بھی معصیت ہے۔ ؎

صرف عصیاں ہوا وہ لحظہ عمر
جو تری یاد میں بسر نہ ہوا

انھیں اگر غم تھا تو صرف اسی بات کا کہ کہیں بارگاہِ الٰہی سے غیر حاضر نہ ہو جائیں، اور آرزو تھی تو صرف اسی بات کی کہ موت آئے تو حضور کے عالم میں آئے۔ ؎

منم و ہمیں تمنا کہ بہ وقتِ جاں سپردن
بہ رُخِ تو دیدہ باشم تو درونِ دیدہ باشی

جب دہلی سے نکلنا ممکن ہو گیا تو بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے قافلے شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ آپ نے اس وقت فرمایا تھا:

مانمی رویم ہر چہ بادا باد۔ شاید کہ امتحان رسیدہ باشد و عند الامتحان یکرم الرجل او یہان۔ (۲)

"یعنی ہم نہ جائیں گے، جو ہونا ہے ہو جائے۔ شاید امتحاں کا وقت آن پہنچا ہے اور آزمائش ہی کے وقت آدمی عزیز یا ذلیل ہوتا ہے۔"

ان دنوں آپ نجم الدین کبریٰ قدس اللہ سرہٗ کا واقعہ سنایا کرتے کہ جب تاتاریوں نے خوارزم میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا تو آپ اس وقت وہیں تھے۔ آپ نے اپنے مریدوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ تم اپنے وطنوں کو لوٹ جاؤ۔ مریدوں نے التماس کی کہ اگر اجازت ہو تو آپ کے لئے بھی سواری کا انتظام کیا جائے۔ آپ نے فرمایا: "مرا اذن نیست کہ بیرون روم" ...... آپ وہیں رہے اور تاتاریوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ (۳)

جب لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ حد سے گزر گئی تو میاں صاحب کا ذہنی سکون بھی ہل گیا تھا اور وہ مضطرب ہو ہو کر ایک ایک سے شہر کی تباہی و بربادی کا حال سنتے۔ ان کا یہ اضطراب حضرت علیہ الرحمہ کو ناگوار گزرتا اور آپ فرماتے:

معلوم نیست مولوی صاحب را چہ شدست کہ ہمہ روز بسخنہائے ایں و آں می گزارند، ایام فتن است بایستی کہ صحیح

---

(۱) مخطوطہ مؤلفہ مولوی غلام رسول صاحب

(۲) مخطوطہ مولوی غلام رسول صاحب

(۳) نفحات الانس میں مولانا جامی رحمہ اللہ نے یہ واقعہ تفصیل سے لکھا ہے۔ ص: 379

بخاری می خواندیم و بمولائے خود پرداختیم۔ (۱)

وہ حضرت علیہ الرحمہ ہی کا وجود گرامی تھا کہ اس ہنگامۂ رستاخیز میں "﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ﴾ کی مثل تفسیر بن گیا تھا۔ وہ انہی کی ذاتِ اقدس تھی جس کے دامن وقار پر ہمیں اضطراب کا ایک ہلکا سا داغ اور غم کی ایک ہلکی سی چھینٹ بھی نظر نہیں آتی ہے۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

﴿ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝﴾ (فصلت:30، 31)

اور ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝﴾ (الرحمٰن:46)

امام ابن تیمیہ کی یہ بات جنتان کا مفہوم سمجھانے کے لئے بس کرتی ہے:

ان فی الدنیا جنة من لم یدخلها لم یدخل جنة الآخرة. (۲)

یہ سکون و راحت، قلب اور جمعیت خاطر ہی کی بہشت تھی جس میں داخل ہونے کے بعد حضرت علیہ الرحمہ کے جی میں غم کی ایک چبھن اور اضطراب کی کوئی خلش باقی نہیں رہی تھی۔

امام عبدالجبار غزنوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ ایک بار حضرت علیہ الرحمہ کے ارادت مندوں میں سے کوئی شخص آپ کے پاس کسی بات کی شکایت لے کر گیا تو آپ نے فرمایا:

من در دنیا نیستم۔ فقط بظاہر بدن مرا شما در دنیا مشاہدہ مے کنید ورنہ من در آخرت ہستم۔ (۳)

''میں دنیا میں نہیں ہوں۔ تم محض میرا جسم دنیا میں دیکھتے ہو، ورنہ میں عقبیٰ میں رہتا ہوں۔''

یہ لکھنے کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں:

ہمچنیں بود بجز دررویت او یاد خدا می آمد و بہ نشستن ہمراہش ہمہ خطرات وغموم ہباء منثوراً می شدند۔

''یعنی بات یونہی تھی۔ محض انھیں دیکھنے سے خدا یاد آتا تھا، اور ان کے پاس بیٹھنے سے رنج والم کا غبار چھٹ جاتا تھا۔''

یہ جو آپ نے فرمایا کہ ''من در آخرت ہستم'' تو اس کی تصدیق زمانۂ تحریکِ آزادی کے ایک واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ مولوی غلام رسول صاحب فرماتے تھے کہ

---

(۱) مخطوطہ مولوی غلام رسول صاحب

(۲) الوابل الصیب من الکلم الطیب (ت: مصطفی بن العدوی)، ص: 75

(۳) مخطوطہ مؤلف مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ، ص: 28

حضرت علیہ الرحمہ اور میں مسجد میں بیٹھے تھے۔ مسجد کی دیواروں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور آپ مجھ سے پوچھتے تھے: عبداللہ [1] یہ کیا ہو رہا ہے؟ [2]

اہل زمین غریب ہیں ہم نکتہ چیں نہ ہو
آتے ہیں گاہ گاہ یہاں آسماں سے ہم

(۲)

انگریزوں کے مظالم سے تنگ آ کر جب انقلابیوں کے غم وغصہ کا لاوا پھوٹا تو وہ عورتوں اور بچوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے لگے۔ غالب نے اس سفاکی کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ اس دلخراش منظر کا نقشہ دستنبو میں یوں کھینچتا ہے:

”کیسی کیسی پری چہرہ، نازک اندام خاتونانِ فرنگ خاک وخون میں لتھڑ گئیں۔ افسوس ان کے چھوٹے چھوٹے بچے جن کے کھلکھلاتے ہوئے چہرے لالہ وگل پہ خندہ زن تھے اور جن کی خوش خرامی چکور کو شرماتی تھی۔ کس طرح تیغ بے دریغ کی نذر ہوئے۔ اگر موت ان کی لاشوں کے سرہانے ماتم میں سیہ پوش ہو کر آہ وزاری کرے تو روا ہے۔“ (ترجمہ) [3]

یہ تو ایک شاعر کے حساس دل کا تاثر تھا۔ اگر دینی اعتبار سے دیکھا جائے تو عورتوں اور بچوں کا قتل اسلامی تعلیمات سے ایک کھلا ہوا انحراف تھا۔ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام جنگ میں شریک ہونے والوں کو نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ:

لا تقتلوا شيخًا فانيًا ولا طفلًا صغيرًا ولا امرأةً. (رواہ ابوداؤد)

خلفائے راشدین کی سنت بھی یہی رہی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب شام کی طرف لشکر بھیجا تو یزید بن ابی سفیان کو نصیحت کی تھی کہ:

لا تقتلوا امرأةً ولا صبيًا ولا كبيرًا اهرمًا. (رواہ مالک)

مولوی غلام رسول صاحب نے عورتوں اور بچوں کے لاشے دیکھ کر کہا تھا کہ جانے اب ہندوستان کب تک غلام رہے ...... کہ لوگ عورتوں اور بچوں پر ظلم ڈھانے لگے ہیں......

گویا مولوی صاحب کی نظر میں ظلم ہندوستان کی غلامی کی ایک علت ٹھہرا اور یہ ایک فراست ایمانی کی بات تھی۔ ہم ہر معلول کی ظاہری اور مادی علل تو ڈھونڈتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ فطرت کے کچھ معنوی اور باطنی قوامیس بھی ہیں،

---

[1] آپ مولوی غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو عبداللہ کہہ کر پکارتے تھے۔

[2] سوانح حیات مولوی غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ مؤلفہ مولوی عبدالقادر مرحوم۔

[3] غالب: مولانا غلام رسول مہر، ص: 177

اور وہ بالکل ان مادی قوانین کی طرح اٹل اور غیر مبدل ہیں۔ تمہیں کیا خبر ہے کہ انقلاب کی ناکامی کے ظاہری اسباب کے ساتھ ان باطنی اور معنوی اسباب کا ہاتھ کہاں تک تھا۔

مسجد اورنگ آبادی کے اس طائفہ اہل حق نے بھی ایک مظلوم انگریز خاتون کی جان بچائی تھی جس کا نام مسز لی سنس (Mrs lae sons) تھا۔ واقعہ کی تفصیلات دلچسپ بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی۔

ایک دن میاں صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر شہر کی حالت زار دیکھنے کے لئے باہر نکلے آپ لاہوری دروازہ کے قریب پہنچے تو کسی کے کراہنے کی آواز سنی۔ آپ لوگ قریب گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک انگریز عورت زخموں سے چور اور خون میں لتھڑی ہوئی ہے۔ ان مسلمانوں کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ کہنے لگی: خدا کے لئے مجھے نہ مارو۔ میاں صاحب نے اسے دلاسا دیا اور کہا: ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے مذہب میں لڑائی کے وقت بھی دشمن کی عورتوں، بچوں، بڈھوں پر ہاتھ اٹھانا حرام ہے۔ تم گھبراؤ نہیں اور اگر چاہو تو ہم تجھے اپنے گھر لے چلیں اور تیرے زخموں کا علاج کریں۔ وہ بہت ہی سہمی ہوئی تھی۔ کہنے لگی: اول تو میں چلنے کے قابل ہی نہیں ہوں اور اگر تم مجھے اٹھا کر بھی لے چلو تو باغیوں کی گولی سے ہم نہیں بچ سکتے ہیں۔

میاں صاحب نے فرمایا: اچھا ہم لوگ تجھ سے کچھ دور ٹھہرتے ہیں۔ رات کا اندھیرا چھا گیا تو اسے اٹھوا کر ایک بے آباد راستے سے گھر لے آئے۔ اپنی اہلیہ سے کہا: یہ بچاری مظلوم ہے۔ اس کی خدمت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی ہے۔ عورتوں نے اس کے زخم دھوئے، مرہم پٹی کی اور تیمارداری میں لگ گئیں۔ [1]

اس بات کی بھنک انقلابیوں کے کان میں پڑی تو مکان پر دھاوا بول دیا۔ وہ گھر کے دروازے زور زور سے کھٹکھٹا رہے تھے اور حلق پھاڑ پھاڑ کر دین دین کے نعرے لگا رہے تھے۔ عورتیں بے چاری دبک کر رہ گئیں۔ مردوں کو ایک تدبیر سوجھی۔ گھر میں اوپلوں کی ایک کوٹھڑی تھی۔ اس کوٹھڑی میں انگریز خاتون کو لٹا کر اوپر سے اپلے چن دیئے اور کوٹھڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ اس حالت کا نقشہ علامہ راشد الخیری نے اپنے مخصوص انداز میں کھینچا ہے:

رات کے تین بجے رہے ہیں اور چودھویں کا چاند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ پندرہ بیس آدمی مولوی صاحب کے گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔ تلواریں اور بلم صاحب خانہ کے سر پر چمک رہے ہیں اور دشمن عورتوں کے سامنے ناشائستہ الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ مولانا خاموش ہیں، عورتیں اللہ اللہ کر رہی ہیں، بچے رو رہے ہیں اور لڑکے حسرت سے باغیوں کا منہ تک رہے ہیں۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا کہ اوپلوں کی کوٹھڑی کھلی اور وہ جفا کار اس میں داخل ہوئے۔ آج کے مسلمان اسے اتفاق محض سے تعبیر کر رہے ہیں۔ میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ حاکمِ حقیقی ہر نیک کام میں اپنے بندوں پر رحمت کے پھول برسا کر دنیا کو دکھا دیتا ہے کہ کس طرح اس کا کرم شامل حال ہوتا ہے۔ خدا کا فضل ایک نہیں

[1] دیکھئے الحیاۃ بعد المماۃ، ص: 78

پندرہ بیس آنکھوں پر پردہ بن کر پڑا اور چاروں طرف دیکھ بھال کر باغی چیختے پیٹتے واپس ہوئے۔①

ساڑھے تین مہینے مسز لی سنس میاں صاحب کے ہاں رہی۔ اس کے زخم بھر چکے تھے اور وہ بالکل توانا ہو گئی تھی۔ پھر اسے انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ اسے انقلابیوں سے بچا کر انگریزی کیمپ تک پہنچانا کٹھن بات تھی۔ ایک بگھی منگوائی گئی۔ اس میں میاں صاحب کے گھرانے کی دو چار عورتیں اور کچھ بچے بٹھا دیئے گئے۔ ان سب کے بیچ میں مسز لی سنس بیٹھ گئی اور دونوں طرف پردہ کھینچ دیا گیا۔ لاہوری دروازہ پہنچے تو پہرہ والوں نے پردہ اٹھا کر تلاشی لینی چاہی۔ ان سے کہا گیا کہ میاں! مولویوں کی بہو بیٹیاں ہیں، تلاشی کیا لیتے ہو۔ ابھی چھ گھڑی رات کی توپ سے پہلے لوٹ آتی ہیں۔ مولویوں کا نام سن کر پہرہ والوں نے کاوش نہ کی اور بگھی کو گزر جانے دیا۔②

یہ کہانی مختصر بھی کہی جا سکتی تھی مگر یہ میرے جدِ اعظم اور جد بزرگوار کے استاذ مکرم کی کہانی ہے۔

من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را③

بعض واقعہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مسز لی سنس کی جان مولوی عبدالقادر (ڈپٹی نذیر احمد کے خسر) نے بچائی تھی۔ مولوی غلام رسول صاحب (قلعہ والے) کے صاحبزادے مولوی عبدالقادر نے ایک انگریز عورت کی جان بچانے کا ایسا ہی واقعہ حضرت عبداللہ غزنوی علیہ الرحمہ اور اپنے والد بزرگوار کے بارے میں لکھا ہے۔

بات یہ ہے کہ میاں صاحب اور مولوی عبدالقادر دونوں پنجابی کٹرہ ہی میں آباد تھے۔ ان کے گھر مسجد اورنگ آبادی کے ساتھ ہی تھے۔ حضرت عبداللہ غزنوی علیہ الرحمہ اور مولوی غلام رسول صاحب مسجد اورنگ آبادی میں قیام فرما رہے تھے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ سب لوگ عصر کی نماز پڑھ کر اکٹھے نکلے تھے اور یہ ایک ہی واقعہ تھا جس میں یہ سب حضرات شریک تھے۔

اس واقعہ کی بعض تفصیلات کے بارے میں واقعہ نگاروں نے اختلاف کیا ہے۔ مثلاً علامہ راشد الخیری لکھتے ہیں کہ مسز لی سنس سترھویں روز آپ لوگوں سے رخصت ہو گئی۔

لیکن دہلی کے کمشنر مسٹر واٹر فیلڈ کی تحریر اس بارے میں زیادہ مستند ہے، وہ لکھتا ہے:

مولوی نذیر حسین، ان کے صاحبزادے مولوی شریف حسین اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد مسز لی سنس کی جان بچانے کے باعث ہوئے۔ ان لوگوں نے اس کے زخموں کا علاج کیا اور ساڑھے تین مہینے اپنے گھر میں رکھا۔ پھر دہلی کے انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا۔

---

① دلی کی آخری بہار، ص: 44

② ملاحظہ کیجئے حیات النذیر ص 43 اور واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول ص 735

③ میں نے ذوقِ حضوری سے داستان کو طول دیا ہے۔

میجر جی۔اے ینگ کمشنر نے واٹر فیلڈ کی تحریر کی تصدیق کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ وہ خود مسز لی سنس سے ملا ہے اور وہ اس تحریر کی مندرجات کی تصدیق کرتی تھی۔ یہ دونوں تحریریں الحیاۃ بعد المماۃ میں موجود ہیں۔ (۱)

ایک اہم بات اس بارے میں ابھی باقی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میاں صاحب نے برٹش گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور اس سے انعام واکرام پانے کے لئے اس عورت کی جان بچائی تھی۔

یاد رہے کہ میاں صاحب کا نام کاسہ لیساں فرنگ کی فہرست میں کبھی نہیں رہا ہے۔ انھوں نے ساری زندگی میں انگریز کی قطعاً کوئی خدمت سرانجام نہیں دی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سیاست سے الگ تھلگ رہے اور قرآن وحدیث کی خدمت میں ڈوبے رہے مگر اس سے یہ بات کہاں ثابت ہوتی ہے کہ وہ انگریز کے وفادار تھے۔ انھوں نے اس عورت کی جان محض اس لئے بچائی تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ عورتوں اور بچوں پر مت ہاتھ اٹھاؤ۔ انہوں نے اپنی اہلیہ سے بھی یہی کہا تھا: اس عورت کی دلجوئی کرو کہ اسی میں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خوشنودی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انگریز نے میاں صاحب کے اس عمل کو لائلٹی (Loyalty) سے تعبیر کیا، مگر یہ تعبیر تو انگریز کی ہوئی۔ انگریز کی اس غلط تعبیر سے میاں صاحب کی نیت پر تو کوئی حرف نہیں آتا ہے اور یہ الزام کہ یہ سب کچھ محض انعام واکرام پانے کے لئے تھا، تو بڑا ہی بودا الزام ہے۔

کیا وہ مردِ درویش جو زندگی بھر مال وجاہ دنیوی سے یکسر بے نیاز رہا، فقر وفاقہ کی سختیاں جھیلتا رہا اور کھردری چٹائی پر بیٹھ کر پیہم ساٹھ برس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائیں بلند کرتا رہا۔ کیا وہ فقیر بے نیاز جس نے بھوپال کی قضائے ریاست کا عہدہ محض اس لئے ٹھکرا دیا کہ اس کے جانے کے بعد یہ غریب طلبہ کہاں سر پھوڑیں گے اور اس حلقۂ درس کا کیا ہوگا۔ (۲)

کیا وہی فقیر بے نیاز چاندی کے چند سکوں پہ ریجھ گیا تھا..........؟

یہ تعصب ہی کی سیاہ عینک ہے جو ان کے بے داغ دامن پر دھبے لگاتی ہے، ورنہ ان کی زندگی کا ہر ہر ورق ان کی سیرت کی صلابت پہ گواہ ہے۔

1864، 65ء میں ہندوستان بھر میں وہابیت (بغاوت) کے الزام کی بنا پر اندھا دھند گرفتاریاں ہوئیں اور مقدمات چلائے گئے۔ جو مجرم ٹھہرے، ان میں سے اکثر کو حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم ملا۔ مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ صاحب (رحمہما اللہ) کے مقدمہ کی لپیٹ میں میاں صاحب بھی آ گئے۔ میاں صاحب کے گھر کی تلاشی ہوئی۔ گھر سے خطوط کے پلندے برآمد ہوئے۔ پوچھا گیا: آپ کے ہاں اس کثرت سے خطوط کیوں آتے ہیں....؟ فرمانے لگے:

---

(۱) ص: 79، 80

(۲) دیکھئے الحیاۃ بعد المماۃ، ص: 131

اس کی وجہ تو بھیجنے والوں سے پوچھنی چاہیے۔

تلاشی لینے والوں نے خطوط پڑھے مگر ان میں کیا دھرا تھا، یہی کہ فلاں مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ فلاں کتاب کی فلاں عبارت کا صحیح مطلب کیا ہے؟ ایک خط میں لکھا تھا: ''نخبۃ الفکر بھیج دیجیے۔'' تلاشی لینے والوں نے کہا: یہ تو ان کے اصطلاحی الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ میاں صاحب کو طیش آ گیا، فرمانے لگے: نخبۃ الفکر کیا بندوق ہے؟ نخبۃ الفکر کیا گولہ بارود ہے؟ آپ نے مجسٹریٹ سے بھی کہا کہ کن جاہلوں کو میرے ہاں تلاشی لینے کے لئے بھیج دیا تھا۔ کسی عالم سے دریافت کیجیے کہ نخبۃ الفکر کتاب کا نام ہے یا نہیں اور اس کتاب کا موضوع کیا ہے؟ آپ قریباً ایک سال راولپنڈی میں نظر بند رہے۔ تحقیقات ہوئیں، کوئی جرم ثابت نہ ہوسکا، اس لئے رہا کر دیئے گئے۔[1]

(۳)

مولوی غلام رسول صاحب حضرت علیہ الرحمہ سے بہت پہلے پنجاب چلے آئے تھے۔ دہلی میں تحریک آزادی کا آغاز 16 رمضان (11 مئی) کو ہوا اور آپ عید الفطر پڑھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے اور حضرت علیہ الرحمہ کے ایماء پر ہوئے۔ ان دنوں حضرت علیہ الرحمہ مولوی صاحب سے کہا کرتے تھے:

''میں دیکھتا ہوں کہ تم پر ایک بلائے آسمانی نازل ہو رہی ہے۔''[2]

آپ لاہور پہنچے تو گرفتاری کے وارنٹ بھی ساتھ ہی نکل آئے۔ انگریز مولویوں سے بدگمان تھا کہ یہی وعظ سے فساد کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ بے شمار گوشہ نشین علماء کو اسی بدگمانی کی بنا پر دھر لیا گیا۔ آپ کے بڑے بھائی نے آپ کو مشورہ دیا کہ روپوش ہو جایئے۔ آپ نے فرمایا: روپوش ہو کر جینا بھی کیا جینا ہے، راضی برضائے خدا ہوں۔

آخر مولوی صاحب کی گرفتاری عمل میں آ گئی۔

تحقیقات کے بعد رہا تو کر دیئے گئے مگر وعظ کہنے کے لئے حکومت سے انھیں اجازت لینی پڑتی تھی۔ کمشنر منٹگمری نے آپ سے پوچھا: آپ کا کوئی ضامن ہے؟ کہ آپ کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ مولوی صاحب نے کہا: ہاں ہے۔ کمشنر: کون؟ مولوی صاحب: میرا ضامن خداوند کریم ہے۔[3]

اہل جہاں ہمارا نشیمن ہے آسماں
نا آشنا ہیں رسم و رواجِ زمیں سے ہم

حضرت علیہ الرحمہ نے دہلی کو اس وقت خیرباد کہا جب انگریز دھلی پر قابض ہو چکے تھے اور تحریکِ آزادی دب چکی تھی۔ خود فرماتے ہیں:

---

[1] الحیاۃ بعد المماۃ، ص: 81، 82

[2] دیکھیے سوانح حیات مولوی غلام رسول صاحب، ص: 61

[3] دیکھیے سوانح حیات مولوی غلام رسول صاحب، ص: 65 سے 66

نصارے غالب آمدند و اہل بلدہ را متفرق نمودند۔ دراں ایام کتاب صحیح بخاری قریب الاختتام بود، مگر بسبب پراگندگیٔ اہل بلدہ درمیان من و سید صاحب ہم جدائی افتاد و کتاب ناتمام ماند۔

ابھی وہ اپنے وطن ہی میں تھے کہ دلی میں پیش آنے والے حالات سے انھیں خواب میں آگاہ کر دیا گیا تھا۔ وہ خواب اور اس کی تعبیر خود ان کی زبانی سنئے:

دیدم کہ در تہ خانۂ زینہ دار فرودمی روم۔ وقتے کہ بہ صحن خانہ رسیدم چراغ روشن یافتم و دراں حالت در بغلم کتاب صحیح بخاری بود۔ پیش چراغ نشستہ کتاب مذکور را وانمودم۔ می بینم کہ کتاب از اول تا آخر سیاہ گشتہ۔ دودہ دخانیہ چناں براں چسپیدہ کہ حرف بہ نظر نمی آید۔ آخر الامر رومالے برگرفتم و از اول کتاب صاف نمودن شروع کردم و ورق ورق صاف نمودہ قریب آخر رسانیدم۔ اوراق متعددہ باقی ماندہ نہایت ماندہ شدہ نفیس سرد کشیدہ گفتم اللہ اکبر.......

تعبیر خواب ہمیں بود کہ زیر خانہ دہلی بود چراغ سید صاحب مذکور و صاف نمودن صحیح بخاری خواندن آں بود و راعسر اوقات الا اوراق چند کہ بنا بر لاچاری باقی ماندہ۔

آپ نے دیکھا کہ ان کے آئینہ وجدان میں مستقبل کی کیسی صاف اور واضح عکاسی ہوا کرتی تھی ۔

من دفتر کون و مکاں یک یک مفصل دیدہ ام
اوراق تقویم فلک جدول بہ جدول دیدہ ام

چودہ ستمبر کو سفید بھیڑیئے (انگریز) غراتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ جوشِ انتقام نے انھیں اندھا کر دیا۔ دلی کی سرزمین دیکھتے ہی دیکھتے خونِ شہداء کی لالی سے رنگین ہو گئی اور شہر بڑی ہی بے دردی سے تاراج کیا گیا۔ کئی محلے بیخ و بن سے اکھاڑ دیئے گئے۔ مسجدیں مسمار کر دی گئیں۔ شاہی عمارتیں کھنڈر ہو گئیں۔ پنجابی کٹڑہ وہ اہل اللہ کا مسکن بھی ڈھا دیا گیا۔ اربابِ صفا کا شیرازہ بکھر گیا۔ نہ میاں صاحب کا مکان رہا، نہ مسجد اورنگ آبادی ہی کا نام و نشاں رہا ۔

عفت الدیار محلّھا ومقامھا
بِمنًی تأبد غولھا فرجامھا[1]

مسجد اورنگ آبادی کی زمین ریلوے اسٹیشن کے احاطے میں شامل کر دی گئی۔ میاں صاحب حبش خاں کے پھاٹک میں چلے آئے اور آخر تک وہیں مقیم رہے۔[2]

---

[1] میرے پیاروں کے گھر منہدم ہو گئے۔ اُن عمارتوں کا نام و نشان باقی نہ رہا۔

[2] دیکھئے واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم، ص: 274، 310، 332۔

ہفت روزہ الاعتصام (24 مئی 1957ء)

مرکزی جمعیت اہلحدیث مغربی پاکستان کے ناظم اعلیٰ منتخب ہونے پر

مولانا سید ابوبکر غزنوی کی تقریر

مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی وفات کے بعد 19 جنوری 1964ء کو مرکزی جمعیۃ اہلحدیث مغربی پاکستان کی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ اس اجلاس میں مولانا سیّد ابوبکر غزنوی نے بطور ناظمِ اعلیٰ مرکزی جمعیۃ اہلحدیث مغربی پاکستان درج ذیل خطاب فرمایا۔(مرتب)

آپ نے ایوان سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''میں تمام اراکین مجلس شوریٰ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ آپ کے اس انتخاب سے خاندانِ غزنویہ کے ساتھ آپ کے تعلق خاطر کا' آپ کے اخلاص اور آپ کی محبت کا پتہ چلتا ہے۔

حقیقت میں یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جو آپ نے میرے کندھوں پر ڈال دی ہے اور آپ کے تعاون کے بغیر نظامت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا میرے لئے ممکن نہیں۔

حضرات! ناظم کا سب سے اہم کام جماعت میں نظم وضبط پیدا کرنا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ایک دینی جماعت کا نظم وضبط ایک سیاسی جماعت کے نظم وضبط سے بہت حد تک مختلف ہوتا ہے۔ یہ ضلعی اور شہری جمعیتوں کی تنظیم، یہ مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کا قیام، ہوسکتا ہے کہ ایک سیاسی جماعت کی تنظیم کے لئے بس کرتا ہو۔لیکن

ایک دینی جماعت کی تنظیم کے لئے سب سے بنیادی بات وہ قلبی اور روحانی رابطہ ہے جو جماعت کے تمام افراد محض اللہ کی خاطر باہم محسوس کرتے ہیں۔ اگر وہ قلبی اور روحانی رابطہ ہم باہم محسوس نہیں کرتے .... اگر ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں یہ بات راسخ نہیں ہوتی کہ ہماری جماعت "المتحابون فی اللہ" کی جماعت ہے .... اگر حبِ جاہ اور حمیت جاہلیہ' اللہ کی محبت پر غالب آ گئی ہے تو آپ یقین کیجئے کہ ہماری توحید بھی ناقص اور ہماری تنظیم بھی ادھوری ہے بلکہ سراسر بودی اور بے بنیاد ہے۔

دیکھئے! ہم ضلعی اور شہری جمعیتوں کی تنظیم پر کتنا وقت صرف کرتے ہیں۔ اگر اس ساری کدوکاوش اور جدوجہد کے بعد بھی ہم پر ﴿ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ﴾ کی حالت طاری رہتی ہے تو اس کدّ وکاوش سے کیا حاصل ....؟''

یہاں آ کر اُن کی آواز کی گھن گرج سے ہال گونج اٹھا۔ اور آپ نے فرمایا:

''میں یہ بات برملا کہنا چاہتا ہوں کہ ایک دینی جماعت کے مزاج میں سیاسی دھڑا بندی اور سیاسی گٹھ جوڑ کا رچ جانا

اس جماعت کے لئے سم قاتل ہے.....زہر قاتل ہے۔

حضرت والد علیہ الرحمہ جب تک زندہ تھے، ہم آپس میں جھگڑتے تھے.....جیسے بچے باپ کے سائے میں لڑتے اور جھگڑتے ہیں۔ مگر اب صورت حال مختلف ہو چکی ہے۔ وہ شفیق اور عظیم سایہ ہمارے سروں سے اُٹھ گیا ہے۔ اگر ہم اب بھی ویسے ہی جھگڑتے رہے اور ایک دوسرے کے گریبانوں پر ہاتھ ڈالتے رہے تو جماعت میں انارکی پھیلے گی، انتشار ہوگا اور وہ تنظیم جو حضرت والد علیہ الرحمہ اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کی مسلسل اور پیہم کد وکاوش سے جماعت میں پیدا ہوئی' غارت ہو جائے گی۔ اور جماعت کی انفرادیت من حیث الجماعت ختم ہو جائے گی۔

آیئے! ہم آج مل کر اللہ سے یہ عہد کریں کہ ہم اپنے تمام اختلافات دفن کرتے ہیں۔ ہم اپنے سینوں کو تمام کدورتوں سے پاک کرتے ہیں۔ آیئے! ہم سب مل کر اللہ سے یہ دعا کریں کہ

﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا﴾

آیئے! ہم اپنے دلوں میں اس بات کو واضح کریں ہم محض اللہ کی خاطر' محض کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی اشاعت وپرچار کے لئے ایک دوسرے کی طرف اخوت اور بھائی چارے کا ہاتھ بڑھائیں گے۔

آیئے ہم مل کر آج ایک ٹھوس اور تعمیری پروگرام مرتب کریں اور اس پروگرام کی تکمیل کے لئے ہم اپنی ساری ہمت اور توانائی صرف کردیں۔

ہمیں ہر سال یہ جائزہ لینا ہے کہ ہم نے کتنے خطیب پیدا کئے جو آج کل کی زبان میں مرتب اور مربوط انداز میں جماعت کے افکار وعقائد کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ ہمیں ہر سال یہ جانچنا ہے کہ ہم نے کتنے ایسے مصنف پیدا کئے جو جدید تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جماعت کے موقف کی وضاحت کے لئے کتابیں اور مقالے لکھ سکتے ہیں۔ پھر ہر سال ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم نے اپنے نظریات اور عقائد کے لئے کتنی کتابیں چھاپی ہیں۔ پھر ''فن تجوید'' اور ''فن قراءت'' کے ماہرین کی بھی ہمارے ہاں سخت کمی ہے اور اس بارے میں دوسری جماعتوں کے سامنے ہماری نیازمندیاں حد سے زیادہ گزری ہوتی ہیں۔ ہمارا نظامِ تعلیم اور فرسودہ ہو چلا ہے اور اس میں بہت سی بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ پھر ہمیں اپنے اخبار کا معیار بھی اونچا کرنا ہے۔ یہ ہے وہ ٹھوس اور تعمیری پروگرام جس کی طرف میں آپ کو دعوت دیتا ہوں۔ اگر ہر سال کے اختتام پر ہم دیکھتے ہیں کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہو رہی ہے تو ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہیں، بلکہ ایک شدید جمود ہے جو ہم پر طاری ہو گیا ہے۔ اس جمود کی برف توڑنے کے لئے ایک مسلسل اور پیہم جہاد کی ضرورت ہے۔

میں اپنی بات ایک فقرے میں پھر سمیٹتا ہوں:

''آیئے ہم اپنے اندر للّٰہیت پیدا کریں اور اس للّٰہیت کی بنا پر ایک قلبی اور روحانی رابطہ باہم محسوس کریں اور

اس ٹھوس اور تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے اپنا مال اور اپنی جانیں کھپا دیں۔"

﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ﴾①

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

---

① ہفت روزہ الاعتصام (31 جنوری 1964ء)

مکتبۂ غزنویہ کا قیام

آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ مکتبۂ غزنویہ کا قیام حال ہی میں عمل میں لایا گیا ہے۔ یہ ان مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے لٹریچر شائع کرے گا۔

① کسی تحریف ذتاویل کے بغیر، اس دور کے اسلوب میں عصر حاضر کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مثبت انداز میں، جوہر دین کا پرچار کرنا۔

② معاشرے کے افراد میں للّٰہیت پیدا کرنا اور ان کا اللہ سے تعلق استوار کرنا۔

③ انسان کو قلبی اطمینان اور روحانی سکون بخشنا تاکہ اُس اضطراب اور بے چینی سے نجات پاسکے جس میں وہ مادیت اور لادینیت کی وجہ سے مبتلا ہے۔

④ تزکیۂ نفس کے ساتھ اسلامی نظریۂ حیات کا اس دور کے مختلف نظام ہائے حیات کے ساتھ موازنہ کرنا۔ اسلام کے اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی نظام کی دوسرے نظام ہائے حیات پر فوقیت کو ملّت اسلامیہ پر اُجاگر کرنا تاکہ ملّتِ اسلامیہ اس احساسِ کمتری سے نجات پاسکے جس کا شکار وہ اسلامی نظریۂ حیات سے عدم ناواقفیت کی بنا پر ہو رہی ہے۔ اس سلسلے کا پہلا مقالہ حقیقتِ ذکر الٰہی چھپ چکا ہے۔

مندرجہ ذیل مقالے چھپ کر ان شاء اللہ العزیز بہت جلد منظر عام پر آنے والے ہیں:

① اسلام اور آدابِ معاشرت
② کتابتِ حدیث عہد نبوی میں
③ وضاعین حدیث پر نقد ونظر
④ اسلام اور سوشلزم

اس کے علاوہ یہ مقصد بھی پیشِ نظر ہے کہ خاندانِ غزنویہ کے اسلاف کی تصانیف اور سوانح حیات کی اشاعت کی جائے۔ نماز مترجم مرتبہ حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ آف سیٹ پر زیر طباعت ہے اور ایک ہفتہ تک مکتبۂ غزنویہ سے دستیاب ہوسکے گی، ہماری کوشش یہ ہے کہ:

- مقالے مختصر اور پُرمغز ہوں۔
- طباعت اور کتابت عمدہ اور معیاری ہو، سرورق دیدہ زیب ہو اور ہدیہ واجبی ہو۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ یہ کارِ خیر استقامت کے ساتھ کرنے کی ہمت اور توفیق بخشے۔

الفقیر الی اللہ: سیّد ابوبکر غزنوی۔ شیش محل روڈ لاہور[1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (28 فروری 1969ء)

مطبوعات مکتبہ غزنویہ

پروفیسر سیّد ابوبکر غزنوی صدر شعبۂ علوم اسلامیہ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے پُر بہار قلم سے مختلف موضوعات پر فکر انگیز مقالات جو صوری و معنوی خوبیوں سے مزین ہیں۔

حقیقتِ ذکرِ الٰہی:

ذکرِ الٰہی ہم کیوں کریں؟ ذکرِ الٰہی سے شخصیت کے تمام گوشے کیوں کر متاثر ہونے لگتے ہیں؟ رحمت وسکینت کی حقیقت کیا ہے؟ درودِ رحمت کی تدبیر کیا ہے؟ کیا ذکر تمام روحانی بیماریوں کی دوا بھی ہے۔ اللہ والوں کی رُوحانی غذا بھی ہے۔ شکوک وشبہات کا علاج بھی ہے......ان باتوں کی وضاحت اس مقالے میں کی گئی ہے۔

اسلام اور آدابِ معاشرت:

تہذیب اور شائستگی کے بغیر انسان کا دین ادھورا ہے اور ادھوری سچائیاں ہمیشہ خطرناک ہوتی ہیں......اس مقالے کے چند عنوان: مسکرانا نیکی ہے...... شکریہ ادا کرنا......مصافحہ...... معانقہ...... آدابِ مجلس...... اسلام میں پرائیویسی کا تصوّر......کھانے پینے کے آداب۔

اسلام میں گردشِ دولت:

چند عنوان: سرمایہ کا چند ہاتھوں میں سمٹ آنا بدترین جرم ہے .....اسلام کے معاشی نظام کی آخری ارتقائی شکل کیا ہے......قل العفو کی تفسیر......کیا اسلامی حکومت دولت جبراً چھین سکتی ہے؟ کیپٹلزم ......سوشلزم اور اسلام ......شخصی ملکیت ......ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لینا......کیا اسلام اور اشتراکیت یکجا ہو سکتے ہیں......روٹی، ہماری زندگی کا مقصد نہیں۔

یہ مقالہ لاہور اور کراچی کی شامِ ہمدرد میں پڑھا گیا اور بے حد پسند کیا گیا۔

عصرِ حاضر میں استاد اور شاگرد کا رشتہ:

عصرِ حاضر میں استاد اور شاگرد کے رشتے میں کیا گرہیں پڑ گئی ہیں؟ اُلجھاؤ کہاں کہاں ہے اور عقدہ کشائی کی صورت کیا ہے؟......رشتے میں بگاڑ کیوں پیدا ہوا اور اُسے ازسرِ نو استوار کرنے کی کیا تدبیر کی جاسکتی ہے؟

اسلامی ریاست کے چند ناگزیر تقاضے:

کیا اسلامی ریاست کا قیام ممکن ہے؟ اسلامی ریاست میں حاکمیت کا حق کسے ہے؟ سربراہِ ریاست عوام کی طرح

جواب دہ ہے...... عمالِ حکومت اور ان کا احتساب .... سربراہِ ریاست کے مصارف ...... ریاست میں مرد کے حقوق...... معاشی تحفظ ...... شخصی آزادی کا حق ...... آزادیٔ اظہارِ رائے۔

اس مقالے میں ان سب باتوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

کتابت حدیث عہد نبوی ﷺ میں :

عہد نبوی ﷺ میں حفاظت وجمع احادیث کا اہتمام کس حد تک ہوسکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عرب قوم کا حافظہ غیر معمولی تھا اور اس والہانہ عقیدت اور شیفتگی کی بنا پر جو وہ رسول اکرم ﷺ سے رکھتے تھے، ان کے ارشاداتِ گرامی کو حفظ کرنے کا انھیں بڑا اشتیاق تھا، مگر یہ کہنا سراسر حقائق کی تکذیب ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ میں احادیث ضبطِ تحریر میں نہیں لائی گئیں ...... احادیث کا بہت بڑا سرمایہ عہد نبوی ﷺ میں صحابۂ کرام کے ہاتھوں قلم بند ہوا، اس بات کی تشریح اس مقالے میں کی گئی ہے۔

خطباتِ جہاد:

یہ خطبات 1965ء کی جنگ کے دوران راقم الحروف نے دیئے تھے ...... فریضۂ دفاع کی اہمیت ...... جہاد کی حقیقت ...... فریضۂ جہاد کے تقاضے، اور ...... اسلام میں جنگ کی غرض وغایت اور مقامِ شہادت کی رعنائیاں اپنے اچھوتے انداز میں بیان کی گئی ہیں۔

واقعۂ کربلا:

واقعۂ کربلا کی تاریخی وشرعی حیثیت، ایک محققانہ جائزہ پڑھنے کے بعد فکر ونظر کی نئی راہیں سامنے آتی ہیں۔

اس دنیا میں اللہ کا قانونِ جزا وسزا:

اللہ کے ساتھ دوستی کا صلہ اس دنیا میں کیا ہے؟ ...... افراد کی عزت وذلت، قوموں کا عروج وزوال کے بارے میں ضابطۂ الٰہی ...... امریکہ اور روس آج کیوں معزز ہیں؟ ہم کیوں بے وقعت ہیں؟

ان سوالوں کے جواب اس مقالے میں موجود ہیں۔

قرآنِ مجید کے صوری اور معنوی محاسن (ایک اجمالی جائزہ):

جدید اصولِ تنقید کے اعتبار سے قرآن مجید کے فنی محاسن کو اُجاگر کیا گیا ہے ...... ذات وصفاتِ خداوندی کے قرآنی تصور کی وضاحت ...... قرآن مجید سیرت النبی (ﷺ) کا مستند ترین مرقع ہے ...... ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور انسان کی عائلی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی میں مشعلِ راہ ہے۔

محمدی انقلاب کے چند خدوخال:

اس مقالے میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو انقلاب برپا کیا' وہ کن ارتقائی منازل سے گزرا اور اُس کے کیا نتائج مرتب ہوئے اور یہ ثابت کیا ہے کہ محمدی انقلاب ماؤ اور لینن کے انقلاب سے عظیم تر تھا۔ [1]

---

[1] ہفت روزہ الحدیث (18 دسمبر 1972ء)، حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ (ص: 457)

خلافتِ راشدہ میں نظم و نسق

خلفائے راشدین کا دور جہاں روحانی سعادتوں سے مالا مال تھا، معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے بھی بے مثال تھا۔ خلفائے راشدین کی راتیں اللہ کے حضور میں قیام و سجود کی حالت میں گزرتی تھیں اور دن مخلوقِ الٰہی کی خدمت میں بسر ہوتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے سوا دو برس کی قلیل مدتِ خلافت میں ایسے عظیم کارنامے سرانجام دیئے کہ ان کے نقشِ لازوال ہیں۔ حضور اقدس (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے بعد سرزمین عرب پھر ایک بار انارکی اور طوائف الملوکی کا گہوارہ بن گئی تھی۔ امام طبری کہتے ہیں کہ:

"قریش اور ثقیف کے علاوہ تمام عرب حلقہ اطاعت سے باہر ہونے لگے۔ مدعیانِ نبوت کی جماعتیں ملک میں شور برپا کر رہی تھیں اور منکرین زکوٰۃ مدینہ منورہ لوٹنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی کی ہمت، فراست اور استقامت تھی کہ حالات پر قابو پالیا۔ باغیوں کی طنابیں کھینچیں اور للکار کر کہا:

أینقص الدّین وأنا حیّ

کیا دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں نقص پیدا کیا جائے گا اور ابوبکر زندہ ہوگا۔ پوری قوت کے ساتھ ہر فتنے کو دبا دیا۔ خلافتِ اسلامی کی داغ بیل حضرت ابوبکر ہی نے ڈالی۔"

خلافتِ راشدہ کی تاریخ کا ہر ہر ورق گواہی دیتا ہے کہ جمہور کے مشورے ہی سے تمام اہم کام سرانجام پاتے تھے۔ خلیفہ کا انتخاب بھی جمہور کے مشورے سے ہوتا تھا۔ حضورِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا جانشین خود مقرر نہیں کیا بلکہ انتخاب کی آپس میں تیز تیز بحثیں ہوئیں اور آخر سب نے متفقہ طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

طبقات ابن سعد میں ہے:

"أن أبا بكر الصديق كان إذا نزل به أمر يريد فيه مشاورة أهل الراى وأهل الفقه"

(کہ حضرت ابوبکر صدیق کو جب کوئی معاملہ درپیش ہوتا تو صاحب الرائے اور سمجھ بوجھ والے صحابہ سے مشورہ لیتے تھے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو باضابطہ مجلس شوریٰ قائم کی اور تمام قومی مسائل اس مجلس کے سامنے رکھتے تھے اور کثرتِ رائے سے تمام امور کا فیصلہ کرتے تھے۔ مجلس شوریٰ کے علاوہ ایک مجلس عام بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قائم کی جس میں مہاجرین و انصار کے علاوہ تمام سردارانِ قبائل شریک ہوتے تھے۔ یہ مجلس نہایت اہم امور کے پیش آنے پر طلب کی

جاتی تھی ورنہ روزمرہ کے کاروبار میں مجلس شوریٰ کا ہی فیصلہ کافی سمجھا جاتا تھا۔ مجلس شوریٰ کے انعقاد کا عام طریقہ یہ تھا کہ منادی ''الصلاۃ جامعۃ'' کا اعلان کرتا تھا۔ لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے تھے پھر دو رکعت نماز پڑھ کر خلیفہ بحث طلب بات پر لوگوں کو خطاب کرتا تھا۔ اس کے بعد ہر ایک کی رائے دریافت کی جاتی تھی۔ خلافتِ راشدہ کی یہ ایک اُبھری ہوئی خصوصیت ہے کہ محض اہمیت اور استحقاق کی بنا پر ہی عمال کو عہدوں پر فائز کیا جاتا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ:

''میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو کوئی مسلمانوں کا حاکم مقرر ہو اور وہ کسی کو اہمیت و استحقاق کے بغیر کسی عہدے پر فائز کرے اس پر خدا کی لعنت ہو۔ خدا اس کا کوئی عذر اور فدیہ قبول نہ کرے گا۔''

خلفائے راشدین حکام کی کڑی نگرانی کرتے تھے۔ ان کا سخت احتساب ہوتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ہر عامل سے عہد لیتے تھے کہ:

① وہ عیش و عشرت کی زندگی سے اجتناب کرے گا۔
② ریشمی لباس نہیں پہنے گا۔
③ چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا۔
④ اور اپنے دروازے پر دربان نہیں بٹھائے گا۔
⑤ اور حاجت مندوں کے لئے دروازہ ہمیشہ کھلا رکھے گا۔

امام بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہر حاکم کے مال اور اسباب کی فہرست تیار کرواتے تھے اور جب کسی عامل کی مالی حالت میں غیر معمولی اضافے کی خبر ان کو ملتی تو جائزہ لے کر آدھا مال بیت المال میں داخل کرا دیتے تھے۔ ایک دفعہ بہت سے عمال اس بلا میں مبتلا ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب کی املاک کا جائزہ لے کر سب کے مال کا آدھا آدھا حصہ بیت المال میں جمع کرا دیا۔ حج کے زمانے میں اعلانِ عام ہوتا تھا کہ جس عامل سے کسی کو شکایت ہو وہ فوراً خلیفہ کے پاس چلا آئے۔ لوگ چھوٹی چھوٹی شکایتیں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لاتے اور وہ پوری مستعدی کے ساتھ ان کا تدارک فرماتے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے ایک مصری کو ناجائز پیٹا اور کہا کہ ''ہم اکابر کی اولاد ہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اس مصری نے شکایت کی تو فوراً عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو بلوایا اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں ان کے بیٹے کو درے لگوائے۔''

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں ایک گھر تعمیر کیا۔ جس میں ڈیوڑھی بھی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خیال سے کہ حاجت مندوں کو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ملنے میں دقت ہو گی۔ محمد بن سلمہ کو حکم دیا کہ جا کر

ڈیوڑھی میں آگ لگا دیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پاس کھڑے خاموشی سے اپنے مکان کی ڈیوڑھی جلنے کا تماشا دیکھتے رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مزاج اگرچہ دھیما اور حلم ان کے ضمیر میں گندھا ہوا تھا لیکن ان کے مزاج کا دھیما پن قومی اور ملی معاملات میں انہیں احتساب سے باز نہیں رکھتا تھا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے ایک خطیر رقم لی جسے وہ ادا نہ کر سکے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہایت سختی سے باز پرس کی اور معزول کر دیا۔ ولید بن عقبہ نے بادہ نوشی کی تو معزول کر کے اعلانیہ حد جاری کی۔

خلفائے راشدین جو عمال کی کڑی نگرانی کرتے تھے حتیٰ کہ کسی عامل کو رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی اور بد دیانتی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ سب سے سخت محاسبہ وہ اپنی ذات کا کرتے تھے۔ خلفائے راشدین ایک متوسط آدمی کا خرچ بیت المال سے لیتے تھے اور جیسا کہ تاریخ طبری میں ہے:

"حلة في الصيف وحلة في الشتاء"

(ایک جوڑا گرمیوں میں اور ایک جوڑا سردیوں میں)

اس سے زیادہ بیت المال میں اپنا حق نہ سمجھتے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ خلافت کے بعد حسب معمول کندھے پر کپڑے کے تھان رکھ کر بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا:

''اب آپ مسلمانوں کے حاکم ہیں۔ اگر آپ حسبِ معمول کپڑا فروخت کرتے رہے تو خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا آپ کے لئے مشکل ہو جائے گا۔''

زمانہ خلافت میں انہیں بیت المال سے چھ ہزار روپیہ قرض لینا پڑا۔ وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ میرا فلاں باغ بیچ کر میرا قرض ادا کیا جائے اور میرے مال سے جو چیز فالتو نظر آئے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دی جائے۔

خلافتِ راشدہ کی تاریخ کا ہر ہر ورق یہ گواہی دیتا ہے کہ وہ عہدِ دیانتداری، راست بازی اور عوام کی خوشحالی کا ایک بے مثال عہد تھا اور پاکستان کی تمام الجھنوں کا حل اسی میں ہے کہ اس ملک کو خلافت راشدہ کے سانچے میں ڈھال دیا جائے۔[1]

یہ تقریر گزشتہ دنوں ریڈیو پاکستان کے تقریباً تمام سٹیشنوں سے نشر کی گئی۔

---

[1] ماہنامہ محدث، لاہور (جنوری، فروری 1971ء)

مسلم معاشرہ کو نئی تہذیب کا چیلنج

تحریر: عبدالوہاب عزام (مصر)

ترجمہ: سید ابوبکر غزنوی (ایم اے ایل ایل بی)

جناب عبدالوہاب عزام صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مصری حکومت کی طرف سے پاکستان میں سفیر رہے، آج کل سعودی عرب میں ریاض یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ آپ نے ڈاکٹر اقبال رحمہ اللہ کے نظریات وافکار کو عربی کا جامہ پہنا کر عالمِ عرب کو اس سے مستفیض ہونے کا موقع باہم پہنچایا اور ان کی متعدد کتابوں کا عربی نظم میں کامیاب ترجمہ کیا۔ عربی ادب میں بھی ان کی کئی مستقل تصانیف ہیں، مثلاً رحلات، ذکریٰ ابی الطیب وغیرہ۔ اس مقالہ کا انگریزی ترجمہ اغلاط سے بھرپور ہے جس کا اعلان عزام صاحب نے مجلس مذاکرہ میں کر دیا تھا اور اُردو ترجمہ بھی کسی اخبار نے ابھی تک شائع نہیں کیا۔

فن تہذیب کے ہراول دستے آج سے تین سو برس قبل سائنس وفلسفہ اور اپنے صنعتی نظام کے ساتھ ظاہر ہوئے تھے۔ پھر اس تہذیب کے خدوخال برابر اُبھرتے رہے اور اس کی راہیں نمایاں ہوتی گئیں، حتیٰ کہ ان آخری سو برس میں یہ تہذیب پورے جوبن پر آگئی ہے۔

اس تہذیب کو دنیا میں بعض لوگوں نے تو خود اپنا لیا اور بعض پر جبراً ٹھونس دی گئی۔ اہل مشرق اور اہل مغرب کا مختلف جگہوں پر ملاپ ہوا، بعض اسلامی ممالک نے بطیبِ خاطر اس تہذیب کو اپنا لیا اور بعض کو مجبوراً اپنانا پڑی۔ مسلمانوں نے جب اس تمدن کی باگ ڈور سنبھالنے والوں کا تسلط اپنے ملکوں پر دیکھا تو ان کے دلوں پر ان کی ہیبت چھا گئی اور ان کے نظریات وافکار کا ایک سیلاب تھا جو مسلمانوں کی طرف امڈ آیا۔ یہ سیلاب مسلسل کئی ادوار میں امڈا ہے۔ ان ادوار کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

مسلمانوں کو اس نئی تہذیب میں ایک قوت، ایک علم اور ایک صنعتی نظام نظر آیا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس تہذیب میں ایک نظم ونسق ہے۔ اس کے ساتھ یہ تہذیب رنگ رلیوں کا سامان بھی مہیا کرنے والی تھی اور بہت سی دنیوی لذتوں کے لیے بھی راہیں کھول رہی تھی۔ مسلمانوں کو ایک ایسا نظریہ حیات ملا جو ان کے دین کے یکسر خلاف تھا اور اس نظریہ حیات کی حمایت کرنے والی وہ قومیں تھیں جن کے ساتھ مسلمانوں کی برابر کئی صدیوں سے دشمنی چلی آتی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ان نظریہ حیات کے حامی اسلامی علاقوں میں گھس گئے ہیں۔ اپنے مسلک کا پرچار کر رہے ہیں اور اسے دلآویز

بنانے کے لیے مختلف ذرائع اختیار کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے تین گروہ:

مسلمان ششدر تھے کہ وہ اس تمدن کا سامنا کیسے کریں۔ اکثریت ایک الجھن میں پڑ گئی اور آخر وہ اختلافِ رائے کی بنا پر تین گروہوں میں بٹ گئی۔

(الف) ایک فریق کے سامنے ان اصحابِ تمدن کی عداوت، ان کا تسلط، ان کی قہرمانیت اور ان کا ظلم و عدوان تھا۔ جو عقائد و افکار وہ لائے تھے، یا تو وہ حقیقتاً یا محض ان کی نظر میں اسلام کے خلاف تھے۔ اس فریق نے دیکھا کہ مسلمانوں کا دین، ان کا اخلاق، ان کی تہذیب آزمائش میں پڑ گئی ہے۔ پس یہ فریق یورپ کی تہذیب سے یکسر متنفر ہو گیا۔ خود اس سے اجتناب کیا اور لوگوں کو بھی اس سے بچنے کی تلقین کی۔

(ب) ایک دوسرے فریق کی نظر اس قوت، علم، صنعت و حرفت، اس سیاسی و اجتماعی نظام، اقتصادی خوش حالی اور ان اسبابِ تعیش پر پڑی جو یورپ اسلامی ممالک میں لایا تھا۔ اس فریق نے دیکھا کہ یورپ نے انہیں بہت سی قیود سے آزاد کر دیا۔ انہوں نے پورے کے پورے تمدن کو سراہا اور اس پر مفتون ہو گئے۔ وہ اپنی انفرادیت کھو بیٹھے۔ وہ تہذیب جو انہیں ورثہ میں ملی تھی' ان کی نظر میں حقیر ہو گئی۔ وہ یورپ کی تہذیب میں یکسر فنا ہو گئے۔ جو کچھ یورپ لایا ان کی نظر میں اچھا ہے اور ہر وہ بات جس کی یورپ نے مخالفت کی' بری ہے۔ ان کے خیال میں تو ہمارے ہاں کوئی اچھی اور عمدہ بات تھی ہی نہیں جس کی ہم حفاظت کریں۔ ہاں اگر یورپ ہماری کسی بات کو اچھا کہہ دے تو تقلیداً وہ بھی اسے سراہنے لگتے ہیں۔ مثلاً عربی گلکاری یورپ والوں کو پسند آ گئی اور انہوں نے اپنے گھروں کی زیبائش کی اور اس کا نام ارابکا (عرب کی گلکاری) رکھا تو مشرقی لوگ (عرب بھی انہیں میں سے ہیں) بھی اس کی تعریف کرنے لگے اور اگر اس گلکاری کا وہی عربی نام رہتا اور اہلِ مغرب کی نگاہوں سے یہ دور رہتی تو اہلِ مشرق کا بھی جی یہ نہ لبھا سکتی اور نہ عربی طرز کے بیل بوٹوں سے وہ اپنے گھروں کی آرائش کرتے۔

یورپ کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ان کے سروں کو اپنے سامنے اور بھی جھکا دیا۔ کمزور طبع طاقتور کی تقلید کرتا ہے اور انسانی معاشرے کی یہ عادت چلی آتی ہے کہ محکوم قومیں حاکم قوم کی پیروی کرتی ہیں۔

مغربی تہذیب کے دو حصے ہیں:

(ج) مسلمانوں کے اعتدال پسند گروہ نے سوچ بچار کی' تو انہوں نے مغربی تہذیب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا:

① صنعتی تہذیب، ② اخلاقی تہذیب۔

صنعتی تہذیب تو ان طبعی قوانین پر مبنی ہے جو مشرق و مغرب میں اور مسلم و غیر مسلم کے ہاں یکساں ہیں، مثلاً ڈاکٹری، انجینئری اور مشین سازی۔ ان علوم کا اکتساب یورپ سے کرنا چاہیے بلکہ مسلمانوں کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ

پوری جانفشانی کے ساتھ یہ علوم یورپ سے حاصل کریں۔ عقل گواہی دیتی ہے کہ اس اعتبار سے مغرب ہم سے بازی لے گیا ہے اور اس نے محیر العقول کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ وہ ان علوم کے اساتذہ ہیں۔ اس لیے ان سے ان علوم کے سیکھنے میں کوئی تأمل نہیں ہونا چاہیے۔

دوسری تہذیب اخلاقی تہذیب ہے اور اگر تم چاہو تو اسے انسانی تہذیب بھی کہہ سکتے ہو۔ یہ تاریخ، دین اور عادات واطوار سے تشکیل پاتی ہے۔ یورپ کی اخلاقی تہذیب میں کچھ خوبیاں ہیں اور کچھ برائیاں ہیں، کچھ رشد وہدایت ہے اور کچھ گمراہی بھی ہے۔ اس کی اچھائی میں بہت کچھ برائی بھی مل گئی ہے۔ اس کے حسن کو بعض قباحتوں نے بگاڑ دیا ہے۔ اس تہذیب کو صنعتی تہذیب پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ تہذیب کا یہ حصہ ان سے اخذ کرنا مناسب نہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کی راہ زیادہ سیدھی اور صاف ہے اور ان کی بات زیادہ پکی اور گہری ہے۔ یہ ہمارے لیے زیبا نہیں ہے کہ اخلاقی اعتبار سے ہم مغرب کی تقلید کریں، بلکہ ہمارا فرض تو یہ ہے کہ ہم اپنی اخلاقی قدروں کی میراث مضبوطی سے تھام لیں اور ان کی قدر وقیمت کو پہچانیں۔

یہ اعتدال پسند فریق اپنے مسلمان بھائی سے کہتا ہے:

دیکھو! اس تمدن کی ظاہری آب وتاب سے مرعوب مت ہو جاؤ۔ اس کی جھوٹی اور بودی قدروں کے قریب بھی مت آؤ۔ اس کی بہیمی لذتوں کے مرام سے بچو۔ دیکھو! اس کا بھڑکیلا پن کہیں تمہاری آنکھوں کو چندھیا نہ دے اور اس کی گھن گرج کہیں تمہیں راہ سے نہ بھٹکا دے۔ تم یہ گمان مت کرو کہ جس کے پاس سائنس، مشین، اسلحہ اور مال ہے وہ اخلاقی، دینی اور فکری اعتبار سے بھی ایک اچھا پیشوا بن گیا ہے۔ اپنے آپ کو پہچانو اور ان اخلاقی محاسن اور انسانی فضائل کی قدر پہچانو جن کے تم وارث ہو۔

اعتدال پسند مفکر کہتے ہیں:

مسلمانوں نے اپنی سیاسی آزادی کے لیے کوشش کی ہے۔ اس سے زیادہ اہم اور مؤثر بات یہ ہے کہ وہ اپنی ذہنی آزادی کے لیے جدوجہد کریں، اپنی صلاحیتوں کو جانچیں اور ذہنی پختگی حاصل کریں تاکہ مغربی تہذیب کی کھوٹی اور کھری اقدار کے درمیان ایک آزاد، معزز، خودمختار اور صائب الرائے انسان کی طرح حد فاصل کھینچنے کے قابل ہو جائیں..... اس انسان کی طرح جو حلال وحرام کے درمیان اپنی عقل اور اپنے قانون سے امتیاز کرتا ہے۔ وہ غیروں کی عقل اور غیروں کے قانون سے امتیاز نہیں کرتا۔

ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ نئی تہذیب علمی اور صنعتی اعتبار سے انسانیت کے لیے فائدہ بخش ثابت ہوئی ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ سیاسی اور اجتماعی اعتبار سے بھی یہ تمدن اپنے ساتھ بہت سی منفعتیں لایا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کرنا چاہیے کہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے یہ تہذیب بڑی ہی بودی اور ناقص ہے اور انسان کی علمی

ترقی کے ساتھ اخلاقی فضیلت کا ہم رکاب ہونا ضروری نہیں ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس تمدن کا دل اور عقل ساتھ ساتھ نہیں چلتے۔ اس کا ایمان اس کے افکار پر حاوی نہیں اور اسی وجہ سے ایک مستقل بے چینی اور دائمی اضطراب ہے جو اس آیہ کریمہ کی تصدیق کرتا ہے:

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ﴾ (الانعام:65)

''کہہ دو کہ وہ اس پر قادر ہے کہ تمہارے اوپر کی طرف سے یا تمہارے پیروں کے تلے سے کوئی عذاب لا کھڑا کر دے یا تمہاری جماعت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمہیں ایک دوسرے سے بھڑا دے اور تمہیں ایک دوسرے کے ہاتھوں جنگ کا مزا چکھا دے۔''

نئی تہذیب کی مضرتیں:

اس وقت ہمیں اس بات سے سروکار نہیں ہے کہ نئی تہذیب کی خوبیاں کیا ہیں اور لوگوں کو اس سے کیا منفعتیں حاصل ہوئیں۔ مجھے تو اس وقت اختصار کے ساتھ صرف ان اہم مضرتوں کا ذکر کرنا ہے جن کا اسلامی معاشرے کو اس تہذیب کے نظریات و افکار سے خدشہ ہے۔

اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ نئی تہذیب پر الحاد اور مادیت چھائی ہوئی ہے اور وہ بہیمی لذتوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ مسلمان اس تہذیب کے جس پہلو سے سب سے زیادہ خائف ہیں وہ یہ الحاد اور مادیت ہی ہے جو اس تہذیب پر حاوی اور طاری ہے۔ مسلمان جماعت مجموعی حیثیت سے ایک دین دار جماعت ہے جو اللہ پر ایمان رکھتی ہے۔ ان کے دل خدا سے وابستہ ہیں۔ وہی ان کے لیے بے مثل و اعلیٰ ہے، وہی مبتدا ہے، وہی منتہا ہے۔ ان کے عقائد و اعمال کا محور و مرکز بھی وہی ہے۔ اسی کا ضابطہ قانون ہے جس نے انہیں ایک منظم جماعت بنا دیا ہے۔ وہی قانون ہے جو مسلمانوں کے قلبی رجحانات میں ایک ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ وہ شرعی نظام جو ان کی شیرازہ بندی کرتا ہے اور ایک ایسا ایمان اس کی پشت پناہی کرتا ہے جو زمان و مکان کی حدود سے بالا ہے۔ اور وہ کسی حالت یا ہیئت میں مقید نہیں ہے۔ اس کے بعد دیوان الشافی سے اس مضمون کے دو شعر نقل کرتے ہیں:

''نفس تنہا تو بھٹکے ہوئے ایسے میلانات رکھتا ہے جن کو محدود نہیں کیا جا سکتا اور یہی نفس اگر حق سے وابستہ ہو جائے تو شریعت کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے اور یہی نفس اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے تعلق پیدا کر لے تو علم اور دوام حاصل کر لیتا ہے۔''

مردِ مومن کی شان:

ایک مومن کی شان یہ ہے کہ وہ حق سبحانہ وتعالیٰ پر ایمانِ صادق رکھتا ہے اور بلا واسطہ اس سے رابطہ رکھتا ہے۔ وہی

اس کے لیے مثلِ اعلیٰ ہے، اسی کے اوصاف سے متصف ہونا اس کا مقصد ہوتا ہے۔

مادی دنیا اس کی نگاہوں میں حقیر ہوتی ہے۔ وہ مادی دنیا کا غلام نہیں ہوتا بلکہ اپنے اعلیٰ مقاصد کے لیے دنیا کی تسخیر میں کوشاں ہوتا ہے۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوتا ہے تو روحانی دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو بے پایاں و بے کنار ہے۔ اس کے عقائد و افکار اور امیدیں صرف مادی دنیا تک محدود نہیں ہوتیں اور نہ ہی دنیا اس کی زندگی کا اصل مقصد اور منتہاءِ علم ہوتا ہے۔ وہ دنیا کا آقا ہوتا ہے، اس کا بندہ بن کے نہیں رہتا۔ دنیا اس کی مٹھی میں ہوتی ہے نہ کہ اس کے دل پر چھائی ہوئی۔ وہ دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز تو ہوتا ہے مگر ان سے مغلوب نہیں ہوتا، نہ ان کا اسیر ہوتا ہے بلکہ ان پر غالب رہتا ہے اور اپنی اخلاقی اور دینی قوت سے اسے اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔ وہ اس کی طرف اسی قدر مائل ہوتا ہے جس قدر دین اور اخلاق اسے اجازت دیتے ہیں۔ وہ ایک ضابطہ قانون کے تحت دنیا میں کام کرتا ہے۔ اس کا دستورِ حیات یہ نہیں ہوتا کہ جس بات کو جی چاہا' کر لیا اور جس کام کو جی نہ چاہا' نہ کیا۔ اس کا قانونِ حیات تو یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کو شریعت نے حلال ٹھہرایا' وہ تو حلال ہے اور جس کو حرام ٹھہرایا' وہ حرام ہے۔ جو کام انسانی عزّ و شرف کے شایانِ شان ہیں' وہ جائز اور جو اس کے خلاف ہیں' وہ ناجائز۔ وہ اپنے آپ کو اس زمین پر اللہ کا خلیفہ سمجھتا ہے۔ اس کے بندوں میں عدل و انصاف قائم کرتا ہے۔ وہ خدا کی زمین کو آباد کرتا ہے اور اس کی اصلاح میں مصروف رہتا ہے اور کسی حالت میں بھی انصاف کا دامن نہیں چھوڑتا۔ حق کی خاطر جہاد کرتا ہے۔ بھلائی کے کاموں کے لیے یوں کوشاں ہوتا ہے گویا سارے لوگوں کے بارے میں اس سے باز پُرس ہونے والی ہے۔ برائیوں سے وہ اجتناب کرنے والا، بدی کے خلاف سرکش اور ایک نہ دبنے والی روح رکھنے والا' مگر ساتھ ہی ساتھ وہ مشفق و مہربان بھی ہے۔ خدا کے بارے میں قوی بھی ہے اور اس کے بل بوتے پر سب سے بے نیاز بھی ہے۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا اور اپنے رب کی رحمتوں سے گمراہوں اور کافروں کے سوا کون مایوس ہوتا ہے۔ وہ سرگرمِ عمل رہتا ہے۔ وہ ناکام بھی ہو تو کامیابی کی امید سے معمور ہوتا ہے اور اس کے ثباتِ قدم میں لغزش نہیں آتی۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہر سختی کے بعد آسانی اور تنگی کے بعد کشائش ضرور ہو کر رہے گی۔ دنیاوی مصیبتوں کی اس پر بوچھاڑ بھی ہو جائے تو وہ ہمت نہیں ہارتا۔ اس کا ایمان دنیا اور دنیا کی مسرتوں اور دکھوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کا نفس دنیا اور اس کے تلخ و شیریں ثمرات سے اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے اور اس کی ہمت دنیا اور اس کے رنج و راحت سے بلند و بالا ہوتی ہے۔

ملحد انسان کی حالت:

مسلم جماعت جو اس ایمان اور ان اوصاف پر قائم ہے اسے خدشہ ہے کہ اس کی مادی اور اِلحاد پسند تہذیب کے رجحانات اس کے افراد کو متاثر نہ کر دیں۔

اس تمدن کی پیدا کی ہوئی پود کے کسی فرد کو تم نے دیکھا ہے؟ اسے اپنی ذات ہی کی فکر ہوتی ہے۔ خود غرضی و خود

پرستی اس کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ اس کے افکار، اس کے احساسات، اس کی آرزوئیں جہانِ آب وگل میں گرفتار ہوتی ہیں۔ وہ اس مادی دنیا سے گزر کر آگے ایک قدم نہیں چل سکتا۔ اس سے ہٹ کر کوئی مطمح نظر ہی نہیں ہے۔ اس کی ساری کوششیں مادی فوائد کے حصول ہی کے لیے ہوتی ہیں اور اگر دنیوی فوائد کی راہیں مسدود ہو جائیں تو ہر جائز وناجائز شریفانہ اور غیر شریفانہ طریقوں سے ان راہوں کی کشائش چاہتا ہے اور اگر کشائش نہ ہو سکے تو اسے خودکشی کر لینی چاہئے۔ اس لیے کہ اس کی زندگی سراسر مادی ہی مادی ہے اور مادی لذتوں سے محروم ہو جانے کے بعد اس کی زندگی بے کار ہے۔

وہ درہم و دینار کا بندہ ہے، دولت اس کا قبلہ وکعبہ ہے۔ وہ دولت کمانے اور سمیٹنے کی خاطر ہر خست اور رذالت کو گوارا کرتا ہے۔ یہ قحبہ خانے، یہ عیاشی کے بازار، شراب خانے سب دولت کی پوجا اور لذت پرستی ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور دین واخلاق کی توہین کے مختلف انداز ہیں۔

مسلمان عورت:

نیک بیوی ہے، بچوں کی پرورش کرنے والی، گھر کی ملکہ، پاک دامن اور ہر اہانت و ذلت کی بات سے اجتناب کرنے والی ہے۔ اسلام اس کی عزت وناموس کا محافظ ہے اور اس کے حقوق کا ضامن ہے مگر اسلام اسے اپنی اور اپنے گھر کی دیکھ بھال کا ذمہ دار بھی ٹھہراتا ہے۔

مسلمانوں کو خدشہ ہے کہ نئی تہذیب مسلمان عورت کو فریب دے کر بھٹکا نہ دے۔ نئی تہذیب کا تقاضا ہے کہ عورت گھر سے باہر آ جائے، اسے خاوند سے سرکشی پر آمادہ کرے، اسے اپنے بچوں سے بیزار کر دے۔ بازاروں، فیکٹریوں، جلسوں اور محفلوں میں اس کی مصروفیت اس قدر بڑھا دے کہ اسے اکثر وقت گھر سے باہر رہنا پڑے اور گھر کے اندر بھی ہو تو ان محفلوں میں شرکت کی خاطر آرائش میں لگی رہے۔ یہ نئی تہذیب عورت کو آزادی اور مساوات کے نام پر دھوکہ دیتی ہے اور ایسی ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے کندھوں پر لادتی ہے جس کے لیے وہ پیدا نہیں کی گئی۔ کہاں یہ بازاروں میں ماری ماری پھرنے والی عورت اور کہاں وہ گھر کی ملکہ۔

نئی تہذیب چاہتی ہے کہ عورت راستوں میں مردوں کی تفریح کا سامان بن جائے اور بازاری لوگوں کی نگاہوں کا ہدف۔ نئی تہذیب دن رات عورت کی تجارت کرتی ہے اور اپنے عشرت کدوں اور قحبہ خانوں کو اس سے آباد کرتی ہے۔ عورت بے چاری ہر جگہ اس تہذیب کے ہاتھوں کھلونا بن گئی ہے۔ نئی تہذیب کی منڈی میں عورت سب سے زیادہ نفع بخش جنس بنی ہوئی ہے۔

مسلمان چاہتے ہیں کہ عورت کی آبرو، اس کے ننگ وناموس کی حفاظت ہو، وہ گھر میں بیٹھ کر خاوند کی راحت کا باعث ہو اور اولاد کی اچھی تربیت کرے۔ مسلمان اسے اس نئی تہذیب کی وباء سے بچا لینا چاہتے ہیں۔

مسلمان کنبہ:

مسلمان کنبہ محبت، ایثار، فرمانبرداری اور حسنِ سلوک سے تشکیل پاتا ہے۔ ہم کسی ایسے دین، قانون یا مذھب سے آشنا نہیں جس نے والدین کی ایسی ہی تعظیم کی ہو جیسی اسلام نے کی ہے۔ قرآن حکیم نے ان کا مرتبہ اتنا بڑھا دیا ہے کہ ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کا ذکر خدا کی توحید وعبادت کے ساتھ ساتھ کیا ہے۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ ہر حالت میں ان سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ ہاں اگر وہ مشرک ہوں اور اپنے بچے کو شرک کا حکم دیں تو اس بارے میں ان کی بات نہیں ماننی چاہیے اور معاملات میں اولاد کو باپ سے بڑے ادب سے پیش آنا چاہیے۔ اسلام نے ماں کی عزت اور پاسِ لحاظ باپ سے زیادہ کیا ہے اس لیے کہ وہ بچہ کو جنم دینے میں سختیاں جھیلتی ہے، اسے دودھ پلاتی ہے، اپنی آغوش میں پالتی ہے اور اس پرورش میں بڑی مصیبتیں اٹھاتی ہے۔ اسلام نے بتایا کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اسلام نے قرابت داروں کی رعایت اور حرمت کی بڑی تاکید کی ہے۔ ان کے حقوق کا ذکر حقوقِ الٰہی کے ساتھ ساتھ کیا ہے:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ﴾ (النساء: 1)

''جس خدا کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اس کا اور قرابت داروں کا پاس ملحوظ رکھو۔''

مسلمان گھرانہ ایک پاکیزہ گھرانہ ہوتا ہے، اس کے افراد آپس میں محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں۔ مسلمان گھرانے میں ماں باپ کا احترام ہوتا ہے، بھائیوں سے مروت ہوتی ہے۔ چھوٹے بڑوں کی اطاعت کرتے ہیں، بڑے چھوٹوں پر شفقت کرتے ہیں۔

نئی تہذیب چاہتی ہے کہ ان اقدار کو تاراج کر دے اور اسلامی گھرانے کا شیرازہ بکھیر دے۔ یہ تہذیب سرکشی، بغاوت اور نافرمانی سکھاتی ہے۔ یہ تہذیب عورت کو گھر سے نکال کر سڑکوں، محفلوں، ہوٹلوں اور کلبوں کو اس سے آباد کرتی ہے۔ نہ والدین کا احتساب باقی رہا، نہ بزرگوں کا احترام، نہ بچوں پہ شفقت۔

میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی معاشرے میں اس تہذیب کے ہاتھوں بڑا ہی بگاڑ پیدا ہوگیا ہے، روحانی اضطراب اور بے چینی پھیل گئی ہے۔ وہ اوصافِ حمیدہ جو ماں باپ کی آغوش میں اچھی تربیت پانے سے حاصل ہوتے ہیں' یکسر ناپید ہوگئے ہیں۔

اسلامی معاشرہ:

اسلامی معاشرے کی بنیاد ہی سچائی پر استوار ہوتی ہے۔ اس میں عدل و انصاف قائم ہوتا ہے، ایفائے عہد ہوتا ہے۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے عدل وانصاف قائم کرو اور دیکھو تمہاری خواہشاتِ نفسانی تمہیں عدل کی راہ سے بھٹکا نہ دیں:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (المائدۃ:8)

''اے ایمان والوں خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے پر آمادہ رہو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ناانصافی پر نہ اکسائے۔ انصاف کرو، انصاف تقویٰ سے قریب تر ہے اور خدا کی نافرمانی سے بچو۔ خدا تمہارے اعمال سے یقیناً آگاہ ہے۔''

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ﴾ (النساء:135)

''اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہو اور خدا لگتی گواہی دو۔ اگر چہ یہ گواہی تمہارے اپنے یا تمہارے ماں باپ اور قرابت داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔''

مسلمان کو کسی کی حق تلفی یا تحقیر کرنے سے بھی روکا گیا ہے۔ اسے یہ بھی تلقین کی گئی ہے کہ وہ کسی پر جھوٹا الزام نہ لگائے، کسی پر افتراء نہ باندھے اور عورت پر بہتان باندھنے والے کے لیے تو خاص سزا ٹھہرائی گئی ہے۔ پھر اس کی گواہی بھی ہمیشہ کے لیے ناقابلِ قبول ہو جاتی ہے۔ اس تہمت طرازی سے اس نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی ہوا وہوس اس کی دینداری پر غالب ہے اور وہ بغیر کسی دلیل کے ایسی سخت (یا خطرناک) بات منہ سے نکال دیتا ہے۔ وہ اسی قابل تھا کہ اس کے قول کی صداقت کو مشکوک سمجھا جائے اور ہر طرح کی شہادت میں اس کی بات ساقط الاعتبار ٹھہرا دی جائے۔

جدید تہذیب کے افکار پھیلے تو جھوٹ اور افتراء پردازی معمولی بات ہوگئی اور انسان ایسے اوصاف کے لبادے اوڑھ کر دنیا کے سامنے آیا جن سے وہ کبھی متصف نہ ہوا تھا۔ اس نے چاہا کہ ایسے کاموں کے لیے اس کی ستائش کی جائے جو اس نے کبھی سرانجام نہیں دیے تھے۔ ایک ہی قوم میں اخبارات نے اپنے اپنے دھڑے کی حمایت میں ہر جائز وناجائز حربہ اختیار کرنا روا سمجھ لیا۔ پھر ہر قوم نے دوسری قوموں پر کیچڑ اچھالا، ان پر بہتان باندھے اور ان میں ایسی قباحتیں نکالیں جو ان میں کبھی پیدا نہ ہوئیں تھیں، حتیٰ کہ حق وباطل میں حدِ فاصل کھینچنا لوگوں کے لیے مشکل ہوگیا۔

تم میں سے جو شخص اس بارے میں میرے ساتھ جھگڑتا ہے اسے چاہیے کہ وہ کان دھر کر اس پراپیگنڈا کو سُنے جس سے دن رات یہ دنیا گونجتی رہتی ہے۔ یہ واویلا جو دنیا میں آج ہر سُو پھیلا ہوا ہے، یہ مجنونانہ دعاوی، یہ متناقض خبریں، یہ گمراہ کن افکار ان سب کا باعث یہی ہے کہ انصاف اور سچائی لوگوں کی نظروں میں حقیر ہوگئی ہے اور حکومتوں، جماعتوں، پارٹیوں اور افراد کے ذاتی مفاد کے لیے ہر جھوٹ، ہر الزام اور ہر بہتان مباح ہوگیا ہے۔

اس ذاتی مفاد کی خاطر لوگ ایک دوسرے پر تہمتیں میں دھرتے ہیں اور اسی جھوٹے پروپیگنڈا ہی کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے ڈرتے اور دبکتے ہیں۔ ہر دھڑا یہی کہتا ہے: ہم عدل وانصاف چاہتے ہیں، ہم امن اور آشتی کے

خواہاں ہیں اور انسانی خوش حالی و بہبود ہی ہمارا مطمح نظر ہے۔ ہر دھڑا پکار رہا ہے، ہم فتنہ فساد نہیں چاہتے، ہم جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے.....ان کی اس بات میں رتی بھر بھی سچائی نہیں ہے۔

یہ وبائیں اسلامی معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنا چاہتی ہیں اور مسلمان سمجھتا ہے کہ یہ متمدن اقوام کے طور طریقے ہیں اور جدید تہذیب کے تقاضے ہیں۔ تف ہے مسلمانوں پر اگر یہ فریب وہ کھا جائیں۔ اگر یہ بداعمالیاں انہیں بھا جاتی ہیں، یہ ہوا و ہوس کی باتیں اگر انہیں سیدھی راہ سے بھٹکا دیتی ہیں اور یہ شور و غوغا اگر ان کے کان بہرے کر دیتا ہے.....تو حیف ہے ان پر۔

مسلمان کا فرض ہے کہ وہ عدل و انصاف کی گواہی دے، ظلم نہ کرے، ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرے، جھوٹ نہ بولے، دھوکہ نہ دے کہ یہی اوصاف پیدا کرنے کے لیے اسلام نے اسے اپنی آغوش میں پالا تھا۔

اسلام چاہتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کی اساس محبت اور تعاون کے جذبہ پر رکھی جائے۔ معاشرہ میں عدل و انصاف پھیلے، ہر شخص حلال روزی کمائے، جسے تونگری ہاتھ آجائے اس کی دولت میں غریبوں کا حصہ ہو اور یہ مایا تو آنی جانی ہے۔ ہوسکتا ہے جو شخص آج دولت کے نشے میں سرشار ہے کل تک کنگال ہو جائے اور جو آج فقر و فاقہ کی سختیاں جھیل رہا ہے کل اس کے ہاں دولت کی گنگا بہہ رہی ہو۔ پس یہ غریبی اور امیری کا امتیاز ایک جھوٹا امتیاز ہے۔

شریعت سب کی نگران ہے۔ وہ ہر شخص کے حقوق کی ضامن بھی ہے اور ہر ایک پر ذمہ داریاں بھی عائد کرتی ہے۔ شریعت امیروں سے مال لے کر غریبوں کا پیٹ بھرتی ہے۔ اسلامی معاشرہ کے تمام افراد آپس میں ایک رشتۂ اخوت میں منسلک ہیں اور اسلام اس اخوت کے حقوق پر بڑا زور دیتا ہے۔

یہ ہیں وہ باتیں جن کی اسلام تلقین کرتا ہے اور جو ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد ہیں۔ اگر آج اسلامی معاشرہ میں یہ نقص و فتور اور یہ ضعف و خلل پیدا ہو گیا ہے تو اس کا باعث یہی ہے کہ مسلمان اپنے دین کے قواعد و ضوابط سے ناآشنا ہیں اور اپنے پیمبر (علیہ افضل التحیات وایمنہا) کی سنت سے منحرف ہو گئے ہیں۔

جدید رجحانات میں یہ اوصاف نہیں ملتے ہیں۔ اکتناز و احتکار کا مرض عام ہو گیا ہے۔ لوگوں کو ایک ہی دھن لگی ہوئی ہے اور وہ دولت سمیٹنے میں دوسروں سے بازی لے جانے کی دھن ہے۔ لوگ دنیا کی ہڈی پر کتوں کی طرح ٹوٹ پڑے ہیں، یہ دنیا ان کا منتہائے نظر ہے اور ان کی کاوشوں کی آخری منزل ہے۔ جسے حلال دولت میسر نہیں آتی، وہ بھاگ دوڑ کرتا ہے کہ کہیں سے حرام ہی غت ر بود کی جائے۔ وہ دولت مندوں کے خلاف جی میں کد رکھتا ہے اور ان سے دولت ہی کی خاطر برسرپیکار رہتا ہے۔ اس طرح قوم کے مختلف طبقوں میں بڑی گہری دشمنی پیدا ہو گئی۔ تمام روحانی اور اخلاقی اقدار بے وقعت ہو گئیں۔ لوگوں کی حرص و آز بڑھی تو ان کی جنگ تیز تر ہو گئی، جیسا کہ اس آئے دن کی جنگ کے دھاکوں اور فتنوں سے ظاہر ہے۔ آج کل روٹی کے مسئلہ پر بہت زور دیا جا رہا ہے۔ عزت آبرو جاتی رہے، آزادی چھن جائے،

انسان دوسروں کے ہاتھوں میں بے حس وحرکت کٹھ پتلی بن جائے مگر پانی اور چارہ میں سب کا حق یکساں ہے۔لوگوں کی بدبختی اور مصیبت کا زمانہ بہت لمبا ہوگیا ہے مگر ابھی تک روٹی کی گتھی بھی نہ سلجھائی جاسکی۔

یہ دشمنی، یہ بغض وعناد، یہ ظلم وعدوان، یہ جبر واکراہ، یہ انسانی فضائل سے محرومی ..... ہمیں خدشہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں یہ خرابیاں پیدا نہ ہوجائیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے علی الرغم یہ خرابیاں اسلامی معاشرے میں سرایت کر رہی ہیں۔ ہمیں خدشہ ہے کہ اگر یہ خرابیاں ہماری ہڈیوں میں رچ گئیں تو ہم اپنی بلند اقدار اور معزز مقاصد سے بھٹک جائیں گے اور شقاوت وبدبختی کے ایک عمیق گڑھے میں گر جائیں گے۔

اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں۔حق وانصاف کے نافذ کرنے میں ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ ہر شخص کو جو مل جائے اس پر مطمئن ہو اور جو نہ مل سکے اس کے بارے میں پر امید رہے، لیکن تقاضا میں غلو نہ کرے اور نہ راہ سے بھٹکے۔ اپنے بھائیوں کے لیے مالی اور جانی قربانی دے۔ اگر ان پر کوئی مصیبت آن پڑے تو ان کی چارہ سازی کرے اور دکھ سکھ میں ان کا شریک ہو۔ ہمیں ایک ایسے معاشرے کی ضرورت ہے جس کا دستور العمل یہ آیت ہو:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ﴾ (النحل: 90)

''یعنی خدا حکم دیتا ہے کہ انصاف کرو (لوگوں کے ساتھ)۔ نیکی کرو، قرابت داروں کی خدمت کرو، اور خدا بے حیائی، بے ہودگی اور ایک دوسرے پر زیادتی سے روکتا ہے۔''

اور جس کا شعار یہ ہو:

لا يؤمن احدكم حتى يحب لاخيه ما يحب لنفسه.

''تم میں سے کوئی صحیح معنوں میں مومن نہیں بن سکتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہ پسند نہیں کرتا جو وہ اپنے لیے کرتا ہے۔''

آج کی تہذیب پر مادیت چھائی ہوئی ہے۔ یہ تہذیب ہوا وہوس کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہے، حرص وآز کی باندی ہے۔ جدید ترین رجحان تو یہ ہے کہ انسان بھی حیوان ہے اور پیٹ کی فکر سب سے اہم ہے۔نئی پود کا انسان اس سطح سے اونچا نہیں جاتا اور اس دائرہ سے قدم باہر رکھ ہی نہیں سکتا۔

نئی پود کے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کھانے، پینے، پہننے اور جسمانی اور مادی ضرورتوں کے علاوہ ہر رابطہ توڑ ڈالے۔ اس کے لیے واجب ہے کہ وہ ہر غیر مادی بات سے انکار کردے نہ کوئی خدا ہے، نہ کوئی دین ہے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ان تمام انسانی اقدار سے انکار کردے جن میں یہ گونگا حیوان شریک نہیں۔ پس نہ کوئی ارادہ، نہ حریت،

نہ کردار، نہ احساسات، کچھ بھی باقی نہیں رہنا چاہیے۔

اس نئی پود کے انسان کو چاہیے کہ وہ صلہ رحمی، شفقت، رحم، اخوت اور اس قبیل کی تمام باتوں کا ٹھٹھا اڑائے۔ انسان اگر تمام ادیان اور انسانی فضائل سے انکار بھی کر دے تو کیا ہوا، خورد ونوش میں شریک ہونے کا حق تو وہ رکھتا ہی ہے یا یوں کہیے کہ چارہ اور پانی میں تو وہ شریک ہے ہی۔

یہ ہے تمہاری جدید تہذیب اور یہ ہے مادیت اپنی آخری اور جدید ترین شکل میں.....!

مسلمانو! اس تمدن سے حذر کرو اور کوشش کرو کہ تم اپنا دامن اس سے بچا سکو اور ایمان، دین، شریعت، اخلاق، مروت، جوانمردی، رحم، عدل، احسان اور دوسری بلند اقدار جن کے تم وارث ہو' مضبوطی سے تھامے رہو۔ اگرچہ آج اکثریت ان اقدار کو جھٹلا رہی ہے۔

مسلمانو! یہ آزمائش کا وقت ہے، صبر وانضباط سے کام لو، ثابت قدمی سے جمے رہو اور اپنی طرف اور اپنے دین اور تاریخ کی طرف لوٹ چلو' تاکہ تم انسانیت کو اس ہمہ گیر فتنہ وفساد سے بچا سکو اور انسانوں کو اندھیروں سے نکال کر اجالے میں لا سکو۔

تمہاری شان کے یہ کس قدر شایاں ہیں کہ تم لوگوں کو اخوت اور انصاف کی طرف بلاؤ اور تم بنی نوع انسان کو ایمان، سچائی اور بھلائی کی راہ دکھاؤ۔

مختصر یہ کہ تم ایسے ہو جاؤ جیسے قرآن کہتا ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ (آل عمران: 110)

''لوگوں کی راہنمائی کے لیے جو لوگ پیدا ہوئے تم ان میں سب سے بہتر ہو، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔''[1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام، لاہور (17 جنوری، 7 فروری 1958ء)

ایک دینی جماعت کو کیسا ہونا چاہیے؟

سید ابوبکر غزنوی لکھتے ہیں:

جماعت اہل حدیث جس کا اوّلین مقصد تبلیغ واحیائے دین ہے، کا الیکشن کی اکھاڑ پچھاڑ میں لگے رہنا اس کے لیے سم قاتل ہے۔ جماعت کے سربراہ آوردہ افراد کی صلاحیتیں انتخابات لڑنے اور جیتنے ہی میں غارت ہو جائیں گی اور وہ تمام بیماریاں جو سیاسی جماعتوں میں ہیں، جماعت اہل حدیث میں بھی سرائیت کر جائیں گی .... جھوٹا پروپیگنڈا، اکھاڑ پچھاڑ، ساز باز، حبِ مال، حبِ جاہ.... للّٰہیت اور روحانیت برباد ہو جائے گی۔ تزکیہ نفس، روحانی تربیت اور اعلائے کلمۃ الحق کا وہ عظیم مقصد جو ہمارے اسلاف کے پیش نظر تھا، نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔

ایک دینی جماعت کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں مال اور عہدوں کی ہوس کے سب مواقع بند کر دیے جائیں اور صرف وہی لوگ اس میں ٹھہر سکیں جو مشنری سپرٹ کے ساتھ محض رضائے الٰہی کے لیے کام کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں، جو اپنا وقت، مال، اپنی توانائی اور اپنی تمام صلاحیتیں اللہ کی راہ میں کھپا سکیں۔

دینی جماعت کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ حصولِ رضائے الٰہی کے سوا کسی اور مقصد کے لیے داخل ہونے والوں کا سانس اس مقدس فضا میں گھٹنے لگے اور جماعت کے ہر فرد کے دل ودماغ پر ایک ہی بات چھائی ہوئی ہو.... الهي أنت مقصودي ورضاك مطلوبي۔

(حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ علیہ ص: 264، 265)

(باب دہم)

مکاتیب سید ابوبکر غزنوی

① بنام حکیم عبدالرحیم اشرف①

جبی فی اللہ حضرت مولانا!

السلام علیکم وعلی من لدیکم②

مدت ہوئی آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا تھا کہ "المنبر" کے لئے پیغام بھیجوں۔ مصروفیتوں کا کچھ ایسا ہجوم تھا کہ جواب میں تاخیر ہوئی۔ معذرت خواہ ہوں۔ کچھ یہ خیال بھی تھا کہ

آں راز کہ در سینہ نہان ست نہ وعظ ست
بر سر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت③

مگر یہ خیال غلط تھا۔ اب تو آپ کے المنبر پر بھی دار ورسن کا گمان ہوتا ہے۔ ہاں المنبر دار ورسن ہے ....الحاد و زندقت کے لئے .... مادیت واشتراکیت کے لیے .... اسرائیلیت کے لئے ....قادیانیت کے لئے۔

شیطنت کوئی بھی روپ دھارے

تو اندازِ قدت را می شناسی④

آپ فوراً اس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ آپ کا وار اکثر واشگاف ہوتا ہے۔ اشارے کنائے سے بات کہنے کے آپ قائل نہیں۔

مبلغین کے مزاج کا ایک اختلاف دلچسپ ہے۔ بعض مبلغین کا رجحان نہی عن المنکر کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور بعض کو مثبت انداز میں امر بالمعروف کرنے میں لطف اندوز ہوتا ہے۔ آپ میں بھی نہی عن المنکر کی صلاحیت زیادہ ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مکتوبات شریف میں اپنے ماحول کی بدعات اور مشرکانہ رسوم کا کہیں ذکر کرتے ہیں تو ساتھ فرماتے ہیں: 'رگِ فاروقیم درحرکت آمد' میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ آپ کی رگِ فاروقی بھی پیہم حرکت میں رہتی ہے۔ خدا اسے توانا رکھے اور پیہم فیضان بخشے۔

بندۂ عاجز کا رجحان مثبت اور ایجابی انداز میں تلقین کرنے کی طرف زیادہ ہے۔ روشنی سے اندھیرا خود چھٹ جاتا ہے۔

---

① المنبر کی نشاۃ ثالثہ پر اکابرین کے پیغامات۔
② لدیکم سے مراد عزیزم خالد ہے۔ (ع۔ا)
③ وہ راز جو سینے میں پوشیدہ ہے، راز نہیں ہے۔ وہ بر سرِ دار تو کہا جا سکتا ہے، مگر بر سرِ منبر نہیں کہا جا سکتا۔
④ بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　من اندازِ قدت را می شناسم
"تو چاہے جس بھی رنگ کی پوشاک پہن لے، میں تجھے تیرے قد سے پہچان لوں گا۔"

وللناس فیما یعشقون مذاهب

حضرت! اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں حسین امتزاج ہو تو کیا افادیت زیادہ نہ ہو؟ المنبر کا باطن ظاہر سے بہتر ہوتا تھا۔ ظاہر سے میری مراد 'المنبر' کا سرِ ورق ہے۔ مجھے وہ رسالے اور انسان بھلے معلوم ہوتے ہیں جن کا باطن ان کے ظاہر سے حسین تر ہے۔ ارتقائی منزل یہ ہے کہ ظاہر و باطن یکساں حسین ہوں۔ میری دعا ہے کہ المنبر سب کی تسکین کا سامان ہو۔

'بہ رنگ اصحابِ صورت را
بہ بو اصحابِ معنی را'

میری ہمدردیاں، میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اللّٰهم أيده بجنودك التى نراها واجعله سيفاً صلولًا يدمغ الباطل حتى يصير الباطل هباءً منثورًا.

الفقیر الی اللہ
ابوبکر غزنوی ①

② بنام شیخ الحدیث مولانا محمد عبد اللہ صاحب

(ادارہ علومِ اثریہ لائل پور)

مکرمی و محترمی جناب مولانا صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شکیب ② کی وفات کا ہم سب کو صدمہ ہے، اللہ تعالیٰ اسے جنت الفردوس عنایت فرمائے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

اس سلسلہ میں راقم نے آپ کو ایک تار ارسال کیا تھا جس میں بچے کی وفات پر تعزیت کا اظہار تھا اور عبید اللہ ③ کو فوراً لاہور لانے کے لیے لکھا گیا تھا کیونکہ گلاب دیوی ہسپتال میں بستر کا انتظام فوراً کروایا گیا تھا لیکن افسوس کہ تار

---

① ہفت روزہ المنبر (24 جون 1967ء)

② مکتوب علیہ کے صاحبزادے۔

③ مکتوب علیہ کے صاحبزادے۔

آپ کو نہیں ملا۔

مولانا عطاء اللہ صاحب کے ذریعے آپ نے عبید اللہ کے علاج کے متعلق کہا تو درج ذیل کوائف سے جلد مطلع فرمائیے:

① مریض کی عمر کیا ہے؟

② بیماری کی تاریخ کہ اسے کب تکلیف ہوئی؟ اور کیا علاج ہوتا رہا؟

③ اب موجودہ تکلیف کیا ہے؟ اور کیا علاج ہو رہا ہے یا نہیں؟

ان تمام حالات سے جلد مطلع کریں۔ ان شاء اللہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔

مخلص: ابو بکر غزنوی

مورخہ: 20 مئی 1972ء

③ بنام جناب بشیر انصاری صاحب

مدیر اعلیٰ ''الاسلام''

محترم انصاری صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا گرامی نامہ ملا مصروفیتوں کا ہجوم تھا جواب میں تاخیر ہوئی، معذرت خواہ ہوں۔ آپ نے جس محبت و اخلاص کا اظہار فرمایا ہے اس کے لیے شکر گزار ہوں۔

میرے لیے دعا فرمائیے گا کہ خدا تعالیٰ اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے دین کے بے لوث خادموں میں شامل کر دے۔

جیسے آپ نے لکھا ہے کہ نوجوانوں کی تنظیم نہایت ضروری ہے، اگر نوجوانوں کی تنظیم کے بارے میں آپ تجاویز مفصل لکھیں یا خود کسی روز تشریف لا کر مجھ سے بات کریں تو مجھے خوشی ہوگی۔ بالعموم شام ساڑھے چار بجے کے بعد میں گھر چلا جاتا ہوں۔ والسلام

مخلص

ابو بکر غزنوی

مورخہ: 8 مارچ 1964ء

④ بنام حافظ عبد الرشید اظہر صاحب

(خانیوال)

مکرمی و محترمی جناب عبد الرشید اظہر صاحب

السلام علیکم!

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، میری تقرری پر آپ نے جس مسرت کا اظہار کیا ہے میں اس کے لیے آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

آپ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان نئی ذمہ داریوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ کا مخلص

ابوبکر غزنوی

وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

مورخہ: 17 ستمبر 1975ء [1]

---

[1] ہفت روزہ الاسلام (8 اکتوبر 1976ء)

ضمیمہ

سرگزشت مولانا داؤد غزنوی... تصنیف سید ابوبکر غزنوی پر تبصرہ

تحریر: ڈاکٹر سید عبداللہ

سوانح عمریاں تو بہت لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں، لیکن بعض سوانح عمریاں اپنے خصائص فائقہ کی وجہ سے، امتیاز کی مالک ہو جاتی ہیں۔ پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کی لکھی ہوئی سرگزشت مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔

اس سرگزشت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک فرزند کے تاثرات پر مشتمل ہے اور اس کی یہی نوعیت ایسی ہے جو سوانح نگار پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد کر دیتی ہے جس سے سوانح عمری کی مشکلات میں بے اندازہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ یوں تو ایک فرزند.... بلکہ ہر کوئی کسی بھی شخص کے بارے میں جو کچھ چاہے لکھ سکتا ہے۔ لیکن معیاری سوانح عمریاں تبھی وجود میں آسکتی ہیں، جب لکھنے والا سوانح نگاری کے تقاضوں کو پورا کرے، ان اصولوں کا پابند ہو جو ایک اصولی اور فنی سوانح عمری کے لیے ضروری ہیں۔ اور ان قاعدوں اور ضابطوں کا خیال رکھے جن کے بغیر سوانح عمری محض واقعات کا ذخیرہ بن کے رہ جاتی ہے۔

ایک فرزند جب اپنے نامور والد کے حالاتِ زندگی مرتب کرتا ہے تو اسے ایک بہت بڑی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے، سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ عقیدت و محبت کا وفور اس کے قلب و دماغ پر غالب ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں، انسان عظمتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے.... وہ ایک کشمکش میں ہوتا ہے، اس کی محبت بسا اوقات اس کی غیر جانبداری پر غالب آجاتی ہے اور اس کے نتیجے میں، اس لیے ہر شے کو بنظر محبت دیکھنا پڑتا ہے۔

ایک فرزند کے لیے اپنے بزرگوار کی لائف لکھنا امتحان سے کم نہیں، میں تو نہیں کہہ سکتا کہ سید ابوبکر اس مشکل سے کس طرح بچ نکلے، لیکن بہ وثوق کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے سوانح نگار نے عقیدت والفت کے باوجود اپنے والد کی جو تصویر پیش کی ہے، اس کا ہر ہر لفظ سچ ہے، اس کا ہر ہر بیان امر واقعہ اور صحیح صورت پر مبنی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے بہت کچھ نہ لکھا ہو، لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ انہوں نے ہر ضروری بات لکھ دی ہے، اور جس طرح لکھی اور جتنی لکھی، اس میں صداقت ہی صداقت ہے.....

میں نے یہ سب باتیں، جدید مغربی ذوقِ سوانح نگاری کے زیر اثر لکھی ہیں، ورنہ حق یہ ہے کہ سوانح عمری کے بارے میں مسلمانوں کا اپنا ایک خاص تصور ہے جو مغربی تصورات کی ضد نہ بھی ہو تب بھی اس سے بہت مختلف ہے۔

خوش قسمتی سے سید ابوبکر غزنوی نے اپنے تصورِ سوانح نگاری کا کتاب کے حرفِ آغاز میں خود ذکر کر دیا ہے، بالکل توقع کے مطابق انہوں نے اس معاملے میں قرآن مجید ہی سے مشورہ لیا ہے، اور واضح کیا ہے کہ دنیا کی عظیم (خصوصاً دینی) شخصیتوں کے ذکر کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ ان کے واقعات زندگی کو نمونہ بنایا جائے، ان کے ذکر اور سرگزشت سے بصیرت بھی حاصل کی جائے اور عبرت بھی۔ ہمارے سوانح نگار نے اس واضح مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ عظیم قرآنی شخصیتوں کا ذکر بار بار تذکیر و موعظت کی غرض سے آیا ہے، تاکہ انسانیت پر یہ واضح کیا جا سکے کہ انسان غیر معصوم ہوتے ہوئے بھی قربِ و ولایت کی بلندیوں سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ پس بزرگوں کے حالاتِ زندگی محفوظ کرنا اور انہیں بنی نوع انسان کے سامنے پیش کرنا عین منشائے الٰہی اور کتاب اللہ کی اقتدا ہے۔

اور یہ نقطہ بھی بہرحال قابل غور ہے کہ

''کسی انسان کی سیرت کے بارے میں اس کے گھر کے افراد کی گواہی بہت بڑی گواہی ہے۔''

محبت کی آزمائش کے باوجود سوانح عمری کا یہ بہت زرّیں اصول ہے۔ جس طرح "صاحب البیت ادری بما فیه" تاریخ و سیرت کی ایک اہم اساس ہے۔ اسی طرح گھر والوں پر گھر والے کی گواہی بھی ایک سند ناطق ہوتی ہے۔

آج کے لوگ مسلم شائستگی اور مسلم آداب کی گہری حکمتوں اور پاکیزہ شرافتوں کے بارے میں کور ذوق ہوتے جاتے ہیں، ورنہ ان پر یہ عیاں ہو جاتا کہ مسلم معاشرہ شرفِ انسانی کا پاسدار تھا، وہ اس امر پر زور دیتا تھا کہ عظیم انسانوں کی عظمتوں کو سامنے لایا جائے تاکہ ان کے بنی نوع بھی شرف و کمال کے ان مراتب تک پہنچ سکیں جو ریاضت، محنت، جستجو اور مجاہدۂ روحانی کی بدولت ناخدائے کائنات کسی بشر پر ارزانی کرتا ہے، سوانح نگاری کا مقصد مغرب والوں کے نزدیک بے نقاب کرنا ہے، مسلم تصور کے مطابق سوانح عمری انسان کے کسب کمال کی چہرہ کشائی کرتی ہے۔ یعنی انسان نے وہ جیسا کچھ بھی ہے، اپنی بشریتوں اور فطری کمزوریوں کے باوجود کمال تک پہنچنے کے لیے تکلیفیں اٹھائیں، کتنی فریاد کی، کتنی کوہکنی کی، تب جا کر عظمت حاصل کی۔ سید ابوبکر کی مرتب کردہ سوانح عمری اس کوہکنی کی داستان ہے۔

یہ سرگزشت دراصل چند سوانحی خاکوں کا مجموعہ ہے، اس کے بیشتر مضامین حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے احباب اور عقیدت مندوں کے رقم کردہ ہیں۔ ہر ایک نے حضرت مولانا پر اپنے اپنے زاویۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے، ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق اور اپنے اپنے روابط کے اعتبار سے معلومات فراہم کی ہیں۔ اس لحاظ سے اسے سوانح عمری تو نہیں کہا جا سکتا، محض سوانحی تاثرات ہی کہا جا سکتا ہے....

بایں ہمہ دوسرے حضرات کے مضامین کے بعد سید ابوبکر غزنوی کے قلم سے جو سرگزشت اس میں شامل ہے، اس سے کتاب میں سوانحیت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ اس حصے کا سرنامہ سیّدی وابی ہے، اور ان دو لفظوں میں ان معانی کی روح سمٹ کر جلوہ گر ہو گئی ہے جو اس روداد میں نور و نکہت کی حیثیت رکھتی ہے۔

سیدی میں دو عقیدتیں پنہاں ہیں جو ایک مرشد کے لیے ہوتی ہیں، اور ابی میں وہ جذبات موجزن ہیں جو ایک فرزند کے اپنے پدر بزرگوار کے لیے ہوتے ہیں۔ ان عناصر کے امتزاج سے یہ شیریں کتاب ظہور میں آئی ہے۔

سیّدی وابی میں ایک طرف مولانا داوٴد غزنوی رحمہ اللہ کے وہ واقعات درج ہیں، جن سے ان کی شب و روز کی زندگی عبارت تھی۔ خاندانی حالات، بزرگوں کی غزنی سے آمد، تعلیم و تربیت، سیاسی زندگی اور آخر میں دینی رشد و ہدایت کے طریقے اور فیوض ہیں، اور جب مصنف نے یہ کہا تو سچ کہا کہ

"جب والد علیہ الرحمۃ پر لکھے ہوئے تمام مضامین پڑھے تو محسوس کیا کہ یہ تو چند یادیں ہیں، چند تاثرات ہیں، چند نقوش ہیں، ان کی مرتب سوانح حیات تو نہیں ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کتاب ناقص اور ادھوری رہ جائے گی، اگر والد علیہ الرحمۃ کے حالات باضابطہ مرتب نہ کیے گئے اور ان کے دینی اور علمی رجحانات کی وضاحت نہ کی گئی۔"

اور اس میں کیا شک ہے کہ سید ابوبکر غزنوی اپنے والد محترم کے خاص حالات اور ان کے معارف و فیوض پر نہ لکھتے تو یہ کتاب ناقص بھی ہوتی اور بے مزہ بھی، موجودہ صورت میں یہ کتاب مانع تو نہیں مگر جامع تصور اور تصویر دے رہی ہے۔ اور تصویر بھی ایسی کہ رنگین کہا جائے تو مناسب ہوگا، یہاں رنگین سے میری مراد اندازِ بیان کے لحاظ سے رنگین ہے، اور سب جانتے ہیں کہ سید ابوبکر غزنوی کا اسلوبِ خطابت اور اسلوبِ تحریر اس دلکش اور دلآویز طرزِ بیان کا عکس ہے، جسے پہلے شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے پھر مولانا ابوالکلام رحمہ اللہ نے اس ملک میں رائج کیا۔

سیّدی وابی والا حصہ بالکل شبلی رحمہ اللہ و ابوالکلام رحمہ اللہ کے انداز میں شعر سے شروع ہوتا ہے، جس میں فارسی غزل کی استعاریت اور رومانیت موجود ہے.... اس کے بعد یہ استعارہ تدریجاً تصویر میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ لفظوں کی شیرینی، ترکیبوں کی خوش ادائی، ادب کی رعنائی، پیرائے کی زیبائی اور عبارتوں کا حسن' اپنی پوری شان سے ظاہر ہوتا ہے۔

غزنوی خاندان کی داستانِ دعوت و عزیمت بجائے خود ولولہ انگیز اور حریت آموز ہے، مگر اس مختصر تبصرے میں اس کی تفصیل کی کوشش ممکن نہیں۔ اگر چند باتیں، حضرت مولانا داوٴد غزنوی کے فقہی اور صوفیانہ مسلک کے بارے میں ہی بیان کر دی جائیں تو موجودہ مقصد کے لیے کافی ہوں گی۔

یہ تو معلوم ہے کہ غزنوی خاندان مسلک کے لحاظ سے حنبلی عقائد کے قریب اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور امام ابن قیم رحمہ اللہ کے طریق کا پیرو تھا، لہٰذا قدرتی طور سے مولانا داوٴد رحمہ اللہ بھی اسی زاویہ نظر پر قائم تھے لیکن سیدی وابی کے مصنف نے ان کی تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے والد کے معتقدات میں جہاں ایک طرف استقامت تھی وہاں اعتدال بھی تھا۔

احناف اور اہلحدیث دونوں گروہوں میں جب شدید کشمکش پیدا ہوئی، تو دونوں طرف غلو اور انتہا پسندی نے غلبہ

پایا، چنانچہ بعض متشدد اہلحدیث نے آئمہ کبار کے بارے میں بے ادبی کے کلمات کہے اور غالی احناف، اہلحدیث کے اسلام کے ہی منکر ہوئے۔ لیکن طبع سلیم رکھنے والے لوگ دونوں گروہوں میں ہمیشہ موجود رہے ہیں .... چنانچہ خود مولانا داؤد ان بزرگوں میں سے تھے جو مابہ الاختلاف کے باوجود مابہ الاشتراک کے اصول پر مسلمانوں کے اتحاد اور یک جہتی پر زور دیتے اور عمر بھر اختلاف کے دائرے کو کم کرتے رہے۔

میرا یہ بیان سادہ سا ہے، اس کی رنگین تفصیل وتشریح سیدی وابی میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح عام طور پر یہ مشہور ہے کہ اہلحدیث کا گروہ، تصوف کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا لیکن یہ خیال حقائق کے خلاف ہے، جسے اس حقیقت کا بچشم خود مشاہدہ کرنا ہو، اسے علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب إغاثة اللهفان کا مطالعہ کرنا چاہیے جس میں عجائبات وفیوض قلب کا مشرّح بیان موجود ہے۔

سیدی وابی میں سید ابوبکر نے حضرت مولینا داؤد کی کتاب 'معارف اللطائف' سے اور خود اپنے مشاہدات ومسموعات کی بناء پر واضح کیا ہے کہ حضرت مرحوم ومغفور ذوقیات تصوف کے نہ صرف شناسا تھے بلکہ ان میں ڈوبے ہوئے تھے، البتہ یہ درست ہے کہ وہ تصوف کے ان مشاغل کے حق میں نہ تھے جو قرآن وحدیث کے خلاف اور مسلک قیم سے متصادم تھے۔

تصوف کے سلسلے میں ان کے خیالات پر حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کے خیالات کا پرتو ہے۔ لیکن یہ تبصرہ تفصیل کا متحمل نہیں، جیسا کہ بیان ہوا ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں، ایک وہ جو دوسرے حضرات کا رقم کردہ ہے، اس میں حضرت مرحوم ومغفور کی سیاسی زندگی کی تفصیل زیادہ ہے، دوسرا حصہ سیدی وابی گھر کے فرد کا مشاہدہ وتاثر ہے جسے اپنے بزرگوار کو قریب سے دیکھنے کا قدرتاً بھرپور موقعہ ملا ہے۔ اسے ہم مولانا کے خصائل وشمائل وفضائل کا صحیح آئینہ کہہ سکتے ہیں۔ جس میں مرحوم ومغفور اپنی وجاہت وزیبائی .... اپنی نفاست وخوش پوشی اور اپنی بلاغت وفصاحت، اپنی خطابت وطلاقت لسانی کے ساتھ، اپنی پوری شبیہ اور پورے پیکر میں ہو بہو نظر آتے ہیں۔

بلاشبہ یہ کتاب خصوصاً اس کا باب 'سیدی وابی' موجودہ دور کی سوانحی ادبی تحریروں میں خاص خوشبو، خاص رنگ اور خاص نقش کا حامل ہے۔ مجھے یقین ہے، ہر پڑھنے والا اسے ایک سوغاتِ خاص خیال کرے گا اور اپنے خاص مطالعات کے لیے ہمیشہ اسے اپنے پاس محفوظ رکھے گا۔ [1]

---

[1] ہفت روزہ چٹان (28 اپریل 1975ء)

پیش لفظ.... تعلیم وتزکیہ

احباب جانتے ہیں کہ حضرت مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہر جمعرات ''مجلسِ ذکر'' منعقد ہوتی تھی۔ مجلسِ ذکر کا یہ معمول تھا کہ موسم سرما ہو یا گرما' سورج غروب ہونے سے پیشتر پون گھنٹہ مجلس شروع ہوتی تھی۔ پہلے پندرہ منٹ خاموشی کے ساتھ اذکارِ مسنونہ جاری رہتے' پھر پندرہ منٹ قرآن وسنت کی تعلیمات پر روشنی ڈالتے۔ نمازِ مغرب باجماعت ادا ہوتی اور احباب چائے کے بعد رخصت ہو جاتے۔ ''مجلسِ ذکر'' کا بنیادی مقصد ''تعلیم وتزکیہ'' تھا۔ سیّد صاحب کی زبان میں:

''دل کی یوں تربیت کرنا کہ دماغ کو پھپھوندی لگ جائے' نقصان دہ ہے اور عقل کی یوں تربیت کرنا کہ دل کی بستی ویران ہو جائے' بھی شخصیت کی نشوونما کے لیے ضرر رساں ہے۔ 'تحریک احیائے دین' اس بات پر زور دیتی ہے کہ دل اور دماغ کی بیک وقت یوں تربیت کی جائے کہ ان میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ وہ فیضان جو حضور علیہ الصلاۃ والسّلام نے انسانیت کو بخشا قرآن مجید نے اسے چند لفظوں میں سمیٹ دیا: ﴿يُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (آل عمران: 164) ''(i) وہ ان کا تزکیہ کرتے ہیں، ان کے دلوں کی سیاہیاں دھو ڈالتے ہیں. (ii) اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔'' پس احیائے دین اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تزکیہ اور کتاب وحکمت کی تعلیم کو یکجا نہیں کیا جا سکتا۔''

سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کی خاص دولت سے مالا مال کیا تھا۔ وہ بدیع الزمان تھے۔ اس نسبت سے انھیں علامہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا مگر انھوں نے اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ ''علامہ'' کے لاحقے سے گریز کیا۔ بلکہ شہر کے علاموں کو دیکھ دیکھ کر اس لقب سے انھیں نفرت کی حد تک چڑ تھی۔ فرماتے تھے: جس کو قرآن مجید کی دو آیتیں یا چار حدیثیں اَزبر ہو جاتی ہیں وہ اپنے آپ کو علامہ کہلوانا شروع کر دیتا ہے۔ اُن کی کسرنفسی کی انتہا یہ تھی کہ اپنے آپ کو ہمیشہ دین کا ایک ادنیٰ طالب علم گردانتے تھے۔ اس ضمن میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دیا کرتے تھے کہ انھوں نے فرمایا تھا: مجھے ''لا أدری'' .... میں مسئلہ نہیں جانتا.... کہنے میں جو خوشی حاصل ہوتی ہے، وہ ''أدری'' 'میں جانتا ہوں' کہنے میں حاصل نہیں ہوتی۔ سو وہ بھی ساری عمر اس کسرنفسی اور انکساری پر برابر قائم رہے اور اخباری علامہ نہ بنے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن وحدیث کے مسلسل اور پیہم مطالعہ اور شب وروز ذکرِ الٰہی میں مستغرق رہنے نے اُن پر قرآن مجید کے انوکھے اور اچھوتے مطالب ومعانی اور معرفت الٰہی کے اسرار ورموز وا کر دیئے تھے۔ عشقِ نبوی

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سرشار ہو کر وہ احادیث کی ایسی ایسی تشریح فرماتے کہ انسان حیران رہ جاتا تھا۔ "مجلسِ ذکر" یہ چند منٹوں کی گفتگو بہت علمی، مستند، جامع اور بڑی مربوط ہوتی تھی۔ انداز دل نشین، اسلوب خطابی اور ادائیگی اس قدر خوبصورت اور ادبی چاشنی لیے ہوتی کہ آدمی کے دل پر اثر انداز ہوتی۔ حوالے کے بغیر بہت کم گفتگو کرتے تھے۔ بعض اوقات ایک آیت یا حدیث کی تشریح مسلسل تین چار جمعراتوں پر پھیل جاتی تھی۔

مقامِ افسوس یہ ہے کہ ایک مدت تک اُن کی یہ علمی اور روحانی گفتگو محض سُننے سنانے پر منحصر رہی اور بہت بڑا علمی سرمایہ ضائع ہو گیا۔ احباب کو بہت دیر بعد یہ خیال آیا کہ علم کے بے بہا گوہر جو سیّد صاحب رحمہ اللہ لٹاتے ہیں، انہیں رولنا چاہیے بلکہ ' سے ضابطۂ تحریر میں لانے کا سامان ہونا چاہیے۔ اس سوچ کے بعد بندۂ عاجز نے یہ ڈیوٹی اپنے ذمے لی اور "مجلسِ ذکر" میں اس گفتگو کو ٹیپ کرنا شروع کیا۔ ٹیپ سے اسے قرطاسِ ابیض کی زینت بناتا رہا۔ اے کاش یہ فیصلہ بہت پہلے ہوا ہوتا۔ ﴿وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا﴾ [النساء: 47] ٹیپ سے ساری گفتگو کو نقل کر کے سید صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ مسوّدے کی نوک پلک سنواری جاتی۔ سیّد صاحب رحمہ اللہ اُسے Manuscript [قلمی] کا نام دیتے تھے۔ نوک پلک جب سنور جاتی تو اس کو دوبارہ تحریر کر کے محفوظ کر لیا جاتا۔ کچھ مسوّدات ایسے ہیں جن پر نظرِ ثانی نہ ہو سکی۔ وہ بھی اللہ کے فضل سے محفوظ ہیں۔ جن مسوّدات پر نظرِ ثانی کے بعد چھپوانے کا فیصلہ ہوا، تعلیم و تزکیہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ ایک آیت کی تشریح مسلسل چار جمعراتوں (1 تا 22 مئی 75ء) کی گفتگو پر پھیل گئی ہے۔

میں بیش قیمت اور انمول جواہر سیّد صاحب رحمہ اللہ کے عقیدت مند قارئین کرام کے حضور پیش کرتا ہوں۔ وہ خود فیصلہ فرمائیں کہ ایسی تفسیر کہیں اس سے پہلے پڑھی یا سُنی ہے۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ باقی کڑیاں بھی ان شاء اللہ وقت کے ساتھ ساتھ منظرِ عام پر آتی رہیں گی تا آنکہ ایک سنہری زنجیر بن جائے۔

میں اپنے زمانہ طالب علمی سے ہی سیّد صاحب رحمہ اللہ سے یہ گذارش کرتا رہا کہ آپ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں جو منفرد، انوکھی اور نوجوان طبقے کے لیے اپنی مثال ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اُردو، فارسی، عربی، انگریزی زبانوں کے علوم ولغت پر عبور عطا کیا ہے۔ ان زبانوں کے شعری اور ادبی سرمائے سے بھی آپ کا دامن پُر ہے۔ آپ جس انداز میں بات کرتے ہیں لوگ اس انداز کو ترس گئے ہیں مگر سیّد صاحب رحمہ اللہ ہمیشہ فرماتے: "یہ کام بہت کٹھن ہے۔" میری آرزو اگرچہ پوری نہ ہو سکی.... ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مگر میں سمجھتا ہوں کہ "مجلسِ ذکر" کے بحر کی غوّاصی [غوطہ لگانا] میں جو کچھ ہاتھ آیا وہ اس اچھوتی اور تصوراتی تفسیر کی ایک جھلک ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سیّد صاحب رحمہ اللہ کے درجات اعلیٰ علیین میں بلند فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ ان

کے مشن کو زندہ اور جاری وساری رکھ سکیں۔

وأخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

احقر العباد

عبدالحفیظ عفی عنہ

سیکرٹری ''تحریک احیائے دین''

4/ر شیش محل روڈ، لاہور

پیش لفظ.... قربت کی راہیں

سیّدی ومخدومی داخی حضرت مولانا سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ بقیدِ حیات ہوتے تو مقدمہ خود تحریر فرماتے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اُن کے دل میں کیا تھا، یا وہ کیا لکھنا چاہتے تھے۔ پھر اُن کا اسلوبِ تحریر بھی تو اُن کے طرزِ بیاں کی طرح منفرد تھا

ع

ایسا کہاں سے لاؤں تجھ سا کہیں جسے

یہ دِن بھی نیرنگیٔ دوراں نے دکھائے کہ کتاب کوئی لکھے، مقدّمہ اس کا کوئی تحریر کرے۔ سیّد صاحب رحمہ اللہ 3 اپریل کی شام جب لندن کے لیے رختِ سفر باندھ کر ہوائی اڈے کی طرف روانہ تھے، میں اُن کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دارالعلوم سے ہوائی اڈے تک اس کتاب کے چھپوانے کی باتیں ہوتی رہیں۔ کتاب کا آخری باب ''درود شریف کی فضیلت''، مکمل ہو چکا تھا۔ فرمانے لگے:

''یہ کاتب کو دے دیجیے، صرف آخر میں ایک صفحہ لکھنا باقی ہے۔ خیال تھا کہ فرصت مل جائے گی تو وہ لکھ کر دیتا جاؤں گا۔ فرصت کے لحات میسر نہ آیئے، اب لندن سے واپسی پر لکھوں گا۔''

دراصل کچھ احباب کی ملاقاتیں اور کچھ لندن جانے کی مصروفیات نے انہیں کتاب کا تتمہ لکھنے کی فرصت نہیں دی۔ لیکن کسے خبر تھی کہ اُن کا یہ سفر.... سفرِ آخرت بن جائے گا۔ اور وہ ہم سب کو یوں داغِ مفارقت دے جائیں گے۔ 4 اپریل کو کار کے حادثے کا شکار ہوئے۔ 20 دن تک لندن کے ویسٹ منسٹر ہسپتال میں زیرِ علاج رہے۔ جب چارہ گروں نے یہ نوید سنائی کہ اُن کی ہڈیاں معجزانہ طور پر جڑ رہی ہیں اور وہ جلد چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے اور انہیں تین ماہ سے پہلے پہلے ہسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا۔ عین اس وقت یکا یک اللہ کے پیامی اُن کے پاس آ پہنچے۔ 24 اپریل 1976ء کی شام اُن کی زندگی کی آخری شام ثابت ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بیوی بچوں سے کوسوں دور، احباب واقارب سے ہزاروں میل کے فاصلے پر دیارِ غیر میں وہ عالمِ جاودانی کو سدھارے۔ بقول مولانا محمد علی جوہر رحمہ اللہ ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور
رکھ لی میرے خدا نے میری بے بسی کی لاج

پانچ دنوں کے جاں گُسل انتظار کے بعد جمعرات 29 اپریل 3 بجے سہ پہر اُن کا جسدِ خاکی لاہور پہنچا، اسی رات 9 بجے اپنے والد حضرت سیّد مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے پہلو بہ پہلو میانی صاحب کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیے گئے۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تُو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

سیّد صاحب رحمہ اللہ کسی دنیوی غرض سے لندن نہیں گئے تھے، اُنہوں نے اللہ کی راہ میں یہ سفر اختیار کیا تھا۔ اللہ کا فرمان ہے:

﴿لَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ﴾ (البقرۃ:154)

''جو اللہ کی راہ میں جان جانِ آفرین کے سپرد کرے اُسے مُردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ جاوید ہے لیکن تمہیں اس کی زندگی کا شعور نہیں۔''

وہ ہمیشہ یہ دعا فرماتے تھے: "اللّٰهم إني أسئلك شهادة في سبيلك لرضاك ولتكون كلمتك هي العُلياء" (اے اللہ! میں تیری راہ میں تیری رضا جوئی اور تیرے نام کی سربلندی کے لیے شہادت کی بھیک مانگتا ہوں۔)

جیسے کہ میرے محترم پروفیسر خالد علوی صاحب نے لکھا، جب اُنہوں نے لندن کے ہسپتال میں سیّد صاحب کی عیادت کی تو سیّد صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: ''زندگی بھر جو دُعائیں کرتا رہا وہ سب پوری ہو گئیں، صرف ایک باقی ہے شاید وہ بھی پوری ہو جائے۔''

دیکھیے اللہ تعالیٰ نے اُن کی اِس دُعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔ وہ اس کی راہ میں درجۂ شہادت پر سرفراز ہوئے اور زندۂ جاوید بن گئے۔ ایسی صاحبِ کمال ہستیاں کبھی فنا نہیں ہوتیں۔ اللہ اپنی راہ میں مٹنے والوں کو بقائے دوام بخش دیتا ہے۔ وہ اب ایسی جگہ ہیں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، اس لیے کہ تحریک احیائے دین زندہ ہے۔ جب تک اُن کے نظریات اور ان کی تحریر زندہ ہے، وہ زندہ رہیں گے ؎

نیک ناموں کے نشاں باقی رہیں گے حشر تک

کے مصداق وہ اپنے گرانقدر علمی اور ادبی شہ پاروں کے ذریعے زندہ رہیں گے۔ اُن کے زندہ ہونے کا یہ ثبوت ہے کہ رات کی تنہائیوں میں اکثر اُن سے ملاقات رہتی ہے ؎

دوریاں نہیں مقدر مگر بارہا
لے کے آئی ہے خوشبو صبا آپ کی
شب کی تنہائیوں میں بایں بُعد بھی
ہم نے اکثر سُنی ہے صدا آپ کی

کتاب کے بارے میں کچھ بھی عرض کرنے کے قابل نہیں، ہاں اس قدر جانتا ہوں کہ جب نام رکھنے کا مرحلہ درپیش تھا تو تمام احباب سے اس سلسلے میں پیہم مشورے ہوتے رہے۔ دو تین نام تجویز ہوئے، آخرکار ''قربت کی راہیں'' پر اتفاق ہو گیا۔ اس کتاب کو سیّد صاحب رحمہ اللہ دراصل وارداتِ قلب سے تعبیر فرماتے تھے۔ یا فرماتے کہ یہ وہ انوارِ الٰہی ہیں جو حرمین شریفین کی حاضری کے دوران دل پر وارد ہوئے۔ ان کا بیان وہ سرِ عام نہیں فرماتے تھے، بلکہ فرماتے تھے یہ عشق

دعاشقی کا مسئلہ ہے۔ ریاض صاحب کو بھی لندن میں فرمایا تھا کہ سعودی عرب کی حاضری میں جو کچھ دل پر وارد ہوا وہ میں نے اس کتاب میں نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُسے ضرور پڑھیے۔

کتاب کے سات ابواب ہیں۔ یہ سب الگ الگ مقالے کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ 1975ء جولائی، اگست کے مہینے میں جب وہ اہل عیال سمیت مری تشریف لے گئے تھے' اُس دوران میں قلمبند کیے تھے۔ صرف محمدی انقلاب پہلے لکھا ہوا تھا۔ ہر سال جب بھی مری تشریف لے جاتے مجھے فرماتے کہ کاغذ کاٹ کر اس طرح بنا دو کہ میں وہاں کچھ نہ کچھ لکھ سکوں۔ مگر چھ سال کی مدت میں صرف 1975ء میں ہی وہ یہ کام کر سکے۔ جب لاہور واپس تشریف لائے تو اس قدر خوش تھے کہ میں نے انہیں اس سے پہلے اس قدر خوش نہ دیکھا تھا۔ بار بار فرماتے: چوہدری صاحب آپ حیران ہوں گے کہ میں چھ مقالے لکھ لایا ہوں۔ مجھے اس وقت جو خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ اس لیے کہ میں سمجھتا تھا کہ علم وادب کے اس بحرِ بے پایاں سے اگر کچھ لعل و گہر میسر آ جائیں تو اسلام کی تبلیغ کرنے والوں کے لیے یہ گرانمایہ دولت ہوگی۔ انہیں خود بھی اعتراف تھا کہ خاندانِ غزنویہ میں قلم پکڑ کر بیٹھنے اور لکھنے کی روایت بہت کم ہے۔ ہاں منبر ومحراب ان کے اسلاف کی نواؤں سے گونج رہے ہیں۔ ان کے علم وفضل کا ہر آدمی معترف تھا۔

تقریر ہو یا تحریر' بات ہمیشہ مربوط کرتے تھے۔ منفرد طرزِ بیاں اور خوبصورت اسلوبِ نگارش کے حامل تھے۔ تحریر وتقریر میں بالترتیب مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ مولانا عطاء اللہ بخاری رحمہ اللہ کا انداز بے حد نمایاں اور واضح ہوتا۔ سیّد صاحب رحمہ اللہ کو جو سوزِ دروں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا' اس کا اظہار الفاظ میں ناممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ کا عشق اُن کے ہر بُنِ مُو میں بس گیا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اُن کے رگ وریشے میں سرائیت کر گئی تھی۔ وہ اس آگ میں پیہم اور متواتر جلتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا قرب کیونکر نصیب ہوتا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اتباع کے تقاضے کیا ہیں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا دعویٰ کرنے والوں کو کون سی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے؟ یہ وہ تجربات تھے جو انہیں دیارِ عرب کی تین دفعہ کی حاضری میں نصیب ہوئے تھے، وہ اس کتاب کا موضوع ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں آخری بات یہ کہہ سکتا ہوں اور وہ بھی علامہ اقبال رحمہ اللہ کے الفاظ میں ؎

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز وسازِ رومی' کبھی پیچ وتابِ رازی

کتاب کی طباعت میں بوجوہ تاخیر ہوئی اور بہت ہوئی۔ کچھ حالات کی ستم ظریفی اور کچھ راقم الحروف کی غفلت۔ میں اپنی غفلت کے لیے تمام قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔

احقر العباد — عبدالحفیظ

جمعۃ المبارک، یکم جولائی 1977ء — انجینئرنگ یونیورسٹی، لاہور

مولانا محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد

تحریر: مولانا محی الدین احمد قصوری

مولانا محمد داؤد غزنوی مرحوم ومغفور کی موت ایک عظیم حادثہ ہے۔ ان کے جانے سے جماعت اہلحدیث ایک معاملہ فہم، بالغ نظر، دور اندیش رہنما (لیڈر یا امیر) سے محروم ہو گئی ہے جس کو بالفاظ قرآن خدا نے "بسطة فی العلم والجسم" کی دو گونہ نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ بلکہ خود ملت اسلامیہ اپنے ایک عظیم اور نادر الوجود فرزند سے محروم ہوگئی جو بیک وقت ایک بے ریا اور مخلص کارکن تھا تو دوسری طرف اعلیٰ درجہ کی راہنمایانہ گوناگوں صلاحیتوں سے بہرہ ور تھا۔ فیا اسفا! ثم یا اسفا!!

لیکن اب مولانا کی وفات کے بعد اس سے بھی بڑھ کر خطرہ درپیش ہے اور وہ یہ کہ جماعت اہلحدیث ایک صحیح قائد کو کھو کر منتشر نہ ہو جائے اور اپنی ان گوناں گوں علمی اور عملی قابلیتوں کو جو گزشتہ ڈیڑھ دو سو سال سے اس کا طرہ امتیاز رہی ہیں، کھو کر ختم نہ ہو جائے، یقیناً یہ اس سے بھی کہیں زیادہ الم انگیز المیہ ہوگا۔

قرآن حکیم نے اس حقیقت کو نہایت مبرہن الفاظ میں واضح کر دیا تھا جب کہ کائنات ارضی کا سب سے بڑا حادثہ پیش آیا۔ یعنی جب فخر کائنات، سرور موجودات، سید الاولین والآخرین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس دُنیوی زندگی کو خیر باد کہہ کر سفر آخرت اختیار فرمایا اور تمام نسل انسانی کے لیے ایک ابدی حقیقت کا اعلان کیا:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ﴾ [آل عمران: 144، 145]

یعنی ...."اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں (جو اپنے اپنے وقتوں میں ظاہر ہوئے اور راہِ حق کی دعوت دے کر دُنیا سے چلے گئے) پھر اگر ایسا ہو کہ وہ وفات پائیں (اور بہرحال انھیں ایک نہ ایک دن وفات پانا ہے) یا فرض کرو ایسا ہو کہ وہ قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں راہِ حق سے پھر جاؤ گے (اور ان کے مرنے کے ساتھ ہی تمہاری حق پرستی بھی ختم ہو جائے گی؟) اور جو کوئی راہِ حق سے اُلٹے پاؤں پھر جائے گا تو (اپنا ہی نقصان کرے گا) خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور جو لوگ شکر گزار ہیں (یعنی نعمت حق کی قدر دانی کرنے والے ہیں) تو قریب ہے کہ خدا انھیں ان کا اجر عطا فرمائے۔ اور یاد رکھو! خدا کے حکم کے بغیر کوئی جان مر نہیں سکتی۔ ہر جان کے لیے ایک خاص وقت ٹھہرا دیا گیا ہے۔"

اس پر امام الہند حضرت مولانا آزاد رحمہ اللہ کا نوٹ بھی قابل غور و فکر ہے۔ فرماتے ہیں:

''اس آیہ مبارکہ میں اس اصل عظیم کی طرف اشارہ ہے کہ بنائے کار اصول اور عقائد ہیں، نہ کہ شخصیت اور افراد۔ کوئی شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو لیکن اس کے سوا کچھ نہیں کہ کسی اصل اور سچائی کی راہ دکھانے والی ہے۔ پس اگر کسی وجہ سے شخصیت ہم میں موجود نہ رہے یا درمیان سے ہٹ جائے تو ہم سچائی کی راہ سے کیوں منہ موڑ لیں۔ یا ادنیٰ فرض میں کوتاہی کریں؟ سچائی کی وجہ سے شخصیت قبول کی جاتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ شخصیت کی وجہ سے سچائی، سچائی ہو گئی ہو۔'' [1]

جماعت کے لیے ایک اہم واقدم سوال:

پس جماعت کے لیے اس وقت سب سے اہم اور اقدم سوال یہ ہے کہ وہ تمام رسوم .... سوگواری، مرثیہ خوانی سے بالاتر ہو کر کسی شخص کو جسے وہ مولانا کے بعد اپنی قیادت کے منصب کے لیے موزوں و مناسب خیال کرتی ہے، اسے فوراً منتخب کرے اور یہ کام بذریعہ عام انتخاب نہیں ہو سکتا تو اس کے بغیر ہی سہی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی چند اہل الرائے بزرگوں نے اس عظیم و جلیل شخصیت کو منتخب کر لیا، اور پھر صحابہ کی جماعت نے اس پر اتفاق کیا.... اس وقت بھی .... ضروری ہے، جماعت کے چند برگزیدہ اہل الرائے حضرات بلا ادنیٰ تاخیر و تعویق ایک شخص کو نامزد کر لیں، اور پھر عام جماعت اس انتخاب کو قبول کر لے۔ اس میں تاخیر والتواء بہت بڑا جماعتی نقصان ہو گا۔

اس وقت بھی تمام دُنیا کی زندہ قوموں کا طرزِ عمل یہی ہے کہ موجود الوقت بادشاہ کی وفات کے اعلان کے ساتھ ہی آئندہ بادشاہ کے نام کے اعلان بھی کر دیا جاتا ہے۔ بادشاہ وفات پا گیا، بادشاہ زندہ باد .... ہمارا مسلک اتباع سنت ہے۔ تعجب ہے کہ اس عظیم ترین سنت کی طرف کیوں کسی بزرگ کی توجہ منعطف نہ ہوئی؟

اصل تو یہی ہے کہ مولانا کی وفات کا صدمہ چاہے کس قدر بھی الم ناک اور جانگسل تھا، ان کا جنازہ اٹھنے کے ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ انھیں سپرد خاک کرنے کے ساتھ ہی آئندہ امیر کا اعلان ہو جانا چاہیے تھا۔ آخر خاص اس موقعہ پر بھی جماعت کے بڑے بڑے سربراہ آوردہ بزرگ موجود تھے۔ آئندہ قیادت کا فیصلہ جن لوگوں کو کرنا ہے، وہ قریباً سب موجود تھے .... اسی وقت ہو جانا چاہیے تھا۔ تاکہ جماعت ایک لمحہ کے لیے بھی بغیر قاعدہ اور امیر کے نہ رہتی۔ لیکن اب اس میں مزید تعویق ایک عظیم جماعتی کمزوری بلکہ ایک عظیم جماعتی اور سیاسی نقصان کا باعث ہو گا۔

انتخاب کے بعد:

انتخاب کے بعد جماعت یا جدید امیر جماعت کا سب سے پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ سابق امیر نے جماعت کو جس حال میں چھوڑا ہے۔ اس کا مکمل جائزہ لے کر اس کی مکمل رپورٹ اپنی مجلس خاص میں پیش کرنے کے بعد آئندہ کے لیے

[1] ترجمان القرآن، جلد اوّل، ص: 382، 383

پروگرام مرتب کرے اور یہ ساری چیز پبلک میں لائی جائے۔ اس میں خاص طور سے ان کاموں کی جو جماعت کی فلاح کے لیے مشروع ہیں، ان کی مکمل کیفیت اور جماعت کا میزانیہ اور تعمیل کے کاموں کے لیے اور مالی اور عملی تدابیر یا اصلاحات سب چیزوں کو شرح وبسط کے ساتھ شائع کرنا چاہیے۔

جماعت کا فرض:

اس کے بعد یہ ضروری ہے اور اگر اسے چھوٹا منہ بڑی بات نہ تصور کیا جائے تو میں عرض کروں گا کہ ہماری جماعت کی ایک بہت بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم میں سمع وطاعت کا فقدان ہے۔ میں نے متعدد مواقع پر دیکھا ہے کہ ہم میں ہر شخص اپنے متعلق یہ رائے رکھتا ہے کہ جو وہ سوچ سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں سوچ سکتا۔ اور کسی مسئلہ میں جو اس کی رائے ہے وہ آخری رائے ہے اور سب کے لیے قابل تسلیم ہونی چاہیے۔ یہ بہت بڑا روگ ہے۔ تقلید شخصی کے ترک کا مطلب عدم اطاعت نہیں سمجھنا چاہیے۔ اطاعتِ امیر میں جماعت کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ [1]

ایک پسندیدہ اقدام:

﴿وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾ [المطففین: 26]

یہ خبر انتہائی مسرت انگیز ہے کہ خاندان غزنویہ نے بالاتفاق اس خلاء کو جو مولانا سید محمد داود غزنوی رحمہ اللہ کی فوری اور ناگہانی وفات سے پیدا ہو گیا تھا، اولین فرصت پر پُر کر لیا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ خوشی اس امر کی ہے کہ جس شخصیت کو انھوں نے سربراہی اور قیادت کے لیے منتخب کیا ہے، وہ اپنی علمی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے لحاظ سے اس کا اہل ہے۔

ہم سیّد ابوبکر کو بھی اس انتخاب پر مبارک باد دیتے ہیں اور دعا دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس قیادت کا عملی طور سے اہل ثابت کرے۔ آمین

خاندان غزنوی:

خاندان غزنوی اپنے پیچھے ایک تاریخ رکھتا ہے، جس کی تاریخ ایک صدی سے زیادہ ہے۔ اس ایک سو سال میں متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی صرف علمی اور مذہبی خدمت ہی نہیں کی بلکہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں اخلاقی اور مذہبی انتشار سے بچایا ہی نہیں بلکہ انھیں ایک زندگی بخشی ہے۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں ان کی راہنمائی سے یہاں کے مسلمانوں کو نشأۃ ثانیہ حاصل ہوئی ہے۔

حیات بعد الممات:

اس لحاظ سے ہم خاندان غزنوی کی ہوش مندی اور معاملہ فہمی کو بھی نہایت درجہ قابل ستائش سمجھتے ہیں کہ انھوں نے

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (27 دسمبر 1963ء)

اس نظم کے قیام سے اس انتشار وتفریق سے بچا لیا جس کا خدشہ مولانا مرحوم ومغفور کی وفات سے پیدا ہوگیا تھا۔ یہاں کے اکثر مسلمان خاندانوں کے اعدام کی اصل وجہ یہی رہی ہے کہ انھوں نے اپنے ہاں کے بڑے آدمی کی وفات پر اس نظم کو قائم رکھنے کے لیے کوئی قدم نہ اُٹھایا۔ اور یہ قدرت کا اٹل قانون ہے کہ جو خاندان یا جو جماعت اپنے انتشار وتفرقہ کو قیام نظام سے دور کرنے کی کوشش نہیں کرتی .... اس کا انجام موت ہوتا ہے....

﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ [الاحزاب:62]

خاندان غزنوی کا اسوۂ حسنہ:

خاندان غزنوی کا یہ عمل ان تمام خاندانوں اور جماعتوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے .... جو اپنی اجتماعیت کو انتشار اور تباہی سے بچانے کے خواہش مند ہوں۔ اس سلسلہ میں جماعت اہلحدیث مغربی پاکستان کے سر براہ آوردہ بزرگوں اور اہل علم کی خدمت میں عرض ہے کہ.... وہ بہت جلد کسی اہل شخص کو اپنا امیر منتخب کر لیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ عظیم خلا جو جماعت میں پیدا ہوگیا ہے، کوئی خطرناک صورت اختیار کر لے .... اس بارہ میں جیسا کہ قبل ازیں عرض کر چکا ہوں، امارت کا فیصلہ جلد از جلد ہونا چاہیے .... تمام دنیاوی نظاموں کا دستور بھی یہی ہے کہ سابق بادشاہ یا قائد کی موت کے اعلان کے ساتھ آئندہ امیر یا بادشاہ کا اعلان کر دیا جاتا ہے کہ اسی میں کسی جماعت یا مملکت کی حیات کا راز پوشیدہ ہے۔

مولانا مرحوم ومغفور نے اپنے پیچھے صرف ایک باعزت خاندان ہی نہیں چھوڑا، بلکہ ایک نہایت وقیع جماعت بھی چھوڑی ہے جس کا ماضی نہایت درخشندہ، جس کی تاریخ اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے نہایت ہی قابل رشک اور قابل تقلید .... پس نہایت ہی ضروری ہے کہ جس طرح خاندان غزنوی کے چند سپوتوں نے اپنے خاندان کو انتشار وتفریق سے بچانے کے لیے کمر ہمت باندھ لی ہے اور علیکم بالجماعۃ پر عمل کرتے ہوئے ایک امیر کے ساتھ منسلک کر لیا ہے .... اسی طرح .... جماعت اہلحدیث کے سر براہ آوردہ بزرگوں کا یہ اہم واقدم فرض ہے کہ وہ .... امارت .... کے اس خلاء کو جلد سے جلد پورا کریں اور بہترین طریق پر پورا کرنے کی دیانت دارانہ کوشش کریں۔

اگر اسے غیر معمولی جسارت نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا رمضان المبارک قریب ہے۔ اس لیے اس امر کا فیصلہ رمضان المبارک کے ورود سے پہلے ہو جانا چاہیے۔ اور کوشش ہونی چاہیے کہ اس اجتماع میں جماعت کے نمائندہ ذمہ دار افراد کو ترک نہ کیا جائے۔ تا کہ یہ ایک صحیح معنوں میں نمائندہ اجتماع ہو۔ اور اس کا فیصلہ بھی سب کے لیے یکساں واجب الاحترام ہو۔ وما علینا الا البلاغ

﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾ [الزمر:17،18] [1]

---

[1] ہفت روزہ الاعتصام (3 جنوری 1964ء)

خاندان غزنویہ کے امیر کا تقرر

مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کی دینی آرزوؤں کی تکمیل کا آغاز

تحریر: مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف

بڑے خاندانوں اور دینی مزاج رکھنے والے گھرانوں کا ایک طرۂ امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے معاملات کو سلجھانے اور اپنے فرائض و مناصب کو بطریق احسن انجام دینے اور اپنی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے اہتمام کے لیے اپنے نظم و نسق کی باگ ڈور کسی ایسے شخص کے سپرد کرتے ہیں جو معاملہ فہمی، اصابت رائے، علم و فضل، تدین و تقویٰ اور خاندان کے ساتھ شفقت و خیرخواہی میں ممتاز ہو۔ اسی مزاج اور طریق کار کے مطابق عارف باللہ حضرت عبداللہ غزنوی نور اللہ مرقدہ کی وفات کے بعد' مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کو ان کا جانشین اور غزنوی خاندان کا امام مقرر کیا گیا۔ چونکہ حضرۃ الامام اپنی بلند شخصیت کے ساتھ ساتھ علم و فضل، تقویٰ و تدین، روشن ضمیری اور زین کے لیے بے پناہ اخلاص و ایثار کی صفات سے بھی بدرجہ اتم موصوف تھے، اس لیے اہلحدیث خواص و عوام نے بھی انہیں اپنا امام تسلیم کیا اور موجودہ طرز کی جمہوریت کے بجائے اسلامی طریق اجتماعیت کے مطابق، آپ رحمہ اللہ کو امام الموحدین کی حیثیت فطری طور پر حاصل ہوگئی۔

امام عبدالجبار رحمہ اللہ کی وفات کے بعد، خاندان غزنویہ نے مولانا سید محمد داؤد غزنوی علیہ الرحمۃ کو امام یا امیر تسلیم کیا۔ تقسیم ملک کے بعد جماعت اہلحدیث نے بھی انہیں اپنا امیر بنا لیا۔ اب جب کہ مرحوم اللہ کی رحمت کی جانب رحلت فرما ہوئے تو غزنوی خاندان کے بزرگوں اور ممتاز افراد نے جمع ہو کر اپنے میں سے سب سے زیادہ عالم دین، عابد اور صاحبِ فکر شخص' یعنی مولانا داؤد غزنوی علیہ الرحمۃ والغفر ان کے فرزند اکبر مولانا سید ابوبکر غزنوی[1] کو امیر خاندان بنایا اور عام رسم کے مطابق ان کی دستار بندی کی گئی۔

خاندان غزنویہ کے متعلق عام تاثر یہی قائم کیا گیا ہے کہ اس خاندان کے اکابر کو معرفت الٰہیہ، دینی ذوق، علم و فضل اور جاذب شخصیتوں کی جو نعمت عطا کی گئی تھی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ تعالیٰ ان عنوانات کے مطابق آخری شخصیت تھے اور اب یہ سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں مولانا مرحوم و مغفور کی عظمت اور وجاہت' اس دورِ زوال [میں] نعمت غیر مترقبہ تھی، اور انہوں نے جو خلا پُر کر رکھا تھا' اسے بھرنا اب کسی ایک شخص کے لیے تو ممکن نہیں۔ اور یہ بھی بڑی حد تک درست ہے کہ مولانا مرحوم و مغفور نے اپنے آباء کرام سے حصولِ فیض کے بعد ملک کی اجتماعی زندگی میں جو بھرپور

---

[1] مولانا عمر فاروق غزنوی مولانا کے بڑے صاحبزادے تھے۔ (نقوش عظمت رفتہ، ص: 70)

حصہ لیا جہاں اس سے بعض نقصانات لاحق ہوئے وہاں یہ اہم فائدہ بھی حاصل ہوا کہ مولانا کی وسعت نگاہی میں اضافہ ہوا۔ انہوں نے اجتماعی زندگی کے متعدد اور باہم متضاد اسالیب کو عملاً اپنایا اور اس سے ان کی شخصیت جامع حیثیت اختیار کر گئی .... اور خود ہمیں بھی اس عظیم خاندان اور اس محبوب سلسلۃ الذھب سے گہرے تعلق کی بناء پر آج سے کئی سال پہلے یہ اضطراب لاحق ہوا کہ مولانا سید داؤد غزنوی رحمہ اللہ کے بعد اس خیر و برکت سے کہیں یہ خاندان محروم ہی نہ ہو جائے اور حسب معمول اس اضطراب کا اظہار خود مولانا رحمہ اللہ کے سامنے کیا۔ ایک مرتبہ اسی سلسلے میں مولانا کی خدمت میں ایک خط بھی لکھا جس کا جواب آنے پر ہمیں یک گونہ اطمینان ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس خاندان کو اس نعمت کے تسلسل سے محروم نہیں فرمائیں گے۔

مولانا غفر اللہ لہٗ نے اس خط میں (جس کا عکس اسی مضمون کے ساتھ شائع ہو رہا ہے) فرمایا:

''آپ نے خاندان غزنویہ کے متعلق جس خیال کا اظہار کیا ہے، آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ میرے لڑکے ابوبکر کو اس قابل بنا دے۔ وہ عربی کا ایم اے ہے، مؤطا امام مالک اس نے پڑھ لیا ہے، اب تفسیر جامع البیان شروع کرنے والا ہے۔ اُس کی عملی حالت بہت اچھی ہے، نماز پانچ وقت باجماعت ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے، ڈاڑھی رکھ لی ہے' اور اپنے اوراد و وظائف میں کافی وقت صرف کرتا ہے، تصوف سے بڑا لگاؤ ہے۔ اس کا مطالعہ دینیات کا اگرچہ بڑا وسیع رہا ہے' لیکن اب وہ باقاعدہ تفسیر اور صحاح ستہ پڑھنا چاہتا ہے۔ الآخر''

یہ خط ہمیں 20 اگست 1960ء میں موصول ہوا، اس کے بعد وقتاً فوقتاً ان سے اس عنوان پر اور جماعت اہلحدیث میں للّٰہیت، تبتل الی اللہ، احسان اور دینی ذوق کی ضرورت و اہمیت پر بارہا گفتگو ہوتی رہی۔

آج تین سال کے بعد' جب مولانا اپنے آقا کے حضور جا چکے (اور اللہ عزیز و کریم سے دعا ہے کہ وہ انہیں اپنی رحمتوں سے نوازیں) ان کے بعد خاندان غزنویہ نے باوجودیکہ اس خاندان میں متعدد بزرگ عمر کے اعتبار سے اور مالی ثروت کے نقطۂ نظر سے' مولانا سید ابوبکر سے زیادہ مستحق سمجھے جا سکتے تھے لیکن اس خاندان کے بڑوں اور چھوٹوں نے متفقہ طور پر' معیار و صلاحیت کا مدار' علم دین، عبادات سے شغف کو قرار دے کر مولانا سید ابوبکر کو جو اپنے خاندان کا امیر منتخب کیا ہے تو یہ اسی بات کی دلیل ہے کہ برسے بادلوں میں ہنوز آثارِ رحمت موجود ہیں اور حضرت عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے خاندان میں بحیثیت مجموعی دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کا ذہن کارفرما ہے۔ اللھم فزد و بارك---

علاوہ بریں' اس انتخاب سے مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے ان احساسات کو بھی تقویت حاصل ہوئی، جو انہوں نے اس خط میں اپنے فرزند کے بارے میں ظاہر فرمائے تھے اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے جو دینی آرزوئیں سید ابوبکر کے سلسلے میں دل میں چھپا رکھی تھیں' خاندان غزنویہ کا یہ فیصلہ ان کی تکمیل کا نقطۂ آغاز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی بعید نہیں کہ وہ سید ابوبکر کو اپنے آباء کرام کا صحیح جانشین بنائیں۔

اس انتخاب کا دوسرا اور بے حد اہم پہلو یہ ہے کہ مولانا سید ابوبکر غزنوی عظیم تر بوجھ کے متحمل ہوئے ہیں۔ وہ اس فیصلے کے بعد عارف باللہ، حضرت سید عبداللہ غزنوی علیہ الرحمۃ کے جانشین مقرر ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے عظیم خاندان کے چھوٹوں اور بڑوں بالخصوص نئی نسل کی دینی تربیت، اخلاقی اصلاح اور ایمانی تکمیل کی کمر توڑ ذمہ داری بھی اپنے اوپر لی ہے۔ اب ان کی زندگی کا رخ بھی اسی راستے کی جانب مڑنا چاہیے اور جو فروگذاشتیں، کوتاہیاں اور اپنے اقارب نیز اجانب کے ساتھ معاملات وتعلقات میں اونچ نیچ ان سے اس بناء پر سرزد ہو جایا کرتی تھی کہ وہ اپنے عظیم باپ کی موجودگی میں ایک چھوٹے آدمی ہیں۔ اب اس مقام پر فائز ہونے کے بعد انہیں اس سطح سے بلند ہونا ہوگا۔ اپنے اندر للّٰہیت، اخلاص، تبتل وتفقر الی اللہ، عاجزی وفروتنی' دوسروں کے مقابل اپنے آپ کو عاجز خیال کرنا اور ہر ایک کے لیے جذبہ محبت واخلاص رکھنا، ان صلاحیتوں کو اہتمام سے پیدا کرنا ہوگا۔ رب عزیز ورحمان سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ انہیں اپنی مرضیات کی توفیق سے نوازیں اور اپنے اکابر کا صحیح جانشین بنائیں۔ اللھم ربنا آمین۔ [1]

---

[1] ہفت روزہ المنبر (4، 11 جنوری 1964ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث مغربی پاکستان

شیش محل روڈ۔ لاہور

محترم مکرم عبدالرحیم اشرف صاحب زاد لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ نوازش نامہ گرامی!

آپ کا نامہ شرف صدور ہو گیا تھا لیکن یہ عاجز ان دنوں انفلوئنزا کے شدید حملہ کا شکار تھا اس لیے جواب جلد نہیں لکھ سکا۔ اب بحمد اللہ حالت بہتر ہے۔ مگر ابھی تک کھانسی کا خفیف سا اثر موجود ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ شفائے کاملہ عطا فرمائے۔

آپ نے تاثرات قلبیہ کے متعلق جس خیال کا اظہار کیا ہے۔ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ میرے لڑکے ابوبکر کو اس کا اہل بنا دے۔ وہ طریقہ کا اہل رہے۔ ترجمہ قرآن مجید اس نے پڑھ لیا ہے۔ اب تفسیر جامع البیان مع ترجمہ شروع کرا دیا ہے۔ اس کی عملی حالت بہت اچھی ہے۔ نماز پانچ وقت باجماعت ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نماز تہجد کا پابند ہے۔ اوراد و وظائف میں کافی وقت صرف کرتا ہے۔ تصوف سے بڑا شغف ہے۔ اس کا مطالعہ دینیات کا اگرچہ بڑا وسیع ہے۔ لیکن اب وہ باقاعدہ تفسیر اور صحاح ستہ پڑھنا چاہتا ہے۔ شوق اور رغبت ہے ابھی نہیں مستقلاً پڑھ رہا ہے۔ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو میری زندگی ہی میں اس قابل بنا دے کہ وہ خاندان کی علمی روایات کا وارث بن جائے۔ علاوہ اس کی عملی حالت اس سے بھی بہتر ہو۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

آپ نے جس مقصد کے لئے خط لکھا تھا وہ تو اپنی معذرت کی وجہ سے پورا نہیں کر سکا۔ معذرت قبول فرمائیے۔

والسلام

داؤد غزنوی

۱۸ ۲/۶۰

سیّد ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ورثاء کو معاوضہ

چند شکایتیں..... وضاحتیں؟.....اور مشورے

تحریر: مولانا محمد ابراہیم کمیرپوری

آج مورخہ [1] 24 جون رات آٹھ بجے کے نشریہ میں وفاقی وزیر برائے مذہبی امور جناب مولانا کوثر نیازی حوالہ یہ خبر نشر کی گئی ہے کہ وزیراعظم پاکستان نے مرحوم سید ابوبکر غزنوی سابق وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے ورثاء کو پچاس ہزار روپیہ بطور امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

قارئین بھولے نہ ہوں گے کہ سید صاحب موصوف حکومت پاکستان کی طرف سے مولانا کوثر نیازی کی سربراہی میں ایک سرکاری وفد کے رکن کی حیثیت سے اسلامی فیسٹیول منعقدہ لندن میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ آپ 4، 5 اپریل کی درمیانی شب کو ٹریفک کے ایک حادثہ میں شدید زخمی ہوئے اور بیس دن موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا رہنے کے بعد 25 اپریل کو 4 بجے شام ۔ ٹ منسٹر ہسپتال لندن میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ 29 اپریل کو ان کی میت ہوائی جہاز میں لاہور پہنچی اور اسی دن شام کی نماز کے بعد یونیورسٹی گراؤنڈ میں ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور نماز عشاء کے بعد اُنھیں میانی صاحب کے قبرستان میں ان کے والد علیہ الرحمۃ کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

ہمارا ایمان ہے کہ اس جہانِ رنگ وبو میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب مشیت ایزدی کے تحت ہے اور اس کے فیصلے آج سے لاکھوں برس پہلے عالمِ قضا وقدر میں طے پا چکے تھے اور ہماری سعادت اسی میں ہے کہ ہم اس باب میں کسی قسم کی لب کشائی نہ کریں بلکہ قادرِ مطلق کی قدرت اور حکیم کامل کی حکمت کے آگے سر تسلیم ورضا خم کر دیں۔

بایں ہمہ اس حادثۂ فاجعہ کے ضمن میں ہم حکومتِ پاکستان کے ان ارکان سے کئی ایک باتوں کی وضاحت چاہتے ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے اس حادثہ کی تفصیل بتانے کی پوزیشن میں ہیں۔

ہم 4، 5 اپریل پھر 25 اپریل کے بعد سے کئی الجھنوں میں مبتلا آرہے ہیں۔ بارہا اس پر قلم اُٹھانا چاہا لیکن بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ ہمیں اس امر کا یقین تھا کہ وزیراعظم' سید صاحب کے سوگوار خاندان کے آنسو پونچھنے کا کوئی نہ کوئی اہتمام کریں گے۔ تاہم یہ اعلان ہماری امید سے بہت لیٹ ہوا۔ خدا جانے ہمارے پھرتیلے وزیراعظم نے اس اہم انسانی مسئلہ میں اتنی تاخیر سے کام کیوں لیا؟ کیا یہ ضروری تھا کہ اس کا اظہار بجٹ سیشن میں ہی کیا جائے؟ اور وہ بھی ایک

[1] خبر سننے کے فوراً بعد یہ آرٹیکل لکھا گیا۔ (ح ک)

سرکاری ممبر کے سوال کے جواب میں؟

پاکستانی سفیر کا کردار؟

خیر یہ مسئلہ تو محض تاخیر کا ہے جس کا سبب شائد کوئی دفتری قسم کی سہل نگاری ہو۔ لیکن اس تقریب سے ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ سید ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ ملک کی مایہ ناز علمی شخصیت اور ملک کی ایک اہم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور سرکاری حیثیت میں لندن تشریف لے گئے تھے۔ وہ خطرناک حادثہ کا شکار ہوئے اور ان کے بیس دن انتہائی کرب واذیت میں گزرے۔ اس طویل مدت میں برطانیہ میں پاکستان کے سفیر جناب ممتاز دولتانہ کہاں تھے؟ کیا اس قسم کے اہم سرکاری وفود سے سفراء کا کوئی تعلق نہیں ہوتا؟ کیا مرحوم غزنوی صاحب کے علاج معالجہ کی کوئی ذمہ داری دولتانہ صاحب پر نہ تھی؟ کیا سفیر مذکور سیّد صاحب کی تیمارداری کے لئے ہسپتال گئے؟

کیا انہوں نے مرحوم کے خاندان کو سرکاری سطح پر اس حادثہ اور اس کی تفصیلات پھر ان کی رفتارِ صحت سے مطلع کیا؟ یہ اور اس قسم کے اور متعدد سوالات ہیں جو سید مرحوم کے پس ماندگان، ان کے ہزاروں تلامذہ، ان کے لاکھوں عقیدت مندوں اور پوری جماعت اہل حدیث کے ذہنوں میں سوالیہ نشان بن گئے ہیں۔ ہم وفاقی وزیر مملکت برائے امورِ خارجہ جناب عزیز احمد سے ان سوالات کا جواب چاہتے ہیں۔ اگر دولتانہ صاحب نے اس سلسلہ میں اپنا فرض ادا کیا ہے تو اس کی تفصیلات بتا دی جائیں۔ آخر یہ کوئی دفاعی راز یا خارجہ قسم کا مسئلہ تو نہیں کہ اس کا بتانا مفادِ عامہ کے خلاف یا ملکی سلامتی کے لئے خطرہ ہو۔ اور اگر انہوں نے اپنے فرض میں تغافل سے کام لیا ہے تو صحیح طریقہ سے جواب طلبی کی جائے اور انہیں اس اہم ذمہ داری کی عدم ادائیگی کی پوری پوری سزا دی جائے۔

پاکستانی سفیر جناب دولتانہ نے سیّد ابوبکر کے ساتھ ان کے ان نازک لمحات میں جس بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ان حالات میں مزید افسوسناک ہے کہ دولتانہ صاحب ذاتی طور پر سید صاحب کی علمی حیثیت، ان کی منصبی وجاہت، ان کی خاندانی عظمت کے علاوہ ان کے والد سیّد محمد داؤد غزنوی علیہ الرحمۃ کی شخصیت، ان کی دینی، علمی، سیاسی اور ملّی خدمات سے براہِ راست واقف اور اُنہوں نے آزادیٔ وطن اور قیامِ پاکستان کے لئے جو قربانیاں دی تھیں اس کے عینی شاہد ہیں۔

وزیر برائے مذہبی امور:

اس سلسلہ میں ہمیں وفاقی وزیر برائے مذہبی امور سے بھی شکایت ہے کہ وہ خود غزنوی مرحوم کو اپنے ساتھ لے گئے تھے اور دراصل غزنوی صاحب رحمہ اللہ ہی ان کے وفد کا حُسن تھے، لیکن افسوس کہ مولانا کوثر نیازی نے ان کے زخمی ہو جانے کے بعد نہ سید صاحب سے صحیح رابطہ رکھا اور نہ ہی ان کے خاندان کو صحیح حالات سے آگاہ کیا۔ خود مولانا غزنوی صاحب رحمہ اللہ کو دیارِ غیر میں موت وحیات کی کش مکش میں چھوڑ کر بعض یورپی ممالک کی سیر کرتے ہوئے وطن آ گئے لیکن

سیّد صاحب کی خواہش اور ضرورت کے باوجود ان کی اہلیہ کو وہاں پہنچانے کا کوئی بندوبست نہ کیا۔ ہمیں اپنے بزرگ شیخ محمد اشرف صاحب سے یہ معلوم کر کے انتہائی دکھ ہوا کہ سیّد صاحب نے ویسٹ منسٹر ہسپتال میں ان سے صرف یہی کہا کہ میں ہسپتال میں طہارت کے نظام سے مطمئن نہیں اور چاہتا ہوں کہ میری اہلیہ کو یہاں پہنچانے کا انتظام ہو جائے۔ افسوس کہ مولانا کوثر نیازی وفاقی وزیر برائے مذہبی امور اور مذکورہ وفد کے قائد ہونے کے باوجود سیّد صاحب کی خواہش پوری نہ کر سکے۔ اور مزید افسوس یہ کہ وزیر موصوف ملک میں ہوتے ہوئے پاکستان کے اس مایۂ ناز فرزند کے جنازہ کے لئے وقت نہ نکال سکے۔

وزیر اعظم کی بے نیازی:

اسی قسم کا گلہ ہمیں وزیر اعظم سے بھی ہے کہ موصوف اپنی پارٹی کے ایم این ایز اور ایم پی ایز کے علاوہ ضلع اور تحصیل لیول کے کارکنوں کی وفات پر اظہارِ غم اور تعزیتی پیغام جاری کرنے میں بڑی مستعدی کا مظاہرہ فرماتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ جناب مظفر علی شمسی کی وفات پر وزیر اعظم کا تعزیتی پیغام ان کی سیکرٹریٹ سے باقاعدہ جاری ہوا۔

ہم حیران ہیں کہ سیّد ابوبکر غزنوی رحمہ اللہ کے الم ناک سانحۂ ارتحال پر بھٹو صاحب کیوں خاموش رہے؟ سیّد صاحب خاندانی حیثیت میں عظیم آباء واجداد کے عظیم فرزند، علمی حیثیت سے قومی اور بین الاقوامی سطح کے دانش مند ماہر تعلیم اور منصبی حیثیت سے ملک کی ایک عظیم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور عین موت کے وقت غیر ملک میں پاکستان کے ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے قیام فرما! لیکن وزیر اعظم اس اندوہناک حادثہ پر مہر بلب؟ ؎

ناطقہ سر بگریبان ہے اسے کیا کہیے؟

قلیل معاوضہ:

مولانا کوثر نیازی کے اعلان کے مطابق وزیر اعظم نے غزنوی صاحب کے پسماندگان کو پچاس ہزار روپیہ بطور امداد دینے کا اعلان فرمایا ہے۔ ہمارے خیال میں مرحوم کی بلند وبالا پوزیشن، تعلیمی میدان میں ان کی بے بہا خدمات، سرکاری فرائض کی ادائیگی کے دوران عین جوانی میں ان کی حادثاتی موت اور ان کے پسماندگان کی اقتصادی اور معاشی ذرائع سے تمام تر محرومی کے پیش نظر یہ رقم انتہائی قلیل اور حقیر ہے۔

ہمارے جنٹلمین، جواں ہمت اور باخبر وزیر اعظم کو اپنے ذرائع سے علم ہو گا کہ مرحوم سید صاحب کا کوئی ذاتی مکان نہیں۔ وہ ایک عرصہ سے سرکاری رہائش گاہ میں رہتے اور اپنے مشاہرہ سے اپنے بچوں کے علاوہ اپنے یتیم بہن، بھائیوں کی کفالت بھی کرتے تھے اور معاشی لحاظ سے وہ اس قابل نہ تھے کہ ذاتی مکان تعمیر کر سکیں۔ ہم وزیر اعظم کو یہ مشورہ دینا مناسب خیال کرتے ہیں کہ مرحوم کی خدمات کے اعتراف میں ان کے بچوں کو کسی موزوں مقام پر مکان بنانے کے لئے

مناسب زمین الاٹ فرمائیں اور تعمیر کے مصارف میں معقول تعاون کریں کہ اس وقت وہ زندگی کی تمام سہولتوں سے محروم اور عوامی حکومت کی مکمل توجہ کے حق دار ہیں۔

بچوں کی تعلیم :

دوسری بات جو ہم وزیر اعظم سے کہنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ سیّد ابوبکر جیسے نابغۂ روزگار افراد تو ہر روز جنم نہیں لیتے، تاہم حکومت کا فرض ہے کہ ایک ماہرِ تعلیم جو ملک کی آبرو میں اضافہ کرنے دیارِ غیر میں گیا اور حادثہ کی نذر ہو گیا۔ اس کے دونوں بچوں کی تعلیم کا سرکاری ذرائع سے خاطر خواہ انتظام کیا جائے اور ان کی اعلیٰ تعلیم کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کی جائیں اور کم از کم تعلیمی لحاظ سے انہیں ان کے مرحوم والد کا صحیح جانشین بنانے کی کوشش کی جائے۔

علاوہ ازیں یہ رقم تو وزیر اعظم نے (غالباً) وفاقی فنڈ سے دی ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے چانسلر جناب محمد عباس عباسی گورنر پنجاب ہیں جن کا تعلق والیانِ ریاست سے ہے۔ ریاست اگرچہ اب پنجاب میں شامل ہے تاہم صادق خاندان کی روایات بڑی تابندہ و درخشندہ ہیں۔ یہ خاندان ہمیشہ علم اور اہل علم کا خادم رہا ہے۔ امید واثق ہے کہ عالی جناب نواب صاحب نہ صرف بحیثیت گورنر پنجاب اور چانسلر جامعہ بہاول پور وزیر اعظم کے نقشِ قدم پر چلیں گے بلکہ ایک ماہر تعلیم کی حادثاتی موت پر ان کے پس ماندگان کی سرپرستی کے سلسلہ میں اپنی خاندانی روایات بھی برقرار رکھیں گے۔

علاوہ ازیں اپنے ہوش مند وزیر اعظم اور بہاول پور یونیورسٹی کے نیک نام چانسلر فضیلت مآب عباسی صاحب کو یہ مشورہ بھی دینا چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی کے کسی شعبہ (لائبریری، ہال، انسٹی ٹیوٹ، ہوسٹل وغیرہ) کو سید ابوبکر غزنوی کے نام سے منسوب کر دیا جائے کہ زندہ قومیں پوری فراخ دلی سے اہل دانش کی خدمات کا اعتراف کرتی اور ایسے ہی اقدامات سے اس بقائے دوام کا اعزاز دیا کرتی ہیں۔

اپنی جماعت کی خدمت میں!

زیرِ بحث مسئلہ میں جہاں ہم نے اربابِ اختیار کا گلہ کیا اور ان کی خدمت میں چند مشورے عرض کئے ہیں وہاں ہم اپنی جماعت کے اکابر، تقویۃ الاسلام کے فیض یافتہ علماء اور سلسلۂ غزنویہ کے متوسلین اور سیّد صاحب کے ذاتی عقیدت مندوں سے بھی کچھ کہنا ضروری سمجھتے ہیں۔

احباب کو معلوم ہے کہ مدرسہ غزنویہ سلفیہ تقویۃ الاسلام اہل حدیث مدارس کے قدیم ترین مدارس میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اس درس گاہ کی علمی اور روحانی شعاعوں سے برصغیر ہی نہیں پورا عالم اسلام منور ہوا اور اس وقت صرف پاکستان میں فضلائے تقویۃ الاسلام کی تعداد بلا مبالغہ ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اسی ادارہ کے مہتمم حضرت سیّد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے منتشر اور لٹی پٹی جماعت کو سنبھالا دیا اور مرکزی جمعیۃ اہل حدیث مغربی پاکستان کے نام سے

جماعت کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا اور اس راہ میں اتنی ہمت اور جانفشانی سے کام کیا کہ صحت سے ہاتھ دھو بیٹھے اور آباء واجداد کے قائم کردہ اس ادارہ کی دیکھ بھال بھی کماحقہ نہ کر سکے۔ ان کے بعد ان کے لائق فرزند جناب ابوبکر نے مدرسہ کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود آخری دم تک اسے نباہتے رہے۔ بلاشبہ علم وفکر میں مرحوم ابوبکر کی راہ اپنے اسلاف سے کافی حد تک مختلف تھی اور ان کے مشاغل بھی اور قسم کے تھے تاہم انہوں نے اس ذمہ داری کو بقدرِ استطاعت خوب نباہا۔

تقویۃ الاسلام کا مستقبل:

لیکن ان کے انتقال کے بعد دارالعلوم کا مستقبل بھی محفوظ رہ سکتا ہے کہ پوری جماعت اس طرف توجہ کرے اور بزرگانِ غزنویہ کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری سے ذرہ برابر تغافل نہ برتے۔

مرحوم ابوبکر کے برادر سیّد عمر فاروق غزنوی بلاشبہ ایک حساس اور دین دار مسلمان ہیں اور پوری عمر کسی نہ کسی طرح دارالعلوم سے متعلق بھی رہے ہیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل حضرت مولانا غزنوی علیہ الرحمۃ کے اسیری کے ایام میں عمر فاروق ہی مدرسہ کے قائم مقام مہتمم ہوتے رہے ہیں۔ بایں ہمہ یہ دور اس امر کا مقتضی ہے کہ دارالعلوم کو باقی رکھنے اور ترقی دینے کے لئے ان کی مدد کے لئے اہلِ علم کا ایک بورڈ تشکیل کیا جائے اور تمام فضلائے دارالعلوم کسی بھرپور اجتماع میں اپنی مادرِ علمی (تقویۃ الاسلام) کو زندہ رکھنے اور ترقی دینے کے لئے جامع منصوبہ بنائیں اور اس نمائندہ بورڈ سے دامے، درمے، سخنے، قدمے ہر ممکن تعاون کریں۔

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث:

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث پاکستان کے قیام واستحکام میں حضرت مولانا غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے خون پسینہ ایک کیا اور حیاتِ مستعار کے آخری لمحہ تک اس کی فلاح وبہبود کی فکر میں رہے۔ مولانا کے بعد ان کے خاندان کا تعلق مرکزی جمعیۃ سے رہنا چاہئے تھا۔ اس کے لئے کوشش بھی کی گئی اور عملی صورت بھی سامنے آئی لیکن بوجوہ یہ تعلق زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ (ہم اس مختصر سے اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس قضیہ نامرضیہ سے متعلقہ تمام اہم افراد اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں) تاہم ہم مرکزی جمعیۃ کے موجودہ قائدین سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ حالات کا نئے سرے سے جائزہ لیں۔ اس خاندان کے موجودہ سربراہ سیّد عمر فاروق غزنوی سے رابطہ قائم کریں اور انہیں جماعت میں مناسب اعزاز سے نوازیں کہ وہ ہر لحاظ سے اس کے اہل ہیں۔ وہ اچھے بھلے زمیندار، ضروری علم سے آراستہ، صاحبِ شعور، متدین، اہل دل اور پاک باز ہستیوں کی یادگار ہیں۔ مرکزی قیادت اور عمر فاروق صاحب دونوں کے لئے مناسب یہی ہے کہ جماعتی اور تعلیمی امور میں ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کریں۔ وما علینا إلا البلاغ[1]

---

[1] ہفت روزہ اہلحدیث، لاہور (2 جولائی 1976ء)

مولانا سید ابوبکر غزنوی کی مجالس ذکر

تحریر: مولانا عزیز زبیدی

سوال

ایک صاحب لکھتے ہیں:

خصوصی مجالسِ ذکر جو کبھی اہل بدعت کے ہاں لگتی تھیں، دیو بندی اور اہل حدیثوں میں بھی رواج پا رہی ہیں، مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں اور پروفیسر مولانا سید ابوبکر غزنوی کے مدرسہ میں ''خاص رنگ'' میں ذکر کی محفل لگتی ہے، کیا اس کا کوئی ثبوت ہے؟

جواب

مجالسِ ذکر:

مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کے بعد جناب مولانا سید ابوبکر غزنوی کی مشہور درسگاہ تقویۃ الاسلام میں ذکر کی جو معروف محفلیں منعقد ہو رہی ہیں مجھے ان میں شرکت کرنے کا کبھی موقعہ نہیں ملا لیکن بہ تواتر یہ اطلاعات مل رہی ہیں کہ واقعی یہ سلسلہ وہاں جاری ہے۔

غزنوی خاندان علماء اور صلحاء کا مشہور خاندان ہے۔ مجھے صرف حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے صاحبزادے جناب پروفیسر ابوبکر غزنوی کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ ان کی قیادت میں تقریباً ڈیڑھ سال گزارا ہے۔ ان کے علم کی گہرائی، وسعت، خشیتِ الٰہی اور ذکرِ مسنون کے جو مناظر راقم الحروف کے سامنے آئے ہیں وہ نہایت جاذب ہیں۔ اگر کبھی وقت اور فرصت نے اجازت دی تو ان شاء اللہ اس سلسلے کی ان مبارک یادداشتوں کو ضرور قلم بند کروں گا۔ بہر حال ''اتباعِ سنت'' میں ان کا مقام بہت اونچا تھا، ذکر و فکر ان کا خاص مشغلہ تھا، لیکن بایں ہمہ انھوں نے خصوصی ذکر کی یہ محفلیں منعقد نہیں فرمائی تھیں۔ حالانکہ جو دواعی اور حالات اب ہیں اس وقت بھی وہی تھے۔

پروفیسر موصوف اہلِ علم ہیں، بالخصوص جدید طبقہ کی اصلاحِ حال کے لیے انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں قابلِ قدر ہیں۔ ان کی تقریر بڑی دلنشین، مؤثر، حکیمانہ اور عالمانہ ہوتی ہے۔ اس اعتراف کے باوجود ان کے اس ''اسلوبِ ذکر'' سے اتفاق کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔

جن رہنماؤں نے یہ ''محفلیں'' ایجاد فرمائی ہیں، ان کے مغالطے کی دو وجہیں ہیں۔ حدیث میں ذکر اور حلقۂ ذکر کا

جو ذکر آیا ہے ان کا مفہوم کیا ہے؟ ذکر کسے کہتے ہیں اور حلقہ ہائے ذکر سے کیا مراد ہے؟ یہ غور طلب امور ہیں۔

ذکر کا مفہوم ''زبانی ورد'' سمجھ لیا گیا ہے اور ذکر کے حلقوں سے مراد بھی یہ مصنوعی محفلیں لے لی گئی ہیں۔ حالانکہ یہ ان کا محدود تصور ہے۔

ذکر:

خدا یابی، خدا جوئی اور تعمیل احکامِ الٰہی کے جذبہ سے جو بھی کام کیا جائے، اسے ذکر ہی کہتے ہیں گو اس کی زبان بھی نہ ہلے اور نہ چلے۔

حضرت امام ابن القیم فرماتے ہیں:

الدنیا ملعونۃ وملعون ما فیہا إلا ذکر اللہ وما والاہ (ذکرِ الٰہی اور اس سے متعلقہ امور کے علاوہ ساری دنیا اور جو کچھ اس میں ہے سب ملعون ہے) میں ذکر سے مراد تمام قسم کی طاعات ہیں، سو جو بھی اس کی اطاعت میں ہوتا ہے وہ اس کا ذاکر ہے۔ خواہ اس کی زبان بھی نہ ہلے۔

الدنيا ملعونة وملعون ما فيها إلا ذكر الله وما والاه فذكره جميع أنواع طاعته، فكل من كان فى طاعته فهو ذاكر له وان لم يتحرك لسانه بالذكر[1]

ذکر سے مراد اصل میں ''استحضار'' ہے۔ (مفردات) یعنی زندگی کے شب و روز میں خدا یاد رہے، بے خدا زندگی کے بجائے ''باخدا زندگی'' گزاری جائے۔

اور جن روایات میں ''حِلق الذکر'' کا ذکر آتا ہے ان سے مراد بھی یہ مصنوعی مجلسیں نہیں ہیں بلکہ وہ اجتماع ہیں جو محض احقاقِ حق، امتثالِ حق اور غلبۂ حق کے لیے وقتاً فوقتاً اور حسبِ ضرورت منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

مصنوعی مجالسِ ذکر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ عوام اجتماعی جدوجہد سے محروم رہتے ہیں اور احقاقِ حق کے لیے میدانِ کارزار جو گرم ہوتے ہیں ان سے عموماً الگ تھلگ رہتے ہیں کیونکہ صرف ان ''لسانی اذکار'' سے وہ مطلوب انقلاب برپا نہیں ہوتا جس کو برپا کرنا ان کے ایمانی فرائض میں ہوتا ہے۔ پوری زندگی باخدا گزارنا اصلی ذکر اللہ ہے۔ مگر اب اسے محدود کیا جارہا ہے۔

اس کے علاوہ زندگی کے باقی شئون، حالات اور مظاہر میں ''یادِ خدا'' کا التزام عموماً کم باقی رہ جاتا ہے، اس لیے ان اذکار کے بعد ان کی زندگی میں ﴿ اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ﴾ کا رنگ بھی عموماً پھیکا رہتا ہے مگر انھیں اس کا احساس کم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان مجالسِ ذکر کو نہایت سختی سے دبا دیا تھا (دارمی) اور یہ وہ باتیں ہیں جو سید صاحب ہم سے بہتر جانتے ہیں۔

---

[1] اغاثة اللهفان من مصائد الشيطان، ص: 51

اس کے یہ معنی نہیں کہ ''لسانی ذکر'' کا وجود نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ ذکر فنی مجالسِ ذکر کا نام نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے۔ شریعت نے عبادت کی جو اجتماعی صورتیں متعین کی ہیں وہ بھی حلق الذکر سے تعلق رکھتی ہیں اور دوسرے وہ دینی کام جو اجتماعی طور پر کرنا پڑتے ہیں وہ بھی حلق الذکر ہیں۔

پروفیسر موصوف دوسرے انداز میں جو دینی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ ان شاء اللہ تعالیٰ ان کے رفع درجات اور مغفرت کے لیے کافی ہیں، اگر وہ ان ''فنی ذکر'' کی محفلیں منعقد کرنے کا اہتمام نہ بھی کریں تو بھی ان شاء اللہ ان سے باز پرس نہ ہوگی۔

اس موضوع پر تفصیلی بحث ہو سکتی ہے لیکن فتوے جیسا مقام اس کا متحمل نہیں ہے۔ (1)

---

(1) ماہنامہ محدث، لاہور (مئی 1975ء)

اسلامی معیشت میں گردشِ دولت کے قرآنی اسلوب

تحریر: محی الدین بن احمد دین

امرت سر اور لاہور کا غزنوی خاندان، پنجاب میں توحیدی افکار کے ساتھ ساتھ کتاب وسنت سے گہری وابستگی، تصوف وطریقت کی شناخت بھی رکھتا ہے۔ پروفیسر ابوبکر غزنوی، جو اسلامیہ کالج لاہور سے وابستہ ہوئے، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایم اے عربی کی کلاسز میں بطور استاذ تعلیم دیتے رہے۔ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں شعبہ علوم اسلامیہ قائم ہوا تو اس کے سربراہ بنائے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جب جامعہ بہاول پور کو یونیورسٹی بنایا تو پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کو اس کا وائس چانسلر بنایا۔ وہ مغربی لباس پہننے والے ولی اللہ تھے۔ میرا دینی وقلبی تعلق ان سے یوں قائم رہا کہ جوانی میں جب بھی میں لاہور میں ہوتا تو نماز جمعہ ان کی اقتداء میں پڑھتا۔ تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ متصل داتا دربار میں وہ خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے۔ حاضرین میں زیادہ تر اہل علم، اہل دانش، اہل قلم، وکلاء، ججز ہوتے۔ بہت مختصر خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے، نماز جمعہ تقریباً 30 منٹ میں مکمل فرما دیتے۔ آخری عمر میں وہ شہادت کی موت کی دعا کثرت سے کرتے۔ لندن میں تھے کہ سڑک عبور کرتے ہوئے وہ روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر شہید ہوئے۔ ان کی نماز جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں جب ادا ہوئی تو خلق خدا اس شہید، شب زندہ دار عالم دین، مفکر ومحب، کتاب وسنت سے وابستہ فقیر کے جنازے میں یوں شریک ہوئی کہ یہ جنازہ لاہور کی تاریخ کے عظیم جنازے کی صورت اختیار کر گیا۔

غزنوی خاندان اتحادِ امت، مسالک و مذاہب میں رابطے، مفاہمت، دوستی کا نام رہا۔ ان کے والد داؤد غزنوی عالم اَجل ایسے تھے کہ مولانا احمد علی لاہوری ان کی اقتداء میں نماز عید ادا کرتے تو دوسری طرف ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بانی خلیفہ عبدالحکیم نامور فلسفی، مفکر، مترجم وشارح اقبال ومولانا رومیؒ داؤد غزنوی کے ذاتی قدر دان تھے۔ زندگی میں دو مرتبہ میں بہت رویا ہوں ایک اپنے والد کی وفات پر اور دوسری مرتبہ پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کے جنازے میں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ روحانی طور پر یتیم ہو گیا ہوں۔ کچھ اطراف کا خیال تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو انہیں مولانا کوثر نیازی کے متبادل کے طور پر سامنے لانے والے تھے کہ وہ شہید ہو کر جنت مقیم ہو گئے۔

آج کل ہمارا قومی نغمہ ہے کہ پاکستان کو ایٹمی قوت بنایا تھا، اب معاشی قوت بنائیں گے۔ میں گاہے گاہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے معاشی افکار، جو اصلاً تو فقہ عمر فاروق کا نچوڑ ہیں، قارئین کی خدمت میں پیش کرتا رہا ہوں۔ آج پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کا معاشی اسلامی فکر اسلام میں گردش دولت کے عنوان سے ایک لیکچر میں دیا گیا ان کا اسلامی

معاشی نظام کا جامع خاکہ (وژن) پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ آیئے ایک معتبر عالم دین کی مجلس فکر میں شریک ہوں۔ جب بھی نماز پڑھیں اس عظیم صوفی، فقیر، قلندر، درویش، پیر طریقت کی بلندی درجات کی دعا ضرور فرمائیں۔ ساتھ میں میری صحت، رزقِ حلال اور میری فکری خدمت کی قبولیت کی دعا بھی فرمائیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی معاشرے میں نظمِ معیشت بگڑتا ہے اور دولت چند افراد کے ہاتھوں میں سمٹ آتی ہے۔ اس معاشرے کے لئے سب سے اہم مسئلہ یہ ہو جاتا ہے کہ زندگی کی ضروریات کیسے میسر آئیں، روٹی کہاں سے کھائیں اور تن ڈھانپنے کو کپڑا کہاں سے لائیں؟

یہ بات ہمیں تسلیم کر لینی چاہیے کہ افلاس انسان کی روحانی اور اخلاقی اقدار کو برباد کر دیتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَكُونَ كُفْرًا." (1)

''قریب ہے کہ مفلسی انسان کو کفر تک پہنچا دے۔''

وہ شخص جس کے پاس پیٹ بھرنے کے لئے روٹی نہ ہو اور تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا نہ ہو وہ اس بات پر کان نہیں دھر سکتا کہ زندگی کا مقصد اللہ کی محبت اور اس کی عبادت ہے۔ شیخ شیراز نے بجا کہا تھا:

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

(ایک سال دمشق کے اندر ایسا قحط پڑا کہ یار لوگ عشق کرنا ہی بھول گئے۔)

پاکستان میں بھی دولت چند ہاتھوں میں سمٹ آئی اور معاشرہ بھوک اور ننگ کے ہاتھوں کراہنے لگا۔ عوام کی زبانوں پر ایک ہی سوال ہے: ''ہمارے معاشی مسائل کا حل تمہارے پاس کیا ہے؟''

اس سوال نے اس شدت کے ساتھ سر اٹھایا ہے کہ آپ اسے ٹال نہیں سکتے۔ اس کا جواب دیجئے اور واضح اور متعین جواب دیجئے۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، وہ عبادت بھی ہے، روحانیت بھی، وہ تدبیرِ منزل بھی ہے اور اصولِ تمدن بھی، وہ ہماری سیاست بھی ہے اور ہماری معیشت بھی ہے۔ آیئے! ہم کتاب وسنت کی روشنی میں اپنے معاشی مسائل کا حل تلاش کریں۔

سرمایہ کا چند ہاتھوں میں سمٹ آنا بدترین اور سنگین جرم ہے:

یہ بات تو بالکل صاف اور واضح ہے کہ معاشرے میں دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹ آنا، اسلامی نقطۂ نظر سے ایک بدترین اور سنگین جرم ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

(1) مشکوٰۃ المصابیح: 5051

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝﴾ [سورۃ التوبہ: 34،35]

''جو لوگ معاشرے کا خون چوستے ہیں اور سرمایا سمیٹتے ہیں اور اللہ کی خاطر اسے معاشرے پر خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک سزا کی خبر دو، جس روز دوزخ کی آگ میں اسے گرم کیا جائے گا اور اس دولت سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اوران کی پیٹھ داغی جائے گی، یہی ہے وہ دولت جو تم اپنے لئے سمیٹ سمیٹ کر رکھتے تھے، پس دولت سمیٹنے کا مزا چکھو۔''

اسلام یہ چاہتا ہے کہ سرمایہ معاشرے میں یوں گردش کرے جیسے خون رگوں میں گردش کرتا ہے۔ وہ نظام جس میں چند افراد بے زمام اور بے مہار ہو کر کھل کھیلتے ہوں اور معاشرے کا خون چوستے ہوں اسلام اسے باطل نظام قرار دیتا ہے۔ وہ ہمیں خبردار کرتا ہے کہ:

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ﴾ [سورۃ الحشر: 7]

''ایسا نہ ہو کہ دولت صرف سرمایہ داروں ہی میں گردش کرتی رہے۔''

اکتناز کی بدترین صورت سود کا کاروبار ہے جس نے ساری اجتماعی معیشت کی باگ ڈور چند خود غرض سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ نے بجا کہا تھا ؎

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سُود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

ذخیرہ اندوزی حرام ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اَلْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ۔" (1)

''احتکار کرنے والے پر اللہ کی پھٹکار ہے۔''

شریعت کی بولی میں احتکار سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص بعض اجناس کو بہت بڑی مقدار میں اس لئے خریدے کہ بازار میں وہ اجناس کمیاب یا نایاب ہو جائیں اور لوگ مجبوراً اسی کی طرف رجوع کریں۔ وہ من مانی قیمت ٹھہرائے، لوگوں

کو وہی نرخ قبول کرنا پڑے۔ ایسے شخص پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی پھٹکار ہو۔''

اصول معاشیات قرآنِ کریم کی روشنی میں:

قرآن مجید نے نظمِ معیشت کو متوازن کرنے کے لئے چند اصول انسان کو بخشے، قرآن مجید اس بات پر زور دیتا ہے کہ:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا﴾ [البقرة:29]

''وہی ہے جس نے تمہارے لئے یہ سب کچھ پیدا کیا جو روئے زمین پر ہے۔''

اور سورۂ حم السجدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَدَّرَ فِيْهَا أَقْوَاتَهَا فِيْ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِيْنَ﴾ [حم السجدہ:10]

''چار معین مدتوں میں روئے زمین پر مختلف غذاؤں کو اندازے سے پیدا کیا، تمام ضرورت مندوں کا ان غذاؤں پر برابر کا حق ہے۔''

اور سورۃ النحل میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ﴾ [النحل:71]

''اور اللہ نے تم کو رزق میں ایک دوسرے پر برتری عطا کی ہے، پھر جن کو برتری عطا کی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے زیردستوں کو نہیں لوٹاتے ہیں کہ وہ اس میں برابر کے شریک ہو جائیں۔ پھر کیا یہ اللہ کی نعمتوں کے صریحاً منکر نہیں ہو رہے ہیں؟''

ان آیتوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید اس بات پر زور دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے رزق کی تمام انواع واقسام پیدا کی ہیں، وہی ہر فرد کی کفالت کرنے والا ہے اور اللہ کی مخلوق کو اس کی پیدا کی ہوئی غذاؤں پر برابر کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد پاک فرماتا ہے:

﴿أَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ أَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ [الواقعہ:63،64]

''یہ جو تم کھیتی باڑی کرتے ہو کیا تم نے اس پر نظر ڈالی ہے؟ کیا تم انہیں اگاتے ہو یا ان کے اُگانے والے ہم ہیں؟''

یہ ہوائیں کون چلاتا ہے؟ کون ہے جو مینہ برساتا ہے؟ یہ کس نے دھوپ پیدا کی ہے؟ جس کی کرنوں سے تمہاری فصل پکتی ہے، اگر یہ سب کچھ ہم ہی نے پیدا کیا ہے تو اسے ہماری خاطر معاشرے پر خرچ کرنے سے دریغ کیوں کرتے ہو؟

گردشِ دولت کا نظام:

دولت کو گردش میں لانے کیلئے اور معاشرے کے تمام افراد میں پھیلانے کے لئے اسلام نے یہ ترغیب دی کہ:

﴿اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ﴾ [البقرة:267]

''اور جو کچھ تم نے کمایا ہے اور جو کچھ زمین سے ہم نے تمہارے لئے نکالا اس کا بہترین حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ردّی چیزیں چھانٹ چھانٹ کر اللہ کی راہ میں نہ دیا کرو۔''

زکوٰۃ وعشر:

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی اور زکوٰۃ کو واجب ٹھہرایا اور مال داروں سے اڑھائی فیصد جبراً وصول کرنے کا حکم دیا اور یہ اسلام میں کروڑوں کی رقم صرف مساکین کیلئے روزگار فراہم کرنے کیلئے وقف کر دی جاتی ہے۔

قانونِ وراثت:

دولت کو گردش میں لانے کیلئے حکم دیا کہ ہر شخص کی وفات پر اس کے مال اور اس کی زمین کو اس کے قریب اور دور کے رشتہ داروں میں بانٹ دیا جائے۔ جائیداد کے حصے بخرے کر دیئے جائیں تا کہ دولت مرکوز نہ ہو، اولادِ اکبر کی جانشینی کا قانون Law of Primogeniture اور مشترکہ خاندان کا طریقہ Joint Family System اسلام نے اسی لئے ناجائز قرار دیا کہ اس سے دولت مرکوز ہو جاتی ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر کہ نظامِ معیشت غیر متوازن نہ ہو، حکم ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ [النساء:29]

''اے ایمان والو! ایک دوسرے کے اموال ناجائز طریقوں سے نہ کھایا کرو۔''

ہر وہ بات جس سے نظمِ معیشت بگڑ جانے کا خدشہ تھا اور اس کے غیر متوازن ہونے کا امکان تھا، ناجائز قرار دی گئی، سود خوری، رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی، سٹہ (speculation) اور تجارتی قمار بازی کو حرام ٹھہرا دیا گیا۔

یوں اسلام زکوٰۃ، عشر اور قانونِ وراثت کو نافذ کر کے اور سود خوری، ذخیرہ اندوزی اور تجارتی قمار بازی کو حرام ٹھہرا کر ایک متوازن نظامِ معیشت قائم کرتا ہے۔ یہ سمجھنا صریحاً غلط ہے کہ زکوٰۃ اور عشر ادا کر دینے کے بعد معاشرہ کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ ترمذی شریف کی حدیث ہے کہ:

"إنّ في المالِ حقًّا سوى الزكاةِ۔"[1]

''یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی معاشرہ کا حق ہے۔''

---

[1] جامع ترمذی: 660

قرآن مجید ہر قانون کی ارتقائی کڑیوں کو محفوظ کرتا ہے تاکہ جب بھی کسی معاشرے میں اسلامی قوانین کو نافذ کیا جائے، وہ انہی ارتقائی منزلوں سے گزرا کریں، جیسے شراب کی حرمت کا قانون جن مرحلوں سے گزرا، قرآن مجید نے ان تمام مرحلوں کو محفوظ کیا، حرمتِ شراب کا پہلا مرحلہ یہ تھا:

﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ [النساء: 43]

''نماز کے قریب مت جاؤ جب تم نشے کی حالت میں ہو۔''

اور حرمتِ شراب کی آخری ارتقائی منزل کا ذکر اس آیت میں کیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ [المائدۃ: 90]

''اے ایمان والو! شراب، جُواء، بُت اور پانسے شیطانی عمل کی نجاست ہے، تم اس سے دُور ہٹ جاؤ۔''

اسی طرح اسلام کے نظامِ معیشت کی آخری ارتقائی منزل قرآن نے یوں بیان کی:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ﴾ [البقرۃ: 219]

''یہ لوگ جن کے پاس سرمایہ ہے آپ ﷺ سے آکر پوچھتے ہیں کہ ہمیں کس حد تک خرچ کرنا ہوگا۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تمہاری ضرورت سے زائد جو کچھ ہے، وہ تمہیں معاشرے پر خرچ کر دینا چاہیے۔''

حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت کی طرف اشارہ کیا تھا:

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

یہ بات جو میں کہہ رہا ہوں مصر کے بہت سے علماء نے بھی یہ بات کہی ہے۔ میں دانستہ طور پر ایک ثقہ عالم کا حوالہ اور کسی تجدد پسند کا حوالہ نہیں دیتا کہ آپ کے نزدیک ان کی ثقاہت محلِ نظر ہو۔ میری مراد مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔

"ایضاح الأدلہ" میں ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جب تک کسی شے پر ایک شخص کا قبضۂ تامہ باقی رہے، اس وقت تک کوئی اور اس میں دست درازی نہیں کر سکتا۔ ہاں خود مالک و قابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے، بلکہ اس کو اوروں کے حوالے کردے۔ کیونکہ باعتبارِ اصل اوروں کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مالِ کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہوا، گو زکوۃ بھی ادا کر دی جائے اور انبیاء علیہم السلام اور صلحاء رحمہم اللہ اس سے نہایت مجتنب رہے۔ چنانچہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے بلکہ بعض صحابہ و تابعین نے حاجت سے زائد

رکھنے کو حرام ہی فرما دیا۔"[1]

قُلِ الْعَفْوَ کا مفہوم سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث وضاحت سے متعین کرتی ہے۔

عن أبي سعيد الخدري، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَن كَانَ مَعَهُ فَضْلُ ظَهْرٍ، فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَن لَا ظَهْرَ لَه، وَمَن كَانَ لَه فَضْلٌ مِن زَادٍ، فَلْيَعُدْ بِه عَلَى مَن لَا زَادَ لَه۔ قَالَ: فَذَكَرَ مِن أَصْنَافِ المَالِ مَا ذَكَرَ حَتَّى رَأَيْنَا أَنَّهُ لَا حَقَّ لِأَحَدٍ مِنَّا فِي فَضْلٍ۔۔۔۔ قَالَ: فَذَكَرَ مِن أَصْنَافِ المَالِ مَا ذَكَرَ حَتَّى رَأَيْنَا أَنَّهُ لَا حَقَّ لِأَحَدٍ مِنَّا فِي فَضْلٍ۔[2]

"سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے پاس فالتو سواری ہو وہ اسے لوٹا دے جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس ضرورت سے زائد غذا ہے وہ ان لوگوں کے حوالے کر دے جن کے پاس غذا نہیں ہے"۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک جنس اور مال کی ایک ایک قسم کا جدا جدا ذکر کیا حتیٰ کہ ہماری یہ رائے ہوگئی کہ فالتو مال پر ہمارا کوئی حق نہیں رہا۔"

یہ "رأینا" جو یہاں ہے اس کے یہ معنی نہ خیال کیجئے کہ "ہم نے یہ خیال کیا"۔ یہ میں عربی کے طالب علموں سے کہہ رہا ہوں۔ فقہ کی بولی میں ہم "رأینا" اس وقت کہتے ہیں جب ہم کوئی فتویٰ دے رہے ہوں اور اپنی علمی رائے کا اظہار کر رہے ہوں۔ پس یہ جو ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا "حَتَّى رَأَيْنَا أَنَّهُ لَا حَقَّ لِأَحَدٍ مِنَّا فِي فَضْلٍ" تو اس کا معنی یہ ہوا: "حتیٰ کہ ہماری یہ فقہی رائے ہوگئی کہ فالتو مال پر ہمارا کوئی حق نہیں۔"

کیا اسلامی حکومت جبراً چھین سکتی ہے؟

اس بارے میں ایک سوال بہت اہم ہے جو ہمارے سامنے آتا ہے، اگر دولت چند افراد کے ہاتھوں میں یوں سمٹ آئی ہو کہ خدشہ ہو کہ یہ اصولِ معاشیات جو ہم نے بیان کئے ہیں، ان کو تدریجی اور ارتقائی طور پر نافذ کرنے سے پہلے ہی یہ معاشرہ دم توڑ دے گا، اور کیفیت یہ ہو کہ:

"تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود" کہ جب تک عراق سے تریاق لایا جائے گا اتنی دیر میں مریض مر جائے گا، تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے جو ایک عظیم انقلابی مفکر ہیں، "المحلّٰی" کی چھٹی جلد میں بہت فاضلانہ بحث اس پر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کتاب وسنت کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر نظمِ معیشت یکسر غیر متوازن ہوگیا ہو اور

---

[1] ایضاح الادلہ، ص: 268

[2] صحیح مسلم: 4517

خدشہ ہو کہ تدریجی اور ارتقائی طور پر اصولِ معاشیات کے نفاذ سے پہلے ہی معاشرہ دم توڑ دے گا، تو اسلامی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سرمایہ داروں سے پیسہ اور غلّہ جبراً وصول کرے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دیکھو قرآن مجید بار بار کہتا ہے کہ سرمایہ داروں کی دولت میں مساکین کا ''حق'' ہے۔ قرآن مجید لفظِ ''حق'' بار بار استعمال کرتا ہے:

﴿وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ﴾ [الذاریات:19]

اور سورہ اسراء میں ہے:

﴿وَءَاتِ ذَا ٱلۡقُرۡبَىٰ حَقَّهُۥ وَٱلۡمِسۡكِينَ﴾ [الاسراء:26]

وہ فرماتے ہیں کہ اس میں احسان کا کوئی سوال نہیں اور جن کی طرف مال لوٹایا جا رہا ہے، وہ سرمایہ داروں کے رہینِ منت نہیں۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ ''المحلیٰ'' کی چھٹی جلد میں یوں رقم طراز ہیں:

''اگر اربابِ ثروت ایسے عادلانہ معاشی نظام کو قبول نہ کریں، تو اسلامی اسٹیٹ کا فرض ہے کہ اسلام کے اجتماعی معاشی نظام کے مطابق اربابِ ثروت کو قانوناً مجبور کرے اور اگر ملّی خزانے کا میزانیہ کافی نہ ہو تو محروم المعیشت انسانوں کو سنبھالا دینے کے لئے صنعت کاروں اور جاگیرداروں سے پیسہ اور غلّہ جبراً حاصل کر کے حق معیشت کی مساوات بروئے کار لائے، خواہ اہلِ دولت مالیانہ اور سرکاری واجبات ادا کر چکے ہوں۔''[1]

حضرت سیدنا ابوعبیدۃ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور تین سو جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے باوثوق ذرائع سے بیان کیا ہے کہ ایک سال غلّہ کا قحط ہوا۔ حضرت سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ہم سب کو حکم دیا کہ ہم سب اپنا غلّہ، اسٹاک کرنے کے مرکزوں میں اکٹھا کریں، پھر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ان مراکز میں سے خود ہر ایک فرد کو مساوی طور پر خوراک دیتے رہے۔

اس کے بعد امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فهذا اجماع مقطوع به من الصحابة لا مخالف لهم منهم.

''اس پر صحابہ کرام کا قطعی اجماع ہے، ان میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے۔''

یحییٰ بن آدم رحمہ اللہ جو ایک جلیل القدر محدث تھے، نے زراعت کے موضوع پر اپنی کتاب ''الخراج'' میں لکھا ہے:

عن عبد الله ابن أبي بكر قال: جاء بلال بن الحارث المزني رضي الله عنه إلى رسول الله ﷺ فاستقطعه أرضاً فأقطعها له طويلة عريضة فلما ولي عمر رضي الله عنه قال له يابلال إنك استقطعت رسول الله ﷺ أرضاً طويلة و عريضة قطعها لك و كان رسول

[1] المحلی: 6/ 156/ 12، ایضاً: 6/ 158/ 3 تا 4، 7 تا 10

اللہ ﷺ لم یکن یمنع شیئاً لیسألہ وأنت لا تطیق ما فی یدیك فقال أجل؛ فانظر ما قویت منها فأمسكه مالم تطق ومالم تقو علیه فارفعه إلینا نقسمه بین المسلمین فقال لا أفعل واللہ أقطعنیه رسول اللہ فقال عمر واللہ لتفعلن فأخذ منه ما عجز عن عمارته فقسمه بین المسلمین۔ (۱)

''سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فرزند سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ جو حضور ﷺ کے محبوب صحابی اور کفار مکہ کی سازشوں کی اطلاع دینے والے فداکار مسلمان، جنگ مکہ سے لے کر طائف کے لوگوں تک حضور ﷺ کے دوش بدوش لڑنے والے تھے۔روایت کرتے ہیں کہ بلال رضی اللہ عنہ بن حارث المزنی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور ﷺ سے زمین کا ٹکڑا مانگا۔آپ ﷺ نے ایک لمبا چوڑا رقبہ عطا فرما دیا، جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو بلال رضی اللہ عنہ سے کہا: بلال (رضی اللہ عنہ)! تم نے رسول اللہ ﷺ سے زمین کا ایک لمبا چوڑا قطعہ مانگا تھا اور آپ ﷺ نے عطا فرما دیا اور حضور ﷺ کا تو یہ عالم تھا کہ مانگنے والے کی کسی بات کو رد نہ کرتے تھے۔ بلال (رضی اللہ عنہ)! زمین کی جو مقدار تم نے حاصل کی ہے وہ تمہاری بساط اور قوت کاشت سے زیادہ نہیں ہے؟'' بلال (رضی اللہ عنہ): ہاں یہ ٹھیک ہے۔عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دیکھو تم جتنی زمین آباد کر سکتے ہو اسے اپنے پاس رہنے دو اور جو تمہاری قوتِ کاشت سے زیادہ ہے، وہ ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم اسے مسلمانوں میں بانٹ دیں۔ بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں ہرگز واپس نہیں کروں گا۔اللہ کی قسم یہ قطعہ زمین تو خود رسول اللہ ﷺ نے مجھے بخشا تھا۔میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم تم کو ایسا کرنا پڑے گا۔پس زمین کا وہ حصہ جسے آباد کرنے سے بلال رضی اللہ عنہ قاصر رہے تھے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چھین لیا اور مسلمانوں میں اسے بانٹ دیا۔''

میں یہ کہتا ہوں کہ اگر محمد ﷺ کی بخشی ہوئی زمین ملی مفاد کی خاطر چھینی جاسکتی ہے تو وہ جاگیریں جو مسلمانوں پر گولیاں برسانے کے صلے میں دی گئی تھیں....وہ جاگیریں جو مسلمانوں کا لہو بہانے میں عطا کی گئی تھیں....وہ جاگیریں جو ملک وملت کے ساتھ غداری کے صلے میں بخشی گئی تھیں، کیوں نہیں چھینی جاسکتیں؟

میں یہ واضح طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ اس ملک میں غریب اور مزدور کی حمایت کا حق ادا نہیں کیا گیا۔میں مجمع الزوائد میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد پڑھ رہا تھا اور سر دُھن رہا تھا۔حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

خیر الکاسب العامل إذا نصح۔ (۲)

---

(۱) کتاب الخراج، ص:93، کنز العمال:2/191، بیہقی:6/138، 149

(۲) مجمع الزوائد:4/61، مسند احمد:2/334

''کسب معاش کرنے والوں میں سب سے بہتر اور معزز مزدور ہے، جب وہ اخلاص کے ساتھ کام کرتا ہے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزدور کو معاشرے کا معزز ترین فرد قرار دیا ہے۔

ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ ہم نے اس معاشرے میں مزدور کی توہین و تذلیل کی ہے اس کا دامن، اس کا گریبان ہماری دست درازیوں سے گلہ مند ہے۔ اس ملک میں عین اس وقت جب کہ مزدور پٹ رہا تھا اور زخموں سے کراہ رہا تھا، ہم نے اس کے زخموں پر نمک چھڑکا، ہم نے اس سے کہا اور ٹھوکے دے دے کر کہا کہ دیکھو یہ ٹھیک ہے تم کہتے ہو سرمایہ دار پر تمہارے حقوق ہیں، مگر یہ ہرگز نہ بھولنا کہ تم پر بھی سرمایہ دار کے حقوق ہیں۔

ہم نے اس سے یہ بات عین اس وقت کہی جب کہ وہ سسکیاں لے لے کر دم توڑ رہا تھا۔

؎ ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے، میں ایک موٹی سی مثال دیتا ہوں، دو بھائیوں کی آپس میں لڑائی ہو جائے، آپ دیکھیں کہ ایک موٹا مسٹنڈا ہے اور دوسرا جو کمزور اور نحیف و نزار ہے، مجروح ہے، پٹ رہا ہے اور نزع کی حالت میں پنڈلی پر پنڈلی پٹک رہا ہے، اگر اس وقت کوئی آ کر اس دم توڑنے والے کو یہ کہے کہ یہ ٹھیک ہے گو تم مر رہے ہو اور دم توڑ رہے ہو، مگر تم یہ نہ بھولنا کہ اس ہٹے کٹے بھائی کے بھی تم پر حقوق ہیں.... یہ بات اس ملک میں کہی گئی۔ عین اس وقت جب کہ غریب اور مزدور کے پیٹ میں بھوک سے قراقر اُٹھ رہا تھا، ہم نے اس سے یہ کہا کہ دیکھو تمہاری زندگی کا مقصد پیٹ نہیں، دل ہے۔ وہ بھوکا تھا، وہ دل کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا، عین اس وقت جب کہ وہ بُھوک سے پیچ و تاب کھا رہا تھا ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی محبت کے گیت اس کو سنانے لگے، وہ بُھوک سے نڈھال تھا، وہ محبت کے گیتوں سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا، وہ ہم سے روٹی مانگتا رہا، ہم اسے محبت کے گیت سناتے رہے، نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرخ جھنڈیاں لے کر چوراہوں میں ناچنے لگا، وہ مذہب سے برگشتہ ہوا، وہ علماء سے برگشتہ ہوا حتی کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے برگشتہ ہوا، وہ سرخ جھنڈیاں لے کر چوراہوں میں ناچ رہا تھا، ہاں وہ غیروں سے اپنی وابستگی کا اعلان کر رہا تھا، میں نے جو اسے دیکھا، تو میرے ذہن کو کوئی جھٹکا نہ لگا، اس لئے کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کہا تھا کہ:

كاد الفقر أن يكون كفرا

''مفلسی انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔''

دیکھئے معاشی مسائل کا حل واضح اور متعین پیش کیجئے۔ مزدور اس ملک میں صدیوں سے ماما سے محروم ہے، اس کے زخموں پر نمک مت چھڑکیں، اس کو ماما بخشیں، اس سے جھگڑا نہ کریں، اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں سوشلزم نہ آئے، تو اس کا یہ علاج تو نہ تھا۔ منبر و محراب سے غلط آوازیں اٹھتی رہیں، آپ یقین کیجئے کہ اگر مزدور اور غریب کے معاشی مسائل کا واضح اور متعین حل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پیش نہ کیا گیا اور اگر مزدور کا غم کھانے میں ہم سوشلسٹوں

سے آگے نہ نکل گئے (جیسا کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا تقاضہ ہے) تو یہ عارضی بند جو سوشلزم کے امنڈتے ہوئے سیلاب پر باندھا گیا ہے، ٹوٹ جائے گا اور اس کی موجیں جو ابھی تک پایاب ہیں، ہمارے سروں سے گزر جائیں گی۔

کیپٹلزم، سوشلزم اور اسلام:

اسلام ہمارے تمام دکھوں کا مداوا ہے، وہ ہر درد کا درماں ہے، وہی اعتدال کی راہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اس میں چند افراد جو بد دیانتی، رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی سے دولت سمیٹ لیتے ہیں، وہ تمام معاشرے کے اوپر مسلط ہو جاتے ہیں اور ذہنی قابلیت رکھنے والے محنت کرنے والے، کاروبار کو کاوش سے چلانے والے سب ان چند سرمایہ داروں کے سامنے ہیچ ہو جاتے ہیں۔ اس نظام میں فرد (individual) بے زمام، بے مہار ہوتا ہے، وہ پورے معاشرے کا خون چوستا ہے۔

سوشلزم کیا ہے؟ یہ اسی سرمایہ دارانہ نظام کا ردعمل ہے۔ سوشلسٹوں نے یہ سمجھا کہ یہ فرد (individual) ہی تمام فساد کی جڑ ہے، اس کی تقریر پر پابندی لگا دو، اس کی تحریر پر قدغن لگا دو، اس کی رائے پر قدغن لگا دو، اس کی اقتصادی آزادی اس سے چھین لو، اور تمام ذرائع پیداور (means of production) کو قومی ملکیت میں دے دیا جائے۔ ''نیشنلائزیشن آف پروڈکشن'' یہ ترکیب بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے، لیکن ایک طالب علم کے ذہن میں فوراً یہ سوال ابھرتا ہے کہ قومی ملکیت میں دے دینے سے کیا مراد ہے؟ کیا قوم کا ہر فرد اس پر قبضہ واختیار رکھتا ہے؟ یہ تو ناقابل عمل ہے۔ تحقیق کی جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ سوشلسٹ حکمران پارٹی کے چند مخصوص افراد کے تصرف واختیار میں تمام ملک کے ذرائع پیداوار دے دیئے جاتے ہیں، پس ملک کے وہی چند افراد جن کے ہاتھوں میں فوجی، سیاسی اور قانونی طاقت سمٹی ہوئی ہے، ملک کے تمام ذرائع پیداوار بھی انہی کے قبضہ واختیار میں چلے جاتے ہیں، یوں ملک کی تمام طاقتیں چند ہاتھ سمیٹ لیتے ہیں، تمام معاشی، سیاسی اور فوجی قوتوں کا یہ ارتکاز سرمایہ دارانہ نظام کی انتہائی بھیانک صورت ہے، جو ایک خطرناک آمریت کو جنم دیتی ہے۔

بھائیو اور بزرگو! مقصد تو یہ تھا کہ ڈی سنٹرالائزیشن ہو، دولت اور قوت بکھرے۔ کیپٹلزم کا جو ردعمل ہوا، اس میں تو پھر تمام قوتیں سمٹ کر چند ہاتھوں میں آگئیں اور ایسا شدید ارتکاز ہوا کہ اس نے انتہائی بھیانک آمریت کو جنم دیا۔ یہ دونوں افراط وتفریط کی راہیں ہیں۔ یہ دونوں نظام انسان کے ذہن کی پیداوار ہیں، وہ انسان جو جذبات کا بندہ اور خواہشات کا پجاری ہے، اسلام شخصی ملکیت اور قومی ملکیت میں ایک حسین امتزاج پیدا کرتا ہے، وہ فرد کے حقوق و اختیارات اور حکومت کے حقوق واختیارات میں ایک توازن قائم کرتا ہے۔

شخصی ملکیت:

بعض ہمارے بھائی جو اشتراکی نظام سے متاثر ہیں، یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام بھی انفرادی

ملکیت کو ناجائز قرار دیتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو یہ صنعتی، معاشی، انتظامی وسائل میسر ہوتے، جو اس دور کی حکومتوں کو حاصل ہیں، تو انفرادی ملکیت کو ختم کرنے کے لئے انہیں کوئی تامل نہ ہوتا۔ اس بات کے لئے ان کے پاس کوئی سند یا دلیل نہیں ہے۔ اس بحث میں بھی کچھ دھڑا بندی کی بات پیدا ہو چلی ہے۔ کوئی پیغمبر اس روئے زمین پر ایسا نہیں گذرا، جس نے انسان کو کسی اقتصادی آزادی سے محروم کیا ہو، کوئی صحیفہ آسمانی ایسا نہیں، جس میں انسان کو اس کی شخصی آزادی سے محروم کیا ہو، پھر وہ سید الاولین و سید الآخرین، وہ سرورِ دُنیا و دین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ ﴾[الاعراف:157]

یعنی وہ جو انسانوں کو بے جا بندھنوں اور غلامیوں سے آزاد کرانے کے لئے آیا تھا، یہ کیوں کر ممکن تھا کہ انسان کو اس کی اقتصادی آزادی سے محروم کر دیتا اور تمام معاشرے کے افراد کو ریاست کا بے دست و پا غلام بنا دیتا۔ اسلام انفرادی آزادی کو شخصی ارتقاء کے لئے ناگزیر سمجھتا ہے، وہ فرد کی آزادی پر اس وقت قدغن لگاتا ہے، جب مفادِ عامہ کو اس سے دھچکا لگے اور معاشرے کے اجتماعی حقوق کو صدمہ پہنچے۔

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لینا:

قرآن و حدیث میں کسی صنعت، تجارت یا ذریعہ پیداوار کو قومی ملکیت میں لینے کے خلاف ایک حرف بھی میری نظر سے نہیں گذرا۔ اگر مفاد عامہ اور ملی مصلحتوں کے پیش نظر اسلامی حکومت کسی صنعت یا تجارت یا ذریعہ پیداوار کو قومی ملکیت میں لینا چاہے، تو وہ ایسا کرنے کی مجاز ہے۔ اگر کوئی صنعت یا تجارت چند افراد کے ہاتھوں میں ہو اور اس کی شخصی ملکیت اجتماعی مفاد کے لئے نقصان دہ ہو تو حکومت ان افراد کو معاوضہ دے کر وہ کاروبار اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے لیکن اسلام اس بات کو ایک اُصول کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا کہ دولت کی پیداوار کے تمام ذرائع حکومت میں یوں چلے جائیں کہ ملک بھر کی تمام صنعتوں اور تجارت کی منڈیوں پر وہ تنہا قابض ہو اور حکومت تمام اراضی کی واحد مالک ہو۔

پس اسلام شخصی اور اجتماعی ملکیت میں ایک توازن قائم کرتا ہے۔

دونوں نظام باطل ہیں:

سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت یہ دونوں باطل ہیں علامہ اقبال رحمہ اللہ نے بجا کہا تھا ؎

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب
ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب

دونوں کی روحیں روحانی سکون سے نا آشنا، دونوں اللہ سے غافل، دونوں اللہ سے جاہل، دونوں اپنے ذاتی اغراض

کے لئے ہر فریب، دھاندلی بد دیانتی، لوٹ کھسوٹ، مار دھاڑ اور قتل و غارت کو روا رکھنے والے اور اپنی ادنیٰ سی خواہش کے لئے ہزاروں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے والے: ؎

غرق دیدم ہر دو را در آب و گل ہر دو را تن روشن و تاریک دل

فرماتے ہیں: ''میں نے سرمایہ دارانہ نظام کو بھی دیکھا اور اشتراکی نظام کو بھی جانچا، دونوں مادیت میں ڈوبے ہوئے، دونوں کا منتہائے نظریہ جہانِ آب و گل، دونوں بدن سنوارنے میں لگے ہیں، دونوں کے دلوں پر ظلمت کا سناٹا چھایا ہوا ہے۔''

اسلام اور اشتراکیت یکجا ہو سکتے ہیں؟

ایک اور سوال ہمارے بعض بھائیوں نے اٹھایا ہے، ہمارے جو بھائی اشتراکیت سے متاثر ہیں، کہتے ہیں: اسلام اور اشتراکیت کو یکجا کر دو، بات لمبی اور بحث طلب ہے۔لیکن وقت کی قلت کے پیش نظر بات سمیٹتا ہوں۔ کارل مارکس کا ''داس کیپٹل'' جو کمیونزم کی بنیادی کتاب ہے، اگر اس کی پہلی جلد کے ابتدائی صفحات ہی آپ پڑھ ڈالیں، تو یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ اشتراکیت کا فلسفۂ زندگی ''جدلیاتی مادیت'' کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، میں اس فلسفہ کی تشریح اس وقت نہیں کرسکتا، صرف اتنا کہتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو فلسفہ کی ابجد ہوز سے بھی واقف ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ جدلیاتی مادیت کے نظریے میں اللہ، رسول، وحی و تنزیل، حیات بعد الممات، روح، ملائکہ اور دوسرے مابعد الطبیعاتی (Metaphysical Realities) حقائق کے تصور کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

کارل مارکس کا فلسفہ زندگی جدلیاتی مادیت پر مبنی ہے، اس کے فلسفہ تاریخ کی اساس بھی جدلیاتی مادیت ہی پر ہے، اس کا اقتصادی نظام بھی قطعی طور پر (Dialectical materialism) کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کارل مارکس کے اقتصادی نظام میں حلال وحرام میں کوئی حد فاصل نہیں کھینچی گئی۔

پس آپ یقین کیجئے کہ اگر اس ملک میں سوشلزم آتا ہے تو ہماری اخلاقی اور روحانی قدروں کا برباد ہونا یقینی امر ہے، اگر سوشلزم اس ملک میں آتا ہے تو ہماری اخلاقی و روحانی قدروں کا یقیناً وہی حال ہوگا جو سمرقند و بخارا میں ہوا، جو مشرقِ وسطی میں ہوا، ہم اس سے مختلف نتائج کی توقع اس ملک میں نہیں رکھتے ہیں۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام اور اشتراکیت کو یکجا کردو تو یا تو دونوں کے مفہوم سے ناواقف ہے یا وہ لوگوں کی آنکھوں میں قصداً اور ارادتاً دھول جھونک رہا ہے، وہ فلسفہ زندگی جس کی بنیادوں پر ایک نظام قائم ہوتا ہے، آپ اس فلسفہ زندگی کو اس نظام سے کاٹ کر الگ نہیں پھینک سکتے۔

روٹی ہماری زندگی کا مقصد نہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے ہمیں نہایت متوازن اقتصادی اور سیاسی نظام بخشا ہے، لیکن مسلمان کی زندگی

کا مقصد محض روٹی نہیں، میں نے یہ کہا تھا کہ جس وقت مزدور بھوکا ہو، وہ اللہ کی محبت اور عبادت کے گیتوں سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا، اس کا پیٹ بھرنے کے بعد ہم اسے کہیں گے کہ دیکھو روٹی تمہاری زندگی کا مقصد تو نہیں ہے، مسلمان کی زندگی کا مقصد اللہ کی ذات اور اس کی صفات کی معرفت حاصل کرنا اور اس کی صفات سے خود کو متصف کرنا ہے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اللہ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے کھپا دینا ہے، مسلمان کی رُوح ہر آن اور ہر لحظہ نغمہ سرا ہے:

"إِلٰهِيْ أَنْتَ مَقْصُوْدِیْ وَرِضَاكَ مَطْلُوْبِیْ"

انسان کی زندگی کا مقصد اس روئے زمین پر اللہ کی خلافت کا قائم کرنا ہے اور یہ معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام جو اسلام نے ہمیں بخشا ہے، ان مقاصد کے حصول کے لئے محض وسائل اور ذرائع ہیں۔ میں علامہ صاحب رحمہ اللہ کے خط کا اقتباس آپ کو سناتا ہوں جو اخبار زمیندار میں 24 جون 1923ء کے شمارے میں چھپا تھا، میں اس وقت جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کی تائید و تصدیق، اور تشریح و توضیح کے لئے حکیم الامت کی شہادت بس کرتی ہے۔

علامہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں مسلمان ہوں، میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل اور براہین پر مبنی ہے۔ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے، سرمایہ داری کی قوت جب اعتدال سے تجاوز کر جائے، تو دنیا کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے، لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریقہ یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے قانون میراث اور زکوٰۃ وغیرہ تجویز کیا ہے، مغربی سرمایہ داری اور رُوسی دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے شریعتِ حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس کے حصول کے لئے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابلِ عمل ہے، جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔

اسلام سرمایہ داری کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا، بلکہ فطرتِ انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے برقرار رکھتا ہے اور ہمارے لئے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے، جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔

مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ ﴿فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾ میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے، جب تک وہ ہر پہلو سے ایک

دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں، جس کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق اور تولید ہو اور مجھے یقین ہے کہ خود رُوسی اور دیگر مغربی اقوام بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص، تجربے سے معلوم کر کے ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائیں گی، جس کے اصولِ اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ موجودہ صورت میں رُوسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی سیاسی اقتصادیات پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، ان کے لئے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کی اقتصادی تعلیم پر نظرِ غائر ڈالیں، مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔"

ساتھیو! یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم ملّی انفرادیت (National Individuality) کھو بیٹھے ہیں، ہم کبھی امریکہ اور کبھی روس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں، کبھی چین کو دیکھ کر ہماری رال ٹپکتی ہے۔ ہر دور کے لات و عزّیٰ ہوتے ہیں، اور امریکہ اور روس اس دور کے لات وعزّیٰ ہیں۔

﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝﴾ [النجم:19، 20]

وقت کا سب سے عظیم انسان اور سب سے عظیم مسلمان وہ ہوگا جو ان تازہ خداؤں کی ذہنی غلامی سے انسانیت کو رہا کرے اور اسلام کے اقتصادی اور سیاسی نظام کو ایک مکمل اور باضابطہ صورت میں پورے یقین اور اذعان کے ساتھ کائنات کے سامنے پیش کرے اور اس کائنات میں اس نظام کو نافذ کرنے کے لئے ایسی مؤثر اور گرج دار آواز بلند کرے کہ یہ کائنات اس آواز سے گونج اُٹھے۔ [1]

---

[1] روزنامہ اوصاف (2 تا 4 جون 2022ء)

نوٹ: کالم نگار نے اخباری ضرورت کے تحت مضمون سے آیات واحادیث کا متن حذف کر دیا تھا، نیز مضمون کا ایک بڑا حصہ قلم زد کر دیا تھا۔ ہم نے اصل سے مراجعت کر کے مضمون کو مکمل کر دیا ہے تاکہ استفادہ وسیع تر ہو جائے۔ (مرتب)

سفر نامہ

ناران کی وادی تک

گرمی کی چھٹیاں ہوئیں تو میں سوچنے لگا کہ اس سال اپنے دینی اساتذہ کے پاس علمی استفادے کی غرض سے جاؤں یا نہ جاؤں۔ کچھ اساتذہ کی سرد مہری اور بے نیازی، کچھ گرمی کی شدت اور کچھ صحت کی خرابی نے پڑھنے کا رُخ بدل دیا اور ذہن یوں سوچنے لگا، پچھلے تین برسوں کی چھٹیاں پڑھنے ہی میں بسر ہوئیں تھیں۔ علم تو ایک سمندر ہے، کون ہے جس نے یہ سارا سمندر اپنے اندر سمیٹ لیا ہو۔ ہم سب کے حصے میں دو دو چار چار قطرے ہی تو آئے ہیں اور جس کے حصے میں کچھ بوندیں زیادہ آ جائیں وہ ہم میں اُبھر آتا ہے اور عالم و فاضل کہلاتا ہے، ورنہ علم تو ایک سمندر ہے جس کا کوئی ساحل نہیں۔ پھر طبیعت بھی مضمحل ہے اور زندگی کی لے بڑے مدہم سروں میں چلی گئی ہے۔ کسی سرسبز اور خنک وادی میں چلیں اور عمرِ رفتہ کو آواز دیں۔

از قیل و قالِ مدرسہ حالے دلم گرفت
یک چند نیز خدمتِ معشوق و مے کلم

فیصلہ ہوا کہ کاغان چلیں۔ صوفی عبدالحی کو ساتھ لیا جن کی جوانی خرابات [1] میں گزری ہے مگر اب فقط اللہ ھو اللہ ھو.... اس صوفی صافی کو ساتھ اس غرض سے لیا کہ طبیعت کی آوارگی حدود سے متجاوز نہ ہو۔ بعض لوگوں نے حوصلہ شکن باتیں کیں کہ وہاں ضروریاتِ زندگی میسر نہیں ہیں، راستہ خطرناک ہے اور ایک صاحب نے تو یہ آیت بھی پڑھ ڈالی:

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ [البقرۃ:195]

حضرت والد صاحب نے یہ مشورہ دیا کہ راولپنڈی جا کر وہاں کی جماعت اہلحدیث کے صدر سے جو گلیات میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں، بات کروں اور اگر نتھیا گلی میں انتظام ہو سکے تو کاغان کا پروگرام منسوخ کر دیا جائے۔

19 جون کی صبح کو ریل کار کے ذریعے راولپنڈی روانہ ہوئے۔ گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک دبلا پتلا، پیلے رنگ کا آدمی ہم سے مخاطب ہوا:

''آپ کا سامان راستے میں پڑا ہے۔ میرے گزرنے کا راستہ صاف ہونا چاہیے۔ یہ سامان یہاں سے اُٹھا لو۔''

صوفی صاحب جو فنائے نفس کے سب مقامات طے کر چکے ہیں، اس کے لہجے کی درشتی سے بھڑک اٹھے' منہ سنبھال

---

[1] فسق و فجور کی جگہ/ شراب خانہ

کر بات کرو، وہ شخص آپے سے باہر ہو گیا۔ میں تمہارا سامان اُٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں تمہارے بخیے اُدھیڑ دوں گا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس کا بدن لرز رہا تھا اور اس کے منہ سے جھاگ چھوٹ رہی تھی۔ میں نے صوفی صاحب سے کہا: 'یہ غریب آدمی ہے! اس کے اعصاب کی حالت سخت خراب ہے۔ آپ کا تصوف کس کام کا، اگر آپ اس بیمار آدمی کو ایک مسکراہٹ بھی نہ بخش سکیں'۔ اس آدمی کی بیوی پاس کھڑی تھی۔ جھٹ بولی آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں یہ سخت بیمار ہیں۔

ہماری سیر و تفریح کا یوں آغاز ہوا، دو چار منٹ میں گاڑی روانہ ہوئی اور فضا پر سکون ہو گئی۔ گاڑی صاف ستھری تھی اور فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ ذہن میں سوال اُبھرا.... کاغان یا نتھیا گلی....؟ اور میں حافظ کا یہ شعر گنگنانے لگا:

کس ندانست کہ منزلگہِ مقصود کجاست

ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید

بارہ بجے ہم راولپنڈی جا پہنچے، ابراہیم اینڈ کمپنی کا رخ کیا۔ میجر حسین صاحب بڑے تپاک سے ملے اور بہت پر تکلف کھانا کھلایا۔ پھر راولپنڈی میں جماعت اہلحدیث کے صدر اسماعیل صاحب ذبیح کو ٹیلی فون کیا۔ جواب ملا یہاں نہیں ہیں، میں نے کہا حضور! بندہ لاہور سے آیا ہے اور محض ان سے ملنے کے لیے راولپنڈی ٹھہرا ہے۔ اس نے بے رخی سے کہا! بازار گئے ہیں ....اور ریسیور رکھ دیا۔ میں نے پھر ٹیلی فون کیا، حضور! مجھے امیر جمعیت اہلحدیث مولانا داؤد غزنوی صاحب نے بھیجا ہے اور مجھے ان سے ابھی ملنا ہے، وہ بازار سے کب تشریف لے آئیں گے۔ جواب ملا میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ وہ بازار گئے ہیں۔ اس آواز سے درشتی ٹپک رہی تھی، مجھے معاً مولانا آزاد کا اہل حدیثوں کے بارہ میں وہ فقرہ یاد آ گیا:

''ان پتھروں کو اگر میں ہزار برس بھی تراشتا رہوں تو ان سے انسان کا بچہ تو میں پیدا نہیں کر سکتا ہوں۔''

میں ہر آدھ پون گھنٹے کے بعد دل کو سیسہ پلا کر اور سینے پر پتھر رکھ کر ٹیلی فون کرتا رہا۔ جواب یہی ملتا رہا کہ ابھی نہیں آئے۔ میں نے کہا بھائی! چار بج گئے ہیں کیا ساری دوپہر بازار ہی میں گھومتے رہے؟ خدا کے لیے گھر سے پتہ کروایئے وہ ضرور آ گئے ہوں گے۔ میں نے جو منتوں سے کہا تو کہنے لگے اچھی بات Hold کیجئے! دس، پندرہ منٹ کے بعد ارشاد ہوا ''وہ مری جا چکے ہیں۔ دو تین دن تک آئیں گے۔'' اس بھلے مانس نے معذرت کا ایک حرف بھی نہ کہا اور ہم مایوس ہو کر ایبٹ آباد روانہ ہوئے۔

ہم ایبٹ آباد پہنچے تو شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے دم بدم آ رہے تھے۔ ایبٹ آباد کی صبحیں اور شامیں کتنی سہانی ہیں۔ رات میجر جمشید کے ہاں ٹھہرے۔ جمشید کچھ اس گرم جوشی سے گلے ملا کہ اہل حدیث جماعت کا سارا گلا جاتا رہا۔ صبح جمشید کی گاڑی میں شہر کا چکر لگایا۔ ضروریاتِ زندگی فراہم کیں اور بالاکوٹ روانہ ہوئے۔

بالاکوٹ:

ایبٹ آباد سے بالاکوٹ تک کی مسافت پینتالیس میل کے قریب ہے۔ جوں جوں بالاکوٹ قریب آ رہا تھا سید احمد شہید علیہ الرحمہ اور ان کے ساتھیوں کی جان فروشیاں اور سکھوں کے مظالم یاد آنے لگے۔ اس خونیں داستان کا ایک ایک نقش ذہن میں اُبھرنے لگا۔

وَجَلَا السُّیُولُ عَنِ الطُّلولِ کَأَنَّها
زُبُرٌ تُجِدّ مُتُونَهَا أَقْلامُها

بالاکوٹ میں ہم ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ بالاکوٹ سے آگے سفر جیپ کا ہے۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس والوں نے کہا کہ کل کی سب نشستیں ریزرو ہو چکی ہیں۔ آپ کو ایک دن انتظار کرنا ہوگا۔ میں نے صوفی صاحب سے کہا:

غنیمت دان امورِ اتفاقی

اگلے روز جمعہ تھا۔ دریا کے کنارے ایک نئی مسجد بن رہی ہے۔ نماز جمعہ ہم نے وہیں ادا کی۔ اس کا محل وقوع غضب کا ہے۔ مسجد میں بیٹھتے ہی خدا یاد آتا ہے۔ ہاں ایک بات افسوس ناک ہے۔ دریا کی موجوں کے خروش میں مؤذن اور امام دونوں کی آواز دب جاتی ہے۔ ہمیں اس روز کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ مولوی صاحب کا موضوعِ سخن کیا ہے؟ حالانکہ ہم پہلی صف میں بیٹھے تھے۔ وہاں کے لوگوں کی یہ ستم ظریفی ہے کہ امام بوڑھا رکھا اور مؤذن بھی ڈھل چکا ہے۔ دونوں کی آواز بیٹھی ہوئی ہے۔ وہاں تو بڑی پاٹ دار آواز کی ضرورت ہے۔ نماز کے بعد کچھ لوگ میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے بعض پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ان سے وادیٔ کاغان کے بارے میں معلومات فراہم کیں اور پھر باتوں باتوں ہی میں ان کے دین مذہب کا حال بھی پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ سب حنفی ہیں اور بالاکوٹ میں سب مسجدیں احناف ہی کی ہیں۔ میں نے پوچھا شاہ اسماعیل شہید کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ سب یک زبان ہو کر کہنے لگے:

وکلٌّ یدّعی وصلًا بلیلی
ولیلی لا تقرُّ لهم بذاکا

وہ نہ تو ایسے جامد مقلد تھے کہ فقہ حنفی کو قیامت تک حرفِ آخر سمجھیں اور اس میں حک و اضافہ کو حرام ٹھہرا دیں اور نہ بعض خشک اہل حدیثوں کی طرح بے زمام اور روحانیت سے کورے۔ صراطِ مستقیم اور عبقات پڑھ کر دیکھئے کہ ان کا ذوقِ تصوف کس قدر سلجھا ہوا ہے۔ میں نے اس خیال سے کہ شاید تلخ حقیقتیں وہ ہضم نہ کر سکیں، بات ٹال دی۔ وہاں سے اُٹھے تو سید احمد شہید کے مزار پر گئے جو بازار کے ساتھ ہی ہے۔ وہاں کے مجاور نے بتایا کہ سید احمد شہید کا سر گڑھی حبیب اللہ میں دفن ہے اور دھڑ یہاں دفن ہے اور آس پاس کے مزار میرے آباؤ اجداد کے ہیں جو حضرت کے مرید

تھے۔ہم سراپا ادب تھے۔ ہم نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے مگر دل نے انوار محسوس نہ کیے اور وجدان کو وہ قبر خالی معلوم ہوئی۔ان کیفیتوں کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ جانے ان میں داخلیت کی آمیزش کہاں تک ہوتی ہے۔

وہاں سے شاہ اسماعیل شہید کے مزار کی طرف روانہ ہوئے جو بالاکوٹ کے بازار سے دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر ہے۔ ان کی قبر زندہ معلوم ہوئی اور روح پر انوار کی بارش ہوئی۔ کئی بار وہاں سے اُٹھنا چاہا مگر جذب سخت تھا۔سورج ڈھل رہا تھا۔آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کی نمی خبر دے رہی تھی کہ بارش آنے والی ہے۔ میں نے جی کڑا کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا:

خرجت امشی یقول قلبی
للرِّجل: باللہ أَنظِرِینی

کاغان تک:

اگلے روز صبح طباشیر بکھیر رہی تھی جب قافلہ ناران روانہ ہوا۔ مجھے اور صوفی صاحب کو اگلی نشستیں مل گئیں جو آرام دہ تھیں۔ مناظر دیکھنے میں سہولت رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں سرسبز وشاداب وادیاں نظر آنے لگیں۔ چیڑ کے سیدھے اور لانبے درخت ہر طرف دکھائی دینے لگے۔ اُبلتے ہوئے چشمے، مچلتی ہوئی ندیاں اور بپھرا ہوا دریائے کنہار۔ دریا اور جیپ کا راستہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

پانی جب پتھروں سے ٹکراتا ہے تو اس سے جھاگ اُٹھتی ہے اور اس کی رنگت دودھ کی سی سفید ہو جاتی ہے۔ مجھے تو اس کی آواز میں بھی ایک آہنگ محسوس ہوتا تھا.... پانی کی آواز اور اس کی رنگت:

یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

سفر کی ساری تھکن جاتی رہی اور طبیعت بشاش ہو گئی۔ ناران جاتے ہوئے پہلی منزل کیوائی آتی ہے جو تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے اور بالاکوٹ سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہمارے ڈرائیور نے ابھی تک چائے نہیں پی تھی۔ کہنے لگا یہاں دس پندرہ منٹ لگ جائیں گے۔ میں تو بالاکوٹ سے ناشتہ کر کے چلا تھا اس لیے جیپ کے پاس کھڑا فطرت کے مناظر دیکھنے لگا۔ دور آدمیوں کی بھیڑ نظر آئی تو میں بھی وقت کاٹنے کے لیے ان کی طرف چل پڑا۔کیا دیکھتا ہوں کہ اس بستی کے لوگ اکٹھے ہیں اور کچھ نورانی صورت کے آدمی ان کے پاس کھڑے ہیں۔ اور ان میں سے ایک بڑے جذبے کے ساتھ بستی والوں کو اللہ اور اس کے رسول کی باتیں سنا رہا ہے۔ پھر اُس نے بڑے خلوص کے ساتھ دعا مانگی۔ مجھ ایسے آلودہ دل کو بھی محسوس ہوا کہ ان پر اللہ کی رحمت برس رہی تھی۔ اللہ نے ہم تن آسانوں پر بڑا کرم کیا۔ ہماری جھولیاں مفت میں بھر گئیں۔ یہ تبلیغی جماعت کے لوگ تھے۔

"هم الذین لا یشقی جلیسهم"[1]

دعا سے فارغ ہوئے تو ان میں سے ہر ایک نے اپنا بستر اور سامان خود اُٹھایا اور چل پڑا۔ ان میں سے بعض کے چہرے صاف بول رہے ہے کہ خوش حال گھرانوں کے لوگ ہیں مگر اللہ کا عشق انھیں قریہ قریہ پھرا رہا ہے:

از پئے دیدنِ رُخت، ہمچو صبا فتادہ ام
خانہ بخانہ، در بدر، کوچہ بکوچہ، کُو بکُو

جی چاہتا تھا کہ ان سے باتیں کروں مگر روانگی کا وقت ہو چکا تھا اس لیے چپکے سے جیپ میں آ کر بیٹھ گیا۔ کیوائی سے مہاندری اور مہاندری سے کاغان پہنچے۔ ایک چھوٹا سا قصبہ جو 7000 فٹ کی بلندی پر ہے۔ مہاندری سے آگے چلے تو ہوا میں خنکی محسوس ہوئی اور ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ بالاکوٹ سے چلتے وقت سویٹر نکال کر ہم نے ساتھ رکھ لیے تھے مگر لاہور کے نواح میں رہ کر ہڈیاں سلگ رہی تھیں اس لیے

جاں مطربِ ترانۂ هَل مِن مَزِید تھی

سردی بدن میں دھنس رہی تھی مگر سویٹر پہننے کو جی نہ چاہا۔ طبیعت کی جولانیاں لوٹ آئیں۔ ذہن میں شعر و ادب کا کواڑ کھل گیا اور حافظ کی غزل گانے لگا۔

بیا تا گل برافشانیم و می در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحی نو در اندازیم
چو در دست است رودی خوش بزن مطرب سرودی خوش
کہ دست افشان غزل خوانیم و پاکوبان سر اندازیم

خیال تھا کہ کاغان میں بھی کچھ دن ٹھہریں گے مگر جا کر دیکھا کہ وہاں نہ بجلی ہے نہ ضروریات زندگی میسر ہیں .... اور کوئی ڈھب کا آدمی وہاں دکھائی نہ دیا۔

یک نالۂ مستانہ زجائے نہ شنیدم
ویراں شود آں شہر کہ میخانہ نہ دارد

اور

نے ذوقِ نگاہے و نے ہنگامۂ عشقے
اے وائے بشہرے کہ در وفتنہ گرے نیست

---

[1] صحیح مسلم کے الفاظ ہیں: هم القوم لا یشقی بهم جلیسهم "یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کی وجہ سے ان کے ساتھ بیٹھ جانے والا بھی محروم نہیں رہتا۔" (حدیث: 2689)

کاغان رہنے کا ارادہ ترک کیا اور ناران روانہ ہوئے۔

ناران:

ناران، کاغان سے چودہ میل کے فاصلے پر اور تقریباً آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ جیپ کئی برف کے تودوں پر سے گزر کر ناران پہنچی۔ ہم نے ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔

ناران کے بارے میں جو باتیں ہمیں بتائی گئی تھیں ان میں اکثر غلط نکلیں۔ وہاں بجلی، ڈاکخانہ، تار گھر سبھی کچھ ہے۔ ناران کا بازار اچھا خاصا ہے۔ اس میں تیس بتیس کے قریب دکانیں ہیں۔ گوشت، سبزی اور پھل کی دکانیں بھی کھل گئی ہیں۔ سرکاری دواخانہ بہت اچھا ہے۔ بعض بڑی قیمتی اور کمیاب دوائیں بھی وہاں پڑی ہوئی دیکھیں۔ وہاں کا پانی بھاری اور ہوا خشک ہے۔ جاتے ہی بدن پھٹنے لگا۔ صوفی کو بواسیر کا دورہ پڑا اور خون کے شراٹے بہنے لگے۔[1] مجھے تو چار دن میں وہاں کی آب و ہوا راس آ گئی مگر انھیں کچھ افاقہ نہ ہوا۔ وہ سیر و تفریح میں میرا ساتھ بہت کم دے سکے۔ آخر انھیں نیچے اترنا پڑا۔ میں تنہا رہ گیا مگر تنہائی کا کچھ ایسا احساس نہ تھا اور بعض شامیں تو بڑی ہنگامہ خیز گزریں۔ میرے پاس کالجوں کے طلبہ کا ہجوم .... چائے کے دور .... غزلیں .... لطیفے چٹکلے اور قہقہوں کی گونج۔

جیسے گھنگھور گھٹاؤں میں کڑکتی ہوئی رعد

ہر روز بارہ بجے کے قریب مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں ریسٹ ہاؤس میں اُترنے لگتی ہیں۔ اکثر سیاح امریکی اور انگریز ہوتے ہیں۔ لوگ بالعموم وادئ کاغان میں ایک دو دن سے زیادہ کسی جگہ نہیں ٹھہرتے۔ میرے ہمسائے ہر روز بدلتے تھے۔ میں نے بھی خود کسی سے رسم و راہ نہ کی۔ بس ایک سلام اور دو چار مسکراہٹیں ہر ہمسائے کو بخش دیتا تھا۔ ہاں اگر کوئی بلا نازل ہو ہی جاتی تو اسے تپاک سے خوش آمدید کہتا اور کبھی کبھی تو بلاؤں کا ہجوم ہوتا تھا۔ وہاں کے مقامی لوگوں سے ملنا طبیعت پر سخت گراں گزرتا تھا۔ وہ لوگ بالعموم زبان کے میٹھے اور دل کے کھوٹے ہیں۔ منافقت ان کی ہڈیوں میں رچی ہوئی ہے اور مداہنت ان کے خمیر میں گندھی ہوئی ہے۔

ٹراؤٹ (Trout) کے شکار کے لیے ہم دو بار گئے۔ یہ مچھلی بڑی لطیف اور لذیذ ہوتی ہے۔ برف کے یخ پانی ہی میں زندہ رہ سکتی ہے۔ ناران جانا اور ٹراؤٹ کا شکار نہ کرنا بڑی محرومی کی بات ہے۔

سیف الملوک:

سیف الملوک ایک خوبصورت جھیل ہے جو ناران سے چھ میل اوپر ہے اور دس ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ جھیل کے آس پاس اونچے نیچے پہاڑ ہیں جو برف سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ سیف الملوک دو بار جانے اتفاق ہوا۔ ایک بار تو ناران

---

[1] دھار کا زور سے نکلنا

کے انسپکٹر صاحب اور صوفی صاحب کے ساتھ گیا۔ اس روز میری طبیعت کچھ ناساز تھی اس لیے زیادہ لطف اندوز نہ ہو سکا۔ دوسری بار ہیلی کالج کے طلبہ کے ساتھ گیا۔ یہ بڑے زندہ دل لوگ تھے۔ ایک ان میں خوش آواز بھی تھا۔ راستے میں اس نے فیض کی غزل چھیڑی جس کا مقطع ہے:

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

سماں بندھ گیا اور طبیعت لہرا اُٹھی۔

جھیل میں آج کل دو کشتیاں کرائے پر ملتی ہیں۔ جاتے ہی ہم نے کشتی کرائے پر لی۔ جھیل کا پانی شفاف اور نیلگوں تھا، برفانی ہوا کے جھونکے پیہم چل رہے تھے۔ ملاح کشتی چلا رہے تھے۔ آفتاب' قاآنی کی نظم گا رہا تھا۔

نسیم خلد می رود مگر ز جویبارھا

میں نے کہا کہ ٹیپ کا شعر تو تم چھوڑ گئے ہو:

دو زلف مشکبار او بہ چشم اشکبار من
چو چشمہ ای کہ اندر او شنا کنند مارھا

دوسری کشتی میں کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ آفتاب کو مجھ پر پھبتی کسنے کا موقع مل گیا، کہنے لگا یہ شعر بالخصوص مصرع ثانی آپ کو غض بصر نے سمجھایا ہے۔ دیکھئے کتنے فائدے ہیں غض بصر کے۔ جھیل کے پار پہنچے تو ہم نے پتلونیں گھٹنوں تک چڑھا لیں اور لگے کوہ پیمائی کرنے۔ بڑی بڑی چٹانوں سے گزرے، گہرے اور سخت ٹھنڈے پانی کے نالوں میں اُترے۔ برف کے عظیم اور مہیب تودوں پہ اچھلتے کودتے رہے۔ بعض جگہ برف پگھل کر غار بن گئے تھے۔ ہم برف کے گولے مار مار کر ان غاروں کو ڈھاتے رہے۔ آخر تھک کر لوٹے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پہنچ کر چائے کی دو دو پیالیاں حلق میں انڈیلیں اور ناران روانہ ہوئے۔

پھر دو چار دن بعد وزیر رسل و رسائل صبور خاں صاحب تشریف لائے اور ''ساتھ ان کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا۔'' ریسٹ ہاؤس میں بہت بھیڑ ہوگئی اور جی یکا یک وہاں سے اچاٹ ہوگیا۔ فوراً جیپ میں نشست محفوظ کی۔ جیپوں کا قافلہ ناران سے صبح سویرے چلتا ہے۔ صبح جو آیا تو جیپ انگریز عورتوں [سے] بھری ہوئی تھیں۔ میں نے Good Morning کہا، انھوں نے بھی Good Morning کہا پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ خاموشی جو ہم سب پر گراں گزر رہی تھی۔ تھوڑی دور گئے تھے ایک گائے آکر جیپ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ڈرائیور نے بہت ہارن بجایا مگر وہ ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ میں نے جھٹ فقرہ کہا:

Even cows behave like asses in Kaghan valley.

سب ہنس پڑے اور فضا نارمل ہو گئی۔ ان سب کو شوگران جانا تھا اس لیے کیوائی سے مجھے جیپ بدلنی پڑی، سنا ہے کہ شوگران کا چپہ چپہ:

"داماں باغبان وکف گلفروش ہے"

میرے گھر کے حالات کچھ ایسے تھے کہ شوگران جانا میرے لیے ناممکن تھا۔ راستے میں کہیں ٹھہرے بغیر سیدھا لاہور پہنچا۔

(اور آہ! اب وہی لاہور کی گرمی.... کڑاکے کی دھوپ.... بجلی کا پنکھا.... ململ کے کرتے.... سکنجبین اور میں ہوں)①

---

① مجلہ فاران، لاہور (فروری 1964ء، 1986ء [سلور جوبلی نمبر]) [گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور]

اہم اعلان

خاندانِ غزنویہ کی خدمات پر دیگر کئی کام پیش نظر ہیں، اس لیے علماء کرام اور دوست احباب سے گزارش کہ اس خاندان کی کسی بھی شخصیت کے بارے میں کسی بھی نوع کی کوئی دستاویز، کتاب، کتابچہ، مضمون، مکتوب، تقریظ، رائے، اگر کسی دوست کے پاس موجود ہو تو براہ کرم ہمیں فراہم کریں یا نشاندہی فرمائیں، ہم شکر گزار ہوں گے اور دعا گو بھی!

قاری اویس ادریس العاصم

مدرسہ تعلیم القرآن والسنہ للبنات

مکان نمبر 22، گلی نمبر 3

محلہ حبیب گنج مصری شاہ لاہور

0322-7776945

سید کلیم حسین شاہ بخاری

ڈاک خانہ خاص ادھوال

تحصیل و ضلع راولپنڈی

0334-5138522